قیمت فی کاپی ۵ر

ایک مستقبل کی تلاش میں

انتساب

دُنیا کے تمام کاشتکاروں، مزدوروں اور
جماعتِ اسلامی کے ہر ہر فرد کے نام

شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو، مردانہ پندِ ناصحاں را گوش گیر

نیاز

ایک مستقبل کی تلاش میں (مارس ہنڈس)

مترجم = لطیف الدین احمد اکبرآبادی

جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

نیاز فتحپوری

اظہار تشکر

میں جناب لطیف اکبر آبادی کا حد درجہ ممنون ہوں کہ انھوں نے مارس ہنڈس کی
کتاب کے ترجمہ و تلخیص کا بار اپنے سر لیکر سالنامہ کی طیاری میں میری بڑی مدد فرمائی

نیاز

ایک مستقبل کی تلاش میں

حال ہی میں ایک یورو پین سیاح مارس ہنڈس (Maurus Hindus) کی کتاب شایع ہوئی ہے، جس کا نام ہے " In search of a future " یہ کتاب نتیجہ ہے ایران، مصر، عراق اور فلسطین کی سیاحت کا جو اس نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ وہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے ان ملکوں کے مستقبل کے متعلق خود کوئی رائے قایم کرسکے۔ اس نے سیاحت کے لئے اس سرزمین کو اس لئے پسند کیا کہ مشرق وسطی کے مسایل سے روس و امریکہ کو جو گہرا تعلق حاصل ہے، اس کے اسباب و نتایج کو اچھی طرح سمجھ سکنے کے لئے خود وہاں جانا ضروری تھا

اس نے ایران میں کافی وقت صرف کیا کیونکہ یہی وہ ملک ہے جو روس و امریکہ کے درمیان عرصہ سے "استخوانِ جنگ" بنا ہوا ہے اور جس کا وزن یہاں کی سیاسی ترازو کے پلہ کو جس طرف چاہے جھکا سکتا ہے، اس نے گاؤں گاؤں جاکر یہاں کی اقتصادی و معاشی حالات کا مطالعہ کیا، اس نے ہر طبقہ کے لوگوں سے ملکر ان کے رجحانات کا پتہ چلایا اور وہ یہاں کی آبادی کے افلاس، ملک کی تباہ حالی اور حکومت کی بدنظمی سے اس قدر متاثر ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ یہاں کی سیاسیات کا مطالعہ کرتا، یہاں کے اقتصادی حالات پر آنسو بہانے لگا اور سوچنے لگا کہ اس خوبصورت، زرخیز، شاداب و شگفتہ سرزمین کو اس کے ہولناک مستقبل سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے۔

انھیں تاثرات کو لئے ہوئے وہ ایران سے مصر گیا، اور مصر سے عراق و فلسطین پہونچا، لیکن بجائے اسکے کہ ان تاثرات میں کمی ہوتی، ان میں اور اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ اس نے ان ملکوں کی حالت بھی ویسی ہی خراب پائی اور وہ آخرکار اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر مشرق وسطی کی مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کو دنیا میں باقی رہنا ہے تو انھیں فلسطین کی اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے جس نے صحرا اور ریگستان کو چند دنوں میں خدا جانے کیا سے کیا بنادیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اگر فلسطین میں یہودی نہ ہوتے تو

مشرق وسطیٰ کی نجات کے لئے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ ان کو دیکھ کر مشرق وسطیٰ کے مسلمان سمجھ سکیں کہ محنت و کوشش اور صحیح و صالح تدابیر سے انسان کیا نہیں کر سکتا"۔

اس نے ایران، مصر اور عرب ہر جگہ عام آبادی اور خصوصیت کے ساتھ کاشتکاروں اور مزدوروں کے حالات کا مطالعہ کرکے افسوس کیا ہے کہ مصر میں جسے کرۂ زمین کا چمنستان کہنا چاہئے۔ تین چوتھائی دیہی آبادی پاؤں کی ایک خاص بیماری (Bilharz) میں صرف اس لئے مبتلا نظر آتی ہے کہ وہ جوتا نہیں خرید سکتے۔ شام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "یہاں کی دو تہائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور ⅚ حصہ زمین کا ان زمینداروں کے قبضہ میں ہے جنھوں نے جاکر کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ کاشتکاروں کی حالت کس قدر خراب ہے"۔

عراق میں جہاں قابل کاشت زمین کی کمی نہیں، صرف ⅕ حصہ کاشت کیا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت تکلیف و مصیبت کے ساتھ ۔ وہ کہتا ہے کہ "مشرق وسطیٰ کے کاشتکار طبقہ کا تصور گویا "فاقہ و موت" کا تصور کرنا ہے اور یہاں کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صاف پانی حاصل کرنے کے لئے بھی ان کے پاس پیسہ نہیں ہے، یہاں کے لوگ جانوروں کو بھی اپنے ہی جھونپڑوں میں رکھتے ہیں اور گندگی نے ان کی صحتوں کو بالکل تباہ کر رکھا ہے"۔

سیاح مذکور جب ان ملکوں کی سیاحت کرکے اسرائیلی حکومت میں پہونچتا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس کو یقین نہیں آتا کہ کیا یہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہے، جسے وہ اس قدر بدحال دیکھ چکا ہے۔ چھ مہینے کی سیاحت کے بعد سب سے پہلے اُسے یہیں جرأت ہوئی کہ وہ ایک سلیقہ کی دوکان سے ناسپاتی لیکر کھا سکتا اور صاف پانی سے نہا سکتا۔

منڈس، یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اسرائیلی حکومت کیونکر چند دنوں میں صحرا و ریگستان کو باغ و بہار بنا سکی۔ اس نے دلدلی زمینوں کو جہاں کے مچھروں سے ملیریا پھیلتا تھا ختم کر دیا، آبپاشی کے ذرائع پیدا کرکے خشک ریتیلے میدانوں کو گلزار بنا دیا، ان حصوں کو جہاں کبھی غلہ کا ایک دانہ پیدا نہ ہوتا تھا، ہری بھری کھیتیوں میں تبدیل کر دیا اور ان مقامات میں جہاں لوگ پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترستے تھے نہریں بہادیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو سکا کہ انھوں نے سب سے پہلے کاشتکاروں کی اصلاح کی، کاشت کے نئے طریقوں سے انھیں آگاہ کیا، کاشتکاروں میں زندگی کا وہ احساس پیدا کیا جس سے وہ اسوقت تک بالکل بے خبر تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کی بے آب و گیاہ زمین سونا اُگلنے لگی۔

سیاح مذکور کہتا ہے کہ ایران، مصر و عراق سب کو اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے اور اگر

وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں کاشتکار طبقہ کی اصلاح کرنا چاہئے۔

اس نے ایران میں تودہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ایک سال کے دوران اقتدار میں آذربیجان کے اندر کافی اصلاح کرنا چاہی لیکن وہ معمولی سی طہرانی فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکی (حالانکہ کچھ زمانہ قبل اسی فوج کو کاشغائی علاقہ کے قبایل نے شکست فاش دیدی تھی) اس کا سبب صرف یہ تھا کہ تودہ تحریک کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور ان کی حمایت نہ حاصل کر سکی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ کاشتکاروں کی یہ سقیم حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی، غلط ہے، کیونکہ روس میں بھی کاشتکاروں کی بالکل یہی حالت تھی اور جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تو انھوں نے حکومت کا تختہ اُلٹ کر رکھدیا۔

سیاح مذکور لکھتا ہے کہ:- "ہمارے مدبرین یہ تو سوچتے رہتے ہیں کہ روس کے اقدامات اور اشتراکیت کی ریشہ دوانی کو کیونکر ختم کیا جائے، ایشیا و افریقہ کی انقلابی تحریکوں پر کس طرح قابو پایا جائے، نئی نئی زمینیں کھود کر معلوم کیا جائے کہ پٹرول کے چشمے کہاں کہاں ہیں، اور جدید مالیاتی منصوبے قایم کر کے نئی نئی منڈیاں پیدا کی جائیں۔ لیکن غریب فلاح و کاشتکار کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ انھیں سمجھنا چاہئے کہ اگر زمین کے مسئلہ کو طے نہ کیا گیا تو کاشتکار خود اسے طے کرے گا اور اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو روس میں ہوا اور اب چین میں ہمارے سامنے ہے یعنے اشتراکیت اور صرف اشتراکیت"۔

(نیاز)

پیش لفظ یہ کتاب ان ملکوں کے حالات پر ہے جو اپنا مستقبل پالینے کی جستجو میں ہیں، یعنے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ۔ اس کتاب کا موضوع انھیں ملکوں کی آبادی اور سرزمین ہے، وہاں کے شہروں اور کلچر کا ذکر محض ضمنی طور پر آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودی فلسطین جس کا نیا نام اسرائیلی حکومت ہے ان قوموں کی ترقی کے لئے ایک عمدہ مثال بن سکتا ہے، بشرطیکہ وسطی مشرق کی مسلمان قومیں اپنے اپنے ملک کی طبعی حالات کے پیشِ نظر اس دستور العمل سے فایدہ اُٹھائیں جو اسرائیلیوں نے صحرا و بیابانوں کو سرسبز و زرخیز بنا کر پیش کیا ہے اور اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو انھیں ایک سخت خونیں انقلاب کا منتظر رہنا چاہئے، جس کا راہرسل ایرانی آذربیجان میں بھی ہو چکا ہے۔

یہودی فلسطین آج سے ایک نسل پہلے تک اسی طرح خواب خرگوش میں مبتلا تھا جس طرح عرب فلسطین۔ لیکن اس مختصر مدت میں اسرائیلی فلسطین میں باوجودیکہ وہ بیرونی اور خصوصاً برطانوی اثرات کا ہدف بنا رہا، حیرتناک

ترقی کرلی ہے اور اس علاقے کی اندرونی ترقیوں کا نہایت مکمل دستور العمل بن چکا ہے، اس کے برخلاف مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک جو ابھی تک بیرونی مداخلت سے محفوظ ہیں، اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اندھیرے کو ٹٹول رہے ہیں۔

یہ تصنیف نہ تو سیاسی حجت وبحث ہے نہ تاریخی مقالہ۔ مجھے صیہونی یا عربی فلسفے سے بھی واسطہ نہیں ہے اس کتاب میں میرا واسطہ عربوں، ایرانیوں، مصریوں اور یہودیوں سے صرف انسانیت کا واسطہ ہے۔

فلسطین کا لفظ جن سیاسی اختلافات اور تاریخی موضوعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جو بین الاقوامی نزاعیں پیدا ہوسکتی ہیں، اس پر نہایت قابل لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن فلسطین کی رائل کمیشن نے ۱۹۳۷ء میں جو رپورٹ شایع کی ہے وہ اس مسئلہ پر نہایت واضح تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ Sumner Welles کی تصنیف We can not fail بھی ایک ایسی کتاب ہے جو اس موضوع پر جامع اور دستاویزی شہادت ہونے کے ساتھ ہی برطانوی ذمہ داریوں اور ناکامیوں، امریکن وعدوں اور بدعہدیوں پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

اسرائیلی حکومت کا مستقبل جو کچھ بھی ہو۔ لندن کا دفتر خارجہ اور امپیریل جنرل اسٹاف یہودیوں کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے، مگر اس قوم کا یہ روشن کارنامہ کہ اس نے ریگستانوں کو سرسبز و شاداب باغوں میں بدل دیا ہے کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ خوش قسمتی سے میں آنجہانی Wendel Willkie سے متعارف تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے ایشیائی ملکوں کی پستی کے متعلق ایک نہایت اہم بات کہی کہ "ان کروروں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک جوڑا جوتہ، دو بنیان، دو قمیص اور دو موزے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم ان کے ساتھ کتنی بڑی تجارت کرسکتے تھے!"۔ ولکی خود پانچ زراعتی فارموں کا مالک تھا اس لئے کاشت اور آراضی کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا کہ افریقہ وایشیا کی نہایت پست قوموں کے افلاس کی جڑ آراضی کی غلط تقسیم ہے، نادرست نہ تھا: دراس سے انکار ممکن نہیں کہ کروروں انسانوں کی زمین سے محرومی اور اسی کے ساتھ پرانے طریقوں اور آلات سے کاشتکاری کے اندر وہ طوفان بھی چھپا ہوا ہے جو جوالا مکھی کے دھوئیں کی طرح دنیا کے بہت بڑے حصے پر منڈلا رہا ہے اور اس وقت ایران، مصر، عراق اور ایشیا وافریقہ کے دوسرے ملک بھی اس طوفان عظیم کے منتظر ہیں ——— باوجود اس کے کہ اسرائیلیوں کی زرعی پالیسی اور ترقی، اس کی آبادی کی صحت مندی، کاشتکاروں کی پر امید زندگی بلاشبہ ایک مستحکم چٹان ہے مگر انکا اندرونی امن وسکون یقیناً اقلیتوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ یہودی فلسطین نے جو امن اور خوش حالی حاصل کرلی ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے جسے وسطی مشرق کی مسلمان قومیں حاصل نہ کرسکتی ہوں۔

Givat Brenner ایک اسرائیلی گاؤں کا نام ہے۔ میں اس گاؤں کو دیکھنے گیا تھا اور جب میں اسکے

سرسبز کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اوڑھے عرب عورتوں اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر ہلّہ بول دیا ہے۔ میں نے اسے فرقہ وارانہ بلوہ سمجھ کر گاؤں کے سکھ سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ بلوہ نہیں ہے بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کارآمد چیزیں ڈھونڈھنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گودڑ وغیرہ چن لے جاتے ہیں۔

یہودیوں کے پاس کوئی نیا موسیٰ نہیں آیا جس نے اپنا عصا مار کر فلسطین میں پانی کے چشمے جاری کر دئے ہوں، بلکہ یہودیوں نے اسی زمین سے پانی نکال کر صحرا کو سیراب کیا اور زمین کو زرخیز بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایک کے سوا باقی سب دلدلوں کو خشک کر کے طاعون اور ملیریا کو ختم کر دیا ہے جو صدیوں سے عرب باشندوں کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے صحرا اور پہاڑیوں پر اپنا پسینہ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ ایشیا و افریقہ میں یہودیوں سے زیادہ ہوشیار اور محنتی شاید ہی کوئی ہو۔ ان مقامات کی مردہ زمین میں اس طرح کہیں بھی جان نہیں ڈالی گئی کہ بیابانوں میں روئی اور پھل اُگنے لگے ہوں۔ از کار رفتہ مویشیوں کو نئی زندگی دینا، بھیڑ، بکریوں اور دیگر مویشی کو کارآمد و نفع بخش بنا لینا اور پولٹری کی افراط اس میں شک نہیں بڑا کارنامہ ہے۔

اسرائیل کے یہودی دولت مند تو نہیں بن گئے ہیں مگر سالانہ ایک جوڑا کپڑا اور جوتا جس کا ذکر ولکی نے کیا تھا ضرور خرید سکتے ہیں۔ یہ بات عرب ملکوں کے لئے خواب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کے صحیح مخاطب چونکہ امریکن لوگ ہیں اس لئے میں نے ایران کے ذکر کو زیادہ جگہ دی ہے۔ میں نے جن ملکوں کی سیاحت کی ان میں ایران سب سے زیادہ دلکش ملک ہے۔ ایک غیر ملکی نے ایران کو "امریکہ کی لاڈلی" کا نام دیا تھا۔ بلاشبہ روس اور امریکہ کی کشاکش میں ایران کنجی کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے دوسرے ملکوں کے مقابل میں ایران تو امریکہ کی لاڈلی ہونا چاہئے۔

ایک انگریز مصنف (A. C. Edwards) نے لکھا ہے کہ "ایران میں جو حکومت بھی قایم ہوتی ہے، بیشتر برطانوی یا روسی سفارت خانے کی اشارہ سے قایم ہوتی ہے۔ مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیونکہ غیر ملکی اثر کے اعتبار سے امریکہ، روس اور برطانیہ دونوں پر سبقت لے گیا ہے۔ چنانچہ آج ایرانی فوج کی نئی تنظیم، امریکن فوجی مشن سے ہاتھوں ہو رہی ہے اور پولیس کو از سرِ نو منظم کرنے کے لئے بھی امریکہ ہی کا ایک فوجی افسر مقرر کیا گیا ہے۔

امریکہ کے دوست اور دشمن، صحیح یا غلط طور پر ۱۹۴۶ء میں ایران کو صوبۂ آذربیجان میں جو کامرانی حاصل ہوئی اس کا سبب امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وزیر اعظم غضام نے روس سے تیل کی جن مراعات کا وعدہ کیا تھا اور ۱۹۴۷ء میں مجلس نے جشن استقلال کے ساتھ اس روسی مطالبہ کو مسترد کیا، وہ بھی امریکہ کے اثر و نفوذ ہی کا نتیجہ تھا۔

لیکن امریکہ کے اس اثر و نفوذ کے باوجود ایران کا مسئلہ واشنگٹن کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے اور آئندہ امریکہ کا یہ اثر رہے یا نہ رہے لیکن میں اپنے یقین کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایران کے بارے میں واشنگٹن کو جتنی وسیع اور مکمل معلومات حاصل ہیں ایسی وسط ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے بارے میں حاصل نہیں ہیں۔ جارج ایلین کی سفارت کے زمانہ میں، جو خود ایک صحافی رہ چکا تھا۔ اس کے اشارات کی توجہ سے ایرانی زندگی کا کوئی پہلو مشکل سے بچ سکا۔

انجنیئرنگ فرم Morrison Knudsen کی آٹھ سو صفحے کی رپورٹ ایران کے متعلق اطلاعات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ رپورٹ حکومت ایران کی خواہش پر اس فرم کے ماہروں نے طیار کی تھی، لیکن یہ رپورٹ شایع نہیں ہوئی۔ مجھے طہران نیشنل بنک کے گورنر نے اس کی کاپی دیکھنے کو دی تھی اور اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ رپورٹ ایران کی کتنی بڑی خدمت ہے۔ ایران کے متعلق ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان جو معرکہ بھی ہو اور اس ملک میں امریکہ کی موجودہ پوزیشن باقی رہے یا نہ رہے، لیکن جو مواد اور معلومات امریکہ کے پاس ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایران کے باب میں پریسیڈنٹ کانگریس کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کا سبب یہ نہ ہوگا کہ امریکہ کو یہاں کی بابت کافی اطلاعات حاصل نہ تھیں۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت اسرائیلی حکومت ہی تنہا ایسی حکومت ہے جو نہ صرف ایران بلکہ مصر، عراق اور شام وغیرہ کیلئے بھی نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اسرائیلی اصولِ ترقی جوں کے توں ان ملکوں کے لئے موزوں ہوں گے لیکن یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ یہودی حکومت کو سامنے رکھکر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

فلسطین کے یہودیوں کے بارے میں لارنس آف عربیا نے تیس سال پہلے لکھا تھا:-

"ان کی (یہودیوں کی) اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوگا کہ موجودہ عرب آبادی خود ان کی (یہودیوں کی) مادی و اقتصادی سطح پر آجائے۔ یہ کام یہودیوں کی ترقی کر لینے کے فوراً بعد شروع ہو جانا چاہئے۔ ایسا ہو سکا تو عرب دنیا کے مستقبل کے لئے اہم نتیجے رونما ہو سکیں گے"

اسرائیلی حکومت سے عربوں کی دشمنی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، لیکن اب وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہودیوں نے کس کامیابی کے ساتھ اپنے مسایل کو حل کیا اور اسے نظر انداز کر دینا بالکل ایسی بات ہوگی جیسے ڈاکٹر کسی کو پنسلین تجویز کرے اور وہ انکار کر دے محض اس لئے کہ اس علاج سے اس کا پڑوسی جس سے اس مریض کی مخالفت تھی شفا پا چکا ہے۔

پہلا باب

(ایران)

دُنیا کے سرے پر اپنا سفر میں نے جینیوا (سوئٹزرلینڈ) سے شروع کیا، اور طہران پہونچکر مجھے محسوس ہوا کہ میں دُنیا کے آخری سرے پر پہونچ گیا ہوں۔ طہران، ایران کا بہت بڑا، نئی وضع قطع کا شہر ہے، جس کی آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے، مگر ہوائی جہاز یہاں بہت کم آتے ہیں، کیونکہ اس طرف مسافروں کی آمد و رفت اتنی کم ہے کہ ہوائی کمپنیاں اپنے اڈوں کے مصارف نہیں نکال سکتیں۔

امریکہ کی ہوائی ڈاک پندرہ دن سے پہلے تہران میں تقسیم نہیں ہوتی اور کبھی کبھی پورا مہینہ لگ جاتا ہے۔ یورپ کے اخباروں کا تہران کے گلی کوچوں میں بکنا تو بڑی بات ہے، اخبار فروشوں کے ہاں بھی نہیں ملتے۔ اور اگر پہونچتے بھی ہیں تو بہت دیر میں۔ ہاں قریب کے روسی علاقے کے اخبار ضرور آجاتے ہیں، مگر روسی زبان جاننے والوں کے لئے بھی ان میں دنیا کی خبریں خاص ترتیب و سلیقہ کے ساتھ نہیں دیجاتیں۔

دُنیا کے حالات سے بے خبری کا احساس جتنا مجھے طہران میں ہوا، کہیں نہیں ہوا۔ جن سیاحوں کی اپنے ملک کے سفارت خانوں تک پہونچ ہوتی ہے وہ البتہ طہران میں دنیا کے حالات و واقعات سے اتنے بے خبر نہیں رہتے کیونکہ ہر سفارت خانہ تازہ خبریں حاصل کرنے کا انتظام رکھتا ہے، لیکن غیر ملکی سیاح جس کی رسائی اپنے سفارتخانے تک نہیں دُنیا کے حالات سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ غیر ملکی زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان کا ایک اخبار "ژورنال دو تہران" یہاں چھپتا ہے۔ مگر اس اخبار میں صحافت کی تمام خوبیاں ہونے کے باوجود دنیا کے تازہ واقعات کی صحیح اطلاع نہیں ملتی۔ چنانچہ میرے قیام طہران کے دوران میں دو مرتبہ یہ افواہ اُڑی کہ روس و امریکہ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔

تہران صحیح معنے میں مشرق ہے، پُرسکون و خوابیدہ! تہران کو شورش و ہنگامہ بھی بمشکل جنبش دے سکتا ہے۔ اس شہر کے حال و مزاج کا اندازہ یہاں کے فقیروں اور کتوں سے ہوتا ہے: افریقہ و ایشیا کے سارے

فقیروں میں تہران کا فقیر بڑا مسکین و خوش مزاج فقیر ہے۔ یہاں ہر موڑ پر، ہر گلی کوچے میں میلے کچیلے، لنگڑے لولے نظر آتے ہیں، کوئی بیسا کھیوں پر چل رہا ہے، تو کوئی سکڑا ہوا پڑا ہے، کوئی بے ٹانگوں کے گھسٹ رہا ہے تو کوئی درخت یا دیوار کا سہارا لئے کھڑا ہے، ان کا ٹھکانا راستے اور فٹ پاتھ ہیں، جہاں بیٹھتے ہیں وہیں سو جاتے ہیں اور سوتے وقت اپنی ٹوپی اُلٹی کرکے رکھ دیتے ہیں تاکہ گزرنے والے خیرات کی یاد نہ بھولیں۔ تہران کے فقیر براہ راست سوال نہیں کرتے۔ میرے قیام تہران میں صرف ایک فقیر نے مجھ سے سوال کیا اور دور تک پیچھا بھی کیا۔ اس کے برخلاف قاہرہ کے فقیر جب انھیں مایوسی ہوتی ہے تو بُرا بھلا کہنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

تہران کو شہر نہیں بلکہ ایک تمدن کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا، اور تمدن بھی ایک نہیں بلکہ مختلف تمدنوں کا مجموعہ۔ جس کھیت کی کیاریوں میں یکساں طور پر پانی نہ پہونچے گا پیداوار اتنی ہی ناہموار ہوگی۔ یہی کیفیت تہرانی کلچر کی ہے۔ پُرانے بازار تنگ پٹے ہوئے ہیں جہاں نہ گرمیوں کی تپا دینے والی دھوپ ستا سکتی ہے اور نہ سردیوں کی برفباری۔ پُرانے شہر کی گلیاں ٹیڑھی میڑھی ہیں، اور بازاروں میں کافی شور ہوتا رہتا ہے، سردی کے موسم میں دہکتی ہوئی انگیٹھیاں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں، بو اور خوشبو، جھنکاریں اور راگنیاں، طہران کی قدامت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن پرانی آبادی سے باہر ہر طرف کشادہ سڑکیں اور خیابان ہیں۔ سڑکوں پر سایہ دار درختوں کی دو رویہ قطاریں، جھلسا دینے والی دھوپ سے پناہ دیتی اور آنکھوں کو طراوٹ پہونچاتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں خاص طور پر ٹھنڈے پانی کے مشکیزے اُٹھائے، سقے پیاسوں کو پکار پکار کر پانی پلاتے پھرتے ہیں ایران میں دودھ بھی مشکیزوں ہی میں لایا جاتا ہے، اور اس وجہ سے خراب بھی جلدی ہوجاتا ہے۔

ٹیکسی اور بس سروس کا انتظام حال ہی میں ہوا ہے، اور سچ یہ ہے کہ تہران کی یہ سروس بہتر بس سروس ہے۔ نئی، خوبصورت اور چمکیلی گاڑیوں کا ایک بیڑہ انگلستان سے یہاں پہونچا ہے۔ طہران کی ٹیکسی سروس اس میں شک نہیں قابل رشک چیز ہے۔ البتہ بوڑھا "درشکی" (کوچبان) اس سے خوش نہیں ہے۔

سارے شہر میں ہمہ وقت، یہ تیز رو اور سستی ٹیکسیاں دوڑتی پھرتی ہیں، اور بھروسے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس باب میں سہولت و آرام کے اعتبار سے تہران کو دنیا بھر کے شہروں پر فوقیت حاصل ہے۔ نقل و حمل کی اس خوبصورت و راحت رساں سواری کے ساتھ ساتھ باربرداری کے گدھوں اور اونٹوں کی قطاریں بھی سڑکوں پر دیکھی جاتی ہیں، اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ طہران کا چہرہ جوان اور جسم بوڑھا ہے اور یہ کارنامہ ہے رضا شاہ پہلوی کا۔

رضا شاہ اور روسی زار پیٹر اعظم میں مماثلت تام ہے۔ پیٹر کی طرح رضا شاہ، ایران کی پستی سے بیزار ہوکر

اسے یورپ کے سانچے میں ڈھال لینے پر تل گئے تھے، کچے مکان اور چھپر ڈھا دئے گئے، کچ بچ گلیاں صاف کی گئیں، بدبودار چشمے اور تالاب خشک ہوئے، اور ان کی جگہ نئی اور عالیشان عمارتیں، سیدھی اور وسیع سڑکیں اور بازار بن گئے۔ پیٹر کی طرح رضا شاہ نے بھی ناراضی و مخالفت کی پروا نہ کرکے سختی سے کام لیا اور جس طرح روس کی آبادی پیٹر سے خوف زدہ تھی اسی طرح ایرانی عوام رضا شاہ سے ڈرتے تھے۔ ایرانیوں نے صدیوں سے زندگی میں اتنا تیز انقلاب نہیں دیکھا تھا کہ سروں کی پگڑیاں دم بھر میں ہیٹ کی صورت اختیار کرلیں، اور لمبی عبائیں کوٹ پتلون بن جائیں۔ ایرانیوں کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نقاب پوش خاتونیں دیکھتے دیکھتے نقاب ترک کرکے میم بن جائیں گی!۔

۱۹۳۲ء میں ایرانی عورتیں ریسٹوراں اور سینما گھروں میں داخل ہوئیں۔ شروع شروع میں کم عورتوں نے ایسی دلیری دکھائی! لیکن ۱۹۳۶ء میں جب تہران گرل ہائی اسکول کی لڑکیوں نے ورزش کی نمایش کی اور رضا شاہ، معہ اپنی ملکہ اور شہزادیوں کے مغربی لباس میں یہاں آئے تو گو اس واقعہ سے ملک بھر میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اسی روز سے ایرانی رسم و رواج تیزی سے بدلنے لگے۔

کم از کم نئے تہران میں، آج نقاب پوش عورت نہیں دیکھی جاتی۔ اور اگر دیکھی بھی جائے تو خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ نقاب یا تو شناخت کرنے کے لئے ہے یا پھر چہرہ عیب دار ہے۔ اس کے باوجود پرانی عادتیں ابھی تک باقی ہیں! ایرانی مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ دیکر نہیں چلتے، بجز ان چند نوجوانوں کے جو یورپ و امریکہ سے تعلیم پاکر واپس آئے ہیں۔

جدید ایرانی عورت ایک غیر ملکی زبان ضرور جانتی ہے اور قہوہ خانوں یا باغوں میں اتنی ہی آزاد و بےتکلف نظر آتی ہے جتنی کوئی یوروپین عورت۔ لیکن یہ جدید ایرانی عورت کسی دوست بلکہ منگیتر کے ساتھ بھی تنہا تفریح کو نہیں نکلتی۔ باپ یا بھائی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

غیر ملکی سیاح جب تہران میں داخل ہوتا ہے تو شہر کی خوبصورتی اور صفائی سے بہت متاثر ہوتا ہے! شہر و بازار کا نقشہ، جدید اور عالیشان عمارتوں کی قطاریں، وسیع چکیلی سڑکیں، چاق چوبند پولیس کے سپاہی، یہ سب باتیں اسے یوروپ کی یاد دلادیتی ہیں۔ لیکن اس حسین و دلکش چہرے کے نیچے وہ سن رسیدہ جھریاں پڑے ہوئے جسم کی جھلک بھی دیکھتا ہے۔

روشن خیال رضا شاہ نے پایۂ تخت میں نلوں کے ذریعہ سے پانی کی بہم رسانی اور حفظان صحت کے اصول پر توجہ نہیں کی۔ تہران میں پہاڑوں کا پانی کھلی نالیوں میں شہر کے ہر کوچہ و بازار میں بہتا نظر آتا ہے شہر کی ساری گندگی ان نالیوں میں بہتی ہے اور یہیں کپڑے دھوئے جاتے ہیں، لوگ نہاتے ہیں اور جانور

پانی پیتے ہیں۔

حال میں ایک برٹش انجینرنگ فرم کو تہرآن کی آب رسانی اور زمین دوز بدر رو بنانے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

تہرآن کی زندگی میں قدیم "دیروز" اور جدید "فردا" آپس میں اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں، جیسے کانٹوں کے درخت پر گلاب کی بیل۔ لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی ایرانی قوم نہ تو سست و کاہل ہے اور نہ انکے اندر شکست خوردگی کا انداز پایا جاتا ہے! کم ازکم تہرآن کا سیاح تو یہی کہے گا۔

جس ایرانی کو دیکھئے سر اٹھائے تیزی سے ہاتھ ہلاتا ہوا چلتا ہے، ایرانیوں کو شائستگی کا خیال ہر وقت رہتا ہے۔ افتادِ طبع و مزاج کے اعتبار سے ایرانیوں اور فرانسیسیوں میں مماثلت ہے اور شاید اسی لئے فرانس کی ثقافت و زبان ایرآن میں زیادہ مقبول ہے۔ ایک ایرانی کتنی ہی خستہ حالت میں ہو' افسردہ وغمگین نظر نہیں آتا، وہ اس وقت بھی اداس نہیں معلوم ہوتا جب وہ اپنے گھر یا دوکان پہ پالتی مارے بیٹھا ایرانی ریڈیو کے غمگین نغمے سنتا ہوتا ہے۔ (مغربی کانوں کو یہاں کی موسیقی اُداس ہی معلوم ہوتی ہے)

اوسطاً ایرانی چھریرے بدن کا مستقل مزاج انسان ہوتا ہے، موٹا آدمی یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جب نظر آجاتا ہے تو اُنگلیاں بھی اُٹھ جاتی ہیں، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے باتوں باتوں میں کہا کہ "ہمارے سب موٹے آدمی پارلیمنٹ میں ہیں"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ الیکشن میں زیادہ تر تاجر اور زمیندار ہی چنے جاتے ہیں جن کو عمر بھر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا اور عیش و آرام آدمی کو موٹا بنا ہی دیتا ہے

ایک طہرانی ادیب سے میں نے سوال کیا:-

"کیا آپ کے ملک میں لوگ خودکشی بھی کرتے ہیں؟" ——— اس نے جواب دیا

"ہاں مگر بہت کم، کیونکہ ہماری قوم بڑے بڑے دشوار حالات سے گزر چکی ہے، اور کوہ و صحرا نے ہماری زندگی کو صعب و دشوار بنا دیا ہے اس لئے کوئی مصیبت ہمیں مایوس نہیں کرتی، ہم ہر حالت میں جئے جاتے ہیں"

قاہرہ کے بازاروں میں گزرتے وقت وہاں کی بھیڑ بھاڑ اور قہوہ خانوں کی رونق و آبادی دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ مصری کام کس وقت کرتے ہیں؟ لیکن جب میں تہرآن کے گلی کوچوں میں گھوما تو وہ سوال اُلٹا ہو گیا یعنی ایرانی راحت و آرام کس وقت کرتا ہے؟ گرمی کے موسم میں تہرآن کی تمام دوکانیں زیادہ دیر تک بند رہتی ہیں۔ اس وقفے کے علاوہ میں نے ایرانیوں کو ہر وقت مصروف اور کام کرتے دیکھا۔ شاید کام کرتے رہنا ایرانی خون میں داخل ہے۔ ہر ایرانی جو طبقۂ اشراف میں شمار نہیں ہوتا ہر وقت مصروف نظر آئے گا۔

اشراف ایرانی بے شک اپنے ہات سے کام کرنے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تاجر و زمیندار کی طرح اہلِ فن (مثلاً انجینر وغیرہ) بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں اور اپنے ہات سے کوئی کام نہیں کرتے۔ ہر کام کے لئے نوکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایرانی سرمایہ داروں میں آپ کو کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا جو امریکی سرمایہ دار کی طرح ضرورت کے وقت آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جائے۔ جنگ کے زمانہ میں جب ایران میں امریکی فوجوں کے افسر راستے میں خود اپنی موٹر درست کرنے لگتے تو اس منظر سے ایرانی شرفار کو حیرت ہوتی تھی۔

جب زرتشتی تعلیمات پر نظر پڑتی ہے تو جسمانی محنت اور ہات سے کام کرنے سے شرفائے ایران کی یہ بیزاری زیادہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے، زرتشتی تمدن میں محنت و مشقت پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ہل چلانا، کنواں کھودنا، کاشت کرنا، درخت لگانا اور مویشی پالنا بلند انسانیت کا ثبوت تھے، زند اوستا میں لکھا ہے کہ "جو محنت و توجہ سے زمین بوتا جوتتا ہے وہ ایسا ذخیرہ اکٹھا کرتا ہے جو دس ہزار عبادتوں سے افضل ہے!" راستگوئی اور مویشیوں کی خدمت اونچے درجے کی نیکیاں تھیں۔ آج کی ایرانی زندگی میں اس ضابطۂ اخلاق کی طرف سے بے اعتنائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میرے تہران پہونچنے کے چند ہی دن بعد ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے ایرانی نے مجھ سے کہا:-

"ایرانیوں کے متعلق پہلے تمھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں!"

"تم تو جھوٹے نہیں؟" میں نے مذاقاً کہا۔

"میں ایک ایرانی ہوں!" اس کا بلیغ جواب تھا۔

"یعنے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

اس نے کہا: "اگر تم اس کو سمجھنا ہی چاہتے ہو تو تمھیں ہماری قومی تاریخ پڑھنا چاہئے۔ زمانۂ تاریخ میں ایرانی قوم نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، بڑے بڑے فاتحوں، غیر ملکی مدبروں اور خود ایرانی حکمرانوں نے قوم کو اتنا رگیدا ہے کہ تحفظ ذات کے لئے جھوٹ سے کام لینا ایک فطری اور موثر حیلہ بن گیا ہے۔ تم شاید مجھ سے اتفاق نہ کروگے، لیکن اگر ایرانی شاہنشاہوں کے مفتوح ہو جانے اور ایران پر عربوں کے قابض ہو جانے کی تاریخ کا مطالعہ کر لوگے تو میرے ہم خیال بن جاؤگے۔"

تعلیمیافتہ ایرانیوں میں میں نے یہ قابل تعریف خصوصیت پائی کہ وہ اپنی قومی کمزوریوں کے اعتراف میں تامل نہیں کرتے۔ اور اس اعتبار سے ایرانی تمام مسلم قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ حکومت ایران کے اقتصادی مشیر A. C. MILSPAUGH نے ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر علی دشتی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

"ہمیں خود ستائی کا مرتکب نہ ہونا چاہئے اگر کسریٰ نے کسی عہد میں ساری دنیا فتح کر لی تھی تو کیا، آج تو

لت یہ ہے کہ جتنے غدار، وطن فروش ایران میں ملیں گے کسی دوسری قوم میں نہیں ملیں گے اور جس طرح ایران میں
سے لوگ قانون کی زد سے محفوظ ہیں ویسے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہونگے!"

ایران کی سیاست میں ریشہ دوانیوں اور دروغ بافیوں نے ایران کے سنجیدہ لوگوں کو اس قدر بیزار
دیا ہے کہ مجلس کے ایک ممبر نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ "میرا کتا البتہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا!"

میری ملاقات ایران کے سب سے پڑھے لکھے افراد اور یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ہوئی اور مجھے یہ
سوس ہونے لگا کہ یہ سب زرتشتی ضابطۂ اخلاق کو زندہ کرنے کے کتنے متمنی ہیں۔ ایک اہل قلم نے ایکبار کہا کہ:

"ہماری قوم جب ہی عظمت پا سکتی ہے جبکہ ایکبار پھر زرتشت ہمارے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے لگے!"
ں نے کہا:۔"لیکن امتداد وقت کے ساتھ زرتشتی اصول میں بھی تو فرق آگیا تھا!"

اس نے جواب میں کہا:۔

"صحیح کہ ایسا ہوا، لیکن گرا ہوا مکان پھر سے تعمیر کیا جا سکتا ہے: زرتشتی ضابطہ اخلاق ہمارا "ایرانی مکان"
ا، ہماری اچھائیوں کا "ایرانی مندر" تھا، جسے ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا تھا، اور اس روحانی مسلک
، بنایا تھا جو ہمارے ہی ملک کا تھا۔ عربوں کی طرح ہم صحرائی انسان نہ کبھی تھے اور نہ آج ہیں ——
سلام کے اندر بڑی خوبیاں ہیں، لیکن ان خوبیوں کے باوجود اسلام بدویوں کا مذہب ہے۔ ہمارے وہ
عرا بھی جو بڑے سخت مسلمان تھے (جیسے نظامی، سعدی) زندگی کے بڑے شیدا اور رومان کے متوالے
،۔ وہ اسلامی تقشف کو قبول نہیں کر سکے، ان کی روح ایرانی روح تھی!"

ایران کی سماجی زندگی میں بعض اور بھی خرابیاں ہیں جن کے ذکر سے آجکل کے مغربی سیاح کو بہت دکھ
پہنچتا ہے۔ مثلاً "آپ میرے گاؤں آئیے!" یہ جملہ میں نے ایک ایرانی زمیندار سے اپنے پہلے سفر ایران کے
ران ۱۹۴۲ء میں سنا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "آپ کتنے گاؤں کے مالک ہیں؟" ۔ "میں بائیس گاؤں
مالک ہوں!" یہ جواب دیتے وقت میں نے محسوس کیا کہ اس ایرانی زمیندار کو کسی قسم کی ناخوشگواری یا
ئی کا احساس نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ ایران میں غلامی کا رواج نہیں ہے اور زراعتی پیداوار کی طرح
انوں کو فروخت نہیں کر دیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اسی فیصدی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے۔ اس لئے اسکے
ر "ملکیت کا شعور" جڑ پکڑ گیا ہے۔ ایرانی کسان جہاں چاہے جا بھی سکتا ہے اور تعلیم پاکر اونچے سے اونچے
بے تک پہونچ بھی سکتا ہے، لارڈ کرزن نے اپنی قابل ذکر کتاب میں لکھا ہے کہ "اس اعتبار سے ایران دنیا
رمیں سب سے زیادہ جمہوری ملک ہے کہ وہاں اونچے نیچے کی تفریق مطلق نہیں ہے اور ہر شخص ذاتی جوہر
بنیاد پر بڑے سے بڑا رتبہ پا سکتا ہے۔" رضا شاہ کی ذات خود اس کا ثبوت ہے، لیکن ایران کا دیہاتی

اپنی تمام نارسائیوں کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑتا، اور یہ جبر بھی برداشت کرلیتا ہے کہ پارلیمنٹ کے چناؤ میں زمیندار کی مرضی کے مطابق ووٹ دے۔ مغرب کے مفہوم میں یہ بات اصول جمہوریت کے منافی ہے۔

میری آخری سیاحت ایران ۱۹۴۹ء میں ہوئی، اور میرے وہاں پہونچنے کے فوراً بعد میرے ایک ادیب دوست نے مجھے شوقیہ ڈراما کرنے والوں کے ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ ہم تھیٹر میں بیٹھے پردہ اُٹھنے کا انتظار کررہے تھے، میرے دوست کا ایک دوست جو نہایت اعلیٰ انگریزی بولتا تھا، ہمارے پاس آیا اور مزاج پُرسی کے بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑاکر تماشائیوں کو دیکھا جو بالعموم پستے کھارہے تھے، اور کہنے لگا "یہ سب تیسرے درجے کے لوگ ہیں!" اس کا یہ کہنا نفرت وحقارت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس کا مقصود مجھے یہ بتانا تھا کہ اول درجے کے ایرانی ایسے بدتمیز نہیں ہوتے جو تھیٹر میں پستے کھاتے رہیں۔ بایں ہمہ، اس کا یہ کہنا میرے لئے خاص معنے اور اہمیت رکھتا تھا۔ ایران میں اگرچہ ہندوستان کی طرح نیچے اونچ نہیں ہیں لیکن اول درجے اور تیسرے درجے کے لوگ ایرانی سماج میں بھی ہیں۔ دوسرے درجے والے اول تو وہاں ہیں نہیں اور اگر چند نفوس ہیں تو وہ آسانی سے اول یا تیسرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی سماج میں درمیانی کڑی غائب ہے۔

تہران کافی بڑا شہر ہے مگر وہاں بڑی اور نازک چیزیں نہیں بنتیں، وہاں کی فیکٹریاں بھی ایسی چیزیں طیار نہیں کرتیں۔ صنعتی پیداوار کا بڑا حصہ ہاتھوں اور سادہ اوزاروں سے طیار کیا جاتا ہے۔ ایرانی دماغ فوری ضرورت کے لئے بہت سی چیزیں نہایت خوشنا وضع کی طیار کرسکتا ہے۔ حرفت و دستکاری کا شوق اور مستقل مزاجی ایرانی کاریگر کے مخصوص اوصاف ہیں۔ نئی بسوں کی "باڈیز" بھی ہاتھ ہی سے بنائی جاتی ہیں چاندی اور دوسری دھاتوں کی چیزوں پر باریک قسم کی نقاشی، قالین بافی اور چوب کاری کی نزاکتیں خیابان لالہ زار کی دوکانوں میں بکثرت دیکھی جاسکتی ہیں جو سچ مچ حیرتناک ہیں — پُرانا ایران اہل حرفہ اور دستکاروں کا ملک تھا اور دُنیا میں مشہور تھا۔ نیا ایران بھی دستکاروں ہی کا ملک ہے اور اگرچہ پرانی عظمت و شان کے ساتھ بہت سے فنی تصورات ختم ہوگئے ہیں مگر اصفہان کے ساداری، شیراز کے نقرئی ظروف اور قالین آج بھی دُنیا میں بے مثل سمجھے جاتے ہیں — ایران کی پیداوار بیشتر مضبوط اور چست چالاک ہاتھوں کی مرہونِ منت ہے۔ ایک امریکن افسر نے خوب کہا کہ "تین چوتھائی ملین ایرانیوں میں سے ساڑھے سات لاکھ ایرانی صرف اپنے لئے تجارت کرتا ہے۔ خیابان لالہ زار میں دوکانیں بہت ہیں مگر ڈپارٹمنٹل اسٹور کوئی نہیں ہے۔ کاریگر بوڑھے بچے چیزیں طیار کرکے زیادہ تر خود ہی بازار میں لاتے اور فروخت کرتے ہیں۔

قاہرہ میں شاید اس وجہ سے کہ وہاں غیرملکی آبادی زیادہ اور ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے، غیرملکی کتابوں

کی دکانیں ... مگر تہران میں بہت ہیں، تہران میں بڑی آبادی کے باوجود چند ہی دکانیں ملیں گی جہاں
غیر ملکی مطبوعات مل سکیں، ایران میں جبری و لازمی تعلیم کا قانون جاری ہے لیکن یہ عام تعلیم کاغذ کی حقیقت نہیں،
کل کی آمدنی ہے، وزیر تعلیم ڈاکٹر صادق کے قول کے مطابق ۱۹۳۶ء میں ساڑھے تین لاکھ سے کم بچے اسکولوں میں
جاتے تھے اور بارہ لاکھ سے کم نہیں جاتے تھے،

ایران کی روز بروز صحافی میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار اطلاعات ہے لیکن اس کی اشاعت بھی تیس ہزار سے
زیادہ نہیں، چار ہزار کی اشاعت والا اخبار بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے،

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ غیر ملکی علمی مطبوعات کا بھوکا ہے، اور افسانوی ادب سے لگاؤ نہیں رکھتا،
(GONE WI THE WIND) ایک ناول ایسا ہے جو دوسرے ملکوں کی طرح ایران میں بھی نہایت مقبول
ہے، تقریباً پچھتر سال ہوئے جب ناصر الدین شاہ قاچار نے یورپ کا سفر کیا تھا، اسوقت سے یورپ خاصکر فرانس
کے مشہور و مستند لکھنے والوں کے تقریباً دو ہزار ناول فارسی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں، پڑھا لکھا ایرانی یورپی اہل قلم
کی حقیقت نگاری کا شیدا ہے، اور زندگی کی یہ ترجمانی اس کے ذہن و خیال کو مسحور کر لیتی ہے، اس لئے اس کا مطالعہ
وسیع ہوتا رہتا ہے، ایرانی نوجوان عقل کی پختگی کے بعد تخئیلی ادب سے ہٹ کر سنجیدہ علمی مطالعے کی طرف مائل ہو جاتا ہے
میں نے ایک مشہور ایرانی سے سوال کیا کہ "ایرانی تعلیم یافتہ طبقہ فلسفہ و نفسیات کے مطالعہ کا اتنا شایق کیوں ہے؟"
اس نے جواب دیا "اس لئے کہ ہم ہنوز سیکھ رہے ہیں، ابھی تک صداقت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، نئی
اور پرانی دونوں صداقتوں کیلئے!" ہر ایرانی اپنے قدیم شعرا اور پیشوایان مذہب کا احترام کرتا اور اُن پر نازاں
ہے، ہر ایرانی کلاسیکی شاعری کے وہ حصے جن میں قومی کردار کو سراہا گیا ہے اکثر گنگناتا رہتا ہے، مائیں بچوں کو
لوریاں بھی ایسی ہی شاعری کی سناتی ہیں، اچھی قسم کے گپ خانے (چائے خانے) صرف شہروں میں نہیں دیہات میں
بھی ہیں، قصہ خوان نوکر رکھے جاتے ہیں، جو لوگوں کو ایرانی شجاعت و بہادری کی داستانیں اور ایرانی فخر و سربلندی
کے افسانے سنایا کرتے ہیں، ایران ایک ایسا ملک ہے جہاں کلاسکی شاعری سب سے بیش قیمت قومی ورثہ سمجھی جاتی ہے اور
یہ جذبہ اعلیٰ و ادنیٰ دونوں طبقوں میں یکساں پایا جاتا ہے، لیکن نئی نسل کا ایرانی اس شاعری کے اعلیٰ جذبات و اشعار
تصورات سے مطمئن نہیں کیونکہ اس شاعری میں قومی عظمت و ترقی کا نشان اسے نہیں ملتا، ایران کی نئی نسل کو شدید
احساس ہے کہ نیا زمانہ بڑی طاقت ہے، اور اس کے بیک وقت عذاب بھی ہے اور بشارت بھی، نیا ایرانی حیرت
و بیگانگی کے ساتھ کلاسیکل ... کا فلسفہ بھی پڑھتا ہے، کیونکہ وہ اس نئے زمانہ کو سمجھنا چاہتا ہے، نیا ایرانی نئے
زمانہ کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ اسے یقین ہو گیا ہے کہ اسے نہ تو اس زمانہ سے مفر ہے اور نہ وہ اسے بدل سکتا ہے
[illegible] چاہتا ہے

دوسرا باب

عقل و دانش کا مسکن

صوبہ فارس کی راجدھانی شیراز ایرانی قوم کا محبوب و عزیز ترین شہر ہے، اور عقل و دانش کا مسکن سمجھا جاتا ہے، یہی وہ علاقہ ہے جسے ایرانی قوم کا گہوارہ کہنا چاہئے، ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کے احترام و محبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے لوگ آپس کی بات چیت میں تہران، اصفہان و ہمدان وغیرہ کی عیب جوئی تو کر سکتے ہیں لیکن شیراز کا نام بے ادبی سے لینے کی جرات کوئی نہیں کر سکتا، ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کا احترام و اعزاز ایک معبد کی طرح ہے، اور اس کی اس تکریم و تحریم کا راز شیراز کی ادبی روایات سے وابستہ ہے،

ایران کی سب سے زیادہ مقبول و محبوب شاعر سعدی و حافظ تھے، جو اسی سرزمین میں دفن ہیں جن کے مزار آج صدیاں گذر جانے کے بعد بھی زیارت گاہ عوام ہیں، یہ دونوں مقبرے ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں، لوگ صاحب مزار سے عقیدت کی بناء پر اور اس جگہ کو بہترین تفریح گاہ سمجھ کر جاتے ہیں جمعہ کے روز ہجوم زیادہ ہوتا ہے اور جابجا قالینوں کے فرش پر بیٹھے لوگ سماوار میں چائے دم کرتے، فنجان کے دَور چلتے اور تار و رباب پر کلاسیکی غزلیں گاتے اور سنتے ہیں، میری گاڑی والے نے بتایا کہ "یہاں تو جمعہ کے روز آیئے، !"

سعدی و حافظ کی طرح تیسرا محبوب و مقبول شاعر خیام ہے، میں شیراز کے ہوٹل سعدی میں ٹھہرا تھا، ہوٹل کے ڈرائنگ ہال میں کسی ایرانی کی قلم کاری کا نتیجہ خیام کی ایک تصویر ٹنگی ہے، اس تصویر میں خیام کو ایک سفید ریش بوڑھا دکھایا گیا ہے جس کا عمامہ بھی سفید ہے، لانبی عبا پہنے ہے، سامنے بادۂ شیراز کی بوتل ہے اور بغل میں ایک دوشیزہ سیاہ گیسو لہرائے بربط کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے، ہم چند آدمی اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ایرانی بولا:-

"وہ تھا تو نیشاپور کی جو یہاں سے دور ہے لیکن خیام خود شیراز تھا!"

اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ شیراز عبارت ہے حسن و رومان سے، شیراز علامت و رمز ہے ذہن و دماغ کی، شیراز مجسمہ ہے زندگی کی خاشگی و نفاست کا، اور شیراز نام ہے شاعرانہ رموز و کنایات کا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ملایانہ فرمان فرمائی کے خلاف تقشف کی بغاوت نے شیراز کی صورت اختیار کر لی ہے!

تہران میں مجھ سے ایک تہرانی شاعر نے کہا تھا کہ اب تک تم جتنے ایرانیوں سے ملے ہو، شیرازی ان سب سے مختلف ہیں،" اور یہ بات سچ نکلی، میں شیراز پہنچا تو ایک جوان عمر تاجر سے بھی ملاقات ہوئی، تعارف ہوتے ہی اس نے مجھ سے سوال کیا کہ "کیا میں شعر کہتا ہوں" اور میرے انکار پر اسے حیرت بھی ہوئی، میرے سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شعر کہتا ہے، اس نے کہا:۔ "بلاشبہہ! شیرازی سب شاعر ہوتے ہیں!"

اس خیال کے مطابق ایک پڑھا لکھا شیرازی شعر نہیں کہتا تو یا تو وہ پڑھا لکھا نہیں ہے یا شیرازی نہیں ہے، سعدی و حافظ، ہر چند بہت مقبول و ممتاز ہیں، لیکن ایرانی قوم اپنے تمام شاعروں سے محبت کرتی ہے، خیام، فردوسی اور نظامی بھی بے انتہا مقبول ہیں، یہ سوال ہر سوچنے والے کے دماغ میں آتا ہے کہ ایرانی اپنے شعراء سے ایسی غیر معمولی محبت و عقیدت کیوں رکھتے ہیں، اس سوال کا جواب غالباً اس حقیقت کے اندر پوشیدہ ہے کہ ایرانی زندگی سے محبت کرتا ہے، اور اسلامی تقشف کو اس روح سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اور چونکہ ایرانی شعراء نے اپنے شعر میں ایرانی روح سمو دی ہے اور اسلامی تقشف سے بغاوت کی ہے اس لئے ایرانی عوام ایسے باغی شعراء اور ان کی شاعری کے شیدا ہیں، ایسے شعراء میں حافظ و خیام کا مرتبہ بہت بلند ہے،

ایرانی شاعری میں زندہ دلی و خوش باشی کو بہت سراہا گیا ہے، لیکن اس کے اندر سماجی مقصد اور روحانی ارتفاع کی تعلیم بھی دی گئی ہے، چنانچہ ایران میں جب بھی کوئی ترقی پسندانہ تحریک اٹھتی ہے تو حافظ کے اشعار اس تحریک کے نعرے بنتے ہیں، کیونکہ حافظ جس خوش باشی کی تعلیم دیتا ہے وہ چند منتخب لوگوں کی خوش باشی نہیں بلکہ عامۃ الناس کی خوش باشی ہے، وہ ہر انسان کو خوش و خرم دیکھنے کا آرزومند ہے،

شیراز کی آبادی ایک لاکھ ہے، افلاس ایران میں عام ہے مگر شیراز کی خصوصیت ہے، اس کے باوجود شیراز ایران کے تمام شہروں میں سب سے زیادہ زندہ دل شہر ہے، یہ ایران کا ادبی مرکز و فکری مستقر ہے، اس لئے وہاں کے جغرافیے نے بھی مدد کی ہے، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور شہر میں جدھر نکل جائیے تو قسم قسم کے وحوش و طیور اور خوبصورت درخت دیکھنے میں آئیں گے، شیراز کا محبوب آج بھی اتنا ہی حسین و دلفریب ہے جتنا حافظ کے عہد میں تھا، اور وہاں بلبل اب بھی پہلے ہی کی طرح خوش الحان ہے، شیراز کی سطح مرتفع، ہوا خوشگوار، مطلع صاف اور سورج چمکیلا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی کسی قوم میں شیرازیوں کی سی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور خودداری نہیں ملے گی، شیراز میں برقعہ پوش عورت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے، اصفہان و تبریز کی طرح شیراز کی عورتیں بھی بالعموم تعلیم سے بے بہرہ ہیں، اور ہر قسم کی روشن خیالی سے محروم ہونے کے باوجود برقعہ اوڑھنے پر راضی نہیں،

یہ عقیدہ عام ہے کہ شیرازیوں کا خون اب تک خالص اور بے میل ہے، چنانچہ شیرازی عورت کی خوبصورتی سارے ایران میں عدیم المثال ہے، اور ایک ایرانی کا یہ قول خاص اہمیت رکھتا ہے کہ:- "ان کو مغربی لباس پہنا دیجئے پھر دیکھئے!"

ہرچند شیراز میں افلاس بہت ہے لیکن اس افلاس نے شیرازیوں کے حسن و جمال کو متاثر نہیں کیا ہے، شیرازی عورت میلے کچیلے لباس میں بھی قمر طلعت نظر آتی ہے، اس کی غلافی سیاہ آنکھیں، سفید موتیوں سے دانت، اور باریک ترشے ہوئے خد و خال اور شگفتہ روئی اس کی خصوصیات ہیں،

شیرازی عورتیں بکثرت اور بلا تکلف دوکانداری کرتی اور سودا بیچتی ہیں، ایران کے دوسرے شہروں میں یہ بات نہیں ہے، میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت سودا بیچنے میں بے تکان سگریٹ پیتی جاتی ہے، راستہ اور بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں کو اس بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کرتی اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے سگریٹ کی فرمائش کرتی ہیں جس طرح یورپ کے بڑے شہروں میں،

شیراز کو اپنی قدیم عظمت اور ثقافتی سربلندی، اپنے دلفریب مضافات و ماحول، اپنے شہریوں کی خندہ روئی اور زندہ دلی کے باوجود ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کی خوش حالی و شادابی کا انحصار "آب رکناباد" پر تھا جو اب سوکھتا جا رہا ہے، تیس سال سے پہلے رضا شاہ کے حکم سے بندر بوشہر بند کر دیا گیا، یہ حکم گویا شیراز کو پھانسی کا حکم تھا، کیونکہ بندر بوشہر کی تجارت کا راستہ شیراز ہو کر تھا، رضا شاہ کو ایرانی اگر برا کہتے ہیں تو صرف اسی ایک قصور کی بنا پر، کہا جاتا ہے کہ بندر بوشہر پھر سے کھول دینے کے سوال پر غور ہو رہا ہے، گو رضا شاہ کے حکم سے شیراز کو یہ نقصان پہنچا، مگر دوسری طرف وہاں کے تاجروں اور زمینداروں نے رفاہ عام کے وہ کام بھی کئے جن کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی، شیراز کے بازار کشادہ و خوبصورت بنائے گئے اور وائرلس قائم کیا گیا، یہ وہاں کے پیسہ والوں کی عالی ہمتی کا نتیجہ تھا،

پورے صوبۂ فارس کی آبادی بیس لاکھ ہے، اور یہ علاقہ سب سے زیادہ زرخیز اور ہرا بھرا ہے، فارس کی سرزمین ہر قسم کی زراعت کے لئے موزوں ہے، لیکن آبپاشی مفقود ہے، رکناباد کی جگہ جو نئے کنوئیں کھدوانے کا انتظام کیا جا رہا ہے، ایک یورپی انجینیر نے پہلا کنواں کھدوا تو فی گھنٹہ میں ہزار

لین پانی دینے لگا، ایران کی عام پکار پانی کی ہے، حالانکہ زیر زمین پانی کا بڑا ذخیرہ موجود ہے،

شیراز کو بھکاریوں کا چھتہ کہنا مبالغہ کہنا، ایران کے دوسرے شہروں میں اپاہج اور ناکارہ لوگ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، مگر شیراز میں کنبے کے کنبے یہی پیشہ کرتے ہیں، بوڑھے جوان، عورت، مرد اور بچے ٹولیاں بنا کر مانگتے ہیں،

شیراز میں مزدوروں کی گنتی پچاس ہزار ہے جس میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے صرف دو ہزار ہیں سرکاری محکموں میں اگرچہ تین ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں مگر ان میں نصف تعداد فالتو ہے پینتیس ہزار ایسے ہیں جو گھروں میں رہ کر کوئی نہ کوئی چیز بناتے اور سد رمق حاصل کرتے ہیں، باقی دس ہزار سرکاری اطلاع کے مطابق بے روزگار ہیں،

شیرازی شعر و شاعری کے شیدا ہیں، لیکن اس ذوق و انہماک کے باوجود نوے فیصدی آبادی بے پڑھی لکھی ہے، سارے شہر میں صرف دو سینما ہیں اور ایک طائفہ شوقیہ ڈرامہ کرنے والوں کا ہے، یہ شوقین ڈراما کرنے والے سب کے سب جدید تعلیم یافتہ ہیں، شیراز میں اخبار تو آٹھ نکلتے ہیں، لیکن ان کی مجموعی اشاعت تیس ہزار سے زیادہ نہیں، روزانہ ایک بھی نہیں ہے، پوری آبادی کیلئے صرف دو ہائی اسکول ہیں، کالج ایک بھی نہیں، برٹش کونسل نے ایک اینگلو ایرانین انسٹی ٹیوٹ جاری کر رکھا ہے، اس کی لائبریری ممبروں کیلئے کھلی ہے، یہ تنہا ادارہ ہے جو جدید کلچر کی ترویج کر رہا ہے،

میرے شیراز پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہاں کے نوجوانوں نے جن کو جدید تعلیم ملی تھی میرے خیر مقدم میں ایک گارڈن پارٹی دی، یہ لوگ انگریزی یا فرانسیسی بخوبی بولتے تھے، اور یورپی رسم و قواعد سے پوری طرح واقف تھے،

میں خاموش ایرانیوں کا وسطی المشرق کی دوسری قوموں سے مقابلہ کرتا رہا، ایرانی جب دوستی کرتا ہے تو بہر نہایت دلکش طریق پر اور حیرت انگیز حد تک صاف بیانی سے کام لیتا ہے، فصاحت بیان ایرانی قوم کا جوہر مخصوص ہے، مگر اسی درجہ پر اس کی خود تنقیدی بھی ایک خصوصیت ہے،

اس شام کو میں نے جس پارٹی میں شرکت کی تھی، وہاں خوش باشی اور گپ زنی کے سوا کوئی بات نہ تھی لیکن اس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایران کی یہ نئی نسل ایک عدالت ہے بڑی بڑی شخصیتوں کے کردار و گفتار کی جانچ ہو رہی تھی اور بڑے بڑے عہدہ داروں کی بد اعمالیوں کی گرفت کی جا رہی تھی، دفعتہ یہ نوجوان مجسٹریٹ کہنے لگا،

آپ جانتے ہیں، میں ایک اچھا مسلمان ہوں مگر مسجد میں کبھی نہیں جاتا، اس لئے کہ مجھے ملا سے سخت نفرت

ہے" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگا "میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ترک وطن کا ارادہ کر رہا ہوں کیونکہ وطن کے اندر حالات سخت حوصلہ فرسا اور مایوس کن ہیں"

"کہاں جاؤ گے؟ میں نے پوچھا،

کہیں بھی، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ، کنیڈا یا آپ کے وطن!"

یہ نوجوان ایرانی دل شکستہ تھا، اور ایران میں ایسے بہت ملیں گے، بہت سے تو ترک وطن کر چکے ہیں اور بہت سے امید پر جی رہے ہیں، لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں بس چکے ہیں وہ بھی منتظر ہیں کہ کوئی عوامی تحریک اٹھے جس میں غیر ملکیوں کا ہاتھ نہ ہو تو وہ وطن واپس آ کر اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنا فرض ادا کریں،

تیسرا باب

(شہسواری کی طاقت)

ایران کے صوبہ فارس میں ایک پہاڑی علاقہ کاشغئی قبیلے کا مسکن ہے، یہ پہاڑی علاقہ (ایران کا نیپال) ہے، قبیلے کا خان یا سردار ناصر خان ہے، جو جدید قسم کی تعلیم سے ناآشنا اور غیر ملکی زبانوں سے بالکل ناواقف ہے اس کے تین بھائی اور ہیں، ایک بھائی حسین کاشغئی ایرانی مجلس کا ممبر ہے اور انگلستان و جرمنی کا تعلیم یافتہ ہے، انگریزی اور جرمن نہایت اچھی بولتا ہے، ایک ملاقات میں میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں شیراز جا رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ ساتھ ہی کاشغئی علاقے کی سیاحت بھی کر سکوں،

میں یہ سن چکا تھا کہ شاہ ایران کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی امریکن سیاح قبائلی علاقے میں جائے، اور شاہ نے یہ بات حسین اور دوسرے بھائیوں کے گوش گذار بھی کر دی تھی، میں حسین کشغائی سے اس بات کی تصدیق بھی کر لینا چاہتا تھا، کہ میرے دوران سفر میں سیاسی مداخلت تو نہیں کی جائے گی،

حسین نے شاہ ایران کی نارضامندی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا کہ "آپ کب جانا چاہتے ہیں، آپ کے سفر کا سب انتظام ہو جائے گا" یہ امر واقعہ ہے کہ طہران اور فیروز آباد (کاشغئی نظام کے مرکز) کے درمیان کچھ اس قسم کی دشمنی ہے کہ وہ جب ضرورت سمجھیں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیں اور جب بات چیت سے نتیجہ نہ نکلے تو توپ بندوق کی زبان میں گفتگو کرنے لگیں،

اس قبیلے کو دبانے کی رضا شاہ نے انتہائی کوشش کی تھی، اس وقت ان بھائیوں کا باپ زندہ تھا، سردار قبیلہ تھا، اس کو اور بڑے بیٹے ناصر خان کو جیل میں ڈال دیا تھا، باپ جیل میں مر بھی گیا، اور اس کے بھائی آج تک اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کے باپ کو زہر دیا گیا تھا، اس کا بدلہ کاشغئی قبیلے نے ۱۹۴۶ء میں اس طرح لیا کہ بغاوت کی اور حکومت کی فوجوں کو زیر کر لیا، وجہ یہ تھی کہ صوبہ فارس میں فوج کی تعداد زیادہ نہ تھی اور جتنی تھی وہ زیادہ طاقتور نہ تھی کاشغئی جنگجو شہر اور خلیج فارس کا علاقہ فتح کر کے شیراز پر بڑھنے والے تھے

گر شیرازیوں کی اصلاح وزاری پر رحم کر کے قبضہ اٹھالیا،

ایک ذمہ دار کاشغئی لیڈر نے بتایا کہ یہ جنگ اس مطالبہ کے لئے کی گئی تھی کہ آذربیجانی باغیوں کا قلع قمع کیا جائے اور صوبہ فارس میں کاشغئی قبیلے کو خاص رعائتیں دی جائیں، کاشغئی باغیوں کی ہر کامیابی سے نوجوان شاہ کو صدمہ ہونا قدرتی بات تھی، اور ایرانی فوج کے جرنیلوں کے لئے ذلت کا موجب تھا، اسی لئے تازہ کمک بھیجی جاتی تھی، اور ممکن تھا کہ باغیوں کی سرکوبی اس طرح ہو سکتی، مگر کسی خاص وجہ کی بنا پر ارباب حکومت نے مصالحت کر لینا ہی بہتر سمجھا،

غرض حسین کاشغئی نے ایک ذمہ دار آدمی میرے ساتھ کر دیا اور ہم فیروز آباد کے سفر پر روانہ ہو گئے، پہاڑی راستہ دشوار گذار تھا، اور ہماری موٹر کو ایسے موقعے بھی پیش آئے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، جب میں فیروز آباد پہنچا تو محسوس ہوا کہ میں ہزاروں سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں، اور جدید دنیا خواب و خیال بن گئی ہے،

یہ علاقہ سورج کی گرمی سے جھلسا ہوا بیابان ہے، اور جہاں تہاں خیموں اور چھولداریوں کی بستیاں اور بھیڑوں کے گلے ہیں اور یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہیں، اونچے پہاڑوں کے بیچ میں وسیع وادی کا یہ علاقہ قبیلے کے بانی نے غالباً جنگی مصلحتوں کی بنا پر منتخب کیا ہوگا، اس علاقہ پر اچانک حملہ ہو جانا ناممکن ہے، کاشغئی لوگوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے، یہ لوگ بلا کے جفاکش، بے مثل شہ سوار اور غضب کے نشانہ باز ہیں، ان کا رہنا سہنا خیموں کے اندر ہے، اور قالینوں کا فرش ان کا انتہائی تعیش ہے، ان لوگوں کو قدامت سے عشق ہے، اور جدید تمدن کی ہر چیز سے نفرت، یہ لوگ جتنے قدامت پرست ہیں، اتنے ہی دلکش بھی ہیں، جس شدت کے ساتھ وہ بیرونی دنیا سے بیزار ہیں، اتنے ہی اپنے عقیدوں یا محاسن پر مصر ہیں، جاڑوں کے موسم میں یہ لوگ اپنے اونٹوں، گدھوں اور بھیڑوں کو خلیج فارس کے علاقہ میں لے آتے ہیں اور گرمیوں میں شمالی علاقہ میں لے جاتے ہیں، گویا وہ بارہوں مہینے سورج کی روشنی میں رہنا چاہتے ہیں،

میں نے جب پہلی بار ان لوگوں کو اپنے تیز اور چنچل گھوڑوں پر سوار دیکھا تو میں خیال ہوا کہ یہ لوگ بنے ہی سپاہیانہ زندگی کے لئے ہیں، ہر چھوٹے بڑے کے کاندھے پر بندوق لٹکتی نظر آئی، [illegible] کاشغئی لوگوں [illegible] کا شکاری ہے، ان کی شہسواری روسی کاسکوں کی یاد دلاتی ہے، ہر گھر میں کم سے کم ایک بندوق اور ایک گھوڑا ضرور ہونا چاہیے،

ان لوگوں کی زبان فارسی نہیں بلکہ ترکی ہے، مگر ایران پرستی میں یہ لوگ اپنے تئیں کسی ایرانی سے کم نہیں ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ الگ تھلگ زندگی گذارتے ہیں، اس لئے ایران کے لوگ ان کو [illegible] ایرانی

کہتے ہیں، اور اس سے کاشغئی خفا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حکومت تہران انھیں غیر مسلح کرنا چاہتی ہے، جس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو بھی چکی ہے مگر یہی بات اس کے لئے دردِ سر بھی بن گئی ہے۔

کاشغئی نہ تو وحشی ہیں اور نہ انھیں غیر مہذب کہا جا سکتا ہے۔ تعلیم بالکل نہیں لیکن حد درجہ متواضع و خلیق ہیں۔ بات بہت دھیمے لہجے میں کرتے ہیں جو متمدن سماج میں کمال شائستگی کا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔

میرے لئے بڑے بھائی ناصر خاں کا مکان کھولدیا گیا۔ وہ خود تہران میں تھا۔ گھر کوئی تواضع ایسی نہ تھی جو اُٹھا رکھی گئی ہو۔ یورپ کی شرابیں بھی فراہم تھیں۔

میں اکثر ان لوگوں کی خیموں کے کیمپوں میں چلا جاتا تھا۔ عورتیں غیر ملکیوں سے بھی پردہ نہیں کرتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو کامل آزادی حاصل ہے، وہ شہسواری بھی کرتی ہیں۔ البتہ خانگی مصروفیات کی بنا پر شکار کو نہیں جاتی ہیں، ان عورتوں کی خود اعتمادی انتہا کی ہے اور پوری مسلم دنیا میں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں اور عام ایرانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کاشغئی تہذیب ایران کے گم شدہ تمدن کے صحیح نشانی ہے۔ میں نے ان کی عورتوں کی آزادی، خود اعتمادی اور مردوں سے مساوات دیکھ کر ایک کاشغئی سردار سے کہا:۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ مسلم عورتیں ہیں!"

اس نے اپنی زبان میں میرا خیال ان عورتوں کو سنایا جو اس وقت وہاں موجود تھیں اور ایک شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھیں وہ سب قہقہہ مار کر ہنس دیں۔

کاشغئی اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ کٹر مسلمان بھی ہے اور یہ لوگ اپنے ایمان و عقیدہ کے لئے جان تک قربان کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے یہاں مُلّا کی دو کان نہیں لگنے دی، اسی لئے مذہبی تقشف ان میں نہیں پایا جاتا۔ کاشغئی لوگ عام طور پر پڑھ لکھ نہیں سکتے، مگر قرآن ضرور گردن میں حمایل ہوگا کیونکہ اس کی برکت سے بلائیں رد ہوتی ہیں۔ شراب بالکل نہیں پیتے۔

اسلام میں چار بیویاں تک جائز ہیں، مگر ان میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے والے شاذ ہوتے ہیں اور حقارت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسلام میں عورت کا نکاح ثانی ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی لڑکیاں غیر کاشغئی سے نہیں بیاہتے کیونکہ وہ طلاق دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذلت کی بات ہے۔ چنانچہ اس قوم میں طلاق بھی اتنی ہی شاذ ہے جتنی ایک سے زیادہ بیوی رکھنا۔ اس قبیلے کے سردار چار بھائی ہیں لیکن انمیں سے صرف ایک شادی کاشغئی عورت سے ہوئی ہے۔

لڑکی کی شادی بالعموم سولہ سال سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے، مگر مرد شادی میں جلدی نہیں کرتے

کیونکہ یہ لوگ شادی کو ایک قسم کا قید و بند سمجھتے ہیں - ایک کاشغئی نے مجھے بتایا کہ :-

"آدمی یا تو بیوی کا انتخاب کرے یا بندوق کا"

ایک موقع پر میں اپنے کاشغئی رہنما کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک جگہ شادی کی تقریب نظر آئی - میرے ساتھی نے بلا محابا بھیڑ کے اوپر بندوق کے دو فیر کئے - میرے حواس گم ہوگئے - مگر میں نے دیکھا کہ وہ قہقہے لگا رہا تھا - خوشی کے موقعہ پر ان لوگوں میں بندوقیں داغی جاتی ہیں -

کاشغئی عورتیں بھی دوسری مشرقی عورتوں کی طرح شوخ رنگوں کو پسند کرتی ہیں اور اس کوہستانی پس منظر میں ان کے رنگ برنگ سربند اور لباس بہت دلکش معلوم ہوتے ہیں -

سارے ایران میں کاشغئی لوگوں کی تندرستی بہترین ہے - یہ علاقہ ٹائیفائڈ، چیچک اور ملیریا کی بلا سے محفوظ ہے - دق کا مرض البتہ ہے جو وہاں کے جغرافیہ اور آب و ہوا کا نتیجہ ہے - ان لوگوں میں اعصابی اور دماغی مریض سنے نہیں گئے حالانکہ جدید تمدن میں ایسے مریض ہر جگہ ہوتے ہیں - ان لوگوں کی غذا سادہ ہوتی ہے - اور ان کی ضروریات محدود ہیں - چائے - شکر ان کی سب سے بڑی عشرت ہے جو مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے -

ایک کاشغئی خان سے میں نے پوچھا کہ کیا ان کے قبیلہ میں خودکشی کے واردات ہوتے ہیں ؟ وہ میرے سوال پر حیران رہ گیا اور بولا کوئی خودکشی کیوں کرتا ہے ؟ محبت میں ناکام رہنے یا زندگی کے ناقابل برداشت ہو جانے پر - ہمارے یہاں نہ تو پہلی صورت ہے نہ دوسری - اگر کوئی کاشغئی مصیبت میں پڑ جائے تو سب مل کر اس کی مدد کرتے ہیں اور اسے بھوکا نہیں مرنے دیتے - زندگی میں انتشار و بے حوصلگی مشینی تمدن کی خصوصیت ہے، مگر کاشغئی قوم اس سے متاثر نہیں اس لئے انتشار سے بھی واقف نہیں ہے"

اس قوم کی جنگجویانہ مصروفیات کی بنا پر امریکی مشیر نے حکومت ایران کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں جنڈرمہ کے افسری اسکول میں داخل کیا جائے - اس تجویز کی تہ میں یہ بات تھی کہ پہلے پولس اور پھر فوج میں کاشغئی لوگوں کا داخلہ قومی دفاع کو مضبوط بنائے گا - لیکن ایرانی جرنیلوں نے اس اسکیم کو خطرناک سمجھا کیونکہ کاشغئی قبیلہ خاص طور پر ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے - لیکن یہ لوگ اپنی جگہ خود ایک فوج ہیں اور اپنی جنگی طاقت کو قایم رکھتے ہیں -

میرے قیام شیراز کے زمانہ میں، ایک نامور و قدیم خاندان کے فرد نے مجھے اپنے باغ میں چائے کی پارٹی دی - اس باغ کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ ایران اپنے باغات پر کیوں فخر و غرور کرتا ہے - یہ پارٹی نہایت پُرلطف و دل خوش کن صحبت تھی - ایرانی قوم نہایت مہذب و شائستہ ہے، ان کی صحبت نہایت پُرلطف

ان کا طرزِ ماند و بود نہایت نفیس، ان کی فطرت جمال پرستی اور گفتگو ذہین و ژرنگ ہے! جب میں اس پارٹی سے واپس ہوا تو چند لوگ مجھے ہوٹل تک پہونچانے آئے۔ موٹر میں انھوں نے ذکر کیا کہ جلسہ سے چند گھنٹے قبل میزبان کے یہاں ڈاکہ پڑا تھا۔ لیکن میزبان نے مہمانوں کی دلداری کے خیال سے پارٹی کو ملتوی نہیں کیا۔ قبایلی لوگ ایسا اکثر کرتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں نہ اسپتال ہیں نہ ڈاکٹر، نہ اسکول ہیں نہ ریڈیو۔ اور نہ کہیں سینما ہے۔ عام حالت یہ ہے کہ خوش حال کاشغئی معلم رکھ کر اپنے لڑکوں کو تعلیم دلاتے ہیں، لڑکیوں کے لئے تعلیم غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کاشغئی بھی شاعری کے اتنے ہی شیدا ہیں جتنے دوسرے ایرانی۔ شاہنامہ ان کی مقبول کتاب ہے اور اس کے حصے جو شجاعت و قوم پرستی کے جذبات اُبھارتے ہیں، ہر کاشغئی کو زبانی یاد ہیں۔ ایک سال پہلے حکومت تہران کی فوج سے مقابلہ ہوا تھا تو کاشغئی عورتوں نے شاہنامہ کے اشعار سُنا سُنا کر کاشغئی جنگجویوں کو جنگ پر اُبھارا تھا۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:-

" ان لوگوں (کاشغیوں) کی رات جب اوپر چاند اور تارے چمکتے ہوتے ہوں اور نیچے ریگستان میں جہاں تہاں چولھوں کی آگ روشن، بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ مجھ جیسے سیاح کے لئے ان لوگوں کی زندگی میں بڑی کشش پائی جاتی ہو ایک آزاد زندگی، زمین سے محبت، فطرت سے قریبی تعلق، جدید تمدن کی الجھنوں سے بے تعلق، مختصر و سادہ ضرورتیں! کس قدر دلچسپ باتیں ہیں، لیکن آج کی دُنیا، سائنس اور مشین کی دُنیا، تمام اقوام کو متاثر کر رہی ہے اور کر کے رہے گی۔ آج بھی دُنیا میں زبردست قوم زیردست پر جبر و تشدد کر رہی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کاشغئی اور ایران کے دوسرے قبایل کب تک الگ تھلگ رہ سکیں گے!

صحیح اعداد و شمار موجود نہیں مگر اندازہ کیا گیا ہے کہ ایران کی ایک کرور ساٹھ لاکھ کی آبادی میں تیس چالیس لاکھ کے درمیان قبایلی ہیں اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ متمدن و پُرامن زندگی کے راستے پر ڈالے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خانہ بدوشی میں مست ہیں۔ آج حکومت اور قبائلیوں کے درمیان جنگ نہیں ہے، لیکن اسے امن کی حالت بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ قبایلی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ فوجی خدمت کے لئے نہایت مناسب ہیں لیکن حکومت ان پر اعتبار نہیں کرتی۔ ملک کے اندر رشوت کا بازار گرم ہے اور بیرونی طاقتیں بین الاقوامی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ اس لئے حکومت تہران کے خلاف ان قبایل کو بغاوت پر آمادہ کر لینا دشوار نہیں ہے۔

البتہ اعلیٰ تدبر کی پالیسی اس خلیج کو پاٹ سکتی ہے جو تہرانی حکومت اور قبایل کے درمیان حایل ہے

اگر ان کی جنگی اسپرٹ سے اپیل کی جائے تو قبایلی لوگ وفادار فوجی بن سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فوجی افسر اپنے ماتحتوں پر جبر کرنے اور ان سے رشوتیں لینا چھوڑ دیں۔

کاشغئی علاقے سے واپسی پر تہران میں میں نے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ قبیلہ ناصر خاں سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ اپنے قبیلے کے مستقبل کے متعلق اس کا کیا خیال ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ:-

"آپ ہمارے علاقہ میں گھوم کر آئے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقی تمام ایرانیوں کے مقابلے میں ہم لوگ بہتر زندگی گزار رہے ہیں، ہم آزاد ہیں، ہم نے اپنی عورتوں کو دبا کر نہیں رکھا ہے، ہماری صحت سارے ایرانیوں سے بہتر ہے۔ ہمیں نہ زمیندار کا ڈر ہے نہ جندرمہ کا خوف! جب ہمارا ملک ایران ترقی کی اس منزل پر پہونچے گا کہ تمام کاشتکاروں کے پاس فولادی ہل ہوں، دیہات میں بجلی پہونچ جائے، ڈاکٹر دستیاب ہونے لگیں، اسپتال کافی بن جائیں، لوگوں کے رہنے کو مناسب مکان ملیں، پینے کو صاف اور عمدہ پانی ملے اور پولس کے جبر و تشدد کا خاتمہ ہو، اس وقت کاشغئی خانہ بدوشی ترک کرنے پر سوچ سکے گا۔"

میں نے اسے توجہ دلائی کہ:-

"آپ مانیں گے کہ کاشغئی لوگ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں جتنا وہ کر رہے ہیں، اور ان کی بڑی قوت ضایع ہو رہی ہے، انھوں نے مویشیوں کے چرانے کے لئے لاکھوں ایکڑ آراضی کو چراگاہیں بنا رکھا ہے جہاں غلہ، پھل اور ترکاریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح اس پر بھی غور کیجئے کہ صحیح علاج دستیاب نہ ہونے سے کتنے مویشی ضایع ہو جاتے ہیں!"

اس نے کہا:- "میں مانتا ہوں کہ مویشی کے علاج کے لئے ہم کو سلوتری میسر نہیں ہیں، اور نہ صرف جانور بلکہ معالجہ نہ ہونے سے آدمی بھی ضایع ہوتے ہیں، لیکن ہمارے علاقہ میں کوئی بھکاری تو نہیں ہے۔"

ناصر خاں کی دلیلیں پختہ ہیں اور جھٹلائی نہیں جا سکتیں۔ لیکن جس طرح امریکہ کے قدیم باشندے نئی زندگی میں کھپ گئے ہیں، اسی طرح ایک دن کاشغئی اور دوسرے ایرانی قبیلے بھی خانہ بدوشی کو خیرباد کہدیں گے۔

مالہ وما علیہ

چوتھا باب

(چاول کا گاؤں)

ایک یورپی مصنف جس نے کافی مدت ایران میں قیام کیا تھا، کہتا ہے کہ :-

"ایرانیوں کو خلق و تواضع کی تعلیم درکار نہیں، یہ وہ ماں کے پیٹ سے ساتھ لاتے ہیں۔"

میری ایرانی سیاحت میں اس قول کی تصدیق ہر جگہ ہوئی، ایک بار میں ایک نوجوان ایرانی کے ساتھ جو کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا، بحر قزوین (اسپین) کے ساحلی علاقے کی سیاحت کو گیا۔ یہ علاقہ گیلان کہلاتا ہے۔

ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک مکان کے سامنے دو نوجوان لڑکیاں دھان کوٹ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کام روک دیا۔ کپڑے جھاڑنے اور چہرہ صاف کرنے میں لگ گئیں، بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی گاؤں کی لڑکیاں باہر کے لوگوں کے آجانے پر کرتی ہیں۔ سر کا رومال کھول کر جھاڑا اور پھر بال باندھ کر مسکراتے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ پھر چند بچے بھی آگئے اور انھوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایسے صاف ستھرے بچے میں نے کسی ایرانی شہر میں نہیں دیکھے تھے۔ ان سب بچوں نے ہمیں سلام کیا۔ غیر لوگوں کے آجانے سے ان کو بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی یورپ کے بچوں کو ہوسکتی ہے۔ ان بچوں کی آنکھوں میں روشنی اور چہرے پر بشاشت تھی، اور اجنبیوں سے مطلق مرعوب نہیں تھے۔

اس کے بعد ہی گھر کا مالک اندر سے باہر آیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی اور اس طرح ایرانی تہذیب کے مطابق ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بچوں کی ماں تھی۔ اس نے بھی بڑی خندہ روئی اور سنجیدگی کے ساتھ رسم سلام ادا کی۔ اور فوراً دونوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ اتنی دیر میں انھوں نے منھ ہاتھ دھوکر بال سنوار لئے تھے اور سر کے رومال خوبصورتی کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ یہ لڑکیاں ایک کرسی لیکر آئیں۔ یہ کرسیاں گھر کے اندر استعمال نہیں ہوتیں بلکہ جب روضہ خوانی ہوتی ہے تو اس وقت کام آتی ہیں یا کوئی مہمان آجائے تو استعمال کی جاتی ہیں۔

ماں نے چپکے سے ان لڑکیوں سے کچھ کہا اور وہ مسکراتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں۔ پھر واپس آکر مہمانوں کے سامنے ایک نے چھوٹی سی میز لگا دی اور دوسری نے چائے کی پیالیاں چن دیں۔ ہم مالک خانہ سے باتیں کر رہے تھے کہ اس کی بیوی اندر گئی اور ایک پلیٹ میں خربوزے کی قاشیں سجا کر لے آئی۔ اس قدیم رسم تواضع اور مہمانداری میں جذبات سے سوا بھی ایک بات ہے جو تخیل اور منطق پر مبنی ہے ساتھ کھانے پینے سے اجنبیت رفع ہو جاتی ہے، میزبان و مہمان کے درمیان ارتباط کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر قزوین کا یہ ساحلی علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ پھل اور گھنے سایہ دار درخت بکثرت ہیں۔ مکان کے صحن کی دیوار مٹی کی تھی اور صحن کے اندر بھی متعدد درخت تھے۔ یہاں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ بنے ہیں اور درمیان میں درختوں کی آڑ بھی پائی جاتی ہے۔

یہاں میں نے جس قسم کے مکان دیکھے، ویسے "نیم مہذب ملکوں" میں، کہیں نہیں دیکھے، عمارت کا سارا سامان مقامی پیداوار سے تعلق رکھتا ہے جو مفت یا بہت ارزاں مل جاتا ہے، یعنی مٹی، لکڑی اور پیال۔ ان دیہاتی انجینیروں کی تعمیری صلاحیت دیکھ کر، ایرانیوں کی تخلیقی محنت سے محبت کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ افلاس اور جہالت کے باوجود اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود اپنے ہی ہاتھ سے بنا لیتے ہیں ان کے مکان دوہرے ہوتے ہیں، ایک حصہ گرمیوں کے اور دوسرا سردیوں کے استعمال کے لئے۔ سارے کام ایک بڑے کمرے میں ہوتے ہیں۔ دوسرا کمرہ بالعموم سامان رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی کمرے میں کھانا پکتا ہے اور وہ دھوئیں سے کالا ہو جاتا ہے۔ میرے کہنے پر کہ دھواں آسانی سے نکالا جا سکتا ہے، بتایا گیا کہ دھواں قصداً مکان کے اندر رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ چاول کی طیاری میں کام آتا ہے۔

بحر قزوین کا یہ علاقہ نہایت زرخیز ہے مگر ملیریا کا گھر ہے۔ مکانوں میں چٹائیوں اور قالینوں کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ مجھے سارے ایران کی عورتوں سے زیادہ اس علاقے کی عورتوں نے متاثر کیا۔ گیلانی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان کے دانت غیر معمولی طور پر سفید، آنکھیں بادامی، پلکیں دراز، پتلیاں نیلی ہیں اور ان میں سے نکلنے والی نظریں زندہ محسوس ہوتی ہیں۔ بال زیادہ تر سنہرے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے ہر ایک سلیقہ مند ہوتی ہے۔ انھیں اپنی شخصیت کا بھی پورا احساس ہے اور یہ سب خصوصیات کے ساتھ وہ مسلم عورتیں ہیں۔

کاشتکاری کا سارا بار گیلانی عورت کے کندھوں پر ہے۔ کاشتکاری کا سارا کام بہت پرانے ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ ہل اب تک لکڑی کے ہیں۔ فصل کاٹ کر سروں پر اٹھا کر گھر لاتی ہیں۔ شاذونادر کسی کے پاس گھوڑا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں گاڑی ٹھیلہ کو کوئی نہیں جانتا۔

میں نے زمیندار کے کارندے سے سوال کیا کہ کیا اس علاقے میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا رواج ہے
اس نے بتایا کہ "ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کھیتی کے کام میں زیادہ سہولت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو البتہ وہ دوسری شادی کا خیال کر سکتا ہے۔"

میں نے سوال کیا کہ "اگر کوئی دوسرا نکاح کرے تو پہلی بیوی کیا کہتی ہے؟"

بولا۔ "وہ کوشش تو یہی کرتی ہے کہ دوسرا نکاح نہ ہو، میکے بھی چلی جاتی ہے، لیکن پھر آجاتی ہے۔"

میرے اس سوال پر کہ طلاقیں بھی ہوتی ہیں، اس نے جواب دیا:-

"بہت کم، بات اصل یہ ہے کہ گیلانی عورت بہت کام کرتی ہے اس لئے مرد ایسی غلطی کرتا ہی نہیں اور بہت نرمی برتتا ہے۔"

میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ:-

"گیلان بھر میں ایسا گاؤں کوئی دوسرا نہیں ہے، مقابلتہً یہاں کے کسان خوش حال ہیں۔" اپنے قول کی تائید میں اس نے ایک کچی سڑک کی طرف اشارہ کیا جو گاؤں کو بڑی سڑک سے ملاتی تھی۔ یہ کچی سڑک پگڈنڈی سے ذرا چوڑی تھی، یہ گاؤں کسی موسم میں شہر سے کٹ کر علٰحدہ نہیں ہوجاتا کیونکہ یہاں تک سڑک پائی جاتی ہے، اور آمد و رفت بارہوں مہینے جاری رہتی ہے۔ گیلان کے دوسرے گاؤں سڑک نہ ہونے کے باعث بعض موسم میں شہروں سے علٰحدہ ہوجاتے ہیں۔ پل نہ ہونے کے سبب سے جب ندیاں چڑھتی ہیں تو ذرائع آمد و رفت منقطع ہوجاتے ہیں اور اس زمانہ میں گاؤں والے طبی امداد اور معمولی دواؤں سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔

یہ سڑک اس گاؤں کے زمیندار نے بنوائی تھی اور اس وجہ سے لوگ اسے بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اس سڑک کے علاوہ گاؤں والوں کی خوشحالی کا ثبوت ان کے لباس سے بھی ملتا تھا، چند بچوں کے سوا میں نے کسی کو ننگے پاؤں نہیں دیکھا۔

گیلان میں بٹائی کا طریقہ رائج ہے۔ لیکن فصل کا آدھا غلہ دینے کے علاوہ کسان کو کچھ دوسری رعایتیں بھی حاصل ہیں۔ گھر کے ساتھ ایک باغچہ ہوتا ہے جس میں پھل اور ترکاریاں بوئی جاتی ہیں، ٹماٹر، کھیرے، خربوزے، لہسن، پیاز وغیرہ بوئے جاتے ہیں۔ اس کا لگان کچھ نہیں دینا پڑتا، پھر جنگلوں میں شکار بہت ہے اور کسان اپنی قرابین سے شکار کر لیتا ہے۔ کوئی ممانعت نہیں ہے۔

میں جس زمینداری میں گیا تھا اس کا مالک تہران میں رہتا ہے، میری ملاقات اس سے وہیں ہوئی۔ اور وہ پورے وسطی مشرق میں سب سے زیادہ رحمدل اور بامروت زمیندار سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے علاقے میں اکثر جاتا رہتا ہے اور اپنے پہونچنے کی اطلاع بازار میں نوٹس لگا کر کر دیتا ہے اور کسانوں کی فریاد بھی سنتا ہے

وہ انگریزی اور فرنچ زبانیں بخوبی بولتا ہے۔ اس نے اپنی زمینداری میں پختہ عمارت بنوا کر اسکول جاری کر رکھا ہے جس میں پچاس بچے پڑھ رہے تھے۔

ایران کی زراعتی پستی موت کے پنجے کی طرح پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ اس خوش حال گاؤں میں بھی ہل تو بے شک جانور کھینچتے ہیں، باقی تمام کام صرف ہاتھ سے انجام پاتے ہیں۔ گیلان کا پورا علاقہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ ساری آبادی کا مدار چاول پر ہے۔ میرے سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ اوسطاً ہر خاندان ڈھائی ایکڑ سے زیادہ کاشت نہیں کرتا کیونکہ دھان کی فصل بہت محنت چاہتی ہے۔ اس میں سے کسان کو آدھا چاول ملتا ہے جو تیس، چالیس "بوشل" کے درمیان ہوتا ہے۔ قرض ادا کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد اُس کے پاس موسم بہار کے ختم ہونے سے پہلے غلہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ نیا قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے قرض کا سود دوگنا تک ہوتا ہے۔ اس مخصوص گاؤں کے بھی سب کسان مقروض تھے۔ اس گاؤں کے لوگوں کی خوش پوشاکی امریکہ سے آئے ہوئے پُرانے اور استعمالی کپڑوں کی بدولت تھی۔ اکثر ایرانی امریکہ کے ممنون ہیں کہ وہ انھیں کپڑا پہننے کے قابل تو کر دیتا ہے۔ ایک کسان نے مجھ سے کہا کہ "سڑکیں نہ ہونا، قرض اور بخار ایران کی تین لعنتیں ہیں۔" خود اس گاؤں کے نوّے فیصدی باشندے ملیریا کا شکار تھے۔ اور ان میں صرف چند ایسے تھے جنھیں کونین نصیب تھی۔

اس علاقے کے جنگلوں میں خود رو پھلوں کی کثرت ہے۔ میرے سوال پر کہ لوگ ان پھلوں کا جام (مربا) بناتے ہیں، جواب ملا کہ "شکر کہاں سے آئے؟ چائے کے لئے تو شکر میسر نہیں، جام کون بنائے؟"

یہ گاؤں مجھے ایسا بھایا کہ میں وہاں دوبارہ گیا۔ دوسری دفعہ میں اُس روز پہونچا جب وہاں ہاٹ لگ رہی تھی۔ آدمیوں کی ایک بڑی بھیڑ اکٹھا تھی اور ایک میلے کی سی صورت تھی، گو وہاں کھیل تماشے مطلق نہ تھے دو کانیں تھیں اور دو کانوں میں سامان تجارت تھا۔ بہت سے ایسے تھے جو بعض چیزیں خریدنا چاہتے تھے مگر خرید نہ سکتے تھے۔ لیکن سب خوش تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ انھیں افلاس کا ملال ہے نہ قرض کی فکر۔ نہ بخار سے پریشانی ہے نہ سڑک بننے کی آرزو۔ بس باہم ایک جگہ اکٹھا ہو جانا ہی ان کی مسرت کے لئے کافی ہے۔ میلوں میں لڑائی جھگڑا ہو جانا یورپ میں عام ہے، کیونکہ لوگ شراب کی بدمستی میں جھگڑ پڑتے ہیں لیکن چونکہ مسلمانوں میں شراب ممنوع ہے اور یہاں شراب کی کوئی دوکان بھی نہ تھی اس لئے یہاں کے میلہ میں میں نے لڑائی جھگڑا نہیں دیکھا، ان کی تنہا مسرت آپس کی بات چیت تھی یا پھر چائے کا دور۔ علاقہ کا زمیندار غیر معمولی طور پر بھلا آدمی تھا مگر اس کا کارندہ اس کا بالکل عکس تھا۔

اس علاقے کے لوگوں نے عمر میں ایک ہی دفعہ سینما دیکھا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب جنگ کے

زمانے میں برٹش قونصل کی طرف سے انتظام ہوا تھا۔ آس پاس کے کوئی تین ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اس فلم کا چرچا وہاں آج بھی ہے۔ میں نے کچھ لوگوں سے سوال کیا کیا وہ پھر سینما دیکھنا پسند کریں گے تو ایک نے جواب دیا کہ:

"کیا ہی اچھا ہو ——— مگر!"

"مگر کیا؟" میں نے کہا۔

"بعض شاید اسے پسند نہ کریں! کیونکہ سینما دیکھ کر ہم لوگ کچھ سیکھ جائیں گے!"

"وہ کون ہو سکتا ہے — کارندہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے ——"

"زمیندار؟" میں نے پھر کہا۔

"ہو سکتا ہے ——"

جس مکان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، ایک پڑوسی یہ سن کر کہ کوئی امریکن آیا ہے، بے بلائے آگیا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ کام کے علاوہ تفریح کی اور کیا صورتیں ہیں۔ تو اسنے برملا جواب دیا "بیماری!" اسنے تو یہ ہنس کر کہا مگر اس جواب کے اندر بڑی تلخ حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ یہاں کوئی گاڑی ٹھیلہ کیوں نہیں ہے ایک نے جواب دیا کہ:۔

"آپ کی اطلاع غلط ہے: زمیندار کی موٹر پہیوں ہی پر چلتی ہے! اور شاید صرف اس لئے کہ وقت ضرورت وہ اس میں بیٹھ کر فرار ہو سکے!"

اس صحبت میں ایک ایسے زمیندار کے متعلق جس کی لوگ تعریف بھی کرتے ہوں، تیز تیز فقرے سنکر مجھے حیرت سی ہوئی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ:

"تودہ تحریک سے پہلے یہ لوگ ایسی باتیں کرنا جانتے بھی نہ تھے"۔

تودہ تحریک ختم کر دی گئی لیکن لوگوں کو بے چین ضرور بنا گئی ہے۔ کوئی دہقان اقرار نہیں کرے گا کہ اسے تودہ پارٹی سے تعلق ہے یا وہ ایسے خیالات رکھتا ہے کیونکہ ہر آدمی کارندے سے ڈرتا ہے۔ اور تودہ کا نام لینا بھی خطرہ کی بات تھی۔

زمیندار کا کارندہ بہت زیادتیاں کرتا تھا، اور اگر زمیندار کے علم میں یہ باتیں آ بھی جاتی تھیں تو وہ ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کیونکہ کارندے کی سخت گیری وصولیابی کی ضامن تھی۔ اس گاؤں میں کارندے کی شکایت کرنے کی کسی کو ہمت ہو ہی نہ سکتی تھی کیونکہ شکایت کا بدلا بہت سخت ہوتا

تھا۔ پانی بند کر دینا تو پہلی سزا تھی۔ اس لئے لوگ اسی میں عافیت سمجھتے تھے کہ کارندے سے بگاڑ نہ کریں۔
تودہ تحریک کے مطالبوں میں پہلا یہ تھا کہ کاشتکار کا حصہ زیادہ ہونا چاہئے۔ طبی امداد اور تعلیم عام اور مفت ہو، سب کو روزگار دیا جائے، اور جندرمہ کو موقوف کر دیا جائے۔ اس آواز نے ایرانی خاصکر گیلانی کسان کی روح کو جگا دیا ہے۔

تہرانی حکومت نے غفلت نہیں کی اور کسانوں کا حصّہ زیادہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ سارے زمینداروں نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔

میرے ساتھی نے بتایا کہ:۔

"ہمارے علاقے میں چاول، چائے، تمباکو، جوٹ اور ریشم کی قیمتی پیداوار ہوتی ہے۔ اور ہم اس کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔ آراضی کی استعداد بھی بہت بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن زمینداروں کو پروا نہیں اور کسان میں اپج نہیں۔ چاول کی کاشت میں مشینوں سے اسی طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسے آپ امریکہ میں لیتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم ملیریا کو بھی ناپید کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے!"

حکومت کے پاس پیسہ نہیں اور کسان قلاش ہے اور زمیندار اپنی دولت غیر ملکوں میں عیاشی کی زندگی بسر کرنے میں خرچ کر رہا ہے!"

"اس کا حل کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
اس نے جواب دیا "کون بتائے؟"

پانچواں باب

(ابر آلود مطلع)

ایرانی آذربیجان کا مستقر تبریز ہے اور دوسرا بڑا اور اہم شہر ہے۔ میری تبریز کی سیاحت نہایت تازگی بخش ثابت ہوئی۔ وسط گرما میں تبریز کا موسم تہران سے زیادہ خوشگوار تھا، ہوائی جہاز سے اُترتے ہی پہاڑوں کی خنک و خوشگوار ہوا کے مسلسل جھونکے ایک بہشتی تحفہ معلوم ہوتے تھے۔ آفتاب کی حرارت طہران کی طرح تیز نہ تھی۔ شمالی ایران میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ آذربیجان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایرانیوں اور آذربیجانیوں کا فرق محسوس ہوا۔ آذربیجانی صرف نسلی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت میں بھی ایرانیوں سے مختلف ہیں۔ انکا قد دراز، جسم بھاری اور رنگ کھلتا ہوا ہے۔ وہ زیادہ جفاکش اور زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ روسی اور ایرانی آذربیجان کے لوگ ہم نسل و ہم زبان ہیں۔ دونوں علاقے ترکی بولتے ہیں۔ انداز کلام میں سنجیدگی، حرکات میں سہولت پائی جاتی ہے اور آسانی سے ہنس دیتے ہیں۔

لیکن باوجود اس اختلاف کے آذربیجانی، ایرانیوں سے کم متواضع نہیں ہیں۔ مینے ایک سنیما میں دیکھا کہ فلم کے گانے کے ساتھ تماشائی خود بھی گانے لگے۔ بازاروں کا گشت کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ گا رہے ہیں۔ آذربیجانی بھی ایرانیوں کی طرح شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کے مقبول و ممتاز شاعر فضلی بغدادی اور حاج رضا اشرف ہیں۔

آذربیجان کے لوگ خوددار بہت ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک آذربیجانی گداگر غیر آذربیجانی سے کبھی بھیک نہ لیگا۔

ایران کے مشنری ادارے تبریز میں بھی کام کر رہے ہیں اور یہ حقیقت ماننا پڑے گی کہ مشنریوں نے آذربیجان کے سماجی سدھار میں بڑی خدمت کی ہے۔ تہران میں ایک تعلیم یافتہ خاتون نے مجھ سے کہا کہ "آپ کی مشنری ہماری "روحانی نجات" کے لئے آئے تھے لیکن انھوں نے ہماری مادی بہبودی کا کام بھی کیا ہے۔" امریکن اور برٹش مشن مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن تعلیم پھیلانے میں انھوں نے بہت کامیابی حاصل کی

۱۹۳۹ء میں رضا شاہ نے ان مشنریوں کو ممنوع قرار دے دیا، حالانکہ تعلیم یافتہ ایرانیوں کو اقرار تھا کہ مش
تعلیم گاہوں کے مقابلے میں ایرانی تعلیم گاہیں ہیچ تھیں۔ چنانچہ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے بند ہو جانے
سے ایران کو سخت نقصان پہونچا اور روشن خیال ایرانی اس پر متاسف ہیں۔

تبریز میں پریس بٹیریاں مشن اسپتال سارے آذربیجان مشہور ہے۔ اس اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈا
چارلس لام ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء میں آذربیجان آیا تھا۔ اُسے مقامی زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ سارے آذ
کے علاوہ ایک طرف گیلان اور دوسری طرف کردستان کے ملحقہ علاقوں سے بھی مریض آتے ہیں۔ ڈاکٹر
نے نرسوں کی ٹریننگ کا بھی ایک اسکول جاری کر رکھا ہے اس اسکول سے ٹریننگ پائی ہوئی نرسیں ا
دائیاں سارے ایرانی اسپتالوں میں کام کر رہی ہیں۔ جب یہ اسکول جاری ہوا تو مسلم ماں باپ نے ا
بچیوں کے لئے غیر مذہب والوں سے میل جول بڑھانا اور نرس بنکر رات رات بھر گھر سے غیر حاضر رہ
اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن ڈاکٹر لام کی ہر دل عزیزی نے اس مورچے کو آسانی سے فتح کر لیا اور یہ مخالفت
دن قایم نہ رہ سکی۔

چونتیس برس کی جانفشانی کے بعد بھی ڈاکٹر لام آذربیجانیوں کی صحت میں نمایاں بہتری پیدا نہ
کر سکا، اس لئے کہ پانی کی بہم رسانی حفظان صحت کے اصول پر نہیں ہے اور کلورین ڈالنے کی مشین کہیں نہ
ہے۔ زمین دوز بدر رو بنانے کا خیال تک نہیں کیا گیا اور پبلک حمام جہاں تمام لوگ ایک ہی حوض میں غسل
ہیں، متعدی امراض کو پھیلاتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے چیچک، ٹائیفائڈ اور آنکھوں کی بیماریاں عا
لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ وہ لال دوا سے پھل اور ترکاریاں دھو لیا کریں تو وہ کہتے ہیں مزا خرا
ہو جائے گا۔

ایرانیوں کی طرح آذربیجانی بھی اعلیٰ درجے کے دستکار ہیں، قالین بافی، چاندی سونے کا کام
چمڑے کی دستکاریوں میں صناع کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ انھیں ایرانیوں کی طرح باغ لگانے کا ذو
نہیں ہے۔ تبریز کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے مگر ایک قصبہ معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ایک نسل پہلے تک بڑی تج
منڈی تھا۔ شہر میں رونق و خوبصورتی یا جدید تمدن کا نشان نہیں، سارے شہر میں صرف ایک لائبریری
کل ۸۴۳ ٹیلیفون ہیں، ایک روزانہ اخبار ہے جس کی اشاعت پوری ہزار بھی نہیں، دوسرا سہ روزہ۔
اس کی اشاعت اتنی بھی نہیں ہے، ایک تیسرا اخبار بھی نکلتا ہے جس کی اشاعت کا کوئی وقت ہی نہیں۔
غرض پورا علاقہ تو کیا شہر میں بھی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی ہے۔

زار شاہی زمانہ ہی سے تبریز ایک مفصلاتی شہر رہا ہے جس کی سرحد چیخوف کے ناولوں کا زمانہ اور ا

مناظر پیش کرتی ہے۔ یہاں کھانے بھی روسی قسم کے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں کیونکہ سلافی لوگ ہمسایہ ہیں۔ عام طور سے روسی زبان بولی سمجھی جاتی ہے۔ روس کا یہ اثر تعجب کی بات بھی نہیں جغرافیائی قربت ہونیکے ساتھ تجارتی تعلقات بھی گہرے رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ آذربیجان بنیادی طور پر ایرانی ہی ہے، بازار سارے مسقف ہیں، دستکاریاں بھی تمام ایرانی ہیں، اہل حرفہ کے اوزار بھی وہی ہیں —— اور رہنے سہنے کے طریقے بھی ایرانی ہیں۔

تبریز میں مجھے سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ نظر آئی کہ وہاں کی مسلم عورتیں حد درجہ شریف و محتاط ہیں۔ رضا شاہ نے پردہ ترک کرا دیا تھا مگر تبریزی عورتوں نے پھر اختیار کر لیا ہے، ان کی چادر زیادہ تر سیاہ ہوتی ہے اور ان سیاہ پوش عورتوں کی وجہ سے بازار ماتم خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پردہ ہی نہیں اور بہت سی پرانی رسمیں جو حکماً ترک کرادی گئی تھیں پھر اختیار کر لی گئی ہیں، رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دوکانیں خواہ وہ غیر مسلموں کی ہی ہوں بند رکھی جاتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد سے چونکہ ایرانی حکومت بین الاقوامی معاملات میں زیادہ الجھی رہی اس لئے ملاؤں کو قدامت پرستی اور مذہبی تنگ خیالی کی تبلیغ کرنے کا کافی موقعہ ملا ہے۔ ملاؤں کی یہ تحریک شروع میں خفیہ رہی مگر چونکہ نوّے فیصدی آبادی جاہل ہے اس لئے ملاؤں کی مذہبی تحریک زور پکڑ گئی ہے عورتوں میں جتنی جہالت زیادہ ہے، یہ تحریک ان میں اتنی ہی زیادہ تیزی سے مقبول ہوئی ہے، حد یہ ہے کہ فیکٹری کے مزدور بھی اس سے متاثر ہیں۔

میرے قیام اصفہان کے زمانہ میں پارچہ بافی کے ایک کارخانہ کے مزدوروں نے ایک ایسے مزدور کو برطرف کر دینے کا مطالبہ کیا جس نے دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا، اور مل کے ذمہ دار اس مطالبہ کو مان لینے کو طیار بھی ہوگئے تھے، مگر ایران کی مشنریوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق پر دست درازی کا مترادف ہوگا، اس لئے مقامی حکام نے اس مطالبے کو رد کرا دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ شیراز کے قریب ایک گاؤں میں ہوا تھا جہاں عیسائیوں کے دس خاندان بستے تھے ملاؤں کے ورغلانے پر کچھ مسلمان لاریوں پر سوار ہوکر وہاں پہونچے اور رات میں عیسائی گھروں پر ہلّہ بول دینا چاہتے تھے مگر وہاں کے مکھیا اور مسلم آبادی نے عیسائیوں کی حمایت کی۔

ایرانی آذربیجان کا دوسرا بڑا شہر رضائیہ ہے۔ جب ۱۹۴۶ء میں آذربیجان کی نئی خود مختار حکومت ختم کر دی گئی تو اس وقت بعض مسلم مذہبی دیوانوں نے عیسائیوں کے چار گاؤں کو آگ لگا دی اور بعض گاؤں

مین مال بھی لوٹا۔ ان علاقوں کے بعض عیسائی لیڈروں نے مجھے بتایا کہ ان حالات سے مجبور ہو کر وہاں کے عیسائیوں نے ہجرت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور انھیں توقع تھی کہ امریکہ و برطانیہ میں انھیں پناہ مل جائے گی
یہ مذہبی دیوانگی تہران کی پرانی آبادی میں زیادہ تھی جہاں زیادہ مزدور اور چھوٹے دوکاندار رہتے ہیں،
میں نے خود بھی دیواروں پر ایسے پوسٹر لگے دیکھے جن میں بے نقاب عورتوں کو اہانت آمیز لفظوں سے مخاطب کیا گیا تھا۔ بعض دوکاندار تو عریاں چہرہ والی عورت کو "ننگی" کہتے اور ان کے ہاتھ سودا بیچنے سے انکار کر دیتے تھے۔ بے نقاب عورتوں کو بازاروں کی مسجدوں سے نکالا بھی گیا۔

مگر اسی کے ساتھ روشن خیال مذہبی پیشوا جو تمام مسلم ممالک میں سب سے زیادہ ترقی پسند ہیں، ایسے متعصب اور مجنون ملاؤں سے اتنے ہی بیزار ہیں جتنا ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ خفا ہے۔ ان بالغ نظر ایرانیوں کو یقین ہے کہ ان ملاؤں کی ہمت افزائی اوپر سے ہو رہی ہے۔

مذہبی تعصب کی تبلیغ کا اثر اس حد تک ہوا کہ ایک فوجی افسر جس نے ہٹلر کی جرمنی میں تعلیم پائی ہے، ایران کی معاشری خرابیوں اور فوجی کمزوریوں کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا کہ:

" اپنی حفاظت کے لئے ہمارے پاس ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ مذہبی تعصب ہے، ہمیں اس ہتھیار کو تیز رکھنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ یہ اسکی ذاتی رائے ہو، اور ممکن ہے کہ یہ کوئی طے شدہ پالیسی ہو، مگر مجھے جتنے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ایرانیوں سے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا وہ سب اس خیال پر ہنستے تھے۔

ایرانی ملاؤں کو مذہبی منافرت پھیلانے میں جو کامیابی آذربیجان اور خاص کر تبریز میں ہوئی وہ ایران کے دوسرے علاقوں میں نہیں ہوئی۔ یہ علاقہ پینتالیس لاکھ آبادی کا علاقہ ہے جہاں کسانوں کی اکثریت اپنی زمین کی خود مالک ہے۔ جھیل آرمیا اسی علاقے میں ہے جو اسّی میل لانبی اور کم و بیش پچیس میل چوڑی ہے اس علاقہ میں پانی بافراط ہے۔ پہاڑی ندیاں علاقے کو بخوبی شاداب رکھتی ہیں اور زیر زمین بھی پانی کی کمی نہیں۔ بعض جگہ نو دس فٹ پر پانی نکل آتا ہے۔ اس شادابی کا نتیجہ ہے کہ یہ علاقہ پورے ایران کے لئے غلّہ فراہم کرتا ہے، انگور، کشمش اور خوبانیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ ایسی ناسپاتیاں میں نے سارے ایران میں کہیں نہیں دیکھیں۔ ترکاریاں بھی ہر قسم کی بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔

ایسا ہوتے ہوئے بھی آذربیجان کی زراعت اور دیہی زندگی المناک نقشہ پیش کرتی ہے ذریعہ رسل و رسایل محدود اور مال کی آمد و رفت برائے نام ہے۔ ٹریکٹر کو یہاں کوئی جانتا ہی نہیں اور موٹر ٹھیلہ شاذ ہی دیکھا جاتا ہے۔ قصبہ خوئش میں میں نے البتہ اناج پھٹکنے کی ملیں دیکھیں مگر وہ بھی روسی ساخت کی تھیں۔ باغوں میں درختوں کی کاٹ چھانٹ بہت کم ہوتی ہے۔ بہترین پھل کیڑے مکوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔

پھل ہاتھوں سے نہیں توڑے جاتے بلکہ درخت کو ہلاکر گرا دئے جاتے ہیں جو زخمی ہوکر جلد خراب ہوجاتے ہیں۔ اس علاقے میں فصل پانچ حصوں میں بانٹی جاتی ہے۔ ایک حصہ زمین کا، دوسرا پانی کا، تیسرا بیج کا، چوتھا بیل کا اور پانچواں کسان کا۔ جس کسان کے پاس اپنا ہل ہے وہ تو چالیس فیصدی پالیتا ہے ورنہ بیس فیصدی ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ بیج اسے بالعموم زمیندار ہی سے لینا پڑتا ہے کیونکہ اپنا غلہ تو وہ کھا چکتا ہے۔ الحاصل وہاں کی زراعت جہاں ہزار سال پہلے تھی وہیں آج بھی ہے اور اس نہایت زرخیز علاقے کا کسان بدستور افلاس زدہ ہے۔

حکومت ایران نے حکم جاری کر دیا ہے کہ خود مختار حکومت کے زمانے کا بقایا لگان وصول نہیں کیا جائیگا۔ مگر زمیندار جو اس زمانہ میں وہاں سے بھاگے ہوئے تھے اب واپس پہونچ کر وصول کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسان نے وہ لگان اس حکومت کو ادا کر دیا تھا۔

زمیندار کے ساتھ جندارمہ (پولس) بھی پھر نمودار ہوگئی۔ یہ دونوں کسان کے لئے وباء کا درجہ رکھتے ہیں۔ خود مختار حکومت قایم ہوجانے کی اہمیت کو زمیندار نے محسوس نہیں کیا تو جندارمہ کیا کرتی جو زمیندار سے رشوت پاکر بقایا وصول کرا رہی تھی۔ ایک امریکن ڈپلومیٹ موٹر سے آذربیجان کا سفر کر رہا تھا۔ اسے ایک رات کسی کسان کے گھر ٹھہرنا پڑا۔ جہاں اُسے معلوم ہوا کہ چند روز پہلے ایک جندرمہ کا سپاہی اسی گھر میں ٹھہر چکا تھا اور غریب کسان نے حد سے زیادہ تواضع بھی کی تھی، لیکن چلتے وقت اس سپاہی نے دو سو ریال طلب کئے جو غریب کسان کے لئے بڑی دولت کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن سپاہی کے جبر و تشدد کے سامنے کسان کو یہ رقم ادا کرنا ہی پڑی۔ زمیندار و جندارمہ کی سختیوں سے کسانوں میں بے چینی ہے اور باغی جماعت اس بے چینی کو ہوا دے رہی ہے۔ ایک ایرانی مصنف نے مجھ سے کہا کہ:

"ہمارا ملک اس آدمی کی طرح ہے جو سونے کے تخت پر بیٹھا ہو مگر بھوکا ہو!"

بلاشبہ آذربیجان کی حالت اس قول کی شرح و تفسیر ہے۔ جدید آلات سے کام لیا جائے تو یہ علاقہ فی الواقعی سونا اُگلے۔ لیکن زمیندار ترقی کرنے کی خاطر روپیہ لگائے اور بغاوت ہوجائے تو اس کی دولت گئی! یہ خطرہ ہر وقت زمیندار کے سامنے ہے۔ اس لئے وہ تہران میں بیٹھا چین کر رہا ہے۔

چھٹا باب

(مرکزِ طوفان)

سنہ [illegible]ء میں تبریز، ایشیا کا مرکزِ طوفان تھا اور دنیا کی نظریں وہاں کے واقعات پر لگی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر لندن و واشنگٹن میں یہ خطرہ زیادہ محسوس کیا جا رہا تھا اور ماسکو میں امیدیں قایم ہو رہی تھیں۔ اس طوفان کے بادل اکٹھا ہونے میں وقت زیادہ لگا۔ یہ رضا شاہ ہی کے وقت سے اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے، کیونکہ رضا شاہ نے اصلاحات جاری کر لینے کے ساتھ آزادی کی خواہش کا بھی گلہ دبا یا۔ لیکن نئی سڑکوں کی تعمیر، ریلوے کا اجراء اور نئی فیکٹریاں قایم ہونا، ایک نئی سماجی طاقت کو وجود میں لانے والے اسباب تھے، یہ نئی سماجی طاقت "مزدور" کی ہے! ان تمام کاموں کے جاری ہونے سے مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ رضا شاہ مزدور تنظیم کا زبردست دشمن تھا، اسے لفظ WORKER سے چڑھ تھی۔ اس کے لئے اس نے LABOURER کا لفظ اختیار کیا۔ مزدور سنگٹھن، رضا شاہ کے استبداد کے لئے ایک چیلنج تھا اس لئے وہ اس تحریک کا دشمن تھا۔ رضا شاہ کو روس اور بالشوک تحریک سے بھی سخت نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ روس WORKER کے لفظ پر مصر اور اسے اعلیٰ صفات کا مجسمہ اور نوع انسان کا نجات دہندہ باور کرتا ہے۔

رضا شاہ کی یہ نفرت اس وقت اور شدید ہو گئی جب اسے گیلان کے بالشوک لیڈر مرزا کچک خاں سے واسطہ پڑا۔ آذربیجان کی خود مختار حکومت کا سرخیل مرزا کچک تھا اور اس نے اپنی حکومت کے دنوں میں "ورکر" اور "پرولتاریہ" لفظوں کی زبردست اشاعت و تبلیغ کی تھی۔ لیکن بالآخر رضا شاہ مزدوروں کی بعض خفیہ جماعتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس جبر و استبداد کا یہ نتیجہ نکلا کہ سوشلسٹ، کمیونسٹ اور تعلیم یافتہ طبقوں کے ساتھ مزدور اور لبرل جماعتیں بھی متحد ہو گئیں اور ان سب کی ایک خفیہ جماعت بن گئی تاکہ رضا شاہی استبداد کا مقابلہ کیا جائے۔ [illegible]ء میں اس جماعت

کے تریپن ممبر پکڑ کر جیل میں ڈال دئے گئے اور کچھ دوسروں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس تحریک کے لیڈر تقی ایرانی کو قصر قاچار جیل میں کوئی مہلک انجکشن دیکر مار دیا گیا۔

اگست ۱۹۴۱ء میں روسی اور برٹش فوجیں ایران میں داخل ہوئیں اور جب رضا شاہ معزول ہوکر جلاوطن ہوئے تو سارے سیاسی قیدی بھی رہا ہوئے۔ جعفر پیشواری دس سال سے جیل میں تھا، وہ بھی رہا ہوا۔ بعد میں اس نے آذربیجانی بغاوت کی رہنمائی کی۔ پیشواری جرمنی اور فاشزم کا زبردست مخالف ہے۔ رہائی کے بعد اس نے تودہ پارٹی قایم کی اور مردم اخبار بھی نکالا جو جرمنی کے طرفدار ایرانیوں کے خلاف لکھتا رہا۔ تودہ پارٹی میں ہر ایرانی ممبر ہوسکتا تھا مگر جو لوگ رضا شاہ کے ہوا خواہ رہے تھے ان کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں اس پارٹی نے ٹریڈ یونین کی بنا ڈالی۔ ۱۹۴۵ء کے آخر تک پورے ایران میں مزدور تحریک کا ایک مضبوط نظام قایم ہوگیا۔ جس کی رہنمائی "فیڈریشن آف دی ٹریڈ یونین آف ایران" کے ہاتھ میں تھی۔ ایران میں مزدوروں کی گنتی زیادہ نہیں مگر تودہ پارٹی کی سیادت میں تنظیم اتنی صحیح تھی کہ یہ تحریک ایک طاقت بن گئی۔ کارخانہ دار، زمیندار اور حکومت، سب ڈرنے لگے۔ اصفہان کی ملوں اور انیگلو ایرانین آیل کمپنی کی کامیاب ہڑتالوں سے پورا اندیشہ ہوگیا تھا کہ ایک روز ملک کی حکومت پر یہ جماعت قابض ہوجائے گی۔ چنانچہ اس کے خلاف ہر قسم کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ اس تحریک میں سارے کے سارے کمیونسٹ نہ تھے مگر انھیں کمیونسٹ کہکر اور روسی تحریک نام دیکر بدنام کیا گیا۔ آذربیجان کی خود مختار حکومت میں صنعت و تجارت کا وزیر ایرج اسکندری ایک عالی خاندان شخص تھا، مگر تودہ پارٹی کا سخت دشمن بھی اسکندری پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ غدار ملک یا کسی بیرونی طاقت کا آدمی تھا، حالانکہ اسکندری آج جلاوطنی کی حالت میں یورپ میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ممتاز قانون داں اور نہایت خوش بیان مقرر ہے۔ اس کے سیاسی عقاید سوشلزم کے ہیں۔ وہ زمین کی مساویانہ تقسیم فوراً کرنا چاہتا تھا مگر زمینداروں کو معاوضہ دیکر اُسے اس بات کا یقین تھا کہ اگر کسان کو زمین کا مالک بنا دیا جائے اور اسے مشینی امداد دیجائے تو ایران ارتقائی اصول پر ترقی کر کے متمدن ملکوں کے دوش بدوش ہوسکتا ہے۔ مگر اس کی یہ اسکیم جس میں نہ خون خرابے کا اندیشہ تھا، نہ ڈکٹیٹری کا اور نہ بیرونی طاقتوں کے نفوذ و اثر کا، انقلابی اسکیم کہہ کر رد کر دی گئی۔

انتخاب میں پیشواری، مزدوروں کے ووٹ سے مجلس کا ممبر چنا گیا مگر جب مجلس نے اس کے انتخاب کو مسترد کردیا، تو اس نے آذربیجان جاکر ایک اور پارٹی "ڈیماکریٹک" کے نام سے بنالی۔ اہل ایران کا خیال ہے کہ پیشواری ایسا نہ کرتا تو وہ پارٹی ایک طاقت بنی رہتی۔ ۱۹۴۳ء کے الیکشن میں تودہ پارٹی کو خاص کامیابی ہوئی اور کیبنٹ میں اس کے تین ممبر لئے گئے تو بحران کی صورت پیدا ہوگئی۔ تعلیم، صحت اور صنعت و تجارت کی وزارتیں تودہ پارٹی

کے ہاتھ میں تھیں جن میں ایک اسکندری تھا۔
ایران کی تاریخ میں "لیبرلا" کا تخیل ہی بالکل نئی چیز تھا۔ تودہ کا نام لوگوں کے دلوں میں امنگ پیدا کر دیتا تھا اور لوگ اس خیال سے خوش تھے کہ ہزاروں برس کی پرانی شاہنشاہیت ختم ہو کر ترقی پسند جمہوریت قایم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ایرانی عوام کی تودہ تحریک نے جو بیداری اور حرکت پیدا کر دی تھی، اس کا اعتراف ہر حلقے میں کیا جاتا تھا۔ لیکن تبریز کے واقعہ نے اس تحریک کو نہ صرف آذربیجان میں بلکہ پورے ایران میں ختم کر دیا۔ تبریز کی خود مختار حکومت کا بننا اور بگڑنا ایک اُلجھی ہوئی داستان ہے جو مورخوں کے منصفانہ فیصلے کی منتظر ہے۔

میں نے ایران کی سیاحت کی اور خصوصیت کے ساتھ آذربیجان کی بغاوت کے متعلق ہر قسم کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا، میں نے سفارت خانوں کے ریکارڈ بھی دیکھے اور غیر ملکی عینی شاہدوں کے بیان اور فیصلے بھی سنے، اور شہادت کے اس بڑے انبار میں سے ایک ہی بات چن سکا، وہ یہ کہ آذربیجان کی بغاوت و خود مختار حکومت کا قیام ایک زبردست اور حقیقی انقلاب کی "ڈریس ریہرسل" تھی۔ تودہ تحریک ختم کر دی گئی ہے مگر اس کی مختصر تاریخ کے نمایاں واقعات ایرانی حکومت، روس، برطانیہ اور امریکہ کے مدبروں کے دماغوں پر بھوت کی طرح چڑھے رہیں گے!

جعفر پشواری اور اس کے ساتھیوں نے تبریز کی خود مختار حکومت کی طرف سے اعلان کیا تھا کہ آذربیجان ایران سے الگ نہیں بلکہ ایک جمہوری نظام میں داخلی اختیار کے ساتھ ایران ہی کا جزو رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۵ء میں وہاں الیکشن ہوا، پارلیمنٹ چنی گئی۔ کیبنٹ بنی، پولس کا نظام قایم ہوا۔ قانون پاس ہوئے اور ٹیکسوں کی وصولی ہوئی۔ ایران سے تعلق ضرور رہا مگر برائے نام۔

اس خود مختار جمہوریت سے روس نے تعاون کیا اور امریکہ و برطانیہ نے اسے روسی حکمت عملی کہہ کر کوئی واسطہ نہ رکھا۔ طہرانی حکومت نے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور وزیر اعظم قوام اور پشواری کے درمیان طہران میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان کی تفصیل تو کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ مصالحت کی یہ کوشش ناکام رہی۔ خیال یہ ہے کہ گفتگو ناکام رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ پشواری کو اصرار تھا کہ آذربیجان میں باغی فوج کے افسروں کو جو ترقیاں ملی ہیں وہ تسلیم کی جائیں مگر طہرانی حکومت اس بات کو باقی ایرانی فوج کے افسروں میں بے چینی پیدا ہو جانے کے خیال سے مان نہیں سکتی تھی۔ بالآخر ایک سال کی طیاری کے بعد طہران نے فوج کشی کر دی۔ مگر اس فوج کے پہونچنے سے تین دن پہلے تبریزی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایران کے لوگوں کا خیال ہے کہ پشواری بہت سا روپیہ اور سامان لیکر روس چلا گیا ہے جو صرف اسی میل پر ہے لیکن پشواری

کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ آذربیجان ہی میں ہے۔

میں نے اپنی سیاحت کے دوران میں اندازہ کیا کہ تبریز میں بے چینی سطح پر بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ فوجی پہرہ بھی معمولی سا ہی رہتا ہے، لیکن میں اس خیال کو دماغ سے دور نہیں کر سکا کہ انقلاب کے مخالفوں کے باوجود، جمہوری حکومت نے ایک سال کی قلیل مدت میں جس قدر اصلاحات جاری کر دیں، اس شہر کے لوگوں نے ان باتوں کو شاید کبھی جانا بھی نہ تھا۔ ان تمام خرابیوں کے ہوتے ہوئے جو اس کم عمر جمہوری حکومت سے منسوب کی جاتی ہیں، اس نے شہر میں چار میل سڑک کولتار سے بنوائی، گداگر اور پیشہ ور عورتیں شہر سے غائب ہوگئیں، ایک زچاؤں کا اسپتال قایم کیا، ایک یونیورسٹی قایم کی جس میں دوسرے شعبوں کے علاوہ میڈیسن، زراعت کے شعبے بھی ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن بنایا، پولس کا انتظام ایسا تھا کہ عورتیں اندھیرے میں بھی بلا خوف آجا سکتی تھیں، قانون آراضی میں بھی اصلاح شروع کر دی تھی، طہران کا "لیبرلا" معطل پڑا تھا اسے پوری طرح نافذ کیا، افیون کی تجارت یکقلم ختم کر دی۔ حکومت کے دفتروں میں فالتو اور نکمے اسٹاف کی تخفیف کر کے کام اور قانون کا اجراء آسان کر دیا۔

ایسے کارناموں کے بعد بھی یہ نظام منتشر ہوگیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکومت نے اپنی فوجی طاقت نہیں بنائی جو طہرانی فوج سے مقابلہ کر سکتی۔ حالانکہ طہرانی فوج اپنی شاندار وردی کے علاوہ کسی امتیاز کی مالک نہیں ہے، پھر آذربیجانی اسی نسل سے ہیں جس سے کاشغئی ہیں۔ اس جمہوری نظام کو عوام کی پوری ہمدردی حاصل نہیں ہوئی اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس خودمختار حکومت نے جب کسان سے زمینداری لگان وصول کیا تو وہ سمجھا کہ یہ حکومت پرانے زمیندار ہی کی قایم مقام ہے۔ اس نے زمیندار کے کارندے اور حکومت کے تحصیلدار میں فرق نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے وعدہ تو تھا کہ زمین اس کی ہوجائے گی۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نظام نے اپنے اوپر سے اس الزام کو ہٹانے کی کوشش مطلق نہیں کی۔ زار کے زمانہ ہی سے ایرانیوں کو روس کے نام سے بیزاری ہے، اور طہرانی حکومت کے خفیہ ایجنٹوں نے عوام میں روس کو زیادہ غیر مقبول بنا دیا تھا، جمہوری حکومت نے یہ کوشش ضرور کی کہ آذربیجانی عوام میں قوم پرستی کا جذبہ شدید ہوجائے۔ اور اگر یہ کوشش کامیاب ہوجاتی تو یقیناً طہرانی حکومت کا پروپگنڈا ناکام رہتا مگر قوم پرستی کا جذبہ ابھارنے کو زیادہ وقت زیادہ کوشش درکار تھی۔

میری سیاحت کے دنوں میں تبریز خاموش تھا، زندہ دلی کے آثار مفقود تھے۔ اقتصادی بدحالی شدید تھی۔ دن بھر کی مزدوری چھ تومان تھی، حالانکہ گدھے کا کرایہ دن بھر کے لئے سات تومان ہوتا ہے

کاروبار سرد تھا کیونکہ سرمایہ دار کو ڈر تھا کہ روس صرف اسّی میل پر ہے۔

میری سیاحت کے دنوں میں آذربیجان کا ایرانی گورنر جنرل علی منصور تھا جو ایک وقت ایران کا وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا اور مانا ہوا مدبر سلطنت تھا۔ علی منصور کو پوری امید تھی کہ امریکہ نے روپیہ کی مدد دی تو حکومت کا ہفت سالہ پلان کامیاب ہوکر حالات کو بدل دے گا۔

تبریز کی خود مختار حکومت کے ختم ہوجانے سے ایرانیوں میں قومی جذبہ اُبھر آیا تھا۔ شاہ نے آذربیجان کا سفر کیا اور نہایت پرجوش خیر مقدم ہوا۔ طہران کے غیر ملکی سفارت خانوں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ گویا مغربی طاقتوں نے روس پر فتح حاصل کی تھی!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اطمینان عارضی ہے، سوویٹ کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ جن اسباب نے پہلا انقلاب کرایا ان کی جڑ زمین کے اندر ہے اور وہ اب بھی جیسے کے تیسے موجود ہیں۔ باغی جماعت متحرک ہے پہاڑوں میں ان کے تین ریڈیو اسٹیشن روزانہ پروپگنڈا کر رہے ہیں۔ اور حکومت تہران صرف امریکہ کا آسرا تک رہی ہے۔ لیکن امریکہ کی امداد گولے برسا کر آبادیاں تو تباہ و مسمار کرسکتی ہے، بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ ایرانی عوام کے لئے روٹی مہیا کرنا تو تہرانی حکومت ہی کا کام ہو اور وہی کر بھی سکتی ہے۔

ساتواں باب

(تشنۂ جواب)

شمالی صوبۂ مازندراں کے شہر رمسار میں پہونچ کر ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ایران میں نہیں ہوں۔ یہاں ایرانی تہذیب و تمدن جسے میں اپنی سیاحت کے دوران میں ہر لحظہ دیکھتا رہا ہوں۔ مفقود تھا، نہ وہ مشرقی مناظر تھے اور نہ اس کی صدائیں۔

ایرانی دوستوں نے اس علاقے کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ مگر جب میں رمسار پہونچا تو ایسا معلوم ہوا کہ ایران کے کسی شہر میں نہیں بلکہ قبل از جنگ کے کسی مغربی شہر میں پہونچ گیا ہوں یا امریکہ کا کوئی شہر اٹھا کر یہاں بسا دیا گیا ہے۔

بلندی پر ایک ہوٹل کی شاندار سفید عمارت کے دروازوں کے چمکتے ہوئے شیشے، وسیع اور ہوادار برآمدے، کشادہ چکردار زینے، لمبے چوڑے صحن میں خوش قطع چمن زار کی نیرنگی، نسرین و نسرن کے نظر فریب تختے، قسم قسم کے بلند درخت، الغرض ہر ہر چیز ستھرے پن کی زندہ شہادت تھی۔ بیرونی شان اور دلکشی سے زیادہ آرائش ہوٹل کے اندر تھی۔ ایران بھر میں صرف یہیں پانی کی بہم رسانی کا انتظام تھا جو صاف شفاف پہاڑی چشموں سے نلوں کے ذریعہ پہونچتا تھا۔ پورے ہوٹل میں کرمان و کاشان کے قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ اس سے بہتر ہوٹل تصور میں نہیں آسکتا۔

یہ ہوٹل سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے بالکل دامن میں بنا ہے۔ ان پہاڑیوں پر گھنا جنگل ہے جہاں ہر قسم کے جانور اور پرندے ملتے ہیں۔ دوسری طرف سمندر کی ساکن سطح کو سورج کی روشنی نے آئینہ بنا رکھا تھا پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں پر بادلوں کا گھرا رہنا ایک پُرلطف منظر پیش کرتا تھا۔ غرض ہوٹل کے تمام جدید ترین سامان عشرت کے ساتھ ساتھ قدیم زمانہ کا یہ جنگل ایسا نظارہ تھا کہ ایران تو کیا غالباً سارے ایشیاء میں میسر نہ ہوگا۔

صرف سترہ سال پہلے رمسار کچے مکانوں کا ایک گاؤں تھا۔ رضا شاہ نے اس گاؤں کو دلکش تفریح گاہ بنا کر شہر آباد کر دیا۔ اس شہر کی تعمیر پر کتنی دولت خرچ ہوئی کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ یہ رضا شاہ کی جیب خاص سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی طرح یہ بھی پتہ نہیں لگ سکتا کہ اس کی تعمیر کے زمانہ میں مزدوروں کی کتنی تعداد ملیریا اور دوسری وباؤں کا شکار ہوئی۔

لیکن وہ لوگ بھی جو رضا شاہ سے کسی نہ کسی بنا پر خفا ہیں، اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رمسار سا حسین شہر محض رضا شاہ کی کوشش کا نتیجہ ہو سکتا تھا کسی دوسرے کی بس کی بات نہ تھی۔

رمسار میں میری ملاقات ایک ایرانی سائنسداں سے ہوئی جو فرانس کا تعلیم یافتہ تھا، کہنے لگا:

"ہمارے ملک میں دولت کی کمی نہیں، ہم فرانس سے زیادہ متمول ہیں، ہمارے زرعی وسیلے جرمنی سے زیادہ ہیں، لیکن رضا شاہ کی معزولی کے وقت سے ہم بے حس و حرکت کھڑے ہیں، کچھ کر نہیں رہے!"

یہ شکایت بجا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ایرانی سرمایہ دار اپنی دولت کو دبائے بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں ایرانی سرمایہ دار دنیا بھر میں سب سے زیادہ خسیس اور بہت زیادہ زیرک ہے۔ اس کا ثبوت اصفہان میں کپڑے کی کامیاب صنعت سے ملتا ہے۔

رضا شاہ نے خود اصفہان آکر وہاں کے دولتمندوں کو بلایا اور ایک تقریر میں بتایا کہ اس زمانے میں مشین سے کام نہ لیکر ہاتھوں ہی سے کام لینا حماقت ہے۔ تم لوگوں کو اصفہان میں کپڑے کی ملیں قایم کرنا چاہئے۔ لوگ چپ رہے۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ شاہ انھیں مشورہ دے رہا ہے یا یہ فرمان شاہی ہے۔ مشورہ کو تو ٹالا جا سکتا تھا مگر فرمان کی تعمیل لازمی تھی! دوسرے دن گورنر نے ان لوگوں کو پھر بلا کر شاہ کی مرضی بتائی۔ تب وہ لوگ مجبور ہو گئے اور ملیں قائم ہو گئیں جن سے بہت نفع ہو رہا ہے اور اصفہان، ایران کا مینچسٹر بن گیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ مالک بے حد منافع اٹھا رہے ہیں۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قلیل رقم کے صرف سے ایک ماہر انجینیر یورپ سے بلا کر رکھیں تاکہ وہ ان کی مشینوں کو بہترین حالت میں رکھ سکے اور یہ لوگ برٹش اور آملی کے کپڑے کی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

۱۹۴۷ء کے موسم خزاں میں مجلس نے ایک سو دو ووٹ سے بمقابلہ دو ووٹ کے روس کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا کہ اسے شمالی ایران میں تیل نکالنے کے مراعات دئے جائیں۔ ایران میں تعلیم یافتہ طبقہ ہی پبلک اسپرٹ رکھتا ہے اور سیاسی معاملات کو دیکھتا سمجھتا ہے۔ ایران کی پبلک رائے کے معنی اسی طبقہ کی رائے ہے۔ اس طبقے میں جن لوگوں کے دلوں میں تودہ تحریک کی یاد باقی تھی اور اس تحریک کے ختم ہو جانے پر

جن کو ملال تھا، وہ لوگ اس فیصلے سے رنجیدہ ہوئے۔ لیکن دوسرے گروہ نے اسے ایک قومی فتحمندی سمجھا، انھیں یقین تھا کہ روس کے انکار کر دینے کے بعد ایرانی سرمایہ دار تیل کی صنعت میں فراخدلی سے سرمایہ لگائیں گے جو نفع بخش ہونے کے علاوہ سلاقی ہمسایہ کے ساتھ وجہ مخاصمت کو بھی دور کر دیگا۔

لیکن ایران کا سرمایہ دار آج تک خواب گراں میں محو ہے، اور ایرانی تعلیم یافتہ طبقے کے دونوں گروہ لیفٹ اور رائٹ بازو والے، حیران ہیں کہ قوم و ملک کا حشر کیا ہونا ہے! کیونکہ وہ خوب واقف ہیں کہ روسی سرحد پر امریکن سرمایہ دار ایک ڈالر لگانے کو طیار نہ ہوگا اور نہ دوسرا کوئی ملک اس مخدوش کام میں ہاتھ ڈالے گا۔ جو قوم شمالی ایران میں نکالنے آئے گی، روس سمجھے گا کہ اس کے علاقہ سرکیشیا کے تیل کو ہتیانے کی سازش ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ روس سے جھگڑا کون مول لے؟

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس مشینی زمانے میں جبکہ نہ صرف صنعت بلکہ زراعت اور فوجی ساز و سامان کے لئے بھی پٹرول کی ضرورت ہے، ایرانی تیل زمین کے اندر دبا پڑا نہیں رہنا چاہئے۔ ایک اعلان ہوا تھا کہ شمالی ایران کا تیل خود ایران نکالے گا۔ مگر سیاسی تذبذب کی صورت میں جو اسوقت ایران پر چھایا ہوا ہے، لوگوں کو بھروسا نہیں کہ ایران ایسا کر سکے گا۔

ایرانی تاجر اس میں شک نہیں کہ زیرکی و دانائی میں تمام دنیا کے تاجروں سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن وہ معمار نہیں ہے، اس کا صنعتی مزاج نہیں ہے، اس لئے جس بات کا نتیجہ بہت عرصے بعد نکلے اس میں اسے دلکشی نظر نہیں آتی۔ ایرانی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے خوب کہا کہ "ایرانی تاجر محض صراف ہے" وہ خرید و فروخت کر کے فوری نفع حاصل کرنا جانتا ہے، اس لئے اس کے اندر یورپ کے تاجروں کی سی وہ اسپرٹ نہیں ہے جو انھیں خطرہ کا مقابلہ کرنے پر طیار کر دیتی ہے۔"

ایرانی تاجر کی یہ فطرت حکومت ایران کو اُس طرف لئے جا رہی ہے کہ خود حکومت تمام تجارت کی اجارہ دار بن جائے۔ حالانکہ امریکہ کا تاجر حکومت کے ایسے اقدام کو کبھی گوارا نہ کرے گا۔

ایرانیوں کے اس مخصوص کردار کا ایک خاص سبب ہے، غیر ملکیوں کے حملے، مسلسل سازشیں، ہر وقت کی دھمکیاں اور لوٹ کھسوٹ، اسی کے ساتھ ملکی حکمرانوں کا جبر و استبداد، یہ تمام باتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک ایرانی کو اپنے ملک و قوم پر بھروسا نہیں رہا۔ کم از کم ایرانی تاجر تو ان دلیلوں سے اپنی معذوری ثابت کرتا ہے۔ لیکن یوروپین یا امریکن کی نظر میں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اہلِ مشرق صبر و قناعت کے عادی ہیں اور راحت و سکون کی تلاش ان کی فطرت ہے اور ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی جو ان روایات پر ایک کاری ضرب لگاتی، ایران میں نہ کوئی سماجی انقلاب ہوا نہ ذہنی! البتہ رضا شاہ نے ایرانی تاریخ کو

ایک دھکا دیا تھا، لیکن اس کا کام کرنے کا ڈھنگ ایسا نہیں تھا جو ایرانی تاجر کو تعمیری کاموں کے لئے اُبھار سکتا بلکہ وہ جھجک اور مایوس زیادہ ہوگیا۔

ایرآن، غیر ملکوں خاص کر امریکہ سے قرضہ ملنے کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ اور بلاشبہ ایسا قرضہ مل جانے سے ایرآن ترقی کر بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر ایرانی زمیندار عقل سے کام لیتا اور مستعدی دکھاتا تو یقیناً ایرانی کاشتکار کا مقدر اس قرضے کے بغیر بھی بدلا جا سکتا تھا۔

ایرآن کی وزارت زراعت نے امریکن ماہر ڈاکٹر لایل ہیڈن کو بلا کر ایک زرخیز علاقے میں پانچ گاؤں پر تجربہ کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس ماہر نے بغیر کسی زرعی اصلاح کا قانون جاری کرائے نہایت قلیل صرف پر بہت زیادہ کامیابی حاصل کرکے دکھا دی۔ میں نے مزآن کے گاؤں کو خود جا کر دیکھا، جہاں ڈاکٹر لایل نے تجربہ کیا تھا۔ ایرانی دہقان نے مکھی، مکڑی، جوں، بچھو اور دوسرے حشرات الارض کو ایک اٹل تقدیر کی طرح مان لیا تھا، لیکن ان پانچوں گاؤں میں آج کسی قسم کا کیڑا مکوڑا نہیں ہے۔ پورے ایرآن میں یہی ایک گاؤں میں نے ایسا دیکھا جہاں کے آدمی بدن نہیں کھجاتے تھے۔ کوئی خارشتی کتا بھی نظر نہیں آیا، اس کامیابی کے لئے ڈاکٹر ہیڈن نے فی گھر پونے دو ڈالر خرچ کئے، جس میں ایک تہائی سرکاری خزانے میں کسٹم ڈیوٹی کی صورت میں پہونچ گیا۔ ڈاکٹر ہیڈن نے حکومت ایرآن کو بتا دیا کہ اگر تین سال تک پانچ ڈالر فی کنبہ کے حساب سے خرچ کیا جائے تو پورا ایرآن جلد و باؤں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس اسکیم پر باتیں بہت کی گئیں مگر ہنوز روز اول ہے۔ اس کا سبب متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے بہت معقول بات کہی کہ:-

" ہماری ملک میں لوگ صرف زمینداری اور تجارت ہی سے روپیہ نہیں کماتے، بلکہ سیاست کو بھی نفع بخش بنا لیتے ہیں"۔

ایک ممتاز وکیل نے اعتراف کیا کہ لوگ دو دو کھاتے رکھ کر انکم ٹیکس کی چوری کرتے ہیں۔ ایرآن میں امریکہ کا فوجی مشن فوجی حالت سدھارنے کا کام کر رہا ہے۔ اس مشن نے چھ جرنیلوں کی برطرفی تجویز کی کیونکہ وہ رشوت کے خوگر بن گئے تھے۔ ایرآن کے فوجی افسر بالعموم غریب یا معمولی حالت میں داخل ہوتے ہیں اور امیر بن کر سبکدوش ہوتے ہیں۔ بے اعتباری کی حد یہ ہے کہ ایرانی تاجر فوج کی سپلائی، ماہوار بل کے اصول پر نہیں کرتے بلکہ بازاروں کی طرح اسی وقت قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ دُنیا کے ملکوں میں ایرآن ہی ایسا ملک ہے جس نے اندرون ملک کوئی قرضہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت پر ایرانی پبلک و خاص دولتمند طبقہ کو بھروسا نہیں ہے۔

ایرانی تاجر کی زیرکی و ہوشمندی کا سب سے بڑا ثبوت ایران کے نیشنل بنک کے ریکارڈ سے ملتا ہے، جسے بریگیڈ جرنیل امیر خسروی نے قایم کیا تھا۔ یہ رضا شاہ کا مقرب خاص تھا۔ اس بنک کی بنا ڈالتے وقت یہ بات بنیادی طور پر مان لی گئی تھی کہ ایرانی بالطبع بد دیانت نہیں ہے چنانچہ ملازموں کو اتنی کافی تنخواہیں دیجاتی ہیں کہ انھیں چوری یا رشوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ امیر خسروی کا یہ اصول بہت کامیاب رہا۔ اس وقت اس بنک کا گورنر ابوالحسن ابتہاج ہے اور اس کی قابلیت مسلمہ ہے۔ اس کے دشمنوں نے متعدد سیاسی الجھنوں میں پھنسا کر اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہا مگر اس کی ساکھ کو صدمہ نہ پہونچا سکے۔

یہ بنک اپنے چار ہزار ملازموں کو معقول تنخواہوں کے علاوہ اور بھی خاص رعایتیں دیتا ہے۔ مثلاً انھیں خاص چھٹیاں بھی لینے کا حق دیا گیا ہے، ان کی صحت کا بیمہ کرتا ہے، ملازموں کی لڑکیوں کی شادی پر بنک کی طرف سے جہیز کے لئے ایک رقم دی جاتی ہے، ان کو سامان غذا سستی قیمت پر اور کم تنخواہ والوں کو بازار سے نصف قیمت پر دیا جاتا ہے، ملازموں کی بیویاں حاملہ ہوں تو زچگی کا خرچ دیا جاتا ہے غرض ابتہاج نے اپنے ادارے کو بد دیانتی سے پاک رکھنے کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہے۔ ایک ملاقات میں ابتہاج نے مجھ سے کہا کہ:-

> "اگر اسٹیٹ بنک کے چار ہزار ملازم کامل دیانت اور وفاداری کے ساتھ کام کرسکتے ہیں تو چار لاکھ کو بھی ایسا بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ انھیں خدمت کا معاوضہ اتنا دیا جائے کہ وہ لالچ کا شکار نہ بن سکیں۔"

میں نے اکثر لوگوں سے یہ بات سنی کہ: "ایران میں سو ابتہاج ہوتے تو ایران کی سرزمین جنت کو شرمادیتی۔"

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک انجینیرنگ فرم کے دو انجینیروں نے ایران کے اقتصاد پر آٹھ سو صفحے کی رپورٹ طیار کرکے اپنے فرم کو بھیجی تھی (تاکہ امریکن حکومت کو اعلیٰ عمال کے صحیح اعداد و شمار اور اصل واقعات و صورت حال کی پوری اطلاع پہونچ جائے) اس رپورٹ کی بنا یہ تھی کہ ایران کو قرضہ دیا جائے اور وہ قرضہ خود بخود ادا ہو جائے۔ اس کتاب میں اس رپورٹ پر تبصرہ تو کیا نہیں جا سکتا لیکن مجھ جیسے ناواقف کار آدمی کی نظر میں اس رپورٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایرانی زراعت کو درختوں کی بیماریوں سے جو زبردست نقصان ہوتا ہے، اس کے دفع کرنے کی بڑی موثر تدبیر بتائی ہے، کیڑے مکوڑوں کی بدولت اناج کی پیداوار میں ایران کو تین کرور ڈالر کا سالانہ نقصان ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر رپورٹ کی ہدایات پر عمل کیا جائے تو ایران کو ڈھائی کرور سالانہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

ایران، دُنیا میں سب سے زیادہ چائے پینے والا ملک ہے، لیکن سماوار، چائے اور استکان

(کاغج کا چھوٹا گلاس) یہ تینوں لفظ روسی ہیں۔ ایران، خود بھی چار ہزار ٹن چائے پیدا کرتا ہے؟ لیکن ایک کروڑ ڈالر کی چائے باہر سے آتی ہے۔ حالانکہ بحرِ قزوین کے علاقے میں بیس ہزار ایکڑ زمین ایسی پڑی ہے جہاں چائے کی کاشت بڑھاکر ایران غیر ملکی چائے سے بے نیاز ہو سکتا ہے لاکھوں ڈالر بچا سکتا ہے۔ اسی طرح وہاں زمین کی پیداواری طاقت کو بھی دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

وزیرِ اعظم غفام نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ بہت بڑے علاقے کو قابل کاشت بناکر زمین کسانوں کو مفت دی جا سکتی ہے۔ دس پندرہ سال ان سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا، مگر اس کے لئے بیرونی قرضے کی ضرورت ہے۔ یہ ایرانی حکومت کا طریق کار ہے، ورنہ بہت سا کام بغیر بیرونی قرضے کے بھی انجام پا سکتا ہے۔

سرزمین ایران غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے اور زرخیز بھی، لیکن ایسا ملک اور یہ قوم، دیکھئے تو سر سے لیکر پاؤں تک، زخم ہی زخم ہے!

تاریخ کے ایک دور میں ایران دُنیا کی زبردست طاقت رہ چکا ہے۔ میں نے ایک ایرانی میوزیم میں ڈھائی ہزار سال پُرانا فولادی ہل دیکھا۔ یہ ہل ان تمام ہلوں سے بہت زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے جو اسوقت ایرانی کاشتکار استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کو توجہ نہیں۔ اس لئے آخر میں یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ نجات کی صورت کون سی ہے؟ میرے خیال میں ایران کو ایک مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہے! پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ رضا شاہ ایسے آدمی کا ہاتھ ہو، یا دارا اور شاہ عباس جیسے مصلحوں کا؟ آیا وہ ہاتھ ایرانی سرزمین سے اُٹھنے والے انقلاب میں ملے گا یا روس کی ڈکٹیٹری کی صورت میں نمودار ہوگا؟ یا پھر واشنگٹن و لندن کی مالی امداد ہی نجات کی صورت پیدا کرے گی؟

ایک غیر ملکی مقیم ایران نے مجھ سے کہا کہ:-

"ایک بلین (سوملین) ڈالر کا قرضہ اور ایک سو یوروپین یا امریکن ماہر و انجنیر دس سال میں ایران کی صورت بدل دے سکتے ہیں!"

بہرحال دو باتیں اٹل ہیں: اس مشینی عہد کی ترقیوں کے زمانہ میں ایران کا جمود عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتا، اور ترقی و خوشحالی کے لئے جو پروگرام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا زمین اور کاشت کی اصلاح ہی سے ہوگی۔

آٹھواں باب

(قاہرہ)

جنگ کے زمانہ کا قاہرہ کچھ اور تھا، اور ۱۹۴۸ء کا کچھ اور اب وہ بالکل پہلے کا سا قاہرہ ہوگیا تھا وہی کاہلی، وہی چیخ کر بات کرنا وہی عمامہ پوش Dragoman وہی گداگروں کی کثرت اور وہی خوانچہ فروشوں کی بھرمار۔ ایام جنگ کی خوشحالی مفقود تھی۔

بڑے بڑے ہوٹل آدھے خالی پڑے تھے، اور ان ہوٹلوں کے بار روم اسپتال کی طرح خاموش تھے۔ بڑے بڑے بازاروں کے دوکاندار گاہکوں کی کثرت سے بوکھلائے ہوئے نہ تھے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ سونا بٹورنے کا زمانہ ہوا ہوچکا تھا۔

بایں ہمہ، یورپ سے اڑکر قاہرہ پہونچ جانا ایک عجیب اور حرکت میں لے آنے والا تجربہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی بلندی سے کسی نئے براعظم پر نہیں بلکہ کسی نئے کرے پر ٹپکا دئے گئے ہیں۔ جہاں کی آب وہوا نئی، تہذیب نئی اور لوگ مختلف ہیں۔ بازاروں میں مال واسباب کی کثرت حیران کردینے والی تھی۔ یورپ کو چھوڑئے، سوئٹزرلینڈ میں نہ تو ڈالر کی حکمرانی تھی اور نہ ڈالر وہاں ہیرو کا درجہ رکھتا تھا اسلئے سوئٹزرلینڈ کی ٹرین "ڈی لکس" کے مسافروں کو بھی قہوہ میں سیکرین ملتی تھی۔ لیکن قاہرہ میں ڈالر کا قحط ہونے کے باوجود شکر کیا معنی کسی چیز کی کمی تھی ہی نہیں، وہاں نہ کسی چیز کا راشن تھا اور نہ کوئی شے ایسی کہ قابل حصول نہ ہو۔ قاہرہ میں لوگ چیزیں ڈھونڈھتے نہیں پھرتے تھے بلکہ خود سامان خریداروں کا منتظر رہتا تھا۔ یورپ کی فاقہ کشی کے بعد قاہرہ میں کھجور اور انجیروں کے انبار، کیلے امرود کے ڈھیر، آموں کی افراط دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

مصر میں جنگ نے کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹایا نہ تھا۔ عیش وآرام کے اسباب مغربی ملکوں میں ناپید ہوگئے تھے مگر مصر میں کثرت سے ملتے تھے۔ مصر کی راجدھانی ایک ایسا شہر تھا جہاں کسی کو قیام گاہ کی

جستجو میں سرگرداں نہیں ہونا پڑتا تھا۔ زیورچ اور جنیوا میں ڈالر کی بڑی ارزانی تھی مگر وہاں سیاحوں کو قیام و طعام اور نغمہ و شراب اس آسانی سے میسر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح قاہرہ میں، شبینہ کلب، رقص گاہیں، شراب خانے اور سینما، نہایت خندہ پیشانی سے سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہمہ وقت طیار تھے۔ ہر قسم کی عیاشی دسترس کے اندر تھی اور اس کے مہیا کرنے والے موٹر پر سیاحوں کا پیچھا کرنے کو موجود تھے۔

بیروزگاری شدید ہونے کے باوجود قاہرہ کے بازاروں میں ہر قسم کے سامان کی کثرت دیکھ کر یورپ سے آنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ متعجب کرنے والی چیز یہاں کا تضاد ہے۔ ایک طرف قدیم اہرام اور عالیشان مسجدوں کے پرانے گنبد و مینار اور دوسری طرف جدید وضع کی شاندار و دلکش عمارتیں اور پھر اسی کے ساتھ کچی جھونپڑیاں بھی لق و دق صحرا کے بالکل کنارے ایسے باغ نظر آتے ہیں جو دنیا کے کسی شہر میں نظر نہیں آ سکتے۔

بیش قیمت اور شاندار امریکن موٹریں دوڑتی پھر رہی ہیں اور اُسی کے ساتھ اونٹوں اور گدھوں کے قافلے بھی ہٹو بچو کہتے گزر رہے ہیں۔ مصری لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خوش باش اور خرچیلے ہیں اور یورپ کا تازہ ترین فیشن قاہرہ کی سڑکوں پر عام طور پر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مصری قوم اتنی ہی خلیق و باتمیز ہے جتنی دُنیا کی کوئی قوم ہو سکتی ہے مگر افلاس اور غریبی بھی اس ملک میں انتہا کو پہونچی ہوئی ہے۔

ایران کی طرح قاہرہ میں بھی عورتیں نقاب پوش رہتی ہیں۔ لیکن وہ مصری لڑکیاں جو نقاب نہیں ڈالتیں اور سرخی و غازہ، پوڈر وغیرہ کمال صناعی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ قاہرہ میں مرد عورت بالعموم آدھی درجن زبانیں بلا تکلف بول سکتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بے شمار مصری اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔ اس شہر میں نمائش بے حد اور سنجیدگی کم ہے۔ فوری طور پر وہاں بڑے سے بڑا واقعہ رونما ہو سکتا ہے مگر استحکام و استقلال کم باتوں میں ہوتا ہے۔ وہاں اگر سنجیدگی و ہم آہنگی دیکھی جا سکتی ہے تو اس کے ساتھ شور بھی ایسا ہے جو کانوں کے پردے پھاڑ دے، اگر وہاں کے مرد بالعموم بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہیں تو وہاں کی عورتیں نرم کلامی کی عادی ہیں، اگر وہاں خونچے والے بدتمیز و گستاخ ہیں تو اسی کے ساتھ بڑے دوکاندار حد درجہ مہذب و شایستہ ہیں۔

قاہرہ کی ٹیکسیاں یورپ کے اکثر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ چکیلی اور شاندار ہیں۔ امریکن بسیں جس کثرت سے قاہرہ میں چلتی ہیں زیورچ میں بھی نہیں دیکھی تھیں حالانکہ زیورچ ہی ایک ایسا شہر

جہاں ڈالر بکثرت اور ارزاں ہے۔
اسکندریہ کے شیپرڈ ہوٹل سے پانچ منٹ چلئے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین بستیاں اور جھونپڑیاں دکھلائی پڑیں گی جہاں کی گندگی اور بو دماغ پریشان کردے گی، جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر آئے گی۔ گداگر فٹ پاتھ پر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے۔ مصر کی اوسط اموات ساری دُنیا سے زیادہ ہے۔ ایک سال کے ہر چار بچوں میں سے ایک مرجاتا ہے۔

الغرض قاہرہ، تضاد و تخالف کا مرکز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ۵۲۵ء قبل مسیح پڑی تھی۔ اس کی آبادی ۱۹۰۰ء میں ساڑھے چھ لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی اور آج بیس لاکھ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

غیر ملکی سیاح جب مصر کی راجدھانی میں پہونچتا ہے تو لب صحرا ایک عالیشان شہر بسا دینے والی قوت و ذہانت پر عش عش کرنے لگتا ہے۔ مشرق اگر اپنی خوبیوں اور خرابیوں کو انتہائی صورت میں کسی جگہ پیش کرسکتا ہے تو وہ جگہ قاہرہ ہے۔ افریقہ بھر میں سب سے بڑا اور ہنگامہ آفریں شہر ہونے کے ساتھ ہی قاہرہ ہزار مسجدوں والا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ایک ہزار سال کی قدیم یونیورسٹی "ازہر" قایم ہے۔ اس جامعہ میں تیرہ ہزار لڑکے تعلیم پاتے ہیں، جن میں چھ ہزار دیگر ممالک کے ہیں۔ ایک مصری عالم کے لفظوں میں "قاہرہ اسلامی دُنیا کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔"

قاہرہ میں ایک جماعت "اخوت اسلام" کے نام سے قایم ہے جو ہر جماعت اور نئی تحریک کی دشمن ہے۔ اگریکلچر کالج کے طلبہ و طالبات اور پروفیسروں نے ایک محفل رقص و سرود جمائی جس میں "ایوننگ ڈریس" ضروری تھا، اس محفل میں بادۂ ارغواں کے دور بے تکلف چلے۔ "اخوت" والوں نے اس کو نجس اور گندہ کا لقب دیا۔

میرے قیام قاہرہ کے دوران میں "اخوت" والوں نے ایک ادیب کی گرفتاری کا مطالبہ کیا کیونکہ اسنے اپنے کسی مضمون میں اس بات کا مذاق اُڑایا تھا کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو جانے پہچانے بغیر شوہر اور بیوی بن جاتے ہیں۔ "اخوت" کے ایک اخبار نے ان اخباروں کی اشاعت روک دینے کا بھی مطالبہ کیا جو لباس غسل میں لڑکے لڑکیوں کی تصویریں شایع کرتے ہیں۔

قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے مجھے ایک شام بدیعہ میں مدعو کیا۔ بدیعہ ایک نہایت فیشن ایبل اور مشہور ریسٹوران ہے جہاں الازہر اور اخوت کی طاقت و اثر کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں۔ اس مجلس میں شریک ہونے سے پہلے میں تصور میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلم تماشائی ایسے منظر کو گوارا کرسکتے ہیں، خاص کر جس شہر میں جامعہ ازہر قایم ہو!

میں نے اپنے میزبان دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع میں اسلامی تعلیم کی یہ پامالی کیونکر ممکن ہے تو اس نے کہا کہ "یہ قاہرہ ہے!"

مصری پایہ تخت میں کسی مذہب کی تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ:-

"قاہرہ ساری دنیا کے شہروں میں سب سے زیادہ کھُل کھیلنے والا شہر ہے۔"

مصریوں کی متضاد طبیعت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک طرف مصر جو ڈالر کا بھوکا ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح یہاں آئیں، ....

.... مگر دوسری طرف ان کی قوم پرستی کا اشتعال غیر ملکیوں کے خلاف متشدد مظاہرے بھی کراتا رہتا ہے۔

مصری حکومت چاہتی ہے کہ سیاح زیادہ سے زیادہ تعداد میں مصر آئیں مگر ساتھ ہی پاسپورٹ کے حاصل کرنے میں اتنی اُلجھنیں اور دقتیں پیدا کی جاتی ہیں کہ سیاح گھبرا جاتا ہے۔

مصری حکومت چاہتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ مصر میں لگے مگر اس کے لئے شرطیں ایسی رکھی جاتی ہیں کہ یہ کام مشکل ہو جاتا ہے۔ رشوت کا یہ عالم ہے کہ جو غیر ملکی، مصر میں کاروبار کر رہے ہیں وہ اپنا کام کسی دوسرے ملک میں منتقل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مصر کی اقلیتیں انھیں وجوہ پر غیر مطمئن ہیں۔ یہودی حکومت اسرائیل کی طرف نظریں لگائے ہیں اور آرمینین، روس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ مصر کو اسرائیل سے نفرت اور روس کی طرف سے شبہ ہے۔

غرض مصر میں منفی و مُثبت طاقتیں متوازی کام کر رہی ہیں جیسے کسی چیز کے حرکت میں آنے سے اس کا سایہ بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ قاہرہ کے تمدن کا تضاد انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

لسانی اعتبار سے قاہرہ اصلاً عرب ہے لیکن کلچری پہلو سے وہ قدیم و جدید اثرات کا مجموعہ ہے قدیم و جدید آرزوؤں کا معرکہ ہے! وہاں پُرانے اور نئے خیالات کا مجادلہ جاری ہے! اور یہی وہ خصوصیت ہے جو قاہرہ کو ایک جیتا جاگتا ڈراما بنا دیتی ہے!

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دوسرے ملکوں کی راجدھانیوں کی طرح قاہرہ بھی ایک کاسماپولیٹن (مخلوط النسل آبادی کا شہر) ہے۔ اس کے برخلاف قاہرہ جو کرتا ہے وہی پورا مصر، بلکہ عرب دنیا کا ایک بڑا حصہ کرنے لگتا ہے۔ قاہرہ کا جغرافیہ، تاریخ، دولت، ضخامت، کلچر، سماجی ہنگامہ خیزی اور ذہنی شورش — روایتی اور جدید، دونوں قسم کی — قاہرہ کی اس سائیکالوجی کا جواز ہیں قاہرہ، اپنی پُر عظمت قدمیت کے باوجود اپنی خامیوں اور گمراہیوں کو نوجوانی کے جوش میں قابلِ تقلید

نہیں سمجھتا ہے۔ وہ اپنی نوحصول اہمیت و دولت پر اس قدر نازاں ہے کہ اس نے فلاحوں (کسانوں) کی حالت زار کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اپنے وقار اور اپنے ارادے کو دنیا اور خاص کر عرب ملکوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہتا ہے جیسے کہ کوئی نوجوان لوگوں کے سامنے اپنی طاقت و جوانی کی نمائش کرے۔ مصری حکومت کے سامنے اس وقت بہت سے بین الاقوامی مسئلے ہیں! ان میں اسرائیلی حکومت اور نہر سوئیز کے علاقے اور سوڈان کا انخلاء بہت اہم ہیں۔ ان مسئلوں نے مصر میں بخار کی سی حالت پیدا کر رکھی ہے۔ وزارت خارجہ کے دفتر سے مجھے بہت سا لٹریچر دیا گیا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سوڈان پر قاہرہ کے جو حقوق ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، ایک اقتباس یہ ہے:-

"بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اقتصادی ترقی اور زراعت کو وسیع کرنے کے لئے مصر کا انحصار، سوڈان پر ہے، بنجر زمینوں کو صرف اسی صورت میں قابل زراعت بنایا جا سکتا ہے کہ آبپاشی کا انتظام ہو، اور یہ بات جب ہی میسر ہو سکتی ہے جب نیل کے پانی پر پورا کنٹرول ہونے کی اسکیم پر عمل درآمد ہو، اور طغیانیوں کے پانی کا ذخیرہ کیا جا سکے اور یہ حقیقت کہ مصر کی خوشحالی کا تمامتر انحصار بالائے نیل پر پورے کنٹرول اور اس پانی کے مناسب استعمال پر موقوف ہے، مصری مدبرین سلطنت کے دماغوں میں مرتسم ہو چکی ہے، جو گزشتہ سو سال سے برابر جڑ پکڑتی جا رہی ہے!"

ایک غیر ملکی حکومت اگر سوڈان کے نظم و نسق میں دخیل ہو تو بلا شبہ نیل کا پانی روک کر مصر کی خود مختاری کو بے معنی اور اس کے وجود کو خطرے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ سوڈانیوں کو اپنے مقصد کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو مصری آتش بپا ہو جاتا ہے۔

قاہرہ کے سوڈانی باشندوں نے اپنے لئے ایک مقام بنا لیا ہے۔ یہ لوگ بالعموم ادنےٰ قسم کے روزگار کرتے ہیں مگر مصری اور اجنبی، سب اس پر متفق ہیں کہ سوڈانی بالعموم قابل اعتماد ہوتا ہے۔ سوڈانی قاہرہ میں ہوٹلوں وغیرہ میں خدمتگاری یا دولتمند مصریوں اور غیر ملکیوں کی نجی ملازمتیں کرتے ہیں، کچھ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں۔ یہ لوگ نہایت سنجیدہ و متین اور تمیزدار ہوتے ہیں۔ مصری جس قدر بسیار گو ہیں، سوڈانی اتنے ہی کم گو ہیں۔ سوڈانی بالعموم دراز قد، چوڑے چکلے، مضبوط و توانا ہوتے ہیں، جسمانی و اخلاقی دونوں اعتبار سے توانا! لیکن اس کے باوجود مصری وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر کے سامنے جب سوڈان کو عام رائے دہی کا حق دینے کی بات میرے منہ سے نکلی تو معلوم ہوا کہ میں نے اس افسر کی نہیں بلکہ پوری مصری قوم کی توہین کی ہے۔

مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں میں، تعلیم یافتہ عورت، خیال و عمل کے لحاظ سے اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے جتنی مصری عورت ہے۔ اور اسی طرح مصر کی جاہل اور قدامت پرست عورت کی طرح کوئی نیک بھی نہیں ہے۔

مصر کی نئی روشنی والی نسل کی لڑکیوں کو اجنبی لوگ FLAPPER (یعنے ایسی لڑکی جو عام صحبتوں میں شریک ہوتی ہو) کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ غلط ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ مصری لڑکیاں قدیم اثر و رسوخ سے ہٹ کر آزاد زندگی گزارنے پر تل گئی ہیں، ایسی باغی لڑکیوں کی گنتی اگرچہ ابھی زیادہ نہیں لیکن ان کی خود رائی متحیر کر دینے والی ضرور ہے۔ انکا نعرہ "آزادی" اور عمل "خود نمائی" ہے۔ وہ جدید تمدن کی آرایش و زیبایش کے تمام طریقے استعمال کرتی ہیں اور اپنے جسم کے سڈول پن پر یورپ کی لڑکیوں کی طرح فخر کرتی ہیں۔ ساحل پر غسل کرنے کا چست لباس، جسے مصری بوڑھیاں "شیطان کی ایجاد" کہتی ہیں، لڑکیاں اسکے پہننے میں اپنی شان سمجھتی ہیں۔ مصری لڑکیاں سینما دیکھنے کی اتنی شوقین ہیں کہ ہفتے میں دو بار ضرور جاتی ہیں۔ گھر پر نوجوان دوستوں سے ملاقات کے امکان کم ہیں اس لئے سینما بہترین وعدہ گاہ ہے۔ وہ پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں شریک ہوتی ہیں اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتی ہیں۔ احترام نسوانیت کے خیال سے سگریٹ نوشی عام اور شدید نہیں ہے۔ اسے ہالی ووڈ کے تمام فلم اسٹاروں کے نام یاد ہیں اور غیر ملکی ملاقاتیوں کے سامنے اسے یہ کہنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ کس فلم اسٹار کو دوست بنا سکتی ہے اور کس کو شوہر۔ ایک مسلم گھر پر ایک ٹی پارٹی میں ایک لڑکی کو میں نے خود یہ کہتے سنا کہ وہ کیری گرانٹ کو دوست بنا سکتی ہے، ہربرٹ مارشل کو شوہر اور کلارک گیبل کو یہ بھی اور وہ بھی! جب میں نے اُسے ٹوکا کہ اس کے گھر والے اسے کیونکر پسند کریں گے تو بولی کہ "میرے باپ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اور ماں سمجھتی ہے کہ میں پوری طرح گمراہ ہو چکی ہوں، دادی البتہ یہ عقیدہ باندھے بیٹھی ہے کہ ایک دن مجھے ہدایت ضرور ملے گی اور میں بے دینی کی راہ چھوڑ دوں گی۔ حالانکہ میں نے انسے کہ دیا ہے کہ میں ان کی طرح کی نہیں بلکہ نئی قسم کی عورت بننا چاہتی ہوں! میں اپنی معاش کی خود کفیل ہوں اس لئے کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا، آزاد ہونا بڑے لطف کی بات ہے!"

پرانی اور اسلامی روایات کی پامالی کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بدتمیز ہو گئی ہیں، نفاست و شائستگی کا انھیں اتنا ہی شدید احساس ہے جس طرح جدید لباس اور بناؤ سنگھار کا! چنانچہ مصر کی جدید عورت اصل میں نتیجہ اور رمز و علامت ہے اس سماجی شورش کی جو دو عظیم جنگوں کے درمیانی وقفے میں مسلم ملکوں کے اندر ہوتی رہی ہے۔ اس شورش کو اعلیٰ اور درمیانی طبقے کی مسلم لڑکیوں

جدید تعلیم ملنے سے اور بھی تقویت پہونچی ہے۔

ہر چند مردوں کی طرف سے کافی مخالفت ہوئی مگر سنہ ۳۶ء سے مصری یونیورسٹی میں لڑکیوں کا داخلہ شروع ہوگیا تھا۔ آج مصر کے پانچ ہزار ڈاکٹروں میں ڈیڑھ سو عورتیں ہیں۔ ایسے ملک کے لئے جہاں یہ کہاوت ہو کہ عورت دو ہی بار گھر سے نکلتی ہے، ایک شادی کے بعد رخصت ہو کر دوسرے مرکر۔ وہاں بیس سال کی مدت میں ڈیڑھ سو عورتوں کا ڈاکٹر ہوجانا واقعی حیرت کی بات ہے۔

ایران کے روشن خیال علماء کی طرح مصر کی تعلیم یافتہ عورت بھی اس کو غلط کہتی ہے کہ اسلام عورت کو کمتر سمجھتا یا اس کی کمتری کا ذمہ دار ہے۔ مسلم عورت جس ادنیٰ درجے میں پہونچا دی گئی ہے مصر کی تعلیم یافتہ عورت کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔

اسماء فہدی جو زنانہ کالج میں اسسٹنٹ ڈین ہے، لکھتی ہے کہ:-

"یورپ والوں کا یہ خیال غلطی پر مبنی ہے کہ اسلامی احکام مسلم عورتوں کو تعلیم دئے جانے کے خلاف ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام عورتوں کی تعلیم پر نہایت زور دیتا ہے پیغمبر اسلام کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی بیویاں لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں۔ رسول خدا کی حدیث ہے کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت کا فریضہ ہے۔ اسلامی ادب میں ایسے حوالے ملتے ہیں، جن سے لڑکے لڑکیوں کا ایک ہی مکتب میں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سوانحعمریوں میں بہت سے اذکار ملتے ہیں کہ عورتیں ادب اور مذہبیات کے مطالعہ میں ممتاز ہوسکتی اور مردوں کو لکچر دیا کرتی تھیں۔"

مصر کی یہ عالم خاتون مسلم عورت کے اس "ذہنی و روحانی زوال" کا ذمہ دار قدامت پرستی کو قرار دیتی ہے۔ یہ خاتون مسلمانوں کی اس جہالت و عصبیت کو اس عقیدے کا سبب قرار دیتی ہے کہ:-

"عورت کو جاہل رکھ کر چار دیواری میں بند رکھا جائے تو اس کی عصمت محفوظ ہے!"

اسماء فہدی کے اس مضمون نے "اخوت اسلامی" کے حلقوں میں ہلچل ڈالدی اس لئے یہ مضمون کتابی صورت میں شایع ہوا تو وہ کتاب شاہ فاروق سے معنون کی گئی۔

سنہ ۴۵ء میں ایگریکلچر کالج میں ۲۷ مصری عورتیں داخل ہوئیں اور تین لڑکیوں نے جرأت کی اور انجینرنگ کالج میں داخلہ کرالیا۔ جرنلزم کے اسکول میں مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں۔ اسی اسکول کی تعلیم یافتہ متعدد خاتونیں آج متعدد اخبار رسالے ایڈٹ کر رہی ہیں۔

بایں ہمہ یہ کامیابیاں اور ترقیاں شہروں تک محدود ہیں۔ مصر کے دہقانی ہنوز فراعنہ کے عہد میں

جمی رہے ہیں۔

مصر کی نئی نسل کی لڑکیوں کی یہ پیشقدمیاں اسی طرح سماجی اور ذہنی شورش و انتشار کی علامت ہے جس طرح طلبہ کے مظاہرے اور ہنگامہ خیزیاں۔ پورے مشرق وسطیٰ میں یونیورسٹی کے طلبہ اتنے پرجوش و عمل نہیں جتنے مصر کے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں میڈیکل طلبہ کے ایک مظاہرے کو پولس نے منتشر کردیا تو انھیں اتنا غصہ آیا کہ تمام درسی کتابیں جلا دیں اور لیبوریٹری کا سامان توڑ پھوڑ ڈالا۔ ظاہر ہے کہ تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا یہ نقصان پولیس کا نہیں بلکہ خود ان طلبہ کا نقصان تھا۔ یونیورسٹی کھلنے پر یہ نوٹس نکلا کہ تمام طلبہ کو پہچان کے کارڈ رکھنا لازمی ہے تاکہ آیندہ اگر وہ یونیورسٹی کا نقصان کریں تو ان سے یا اُن کے سرپرستوں سے وصول کیا جاسکے۔

مصر کے لوگوں میں باغیانہ اسپرٹ عام ہے، صرف نئی نسل کے لوگوں میں نہیں۔ جنگ کے بعد سے بے شمار مظاہرے اور بلوے ہوچکے اور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مظاہرے برٹش کے خلاف ہوتے ہیں کبھی تمام غیر ملکیوں کے خلاف۔ کبھی وہ اسرائیل کا مسئلہ ہوتا ہے اور کبھی سوڈان کا۔ اور اب تو خود مصری حکومت کے خلاف بھی مظاہرے ہونے لگے ہیں۔ غرض ہنگامہ آرائی کے لئے مصریوں کو حیلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قومی اور بین الاقوامی حیلہ ہر وقت طیار رہتا ہے۔ قاہرہ کے ایک ماہر تعلیم نے اس ہنگامہ آرائی کا سبب یہ بتایا کہ طلبہ کی تعداد قاہرہ میں بہت زیادہ ہے ایک دوسرے ماہر تعلیم نے اس طرح رائے زنی کی کہ :-

"ہمارا ملک غیر ترقی یافتہ ہے اور اپنے اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے تمام لوگوں کو کام نہیں دے سکتا!"

اور یہ سچ بھی ہے کہ حکومت نے اسی شورش کے دباؤ سے بہت سے محکمے بیکار یا ضرورت سے زاید کھول رکھے ہیں تاکہ کچھ لوگ کھپائے جاسکیں اور زیادہ آدمی کھپانے کی خاطر تنخواہیں کم کی جارہی ہیں جس کی وجہ سے رشوت کی گرم بازاری ہے، چنانچہ نوجوان طبقہ جب روزگار نہیں پاتا تو شورش پسند بنجاتا ہے مصر میں ابتدائی تعلیم عام ہے اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر مصر میں ابھی صرف چالیس فیصدی بچے ابتدائی درسگاہوں میں داخل ہوسکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا دوگنا اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مصر کی روح اس کے جسم سے زیادہ قوی اور اس کی آرزوئیں ان کے پورا ہونے کے ساز و سامان سے بہت زیادہ ہیں۔ قومی انتشار کی حالت میں ایسے نوجوانوں کا ذاتی انتشار بہت زیادہ وزنی ہوجاتا ہے، جن کو غیر مذہبی قسم کی تعلیم ملی ہو۔ مصر کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان یا تو زمیندار اور تجارت پیشہ طبقے کے

ہیں یا سرکاری افسروں کی اولاد ہیں اور نئی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ دنیا کا تازہ ترین ادب اور سیاسی خیالات ان کے مطالعے میں آتا رہتا ہے، چنانچہ ان کے سامنے ایک نئی دنیا ہوتی ہے جسے وہ پیار بھی کرتا ہے اور اس سے نفرت بھی۔ ہر ہوائی جہاز جو قاہرہ کے اڈے پر اُترتا ہے تعلیم یافتہ مصری کے لئے کچھ نہ کچھ نئی چیز لیکر آتا ہے اور اس کا قومی و ذاتی انتشار اس سے اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے دماغ سے نئے خیالات کو نکال نہیں سکتا! وہ مصر کی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ مصر کے غرباء اور دیہات کی حالت زار برداشت نہیں کرسکتا، مگر اس اصلاح میں خود اس کے قدامت پرست گھر والے مُخل ہوتے ہیں۔ یہ حالت اسے کرب و غضب میں مبتلا رکھتی ہے اور وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے غیر ملکیوں سے نفرت ہے مگر وہ مصری پاشا سے بھی نفرت کرتا ہے۔ وہ عمل کا طالب ہے! در اصل وہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چاہتا ہے مگر یہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نہیں چاہتا! اسی لئے وہ کمیونزم کو اپنا لیتا ہے۔ لیکن اصلاً مصری نوجوان وطن پرست ہے۔ وطن عزیز کو ترقی کی راہ میں تیزی سے گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے غم و غصہ دل میں لئے "مرتا کیا نہ کرتا" پر عمل کرنے لگتا ہے۔

یہ حقیقت نہایت اہم ہے کہ اس ملک میں جو اسلام کا قلعہ ہے، ایسے نوجوان موجود ہیں جو اپنے باپ کو چور اور ڈاکو کے نام سے یاد کرنے میں باک نہیں کرتے۔ اور ایسے باپ بھی موجود ہیں جو اپنے بیٹے کو مصر کی حالت پر اظہار خیال کرتے سنتے ہیں تو "ناپختہ جوانی کی بکواس" کہکر ٹال دیتے ہیں، یا اپنے لختِ جگر کے ان "عجیب خیالات" پر کڑھتے رہتے ہیں۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ذکی الحس بیٹے نے اپنے باپ کی دولت کو پس پشت ڈالکر راحت و آرام کی زندگی بسر کرنا ترک کر دی ہے۔ اور ایسے نوجوان بھی ہیں جو "زمیندار کا ناس!" "افلاس کو ختم کردو!" "سرمایہ داری ختم کردو!" "نابرابری کو مٹادو!" قسم کے نعروں میں بہت دلکشی پاتے اور ہر انقلاب و طوفان کو "خوش آمدید!" کہنے کو طیار ہیں، بشرطیکہ وہ مصر کے ان خوابوں کو حقیقت میں بدلدینے کے لئے ہو! میں نے چند نوجوانوں سے سوال کیا:-

"تم لوگ روس کی تقلید کرنا چاہتے ہو یا امریکہ کی؟"

"کسی کی نہیں! ہم یہ چاہتے ہیں کہ مصر اپنی کامل خود مختاری کی حفاظت کرے، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ مصری پاشا اپنے قانون داں گرگوں کو پارلیمنٹ کے ممبر بنواکر مصری قوم کی قوت، اسکی صلاحیت اور قابلیت کو غیر کا پابند بنادیں!"

قانون کے ایک طالب علم نے مجھے جواب دیا۔

"مصر کی نئی نسل شدید قسم کی وطن پرست ہے، اور مشکلوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کو نہایت عزیز رکھتی ہے اور خوفزدہ ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ کوئی مشرقی یا مغربی طاقت کسی بہانے مصر کو پھر دبوچ لے۔ اس لئے یہ لوگ لفظ انقلاب سے بھی ڈرتے ہیں۔"

حکومت مصر نے ہفتہ وار الجمہور کو کچل دینے کی کوشش کی تھی جسے ایک نوجوان پروفیسر اور کئی قانون داں اور طلبہ ایڈٹ کرتے ہیں مگر وہ زندہ رہا اور جب مصر نے اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کی تو وہ تنہا اخبار تھا جس نے اس جنگ کی تنہا مخالفت کی۔ مصر کے طلبہ در در جاکر اس اخبار کو بیچتے اور چندہ وصول کرتے ہیں۔ مزدور لیڈروں سے اسے مدد ملتی ہے۔ حالانکہ مصر میں مزدور تحریک اس مفہوم میں موجود نہیں جو یورپ کے ملکوں میں لیا جاتا ہے۔ مجھے ایک سفارت خانے کے ایلچی نے بتایا کہ:

"جس وقت فرانس میں انقلاب ہوا تو فرانس موجودہ مصر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔"

وزارت کے ایک ذمہ دار افسر نے جسے کالج چھوڑے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی۔ غمگین آواز میں مجھ سے اعتراف کیا کہ

"ہٹلر اگر لڑائی میں جیت جاتا تو مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ فاشزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔"

یہ اس نے صحیح کہا۔ کچھ دنوں کے لئے "نوجوان مصر" کی تحریک اٹھی تھی اور چند ہی دنوں میں کافی مدد حاصل کرلی تھی۔ اس کا طاقتور پریس بھی وجود میں آگیا تھا۔ مگر اتحادیوں کی فتح نے اس تحریک کو ٹھنڈا کردیا۔ تحریک ختم ہوگئی مگر اس کی اسپرٹ ابھی باقی ہے۔ اس اسپرٹ نے حال میں نیا روپ اختیار کرلیا ہے اور فلسطین کا مسئلہ اس کا بنیادی پتھر ہے۔

"اخوتِ اسلامی" ۱۹۲۸ء سے قایم ہے۔ ایک لاکھ ممبر ہیں جس میں دس ہزار مجاہدوں کی فوج ہے اس جماعت کو غیر ملکیوں سے سخت مخالفت ہے اور مذہبی قدامت پرستی اس کا نصب العین ہے۔ اگر وہ بولشیوک کا دشمن ہے تو اسی کے ساتھ جمہوریت کا بھی ہے۔ وہ عرب ملکوں کا اتحاد چاہتی ہے اور مصر کی سیادت چاہتی ہے۔

الحاصل یہاں قدامت پرستی اور جدت پسندی کا معرکہ قایم ہے۔ شیپرڈ ہوٹل کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو میں نے دیکھا کہ جنازے پر ایک جامنی رنگ کی چادر پڑی تھی اور سرہانے ایک طربوش (ترکی ٹوپی) رکھی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مرنے والا صاحب اثر و رسوخ تھا۔ میت کے پیچھے سیاہ برقعے ڈالے عورتیں بین و بکا کرتی جارہی تھیں۔ یہ سب قدامت پرستی کے آثار تھے اور ان کے ساتھ ایک بینڈ باجہ CHOPAN کا FUNERAL MARCH بجاتا جا رہا تھا۔ یہ نئے تمدن کی علامت تھی۔

نواں باب

(مصر، عالم نزع میں)

مصری کسان کا سب سے زیادہ عزیز سرمایہ اس کی بھینس ہے جو دودھ دینے کے ساتھ ہل چلانے کا کام بھی دیتی ہے۔ مصر کی رائل ایگریکلچرل سوسائٹی نے ایک نمونے کا گاؤں آباد کیا ہے۔ اس گاؤں میں میں نے پہلی دفعہ دیکھا کہ بھینس ایک الگ کمرے میں بندھی تھی، ورنہ کاشتکار اس کو اسی کمرے میں باندھتا ہے جس میں خود رہتا ہے، اس لئے کہ وہ اس کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہے۔ یہ بھینس شمالی امریکہ کی گائے کے مقابلے میں صرف پانچواں حصہ دودھ دیتی ہے۔ مگر اس کی یہ بھینس ایک اور کام بھی دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسان کے بچے اس کے ساتھ کھیل کود لیتے ہیں اور تالاب میں اس کو نہلانے کے وقت خوب خوش ہوتے ہیں۔

مصر میں کسانوں کے تیس لاکھ کنبے ہیں مگر بھینسوں کی گنتی صرف پندرہ لاکھ ہے، اس لئے بعض کسان دودھ کے لئے بکری پال لیتے ہیں اور باقی جو زیادہ خرچ نہیں کر سکتے، بغیر دودھ ہی کے جیتے ہیں۔ مصریوں نے ابھی دودھ کی خاطر گائے پالنا نہیں سیکھا اور اس کے دودھ کے فواید سے واقف نہیں ہیں۔

مویشی کی یہ کمی مصر کا ایک قومی مسئلہ ہے۔ کیونکہ مصریوں کو دودھ نصیب نہیں ہوتا، ڈنمارک میں اگر دودھ کی سپلائی اٹھائیس ہے تو مصر میں صرف ایک ہے۔ مصری کسانوں کی ادنیٰ اور گری ہوئی صحت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں دودھ نصیب نہیں۔

کسان عورتیں اگر اپنے بچوں کو دودھ نہیں دے سکتیں تو انھیں ہر وقت اونٹتی رہنے والی سیاہ چائے پلاتی ہیں۔ اور چائے کی یہ عادت مصری کسانوں میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی قمیص بھی گرو کر سکتا ہے۔

پونے دو کروڑ کے قریب آبادی رکھنے والا مصر، صرف پچیس لاکھ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔ اور یہ زمین نیل کی طغیانیوں کے باعث دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز زمین ہے۔ دنیا کی کسی قوم کی ہستی کا انحصار دریا پر اتنا نہیں ہے، جتنا مصری قوم کا دریائے نیل پر اور دنیا کا کوئی ملک اپنی زرخیزی کے لئے کسی دریا کا اس قدر ممنون نہیں جتنا مصر نیل کا ہے۔ نیل نہ ہوتا تو دنیا میں قدیم و جدید مصر وجود ہی میں نہ آتا۔

مصری آب و ہوا خشک ہے اور وہاں اوسط بارش بہت کم ہے۔ اس لئے ہر قطعۂ زمین آبپاشی چاہتا ہے۔ پچیس فیصدی زمین کی آبپاشی تو نیل کی طغیانی سے پوری ہو جاتی ہے باقی کے لئے نہری آبپاشی کا انتظام ہے۔ یہ نہری آبپاشی محمد علی پاشا (۱۷۶۹ء لغایت ۱۸۴۹ء) کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ نے بھی آبپاشی کے ذرایع بڑھانے میں مدد کی ہے اور اسوان کا بند برٹش اسکیم ہی کا نتیجہ ہے۔

نیل کی طرح دوسری نعمت مصریوں کے لئے سورج ہے۔ مسلسل دس گھنٹے کی دھوپ مصر کی زمین کے لئے ایک نعمت ہے۔ پانی کی افراط اور دھوپ دونوں ملکر مصر کو قحط سالی سے بچاتے رہتے ہیں۔ یہاں کی زمین ہر قسم کی کاشت کے لئے مناسب ہے۔ روئی تو مصر کا سونا ہے، گو قابل زراعت زمین کے صرف پانچویں حصے میں کپاس بوئی جاتی ہے، لیکن برآمد میں روئی کا اوسط اسی فیصدی رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں کی روئی دنیا بھر کی روئی سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی ترکاریاں، پھل اور غلہ بھی بہتر ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود مصری کسان بھوکا، ننگا اور بیمار رہتا ہے۔

مصر میں میں نے پرشوکت اہرام بھی دیکھے، عظمت آفریں ابوالہول کو بھی دیکھا۔ عجائب خانے میں اعلیٰ صناعی کے نمونے بھی دیکھے، اور ہر منظر نے میرے اندر حیرت و استعجاب کی لہر دوڑا دی، لیکن جب میں نے مصر کے گاؤں دیکھے تو قدیم و جدید مصر کی عظمتیں میرے ذہن و خیال سے محو ہوگئیں۔

مصری کسان کچے مکان میں رہتا ہے جو بدوضع بھی ہوتا ہے۔ ورنہ مٹی گارے کے مکان بھی خوبصورت اور آرام دہ بنائے جا سکتے ہیں۔ ایگریکلچرل سوسائٹی نے نمونے کے گاؤں میں نہایت خوبصورت اور آرام دہ مکان بنوائے ہیں، جو گرمی میں سرد اور سردی میں گرم رہتے ہیں۔ مویشی باندھنے کا اصطبل رہنے کے کمرے سے الگ بنایا ہے۔ قبل جنگ اس مکان کی لاگت سو امریکن ڈالر کے برابر تھی اور مصری کسان کے لئے یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ لڑائی کے بعد کی گرانی میں تو اس کے لئے یہ مکان تعمیر کرنا ناممکن سا ہے۔ جو مکان وہ بناتا ہے بہت سستے میں بن جاتا ہے۔ مٹی مفت اور سرکنڈے وغیرہ بھی نہایت ارزاں، اور یہی دو چیزیں اس کی تعمیر کا مسالا ہیں۔ مکان نہایت بدبودار ہوتا ہے مکھیوں کی انتہا نہیں۔ موسم البتہ مصری کسان کا دوست ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ کھلے میں

کرتا ہے۔

مصر کے دیہاتی پینے کا پانی تالابوں سے حاصل کرتے ہیں جن میں بچے اور مویشی نہاتے بھی ہیں۔ پانی کے گھونگے ایک خاص بیماری کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دیہاتی لوگ جوتہ پہننے والے کو دولتمند سمجھتے ہیں مرد اور بچوں کو کپڑا بہت کم نصیب ہے۔ البتہ عورت کا لباس غنیمت ہوتا ہے۔ دیہاتی عورت پردہ نہیں کرتی لیکن اس کی عصمت و پاکبازی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

دُنیا میں دیہات کے لوگ اس قدر مریض و بیمار کہیں کے نہ ہوں گے جتنے مصر کے ہیں۔ آنکھوں کی بیماری بہت عام ہے اسی لئے وہاں اندھوں کا اوسط سب ملکوں سے زیادہ ہے۔ ملیریا اور گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماری جس کا نام " لمہارزیا " پڑ گیا ہے عام ہے۔ ستر، اسی فیصدی کسان اس بیماری اور داد کے مریض ہیں۔

مصر کے دیہاتی بچے اتنے ہی چونچال اور کھلنڈرے ہیں جتنے کسی دوسرے ملک کے ہوسکتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ سرخ و مریض آنکھیں اور سوجے چہرے پر مکھیاں کھیل کے وقت بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مصری کسان کا افلاس و جہالت اس حد تک ہے کہ وہ ارزاں ترین دوائیں بھی خرید کر اپنے بچوں کی آنکھیں نہیں دھو سکتا۔

الغرض دُنیا بھر کے ملکوں سے بہتر آب و ہوا کا مالک اور دُنیا بھر میں سب سے زیادہ زرخیز زمین کا مالک ہوتے ہوئے بھی، مصر میں افلاس کی انتہا نہیں ہے۔

ایک مصری ماہر زراعت کے ساتھ مجھے ایک مرتبہ قاہرہ سے ذرا دور ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بازار میں وہ کسی شناسا سے بات کرنے لگا اور میں ایک صحن میں داخل ہوگیا۔ فوراً میں نے اپنے دوست کو پکارتے سُنا کہ " واپس آجاؤ! " پھر اس نے معذرت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس طرح کسی مکان میں داخل ہوجانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے کہا کہ دن دہاڑے اور آدمیوں کی موجودگی میں میرے داخل ہونے پر کوئی شک شبہ کیسے کرسکتا ہے تو اس نے بتایا کہ مصری لوگ جلدی شک کرلیتے ہیں اور جلد مشتعل ہوجاتے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ مصر میں قتل کی وارداتیں دیہات ہی میں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ بیشتر یہی بدگمانی ہوتی ہے۔

مصر میں تعدد ازدواج برائے نام ہے مگر شک کی بنا پر طلاق کی کثرت ہے یہ بھی مصریوں کی بدنصیبیوں میں سے ایک بدنصیبی ہے۔

مصر کے لوگ کافی تغذیہ نہ ہونے کے باعث کمزور ہیں اور چونکہ اپنی قوت مردمی کے بارے میں

نہایت ذکی الحس بھی اس لئے حشیش کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

اپنی ان کمزوریوں کے باوجود، دُنیا بھر کے کسانوں کی طرح، مصری کسان میں خوبیاں بھی ہیں۔ وہ عام مصریوں کی طرح غیر ملکیوں کو ناپسند کرتا ہے، وہ ایرانی کسان کی طرح زود آمیز بھی نہیں لیکن آپ سے تھوڑی شناسائی بھی ہو تو اس کی کم گوئی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کھل کر باتیں کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے حالات کے متعلق سوالات کرتا ہے۔

مسلمہ طور پر مصر کے لوگ جلدی مشتعل ہو جانے والے ہیں لیکن مصری کسان اجنبیوں کے سامنے برد بار اور خلیق ثابت ہوتا ہے۔ وہ دوسرے فلاح کے کھیتی باڑی کے کام میں بوقت ضرورت عملی مدد دینے کو ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتا اور انھیں شفقت سے رکھتا ہے۔ طلاق کا رواج عام ہے مگر بیوی سے اُلفت کرتا اور اس کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ اسے فطرت سے بھی محبت ہے اپنی زمین سے بھی وابستہ ہے اور اس کی سب سے بڑی خواہش ایک قطعہ زمین کا مالک بنجانا ہے؟ وہ محنت کرتا اور بار برداری کے مویشی کی طرح ہر وقت جُتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں مسرت برائے نام اور امید مفقود ہے۔ دودھ، گوشت، انڈا، مچھلی وغیرہ اس کی غذا کا جزو نہیں۔ ہر وقت اونٹتی رہنے والی چائے اس کی سب سے بڑی عشرت ہے۔ چائے میں کبھی شکر ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ مٹی کا تیل، صابن اور کپڑا بس اسی حد تک خرید سکتا ہے۔ جتنی اس کی قلیل آمدنی، چائے اور شکر کے صرف کے بعد اجازت دیتی ہے۔ وہ درحقیقت بے والی وارث ہے، وہ محض فطرت کے رحم پر جیتا ہے صرف ایک سورج ہے جو اس کا دوست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصری فلاح مصر کی شان و عظمت ہے اور اسی کی قوت بازو سے مصر کی خوشحالی قایم ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ مصر کی ٹریجڈی بھی ہے۔

شاہ مصر نے، سماجی بہبود کے لئے تعلیم یافتہ جماعت اور سیاسی لیڈروں نے جہالت، افلاس اور بیماریوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ یہ نعرہ میں نے ہر جگہ سنا اور یہ بھی دیکھا کہ بعض زمیندار کچھ رفاہی کام کر رہے ہیں، مگر یہ کام تو قومی عمل اور قومی ارادے ہی سے انجام پا سکتا ہے، جو یہاں مفقود ہے۔

مصر کے افلاس کی بنیاد اس کی کثرت آبادی بتائی گئی ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ دُنیا کے کثیر آبادی رکھنے والے ملکوں میں ایک مصر بھی ہے۔ مصر کا علاقہ ویسے تو تین لاکھ چھیاسی ہزار میل مربع ہے، لیکن قابل زراعت زمین صرف ساڑھے تین فیصدی ہے۔ باقی سب صحرا ہے۔ چھ ہزار سال پہلے جس طرح وہ محض نیل کے ذریعہ سے رزق حاصل کرتا تھا اسی طرح آج بھی حاصل

کر رہا ہے۔ نیل کی لمبائی نو سو ساٹھ میل ہے اور ساری آبادی اس کے کنارے پر ہے۔ اس دریا میں کوئی دوسری ندی آکر گرتی بھی نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ صرف پچیس لاکھ ایکڑ زیر کاشت ہے اور دو لاکھ ایکڑ مزید زیر کاشت لائی جا سکتی ہے، اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ مصر کی زمین پر اس کی آبادی کا بڑا زبردست بار ہے۔ بلجیم بھی کثیر آبادی کا ملک ہے مگر وہاں فی کیلو میٹر صرف دو سو چھیاسٹھ آدمی ہیں اور مصر میں پانچسو تینتیس۔

اس مشکل کا حل سوڈان کی طرف ہجرت کرنا سمجھا گیا ہے، لیکن خود سوڈان کا مسئلہ ہنوز لانیحل ہے اور اس ذیل میں ابتک کوئی کام نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ افزائش نسل پر کنٹرول، یہاں شاید قابل عمل نہ ہو کیونکہ مصری کسان خیال کرتا ہے کہ جتنے بچے ہوں گے اتنے ہی کام کرنے والے بڑھیں گے۔

اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک کنبہ چار ایکڑ زمین پر بخوبی کاشت کر سکتا ہے، اس لئے اس حساب سے آدھے مصری کسان نکمے اور فالتو ہو جاتے ہیں۔ اس فالتو آبادی کو وہ عراق منتقل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مگر اس کام کے لئے بھی پہلے بہت کچھ کرلینا ہے۔

اس کے علاوہ مصر میں صنعت بڑھانے کی تجویز بھی سوچی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے یہاں خام پیداوار کی کمی ہے۔ اس سے قطعِ نظر صنعتی پھیلاؤ کے لئے منڈی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر صنعت کی سب سے پہلی منڈی خود اپنا ملک ہوتا ہے، مگر مصر اس باب میں بھی بدقسمت ہے کیونکہ اس کے کسانوں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ قانون آراضی کی اصلاح ہو تو کسان کی آمدنی بڑھے اور اس کا مصر میں چرچا بھی نہیں ہے۔

اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ مصر کے ساڑھے ستر لاکھ کسانوں کے پاس صرف ساڑھے سات لاکھ [illegible] زمیندار [illegible] کے قبضے میں اس سے ساڑھے تین گنی آراضی ہے۔ یہ ایک حقیقت مصر کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کے مطلع کو گدلا بنائے ہوئے ہے۔ سرزمین مصر جس طرح زمیندار کے لئے جنت ہے [illegible] وحسرت کی زندگی بسر کرتا ہے اسی طرح [illegible] کسان کے لئے دوزخ ہے جہاں افلاس [illegible] کے سوا کچھ نہیں۔

دسواں باب

(زرعی اصلاحات یا تباہی)

میں جنگ کے دنوں میں بالائے نیل، لکسر میں تھا، تو ایک قبطی ڈاکٹر نے مجھے ایک بہت بڑے پاشا زمیندار سے ملایا جو تبدیلِ آب و ہوا کے لئے ونٹر پیلیس ہوٹل میں مقیم تھا۔ پاشا کی سرخ طربوش اور اس کا ملتا ہوا سیاہ ریشمی پھندنا بڑا مرعوب کن تھا۔ ٹائی پن کا چمکیلا ہیرا اور اس سے بڑا انگوٹھی کا دمکتا ہوا ہیرا اسکی دولتمندی کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا بہترین انگریزی لباس اور فصیح انگریزی اور فرانسیسی گفتگو اس کی تہذیب و تعلیم کا ثبوت تھے۔ وہ بے انتہا متواضع اور حد درجہ شایستہ و سنجیدہ تھا۔

اس پاشا نے انگلستان اور فرانس میں تعلیم پائی تھی اور امریکہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اپنی سیاحت کے اذکار بڑے جوش و انہماک کے ساتھ سناتا رہا، ایک پرجوش وطن پرست کی طرح مصریوں کی حالت زار کا ذمہ دار وہ برٹش حکومت کو سمجھتا تھا، جو مصر کے اقتصاد، کلچر اور جینیس کا گلا گھونٹتے رہے ہیں، اس نے کہا کہ اگر انگریز مصر و سوڈان سے چلے جائیں تو مصر اپنی پرانی شان و عظمت کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے۔

یہ باتیں میں نے مصر میں ہر ایک کی زبان سے سُنی تھیں۔ اس لئے میں نے اس سے ایک سیدھا سوال کیا، "کیا انگریزوں نے مصریوں کو زرعی اصلاحات سے روکا ہے ؟" اس نے [illegible] ہے، تو پھر میں نے دوسرا سوال کیا۔ "پھر قانون آراضی میں اصلاح کیوں نہیں ہوئی [illegible]" میں اس نے یہ ٹالنے والا جواب دیا کہ: "یہ بلند قسم کی سیاست ہے!" میں نے اسے توجہ دلائی کہ۔ "کیا برطانوی عقل و فراست، برطانوی سرمایہ، برطانوی رہنمائی نے مصر کو اور خاص پاشا کو [illegible] دولتمند نہیں بنا دیا ہے ؟" تو اس نے جواب دیا کہ۔ "برطانیہ نے ان [illegible] بھی پالیا ہے"۔

حقیقت امر یہ ہے کہ برٹش مداخلت کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے سے [illegible] دینے کی [illegible]

اور اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کر دینے سے مصریوں کا جذبۂ قوم پرستی بہت زیادہ ابھار دیا گیا ہے اس سے اصل مقصد پورا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر مصری قوم اپنی مصیبتوں کو ضرور بھول گئی ہے۔ نہر سویز کے کنارے کے علاوہ انگریزوں نے مصر خالی کر دیا ہے مگر مصری کسان کو کوئی سہولت نہیں مل پائی ہے، اس کی مفلسی اتنی ہی شدید ہے، اس کی بیماریاں وہی ہیں اور مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ اسی طرح بے روزگار ہے۔

جب ہم ہوٹل سے نکل رہے تھے تو میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ حال ہی میں ملیریا کی وبا نے ایک لاکھ جانیں تلف کی ہیں۔ اس بیماری کے مچھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ مغربی افریقہ پہونچے اور مصریوں میں تاب مقاومت تھی نہیں اس لئے وبا پوری طرح پھیل گئی۔

میں اس ڈاکٹر سے مصریوں کے مفلس اور مریض رہنے پر بات چیت کرتا رہا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کھل کر اظہار خیال نہیں کر رہا ہے کیونکہ وہ مذہبًا عیسائی تھا۔ میرے اس کہنے پر کہ آخر ہے تو وہ بھی مصری اس نے شدومد کے ساتھ کہا کہ وہ "بے میل مصری ہے!" پھر اس نے بتایا کہ:-

"اس بادشاہ کی طرح کے لوگوں نے مصر کی ترقی روک رکھی ہے۔ اس کے پاس دولت ہے اور جس طرح آپ نے دیکھا، عیش و عشرت میں پڑے ہیں"

اس قبطی ڈاکٹر کے خیالات و احساسات بھی وہی تھے جو بے شمار دوسرے مسلمان مصریوں میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی پسند خیالات رکھنے والے مصری بخوبی سمجھتے ہیں کہ صرف قوم پرستی کا نشہ سماجی اصلاح نہیں کر سکتا اور سمجھتے ہیں کہ مصر کی اقتصادی تباہ حالی میں ان بادشاہوں کی عیش پرستی کو بڑا دخل ہے۔ زیادہ مدت قائم نہیں رہ سکتی۔

وہ مصری جنہیں زراعت کی تعلیم ملی ہے بخوبی جانتے کہ مصر اپنی روئی کی پیداوار پر انحصار کر کے بیٹھا رہے۔ حالات زمانہ بدل رہے ہیں اور ایک دن آئے گا کہ مصری روئی بہت اعلیٰ ہونے کے باوجود دنیا کی منڈیوں میں نہیں بکے گی۔ جس طرح روس اور برازیل وغیرہ نے اپنی زرعی پیداوار کا رخ بدل دیا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ مصر بھی ایسا ہی کرے۔

ایک امریکی ماہر نے مصر کی کاشت کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ:-

"مصر کو روئی اور گیہوں کی کاشت گھٹا کر پھلوں کی کاشت بڑھانا چاہئے۔ مصر کی زمین [illegible] پیداوار [illegible] یورپ کا ایک [illegible] بنا دے گی۔ لیکن جب تک قانون آراضی [illegible] [illegible] مشکل ہوگا"

[illegible] مصر [illegible] سکتا ہے اور ایسا ہوا مصر [illegible] فلاح کے لئے نئی امیدوں [illegible]

بن جائے گا۔ لیکن اس غریب کو تو بیماریوں نے معذور بنا رکھا ہے۔
مصر کے زرعی سائنسداں اپنے ملک کی بہبود کے لئے بہت کچھ اور بھی سوچ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ڈیری فارم، شہد اور مرغی خانے وغیرہ کی انڈسٹری کو دیہات میں بڑھانا مصری فلاح کے افلاس کو کم کر دے گا اور اس کی غذا بھی بہتر ہو جائے گی۔
مصر میں ہر دس بارہ آدمیوں کے پیچھے ایک دودھ کا جانور ہے، امریکہ میں ہر پانچ آدمیوں کے لئے ایک۔ لیکن مصری اور امریکن مویشی کے دودھ دینے کی استعداد پر نظر کی جائے تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔
مصر نے امریکہ کے مختلف قسم کے انگوروں کی کاشت کی۔ یہ انگور اتنے اچھے تو نہ ہو سکے لیکن یورپ میں ان کی مانگ ہو گئی۔ اسی طرح کھجور، انجیر اور کیلے کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ پھلوں کے علاوہ پھولوں خاصکر گلاب کے پھولوں کی کاشت کرکے برآمد کی جا سکتی ہے۔
مصر کے تمام روشن خیال لوگ متفق الخیال ہیں کہ قانون آراضی کی اصلاح لازمی و لابدی ہے۔
حکومت مصر نے ایک وزارت سماجی بہبود کے کاموں کے لئے قایم کر رکھی ہے۔ اس وزارت کا ایک محکمہ فلاح کے بہبود کے لئے قایم کیا ہے۔ اس کا انچارج ڈاکٹر احمد حسین ہے۔ میں نے اس کی بہت تعریفیں سنیں تو اس سے ملا بھی۔ اور ان تعریفوں میں کوئی مبالغہ نہ پایا۔ ڈاکٹر حسین اپنا سارا وقت اور ساری قوت دیہاتی زندگی اور دیہاتی مسایل کے سمجھنے میں صرف کرتا ہے، اور بلاشبہ ان مسایل پر عبور رکھنے والا دوسرا آدمی مصر میں نہیں ہے۔ پورے قاہرہ میں وہ سب سے زیادہ مصروف آدمی ہے وہ کھل کے گفتگو کرتا ہے اور جتنی صاف گوئی سے بات کرتا ہے اتنا ہی صاف سوچتا بھی ہے، اور پھر اسی شدت سے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ حسین سخت قسم کا حقیقت پرست انسان ہے، اور یہی نہیں کہ وہ صرف دیہی مسایل کو سمجھتا ہے بلکہ مصری تعلیم یافتہ طبقے کے محسوسات و خیالات کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اس کی نظر کسان کی مصیبت اور تعلیم یافتہ مصریوں کی بغاوت، دونوں پر ہے اور ان دونوں کا باہمی تعلق اس کے پیش نظر ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے بولا :-
"ہم اپنی قوم کو اقتصادی بے بسی اور امراض میں مبتلا رکھنا چاہیں بھی تو نہیں رکھ سکتے۔ بلاشبہ مصر کو یورپ کا کیلیفورنیا بننا چاہئے۔ اس کی ہمیں اشد ضرورت ہے کیونکہ اس سے مصری عوام کی غریبی دور ہو گی۔ لیکن اس کام کے لئے دو اصلاحیں لازمی ہیں : ایک کاشتکاری کے طریقوں میں اور دوسری آراضی کی ملکیت کے قانوں میں۔ دو لاکھ ایکڑ پر روئی کی کاشت کے بدلے باغ لگائے جائیں اور سخت محنت کی جائے تو ...

دیہاتی بیروزگاروں کو روزگار مل سکتا ہے، لیکن زمیندار پاشاؤں کو اس پر آمادہ کرنا اور پرانے طریقے کو چھوڑنا مشکل کام ہے تاہم اگر مصریوں کی بھوک اور بیماری دور کرنا ہے تو مخالفت کی پرواہ نہ کرکے قانون آراضی میں تبدیلیاں کرنا لازم ہے۔ بیس لاکھ ایکڑ نئی زمین کو قابل کاشت بنانا ہے۔ یہ آراضی صرف ایسے کاشتکاروں کو دیجائے گی جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہے، اور کسی کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین کی ملکیت کا حق نہ ہوگا۔ چنانچہ زمینداروں کے پاس اگر سو ایکڑ سے زیادہ زمین ہے تو انکو اسکی آمدنی پر سو فیصدی ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ اسکے بعد زمیندار کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین رکھنا فایدہ بخش نہ ہوگا اور وہ ازخود حکومت کے ہاتھ بیچ ڈالیگا۔ سو ایکڑ زمین کی آمدنی سے یہ لوگ فارغ البالی کی زندگی گزار سکیں گے۔ فالتو زمین کی جو قیمت انکو حکومت سے ملیگی وہ خاص کر گھریلو انڈسٹری میں لگے گی جہاں ملکی ضرورت کا سامان طیار ہوگا ـــــ کسان جب اپنی آراضی کا خود مالک ہوگا تو اس کی آمدنی میں اضافہ اور زندگی کا معیار اونچا ہوگا، اور وہ گھریلو دستکاریوں کی پیداوار خرید کر استعمال کر سکے گا۔ چونکہ مصری کسان کو اپنی آراضی سے عشق ہے اور اس کی زندگی و مسرت آراضی ہی سے وابستہ ہے، اس لئے پیداوار میں ترقی لازمی ہوگی۔ بلاشبہ اسے آراضی کو بہتر بنانے کی تعلیم دیجائے گی، یہ محکمہ اسی کام کے لئے قایم ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ غریب کسان بہتر زندگی کا سخت آرزومند ہے، اس لئے وہ ہماری تعلیم کو لازماً قبول کرے گا۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ ان اصلاحات کو قانون کی صورت دینے کے بعد بھی کثرت آبادی کا مسئلہ باقی رہے گا، اس نے جواب دیا:۔

"ٹھیک ہے! لیکن ہم ہر کام ایک ساتھ شروع نہیں کر سکتے۔ میں ڈکٹیٹری کا قایل نہیں اور تدریجی ارتقاً کو مانتا ہوں۔ ہمارے نوجوان انقلاب لانے کے لئے بے چین ہیں مگر میں تدریجی ترقی کو مناسب سمجھتا ہوں بلکہ ہماری تعلیمی ترقی کی اسکیم فلاحین کے اخلاقی اصلاح میں ہماری مدد کرے گی۔ ہم نے اس کی ابتدا کردی ہے۔ اسکولوں میں پانچ لاکھ بچوں کو دن کا کھانا مفت دیا جاتا ہے ـــــ دیہات میں کلب اور سوشل سنیٹر کھولے جارہے ہیں۔ گھریلو دستکاریاں پھیلائی جارہی ہیں۔ سولہ ہزار کوآپریٹو سوسائٹیاں کام کررہی ہیں۔ اس طرح ہم دیہات میں سماجی زندگی پیدا کررہے ہیں اور کرتے جائیں گے۔" میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ:۔ "زرعی اصلاحات کے قانون کا مسودہ طیار ہوچکا ہے اور وزارت نے اسے منظور بھی کرلیا ہے ـــ اصلاحات کی مخالفت کا زور بھی کم ہورہا ہے۔ اب وفد نے پروگرام کو "بولشوزم" نہیں کہا جاتا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر حسین نے کہا کہ "زمیندار یا تو سو ایکڑ زمین کی آمدنی پر قناعت کریں گے یا پھر چند روز اور عیش منالیں اور اس کے بعد اپنا سر قلم کرالیں!"

ڈاکٹر حسین کے یہ انقلابی لفظ میں نے اس سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں سنے تھے۔

گیارھواں باب

(نیا امتحان)

توریت میں آیا ہے کہ ابراہیمؑ کو خدا نے ترک وطن کی ہدایت کی اور وہ اپنے خاندان کو لیکر عراق سے نکلے کہ نئی چراگاہیں تلاش کریں۔ اس سے ابراہیمؑ کے شیخ قبیلہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ توریت کا حوالہ اس زمانہ کے انسان کے لئے قصہ کہانی کا درجہ رکھتا ہے، مگر ۱۹۲۲ء کی دریافت نے ثابت کر دیا ہے کہ قدیم عراق کا مرکز شہر اُر تھا جو ایک شاندار تمدن کا حامل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا وطن یہی شہر اُر تھا، اسوقت کا عراق کلدانی قوم کا گہوارہ تھا اور اس قوم کے کلچری کارنامے ہزاروں سال سے اسی سرزمین میں مدفون تھے جن کو اب کھود کر نکالا جا رہا ہے۔

تین ہزار سال پہلے شہر اُر خلیج فارس پر ایک بندرگاہ تھا، مگر آج اس شہر کی زمین ساحل سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور جا پڑی ہے۔ سمندر پیچھے ہٹتا رہا ہے۔ والٹرلوکڑر ملک نے نتیجہ نکالا ہے کہ پچھلے سات ہزار برس کے اندر سرزمین عراق پر گیارہ مختلف تمدن وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔ ان مختلف تہذیبوں نے جو آج فنا کی گود میں سو رہی ہیں نوع انسان کی تاریخ کو بعض حرکت میں لانے والے واقعات سے سنوارا اور اپنے امٹ کارناموں سے قوی بنایا ہے۔

راویوں کی زبان میں دو آبۂ دجلہ و فرات کی وادی انسانی تمدنوں کا گہوارہ ہے، اسی علاقے میں طوفانِ نوحؑ برپا ہوا اور مذہبی عبادت گاہیں قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے اسی سرزمین پر پیدا ہوا۔ ایک امریکن مورخ نے جماعتی عبادتگاہ بنانے کا سہرا یہودیوں کے سر باندھا ہے جن کو شاہ بابل بخت نصر قیدی بنا کر اپنے پایۂ تخت بابل میں لایا تھا۔ قدیم بابل اور آج کا عراق ایک ہی چیز ہیں۔ بابل کے اس سیناگاگ (یہودیوں کی مسجد) نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں جماعتی عبادت کی بنیاد ڈالی۔

الف لیلہ کا بغداد، عراق کا مرکز ہے جہاں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان اور نہایت طاقتور مملکت قایم کی تھی۔ عباسی خلافت کا مرکز و مستقر بغداد تھا جہاں معروف عام اور مقبول شہنشاہ ہارون رشید حکومت کرتا تھا۔ جس کی طاقت کا جواب اسوقت کی دُنیا میں نہ تھا۔

اس وقت کے عراق میں جیسی کاشت ہوتی تھی اس کی زرخیزی کی مثال یورپ اور ایشیا میں کہیں نہ ملتی تھی۔ کہاوت کے طور پر آتا ہے کہ زمین کرید دینے سے فصل مسکرانے لگتی تھی۔ ہیروڈوٹس نے اس ملک کی زرخیزی کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ ہیروڈوٹس کے علاوہ اس ملک کی زرخیزی کی شہادتیں دوسرے ذریعوں سے بھی ملتی ہیں، اور تصدیق ہوگئی ہے کہ "پرانے زمانے کا عراق "نہروں سے چمکتا اور غلے کے انباروں سے معمور رہتا تھا۔" آج کے مقابلہ میں قدیم عراق کی پیداوار تین گنی زیادہ تھی۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں شہر بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی، اور خوشحالی اور کلچری ترقی میں دُنیا کا کوئی پایۂ تخت بغداد کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ سرمارکس سائکس بغداد کا حال سُناتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

"شہنشاہی دربار شائستہ، شاندار اور بے حد متمول تھا۔ چاروں طرف شہر آباد تھا اور بیچ میں قلعہ تھا جہاں سے نظم و نسق کے احکام ہروقت جاری ہوتے رہتے تھے۔ ہر چیز کا محکمہ جدا تھا اور دفتروں کی باقاعدگی اُسوقت کی دُنیا میں بے مثال تھی۔ شہر بغداد سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا۔ تعلیم گاہوں کا شمار مشکل تھا۔ جہاں دُنیا بھر کے طلبہ، فلسفی، علماء اور شاعر آتے اور کسب علم کرتے تھے۔ دارالخلافہ کی طرح صوبائی مستقروں میں بھی عالیشان سرکاری عمارتیں تھیں۔ پوری مملکت میں ڈاک کا انتظام مکمل تھا۔ فوج وفادار، بہادر اور قاعدہ کی پابند تھی۔ گورنر اور وزراء متدین اور بردبار ہوتے تھے۔ عباسی مملکت صقلیہ سے مدارن تک اور مصر سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع مملکت میں نظم و نسق یکساں طور پر مضبوط تھا۔ سرکاری عہدوں پر عیسائی، یہودی، مسلم اور بے دین سبھی فائز ہوتے تھے۔ اس حکومت کے زمانہ میں جھوٹے پیغمبر، باغی جرنیل اور غاصب عمال یکسر مفقود ہوگئے تھے۔ تجارت کی وسعت اور دولت کی فراوانی نے قحط اور بغاوت کو وہیں سے نکال دیا تھا۔ وباء اور امراض کی روک تھام کے لئے سرکاری اسپتال اور شاہی مطب تھے۔"

عباسی خلافت کے دور میں علم و فن اور فلسفہ و مذہب اگر کہیں پھلا پھولا تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی کے اندر، باقی دُنیا میں ان چیزوں کا وجود نہ تھا۔ ایچ، جی ویلس لکھتا ہے کہ: "سائنسی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یونان کو اگر باپ کا درجہ حاصل تھا تو عربوں کو موجد یا لے پالک چاہیے

جدید زمانے کو علم کی روشنی لاطینی ذریعے سے نہیں، عربوں کے توسل سے ملی ہے۔

عربوں نے دوسرے کلچروں کو خاص کر یونانی اور ہندستانی کلچروں کو اپنی چیز بنا لیا تھا۔ صدیوں سے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات نے جھنجھوڑا اور عرب بیدار و متجسس ہو کر دنیا میں سب سے زیادہ تخلیقی دماغ ثابت ہوا۔ عرب ماہرین ریاضی نے ہم کو صفر اور الجبرا دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کیے، علم ہیئت کو نہایت بلند کر دیا اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کیے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں کہا جا سکتا۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم و ادب کی زبردست اشاعت کی اور یورپ کے لوگوں کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی بنا ڈالی جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بد نظمی کے گڑھے میں پڑے تھے، عرب لوگ اس وقت ساری دنیا کی ذہنی رہنمائی کا منصب ادا کر رہے تھے اور چار سو برس تک کرتے رہے۔

بغداد کو جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں میرے ساتھ ایک عراقی ماہر تعلیم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ

”یورپ کا (نشاۃ ثانیہ) مسلمان عربوں نے شروع کیا۔ افلاطون، ارسطو اور اقلیدس ہم نے یورپ کو دئے۔ ہمیں نے ان کو ریاضی، طب، ہیئت اور دوسرے علم مکمل کر کے دئے اور یورپ کو ایک متمدن بر اعظم بنا دیا۔“

یہ عراقی بھی وہی کچھ کہہ رہا تھا جس کا یورپ کے تاریخ نویسوں نے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کے بیان میں زور زیادہ تھا۔ بلاشبہ یورپ عرب کلچر کا مرہون منت ہے۔ میری اسلامی ملکوں کی سیاحت میں میں نے عراقیوں کو اس بات کو بار بار دہراتے سنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ عرب شہنشاہی کے کارناموں کو دہرا کر پرانی عظمت و شان کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں۔ عراقیوں کو ایسے خوابوں کی صحیح اور حسب مراد تعبیر نکلنے کی مخالفت نہ تو علم الحیات کرتا ہے اور نہ تاریخی دلائل سے ہوتی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہوگی کہ عرب دنیا عہد نبوی کی طرح ایک بار پھر حرکت میں آجائے اور اسی طرح مستحکم بھی ہو جائے! عرب قوم نے جن اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثبوت اس زمانے میں دیا وہ صلاحیتیں اور قوتیں عرب دماغ میں آج بھی چھپی ہوئی ہیں۔ آج عرب دنیا سوئی ہوئی ہے اسے کسی محمدؐ کی ضرورت ہے جو اسے نیا الہام دے کر حرکت میں لے آئے!

اسلام نے ذہن انسانی کو کس قدر آگے بڑھایا اس کا اندازہ [illegible] مساجد و مقابر، باغات و محلات کے فن تعمیر سے ہو سکتا ہے۔

ہلاکو کے حملے نے بغداد کو تباہ کیا، ترکی حکومت نے قدیم نظام [illegible]

عراق کی قدیم شان و عظمت آج زیر زمین مدفون ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے بعض علمی ادارے اس شان و عظمت کے نشان و علامات زمین سے نکال کر اس کے کارنامے پیش کر رہے ہیں کہ عراق کیا کچھ رہ چکا ہے۔

۱۹۱۸ء میں برطانوی فوجوں نے عراق کو ترکوں کی حکمرانی سے آزاد کرایا لیگ آف نیشنز نے اس کی سیادت برٹش کے سپرد کردی، اس عرصے میں عراقیوں اور برطانیہ سے کئی سخت معرکے ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنے ملک کو آزاد و خود مختار بنالیا۔ عراقیوں کی جنگی اسپرٹ اس حکومت کی بالا دستی کو بھی گوارا نہیں کرسکتی، جس نے اسے چار سو برس کی غلامی سے نجات دلائی۔ لیکن آزاد و خود مختار عراق کی ہنوز ایک قوم بننے کے درمیانی منزل سے گزرتا ہے۔ وسطی مشرق کی تمام مسلم قوموں میں عراق سب سے زیادہ بےچین ہے وہ انتہائی جد و جہد کر رہا ہے کہ قدامت سے باہر نکل آئے وہ قدیم روایات اور جدید علوم کی کشاکش میں مبتلا ہے، اس کا ایک پاؤں پُرانی دُنیا میں ہے اور دوسرا نئی دُنیا میں۔ پہلی کی علامت صحرائی بدوی ہے جو آج بھی زمانہ ابراہیم کی طرح خانہ بدوش ہے اور دوسری فصیح و تیز انگریزی بولنے والا طالب علم ہے۔ آج عراق نہ قدیم ہے نہ جدید۔ ذہنی اور جغرافیائی، دونوں اعتبار سے وہ ایک چوراہے پر کھڑا ہے۔

وسطی مشرق کی تمام قوموں میں عراقی سب سے زیادہ جذباتی اور بےچین ہو جانے والی قوم ہے اندرون ملک کے معاملات یا بیرونی حالات میں کوئی قوم اتنی سریع العمل نہیں ہے جتنی عراقی قوم ہے۔ پچھلے چھبیس برس میں عراق کی حکومت ۵۰ مرتبہ تبدیل ہوئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازی طرفداری کا جتنا شدید اور کامیاب مظاہرہ ۱۹۴۱ء میں رشید الگیلانی نے کیا ویسا کسی ملک میں نہیں ہوا۔

حال میں ایک اور بغاوت ہوئی جو برطانیہ اور عراقی حکومت دونوں کے خلاف تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم صلاح جبر اور اس کی حکومت نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا۔ بغداد کے لوگوں نے اس معاہدے کی زبردست مخالفت کی۔ قتل و خون بھی ہوا۔ جبر کی حکومت گر بھی گئی مگر عوام کی بےچینی اور باغیانہ اسپرٹ ختم نہیں ہوئی۔ بظاہر سکون ہے مگر تہ میں بےچینی موجزن ہے۔ ملک کے اندرونی حالات اس تلخی میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ گرانی بے حد بڑھ گئی ہے اور حقیر درجے کی ضرورت زندگی کی فراہمی بھی مشکل ہے۔ بغداد کا ہوائی اڈا بہترین اڈوں میں سے ایک ہے جہاں جدید تمدن کا ہر سامان عشرت بہم ہے۔ اس پر عراقی فخر کرتا ہے لیکن اس سے اس کی تسکین نہیں ہوتی، عراقی مرد اور عورت، بوڑھا اور بچہ، روٹی اور کھجور کے لئے پریشان ہے۔

عراق میں زمینداری نظام نہیں تھا۔ ترکوں کے پنجے سے آزاد ہوتے وقت اگر زمین کو سرکاری ملکیت قرار دیدیا جاتا تو عراقی عوام اس بدحالی میں نہ ہوتے۔ لیکن اس وقت قبیلوں کے شیخ نے قبائلی علاقے کی زمین پر اپنا حق ثابت کیا اور وہ مان بھی لیا گیا۔ اس وقت سے زمینداری کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے اور منجملہ دوسرے اسباب کے فلاحین کی فاقہ کشی کا ایک سبب زمینداری بھی ہے۔ جس طرح سیاسی ناپختگی عراقی حکومتوں کے جلد جلد گر جانے کی وجہ ہے اسی طرح زمینداری نظام فلاح کی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔

صدیوں کے جمود تعطل کے باوجود احیائے ثانی کا جتنا روشن مستقبل عراق کا ہے اتنا کسی اسلامی ملک کا نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ عراق اس کام کے لئے دل وجان سے مستعد ہو جائے۔ مصر کے لئے ایک دریائے نیل غذا بہم پہونچاتا ہے، عراق کے پاس دو نیل ہیں، دجلہ و فرات، عراق میں نہ تو مصر کی طرح بارش کی کمی ہے اور نہ آبادی کا اتنا دباؤ ہے۔ عراق کی مردم شماری مصر کے مقابلہ میں ایک چوتھائی ہے اور قابل کاشت زمین مصر سے چوگنی ہے۔ اس کے علاوہ عراق کے پاس تیل کے چشمے بھی ہیں۔

عراق کی آب و ہوا گرم ہے لیکن میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ دن بھر کام کرنے کے بعد عراقی مزدور پژمردہ و مضمحل نہیں ہو جاتا۔ عراقی مزدور کو سست اور کاہل سمجھنا غلط ہے اس میں سستی اگر ہے تو ناکافی تغذیہ کا نتیجہ ہے۔ یا پھر دوسری بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مزدوروں کے سامنے کوئی وجہ تحریک نہیں ہے۔

زمانہ قدیم کی طرح عراق کی اہم پیداوار آج بھی غلّہ ہے۔ وہ تمباکو اور روئی کی کاشت بھی کر سکتا ہے۔ غلّہ کے علاوہ اس کے کھجور ہیں جو دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ عراق میں کھجور کے درختوں کی گنتی تین کروڑ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار ٹن کھجور برآمد ہوئی تھی۔

ترکی حکمرانی کے مقابلے میں عراقی حکومت نے زراعت میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آبپاشی چوگنی ہو گئی ہے کہیں کہیں کاشت میں مشینوں کا استعمال بھی ہونے لگا ہے۔

عراق کو یہ موقعہ حاصل تھا کہ زمینوں کو سرکاری بنا کر دوسرے اسلامی ملکوں کے لئے زرعی قانون میں اصلاحات کا دروازہ کھول دیتا، مگر اس نے وہ زریں موقعہ کھو دیا اور آج زمیندار بالادست ہے عراق میں کاشت بٹائی پر ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں کسان کو تیس فیصدی ورنہ چالیس فیصدی غلّہ ملتا ہے۔ اس میں سے اسے نہری ٹیکس وغیرہ بھی دینا پڑتا ہے، نقد کی صورت میں اس کے پاس شمالی علاقے میں چوبیس سے چالیس امریکن ڈالر، اور جنوبی علاقے میں اسے ڈیوڑھا پہونچتا ہے۔

عراقی کسان کا افلاس جلی حروف میں لکھا ہے۔ اوسط اموات مصر کی طرح یہاں بھی زیادہ ہے۔ ۱۹۳۶ء ۲۷۰ فی ہزار تھی۔ بچوں کی موت کا اوسط بھی ڈراؤنا ہے ۱۹۴۱ء میں ۲۲۷ دوسو ستائیس فی ہزار تھا۔ ہر سال سات آٹھ لاکھ انسان ملیریا کا شکار ہوتے ہیں۔ عراق میں بھی وہی بیماریاں عام ہیں جو مصر میں ہیں۔ بغداد میں اندھوں کی گنتی ساڑھے سات ہزار ہے اور اوسط زندگی چھبیس سال ہے۔

افلاس اور بیماریوں کی اس شدت میں برطانیہ و امریکہ کی مدد بھی کیا کام دیسکتی ہے پینتالیس لاکھ کی مردم شماری میں پنتیس لاکھ فلاحین کی تعداد ہے۔ زمین سے نہ فلاح کی محبت ہے نہ زمیندار کو۔ زمیندار چاہے تو فلاح کو ایک جگہ سے ہٹاکر دوسری زمین پر بھیجدیتا ہے اور فلاح بھی بہتر آراضی پا سکتا ہے تو پرانی کو چھوڑ دیتا ہے۔

عراق سے بہتر چراگاہیں دُنیا میں کہیں نہیں ہیں مگر مویشی کا اوسط عراق میں بہت کم ہے۔

قوت پیداوار کے لحاظ سے عراق سب سے زیادہ دولت مند ملک ہوسکتا ہے مگر سب سے زیادہ مفلس ہے۔ یہ نوزائیدہ قوم شدید قسم کی سیاسی توم ہے مگر استحکام سے محروم ہے۔ عراق کا تعلیم یافتہ طبقہ آس پاس کے ملکوں میں لبنانیوں کے علاوہ سب سے زیادہ پختہ مغز ہے لیکن عراق کا زمیندار سب جگہ کے زمینداروں سے زیادہ ناسمجھ اور ضدی ہے۔

عراقی لوگ عرب بھی ہیں اور مسلم بھی مگر محمدؐ کے یہ الفاظ بھلا چکے ہیں کہ "میں نے تمھیں زمین دے کر برکت دی ہے! کھاؤ اور پیو اور ضایع مت کرو"!

بارھواں باب

(تل عفیف)

فلسطین کے ہوائی اڈے سے ایک امریکن ہوا باز نے مجھے اپنی کار میں شہر پہونچایا۔ راستے میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پہلی دفعہ تل عفیف آیا ہوں۔ میرے بتانے پر کہ یہ میری پہلی سیاحت تھی اُس نے کہا:-

"یہ شہر ایسا ہے جہاں امریکن اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ وہ امریکہ ہی میں ہیں۔ اکثر امریکن چھٹیاں منانے یہیں آتے ہیں۔"

تل عفیف کی تعریفیں میں نے اکثر سنی تھیں، اور عفیف کا نظارہ میرے لئے حیرتناک نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن جب میں شہر کے اندر داخل ہوا تو میری حیرت کی حد نہ تھی۔ دن ڈھل رہا تھا، ہماری موٹر آہستہ خرامی سے کشادہ بازاروں سے گزر رہی تھی، اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں جسمانی و روحانی دونوں اعتبار سے کسی معجز نما شہر میں پہونچا دیا گیا ہوں۔

شہر زندگی اور زندگی کے ہنگامہ سے معمور تھا۔ ہر سڑک پر موٹروں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں۔ پٹڑیاں پیدل چلنے والوں سے بھری تھیں، اور دوکانیں مال اسباب سے۔ دوکانوں کی رونق و نمائش دیکھنے کے قابل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی حرکت زیادہ اور شہر چھوٹا ہے، جیسے کسی نوجوان کو اس کے بچپن کے کپڑے پہنا دئے جائیں۔

یہاں نہ تو کثیر دولت کی علامت تھی اور نہ شدید افلاس کی۔ نہ تعیش کے نشان تھے نہ احتیاج کے مصر و ایران کی طرح یہ دو انتہائی صورتیں تل عفیف میں کہیں نظر نہ آتی تھیں۔ گداگروں کی قطاریں اور گلیوں میں بے والی وارث چھوکرے مفقود تھے۔ باربرداری کے اونٹوں اور گدھوں کے قافلے نظر نہ آتے تھے، چونکہ مال و اسباب کی ڈھلائی موٹر ٹرک سے ہوتی ہے، انجن نے انسانی مشقت کو ہلکا کر دیا ہے

ہوا کے ساتھ گرد کا اڑنا البتہ ثابت کرتا تھا کہ صحرا قریب ہے، یا پھر لاؤڈ اسپیکر عبرانی زبان کی وجہ سے بتاتا تھا کہ یہ امریکہ نہیں ہے۔

مجھے اسلامی ملکوں میں سفر کرتے چھ مہینے ہو چکے تھے اور ہر موقعہ پر یوروپین ڈاکٹروں سے یہی سنا تھا کہ کھانے پینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ بس میں سفر کرتے ہوئے ایرانی ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی تازہ و خوشرنگ انگور خرید کر کھائے تھے اور اس کے جرمانے میں معدے کی شکایت میں مبتلا رہ چکا تھا، لیکن تل عقیف پہونچ کر میں نے نل کا پانی نہایت آزادی کے ساتھ پیا اور ہوٹل کی خادمہ سے سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوئی کہ پانی اُبال لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی احتیاط کرنا میرے اوپر لازم ہو گیا تھا، لیکن یہاں کے بازار میں تازہ پھل اتنے اچھے معلوم ہوئے کہ میں نے ایک تھیلا بھر خریدے اور ان کو کھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں قسمت سے نیچے اڑا رہا ہوں۔

بازار بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ عمارتیں یک منزلہ ہیں اور بالعموم سفید۔ اونچی عمارت بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قاہرہ کی طرح یہاں بھی کیفے اور ریسٹوراں بکثرت ہیں۔ چائے اعلیٰ قسم کی ہر جگہ پینے کو ملتی ہے۔ قہوہ، امریکن مذاق نہیں بلکہ یورپین ڈھنگ پر طیار کی جاتی ہے۔ بیرے خدمت گار مہذب اور مستعد ہیں۔

تل عقیف اگرچہ ریگزار پر آباد ہے مگر وہاں سبزہ زار کی کثرت ہے۔ چار میل لانبے ساحل کے ساتھ ساتھ خوشنما پارک ہیں جن میں خوبصورت صحرائی سرو اور دوسرے درختوں کی قطاریں دل کو بھاتی ہیں۔ تل عقیف آباد کرکے یہودی قوم نے فطرت کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیدیا ہے، باغ و راغ کی کثرت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ریگستان سے جنگ کرنے میں یہودیوں نے پوری طرح معلوم کر لیا ہے کہ وہاں کس قسم کے درخت نشو و نما پا سکتے ہیں۔ یہ شہر جدید تعمیر ہے مگر اس میں عمارتی شان و عظمت کا نہیں بلکہ نفاست و آرام کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ صرف ایک کالج کی عمارت ہے جس پر گنبد نظر آتا ہے ورنہ سب جدید وضع کی عمارتیں ہیں۔ یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ شہر کی تعمیر میں عہد انجیل کا کوئی خیال درمیان نہیں آیا۔ اور مصر و ایران کے برخلاف اس شہر کی کوئی چیز قدامت کی یاد نہیں دلاتی۔ سڑکوں اور بازاروں کے نام البتہ انجیل سے لئے گئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان لوگوں کے نام پر بھی بازار آباد کئے گئے ہیں جنھوں نے صیہونی تحریک سے ہمدردی کی ہے۔

پوری دنیا میں تل عقیف ہی خالصًا یہودی شہر ہے، جسے یہودی ہاتھوں نے بنایا اور جس میں یہودی ہی آباد ہیں، یہاں یہودیوں کی حکمرانی ہے اور جس کی دولت و ناموری یہودیوں ہی کے باعث ہے

جہاں عبرانی سرکاری زبان ہے۔ (البتہ انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ حاصل ہے اور بوڑھے بچے ٹیکسی ڈرائیور اور پولیس میں بھی انگریزی بول سکتے ہیں) سڑکوں کے نام کی تختیاں عبرانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اسکولوں میں عربی بھی لازمی مضمون ہے۔

فلسطینی یہود کی نئی نسل جو نفرت کی آب و ہوا میں پیدا ہوئی اور مجادلے کے ماحول میں پروان چڑھی نہایت مضبوط و جفاکش ہے اور جتنی جفاکش ہے اتنی ہی خوش و خرم بھی ہے۔ یہودی نوجوان جس انہماک سے کتابوں پر جھکے دکھائی دیں گے، اسی ولولے سے ہل بھی چلاتے نظر آئیں گے۔ اس نسل کے دل میں داخلی یا خارجی قسم کا کوئی خطرہ جگہ نہیں پا سکا ہے۔ وہ بڑی بے خوف نسل ہے، اور اپنے ماضی یا مستقبل کو جذبات کی عینک سے دیکھنا نہیں جانتی۔ وہ تحقیر و تذلیل کو برداشت کرنا نہیں جانتی، کیونکہ اس نئی نسل میں خود اعتمادی اتنی ہی وسیع ہے جتنا تل عفیف کا آسمان وسیع ہے۔ ایک انیس سال کے لڑکے کے الفاظ ہیں:

"آنسو بہانا ہم بھول چکے اور رحم کی التجا کرنا چھوڑ چکے ہیں! ہمارے باپ دادا کے طریقے اب ہمارے کام کے نہیں، ہم یا تو جئیں گے یا مر جائیں گے!"

یہ لڑکا جس وقت یہ بات کہہ رہا تھا تو اس میں جوش و جذبہ مطلق نہ تھا بلکہ نہایت سکون و سنجیدگی کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جو خیال و احساس لڑکوں میں ہیں وہی لڑکیوں میں بھی پائے جاتے ہیں، لڑکیاں نیکر پہنتی، بال ترشواتی اور غازہ لگاتی ہیں۔ مگر ان میں مصر و ایران کی جدید لڑکیوں کی سی نزاکت آبیاں نہیں ہیں بلکہ وہ بیسویں صدی کی بچیاں ہونے کے اعتبار سے اس نظریہ کی قایل نہیں کہ مرد ان سے زیادہ مضبوط اور زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ وہ آنسو بہانے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے کو نسائیت کا زیور نہیں سمجھتی ہیں۔ ہوٹل میں میری ملاقات ایک یہودی لڑکی سے ہوگئی، میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ لڑکیوں کا دہشت انگیز جماعت میں شامل ہونا پسند کرتی ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ:-

"میں ہر اس بات کو پسند کر سکتی ہوں جو ہمیں ہمارے وطن کو آزاد رکھنے کے لئے ضروری ہو۔"

۱۹۰۹ء میں جافہ کے ساٹھ یہودیوں کی جماعت نے، جافہ کے مضافات میں تل عفیف کی بنیاد ڈالی تھی اُسوقت تل عفیف کا وجود ایک واہمہ و خیال کا درجہ رکھتا تھا اور آج کا شہر ایک ٹھوس حقیقت ہے مشینوں کی مدد کے بغیر صرف ہاتھوں کے اوزاروں سے کام لیکر جافہ کی ایک نئی مضافاتی آبادی قایم کرنا اس جماعت کا مقصود تھا۔ ریگزار سے مقابلہ کرنا یقیناً حوصلے پست کر دینے والا تھا، لیکن اس چھوٹی سی جماعت کا جوش اور جذبہ کسی وقت کمزور نہیں پڑا۔ ابتدا میں صرف تین سو آدمی وہاں آباد ہوئے تھے۔ اچانک پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ترک حکمرانوں نے ان یہودیوں کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا۔ لیکن

۱۹۱۸ء میں جب اتحادیوں کی فتح ہوئی تو وہ یہودی پھر وہاں جاکر آباد ہوگئے اور آبادی اٹھارہ سو ہوگئی۔ پھر دُنیا کے مختلف حصوں میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ یہودی ترک وطن کرکر کے تل عفیف میں آباد ہوتے رہے، ۱۹۲۱ء میں بارہ ہزار، ۱۹۶۲ء میں ایک لاکھ بیس ہزار اور آج دو لاکھ کی آبادی ہے۔ شہر کی تعمیر جاری ہے، تل عفیف کے "ٹاؤن کلارک" مسٹر ندیوی نے مجھے بتایا کہ" ان کا مقصد یہ ہے کہ ہر کنبے کے پاس اپنا ذاتی مکان ہو"۔

فلسطین کو وطن بنانے والوں میں بہت سے قابل اور ماہرین فن بھی شامل تھے جنھوں نے شہر کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ آج کچھ بوڑھی عورتوں کے علاوہ وہاں کوئی بے پڑھا لکھا نہیں ہے۔ ۱۹۶۲ء کے ایک کروڑ ڈالر کے بجٹ میں سے سٹی کونسل نے تیس لاکھ ڈالر صرف تعلیم پر خرچ کئے تھے۔ بچّوں کی تربیت اور تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دیجاتی ہے۔ اسپورٹس کی بڑی قدر ہے۔ نشر و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، دو لاکھ کے شہر میں بارہ روزنامہ اخبار نکلتے ہیں۔ دس عبرانی زبان میں اور دو جرمن زبان میں، کیونکہ جرمنی سے آئے ہوئے یہودی عبرانی زبان کے ماہر نہیں ہوسکے ہیں۔ اس وقت بہت زیادہ کام دوسری زبانوں کے کلاسکس کو عبرانی میں منتقل کرنے پر ہو رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں کتب فروشوں کی دوکانوں کی کثرت ہے اور پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں دوسرے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح تین لاکھ ڈالر سالانہ کے اخبار رسالے دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ شہر میں پانچ بڑی لائبریریاں ہیں۔ اصفہان میں میں نے دو لائبریریاں دیکھیں جہاں کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک محدود ہے۔ تل عفیف میں موسیقی کو بھی بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ تھیٹر روز افزوں ترقی پر ہے اور دُنیا کے بہترین ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔

تل عفیف میں ایک کلچری ادارہ ایسا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ہے وہاں کی پریس ایسوسی ایشن ہر پندرھویں دن ایک ادبی اجتماع کرتی ہے جس میں اڈیٹر، اخبار نویس، ادیب و شاعر جمع ہوتے اور اپنا تازہ کلام پیش کرتے ہیں۔ اس شہر میں اظہار خیال کی کامل آزادی ہے اور یہاں کا ادب کسی سیاسی نظریے کے سانچے میں ڈھل کر نہیں نکلتا، حالانکہ تل عفیف کلچری اعتبار سے اس وقت کڑھاؤ میں اُبل رہا ہے۔

یہاں سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں (بلونڈز) اس کثرت سے ہیں جتنی آپ نیویارک یا پراگ میں دیکھیں گے۔ میں نے جب اس حقیقت پر حسرت ظاہر کی تو ایک ممتاز اہلِ قلم نے کہا کہ:-

"شاید خدا کی مرضی یہی ہے!"

حافہ کے عرب باشندے بھی سامی النسل ہیں مگر ان میں اور فلسطین کے یہودیوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ زبان اور عادات و اطوار سے قطع نظر جسمانی ساخت میں بھی فرق ہے اور ذہنی انداز بھی مختلف

ہے۔ تل عفیف کے یہودی خود بھی پچاس مختلف قوموں کا مجموعہ ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ بچے بھی جو فلسطین میں پیدا ہوئے ہیں، سامی نسل کے نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں یہودیت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی اس پہلو سے بھی فلسطین ایک اونٹنا ہوا کڑھاؤ ہے۔

تل عفیف کے لوگ بالعموم یورپین وضع کا لباس پہنتے ہیں جو یورپین کم اور امریکن زیادہ ہے۔ میں نے لوگوں کو اتنا خوش پوش دیکھا تو سوال کیا کہ کیا یہاں کوئی شخص غریب نہیں ہے۔ تو میرے ایک دوست نے جواب دیا:-

"بلاشبہ یہاں غریب بھی ہیں، لیکن سب متمدن ہیں"

الغرض تل عفیف اتنا مصروف و منہمک شہر ہے اور وہاں اس قدر حرکت و عمل ہے کہ دو لاکھ کی آبادی پانچ لاکھ کی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی شخص نکما اور بیکار نہیں، تجارت و صنعت، طباعت و اشاعت ادب و علم، موسیقی و رقص سبھی پر کام ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ میں تل عفیف ہی ایسا شہر ہے جہاں چودہ سال سے کم عمر بچے سے کام لینا جرم ہے اور یہ قانون نافذ العمل بھی ہے۔ تل عفیف اب ہیرا تراشی کا خاص مرکز بن گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اس کی ہیرے کی برآمد سوا دو کروڑ ڈالر کے قریب تھی۔ اس شہر میں شان و شوکت کی نمائش کا سراغ نہیں ملتا اور محنت و مشقت کے علامات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

دوران گفتگو میں ایک جرمن یہودی نے مجھ سے کہا:-

"ہم نے اگر ریگستان پر فتح پاکر اسے باغوں سے ڈھک دیا ہے تو ایک دن ہم عربوں سے معاملہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے"

ان الفاظ میں سمجھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

تیرھواں باب

(ایک نیا سماج)

جس روز میں نے فلسطین کی سرزمین پر قدم رکھا اُس کے دوسرے ہی دن سے سخت قسم کی بارش شروع ہوگئی۔ چونکہ فلسطین پہونچ کر (قاہرہ وطہران کی جمودی حالت دیکھنے کے بعد) مجھے حرکت وعمل کے دیکھنے کا پہلا موقع ملا تھا، اس لئے مجھے فلسطینی دیہات سے بڑی توقع ہوگئی تھی۔ بارش کی کثرت یقیناً میری دیہاتی سیاحت میں حارج ہوتی اگر فلسطین کی بہترین سڑکیں میری مدد نہ کرتیں۔

پہلے میں اس گاؤں میں پہونچا جس کا نام غوات برنیر ہے۔ اس کے متعلق مجھ سے بڑی تعریفیں کی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ یہ محض مثالی اور نمونے کا گاؤں نہیں ہے جیسا عام طور سے تقریباً ہر ملک میں ہورہا ہے بلکہ پورے فلسطین میں سب سے زیادہ سائنسی طریق پر منظم اور پوری دُنیا میں ایک نئے سماج کی حیرتناک لیباریٹری (معمل) بھی ہے۔ گاؤں کی پوری آبادی جمہوری اصولِ خود مختاری پر امدادِ باہمی کے طریقوں پر کاشت کرتی اور زندگی گزارتی ہے۔ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے، نہیں کہا جا سکتا مگر بحالت موجودہ اس میں شک نہیں یہودیوں نے نہ صرف طریق کاشتکاری بلکہ طرزِ زندگی کو بدل کر معجزہ پیش کیا ہے۔

اپنی سیاحت میں میں نے زراعت کے ترقی پسند طریقوں کا خاص طور پر معائنہ کیا ہے، اور کناڈا میں رہ کر وہ گاؤں میں نے دیکھے ہیں جہاں DUKHBOR جماعت کے لوگ زارِ روس کے جبر وتشدد سے بھاگ کر آباد ہوئے تھے اور مذہبی عقیدے کی طرح نجی ملکیت کے خیال کو تیاگ کر مشترک زراعت پر منظم ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کی جفاکشی نے ان کو اپنے مقصد میں کامل طور پر کامیاب کیا، مگر چونکہ جدید تعلیم اور کلچری ترقی سے متنفر رہے اس لئے یہ جماعت اپنے لیڈر کی محکوم بن کر رہ گئی۔ جن دنوں میں وہاں گیا تھا، انکا لیڈر پیٹر وویری گین تھا جو کسی طرح روسی زار سے کم نہ تھا۔ بجز اپنے لیڈر کی حکمرانی کے یہ جماعت کسی

ور کے تحکم سے واقف بھی نہ تھی۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا ان کا فرض ہے۔ پیٹر جب سفر کرتا ہے تو دو
وجوان لڑکیاں اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بلا شبہ ان لوگوں نے مشترک کاشت میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے
مران کے لیڈر نے ان کو جو سماجی درجہ دیا ہے، اگر ٹالسٹائی اس کو دیکھتا یا تصور میں لاسکتا تو رو پڑتا۔
یہ روسی کاشتکار ٹالسٹائی کی مدد سے روس سے نکل کر کناڈا میں آباد ہوئے تھے۔

اسی طرح میں نے روس میں مشترک کھیتی کا قانون جاری ہونے سے پہلے شمالی قفقاز کی دو آبادیاں
دیکھی تھیں جہاں مشترک زراعت قایم ہو چکی تھی۔ ایک آبادی روسیوں کی تھی دوسری فنیتوں کی اور یہ
سب امریکہ میں اچھی کاشتکاری کر کے خوشحالی سے بسر کرتے تھے۔ مگر جب روس میں انقلاب کامیاب ہو لیا
تو یہ لوگ اپنا سامان اور زمینیں فروخت کر کے روس چلے آئے اور مشترک سرمائے سے مشترک زراعت کرنے
میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ امریکہ سے بہترین قسم کے آلات زراعت ساتھ لائے تھے اور امریکن کاشت کے
جدید طریقوں سے واقف تھے۔ ان دونوں بستیوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ نمونہ و نمایش کی چیز بن گئیں
ان کا کلچر اور زندگی معیار آس پاس کے دیہات سے بلا شبہ بہت اونچا تھا۔ لیکن جب روس میں مشترکہ
کھیتی کی اسکیم پر عمل درآمد ہوا تو یہ دونوں بستیاں بھی اس میں مدغم کر دی گئیں۔

چونکہ یہ مثالیں میرے تجربے میں آچکی تھیں اسلئے فلسطین کے اس گاؤں کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا تھا
مشترک کاشت و زراعت کے تجربے اکثر کئے گئے، کہیں ناکام رہے اور کہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی
یا ایک پہلو سے پوری کامیابی ہوئی اور دوسرے پہلو سے تشنہ رہے۔ لیکن فلسطین میں یہ تجربہ بہمہ وجوہ کامیاب
ہے۔ یہ مشترک کاشت و مشترک سماج کسی سیاسی نظر سے بوجھل نہیں ہے اور اس کو کامیاب بنانے
والے یہودی نوآبادکاروں نے اپنے لئے ایک معزز مقام حاصل کر لیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں
ایسی نوآبادیوں کی تعداد ایک سو چھیاسٹھ تھیں اور اب برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔

یہودی دماغ نے اس اشتراک عمل اور امداد باہمی کا جو کارنامہ پیش کیا ہے اس کی اہمیت کا پورا
اندازہ کرنے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہاں ابھی تک اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی قانون جاری
نہیں ہے۔ زیادہ زرخیز اور نفع بخش علاقے اس وقت بھی نجی ملکیت ہیں جن میں حکومت یا سماج
کسی طرح مخل نہیں ہو سکتی۔

اس صدی کے اوایل میں جب یہودیوں نے زمینیں خریدنا شروع کیں تو ان کے وہی تیور تھے جو عرب
زمینداروں کے ہیں۔ یہودی زمیندار بھی ایک نیا آفندی بن گیا تھا۔ چنانچہ یہودی زمیندار اور یہودی
مزدوروں میں مزدوری کی کشاکش ضروری ہو گئی، اور بالآخر مزدور اس نتیجے پر پہونچے کہ اس بلا سے

نجات صرف امداد باہمی کے اصول پر عمل کرنے سے مل سکتی ہے، اس خیال و تصور کو تعلیم یافتہ طبقے کی ہمدردی سے بھی تقویت پہونچی، جس میں صیہونی تحریک کے لیڈر بھی شامل تھے۔ جوزف بنیسیل نے جو دغانیہ نو آبادی کے ڈائریکٹروں میں سے ایک ہے، لکھا تھا کہ:۔

"کاروبار زراعت میں ہم امن کے خواہشمند ہیں، ہم نے کھیتوں میں مزدوری کی ہے اور اس تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں"

فلسطین میں امداد باہمی کے اصول پر آباد ہونے والے لوگوں کو "یہودی قومی فنڈ" سے زمین خریدکر بلاقیمت دیدی جاتی ہے۔ البتہ دو فیصدی سالانہ بطور لگان کے وصول کیا جاتا ہے شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ زمین لینے والے مزدور کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود کاشت کریں گے۔ اس شرط کی خلاف ورزی کرنے پر زمین سے بیدخل کئے جاسکتے ہیں ورنہ اُنچاس برس کا پٹہ ہی عملاً دائمی پٹہ ہوتا ہے اور وہ زمین کاشتکار کی اولاد میں وراثتاً بغیر رجسٹری کے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ فصل خراب ہوجانے کی صورت میں لگان کی رقم بتدریج وصول کی جاتی یا معاف ہوجاتی ہے۔ ان شرایط کی وجہ سے کسان اپنی زمینوں کو بہترین حالت میں رکھنے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ اور کاشتکار کے یہ حقوق صرف یہودیوں کے لئے نہیں بلکہ عربوں کے لئے بھی ہیں۔

اس حقیقت کا اندازہ کرلیا گیا ہے کہ اصول اشتراک پر کاشت کرنا اور سوشلزم کے اصول پر دیہاتی نظام بنانا مخصوص طبع مزاج کے لوگوں کے لئے ہی مناسب ہوسکتا ہے، سب کے لئے نہیں۔ اس لئے ایسے گاؤں الگ آباد کئے گئے ہیں جن کو چھوٹے کاشتکاروں کی آبادیاں کہا جاتا ہے۔ اس تنظیم میں ایک کنبہ کو اکائی بنایا گیا ہے اور اس لئے کہ چھوٹے بیوپاری کا مال نسبتاً کم قیمت پاتا ہے، ایسے ہر گاؤں کی ایک کوآپریٹو بھی بنا دی گئی ہے، اور بڑی مشینیں جنھیں ایک کاشتکار نہیں خرید سکتا، مشترک سرمائے سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ کوآپریٹو گاؤں کی ضرورت کی ساری چیزیں اکٹھا خرید کرتی اور اسکی ساری پیداوار اکٹھا کرکے فروخت کرتی ہے کوئی بیمار پڑتا ہے تو پڑوسی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کی کاشت پر جاکر کام کریں۔ گاؤں کے اجتماعی کام گاؤں پنچایت طے کرتی ہے۔ ۱۹۴۸ء تک ایسے تراسی گاؤں آباد ہوچکے تھے۔

جن لوگوں کی انفرادیت پسندی کو اتنا بھی گوارا نہیں، ان کے لئے ایک اور اسکیم جاری کی گئی ہے جسے درمیانہ کاشتکاری گاؤں کا نام دیا گیا ہے۔ ایسی آبادیوں کے لوگ جتنا ان کی پونجی ساتھ دیتی ہے، زمینیں خرید لیتے اور اس پر خود کاشت کرتے ہیں اور مزدور بھی لگا سکتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء تک ایسی

نوآبادیوں کی تعداد پینتیس تھی۔

ان نوآبادیوں میں یورپ سے آئے ہوئے وہ یہودی زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جو تعلیم یافتہ ہیں یا شہروں سے آئے ہیں۔ یورپی دیہات کا آدمی اتنا زیادہ کامیاب نہیں ہے۔

غرض، جب ہم موٹر سے غواط برنیر جا رہے تھے تو راستے میں بہت سے گاؤں پڑے اور پھر پہاڑی کے ڈھلان پر چڑھ کر ہم غواط برنیر پہونچے۔ اس گاؤں میں بارہ سو پچاس آدمیوں کی آبادی ہے۔ چھ سو پچاس بچے ہیں اور چھ سو مرد عورت ہیں۔ ہر چند یہ سب یہودی ہیں مگر مختلف آب و ہوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے ہیں، جنھیں کاشتکاری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو یہودی بھی نہیں سمجھتے۔ اٹلی کے یہودی اپنے تئیں یہودی مذہب کے اطالوی کہتے اور سمجھتے تھے، ایسے ہی عیسائی اپنے تئیں اطالوی کیتھولک سمجھتے تھے۔ قومیت سب سے بالاتر تھی لیکن جب مسولینی پر ہٹلر کا سایہ پڑا تو ان یہودیوں کو بھی سامی دشمنی کا تجربہ ہوا۔ اور یہ لوگ وطن میں غریب الوطن بن گئے، وطن بہرحال تلاش کرنا تھا اور وہ انھوں نے فلسطین کو بنایا، اور غواط برنیر میں بس گئے۔

یہ گاؤں ۱۹۳۹ء میں آباد کیا گیا۔ پہلی جماعت جب اس مقام پر پہونچی تو کوئی گاؤں یا مکان نہ تھا صرف زمین تھی۔ ڈیروں میں سکونت اختیار کر کے یہ لوگ کام میں جٹ گئے۔ شروع میں صرف پچیس ایکڑ زمین جوتی گئی۔ جب آبادی بڑھی تو زمین بھی اور مل گئی۔ اب یہ چھ سو کاشتکار بونے نو سو ایکڑ زمین پر کاشت کرتے ہیں۔

ایک ایک مکان کے اندر جاکر اور کھیتوں پر پہونچ کر ان کی سلیقہ شعاری دیکھی تو حیران رہ گیا کسی جگہ جنگلی جڑی بوٹی بھی تو نظر نہیں آئی۔ البتہ حال کی بارش سے کچھ کلّے پھوٹ آئے تھے۔ پنتالیس ایکڑ زمین پر باغ ہی باغ ہیں، جہاں سیب، نارنگی، انگور، لیمو اور دوسرے پھل اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں جتنے کیلیفورنیا کے۔ بعض چیزوں کی تو چار چار فصلیں اترتی ہیں۔

پورے رقبے میں ڈھائی سو ایکڑ نہری زمین ہے باقی بارانی۔ بارانی زمین پر غلّہ بویا جاتا ہے۔ ہر چند یہ زمین غلّہ پیدا کرنے کے لئے مناسب نہیں اور اوسط پیداوار بہت کم ہے لیکن فلسطین کے لوگوں کو کھانے کے لئے غلّہ بھی تو چاہیئے، نہری زمین گاؤں کی آبادی کے لئے بے حد فیض رساں ہے۔ پچھتر ایکڑ زمین پر چارہ کی غرض سے مکئی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاتی ہے جس کے بیج سے کھانے کا تیل بھی نکل آتا ہے۔ مزید تیس ایکڑ ترکاریوں کے لئے وقف ہے اور تین فصلیں اترتی ہیں جو غواط اور تل عفیف میں صرف ہوتی

ہیں۔ ساتھ ہی پھولوں کی کاشت بھی ہوتی ہے جو بہت نفع بخش ہے۔ باغات کے علاوہ ایک بڑا رقبہ تاکستان کا ہے۔

کاشت کرنے کے طریقے اتنے عمدہ ہیں کہ مجھے گاؤں سکریٹری سے پوچھنا پڑا کہ یہ لوگ اتنے ماہر کاشتکار کیسے بن گئے۔ اس نے ذرا سوچ کر جواب دیا کہ :-

"ہم اس پر مجبور تھے! اور چونکہ سب تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے سیکھ بھی جلدی لیا!"

سب سے زیادہ حیرت مجھے گاؤں کی ڈیری دیکھ کر ہوئی۔ مصر و ایران میں دو ایک جگہ کے علاوہ مجھے دودھ دینے والے اچھے جانوروں کے دیکھنے کی آرزو ہی رہی۔ غواط کی ڈیری جدید مشینوں سے آراستہ اور سفید ٹائل کی بنی ہوئی تھی، جس میں کہیں ایک دھبہ بھی نہ تھا۔ ڈیڑھ سو سے اوپر مویشی تھے۔ میں نے انھیں ہولسٹائن نسل کے سمجھا مگر سکریٹری نے بتایا کہ وہ سب فلسطینی نسل کے ہیں۔ دودھ کا سالانہ اوسط فی گائے ننانوے ہزار پونڈ تھا۔ دودھ بھی مشین سے دوہا جاتا ہے۔ اتنی چھوٹی سی آبادی نے ایک برف خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ حفظان صحت کے اصول اور ریفریجیریٹر مسلم ملکوں میں اہم مسئلے سمجھے جاتے ہیں مگر غواط میں بالکل معمولی باتیں ہیں۔ مختلف مشینوں کی مرمت کے لئے گاؤں کا لوہار ناقص تھا اور تل عفیف سے مستری بلانا طول امل تھا اس لئے اس آبادی نے ایک ورکشاپ بھی قایم کرلیا ہے جو صرف مرمت اور پرزے ہی بنانے کا کام نہیں کرتی بلکہ پوری مشین بنالیتی ہے۔ گھریلو دستکاریوں کو وسعت دینے میں اس ورکشاپ کا بڑا ہات ہے۔ وہاں لوہے کی ڈھلائی کا کارخانہ بھی چل رہا ہے ایک فیکٹری فرنیچر اور دوسرے لکڑی کے کام کے لئے جاری ہے اور ایک اور حشرات الارض مارنے والی دوائیں طیار کرتی ہے۔ مشین ہی سے کپڑے دھلتے، روٹی پکتی، کپڑے سلتے اور جوتوں کی مرمت ہوتی ہے۔ عمارتیں بنانے والا ادارہ الگ قایم ہے اور پہاڑی کی چوٹی پر ایک ویجیٹرین ہوٹل اور گاؤں والوں کی راحت گاہ ہے جہاں ایکسو بیس آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ پھلوں کو محفوظ کرنے کی ایک اور فیکٹری چل رہی ہے اور اس کا مال بیشتر انگلستان کو جاتا ہے۔ میں نے سکریٹری سے ایک مشین کے بارے میں پوچھا کہ کس کام کی ہے تو اُس نے بتایا کہ :

"اینیشیل آئل نکالتی ہے اور ہم نے خود ہی بنائی ہے، اب اس کی بہت مانگ ہے۔"

مزدوروں کا بیکار وقت گھریلو دستکاریوں میں صرف ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی وقت بیکار نہیں بیٹھتا۔ میں نے سکریٹری سے پوچھا کہ گزشتہ سال پورے گاؤں کی کل آمدنی کیا تھی تو اس نے بتایا :-

"۱۹۵۲ء میں ہماری کل آمدنی چار لاکھ پونڈ تھی۔ اس میں ایک لاکھ کاشت کا منافع تھا

اور تین لاکھ گھریلو انڈسٹری کا۔"

یعنی کام کرنے والے ہر آدمی نے دو ہزار چھ سو امریکن ڈالر کمائے۔ مشرقِ وسطیٰ میں یہ اوسط آمدنی بہت بڑی دولت ہے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ ہر آدمی کو نقد کتنا ملتا ہے تو اس نے کہا کچھ نہیں، یا برائے نام۔

میں نے پوچھا: "فرض کرو وہ کوئی کتاب ہی خریدنا چاہتا ہے؟"

اسنے جواب دیا کہ: "کتاب کے لئے وہ لائبریرین کو اطلاع دیدیگا اور کتاب آجائے گی۔"

میں نے پوچھا: "اچھا اگر کوئی نوجوان چاہتا ہے کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو تفریح کرانے لے جائے؟"

جواب ملا کہ: "اس صورت میں وہ خزانچی کے پاس جائے گا اور اسے مناسب رقم ملجائے گی لیکن وہ اگر اپنی بہن کو تفریح کرانا چاہتا ہے تو رقم کم ہوجائے گی۔"

یہودی قوم کی اس کواپریٹو کاشتکاری کی کامیابی پہ بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن آج تو زراعتی اور سماجی طریقے برتنے میں یہ کامیابیاں اپنا ثانی کہیں نہیں رکھتیں۔

جن لوگوں نے یہ سماجی انقلاب کر دکھایا ہے وہ بلاشبہ ٹالسٹائی، روسو اور کروپٹکین کے فلسفے سے متاثر تھے لیکن ان کی مشقت وجانکاہی دراصل حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ فلسطین کی پہلی مشترک کھیتی اور سوشلسٹ سماج ۱۹۰۹ء میں دغانیہ بستی آباد کرنے سے شروع ہوئی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ غواط میں اگر انفرادی کاشت کا طریقہ جاری ہوتا تو موجودہ صورت کا غواط کبھی وجود میں نہ آتا۔

اس بستی میں ہر میاں بیوی کے لئے ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے کا مکان ہے۔ باورچی خانہ نہیں ہے کیونکہ سارے گاؤں کا کھانا ایک جگہ پکتا اور ایک جگہ کھایا جاتا ہے۔ بچے، بچوں کے گاؤں میں رہتے ہیں۔ شام کو جب والدین اپنے اپنے کاموں سے فرصت پاتے ہیں تو بچے گھر آکر ان سے ملجاتے ہیں۔ چھٹی کا دن بھی بچے والدین کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ماں باپ اگر سیر تفریح کے لئے تل عفیعت جائیں تو بچوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ سال میں ماں باپ کو دو ہفتے کی چھٹی ملتی ہے، بچے ان چھٹیوں میں کبھی ماں باپ کے ساتھ جاتے بھی ہیں اور کبھی نہیں جاتے۔

بچہ پیدا ہونے کے چھ ہفتے بعد تک زچہ اسپتال میں رکھی جاتی ہے اور پھر چھ مہینے تک آدھے دن

کام لیا جاتا ہے ۔ باقی آدھے دن وہ نرسری میں اپنے اور دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے چھ مہینے کا ہو جانے کے بعد بچہ نرسری سے بچوں کے گاؤں بھیجدیا جاتا ہے۔ بچوں کی غذا، صحت، کھیل کود وغیرہ پر سخت توجہ دیجاتی ہے ۔ غواآط میں بچوں کی اموات کا اوسط چھبیس فی ہزار ہے جو دُنیا میں سب ملکوں سے کم ہے، خود پورے فلسطین کا اوسط چوالیس فی ہزار ہے۔ غواآط کا طبّی انتظام بھی اپنا ہے، اسپتال میں پندرہ بڑے اور سترہ بچوں کے پلنگ ہیں۔

غواط میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے۔ ثانوی تعلیم کو ناقابل ترک سمجھا جاتا ہے ۔ مگر چودہ سال کی عمر ہونے پر لڑکے لڑکیاں کھیت یا فیکٹری میں بھی کچھ وقت صرف کرتے اور سیکھتے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر ہونے پر لڑکا یا لڑکی خود طے کرتے ہیں کہ ان کو وہاں رہنا ہے یا کہیں اور ۔ ماں باپ مشورہ دے سکتے ہیں مگر جبر نہیں کرسکتے، جاکر پھر آجانا ممنوع نہیں ہے۔ نئے آنے والے کو ایک سال تک جانچا جاتا ہے کہ وہ مشترک زندگی کے لئے بنا بھی ہے یا نہیں اور اگر وہ موزوں سمجھا جاتا ہے تو گاؤں سماج کا ممبر بنالیا جاتا ہے ۔ سب سے بڑی جانچ اس بات کی کیجاتی ہے کہ نئے ممبر میں "سمجھوتہ" کرنے کی اسپرٹ ہے یا نہیں ۔

سکریٹری نے بتایا کہ :-

"یہ نظام ہماری زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کر دیتا ہے ۔ ہمارا مستقبل محفوظ اور یقینی ہے، رہنے کو مکان ہے، کھانے کو ہر چیز ہے، پہننے کو کپڑے ہیں اور جوتا، بچوں کی تربیت، تعلیم اور معالجے کی ہمیں فکر نہیں، اور بے روزگاری کا اندیشہ نہیں اور چونکہ ہمارے کاندھوں سے سارا بوجھ اُتار لیا ہے، ہمارے پاس کلچری مشاغل کے لئے بھی وقت رہتا ہے۔"

ایک دوسرے منتظم نے کہا کہ :-

"ہم عمارتوں وغیرہ پر جتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی مناسبت سے ہماری آمدنی بڑھتی اور کلچری معیار اونچا ہوتا ہے۔"

یقیناً غواآط کے لوگوں کا کلچری معیار دُنیا بھر کے دیہات سے بہت اونچا ہے۔ بارہ سو پچاس آدمیوں کی بستی کے لئے ایک لائبریری ہے جس میں بیس ہزار کتابیں ہیں، لائبریری کی عمارت میں بڑوں اور بچوں کے مطالعے کے چھ کمرے ہیں، جن میں اخبار اور رسالے بھی رکھے رہتے ہیں۔ ہال میں چھ سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں جس میں ایک اسٹیج بھی ہے ۔ اور تل عفیف سے ڈراما کمپنی اکثر آتی رہتی ہے ۔ ڈانس اکثر ہوتے ہیں، خود گاؤں والوں نے چوبیس آدمی کا ایک ارکیسٹرا قایم کر رکھا ہے۔ ایک گاؤں والے نے

مجھ سے فخریہ کہا کہ "ہمارے تو بوڑھے بھی رقص کئے بغیر نہیں رہتے!" اجتماعی رقص کی بھی مشق کرائی جاتی ہے، بوڑھوں اور بچوں، سب کے لئے کھیلوں کا انتظام ہے۔ تیراکی بہت زیادہ مقبول ہے۔ الغرض غوآطا شہری و دیہی زندگی کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔

شادیاں گاؤں سے باہر بھی ہوتی ہیں۔ لڑکی شادی کر کے شوہر کے ساتھ چلی جاتی ہے اور لڑکے اپنی بیویوں کو غوآطا لے آتے ہیں۔

اِس گاؤں کا سماجی نظام اس لئے کامیاب ہے کہ جمہوریت کے اُصول پر پورا پورا عمل کیا جاتا ہے۔ اس سوسائٹی پر اگر کسی کا تحکم ہے تو خود ان کا اپنا۔ ساری طاقت جنرل اسمبلی یا ٹاؤن میٹنگ کے ہاتھ میں ہے جو حسب ضرورت اجلاس کرتی رہتی ہے ہر سال ایک ایگزیکیٹو چن لیا جاتا ہے، وہ سال بھر کا پلان بنا کر پیش کرتا ہے اس پلان پر اسمبلی میں بحث ہو کر ترمیم و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر اس کی تعمیل شروع ہو جاتی ہے۔ ہر کام کے لئے ایک کمیٹی بن جاتی ہے۔

اس نئے سماج میں جس موضوع پر مطلق توجہ نہیں دی جاتی وہ سیاست ہے۔ چونکہ یہ تنظیم کسی سیاسی عقیدے کی تحت نہیں ہوئی بلکہ سماجی و اقتصادی بہبودی اس کا مقصد ہے، جسے وہ حاصل کر چکے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، کوئی کسی کے سیاسی خیالات میں مزاحم نہیں ہوتا۔

غیر ملکی اخبار نویسوں نے غوآطا کی اس زندگی کو شہد کے چھتے کی زندگی سے تشبیہ دی ہے جہاں انفرادی خواہش کا وجود نہیں ہے، اس کا جواب غوآطا کے ایک بوڑھے کے ان لفظوں میں ہے:

> "میں اگر دو چار ایکڑ زمین نجی طور پر کاشت کرتا ہوتا تو مجھے ڈراما دیکھنے یا ارکیسٹرا سننے تل عفیف جانا پڑتا، مگر چونکہ میں مشترک سماج اور زراعت کا ممبر ہوں ڈراما کمپنی اور آرکیسٹرا میرے یہاں چلے آتے ہیں۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سوشلسٹ نظام کا جس میں کامل طور پر امداد باہمی کے اصول پر کام ہوتا ہے ملک کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ظن و تخمین ہی سے دیا جاسکتا ہے۔ میرا پختہ خیال ہے کہ بستیاں بسانے میں اگر روپیہ کی افراط ہو تو یہ کامیابی ہرگز نہ ہوگی، غوآطا کی کامیابی لوگوں کی محنت مشقت کا نتیجہ ہے۔ غوآطا کی اسکیم تجربے کی حد سے باہر نکل چکی، اور محنت و قربانی کی منزل پر آچکی ہے۔ آج غوآطا جس منزل میں ہے وہاں پہونچ کر یہ سوال ہونے لگا کہ انسان صرف روٹی ہی کیلئے نہیں جیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے دلوں میں یہ آرزو بھی پیدا ہوگئی۔ کہ مکان بہتر ہو اس کی آرائش اچھی ہو، اپنا ریڈیو اور ریفریجریٹر ہو، وہ لوگوں کی دعوتیں کریں ا

خود دعوتوں میں جایئں ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی بہت سی خواہشیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس وقت میرے خیال کے مطابق تقسیم نقد کی ضرورت کا وقت ضرور آئے گا۔ میرے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فلسطینی لیڈروں نے غالبًا یہی اندازہ کرکے ایک نئی قسم کے گاؤں بسانا شروع کر دیا ہے ایسے گاؤں میں کاشت تو مشترک محنت سے ہوتی ہے مگر ماحصل افراد میں بٹ جاتا ہے تاکہ حسب منشاء و مرضی اسے خرچ کر سکیں۔

غوآطاسے تل عفیف پلٹتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ مصر و ایران اس اسکیم پر عمل کرکے کس قدر نفع اٹھا سکتے ہیں، ان ملکوں کا کسان اشتراکی محنت کو ہر چند پسند نہیں کرے گا مگر اسے اس کی کتنی شدید ضرورت ہے، مویشی کی نسل سدھارنے کی ضرورت ہے، اچھے بیجوں کے انتظام کی ضرورت ہے، کھیتی اور انسانوں کی بیماریوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے اور گھریلو دستکاریوں کے نفع کا پورا احساس کرنے کی ضرورت ہے!

چودھواں باب

(زمین کی حیاتِ نو)

یہ خیال عام ہے کہ شہری لوگ جسمانی مشقت پسند نہیں کرتے۔ اپنے پُرانے تجربے کی بناء پر میں بھی اسی خیال کا تھا۔ لیکن غواط برنیر کے تقریباً سارے باشندے شہروں کے رہنے والے تھے، فلسطین پہونچنے سے پہلے انھیں کدال پھاوڑے کا فرق بھی شاید معلوم نہ ہو۔ لیکن بیس سال کی مدت میں انھیں لوگوں نے محنت کا معجزہ کر دکھایا۔ بظاہر غواط کی بستی ایک معما نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں پڑھا لکھا آدمی اگر ارادہ کرکے دیہاتی زندگی اختیار کرلے تو سائنسی طریقوں پر عمل کرنے میں اسے تکلف نہیں ہوگا اور اس کی ذہانت اسے ایک بہتر کاشتکار بنا سکتی ہے۔ چنانچہ غواط کے ان کاشتکاروں کے ایک ہاتھ میں کھرپا اور دوسرے میں کتاب تھی۔ جس سرزمین پر وہ آپڑے تھے، قدرتاً انھیں اس سے گہرا لگاؤ ہونا چاہئے۔ اپنی زندگیوں کو نیا جنم دینے کا عزم بھی ان کے اندر لازمی تھا۔ سائنس کے ماہرین کے مشورے انھیں حاصل تھے۔ باہر سے مالی امداد بھی ان کے دست رس میں تھی۔ یہ تمام باتیں انکا قیمتی سرمایہ تھیں۔ بایں ہمہ ان کے پاس اگر جدید ترین مشینیں نہ ہوتیں تو ان کی کامیابی اتنی مکمل نہ ہوتی۔

ظاہر ہے کہ ان کے عرب ہمسائے خود تاریخ کے مجروح تھے اور ان کو کچھ سکھا نہ سکتے تھے۔ دیسی مویشی ویسے ہی خراب حالت میں تھے۔ جیسی فلسطین کی زمین، دودھ کا سالانہ اوسط فی مویشی تقریباً ساڑھے پندرہ سو پونڈ تھا (امریکہ کی گائے کا اوسط ساڑھے آٹھ ہزار پونڈ ہے اور ڈیری کا مالک ایسی گائے کو اپنے گلّے سے نکال دیتا ہے جو سال میں ساڑھے تین سو پونڈ مکھن نہ دیتی ہو) فلسطین کے نوآبادکاروں کے لئے بھی کم دودھ والے مویشی بے کار تھے۔ شام و لبنان کے مویشی بہتر ضرور تھے مگر تجارتی نقطۂ نظر سے وہ بھی کارآمد نہ ہوسکتے تھے۔ یورپ سے عمدہ نسل کے مویشی بآسانی منگائے جاسکتے تھے مگر تبدیل آب و ہوا کی وجہ سے وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوسکتے، ولندیزی گائے کچھ مناسب ثابت ہوئی

مگر کثیر تعداد میں لا کر بسائی نہ جا سکتی تھی۔ ان حالات میں یہودی سائنسدانوں کو طے کرنا پڑتا کہ فلسطین کے لئے انھیں ایک مناسب مویشی پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ولندیزی سانڈ اور شامی گائے سے جو نسل طیار ہوئی وہ قابل اطمینان نکلی۔ اس کے دودھ کا اوسط نو ہزار پونڈ ہے اور اس وجہ سے فلسطین میں ڈیری کی صنعت نہایت کامیاب ہے۔ فلسطینی عرب بھی اگر اپنے مویشیوں کی نسل اسی طرح بنالیں تو بلاشبہ فلسطین میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ دوران جنگ میں عربوں نے کچھ حوصلہ دکھایا اور نئی قسم کے مویشی فراہم کئے مگر بالآخر چھوڑ بیٹھے۔ بڑے مویشی کی طرح یہودی نوآبادکاروں نے بھیڑ بکری کی نسلیں بھی سدھاری ہیں۔ لیکن بکری جو نہ صرف کھیتی بلکہ جنگل کو بھی نقصان پہونچاتی ہے، مقبول نہیں ہوئی۔

ان یہودی نوآبادکاروں نے ترقی کی کوئی صورت نظرانداز نہیں ہونے دی۔ مرغی پالنے کے کام کو بھی بہت کامیاب بنالیا اور ڈیری فارم کی طرح یہ بھی بہت نفع بخش ثابت ہوا ہے۔

مویشی کی نسل کو بہتر بنانے کا کام اتنا مشکل نہیں تھا جتنا فلسطین کی زمین کو نئی زندگی دے کر زرخیز بنانا، زمین کی سطح صدیوں تک بارش سے دھل دھل کر طاقت کھوتی رہی اور قوی بنانے کی کسی صورت پر عمل ہوا نہیں اس لئے بنجر ہو کر رہ گئی۔ اس کے لئے عربوں کو ملزم بھی نہیں گردانا جا سکتا صلیبی جنگوں کے زمانے سے یہ ملک تباہ برباد ہوتا رہا ہے۔ مغلوں کی یلغار نے بے شمار عرب کاشتکاروں کو خانہ بدوشی کی زندگی پر مجبور کر دیا اور زمینیں بے وارث پڑی رہیں۔ ترکوں نے چار سو برس حکومت کی مگر عرب کاشتکار کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ بلکہ آفندی (زمیندار) اس کا خون چوستا رہا۔ ترکی حکومت کے عمالوں نے بھی آراضی کی تباہی کے سارے اسباب پیدا کر دئے۔ ۱۹۰۹ء میں ٹی ای لارنس نے عرب ملکوں کا سفر کیا اور ان ملکوں کی بربادی دیکھ خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن یہودیوں کی نوآبادیاں دیکھ کر اسے نجات کی صورت دکھائی پڑی۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"ان کی (یہودیوں کی) کامیابیاں لامحالہ عربوں کو بھی ایک دن اسی جگہ لے آئیں گی۔ اور اسوقت عرب دُنیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ یہودیوں سے عربوں کو تکنیکی مدد ملسکتی ہے اور وہ اس طرح صنعتی یورپ سے بے نیاز ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ملکوں کی ایک کنفڈریشن وجود میں آکر ایکروز "ورلڈ پاور" بن جائے۔"

ملیریا ایک عام وباء کی صورت رکھتا تھا۔ یہودی نوآبادکاروں نے آتے ہی دلدلوں کو خشک کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کام کو انجام دینے میں خود بھی ملیریا کا شکار ہوئے مگر سمجھتے تھے کہ اس بلا کو دفع کئے بغیر جینا محال ہوگا۔ چنانچہ یہ جنگ ساٹھ سال تک لڑی جاتی رہی۔ آج ایک آدھ علاقے کو چھوڑ کر باقی

تمام دلدلیں خشک کر کے ملیریا کے مچھر کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں ملیریا نے بائیس فیصدی آبادی کو متاثر کیا تھا اور ۱۹۴۶ء میں صرف دو فیصدی اس بخار میں مبتلا ہوئے۔

یہودیوں کو اس فتح سے جتنا فایدہ پہونچا اتنا ہی عربوں کو پہونچا۔ فلسطین کے کسان اب مصر، عراق اور ایران کے کسانوں کی طرح ملیریا کا شکار نہیں ہوتے۔

دلدلیں خشک کر دینے سے یہی فایدہ نہیں ہوا کہ ملیریا دفع ہو سکا بلکہ ایسا کرنے سے کافی بڑا رقبہ کاشت کے لئے دستیاب ہو گیا۔ چھوٹے سے ملک میں سوا لاکھ ایکڑ زمین کا اس طرح ملنا بہت بڑی بات ہے جس علاقے میں دلدلیں ابھی تک خشک نہیں کی گئی ہیں وہ حلّہ کا علاقہ ہے اور ان دلدلوں کا رقبہ اٹھارہ ہزار میل کا ہے۔ حلّہ جھیل کا علاقہ اور شاداب ہے کیونکہ بارش کافی ہوتی ہے۔ اب اس جھیل میں مچھلیاں پرورش کرنے کی اسکیم جاری کی جانے والی ہے۔ اس علاقے کی آبادی پندرہ ہزار ہے جس میں پانچ ہزار یہودی اور دس ہزار عرب ہیں۔

فلسطین میں زمین سے متعلق سارے کام تقریباً انجام پا چکے ہیں۔ چٹانوں کو کھود کر نکال پھینکا گیا ہے ڈھلان مسطح کر دئے گئے ہیں۔ روحامہ کے علاقے کی زمین کو اب بارش کا پانی بہا کر نہیں لے جائے گا — کھاری زمینوں کو پاک کر کے قابل زراعت بنا لیا گیا ہے۔

تمام زمینوں کو قابل زراعت بنانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ پانی کی تلاش بھی جاری تھی — ان نوآبادکاروں سے پہلے آبپاشی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جھیلوں، ندیوں اور چشموں سے معقول کام لیا ہی نہ جاتا تھا۔ اتھلے کنوؤں سے کچھ آبپاشی ہوتی تھی مگر زمین کی تہ کا پانی ان میں سے بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں "یہودی نیشنل فنڈ" نے پیمایش کر کے بتایا کہ زیر زمین بہت کافی مقدار میں پانی موجود ہے، اور آسانی چار لاکھ ایکڑ کی زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک صرف سوا لاکھ ایکڑ زمین پر آبپاشی ہوتی ہے اور ان زمینوں پر ایک سے زیادہ فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ بدل بدل کے فصل پیدا کرنا جدید دریافت ہے، فلسطین میں اس پر عمل کر کے زمین کی طاقت اور زرخیزی کو بڑھایا جا رہا ہے۔ نارنگی فلسطین کی پرانی پیداوار ہے مگر یہودی نوآبادکاروں سے پہلے نارنگی کی کاشت کے امکانات کا اندازہ نہیں کیا گیا تھا کہ چٹان میں سونا چھپا ہوا ہے۔

نارنگی کو فلسطین میں شموتی کہتے ہیں، شکل اور ذایقہ دونوں طرح سے نہایت اچھا پھل ہے اور دنیا بھر میں اس کی مانگ ہو سکتی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ساڑھے سات ہزار ایکڑ پر نارنگی کی کاشت ہوتی تھی، ۱۹۳۸ء میں دس گنا تھی۔ عرب کے لوگ پھلوں کا "گریڈنگ" ان کا پیکنگ اور شپنگ نہیں جانتے تھے،

یہودیوں نے آکر یہ طریقے اختیار کئے تو پیداوار اور برآمد بڑھ گئی اور عربوں کو بھی اتنا ہی فایدہ پہونچا۔ عرب لوگ سنہ ۲۲ء میں ساڑھے چار ہزار ایکڑ زمین پر نارنگی بوتے تھے۔ آج وہی اُنتالیس ہزار ایکڑ پر بو رہے ہیں۔ یہودیوں نے آکر ویلنشیا کی قلم امریکہ سے منگائی اور وہ بہت کامیاب رہی ان کو دیکھ کر عربوں نے بھی ویلنشیا کی کاشت شروع کی ہے، یہودیوں نے گریپ فروٹ لگا کر بھی کامیابی حاصل کی ہے مگر عرب ابھی دیکھ ہی رہا ہے۔

جنگ کی وجہ سے سٹرس (بڑا لیمو) کی تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ کیونکہ یورپ کی طرف برآمد رک گئی تھی اور یہودیوں نے اس کے درخت اُکھڑوا کر دوسری کاشت شروع کردی تھی۔ اب سٹرس کی مانگ پھر بڑھ جائے گی۔ اور چونکہ اس کی پیداوار کے لئے زمین، پانی اور آب و ہوا سب موافق ہے اس لئے لاگت کم آتی اور قیمت اچھی ملتی ہے۔

زیتون کی کاشت پر یہودی نوآبادکاروں نے توجہ نہیں دی ہے۔ زیتون کا درخت بارہ سال میں پھل دیتا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ پر زیتون ہوتا ہے، اس میں یہودیوں کا حصہ شاید ایک فیصدی ہو۔ اس طرح یہ کاشت آج بھی عرب کلچر ہے اور یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ عرب لوگ اگر زیتون کے اتنے شیدا نہ ہوتے تو زمینیں زیادہ خراب ہو جاتیں۔

یہودی نوآبادکاروں نے دُنیا بھر سے بہترین قلمیں منگا کر سیب، آلو بخارا، آڑو وغیرہ کی کاشت بڑھائی ہے۔ پہلے فلسطین میں یہ پھل غیر معلوم تھے۔ کیلا بھی یہودی لائے۔ اب ان نوآبادکاروں نے آم انناس اور پپیتا وغیرہ بھی لگائے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں نے فلسطین میں ہر قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں بھی پیدا کرلی ہیں۔ آلو کو انھوں نے تجارتی پیداوار بنا لیا ہے اور اب عرب لوگ بھی آلو بونے لگے ہیں۔

سنہ ۲۱ء سے سنہ ۳۶ء تک کی مدت میں عرب کاشتکاری نے بڑی ترقی کی لیکن یہودی کاشت کے مقابلہ میں ان کی پیداوار کا اوسط کم رہتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، آفندی کبھی آکر اپنی زمین کو دیکھتا بھی نہیں اور وصولی کے علاوہ زمین پر روپیہ لگانا غیر ضروری سمجھتا ہے۔ چند زمینداروں نے کچھ مشینیں منگائی بھی ہیں، مگر معمولی فلاح مشینیں، کھاد اور اچھا بیج کہاں سے منگائے، اس کی آمدنی اگر اپنی زمین جوتتا ہے تو اکسو چالیس امریکن ڈالر اور بٹائی پر کاشت کرتا ہے تو استی ڈالر فی ایکڑ ہے۔ ان مجبوریوں کے علاوہ اسکی قدامت پرستی کا ورثہ ایک اور رکاوٹ ہے۔ .... وہ عرب کاشتکار جن کے آس پاس یہودی کاشت نہیں ہوتی اپنے ڈھنگوں کو بدلنے پر ذرا دشوار نظر آتا ہے۔

فلسطین کی زمین غلّے کی کاشت کے لئے غیر موزوں ہے مگر یہودی کی طرح عرب کو بھی پیٹ تو بھرنا ہے لیکن وہ اس میں بھی ترقی نہیں کرسکتا کیونکہ نہ تو گہرا ہل چلاتا ہے نہ اچھا بیج میسر ہے اور نہ کھاد دینا۔ چونکہ یہودی کاشتکار کے ذہن و دماغ پر قدیم روایات کا بوجھ نہ تھا، وہ وسیع پیمانے پر مشینوں کا استعمال کرکے، بدل بدل کر فصلیں پیدا کرکے، عمدہ بیج ڈال کر اور کھاد کے استعمال سے چھوٹے رقبے میں زیادہ پیداوار کرلیتا ہے۔ ان دونوں میں فرق ظاہر ہے، ایک لکڑی کا دقیانوسی ہل چلاتا دوسرا فولادی ہل استعمال کرتا ہے، ایک بیل سے کام لیتا ہے، دوسرا ٹریکٹر سے!

عہد توراۃ و انجیل میں فلسطین کی سرزمین پر شہد کی نہریں بہتی تھیں مگر درمیان کی صدیوں میں سوتے سوکھتے گئے، آج اس زمانے کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے، ۱۹۶۶ء میں یہودی کاشتکار نے چھبیس ہزار چھتے پال کر ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ شہد پیدا کیا تھا۔

قوم اسرائیل نے تہیہ کرلیا ہے کہ سرزمین فلسطین کے ہر ذریعے کو ترقی دیکر پورا فایدہ اُٹھایا جا۔ اسی مقصد سے اب وہاں مچھلی کی پیداوار بھی بڑھائی جا رہی ہے۔ جلیلی کے سمندر میں ۱۹۶۶ء سے مچھلی کی پرورش شروع ہوئی، مگر اب بحر روم سے بھی مچھلی پکڑی جا رہی ہے۔ اندرون ملک کی جھیلوں میں مچھلیاں پرورش پا رہی ہیں۔

ایک نسل کی مدت میں یہودی مہاجرین نے ارض مقدس کو پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے زرخیز علاقہ بنا دیا ہے، بنجر زمینوں سے دو دو تین تین فصلیں لے رہے ہیں۔ زمین کو یہ نئی زندگی اس لئے ملی ہے جب ان نوآبادکاروں نے اپنی جانیں کھپا دی ہیں، وباؤں سے جنگ کرنے میں جانوں کی قربانی دی ہیں۔

عربوں اور یہودیوں میں کیسی بھی عداوت ہو مگر یہودی نوآبادکاروں کا یہ کارنامہ ایک حقیقت ہے، مشرق وسطیٰ میں ان لوگوں نے تاریخ کو پلٹ دیا ہے! ان کے اس کارنامہ سے عربوں کو سبق پہونچا ہے۔ اور جو کارنامہ انھوں نے فلسطین میں کر دکھایا ہے، وہی عراق، سعودی عرب، ایران اور مصر میں بھی دکھایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی طاقت رونما ہوکر مسلمانوں کی کاہلی اور جہالت کی دیوار کو ڈھا دے اور مسلم فلاح کی تخلیقی قوت برسرعمل ہوجائے!

میں عرب طلبہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ملا ہوں، میں نے مسلم ملکوں میں سیاحت کرکے نوجوانوں کی باتیں سنی ہیں اور ان کے ولولے اور آرزوئں سے متاثر ہوا ہوں۔ عرب طالب علم غیر ملکوں سے فارغ التحصیل ہوکر جب اپنے وطن پہونچیں تو ان کو "درکان نمک" ہوجانے سے بچانے کی ضرورت

…نوجوان علم و فن کی آرزو رکھتے ہیں ان کو حصول فن کے لئے غیر ملکوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے، اور جو
…مریکہ یا یورپ نہیں جا سکتے انھیں فلسطین بھیجا جا سکتا ہے جہاں سے واپسی پر یہ نوجوان اپنے ملکوں کو
…فلسطین کی طرح شاداب و زرخیز بنا سکیں گے، اپنے عوام کی تخلیقی قوتوں کو مہمیز دے سکیں گے۔ عرب ملکوں
…کی نئی نسل کے لئے بہترین تعلیم و تجربہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے، وہ وہاں نظریاتی اور عملی طور پر سائنسی
…طریقوں سے زمین کو زرخیز بنانا سیکھ سکیں گے۔ فلسطین کی امداد باہمی کے اصول پر بنی ہوئی بستیاں یورپ
…کے تعلیم یافتہ یہودیوں کو اگر ماہر کاشتکار بنا سکتی ہیں تو عرب نوجوانوں کو بھی بنا سکتی ہیں۔

…میں دقتوں سے بے خبر نہیں ہوں، اس میں عملی مشکلیں ہیں، کلچری رکاوٹیں ہیں، اور ڈپلومیٹک دشواریاں
…ں۔ لیکن یہ دشواریاں دور ہو سکتی ہیں بشرطیکہ دونوں طرف کے لیڈر انھیں دور کرنے کا ارادہ کرلیں۔

ان دشواریوں کو دور کرنے میں غیر ملکی ڈپلومیٹ اگر یہود و عرب کی عداوت کو بڑھانے کے بدلے
…ے کم کرنے میں لگ جائیں تو فلسطین میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم کی بڑی آسانیاں مل سکتی ہیں۔ اور تمام
…سلم ممالک کی اقتصادی و معاشی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔

یہود و عرب کی باہمی کشاکش کے متعلق برطانوی رائل کمیشن کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس
…ر و توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے:-

(۱) "فلسطین میں یہودی سرمائے کی درآمد نے پورے ملک کی بحالی پر اثر ڈالا ہے۔

(۲) عربوں کی سٹرس پیداوار میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اس کا باعث یہودی سرمایہ کی درآمد ہے۔

(۳) یہودی کاشت کی ترقی عرب کاشت کو اور خاص کر سٹرس کی کاشت کو مہمیز دے رہی ہے۔

(۴) یہودیوں کی صنعتی و زرعی ترقی نے بہت سے عرب مزدوروں کو روزگار فراہم کیا اور شہروں بالخصوص بندرگاہوں کی ترقی کا باعث ہوئی۔

(۵) بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور بیماریوں کو دفع کرنے میں کامیاب ہو کر یہودی نوآبادکاروں نے عربوں کو بھی فایدہ پہونچایا ہے۔

(۶) "نیشنل (یہودی) ہوم" کے فنڈ نے رفاہ عام کے لئے جو ادارے قایم کئے ان اداروں نے عرب آبادی کی بھی اتنی ہی خدمت کی جتنی یہودیوں کی۔ عداسہ کے اسپتال میں عرب مریضوں کا علاج بھی پوری دیانت کے ساتھ ہوتا ہے، صفاد کے دق کے اسپتال میں اور ریڈیولاجی انسٹی ٹیوٹ میں عرب مریض بھی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ دیہاتی بیماروں

کے فنڈ سے جو کلینک جاری ہیں وہاں عرب مریضوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے اور بچوں کی
تحفظ کے کاموں میں عرب بچوں کی بھی خدمت کی جاتی ہے۔

(۸) فلسطین میں یہودیوں کے آنے سے عربوں کو کتنا فایدہ پہونچا وہ اس حقیقت سے ثابت ہے
کہ جن شہروں میں یہودیوں نے ترقی کے کام شروع کئے وہاں عربوں کی آبادی بہت بڑھ گئی
حیفہ کی آبادی بمقابلہ ۲۲ء کے ۳۱ء میں چھیاسی فیصدی اور یروشلم کی تینتیس فیصدی
بڑھ گئی۔ اسی زمانے میں خالص عرب آبادی کے شہروں میں صرف سات فیصدی اضافہ
ہوا۔ غازہ میں تو آبادی دو فیصدی گھٹ گئی ہے۔

اس رپورٹ کا ایک نہایت اہم حصہ یہ بھی ہے:-

"عرب کاریگر کی مزدوری اب ڈھائی سو سے چھ سو مل اور غیر کاریگر کی سو سے ایکسو اسی مل
روزانہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں شام میں سرسٹھ سے ایکسو چھبیس مل تک ہے، عراق میں
فیکٹری مزدور کی مزدوری چالیس سے ساٹھ مل روزانہ ہے"

عرب اور یہودیوں کی مسلسل عداوت کے ہوتے ہوئے اگر عربوں کو یہ فواید پہونچ سکتے ہیں تو قیاس کیا
جاسکتا ہے کہ دوستی و رفاقت ہوجانے سے کتنا فایدہ پہونچے گا۔

پندرھواں باب

(مزدوروں کا لشکر)

تل عفیف پہونچنے سے پہلے ہستادروت کا نام میں نے سنا بھی نہ تھا۔ یہ نام ہے (فلسطین کی یہودی ٹریڈ یونین) کا۔ لیکن یہ ایک ایسی جماعت کا نام ہے کہ تل عفیف پہونچ کر ناممکن ہے کہ کوئی اس سے بےخبر رہے۔ اس سے بےخبر رہنا گویا بحر روم کے وجود سے بےخبر رہنا ہے۔ میں جہاں جاتا تھا ہستادروت کی علامتیں اس طرح سامنے آتی تھیں جیسے بحر روم کی لہریں۔

مزدور تنظیم کی یہ نوعیت دیکھنا کیا تصور میں آسکنے والی بات بھی نہ تھی۔ اس مزدور تنظیم نے اپنے سر جس قدر ذمہ داریاں لی ہیں اور جو تخلیقی اسپرٹ دکھائی ہے اور اس اسپرٹ کا جو کامیاب عمل ہوا ہے اس کی مثال کہیں دنیا میں نہیں ملتی۔

یہ جماعت جس کا نام ہستادروت ہے مزدور جماعت بھی ہے اور سرمایہ داری ادارہ بھی۔ یہ بیک وقت دونوں کی نمائندہ ہے۔ وہ فلسطین میں سب سے زیادہ مزدوروں سے کام لینے والا کارخانہ دار ہے مگر مزدور مفاد کا محافظ بھی ہے۔ اس ادارے کی بہت سی فیکٹریاں اور کارخانے چل رہے ہیں اور تجارت وصنعت کی ترقی کے خیال سے بہت سی فیکٹریوں اور ملوں میں حصہ دار بھی ہے۔ دوسرے کارخانہ داروں سے تعاون کرکے ہستادروت نے شہر بیرشیبا کی تعلیم کے لئے ایک فنڈ اکٹھا کر لیا ہے جہاں دس ہزار کی آبادی ہے۔ سنیٹرل ٹریڈ اینڈ انوسٹیمنٹ کمپنی کی شرکت میں، ہستادروت نے حیفہ کے اندر ایک سیمنٹ فیکٹری قایم کی ہے۔ فنی شن کانچ کا کارخانہ فیل ہوچکا تھا، ہستادروت نے اسکے مالک سے خرید لیا اور مزید سرمایہ لگاکر اسے بالکل جدید سائنسی طریقے پر چلایا۔ آج شیشے کی چادریں بنانے کا یہ بہترین کارخانہ ہے۔ تعمیرات کا کام بھی بہت بڑے پیمانے پر جا رہی ہے اور مشینوں سے جوتا، اینٹ، صابن، تیل اور کاسمیٹک وغیرہ بنانے کی فیکٹریاں بھی کام کر رہی ہیں۔

ہستادروت، نجی ملکیت کے حق میں بھی ہے وہ پیداوار بڑھاتا ہے تو اس کی تقسیم بھی صحیح کرتا ہے، خدمت کرتا ہے تو جذبۂ مسابقت بھی پیدا کرتا ہے، وہ عام تاجروں کی طرح اپنے حریف تاجر کو نقصان بھی پہونچا دیتا ہے اور اسے کمزور کرکے نگل بھی جاتا ہے۔ اس نے کارخانہ دار اور تاجر کی حیثیت سے جو وقار و رسوخ حاصل کیا ہے وہ حقیقتاً تجارتی فراست اور ہوش مندی کا بہترین مظاہرہ ہے، سامان طیار کرنے اور اس کی تقسیم کرنے والے کی حیثیت سے ہستادروت کی طاقت بے حد بڑھ گئی ہے، اسی وجہ سے اس کے حرکت و عمل کی بھی حد نہیں رہی ہے۔ وہ مہاجن اور بینکر بھی ہے اور بچت کرا کے ڈپازٹ کرنے اور قرضے دینے کی متعدد سوسائٹیاں بھی اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ اس کے کئی چھاپے خانے بھی ہیں اور اسکے متعدد اخبار، رسالے اور پمفلٹ بھی ہیں۔ چھوٹے بچّوں کے لئے، لڑکوں کے لئے اور بالغوں کے لئے اسکول کھول رکھے ہیں، تکنیکی تعلیم کا بھی انسٹی ٹیوٹ جاری ہے۔ تل عقیف میں اس کا اپنا تھیٹر ہے جہاں ہر قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ وہ اسپورٹس (کھیل) کی بھی ہمت افزائی کرتا ہے۔ "یہود ایجنسی" کے تعاون سے اپنے ایک ٹریننگ اسکول جہازیوں کی تعلیم کے لئے کھول رکھا ہے۔ دوسرا ہوا بازی کا اسکول چلا رہی ہے۔ ایک کارخانہ جہاز بنانے اور مرمت کرنے کا بھی چلا رہی ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے اس نے چھوٹے چھوٹے جہاز خود بنوائے ہیں۔ کاشت کی مشینیں بنانے، چمڑہ رنگنے، ربڑ کا سامان طیار کرنے اور کپڑے کی انڈسٹری میں اسے خاص امتیاز حاصل ہے۔ چوری، آگ، زلزلہ، زندگی اور حادثہ وغیرہ کا بیمہ بھی کرتا ہے فلسطین کے بائیس فیصدی مزدور، ہستادروت کے کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ فلسطین میں جتنا سامان تجارت بنتا ہے اس کا پانچواں حصہ ہستادروت کی فیکٹریوں کا بنا ہوتا ہے۔

دُنیا کے اور ملکوں میں بدیسی مزدوروں کے داخلے پر پابندیاں ہیں، مزدور تحریکیں اس کی مخالفت کرتی ہیں، مگر یہ مزدور تنظیم ایسی ہے جو نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ نئے مزدوروں کے فلسطین میں آنے سے نہ تو وہاں کے پُرانے مزدوروں کی شرح مزدوری میں کمی آتی ہے، نہ ان کی اجتماعی طاقت میں کمزوری ہوتی ہے نہ بیروزگاری پھیلتی ہے۔

دُنیا بھر کی ٹریڈ یونینیں کمیونزم کی طاقت ہیں اور اس طرح طبقاتی جنگ پھیلتی بڑھتی ہے مگر ہستادروت ایک ایسی مزدور تنظیم ہے جو کمیونزم کی موت ہے! ہستادروت کے سب سے بڑے اور زیادہ بکنے والے اخبار کا موٹو "آزادیٔ خیال و اتحادِ عمل" ہے۔ اس طرح یہ تنظیم مغربی ملکوں کی مزدور تحریکوں سے بھی مختلف ہے ہستادروت اپنے مقصد و مدعا کے تحت اپنی ذمہ داری بڑھانے سے گھبراتا نہیں، اسی طرح وہ اپنے ممبر بڑھانے میں بھی حوصلہ مند ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ "تمام لوگ اپنی محنت کی کمائی سے پورا فائدہ اٹھائیں

اور کوئی شخص دوسرے کی محنت سے فایدہ اُٹھانے نہ پائے۔"

اسی لئے ہستادروت کی ممبری سب کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے مزدور، پولس مین، کسان، کلارک، ڈاکٹر، وکیل اور صناع سب اس کے ممبر ہیں اور ہوسکتے ہیں۔ البتہ جو کسان مزدور لگا کر کاشت کرتا ہے وہ اس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

یہ ادارہ سنہ ۱۹۲۰ء میں قایم ہوا اسوقت اس کے ممبر ساڑھے چار ہزار سے بھی کم تھے مگر بڑھتے بڑھتے آج ہونے دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے اس کے ممبروں کے اعداد و شمار یہ ہیں:-

اپنی زمین پر کاشت کرنے والے	۴۴	فیصدی
کھیت مزدور	۳	"
ٹیچر، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ	۶	"
پولس مین	۳	"

یہ ایسے مختلف و متضاد پیشے کے لوگوں کا اجتماع ہے کہ اس کو نہ پرولتاریہ جماعت کہا جا سکتا ہے نہ درمیانی طبقے کا ادارہ۔ وہ ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ الغرض ہستادروت سب کچھ ہے بینکر ہے، سیلس مین ہے، اکسپورٹر و امپورٹر ہے، تھوک فروش، خردہ فروش ہے، سرمایہ دار و مزدور ہے، اس کی حرکت و عمل کا دایرہ سر چکرا دیتا ہے اور اس کی طاقت اور شوکت کو دیکھ کر انسان حیران رہجاتا ہے۔

فلسطین میں حالات کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ ہستادروت کے وجود میں آئے بغیر کام بھی نہ چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور تنظیم ہونے کے باوجود ہستادروت دُنیا کے اور تمام مزدور اداروں سے مختلف ہے اس تنظیم کا کام مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دینا ہی نہ تھا، اس کا مقصد یہودی شخصیت کو نئے سانچے میں ڈھالنا بھی تھا۔ یہودیوں میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھا جو دو ہزار سال کی آوارہ گردی میں وہ کھو چکے تھے۔ ہستادروت کے ساتھ دوسرے یہودی اداروں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اس ادارے کے ایک ذمہ دار آدمی سے میں نے سوال کیا کہ کیا وہ ایک فقرے میں ہستادروت کے مقاصد بیان کر سکتا ہے" تو اس نے اقرار کیا اور بتایا:-

"یہودیوں میں فلسطینیت Palestinization پیدا کرنا"

اس کا یہ لفظ میرے لئے ویسا ہی ناقابل فہم تھا جیسا لفظ ہستادروت۔ میرے لئے یہ اصطلاح Histadrut اور Zionism سے زیادہ دلچسپ تھی۔

فلسطین میں متعدد یہودی ادارے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد و مدعا ایک نئی قومی تعمیر ہے ہستادروت

بھی اسی مقصد کے لئے وقف ہے، مگر اس کا دائرۂ عمل وسیع ہے اس کے کارگزاروں نے سمجھ لیا ہے کہ مختلف ملکوں کے یہودیوں کو فلسطین میں پناہ دینا اور بسا دینا ناکافی ہوگا بلکہ خطرناک بھی ہوگا! یہ نیا یہودی سماج اگر درمیانی طبقے کے لوگوں سے بنتا ہے جس میں دوکاندار، وکیل اور دوسرے پیشوں کے آدمی ہوں تو یہودی وطن (HOMELAND) کی توہین ہوگا۔ ہستادروت اس لئے یہودی قوم کے اندر سے GHETTO ذہنیت کو فنا کر دینا چاہتا ہے، اس سماجی تنفر اور گھمنڈ کو مٹا دینا چاہتا ہے جو مختلف ملکوں کے یہودیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا منشا و مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے اندر فطرت اور آراضی سے وہی لگن پیدا ہو جائے جو ان کے آباء و اجداد میں اسوقت تک پائی جاتی تھی جب فلسطین کے تاکستان آباد تھے اور زراعت شاداب تھی۔ آردن، ڈیوڈ، گارڈن یہودی احیائے ثانی کا بڑا مبلغ تھا، لکھتا ہے :-

"وہ قوم جو فطری یعنے خود شعوری، خود مکتفی زندگی کے علاوہ کسی دوسرے قسم کی زندگی کی عادی ہو چکی ہے، ایسی قوم کبھی جفاکش نہیں بن سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے ارادے اور عزم کو اسی مقصد کے لئے وقف نہ کر دے! محنت و مشقت محض سبب نہیں ہے جو انسان اور زمین کے درمیان رابطہ اور حق قائم کرتا ہے بلکہ وہ سب سے بڑی قوت ہے جو ایک تمدن ڈھالنے کے لئے درکار ہوتی ہے، محنت انسانی مستقبل کے لئے بہترین تصور اور عقیدہ ہے، ایسی عینیت ہے جیسے آفتاب کی معالج نوعیت!"

فلسطین کے مہاجر یہودی جس ملک کے بھی ہوں، جسمانی مشقت کو سماجی کمتری کی دلیل سمجھتے تھے، محنت کا لفظ سماجی تحقیر کا مفہوم ادا کرتا تھا۔ اس لئے ان کو محنت و مشقت کا اعزاز و مرتبہ سمجھانے کے لئے کچھ تعلیم کی ضرورت تھی۔ کتاب و قلم ہی تنہا تہذیب و تمدن کی علامت نہیں، بلکہ کدال، ہتوڑا، پھاوڑا اور ہل بھی اسی طرح تہذیب و تمدن کے نشانات ہیں۔ یہ سارے مہاجر یہودی اگر دوکاندار، ڈاکٹر اور وکیل بن گئے اور کچھ زمیندار پیدا ہو گئے تو یہودی وطن کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ ہستادروت زمینداری کے ادارے کو سامنت شاہی کی علامت سمجھتا اور اس سے سخت بیزار ہے۔ وہ سستے عرب مزدوروں پر یہودی کاشت کو منحصر کرنے کے سخت خلاف ہے اس کا مقصود ہے کہ یہودی اپنی زمینوں پر خود کاشت کریں۔ یہودی دوکاندار یہودی وکیل، یہودی پروفیسر، یہودی ڈاکٹر، یہودی کارخانہ دار، یہودی ماں باپ سب محنت پسند بنجائیں وہ فلسطین کو صناع و سائنسداں، تاجر و مل مالک، کا ملک نہیں بلکہ مستریوں، مچھیروں، کسانوں، مزدوروں اور بوجھ اٹھانے والوں اور اینٹیں تھوپنے والوں کا ملک بنانا چاہتا ہے۔ لگاؤ کے ساتھ زمین پر محنت

کرکے اور سہرا گئے اور بکنے والی چیز سے محبت کرکے اسے ایسا مقدس و معزز بنا دیا جائے جیسی وہ عہدِ قدیم میں تھی۔ ہستادروت جنٹلمین کسان پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ مسکین اور ادنیٰ کسان بنانا چاہتا ہے اور یہ کوئی انجیل کا الہام نہیں بلکہ وقت کی وہ فوری ضرورت ہے جو انجیل کے الفاظ کو نیا مفہوم دیتی ہے۔

ان وجوہ پر ہستادروت سمجھتا ہے کہ اس کا فرض یہی نہیں ہے کہ مزدوروں کی معمولی اور مادی مانگوں کی حمایت کرکے انھیں پورا کرائے بلکہ یہ بھی ہے کہ غیر مشقتی یہودی کو محنت کش بنا دے۔ محنت سے محبت کرنا سکھائے۔ ہستادروت کا بہت سا لٹریچر جب میں نے مطالعہ کیا تو مجھ پر "محنت کی فتح" کا مفہوم واضح ہوا۔ اور میں سمجھا کہ "فلسطینیت" یہودیوں کے ذہن و مزاج کو کس طرح بدل رہی ہے۔

برطانیہ کی ابتدائی حکومت اٹھائیس سال فلسطین میں قایم رہی، اس مدت میں اگر وہ وہاں کی سماجی اصلاح مخلصانہ طور پر اتنی بھی کرنا چاہتی جتنی خود انگلینڈ میں کنسرویٹو حکومت نے کی تو ہستادروت ایسا زبردست ادارہ کبھی نہ بن سکتا جیسا کہ وہ آج ہے۔ برطانیہ کا سامراجی دماغ فلسطین میں بھی اتنا ہی غیر جواب دہ تھا جتنا دوسرے مقبوضات میں۔ سماجی رجحانات سے متعلق اس نے ہر جگہ دیسی حکمرانوں کو کم سے کم زحمت دی اور محنت کش عوام کی کم سے کم مدد کی ہے۔ فلسطین میں انتدابی حکومت نے جو "لیبرلا" بنایا وہ کسی ایسے تحفظی قانون سے تو بہت بہتر تھا جس سے عرب مزدور واقف تھے مگر اس سے بدرجہا ادنیٰ تھا جو کنسرویٹو حکومت خود انگلستان میں جاری کر سکی تھی۔ اس حکومت نے ۱۹۲۵ء میں یہ حکم تو بلا تامل جاری کر دیا کہ دیا سلائی بنانے میں سفید فاسفورس استعمال نہ کیا جائے مگر عرب لوگ اپنی کم عمر بچیوں کو ادنیٰ قسم کی خدمت پر نوکر کرنے کے جو معاہدے کرکے کچھ رقم وصول کر لیا کرتے تھے اس رواج کو موقوف نہ کیا۔ بڑی اصلاح یہ کی تھی کہ سال بھر سے زیادہ کا معاہدہ غیر قانونی ہوگا۔

ہستادروت نے اگر مزدور کے حقوق کی حفاظت کے لئے جد و جہد نہ کی ہوتی تو فلسطین ہمیشہ سستی مزدوری کی منڈی بنا رہتا۔ اس نے ایک طرف مزدور کے حقوق قایم کرائے اور دوسری طرف مہاجر مزدوروں کو محنت پسند بنایا۔ اس طرح اس نے وہ ذمہ داریاں اپنے سر لےلیں جو حکومتوں کو لینا چاہیے تھیں اور فلسطین کی انتدابی حکومت اسے پورا نہیں کر رہی تھی۔ مزدور کو پند و نصیحت کرنا بے نتیجہ ہے اگر اسے یہ یقین نہ دلایا جائے کہ اس کی محنت کا مناسب معاوضہ بھی ملے گا۔ اس نظریہ کے تحت ہستادروت نے رفاہ و اصلاح کا ایک ایسا پروگرام بنایا جو مغربی ملکوں میں بھی جاری نہ کیا جا سکا تھا۔ ہستادروت اپنے تمام مزدوروں کی جان، تندرستی، حادثہ، بیماری، ضعیفی اور بے روزگاری کا بیمہ کرتی ہے اور بیواؤں، یتیموں کو پنشنیں بھی دیتی ہے۔ زچہ کی حفاظت اور بچے کی خبر گیری اس بیمے کا خاص پہلو ہے۔ اس کا سب سے

مہتم بالشان کام "بیمار فنڈ" ہے، جس کی شاخیں اور ادارے سارے فلسطین میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں جہاں یہودی کاشت کی نوآبادی ہے وہاں ہستادروت کا طبی امداد کا انتظام بھی ضرور ہے اس نے جو ادارے قایم کئے ہیں، ان کی تعداد ذیل میں درج ہے :-

اسپتال	۶
بعد صحت آرامگاہیں	۴
مرکزی دوا خانے	۸
دیہاتی ڈسپنسریاں	۲۱۵
ایکسرے انسٹی ٹیوٹ	۷
مرکزی فارماسیوٹیکل ڈپو	۱
فارمیسیاں	۱۶۱
دانت کے کلینک	۲۷
الکٹرو تھیراپی انسٹی ٹیوٹ	۳۰
بچوں کی خبرگیری کا سینٹر ڈپارٹمنٹ آف ہائی جین	۱

ان تمام ممبروں کے علاوہ ہستادروت غیر ممبر عربوں کو بھی طبی امداد پہونچاتا ہے اور زچہ کی خبرگیری کا خاص انتظام ہے۔ اس کام کے لئے اس نے تمام کارخانہ داروں سے وہ جتنی مزدوری سال بھر میں ادا کرتے تھے اس کا تین فیصدی وصول کیا اور ۱۹۴۲ء میں اپنے ممبروں سے سات بلکہ گیارہ فیصدی تک وصول کیا اور یہ سارے کام جاری کئے۔ اس فنڈ میں انتدابی حکومت اور دوسرے یہودی اداروں نے بھی چندہ دیا۔ بعض طبی اسکیموں میں عرب مزدور بھی شامل ہیں۔ عرب مزدوروں کو ہستادروت پوری طرح شامل کرلیتا مگر باہمی مفاد بڑا مانع تھا۔ اس لئے اس نے فلسطین لیبر لیگ قایم کرائی جس میں دونوں قوموں کے مزدور اپنی آزاد مزدور جماعتوں کو خود مختار رکھتے ہوئے بعض مفاد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوسکیں۔ اس لیگ کا کام عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں ہوسکتا تھا۔ اس لیگ کے پانچ ہزار سے زیادہ ممبر نہ بنے اور سیاسی نزاکتوں کی بنا پر اپنا مقصد حاصل نہ کرسکی۔

دُنیا بھر میں کوئی انسان طبی امداد سے اتنا محروم نہیں جتنا وہ عرب کسان جو شہروں سے فاصلے پر آباد ہے۔ ہستادروت کی طبی تنظیم ان عرب کسانوں کی خدمت کرتی ہے۔ دو ہزار پانچسو سے کچھ زیادہ ڈاکٹر نوکر ہیں۔ ان میں دوسوسے اوپر عرب ہیں اور سواسو غیر عرب عیسائی باقی سب یہودی ہیں۔ لیبر لیگ

اپنے عرب ممبروں کو طبی امداد پہونچاتی ہے۔ وسیع پیمانے پر طبی امداد کا انتظام ہستادروت کی حرکت و عمل کا صرف ایک پہلو ہے، ورنہ اس کی خدمات مختلف نوعیت کی ہیں۔ جسمانی اور کلچری ترقی و بہبود کی خاطر متعدد تجارتی ادارے قایم ہیں۔ تعلیم گاہوں کے علاوہ کھیل کے میدان تھیٹر امد اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔

ہستادروت کی امداد نہ ہوتی تو غواط برنیر آباد نہ ہوسکتا اور آباد بھی ہوجاتا تو اتنا خوشحال و کامیاب نہ ہوتا۔

ہستادروت کے مہاجنی ادارے تھوک اور خوردہ فروشی کی کوآپریٹو سوسائٹیاں اور فیکٹریاں سب نوآبادکاروں کی بحالی و ترقی کے لئے اور ہر وقت ان کی خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔ فلسطینی ساخت کے اونار آلات۔ درآمد کی ہوئی مشینیں، فنی جراید، ہوشیار مستری، کاشت کے ماہر، اور دوسری بہت سی چیزیں نوآبادکاروں کی خدمت کے لئے اسی طرح قابل حصول ہیں جس طرح طبی امداد۔ فلسطین میں دوسو کے قریب امداد باہمی اور چھوٹے کاشتکاری کے گاؤں ایسے ہیں جو ہستادروت کی امداد کے بغیر آباد نہ ہوسکتے تھے۔

یہودی قوم میں مخصوص ذہن و دماغ کا کاشتکار طبقہ پیدا کردینا اسی عظیم الشان ادارے کا کام تھا۔ اس کے تمام کام پہلے سے سوچے سمجھے پلان کے مطابق انجام پاتے ہیں اور ان اسکیموں اور پلانوں کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کاشتکار کاشت کو کامیاب بنانے کی فکر کے سوا ہر فکر سے آزاد ہو۔ چنانچہ اس ادارے کی مدد اور ہدایت کے بموجب نوجوان یہود مرد اور عورتوں کی ایک جماعت بحرمردہ کے ساحل پر پہونچی جہاں صدیوں سے کسی قسم کی روئیدگی کا وجود نہ تھا کیونکہ زمین میں تیزابی مادہ تھا، ان نوجوانوں نے بالآخر اس زمین کو کارآمد بنالیا اور وہاں بیت حاردہ کے نام سے ایک خوشحال گاؤں آباد ہوگیا۔ لیکن ۴۸ء کی جنگ میں وہ گاؤں عرب فوجوں نے پامال کردیا۔

یہ ادارہ مسلسل و متواتر نئی زمینیں دستیاب کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ۴۳ء میں اسنے نیگیف کے علاقہ پر توجہ کی۔ یہ علاقہ جنوبی فلسطین میں کوئی تیس لاکھ ایکڑ زمین کا ایک مثلث ٹکڑا ہے۔ پانی کی قلت تھی اور روئیدگی کا صرف ایک کنارے پر وجود تھا وہاں بدوی لوگ سیاہ ڈیرے جمائے اپنے گلّوں کو چراتے تھے اور اگر پانی برس جاتا تو گڑھوں میں پانی جمع کرکے کچھ کاشت بھی کرلیتے تھے۔ حالانکہ کسی وقت یہ علاقہ ایک تمدن کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس علاقے کو شاداب بنانے کے لئے ہستادروت نے تین مہمیں جداجدا روانہ کیں تاکہ زمین، آب و ہوا اور پانی کی تلاش کرکے رپورٹ دیں۔ ۴۶ء تک اس علاقہ میں چودہ گاؤں آباد ہوگئے۔

الیس اور آباد کرنے کی اسکیم تھی۔ ۱۹۴۸ء میں یہ علاقہ جنگ کا میدان بنا رہا۔

کاشت کی ترقی کے ساتھ ہستادروت نے گھریلو صنعتوں کو بڑھانے میں بھی بہت بڑا کام کیا ہے۔ مشکل سے کوئی کاشتکار آبادی ایسی ہوگی جہاں اچھے بڑے پیمانے پر گھریلو صنعتیں نہ چل رہی ہوں۔

امداد باہمی کے اصول پر پورے فلسطین میں عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہستادروت نے کسی سیاسی نظریئے کو قبول نہیں کیا ہے۔ اور یہی بات اس کی طاقت و اثر کا راز ہے۔ من حیث الجماعت ہستادروت کا رجحان سوشلسٹ ہے لیکن وہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس کی چھٹی جنرل کنونیشن ہوئی تو فلسطین کی پچیس سیاسی پارٹیوں میں سے دس پارٹیوں کے لوگ اس کنونیشن میں شریک تھے۔ ہر چند ہستادروت یا لیبر پارٹی اس ادارے میں اکثریت رکھتی ہے مگر ادارے کے کاموں میں سیاسی عقاید کا اختلاف کبھی مخل نہیں ہوا۔ یہ ادارہ سوشل ڈیماکریٹ سے بہت قریب ہے۔

روس کی حالیہ پالیسی نے کمیونسٹوں کو فلسطین میں نامقبول بنا دیا ہے، لیکن سخت اختلاف کے باوجود وہاں باہمی عناد نہیں پایا جاتا۔

ہستادروت کی بڑی خصوصیت اس کی کاروباری ذہنیت رکھنا اور اسکا عملی ہونا ہے۔ ممبروں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی مالی طاقت اور سماجی وقار اتنا بڑھا ہوا ہے کہ انتدابی حکومت کے زمانہ میں اسے "ریاست کے اندر ریاست" سے تعبیر کیا جاتا تھا، اور اس وقت یہ بات غلط بھی نہ تھی اس لئے کہ ہستادروت بہت سے ایسے کام کرتا ہے جو حکومت کو کرنے چاہئیں۔ اب چونکہ اسرائیلی ریاست قایم ہوگئی ہے۔ اس لئے ہستادروت اب بھی ریاست کے اندر ایک ریاست ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ اور وہ اس لئے کہ خود اسرائیل کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، ایک چھوٹی سی ریاست کے اندر پچیس مختلف عقاید کی سیاسی پارٹیاں کوئی نیک شگون نہیں کہا جا سکتا اسرائیل کے انتہا پسند جو انتدابی زمانے میں دہشت انگیزی پھیلاتے رہے، اب اکھنڈ فلسطین چاہتے ہیں۔ اور ان کی طاقت و اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال کے مطابق یہ جماعت یہودی قومی اتحاد کے لئے خطرہ ہے۔ کیونکہ اکھنڈ فلسطین کے تصور میں اگر اس جماعت کو کامیابی نہیں ہوئی تو وہ خود اسرائیل کے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جو اسرائیل کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں اس ذیل میں ہستادروت کا اثر و رسوخ ہی توازن کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

سولھواں باب

(بیداری یا تباہی)

بالآخر میں واپس سوئٹزرلینڈ پہونچ گیا۔ جنیوا کا موسم گندہ تھا مگر اس کی ستھرائی اور صفائی چمکتی معلوم ہوتی تھی، مشرق وسطیٰ کے شہروں کے مقابلہ میں جنیوا ایک نئی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ اصل میں یہاں تمدن اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے اور اینٹ پر اینٹ چن کر ایک ذیشان عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ جنیوا میں قاہرہ کی سی شان و شوکت اور افلاس و امراض کی انتہا دونوں مفقود ہیں۔

خیالات کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جنیوا بہت مناسب مقام ہے۔ میں نے اپنی یادداشتیں نکالیں اور وہ سب کتابیں بھی جو میں نے دوران سیاحت میں خریدی تھیں اور وہ لٹریچر بھی جو مجھے وزارت خارجہ کے دفتروں سے ملا تھا۔ میں ان سب پر غور کرنے لگا۔

جسوقت میں اپنی نوٹ بک کو پڑھ رہا تھا تو ان میں لطف و رافت، ترحم و ہمدردی کی تمام باتیں ڈپلومیٹ لوگوں کی منھ کی نہیں بلکہ مشنری پادریوں کی کہی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ولیم لام اور ڈاکٹر ولیم شارب سے میری ملاقاتیں بھول جانے والی چیز نہ تھیں، یہ دونوں تصنع سے پاک اور اپنے حلقۂ عمل کی ممتاز ہستیاں تھیں، ایران کے لوگوں سے ان کے تعلقات جس نوعیت کے تھے وہ بلا شبہ بڑے محرک و سبق آموز تھے۔ ڈپلومیسی اور پاور پالیٹکس سے یہ دونوں انسان بہت اونچے اور ارفع تھے۔ ان کا کام نوع انسان کی خدمت ہے ان پادریوں نے ایران میں سوال انسانیت کی اہمیت کا جیسا اندازہ کیا ہے کسی ڈپلومیٹ یا سائنس کے ماہر نے نہیں کیا ہے۔ ان پادریوں نے کوئی حل تو پیش نہیں کیا لیکن بہتری کی امید ضرور ظاہر کی ہے۔ بہتری کس طرف سے آئے گی؟ یہ نہ ان کو معلوم ہے نہ کسی اور کو۔

جو لٹریچر میں نے دوران سیاحت میں خریدا اس میں لاؤڈر ملک کی کتاب PELASINE:LANDOFPROMISE بھی تھی۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو میرے

اہرے میں نہیں آئیں یارہ گئیں، لیکن اس کتاب کے اس حصّہ کو میں کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا جس نے مجھ پر حقیقت ظاہر کی کہ:-

”روبہ انحطاط مشرق ادنیٰ کی اصلاح و ترقی کا راستہ یہودیوں نے فلسطین میں اپنی نوآبادیوں سے بتا دیا ہے۔“

ں اقتباس میں مشرق ادنیٰ کا مطلب مشرق وسطیٰ ہے۔ ایران، عراق، عرب، شام، لبنان، ماورائے اردن بنااور مصر وغیرہ جن کی حالت تقریباً ایک سی ہے ــــــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ اور جن کی بربادی کے ملق ولیم دوگت کے یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو اس نے زمینداروں کے ذکر میں لکھے ہیں کہ:

”ہر سال جسم آراضی سے ایک پونڈ گوشت کاٹتے رہنے نے لاکھوں ایکڑ زمین (اور انسانوں) کو برباد کر دیا ہے۔“

اسی طرح چارلس عیسوی کی یہ جملے:

”کسی طبقے نے اپنی ہستی کے جواز کا اتنا کم ثبوت نہیں دیا جتنا مصری زمیندار نے جس کو تمام مراعات حاصل ہیں مگر حکمراں طبقے کی خوبی ان کے اندر ایک بھی نہیں!“

مس ڈورین وارنیر نے اپنی کتاب ”مشرق وسطیٰ کی آراضی اور افلاس“ میں لکھا ہے کہ:-

”فاقوں سے واسطہ، اموات میں زیادتی، زمین کی بربادی، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، یہ ہے مشرق وسطیٰ کی دیہاتی زندگی کا خاکہ! یورپ بھر میں اس شدید افلاس کی مثال کہ صاف پانی بھی میسر نہ آتا ہو، کبھی اور کہیں نہیں ملتی۔ ایک انسان ان گندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو ایک ہی مکان میں انسان اور مویشی کے ساتھ رہنے سے پیدا ہوسکتی ہے۔“

ایرانی عمال وحکام کی زبان سے میں نے یہ جملہ اکثر سنا ”کاش ہمیں پانی میسر ہوتا!“ لیکن ایران میں نی کی کمی نہیں۔ زمین کے نیچے اتنا پانی ہے کہ ایران کو اتنی ضرورت بھی نہیں۔ کاش ایرانی پانی نکالنے پر توجہ رتے! ڈاکٹر لائل بیڈل نے ایک ایرانی گاؤں میں کنواں کھود کر ثابت کر دیا کہ پانی کی کمی نہیں ہے۔ اس نویں سے فی گھنٹہ پندرہ بیس ہزار گیلن پانی ابلتا ہوا نکلا۔ اسی طرح شیراز میں ایک انگریز انجینیر نے پینے کے نی کے لئے کنواں کھودا اور معلوم ہوا کہ پانی بے انتہا ہے۔ پھر بارش کی طغیانیاں ملک کی بربادی کا سبب تی ہیں حالانکہ یہی پانی اگر جمع کیا جائے تو دولت پیدا کرسکتا ہے۔ صرف اس پانی کا ذخیرہ کرنے میں کوئی خاص حمت نہیں اُٹھانا پڑے گی اور بٹائی پر کاشت کرنے والے کسانوں کے ساڑھے بارہ لاکھ کنبے معاشی سکیں گے۔ ایران اپنے موجودہ ذرایع سے اپنی کاشت کو تگنا کرسکتا ہے، ضرورت، ڈھنگ، طریقے

بدلنے کی ہے۔ جن بیماریوں کو آسانی سے دفع کیا جا سکتا ہے ان سے بیس لاکھ بھیڑیں ہر سال مر جاتی ہیں۔ حشرات الارض کھیتی کا تقریباً تین کروڑ ڈالر سالانہ کا نقصان کر دیتے ہیں۔ حالانکہ پانچ ڈالر فی کس سالانہ کے خرچ سے تین سال میں ملیریا کو بالکل ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن کوئی پروا نہیں کرتا۔

حیرتناک ماجرا ہے کہ جو ملک تیل کی پیداوار میں چوتھے نمبر پر ہو وہ قیمتی جنگل اور اس سے زیادہ قیمتی کھاد کو ایندھن کی طرح جلا ڈالے! ایسی قوم کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے!

مصر "باغِ عالم" کہلاتا ہے مگر تین چوتھائی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے آنکھوں کے مرض کا اور خارش و داد کا شکار ہے۔

شام کی تیس لاکھ کی مردم شماری میں دو تہائی کاشت کرتی ہے مگر قابل زراعت آراضی کا ساٹھ فیصدی رقبہ ایسے زمینداروں کی ملکیت ہے جو دیہات کو جھانک کر بھی نہیں دیکھتے۔ شام میں ساڑھے بارہ لاکھ ایکڑ پر کاشت کی جا سکتی ہے مگر زیر کاشت آراضی اس کا تیسرا حصہ ہے۔ کاشتکار بآسانی بے دخل کیا جا سکتا ہے، اس لئے وہ زمین پر محنت کیوں کرے؟

عراق پینتالیس لاکھ انسانوں کا ملک ہے۔ وہاں بھی قابل کاشت زمین پر صرف بیس فیصدی زراعت ہوتی ہے۔ برطانوی سائنسدانوں نے عراق کی کاشت اور آبرسانی کو کافی ترقی دی ہے لیکن کاشت چونکہ بٹائی پر ہوتی ہے اس لئے کوئی معقول فایدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

سو سال کے قریب ہوئے جب روسی طنز نگار سالتی کوف شچیدرین نے روسی کسان کی بربادی حالت پر غصہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

> "ہمارے کسان چمڑے کے بدلے لکڑی کے جوتے کیوں پہنتے ہیں؟ گوشت کی غذا انکے لئے ناممکن کیوں ہے؟ انھیں مکھن یا چربی کیوں میسر نہیں؟ وہ تقدیر پرست کیوں ہیں؟ اور ان کا ضمیر کیوں مردہ ہو گیا ہے؟ وہ کیوں کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے اور کیوں مکھیوں کی طرح مر جاتے ہیں؟"

یہی سوال عرب ملکوں میں وہاں کے فلاح کے متعلق دہرائے جا سکتے ہیں۔ روس میں زرعی غلامی رائج رہی تو روس کو اس کی قیمت بدترین خونیں انقلاب سے دینا پڑی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی موجودہ حالت دیکھنے اور سمجھنے والا بھی کچھ اس طرح کا قیاس قایم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

میرے سامنے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے قوم پرست نہیں بلکہ وہاں کے فلاح ہیں۔ اس کی تندرستی کی بحالی سب سے مقدم ہے، کیونکہ وہ موثر طریق پر فوج میں خدمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ۱۹۴۸ء کے

فلسطینی معرکے میں عرب سپاہی بہترین اسلحہ کے باوجود نکما ثابت ہوا، حالانکہ برطانوی کمانڈر کا دعویٰ تھا کہ عرب فوجیں دس دن کے اندر پورے فلسطین کو روند ڈالیں گی۔

ان ملکوں میں فوجی طاقت اس لئے مفقود ہے کہ تندرستی غائب ہے، انسانوں کا یہ جم غفیر ادنیٰ قسم کی خوشی سے بھی محروم ہے۔

ان ملکوں کا فلاح کاشتکار نہیں بلکہ کھیت مزدور ہے کیونکہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے۔ اور بے زمین والا کسان ایسا ہی ہے جیسے بغیر پانی کا پودا وہ عناصر فطرت کے قہر اور انسان کی حرص وطمع کا شکار ہے۔ وہ نہ ڈیماکریٹ ہے نہ سٹیزن، قانون بنانے میں اسے کوئی دخل نہیں مگر اس کی تعمیل پر مجبور ہے .... وہ نہ خریدار ہے نہ تعمیر کرانے والا، کیونکہ اس کی کوئی قوت خریداری نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ملک کی صنعت وتجارت میں کسی قسم کی مدد نہیں پہونچا سکتا اور اس طرح قوم وملک کے اقتصاد اور کلچر پر بار ہے۔ اس کی زندگی ایسی باتوں سے خالی ہے جو ولولہ پیدا کر سکیں جو اس کی قابلیتوں کو بر سر عمل لا سکیں۔ فلاح نہ تو زندگی میں اپنے اولاد کو کچھ دے سکتا ہے اور نہ مرنے کے بعد کوئی ورثہ چھوڑتا ہے۔ سید ضیاءالدین سابق وزیر اعظم ایران کے الفاظ ہیں :-

"بھوکے انسان کا نہ خدا ہے نہ وطن !" ان ملکوں میں عروج قوم پرستی نے وہاں کے فلاح کو کچھ نہیں دیا۔ روٹی کی بھوک آراضی کی بھوک کا نتیجہ ہے اور اس بھوک نے دنیا میں خونیں انقلاب کردئے ہیں۔ آئرلینڈ اور میکسیکو میں بار بار خون کی ندیاں بہی ہیں۔ چین آج بھی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ جنوبی امریکہ کے ملکوں میں آج کل بھی انقلاب برپا ہوتے رہتے ہیں، انقلاب ہوتا ہے، ڈکٹیٹری قایم ہوتی ہے پھر انقلاب ہوتا ہے۔ یہ سارے انقلاب صرف اس لئے ہیں کہ زمین کو جوتنے والا زمین کا خود مالک نہیں ہے۔ اور جب تک ایسا ہے، خون بہتا رہے گا۔ میرا عقیدہ ہے کہ زار روس اگر زرعی غلامی کو ختم کرنے کا حکم جاری کردیتا تو روس میں بولشویک انقلاب ہرگز برپا نہ ہوتا۔

جان برائٹ ایک برطانوی لبرل نے سو سال پہلے لکھا تھا کہ :-

> "قانون جب اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کردے، حکومت جب عوام کے حقوق ادا کرنے میں قاصر رہے، زمیندار جب آراضی کے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشتکاروں میں ضد اور مقابلہ پیدا کرکے نفع اٹھائے، وہاں لوگ قانون سے سرگردانی کرنے لگتے ہیں، تہذیب وتمدن کے اصول ترک ہوجاتے ہیں اور فطری بلکہ انتقامی قانون کام کرنے لگتا ہے !"

۱۷۲۹ء میں جوناتھن سوئفٹ نے آئرلینڈ کے متعلق لکھا تھا :-

"ایک تجویز یہ ہے کہ زمین کے مالک اپنے کاشتکاروں پر کم سے کم یہ رحم ضرور کریں کہ ان کے بچوں کو لے لیا کریں۔ ان بچوں کا گوشت دس شلنگ کو ضرور بک سکتا ہے، اس میں سے آٹھ شلنگ ماں کو دیدیا کریں تاکہ دوسرا بچہ ہونے تک وہ اس رقم سے اپنے آپ کو کام کے قابل رکھ سکے۔"

آج مشرق وسطیٰ کے زمیندار اُسوقت کے آئرش مالکان زمین سے بیچھے نہیں ہیں۔۔ امریکہ اور ڈنمارک وغیرہ کی ترقیاں جہاں زمین اسکے جوتنے بونے والے کو دیدی گئی ہے، اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں، اور وہاں بعض خرابیاں اسی وجہ سے نہیں ہیں کہ کسان اپنی زمین کا مالک ہے ــ فلسطین کے یہودیوں نے ثابت کرد کھایا ہے کہ زمین خراب ہونے کے باوجود اور کسان کی کمزوری کے ہوتے ہوئے بھی ان دونوں میں نئی جان ڈالی جاسکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ عرب فلاح کے مقابلہ میں یہودی کاشتکار کو صدہا قسم کی سہولتیں حاصل ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کاشت کو کامیاب بنانے کے سوا کوئی کام نہ تھا، ان کو عرب فلاح کی سی مصیبتیں برداشت نہیں کرنا پڑیں، نہ اسے باہمی مجادلہ میں مبتلا ہونا پڑا نہ اپنے لیڈروں سے نئے طریقے اور اوزار استعمال کرنے کے لئے کشاکش کرنا پڑی۔ تاہم فلسطین کا یہودی اگر یہ سب کچھ نہ دکھاتا تو عرب وایرانی لیڈروں اور غیر ملکی ڈپلومیٹ کو ایسے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ عربوں کو بتایا جاتا کہ "اپنی مدد آپ" کے معنی کیا ہوسکتے ہیں! یہود وعرب کی عداوت کیسی ہی شدید ہو، یہودی آباد کاروں کے کارنامے عرب کی نجات کا موجب بن سکتے ہیں۔

برٹش ڈپلومیسی نے مشرق وسطیٰ میں جس ناروا پالیسی پر عمل کیا وہ عربوں اور یہودیوں کی بدنصیبی تو تھی ہی، برطانیہ اور دنیا کی شومی قسمت کا بھی ثبوت ہے۔ یہود وعرب آج ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ان کو دوست بنانے کے لئے عقل سلیمانی درکار تھی مگر برطانیہ کے پورے ریکارڈ میں کسی ایک کوشش کا ثبوت بھی موجود نہیں ہے ــ ۱۹۳۸ء میں جب میونک کی شطرنج کھیلی جاچکی اور چیمبرلین نے "ہماری زندگیوں میں امن" کا اعلان کیا تو میں اور دوسرے صحافی جو اس وقت پراگ میں موجود تھے اس ڈپلومیسی کو مطلق نہ سمجھ سکے۔ لیکن جس پاور پالیٹکس نے برطانیہ کی فلسطینی پالیسی بنوائی وہ بھی میونک کی طرح کوتہ اندیشی کی پالیسی تھی ــ اسرائیل آج ایک خودمختار ریاست ہے، بیرونی دنیا کے اثرات اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کا فرض یہ ہے کہ عرب دنیا کا اچھا پڑوسی بنے۔ اس یہودی ریاست کے سامنے اس سے زیادہ اہم اور تاریخی کام دوسرا نہیں ہوسکتا یہودی ریاست یہ نہیں کرتی ہے تو نہ وہ خود چین پائے گی نہ عرب دنیا کو چین ملے گا ــ اپنے وطن امریکہ واپس پہونچ کر میں نے وہ غیر معمولی تابناکی اور فراوانی دیکھی جیسی کسی ملک میں نہ دیکھی تھی۔ باتیں اونچی آوازوں میں کی جارہی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں ہمارے قومی لیڈر دنیا کی جانچ کر رہے تھے، سائنسداں اسے ایٹمی بحران بتاتے ہیں سوشل سائنس کے ماہر کہتے ہیں کہ انسانی علم میں بحران آیا ہوا ہے۔ اقتصاد کے ماہر اسے اقتصادی بحران کہہ رہے ہیں، علم النفس کے ماہر کہتے ہیں کہ ایک عالمگیر اعصابی اختلال ہے، سیاسی مدبر اسے روس کے حملہ سے تعبیر کرتے ہیں، کمیونسٹوں کا خیال ہے کہ انکے عقاید اور سرمایہ داری کے مابین ایک بین الاقوامی معرکہ ہے، فلسفی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ نہیں بس خیال کے اندر بحران ہے، مذہبی پیشوا اُسے ایمانی بحران سمجھتے ہیں، مگر ارضیات کے سمجھنے والے زمین اور آبادی کا بحران مانتے ہیں۔

ان تمام آوازوں میں سے یہ آخری پکار میرے لئے کشش رکھتی ہے - فیر فیلڈ آسبورن مصنف OUR PLUNDERED PLANET اور ولیم ووگٹ ROAD TO SURVIVAL کی آوازوں نے مجھے بہت مسحور کیا - یہ اور ایسے دوسرے لوگ پاور پالیٹکس سے بہت بلند ہیں - وہ بتا رہے ہیں کہ اگر زمین کی گھٹتی ہوئی قوت کا علاج نہیں کیا گیا تو انسان کے مقدر پر مہر لگی سمجھو!

مغربی ملکوں کے کاشتکار نے ان "پیغمبروں" کی آواز پر دھیان دینا شروع کر دیا ہے، مگر فلسطین کو چھوڑ کر مشرق وسطیٰ کے تمام زمیندار اور لیڈر ہنوز خواب خرگوش میں ہیں - وہ نہیں جانتے کہ زمین کی نجات کسان کی مدد ہی سے ممکن ہے، اور کسان کی مدد اسی وقت حاصل ہو گی جب اس کا معیار زندگی اونچا ہوگا۔

با ایں ہمہ دُنیا کے سیاست داں اور مدبر "روسی حملے" کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں - کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کی تدبیروں میں لگے ہیں، ایشیا و افریقہ کی بغاوتوں پر دماغ سوزی کر رہے ہیں، تیل اور ہوائی اڈوں کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں، فوجی ماہر جنگ کے نقشوں پر جھکے ہوئے ہیں - طبقات الارض کے ماہر، اور انجنیر اور بنکر اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تیل کے ذخیروں کا حساب لگا رہے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن ایک غریب فلاح ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں، ! حالانکہ یہ اٹھارھویں اُنیسویں صدی نہیں، بیسویں صدی ہے !، ہوا بازی اور ایٹمی توانائی کی صدی ہے ! ہوائی جہاز ہی نہیں پرواز خیال کی صدی ہے ! بغاوت کے خیالات کی پرواز کی صدی ہے ! وہ نہیں دیکھتے کہ دُنیا کا کسان کسمسانے لگا ہے - حرکت میں آرہا ہے ! وہ کارل مارکس کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن اس سے آراضی کی بات کی جائے تو فوراً سمجھ لیتا ہے - اسکو اگر کوئی صحیح حل نہیں بتایا گیا تو غلط حل کو قبول کرے گا - وہ ہر اس آدمی کی بات مان لے گا جو زمین دیدینے کا وعدہ کرے، کیونکہ زمین اس کی جان ہے - اس کی مدد کرنے کو مغربی طاقتیں کھڑی نہیں ہوتیں تو مشرقی کسان کی مدد کرنے کے چیلنج کو قبول نہیں کرتی تو کمیونزم کی فتح یقینی ہے، کل جو روس میں ہوا، آج جو چین میں ہو رہا ہے، وہی کل وسطیٰ مشرق اور دوسرے ملکوں میں ہوگا۔

مغربی طاقتوں کا مشرقی ملکوں کو قرضے دینا ایسا ہی ہے جیسے سرطان والے رخسار پر غازہ ملا جائے، بیمار گالوں پر تندرستی کا غازہ نہیں چڑھ سکتا۔

دمشق، بیروت، بغداد، مکہ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لندن و واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار میں ہیں جو سماجی مقصد و اصلاح کا جھنڈا لئے ہوئے بیسے کی طرح کاشتکار کو صرف یہ کہکر ہوش میں لا سکے کہ:

"جاگ! جاگ !! اور طاقت کا مظاہرہ کر!"

جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

تمہید

آپ نے مارس ہنڈس کی زبان سے ایران اور شرق وسطیٰ کے بعض اسلامی ممالک کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی کی داستان سن لی، جس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اگر ان حکومتوں نے مزارعین کی حالت کو درست نہ کیا اور پیشہ وروں کو صنعت و حرفت کے صحیح راستہ پر ڈال کر، ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو ایک نہ ایک دن کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کا ناقابل ضبط ہو جانا ضروری ہے۔ ہنڈس اسے "مستقبل کی تلاش" کہتا ہے، لیکن میرے نزدیک اسے "مستقبل کا سایہ" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، جو مادی حقیقت میں تبدیل ہونے کے لئے نہایت تیزی سے آگے بڑھتا آرہا ہے۔

اسلامی ممالک میں جو ذہنی انقلاب اس وقت پایا جاتا ہے، وہ آج کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پہلی جنگ عظیم کے وقت ہی پڑ گئی تھی لیکن بدقسمتی سے اس پر آج تک کوئی عمارت قایم نہیں کی گئی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کچھ زمانہ اور اسی طرح گزر جائے، لیکن یہ یقین کرنا کہ ہمیشہ یہی حالت رہے گی درست نہیں۔ کوہ آتش فشاں بعض اوقات بغیر دھواں دئے ہوئے بھی پھوٹ پڑتا ہے اور یہاں تو دھواں بھی عرصہ سے اٹھ رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت ابل پڑے۔

اس کتاب کے تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں باب خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، کیونکہ وہ نہ صرف عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے بڑا زبردست درس عمل اپنے اندر رکھتے ہیں، آج فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے اختلافات نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس سے ہر شخص باخبر ہے اور عربوں کے ان جذبات سے ہر مسلمان کو ہمدردی ہے کہ ارض فلسطین سے انھیں محروم نہ کیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عربوں کی یہ خواہش اور مسلمانوں کی یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے ذمہ دار برطانیہ و امریکہ ہیں، تو یہ بھی غلط نہیں کہ برطانیہ و امریکہ کا یہ طرز عمل کسی مذہبی یا انسانی ہمدردی کی بنا پر نہ تھا بلکہ نتیجہ تھا یہودیوں کے علمی و اقتصادی اقتدار کا جو جنگ کے دوران ہی میں قایم ہو چکا تھا اور جس نے بعد از جنگ ایسی جذباتی رو کی شکل اختیار کر لی کہ اس کا مقابلہ امریکہ و برطانیہ کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

عربوں کو بہت پہلے سے معلوم تھا کہ یہودی ارض فلسطین کو اپنا قدیم وطن سمجھ کر وہاں آباد ہونا چاہتے ہیں، لیکن

انھوں نے اس سیلاب کے روکنے کی جو تدابیر اختیار کیں، وہ یکسر سفیہانہ اور غیر فطری تھیں۔ سفیہانہ اس لئے کہ انھوں نے امریکہ و برطانیہ پر اعتماد کیا اور غیر فطری اس لئے کہ وہ خود اپنے آپ کو اس سیلاب کے روکنے کا اہل نہ بنا سکے یہودی ارض فلسطین میں اس شان کے ساتھ داخل ہوئے کہ ان کے پاس علم تھا، دولت تھی، غیر معمولی فراست و دانائی تھی، فوج تھی، اسلحہ تھے اور اسی کے ساتھ عزم راسخ ــــ اس کا مقابلہ میں عربوں کے پاس کیا تھا؟ جہل، افلاس، فقر و فاقہ، تشتت و انتشار، خود غرضی، کم ہمتی اور لامرکزیت! پھر ان دونوں کے تصادم کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور اسے کوئی قوت نہ روک سکتی تھی۔ اس لئے عربوں کو اب اس فکر میں اپنا وقت نہ ضایع کرنا چاہئے کہ وہ یہودیوں کو فلسطین سے نکالدیں، بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہودی فلسطین سے آگے بڑھ کر سارے عربستان پر چھا جائیں، کیونکہ جس تیزی کے ساتھ وہ ترقی کر رہے ہیں، اور جن اصول پر وہ اپنی حکومت کی بنیاد قایم کر رہے ہیں، وہ تمام عربستان کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ عرب ممالک کے لئے یہ بڑا سخت خطرہ ہے۔

پھر اس خطرہ کے دور کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، بالکل وہی جس سے یہ خطرہ پیدا ہوا ہے یعنی اصلاح و ترقی کے وہی اصول جو یہود نے اختیار کئے ہیں اور اقتصادی بحالی وغیرہ کرنے کے وہی طریقے جنھوں نے فلسطین کے ریگزاروں کو چند دن کے اندر "جنت عدن" میں تبدیل کر دیا۔ پھر حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ جن اصول کو پیش نظر رکھ کر آج یہود فلسطین پر چھائے جا رہے ہیں، وہ اسلام ہی کے متعین کئے ہوئے اصول ہیں، بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس "ہادی اکبر" نے یہ اصول بتائے تھے اسی کے متبعین آج اس سے منحرف نظر آتے ہیں اور اس خدائی فیصلہ کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ

"ان الارض یرثھا عبادی الصالحون"

ھنڈس نے اپنی کتاب میں مسلم حکومتوں کے صرف اقتصادیات سے بحث کی ہے اور سیاسی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے غالباً اس لئے کہ یہ اس کے مطالعۂ سیاحت کا مقصود نہ تھا، لیکن جب تک تصویر کا دوسرا رخ (سیاست) سامنے نہ آئے، ان حقیقی اسباب کا پتہ نہیں چل سکتا جنھوں نے اسلامی ممالک میں یہ ہلچل پیدا کی اور نہ یورپ کے سرمایہ دارانہ ملکوں کی اُن ریشہ دوانیوں کا علم ہو سکتا ہے، جن کا مقصود وہی اسلامی ممالک کو ہمیشہ زبوں حال بنائے رکھنا ہے تاکہ وہ انکی گرفت سے باہر نہ ہونے پائیں۔ اس لئے ہم سالنامہ کے دوسرے حصہ میں تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ پہلی جنگ کے وقت اور اس کے بعد اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کے اسباب کیا تھے اور بعد کو انھوں نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں، اس مقالہ کی ترتیب میں ہم نے ہیمڈن جیکسن کی کتاب پوسٹ وار ورلڈ سے مدد لی ہے، کیونکہ اس موضوع پر لکھنے والے مغربی مورخین میں جیکسن ہی تنہا وہ شخص ہے جس نے کافی دیانت سے کام لیا ہے اور عصبیت سے مغلوب نہیں ہوا۔

جمہوریت ترکی

اسلام اور عیسویت کی تاریخ میں ایک مماثلت بہت عجیب پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح چودھویں صدی عیسوی میں مسیحیوں نے پوپ اور مقدس سلطنت روما کا جُوا گردن سے اُتار کر اپنی اپنی قومی سلطنتیں علحدہ بنالیں، اسی طرح چودھویں صدی ہجری میں، خلافت کی زنجیر ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں کی بھی متعدد حکومتیں قایم ہوگئیں۔

اس سے قبل ترکوں کی حکومت بہت وسیع تھی جس میں عربستان کی مسلم آبادی کے علاوہ یورپ کے بعض حصوں کی عیسوی آبادی بھی شامل تھی، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں وہ انحطاط کی آخری منزل سے گزر رہی تھی۔ اور اس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ نہ ہم اسے صحیح معنے میں مسلم حکومت کہہ سکتے تھے، نہ ترکی حکومت بلکہ سچ پوچھئے تو اسے خود مختار سلطنت بھی نہ کہہ سکتے تھے۔

مُسلم حکومت تو وہ اس لئے نہ تھی کہ مسلمانوں کی کثیر آبادی اس کے قلمرو سے باہر رہتی تھی، ترکی حکومت اس کو اس لئے نہ کہہ سکتے تھے کہ اس کی زبان عربی تھی، قوانین عربی تھے اور مذہبی علماء ہر جگہ دخیل تھے، خود مختار حکومت نہ کہہ سکنے کا سبب یہ تھا کہ اپنے ملک کی غیر مسلم قوموں پر اسے کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، ان کی عدالتیں الگ تھیں، ان کے قوانین علحدہ تھے اور حکومت کی طرف سے ان کو اجازت تھی کہ وہ اپنے تمام معاملات بالا بالا اپنے اپنے سفارت خانوں ہی کے ذریعہ سے طے کریں۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) نے ایک بار اس کی کوشش بھی کی کہ وہ دُنیا کے تمام مسلمانوں کے روحانی و دنیوی پیشوا تسلیم کر لئے جائیں اور اسی کوشش کے سلسلہ میں انھوں نے مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے قسطنطنیہ سے مدینہ تک ریل کا سلسلہ بھی قایم کر دیا، لیکن ان کے اس اقدام کو صرف سیاسی چال جان کر ایک طرف مہدی سوڈانی نے بغاوت کر دی، دوسری طرف عرب میں وہابی تحریک شروع ہوگئی۔ اور ترکی حکومت مرکزی مسلم حکومت نہ بن سکی۔

جب ترکی کو روحانی پیشوائی حاصل کرنے کی امید ختم ہوگئی تو پھر اس نے یہ کوشش کی کہ اگر وہ مذہبی

حیثیت سے تمام دُنیا کے مسلمانوں کا مرکزِ امید نہیں بن سکتی تو شاہنشاہیت ہی کی حیثیت سے اس کو استوار کیا جائے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی ایک جماعت نے جو پیرس میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے سوچا کہ کیوں نہ فرانسیسی حکومت کے اصول کو سامنے رکھ کر ایک ڈماکریٹک قسم کی حکومت قایم کی جائے جس میں مسلم، عیسائی یہودی، ترک، عرب وغیرہ سب کو نمایندگی حاصل ہو، چنانچہ سنہ ۱۹۰۸ء میں "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے سالونیکا میں سلطان ترکی کے خلاف نعرۂ انقلاب بلند کیا گیا اور جدید کانسٹی ٹیوشن کا مطالبہ شروع ہو گیا۔

خیال تھا کہ سلطان سختی سے اس تحریک کو دبائے گا، لیکن حالات دیکھ کر اس نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور "انجمن اتحاد و ترقی" برسرِ اقتدار آ گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جماعتی تحریک کی یہ کامیابی بڑی کامیابی تھی، لیکن "انجمن اتحاد و ترقی" کے اس اقتدار کو بلقانی ریاستوں نے پسند نہ کیا اور ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلغاریہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، یونان نے کریٹ پر قبضہ کر لیا، آسٹریا نے بوسینا اور ہرزگوینا لے لیا اور اٹلی، طرابلس کو دبا بیٹھا۔

ان کے دیکھا دیکھی عربوں نے بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ بغداد میں عراقی افسروں نے ایک خفیہ سوسائٹی آزادیٔ عراق کے لئے بنائی، دمشق میں بھی اسی طرح کی سوسائٹیاں شام کی خود مختاری کے لئے بننے لگیں، مکہ میں شریف حسین اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگا اور نجد میں ابن سعود نے وہابی حکومت کی طرح ڈالدی۔ اس میں شک نہیں کہ عربستان کی یہ تحریک آزادی برسوں تک کامیاب نہ ہوتی اور ترکی کی نئی حکومت اس کو بہ آسانی دبا دیتی، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں جنگ شروع ہو گئی (سنہ ۱۹۱۴ء) اور ترکی نے اپنی قسمت جرمنی کے ساتھ وابستہ کر دی۔

ترکی کی حکومت نے اس جنگ کو بڑی خدا ساز بات سمجھا۔ اس نے سوچا کہ جرمنی کے روپیہ سے وہ اپنی فوج کو مضبوط و آراستہ کر کے اپنے قدیم دشمن روس سے بھی انتقام لے سکے گی اور عرب حکومتوں کے سر سے بھی آزاد کا سودا نکالدے گی لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا، اور عربوں نے سوچا کہ حصول آزادی کا یہی بہترین موقعہ ہے، چنانچہ جس وقت برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی فوج نے عراق پر حملہ کیا تو یہاں کی فوج نے کوئی مقابلہ نہیں کیا اسی طرح دمشق میں بھی اہل شام نے کوئی مدد ترکی کی نہیں کی، نجد میں ابن سعود انگریزوں سے رشوت لیکر بالکل غیر جانبدار بنا رہا اور مکہ میں شریف حسین نے برطانیہ کے ہائی کمشنر متعینہ مصر سے گفتگو کر کے یہ طے کر لیا کہ اگر اس نے قبایل عرب کو ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا تو عرب کا فرمانروا اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

اول اول برطانیہ نے حسین کے وعدۂ امداد کو چنداں اہمیت نہ دی تھی کیونکہ درۂ دانیال کی طرف سے

اس نے خود قسطنطنیہ پر حملہ کرنا طے کر لیا تھا، لیکن انگریز اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور ترکی فوج نے بڑی پامردی سے مقابلہ کرکے درۂ دانیال سے انگریزوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی اثناء میں شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ترکوں نے اس کے خلاف مدینہ میں قلعہ بندی کرکے مکہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس واقعہ سے عربوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا اور حسین کے تیسرے بیٹے فیصل اور ٹی۔ ای۔ لارنس کی قیادت میں تمام عرب قبایل نے مل کر حجاز کی طرف سے ترکوں کے خلاف خلیج سنائی پر دھاوا بول دیا۔

اسی کے ساتھ انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مصر کی طرف سے براہِ شام، ترکی پر حملہ کریں۔ مقابلہ کے لئے مصطفےٰ کمال کو بھیجا گیا، لیکن چونکہ ترکی فوجوں پر دو طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا اور عراق کی طرف سے بھی برطانوی فوجیں بڑھتی آ رہی تھیں، اس لئے ترکی کو مجبوراً نومبر ۱۹۱۸ء میں صلح کرنا پڑی اور معاہدۂ مدروس (MUDROS) کی رو سے، مصر اور عربستان کے علاقوں سے اسے دست بردار ہونا پڑا۔

ترکی کو مذہبی حکومت بنانے میں پہلے ہی ناکامی ہو چکی تھی، سلطان عبدالحمید نے ترکی کو مرکزی مسلم حکومت بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا، انجمن اتحاد و ترقی نے اس کو شاہنشاہیت بنانا چاہا اور کامیابی نہ ہوئی، اس لئے اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی کہ ترکی کو محض ترکی حکومت بنایا جائے، لیکن اس کی تکمیل کیونکر ہو اور کون اس اہم خدمت کو انجام دے، اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

سلطان وحیدالدین اپنی جگہ ڈر رہے تھے کہ اگر اب ترکی میں کوئی قومی تحریک شروع ہوئی تو اتحادیئن اس بہانہ سے اناطولیا کو بھی ہتیالیں گے، اسی طرح انجمن اتحاد و ترقی بھی اپنی جگہ خایف تھی اور اس کے ارکان حلب کی شکست کے بعد اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ اب صرف ایک ہی شخص رہ گیا تھا جسے بھروسا تھا کہ قومی روح پھونک کر اب بھی ترکی کو بچایا جا سکتا ہے اور وہ مصطفےٰ کمال تھا، لیکن اس وقت وہ بھی قسطنطنیہ کے مضافات میں چھپا ہوا تھا، کیونکہ انگریز اس فکر میں تھے کہ اسے گرفتار کرکے مالٹا بھیجدیں۔

مصطفےٰ کمال بھی دوسرے لیڈروں کی طرح[1] خود اس جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا جس کو اسے آزاد کرانا تھا، اس کا باپ البانی تھا اور ماں مقدونیہ کی۔ وہ ۱۸۸۱ء میں بمقام سالونیکا پیدا ہوا اور مدرسۂ حربیہ میں تعلیم پائی، ۱۹۰۵ء میں اس کو فوج میں کمیشن ملا اور اس کے بعد سے اس کی زندگی لڑائی میں بسر ہوئی۔ دروزیوں کو اس نے شکست دی، بلغاریہ سے اس نے جنگ کی، طرابلس میں اطالوی فوجوں کا اسنے مقابلہ کیا، قفقاز میں روسی افواج کے سامنے وہ سینہ سپر رہا اور گیلی پولی میں اس نے برطانوی فوج کو

---

[1] ڈی ویلرا امریکن اشنرہ ہے، ہٹلر آسٹریا سے تعلق رکھتا تھا، پلسوڈسکی، لتھونیا کا متوطن تھا اور اسٹالین جارجیا میں پیدا ہوا۔

ناکوں چنے چبوا دئے۔ الغرض ایک محارب کی حیثیت سے اس کی قابلیت و اہلیت مسلم تھی اور ترکی سپاہ اس پر جان دیتی تھی، لیکن سیاسی حلقوں میں وہ اپنی صاف گوئی اور سخت کلامی کی وجہ سے مقبول نہ تھا اور انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان سے اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ خلیفہ اس سے مرعوب تھا لیکن دربار خلافت میں اس کے مخالف اتنے تھے کہ وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ نکل سکتی تھی، اس لئے خلیفہ نے اسے ٹالنے کے لئے قسطنطنیہ سے باہر مشرقی اناطولیا کی طرف اس کمیشن کا افسر بناکر بھیجدیا جو مشرقی اناطولیہ کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے یہاں کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے بجائے اسے اور مسلح کرنا شروع کر دیا اور جب اس کی اطلاع سلطان وحیدالدین کو ملی اور انھوں نے مصطفیٰ کمال کو واپس بلانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں آزادی اور خود مختاری حاصل کئے بغیر واپس نہ آؤں گا۔

مصطفیٰ کمال کا یہ خیال بظاہر ناممکن العمل تھا، کیونکہ سلطان اور ترکی حکومت اس کے خلاف تھی، اتحادئین بھی اس کے دشمن تھے، چنانچہ سلطان نے کردوں کو اس کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کی مدد سے یونان نے سمرنا میں اپنی فوجیں اتار دیں، لیکن مصطفیٰ کمال نے انھیں واقعات سے فایدہ اٹھایا اور ترک آبادی کو یہ یقین دلاکر کہ سلطان اور اتحادئین دونوں ترک قوم کو غلام بنانا چاہتے ہیں، عوام کی ہمدردیاں حاصل کرلیں اور وہ جوق درجوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔

مصطفیٰ کمال نے ہوا کا یہ رخ دیکھ کر نیشنل اسمبلی کے قیام کا اعلان کر دیا اور جون ۱۹۱۹ء میں بمقام ارض روم اس کا پہلا جلسہ طلب کیا۔ اس جلسہ میں مصطفیٰ کمال کو پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ ستمبر میں بمقام سیواس اس نے پھر اسمبلی کا جلسہ طلب کیا اور ایک مجلس عاملہ مرتب کرکے انگورا کو صدر مقام بنا لیا۔

مصطفیٰ کمال نے یہ سوچکر کہ عرب ریاستوں پر تو قبضہ ہو نہیں سکتا اور قسطنطنیہ کی حکومت اس کی مدد کے لئے طیار نہیں، یہ فیصلہ کیا کہ ترکی قوم کا بقا صرف اس طرح ممکن ہے کہ اس علاقہ میں جہاں ترک مسلمانوں کی اکثریت ہے خالص ترکی حکومت قایم کی جائے اور اس کا اعلان کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی کی نئی حکومت کے قیام کا یہ اعلان ایسا تھا جس کو نہ خلیفہ پسند کرتا تھا نہ اتحادئین اور بالکل ممکن ہے کہ قوم پرست ترکوں کی جو جماعت اس کے ساتھ ہوگئی تھی، وہ بھی تازہ جوش ٹھنڈا ہونے کے بعد اس کا ساتھ چھوڑ دیتی، لیکن اتحادیوں نے ۱۹۲۰ء میں تین ایسی غلطیاں کیں کہ ترک قوم کے جذبات حد درجہ مشتعل ہوگئے اور مصطفیٰ کمال کی قایم کی ہوئی حکومت زیادہ مستحکم ہوگئی۔

پہلی غلطی یہ تھی کہ انگورا کے نیشنل پیکٹ کے اعلان کے بعد اتحادئین نے کہلا بھیجا کہ ترکوں کی نئی حکومت کو وہ تسلیم کرنے کے لئے طیار ہیں اگر قسطنطنیہ میں نیشنل اسمبلی کا جلسہ کرکے اس کا اعلان کیا جائے، انگورا سے کے

ڈیلی گیٹ اس خبر کو سنکر خوش ہوگئے اور اس نوید پر قسطنطنیہ جا کر انھوں نے پارلیمنٹ کے پورے اجلاس میں نیشنل پیکٹ کو منظور کرایا، لیکن اس کے دو مہینے بعد ہی اتحادی سپاہ نے قسطنطنیہ کی بہت سی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرکے چالیس نیشنلسٹ لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور مالٹا بھیجدیا۔ اس بدعہدی سے اتحادیین کے خلاف ترکوں میں عام بدظنی پیدا ہوگئی۔

دوسری غلطی معاہدہ سیورس تھا۔ جسکی رُو سے تھریس کا علاقہ اور سمرنا یونانیوں کو دیدیا گیا، عدلیہ اٹلی کو اور صرف کوہستانی علاقہ ترکوں کو ملا، اس تقسیم نے ترکوں کو بالکل یقین دلادیا کہ اتحادیین انھیں تباہ کردینے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کی قومی اسپرٹ پوری قوت کے ساتھ اُبھر آئی۔

تیسری غلطی یہ تھی کہ اتحادیین (فرانس، برطانیہ، اٹلی) نے یونان کو ترکی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ترکی پر دباؤ ڈال کر معاہدہ کی شرایط تسلیم کرالی جائیں۔ یہ لڑائی تین سال ۱۹۲۲ء تک جاری رہی اور اتحادیین نے یونان کی پوری مدد کی، لیکن آخرکار ترکوں کو فتح ہوئی اور معاہدۂ سیورس کالعدم ہوگیا۔ مصطفیٰ کمال کی یہ فتح معجزہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے صرف تیرہ ہزار ترک سپاہیوں سے جو پوری طرح مسلح بھی نہ تھے اور فنونِ جنگ سے بھی واقف نہ تھے، یونانیوں کی ۸۰ ہزار باقاعدہ آراستہ فوج کو باہر نکال دیا اور اپنا سارا علاقہ واپس لے لیا۔

ترکوں کی اس کامیابی کے بعد معاہدۂ لاسین (۱۹۲۳ء) وجود میں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو پورا اناطولیا، مشرقی تھریس اور قسطنطنیہ مل گیا اسی کے ساتھ غیر ملکیوں کو جو غیر معمولی حقوق حاصل تھے وہ بھی ختم کردئے گئے، ۔الاکھ یہودی آبادی مشرقی اناطولیا سے یونان منتقل کی گئی اور اس طرح تاریخ میں بالکل پہلی مرتبہ ترکی کی قومی حکومت قایم ہوئی۔

لیکن اب مصطفیٰ کمال کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ اس حکومت کی بنیاد کو کیونکر استوار کیا جائے خود ترکوں کی کثیر آبادی سیاست سے بالکل ناواقف تھی اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی کہ کس قسم کی حکومت قایم کی جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ سوویٹ یونین میں شامل ہوجانا چاہئے۔ بعض خالص اسلامی حکومت کے قیام کی طرف مایل تھے اور بعض اسے مغربی انداز کی جمہوریت بنانا چاہتے تھے، لیکن مصطفیٰ کمال نے ان سب کی مخالفت کی کیونکہ سوویٹ یونین میں شامل ہونا اس کے نزدیک اپنی آزادی کو ہاتھ سے کھودینا تھا، اسلامی حکومت میں پھر قدامت پسند طبقہ کے درخور کا اندیشہ تھا اور جمہوریت کا وہ اس لئے خلاف تھا کہ ترکی آبادی ابھی اس قابل نہ تھی کہ انتخاب اور رائے دہندگی کی اہمیت کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال ڈکٹیٹر شپ ہی موزوں ہے۔

چنانچہ جب معاہدہ لاسین کے بعد نیشنل اسمبلی کا اجلاس ہوا تو مصطفیٰ کمال اور عصمت بے نے ایک بل پیش کیا کہ ترکی کو جمہوری حکومت قرار دیا جائے اور کسی نہ کسی طرح اسے منظور کرا کے مصطفیٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہوگیا، اب مصطفیٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہوگیا، اور اس کے اختیارات غیر معمولی وسیع ہوگئے۔ صدر کی حیثیت سے کابینہ پر اسے اقتدار حاصل ہوگیا، پارٹی کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے سیاسی پالیسی پر پورا اختیار مل گیا اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے تمام فوجی نظام اس کے ہاتھ آگیا۔

مصطفیٰ کمال کو صرف ایک ہی دُھن تھی وہ یہ کہ ترکی قوم میں کسی طرح قوم پرستی کا صحیح جذبہ پیدا کیا جائے اور غیر ترکی عناصر کو نکال باہر کیا جائے اور صدر جمہوریہ ہونے کے بعد اس نے یہ کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں کئی باتیں اس کے سامنے تھیں، سب سے پہلے تو یہ کہ خلافت کے قصہ کو ختم کیا جائے، دوسرے یہ کہ ترکوں میں جو عربوں کی سی مذہبی ذہنیت پیدا ہوگئی ہے اسے دور کیا جائے اور تیسرے یہ کہ قدیم قوانین کو منسوخ کر کے جدید قوانین نافذ کئے جائیں۔ چنانچہ اپنے انتخاب کے چند مہینے بعد ہی اس نے سب سے پہلے منصب خلافت کے منسوخ کرنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کام آسان نہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں جو روایتی احترام منصب خلافت کا صدیوں سے جاگزیں چلا آرہا ہے اس کو دور کرنا مشکل ہے، تاہم وہ ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس دوران میں سر آغا خاں نے منصب خلافت کے احترام کے بقا کے متعلق ترکی جمہوریت سے پر زور اپیل کی اور یہ اپیل مصطفیٰ کمال کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس نے ترکی قوم کے سامنے اس مسئلہ کو اس صورت سے پیش کیا کہ سر آغا خاں نے یہ اپیل برطانیہ کے اشارہ سے کی ہے اور اس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ ترکی جمہوریت کو فنا کر دیا جائے۔

ترکوں پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور نیشنل اسمبلی نے باتفاق رائے منصب خلافت کی تنسیخ کا فیصلہ کر دیا۔ اس وقت عبدالمجید خلیفہ تھے۔ ان کو معزول کر کے معہ ان کے متعلقین کے یوروپ بھیجدیا گیا۔ نیشنل اسمبلی نے اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر دیا۔ کہ موجودہ قوانین بھی منسوخ کر کے جدید قوانین مغربی اصول پر طیار کرائے جائیں اور اس پر بھی فوراً عملدرآمد شروع ہوگیا۔ لیکن چونکہ مذہبی خیالات یوں دفعتاً ختم نہیں ہوسکتے، اس لئے نیشنل اسمبلی کے حزب مخالف نے مصطفیٰ کمال کی مخالفت شروع کی اور کردستان میں بغاوت کرادی۔ جب تین مہینے کے بعد مشکل سے یہ بغاوت فرو ہوئی تو مصطفیٰ کمال نے سوچا کہ کام یوں نرمی سے نہیں چلے گا، اسلئے اس نے پہلے تو اسمبلی سے حزب مخالف کے افراد کو نکالا اور پھر پوری سختی کے ساتھ اس نے ملاؤں اور مذہبی اداروں کو ختم کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اقتصادی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ جب تک ترکوں کی ذہنیت کو نہ بدلا جائے اس میں کامیابی ممکن نہیں، اس لئے اس نے سب سے پہلے تعلیمی نصاب کو بدلا اور تمام

مذہبی مکاتب و مدارس بند کر کے جدید مدارس مغربی اصول پر قایم کئے۔

وہ سمجھتا تھا کہ ذہنیت بدلنے کے لئے ظاہری وضع قطع کا بدلنا بھی ضروری ہے، اس لئے اس نے ترکی ٹوپی کی جگہ چھجے دار ٹوپی کو حکماً رائج کیا، برقع استعمال کرنا ممنوع قرار دیا اور رسم خط لاطینی کر دیا۔ ٹوپی اور رسم خط کا مسئلہ تو خیر اتنا سخت نہ تھا، لیکن پردہ کی ممانعت نے قصبات و دیہات میں کافی بے چینی پیدا کر دی کیونکہ وہاں کی عورتیں قدیم اسلامی روایات کی سختی سے پابند تھیں اور وہ بے پردگی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں، تاہم رفتہ رفتہ تمام مزاحمت دور ہوتی گئی اور ۷ سال کے عرصہ میں ترکی جمہوریت مغربی اصول پر قایم ہوگئی۔

اب مصطفیٰ کمال کے سامنے دوسرا اہم سوال اقتصادی اصلاحات کا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ ترکی اپنی آب و ہوا، زرخیز وادیوں اور صحرائی و معدنی پیداوار کے لحاظ سے ہر قسم کی زرعی و صنعتی ترقی کر سکتا ہے، لیکن ان قدرتی ذرایع سے فایدہ اُٹھانے میں ایک سب سے بڑا مانع حایل تھا یعنی یہ کہ حکومت بالکل مفلس تھی اور وہ نہ دوسرے ملکوں سے قرض لینا چاہتا تھا نہ یہ پسند کرتا تھا کہ وہاں کے سرمایہ دار یہاں آ کر صنعت کو ترقی دیں۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے زراعت کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور پہلے خود ایک فارم طیار کیا جس میں جدید آلات کشاورزی سے کام ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے آٹھ زراعتی کالج قایم کئے اور زراعتی بنک قایم کر کے کسانوں کو تخم اور زراعتی مشینری کی فراہمی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کسانوں میں جدید آلات کے ذریعہ سے زراعت کرنے کا رواج عام ہونے لگا اور رفتہ رفتہ وہاں کے تمام کسانوں نے اسے قبول کر لیا۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال صنعت و تجارت کی ترقی کا تھا۔ تجارتی نقطۂ نظر سے ترکی کی جغرافی پوزیشن نہایت اچھی ہے کیونکہ ایشیا اور یوروپ کے درمیان وہ ایک چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح پیداوار کے لحاظ سے بھی ترقی کے اسباب اس کے پاس موجود ہیں۔ سمرنا کا انجیر، ترکی کا تماکو، روئی اور زیتون وہاں کی خاص اشیاء ہیں جن کی مانگ دُنیا میں بہت ہے۔ ہر چند جنگ کے بعد بین الاقوامی تجارت کے لئے اسباب مساعد نہ تھے لیکن مصطفیٰ کمال نے روس، اٹلی، یوگوسلیویا، رومانیا اور یونان سے تجارتی معاہدات کر کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر لی تھی اور حمل و نقل کے لئے ہر سال ۱۵۰ میل ریلوے لائن بھی طیار کی جانے لگی۔

قیام جمہوریت سے قبل ترکی ہر قسم کی صنعت سے محروم تھا، اور گو قیام جمہوریت کے بعد متعدد فیکٹریاں قایم ہوئیں جن میں سگریٹ بنانے قالین بُننے اور فوج کی وردی کے لئے پارچہ بافی کی فیکٹریاں خاص اہمیت رکھتی ہیں تاہم کوئی قابل ذکر ترقی اس میں نہ ہوسکی، ان حالات کو دیکھ کر وہاں کے کارخانہ داروں نے احتجاج کیا کہ حکومت آمدنی کا زیادہ حصہ فوج پر صرف کر رہی ہے اور صنعتی اداروں کی ہمت افزائی بہت کم ہوتی ہے، اس لئے یا تو روپیہ باہر سے قرض لیا جائے یا فوجی بجٹ کو کم کیا جائے۔

مصطفےٰ کمال نے اس احتجاج سے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکی قوم میں غالباً اب اتنی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ملک کے مالیات اور اقتصادی مسایل کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے عصمت پاشا کی قیادت میں حزب مخالف کے لئے بھی اسمبلی میں جگہ نکالی تاکہ ترکی قوم ایک ذمہ دار جمہوری حکومت کے صحیح اصول سے واقف ہو سکے۔ اس سے قبل وہاں ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور حکومت کی تقریروں اور تجویزوں پر اظہار رائے بالکل ممنوع تھا اور کوئی اسکی مخالفت نہ کر سکتا تھا، لیکن اب حزب مخالف قایم کرکے آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی عام اجازت دیدی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں فتحی پاشا کی سرکردگی میں ایک لبرل جمہوریت پسند پارٹی قایم کی گئی جو حکومت کی تجویزوں پر کھلی ہوئی تنقید کرے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔

ترکوں کی قدیم ذہنیت اس بات کو سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ حکمراں جماعت کی مخالفت بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے، اس لئے انھوں نے مصطفےٰ کمال کے اس طرز عمل سے یہ سمجھا کہ اب وہ ضعیف ہو گیا ہے اور حکومت سنبھالنے کی طاقت اس میں نہیں رہی۔ اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ مختلف سمتوں سے قدامت پرست اور باغیانہ عناصر رکھنے والی جماعتوں نے شورش شروع کر دی، سمرنا میں ایک شخص نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرکے لوگوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنا شروع کیا، کردوں نے پھر حکومت کے خلاف ہتھیار سنبھال لئے اور ملا پھر سر اٹھانے لگے۔ مصطفےٰ کمال نے مجبور ہو کر حزب مخالف کو توڑ دیا اور ان تمام شورشوں کو دبانے میں پوری سختی سے کام لیا۔

اس نے کہا کہ "ترک قوم ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ مغربی اصول پر طریق حکمرانی کو سمجھ سکے اس لئے ضرورت ہے کہ میں کم از کم پندرہ سال تک اور آمرانہ حیثیت سے کام کروں اور ترک پبلک کو سیاسیات میں حصہ نہ لینے دوں"

الغرض ترک جمہوریت کا قیام اس میں شک نہیں کہ محض مصطفےٰ کمال کے غیر معمولی عزم و ثبات کا نتیجہ تھا اور وہ اپنی زندگی ہی میں سیاسی دنیا میں اس کے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر گیا۔ مصطفےٰ کمال کے انتقال کے بعد بھی حکومت کی پالیسی قریب قریب وہی رہی جو اس نے قایم کی تھی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو دوسری جنگ عظیم میں اس کی پالیسی کیا ہوتی۔ تاہم اس جنگ میں ترکی کا غیر جانبدار رہنا اس کے لئے مفید ہی ہوا اور وہ ان تباہیوں سے بچ گیا جو دوسری حکومتوں پر شرکت جنگ کی وجہ سے نازل ہوئیں — فی الحال اس نے اپنی قسمت اینگلو امریکن بلاک سے وابستہ کر دی ہے اور اٹلانٹک پیکٹ میں شامل کئے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ امریکہ نے مارشل پلان کے تحت ترکی کی کافی مدد بھی کی ہے، لیکن اس سے زیادہ تر فوجی تنظیم میں کام لیا گیا جو امریکہ کا اصل مقصود تھا اور ملک کے اقتصادی حالات کو درست کرنے میں اسے صرف نہیں کیا گیا۔

فوجی ترتیب و تنظیم اور تمدنی تہذیب و شایستگی کے لحاظ سے ترکی کا مقابلہ کوئی اسلامی حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے باوجود چھوٹی سلطنت ہونے کے یوروپ و امریکہ میں اس کی دھاک اور ساکھ کسی بڑی سلطنت سے کم نہیں

بھی اس کانفرنس میں شریک نہیں کئے گئے، صرف حجاز کی نمائندگی قبول کی گئی اور وہ بھی حسین [illegible] کے بیٹے فیصل کو نمائندہ تجویز کیا گیا کیونکہ اس نے کہہ دیا تھا کہ میں دمشق سے زیادہ کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتا۔

سرزمینِ عرب کی تقسیم

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ارکان صلح کانفرنس کے لئے مشرق وسطیٰ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم نہ تھا جتنا جرمنی کے بٹوارہ کا اور سب اسی میں مصروف تھے علاوہ اس کے بڑی بڑی طاقتوں کے بعض نمائندے عربستان کے حالات سے زیادہ واقف بھی نہ تھے، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ جزیرہ نمائے عرب نام ہے ایک بہت بڑے صحرا اور صرف اس کے سواحل کا جو اقتصادی، زرعی اور سیاسی حیثیت سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، مصر صرف نہر سویز کی وجہ سے نگاہ میں تھا اور فلسطین، شام و عراق کی اہمیت صرف اس لئے تھی کہ ہندوستان کا راستہ اِدھر سے بھی جاتا ہے، موصل اور خلیج فارس کی اہمیت البتہ پٹرول کے چشموں کی وجہ سے کچھ زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ رہا عرب کا مرکزی حصہ سو اس سے وہ بالکل ناواقف تھے یہاں تک کہ ابن سعود اور اس کی وہابی تحریک کا بھی انھیں کوئی علم نہ تھا۔ ان کا تنہا مشیر صرف لارنس تھا اور وہ خود بھی ابن سعود اور اس کی تحریک سے زیادہ آگاہ نہ تھا۔

صلح کانفرنس میں کبھی کبھی مشرق وسطیٰ کا بھی ذکر آجاتا تھا اور دو مختلف رائیں اس سلسلہ میں ظاہر کی جاتی تھیں، ایک جماعت تو یہ کہتی تھی کہ عربوں سے جو وعدہ آزادی کا کیا گیا ہے وہ پورا کرنا چاہئے، دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اگر برطانیہ نے عراق چھوڑ دیا تو ترکی پھر اس پر قابض ہو جائے گا اور نہر سویز بھی ہاتھ سے نکل جائے گی علاوہ اس کے فرانس بھی اس پر آمادہ نہ تھا کہ شام سے اس کا اقتدار اٹھ جائے۔

اصول تولیت

آخرکار ۱۹۱۹ء میں یہ طے پایا کہ وہ مستعمرات یا ریاستیں جو جنگ کے بعد دوسری حکومتوں کے اثر سے آزاد ہو گئی ہیں (مثلاً عرب جو ترکی کی حکومت سے علٰحدہ ہو گیا ہے) ترقی یافتہ حکومتوں کی نگرانی میں دیدی جائیں تاکہ وہاں کی آبادی کو آزاد و خود مختار حکومت قائم کرنے کا اہل بنایا جا سکے (وہی پرانی چال جو دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے مغربی حکومتیں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں) عرب کے مسئلہ میں بھی چلی گئی۔

اس اصولی بات کے طے ہونے کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک بین الاقوامی کمیشن خود عربستان جاکر معلوم کرے کہ وہاں کے لوگوں کی کیا رائے ہے لیکن چونکہ فرانس نے اپنا کوئی نمائندہ اس کمیشن میں مقرر نہیں کیا بعمت اس لئے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا اور اتحادیوں نے خود ہی ۱۹۲۰ء میں یہ فیصلہ کر دیا کہ:

۱- عراق، برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔

۲- شام اور کوہستانی لارنس و صحرائے سینا کا درمیانی علاقہ برطانیہ و فرانس کے درمیان [illegible] جائے گا فلسطین اور شرق اردن کی تولیت میں رہیں گے اور مغربی حصہ یعنی ساحل لبنان اور دمشق فرانس

کی تولیت عبداللہ کے ساتھ شریف حسین کو جن کی عمر ۷۰ سال کی تھی حجاز کا فرمانروا تسلیم کیا گیا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ حجاز اقتصادی حیثیت سے کوئی اہم چیز نہیں اور صرف حجاج ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ حسین کا ولی عہد اس کا بڑا بیٹا علی مقرر کیا گیا، دوسرے بیٹے عبداللہ کو زیر سیادت برطانیہ والی عراق تسلیم کیا گیا اور فیصل کو دمشق دیا گیا۔ الغرض اس طرح شریف کے خاندان والوں کا منہ بند کر دیا، لیکن سلطنت عثمانیہ سے جدا ہونے والے دوسرے علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ آرمینیا بدستور ترکوں کے پاس رہا، مصر، برطانیہ کے سیادت سے باہر نہ نکل سکا، اور ابن سعود سرزمین نجد میں چاروں طرف شریفی خاندان والوں سے گھر گیا۔

شام اور فرانس

شام میں فرانس کی تولیت وہاں کے باشندوں کی مرضی کے بالکل خلاف تھی اور ہرچند شام کی ۳۰ لاکھ کی آبادی جس میں مسلم کاشتکار و زمیندار، دروزی قبایل، لبنانی تاجر شامل ہیں اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے لحاظ سے باہدگر متفق نہ تھے، لیکن تولیت کے سب مخالف تھے اس لئے فرانس کو فوجی طاقت سے اپنی تولیت قایم کرنا پڑی اور اگست ۱۹۲۰ء میں فیصل کو دمشق سے نکال کر وہاں فوجی حکومت قایم کر دی اور شام کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے پانچ جداگانہ ریاستیں قایم کر دیں جن کا نظم و نسق، بجٹ، جھنڈا سب علحدہ تھا۔

اہل شام کو یہ تقسیم سخت ناگوار ہوئی اور عیسوی اقلیت کے ساتھ جو غیر معمولی مراعات روا رکھی گئیں انھوں نے مسلمانوں کو بہت برہم کر دیا۔ دروزی قبایل نے اس کی عملی مخالفت شروع کر دی اور جب یہ مخالفت زیادہ سنگین ہو گئی تو ۱۹۲۵ء میں فرانسیسی حکومت نے دھوکا دیکر دروزی لیڈروں کو دمشق گفتگو کے لئے بلایا اور انھیں قید کر لیا۔ اس واقعہ سے سخت برہمی پیدا ہو گئی اور دروزیوں نے پوری قوت کے ساتھ بغاوت شروع کر دی۔ فرانسیسیوں نے اس کے جواب میں مسلسل ۴۸ گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کر کے اسے کھنڈر کر دیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد فرانسیسی افواج کی تعداد یہاں ۵۰ ہزار بڑھا دی گئی اور دیہات بھی کثرت سے جلا دئے۔

اس واقعہ سے تمام دنیا میں سنسنی پھیل گئی اور فرانس کو مجبور کیا گیا کہ وہ کوئی سمجھوتا کرے۔ فرانس نے ایک آزمودہ کار شخص [illegible] کو یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے بجائے تولیت قایم رکھنے کے اہل شام سے مستقل معاہدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار اہل شام نے یہ محسوس کیا کہ وہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ نباہ کر سکتے ہیں۔

[illegible] کر [illegible] انتخاب کے ذریعہ سے [illegible]

بچ جائیں اور برطانیہ نے عراق میں بھی اسی اصول پر عمل کیا تھا۔ اس لئے شام کے فرانسیسی گورنر نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور دو سال کے اندر یہاں اسمبلی قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۳۶ء میں جب گورنر نے اسمبلی کے سامنے شرائط معاہدہ پیش کیں تو کثرت رائے سے اسے اہل شام نے رد کر دیا۔ کیونکہ ان شرائط کی رو سے شام کی تقسیم پانچ ریاستوں میں بدستور قائم رکھی گئی تھی اور حکومت فرانس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ شام میں جتنی فوج چاہے رکھے اور جتنے ہوائی اڈے چاہے قائم کر سکتا ہے۔

برطانیہ اور یہود

فرانس کو جو ناکامی شام میں ہوئی اس سے زیادہ برطانیہ کو فلسطین میں ہوئی ہر چند عرب دونوں سے نفرت کرتے تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ شام میں کم از کم انھیں یہ تو معلوم تھا کہ فرانس کا کیا ارادہ ہے، لیکن فلسطین کے معاملہ میں تو برطانیہ کے ارادوں کی خبر ہی نہ تھی اور بیم و رجا کی کیفیت طاری تھی۔

ایک طرف برطانیہ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ وہ عربوں کا طرفدار ہے اور دوسری طرف ہر سال ہزاروں یہودیوں کو بھی فلسطین میں بساتا جا رہا تھا۔

جو یہودی یہاں آ رہے تھے وہ زیادہ تر صیہونی[1] جماعت کے تھے اور عرب انھیں کی طرف سے بہت مشتبہ تھے۔

برطانیہ نے جنگ سے پہلے یہودیوں کے قومی وطن کے لئے اوگانڈا تجویز کیا تھا لیکن ڈاکٹر ویزمین نے جو صیہونی لیڈر تھا اس تجویز کو رد کر دیا۔ ڈاکٹر ویزمین نے دوران جنگ میں برطانیہ کی بڑی اہم خدمت انجام دی تھی۔ ایک بار جنگ میں برطانیہ کو بڑی مشکل پیش آ گئی تھی یعنی یہ کہ برطانیہ میں الکحل جو پھٹنے والے گولوں کی طیاری کے لئے ضروری تھا بالکل ختم ہو گیا تھا اور اس کا حصول کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس وقت ڈاکٹر ویزمین نے لکڑی سے الکحل طیار کر کے برطانیہ کو اس خطرہ سے بچا لیا تھا اور جب اس سے اس خدمت کا معاوضہ پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ "میری قوم کے لئے کچھ کیا جائے"۔

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ویزمین کی خواہش کو برطانیہ رد نہ کر سکتا تھا اس لئے نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا (جسے اعلان بالفور کہتے ہیں) کہ "حکومت برطانیہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن قرار دینے کی طرفدار ہے

---

[1] صیہونیت کی تحریک ایک یہودی فیلسوف ڈاکٹر ہرتزل نے ۱۸۹۷ء میں شروع کی تھی جس کا مقصود یہ تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی و مذہبی مرکز قرار دیا جائے اور تیس سال کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ یہودی مہاجر فلسطین میں آباد ہو گئے تھے۔

اور اس مقصد کی تکمیل کی پوری کوشش کرے گی، لیکن اسی کے ساتھ فلسطین میں جو یہودی آبادی پائی جاتی ہے اس کے حقوق بدستور قایم رہیں گے اور اسی اصول کے تحت فلسطین برطانیہ کی تولیت میں سے [illegible]

اس اعلان سے مقصود یہ تھا کہ فلسطین میں عرب و یہود دونوں کی ملی جلی آبادی کی حکومت قایم کیجائے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہود و عرب کے درمیان نفرت و اختلاف اب بہت زیادہ ہوگیا تھا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر ان دونوں کا اجتماع مشکل تھا۔

بالفور اعلان سے قبل برطانیہ نے یہاں فوجی حکومت قایم کر رکھی تھی جو بہ نسبت یہودیوں کے عربوں کی طرف زیادہ مایل تھی (کیونکہ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے برطانیہ کی بڑی مدد کی تھی) لیکن بالفور اعلان کے بعد اس پر عمل کرانے کے لئے سر ہربرٹ سموئل کو فلسطین بھیجا گیا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ غیر جانبدارانہ طریقہ سے اس مسئلہ کو طے کرے، لیکن چونکہ وہ خود یہودی تھا۔ اس لئے یہودیوں نے اس کی پذیرائی ایک یہودی گورنر کی حیثیت کی اور عربوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تولیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے اور یروشلم اور یافہ میں سخت بدامنی پیدا ہوگئی۔ ہربرٹ نے ۱۹۲۳ء میں ایک عام انتخاب کی کوشش بھی کی، لیکن مسلمانوں نے اس میں مطلق حصہ نہیں لیا۔

اس کے بعد لارڈ پلومر کو ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا، اتفاق سے اسی وقت کساد بازاری شروع ہوگئی جس نے بہت سے یہودیوں کا دیوالہ نکال دیا، مسلمان اس کساد بازاری سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اب یہود خود ہی فلسطین چھوڑ کر چلے جائیں گے، لیکن عربوں کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ کساد بازاری زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکی دوسری طرف لارڈ پلومر نے بھی استعفا دیدیا جس سے عرب بہت خوش تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں پھر بے چینی پیدا ہوئی اور یروشلم میں یہود و عرب نے ایک دوسرے سے لڑنا اور شہر کے امن و سکون کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

ان حالات کو دیکھ کر لارڈ پاسفیلڈ کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجا گیا تاکہ وہ فلسطین کے حالات کی تحقیق کر کے رپورٹ مرتب کرے۔ لارڈ پاسفیلڈ نے تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ وائٹ پیپر کے نام سے شایع کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو محدود کر دینا مناسب ہوگا۔

[illegible] یہودیوں میں [illegible] ہوگیا اور آخر کار مرنے میکڈانلڈ کو اس کے سامنے جھکنا پڑا [illegible] یہودیوں کا [illegible] فلسطین کو ان کا قومی وطن بنانے کے لئے کروڑوں پونڈ صرف کئے ہیں، ہم نے یہاں کی [illegible] زراعت [illegible] باغات نصب کئے ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں [illegible] سے کام لیکر اس سرزمین کی ترقی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں، یافہ کے قریب [illegible] ہے آباد کیا ہے جس میں ۵۰ ہزار یہودی آباد ہیں پھر گزرے ہوئے [illegible]

بھگانے کی فکر میں ہیں اور [illegible] سے کہاں کی قوت پیدا کر رہے ہیں، اور ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانا طے کر لیا ہے اس لئے ہم کسی روک ٹوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔"

عربوں کا کہنا یہ تھا کہ: "فلسطین ہمارا ہے، وہاں ہماری اکثریت ہے، یہاں کی ترقی کی اسکیموں میں پچاس لاکھ پونڈ برطانیہ ان سے وصول کر چکا ہے، دس لاکھ پونڈ بندرگاہ حیفہ کی تعمیر میں انھوں نے ادا کئے ہیں اور یہودیوں کو حق حاصل نہیں کہ وہ فلسطین کو اپنا وطن بنائیں۔"

لیکن انگریزوں نے کسی ایک کی نہیں سنی اور جو کچھ انھیں کرنا تھا کیا، فلسطین کے ساتھ شرق یردن کو بھی اپنی تولیت میں لے لیا اور عبداللہ (شریف حسین کے دوسرے بیٹے) کو یہاں کا برائے نام فرمانروا بنا دیا۔ اس کے بعد [illegible] میں عمان اور عقبہ کو بھی شرق یردن میں شامل کر کے یہاں ہوائی اڈے بنائے۔

یہ تو سب کچھ ہوا اور برطانیہ و فرانس نے اپنی تولیت کے قیام کے لئے بہت کچھ بندوبست کر لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شام و فلسطین دونوں جگہ تولیت ناکام ثابت ہوئی اور اس کا تنہا سبب یہ تھا کہ شام میں فرانسیسیوں نے عیسائی اقلیت کا اور فلسطین میں برطانیہ نے یہود اقلیت کا ساتھ دیا۔

سعودی عرب

انگریزوں نے شریف حسین اور اس کے خاندان والوں میں عرب کا بٹوارہ کر کے یہ سمجھا تھا کہ چونکہ یہ خاندان نبوت سے ہیں اس لئے اہل عرب مطمئن ہو جائیں گے اور اس خاندان کی وساطت سے وہ ان پر قابو پا سکیں گے، لیکن نتیجہ توقع کے خلاف نکلا کیونکہ شریف حسین قطعاً حکومت کا اہل ثابت نہیں ہوا اور اس نے اہلِ حجاز کو سخت برہم کر دیا، اس نے حجاز میں قدیم انداز کی ملوکیت قائم کر کے سب کچھ اپنے ہی لئے مخصوص کر لیا، ملازمین کو تنخواہیں بھی بروقت نہ دیتا تھا، اور آمدنی کا ایک ایک پیسہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر جو چاہتا تھا صرف کرتا تھا، فوج کو پورا راشن بھی نہ دیتا تھا اور بدنظمی کا وہ عالم تھا گویا یہاں کسی کی حکومت ہی نہیں ہے، ان حالات کے تحت حجاز کی رعایا بہت پریشان تھی اور برہمی کے آثار ہر جگہ نمایاں تھے۔

اس سے قبل عرب کے وسطی حصہ میں وہابی تحریک شروع ہو گئی تھی جو ترکی کی خلافت کو تسلیم نہ کرتی تھی۔ یہ تحریک اس قدر مقبول ہوئی اور عربوں نے اس کا اتنا ساتھ دیا کہ حجاز کے دونوں مقدس مقامات مکہ اور مدینہ پر بھی وہابیوں کا قبضہ ہو گیا اور عبدالعزیز وہابی لیڈر نے نجد کی فرمانروائی کا اعلان کر دیا۔ لیکن [illegible] میں اسے ترکوں نے نکال باہر کیا۔ اس وقت اس کے بیٹے ابن سعود کی عمر ۹ سال کی تھی اور وہ اپنے باپ کے ساتھ یہ بھی خلیج فارس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، بیس سال کی عمر میں اس نے خلیج فارس کو چھوڑا اور چھوٹی سی جماعت کے ساتھ نجد کے پایۂ تخت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھی اور دس سال کے اندر اس کی قوت اتنی ہو گئی کہ ترکی حکومت کو تشویش پیدا ہوئی اور اس نے [illegible]

کو دو دفعہ پھر ابن سعود کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ شریف حسین نے ابن سعود کے بھائی کو گرفتار کر لیا اور اسے مجبور کیا کہ ترکی حکومت کی سیادت کو تسلیم کرے اور ایک ہزار پونڈ تاوان ادا کرے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۰ء کا ہے اور یہی ابتدا تھی شریفی خاندان اور وہابی جماعت کی مخالفت کی جو اب تک چلی جا رہی ہے۔

ابن سعود کے متبعین زیادہ تر خانہ بدوش قبایلی لوگ تھے جن کی معاش کا انحصار صرف لوٹ مار پر تھا اور وہ کسی ایک جگہ جمکر نہ رہتے تھے، ابن سعود نے وہابی تحریک کے سلسلہ میں یہ بھی کوشش کی کہ ان قبایل کی قزاقانہ عادت کو ترک کرایا جائے، چنانچہ اس نے ایک ادارہ اخوان کے نام سے قایم کرکے ان لوگوں کو اسکا ممبر بنایا اور ملت وفاداری لیکر ان کی فوجی تنظیم شروع کر دی۔ ان لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کیا گیا کہ وہ صحرائے عرب کے شاداب مقامات میں مستقل سکونت اختیار کرکے کاشت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس تحریک میں ابن سعود کو بہت کامیابی ہوئی اور چند دن میں وہابیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔

۱۹۱۳ء میں ابن سعود نے ترکوں سے بدلہ لینے کے لئے احسا پر قبضہ کر لیا اور وہابی حکومت خلیج فارس تک وسیع ہوگئی۔ اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اتحادیوں نے پانچ ہزار پونڈ ماہوار کی رشوت دیکر ابن سعود کی غیر جانبداری خریدی اور شرط یہ قرار پائی کہ شریف حسین کو جو مدد دیجا رہی ہے وہ وہابی حکومت کے خلاف استعمال نہ کی جائے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں شریف حسین نے اس عہد کو توڑ کر وہابیوں کے شہر خرما پر قبضہ کر لیا۔ ابن سعود نے چند دن بعد ہی اچانک حملہ کرکے پھر خرما کو چھین لیا اور حسین کے بیٹے عبداللہ کو بھی گرفتار کر لیا جو بعد میں قید سے بھاگ نکلا۔

۱۹۲۱ء میں ابن سعود نے پھر اپنی تاخت کا سلسلہ شروع کیا اور عراق کی حدود تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔ اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ وہابیوں سے گفتگوئے مصالحت ضروری ہے اور اس غرض سے کویت میں کانفرنس طلب کی گئی۔ لیکن باہم کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ ابن سعود نے برطانیہ کی اس پالیسی کو پسند نہ کیا کہ عراق، حجاز اور شرق اردن میں شریفی خاندان کے افراد کو حکمران بنایا جائے، دوسری طرف برطانیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ابن سعود عراق کے حدود تک پہنچ جائے۔

۱۹۲۴ء میں جب مصطفےٰ کمال نے منصب خلافت کو منسوخ کیا تو شریف حسین نے اپنے بیٹے عبداللہ کے اصرار سے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ نے ابن سعود اور شریف حسین دونوں کو امداد دینا بند کر دی تھی۔ ابن سعود نے شریف حسین کا اعلان خلافت سنکر تین طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ شرق اردن اور عراق میں اس کو اسے کامیابی نہ ہوئی اور برطانیہ کی ہوائی فوج نے بم گرا کر ابن سعود کے فوجیوں کو منتشر کر دیا لیکن جدہ کی طرف حسین کی فوج کو شکست دیکر اس نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس

حج کے بعد جب ابن سعود مکہ میں داخل ہوا تو اس کا داخلہ فاتح کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ ایک احرام بند زائر کی حیثیت تھا اس کا اثر لوگوں پر بہت ہوا اور کہا جاتا ہے کہ سالہا سال کے بعد پہلی بار ابن سعود ہی کے زمانہ میں امن و سکون کے ساتھ لوگوں کو حج کرنا نصیب ہوا۔

اب ابن سعود، نجد و حجاز دونوں کا مالک تھا۔ لیکن ان دونوں مقامات میں دیرینہ قبائلی عداوت کو دور کرنا آسان نہ تھا۔ وسطی ریگزار عرب کے باشندے جو وہابی اصول کے پابند تھے، اول تو ویسے ہی حجازیوں کے سخت دشمن تھے اور دوسرے وہ یہ دیکھتے تھے کہ مکہ میں ہر چہار طرف سے حجاج آتے ہیں اور آزادی کے ساتھ وہاں ممنوعات کا استعمال ہوتا ہے جو ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس لئے نجد کے قبائل بیتاب تھے کہ حجاز پر حملہ کرکے وہاں کے قبائل کو نکال دیں، لیکن ابن سعود نے اپنے قبائل کے جذبات کو بڑی تدبیروں سے دبایا اور اسی دوران میں اس نے جدہ سے مکہ تک ریل اور موٹر سروس جاری کر دی، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں جتنے حجاج مکہ میں جمع ہوئے اس سے قبل کبھی نہ جمع ہوئے تھے۔ لیکن جماعت اخوان اب تک برہم تھی اور ابن سعود کے متعلق کہتی تھی کہ وہ وہابی اصول سے ہٹ گیا ہے اور عرب میں موٹریں چلا کر اور وائرلیس قائم کرکے اصول مذہب سے منحرف ہو گیا ہے۔ ابن سعود نے نجد کے سرداروں کو بلا کر بہت کچھ سمجھایا لیکن وہ نہ مانے اور بغاوت کرکے حدود عراق پر حملہ کر دیا۔

برطانیہ نے عراقیوں کی مدد کرکے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا اور جب یہ نجد واپس آئے تو ابن سعود نے ان کے بہت سے لیڈروں کو قتل کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجد و حجاز ایک ہو گئے اور ابن سعود کی حکومت بحر احمر سے لیکر خلیج فارس تک اور بحر ہند سے صحرائے شام تک قائم ہو گئی۔ اب اس کے لئے خطرہ کی چیز صرف وہ علاقہ تھا جو شمال میں برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔ اس لئے ۱۹۳۲ء میں اس نے شرق اردن اور عراق کے درمیان کا علاقہ بھی لینا چاہا۔ لیکن برطانیہ اسے کسی طرح گوارا کر سکتا تھا کیونکہ فلسطین سے خلیج فارس کا راستہ اسی طرف سے تھا اور اس کی پائپ لائن بھی یہیں کہیں ہونا تھی۔ آخرکار ابن سعود کو مجبوراً یہ خیال ترک کرنا پڑا اور اسے شرق اردن میں عبداللہ سے اور عراق میں فیصل اور فیصل کے بیٹے سے صلح کرنا پڑی۔

اس کے بعد صرف جنوبی حصہ ایسا رہ گیا تھا جہاں وہ کامیاب ہو سکتا تھا اس لئے ابن سعود نے ۱۹۳۴ء میں یمن پر حملہ کرکے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

ہر چند برطانیہ نے بہت کوشش کی کہ ابن سعود کو عرب کو بھی اپنے تحفظ میں لے لے لیکن وہ [illegible] ہوا اور اب سر زمین عرب میں تنہا ابن سعود ہی کی حکومت ایسی ہے جو اپنے آپ کو [illegible] ہے اور بیرونی ممالک کے اثر سے بالکل پاک ہے۔

ابن سعود کے تعلقات اب امریکہ سے زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور اس نے اپنے ہاں کے پٹرولی چشموں کا ٹھیکہ امریکن کمپنی کو دے رکھا ہے جس سے اس کو لاکھوں پونڈ کی آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ جن ترکیبوں سے کام لے رہا ہے، وہ بڑی شاطرانہ ہیں، وہ آہستہ آہستہ یہاں پوری طرح چھایا جا رہا ہے اور ابن سعود ڈالروں کی لالچ کی وجہ سے اس حقیقت کو نظر انداز کرتا جا رہا ہے کہ سرزمین نجد و حجاز کو امریکہ کے موجودہ دور کی وجہ سے ایک نہ ایک دن امریکہ کی کالونی بن جانا ہے اور اس کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے سلب ہو جانا۔

عراق

جنگ عظیم سے قبل عراق کو کوئی بین الاقوامی خصوصیت حاصل نہ تھی۔ دوران جنگ میں سب سے پہلے دنیا کی توجہ اس کی طرف اس وقت مبذول ہوئی جب برطانوی جنرل ٹاؤن شنڈ کو ترکوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور اس کے بعد اس وقت جب مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانوی فوج کے ہاتھ آیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں بصرہ، بغداد اور موصل کے علاقے بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

اس وقت یہاں کی آبادی ۴۰ لاکھ عراقیوں، ۵ لاکھ کردوں اور ڈھائی لاکھ اسیرین عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ترکوں کا یہاں اب کوئی اثر باقی نہ رہا تھا اور برطانیہ نے کرنل اے ٹی ولسن کی تجویز کے مطابق برطانوی افسروں کے ذریعہ سے یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، لیکن چونکہ وہائٹ ہال کی پارٹیوں میں عراق کے مستقبل کے متعلق اختلاف تھا، اس لئے کوئی خاص پالیسی اس باب میں متعین نہ ہوئی تھی۔

خود عراقیوں کے ذہن میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی واضح صورت نہ تھی، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد وہ کسی اور حکومت کی غلامی میں نہ دیدئے جائیں۔

ولسن یہ چاہتا تھا کہ عراق، برطانیہ کی تولیت میں آجائے۔ اس نے لکھا تھا کہ "اگر ہم کو عرب کے متعلق اپنی پالیسی کو کامیاب بنانا ہے تو ہم کو ان سے سیاسی تعلقات استوار کرکے اپنی تجارتی پالیسی کو مضبوط بنانا چاہئے۔"

ولسن کا مقصود یہ تھا کہ عراق کو ترقی دیکر وہ اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی حیثیت سے یوروپ کی سطح پر لے آئے، عربوں کے قبائلی نزاعات کو دور کرکے انھیں متحد و متفق کردے، لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی، اور اس کے لئے بڑا زمانہ درکار تھا، تاہم اس نے بارہ مہینے تک اس تجویز میں سر کھپایا اور اسی قلیل مدت میں برطانیہ کے ۳ کرور پونڈ صرف ہوگئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر کار ۱۹۲۰ء ولسن واپس بلا لیا گیا۔

اس کے بعد جب بغداد میں یہ اعلان کیا گیا کہ عراق برطانیہ کی تولیت میں رہے گا، تو یہاں بغاوت شروع ہوگئی، کیونکہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کسی اور کی غلامی قبول نہ کرسکتے تھے۔ اس ہنگامہ میں بہت

برطانوی افسران مارے گئے اور علاقۂ فرات کا درمیانی حصّہ برطانیہ کے قابو سے باہر ہوگیا۔

کرنل لارنس نے ایک خط کے ذریعہ سے ۲۲ جولائی سنہ ء کے ٹائمس میں ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :۔

"دو سال کا انتظار کرنے کے بعد عراقیوں کے پیمانۂ صبر کا لبریز ہوجانا تعجب کی بات نہیں۔ جو حکومت ہم نے یہاں قایم کی ہے وہ انگریزی وضع کی ہے اور انگریزی زبان ہی میں وہ کام کرتی ہے۔ ۴۵۰ افسران میں سے ایک بھی عراق کا باشندہ نہیں، ترکوں کے زمانہ میں ۷۰ فی صدی افسران عراق ہی کے تھے ہماری ۸۰ ہزار فوج صرف فرایض پولیس ادا کرتی ہے اور سرحد کی حفاظت ونگرانی نہیں کرسکتی۔ ترکوں کے عہد میں یہاں کی فوج میں عربی افسر ۹۰ فی صدی تھے اور ۹۵ فی صدی دوسرے فوجی عہدہ دار بھی عرب ہی تھے، لیکن انگریزوں نے ان سب کو نکال دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور عراقیوں میں برطانیہ کے خلاف بدظنی پیدا ہوگئی"

جولائی اور اکتوبر کے درمیان، عراقیوں سے جنگ کرنے میں دو ہزار برطانوی اور ہندوستانی افسران کام آئے اور ۸۴۵۰ عرب مارے گئے۔ اس خلفشار اور بد امنی کے دور کرنے کی صرف ایک ہی تدبیر تھی اور یہ کہ حکومت کا ذمہ دار زیادہ تر عربوں کو قرار دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اکتوبر میں کرنل ولسن کی جگہ سرپرسی کاکس بھیجے گئے، انھوں نے بغداد میں سربرآوردہ عراقیوں کو بلاکر کابینہ بنانے کی ہدایت کی اور اس طرح تیرھویں صدی کے بعد سب سے پہلے عراقیوں کو ذمہ دار حکومت تفویض ہوئی۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ حکومت پھر بھی برطانیہ ہی کی تھی کیونکہ اہم معاملات کا فیصلہ اس نے خود اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا۔

سنہ ء میں جب قاہرہ کانفرنس منعقد ہوئی تو استعماری سکرٹری ونسٹن چرچل نے یہ فیصلہ کیا کہ عراق سے برطانوی فوج ہٹالی جائے اور اس کی جگہ ہوائی فوج رکھی جائے۔ اس سے منشاء یہ تھا کہ فوجی مصارف تو کم ہوجائیں لیکن دباؤ پہلے سے زیادہ بڑھ جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ یہاں کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے۔ اس کے انتخاب میں بھی برطانیہ اور عراق کے درمیان کافی اختلاف رہا، لیکن آخرکار شریف فیصل کی سیادت عراقیوں نے منظور کرلی۔

شریف فیصل فیصل کی تمام زندگی مصائب ہی میں بسر ہوئی تھی، وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں مقید کرکے قسطنطنیہ بھیجدیا گیا، اور پھر حجاز میں عرصہ تک مقید رہا۔ اس کے بعد عرب بغاوت کی قیادت میں سرگرداں رہا اور آخر آخر جب دمشق کی حکومت اسے ملی تو فرانسیسیوں نے اسے نکالدیا۔ اب عراق کی حکومت ملی تو اس کی پوزیشن اور زیادہ نازک ہوگئی، ایک طرف تو عراقی رعایا اس۔

بدظن تھی کیونکہ وہ برطانیہ کا نامزد شخص تھا، دوسری طرف شام میں فرانسیسی پڑوسی اس سے برہم تھا کیونکہ دمشق سے اس نے اس کو نکالا تھا، پھر چونکہ وہ سُنّی تھا اس لئے ایرانی بھی خوش نہ تھے اور اپنے مقامات مقدسہ ایک سُنّی کے ہاتھ میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شریفی خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ابن سعود سے اس کی دشمنی پہلے ہی سے تھی، الغرض عراق کا بادشاہ ہونے کے بعد فیصل کی پوزیشن بہت نازک ہوگئی لیکن چونکہ وہ آدمی تھا بڑے صبر و استقلال کا اس لئے اس نے ان تمام مشکلات پر آہستہ آہستہ قابو پالیا۔

فیصل کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب وہ اپنی حکومت کا اعلان کرے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کردے کہ اقتدار اعلیٰ برطانوی ہائی کمشنر کا رہے گا، لیکن فیصل نے اس سے انکار کردیا اور کہا کہ: "حسب معاہدہ برطانیہ نے مجھے خود مختار فرمانروا تسلیم کیا ہے اور اس کے خلاف میں کوئی اعلان نہ کروں گا"

آخرکار ۱۹۲۳ء میں ایک مزید معاہدہ کی روسے برطانیہ نے اسے عراق کا خودمختار فرمانروا تسلیم کرلیا۔ ۱۹۲۸ء میں شام کی فرانسیسی حکومت نے بھی اس کی یہ حیثیت مان لی اور شام و عراق کے درمیان سلسلۂ تجارت قایم ہوگیا۔ ایرانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے بغداد سے تہران تک سڑک بنوادی، اور ایران سے بھی معاہدہ ہوگیا۔

اب صرف ابن سعود رہ گیا تھا جس سے صلح و آشتی کے تعلقات قایم کرنا مشکل تھا، لیکن فیصل برابر اس کوشش میں لگا رہا اور آخرکار ۱۹۳۰ء میں وہ خود ابن سعود سے ملا اور اس طرح آپس کے تعلقات میں جو تلخی پائی جاتی تھی وہ بہت کم ہوگئی۔

موصل موصل کی زیادہ تر آبادی کردوں پر مشتمل ہے اور اسی لئے جنگ کے بعد بھی ترکوں کا یہ اصرار باقی رہا کہ موصل کو ترکی حکومت میں شامل رہنا چاہئے۔ جمہوریت ترکی کا ارادہ یہ تھا کہ موصل کے ۵ لاکھ کردوں کو اُن ۳۰ لاکھ کردوں کے ساتھ ملادے جو کوہستان زوغا کے شمال میں آباد ہیں اور اس طرح پورے کُردستان کو اپنی قلمرو میں شامل کرلے۔ لیکن اتحادیئن یہ چاہتے تھے کہ شمالی کردستان کو علٰحدہ ایک مستقل حکومت بنادیا جائے اور اگر موصل کے کُرد آبادی چاہے تو اس حکومت میں شامل ہوجائے۔ لیکن جب اتحادیئن اس میں کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے اپنی پالیسی بدل کر یہ ظاہر کیا کہ موصل کا عراق کی حکومت میں شامل رہنا ضروری ہے۔ کُردوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری کیونکہ عراقیوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ سے خراب رہے تھے اور انھوں نے اس تحریک کا مقابلہ بھی کیا، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے اور آخرکار موصل، عراق کو دیتا سطے پاگیا۔

پہلے ۱۹۱۶ء میں یہ صوبہ فرانس کو دینا تجویز ہوا تھا اس لئے شام کی فرانسیسی حکومت نے اس تجویز کی مخالفت کی، لیکن آخر کار اس نے بھی اسے تسلیم کر لیا، اس شرط کے ساتھ کہ یہاں کے پٹرولی چشموں کی آمدنی سے ایک چوتھائی اسے دیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد ایک کروڑ پونڈ کے سرمایہ سے عراق پٹرول کمپنی وجود میں آئی اور حیفہ سے طرابلس تک پائپ لائن بچھا دی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی حکومت اقتصادی حیثیت سے برطانیہ و فرانس کی دست نگر ہوگئی اور اب ہر وقت اس اندیشہ سے دوچار ہے کہ بہ صورت بدامنی مغربی طاقتیں اپنے اپنے سرمایہ کی حفاظت کے بہانہ سے فوراً اپنی فوجیں یہاں بھیجکر قبضہ کر لیں گی۔

مصر

برطانوی شہنشاہیت نے جس چالاکی و ہوشیاری سے مصر میں آہستہ آہستہ اپنے پاؤں جمائے ہیں اس کی مثال دُنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مصر کے ساتھ برطانیہ کی دلچسپی سب سے پہلے اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب نپولین اول نے برطانیہ کے مشرقی ذرایع آمد و رفت کو دریائے نیل کی طرف سے خطرہ میں ڈال دیا تھا، لیکن جب نپولین سوم کے عہد میں نہر سویز طیار ہوئی تو یہ دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ہرچند یہ کمپنی فرانس کی تھی لیکن ہر ملک اس کے حصّے خرید سکتا تھا اور چونکہ اس کا تعلق سرزمین مصر سے تھا اس لئے اُصولاً چاہئے یہ تھا کہ مصر ہی اس میں زیادہ حصّہ لیتا، لیکن خدیو مصر کے پاس روپیہ نہ تھا۔

اس موقعہ سے فایدہ اُٹھا کر برطانیہ نے نصف سے زیادہ حصّے خرید لئے اور اس مالی تعلق کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے مصر پر اپنا اقتدار قایم رکھنے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اتفاق سے اس کے بعد ہی عربی پاشا نے خروج کیا اور برطانیہ کو فوجی تسلط قایم کرنے کا بھی بہانہ ہاتھ آ گیا۔ لیکن یہ تسلط جس ہوشیاری سے ۲۲ سال تک قایم رکھا گیا وہ برطانوی سیاست دانی کی بڑی زبردست چال ہے۔

مصر، سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا اور خدیو مصر اس کا ماتحت تھا، لیکن انگریزوں نے اس تعلق کی اہمیت کو کبھی چیلنج نہیں دیا بلکہ اس کو بدستور قایم رکھنے کی کوشش کی حتٰے کہ جو انگریز خدیو مصر کی ملازمت میں تھے انھوں نے انگریزی ٹوپی بھی اُتار پھینکی اور ترکی ٹوپی پہننا اختیار کیا۔ فوج کی ملازمت میں انھوں نے پاشا کا لقب اختیار کرنا منظور کر لیا اور مصریوں کے ساتھ ایسے گھُل مل گئے گویا وہ مصر ہی کے اصل باشندے تھے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ سلسلہ برابر ۲۲ سال تک جاری رہا یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ کو اپنا نقاب دوستی اُتار پھینکنے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ چونکہ اس جنگ میں ترکی، اتحادیئن کے خلاف تھا اس لئے دسمبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ "مصر، ہز مجسٹی کی حفاظت میں لے لیا گیا ہے اور آیندہ وہ برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔"

لیکن اس کے بعد بھی برطانیہ نے اپنی پالسی کو گول مول ہی رکھا اور ظاہر یہی کیا کہ مصر خود مختار رہے،

چنانچہ خدیو کا لقب بدل کر سلطان کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ موجودہ تولیت عارضی ہے اور صرف جنگ کے زمانہ تک محدود رہے گی۔

ہر چند مصر کو اتحادیین کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی اور اس کی حیثیت ایک غیر جانبدار ملک کی سی تھی، لیکن جیسا کہ لارڈ لائیڈ نے ظاہر کیا تھا در اصل وہ نہ نیوٹرل تھا اور نہ لڑائی میں شریک، اس کی حیثیت ایک فوجی کیمپ کی سی تھی، جہاں اتحادی فوجوں کا زبردست اجتماع رہتا تھا اور مصریوں کے تمام ذرائع پیداوار و ترقی یا تو اتحادیوں کے تصرف میں تھے یا بالکل معطل اور ان کا مستقبل بالکل برطانیہ کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔ اگر مصر واقعی صحیح معنی میں نیوٹرل رہتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن ہوا یہ کہ مصر کو شرکت جنگ میں دعوت نہ دینے کے باوجود، اس کے فوجی دستوں کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا گیا، وہاں کے ہزاروں غریب کاشتکاروں کو زبردستی بھرتی کرکے میدان جنگ کی طرف بھیجدیا گیا، اس لئے دریائے نیل کا سارا علاقہ مارشل لا کے تحت آ گیا، دو لاکھ اتحادی فوجوں کے لئے پانی اور لکڑی لانے کے لئے مصر ہی کے غریب کاشتکاروں کو مجبور کیا گیا، غلّہ اور روئی کی تمام پیداوار نہایت معمولی قیمت دیکر لے لی گئی، اور مصر کے تمام خچر اور اونٹ فوج کے لئے زبردستی حاصل کئے گئے۔

ان حالات میں مصری قوم کی پریشانیوں اور بے چینیوں کا جو عالم رہا ہوگا، ظاہر ہے، اس کے بعد جب لڑائی ختم ہوئی اور ولسن نے شرائط صلح کے لئے اپنے بارہ نکات پیش کئے تو مصر کو کچھ امید قایم ہوئی کہ غالباً وہ آزاد ہو جائے گا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صلح کانفرنس میں اس کو شرکت کی اجازت نہیں مل سکتی، حالانکہ حبشہ اور حجاز کے نمایندوں کو اس کی اجازت مل گئی تھی۔

اس واقعہ سے مصریوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ برطانیہ کا ارادہ مصر کے باب میں کیا ہے، چنانچہ اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ زاغلول پاشا کی سیادت میں وفد پارٹی قایم ہوئی اور مصر کی مکمل آزادی کا مطالبہ شروع ہوا۔ اس کا جواب برطانیہ نے یہ دیا کہ زاغلول پاشا اور اس کے دو ساتھیوں کو مارچ ۱۹۱۹ء میں جلاوطن کر دیا۔ اس واقعہ سے قوم پرستوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور انھوں نے تشدد کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا، قاہرہ کے چاروں طرف ریل، تار اور سڑکوں کا سلسلہ تباہ و برباد کرکے، قاہرہ کو گویا ساری دنیا سے بےتعلق کر دیا۔ سوڈان ریلوے کو بھی متعدد جگہ نقصان پہونچایا۔ گویا اس سلسلہ میں عام خونریزی نہیں ہوئی پھر بھی کہیں کہیں مصریوں کے جذبات زیادہ مشتعل ہو گئے اور اس سلسلہ میں کچھ انگریزوں کی جانیں بھی تلف ہوئیں۔

اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ معاملہ زیادہ سنگین ہے اور اس نے لارڈ ایلن بری کو ہنگامہ فرو کرنے کے لئے مامور کیا۔ انھوں نے مصر آکر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں ہے بلکہ ساری

مصری آبادی کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں اور طلبہ، وکلاء، اخبار نویس اور چھوٹے بڑے طبقہ کے تمام افراد اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ اس نے ان حالات کے پیش نظر مصر کے لیڈروں کو بلاکر ان سے قیام امن کیلئے کی اپیل کرنا مناسب سمجھا۔ اس مشورہ میں زاغلول پاشا کو بھی بلاکر شریک کیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تشدد کی پالیسی کو تو مصر نے ملتوی کر دیا، لیکن اس کی جگہ اسٹرائیک، پکٹنگ وغیرہ شروع کر دی۔ برطانیہ نے اب ایک کمیشن لارڈ ملنر کی سرکردگی میں مصر کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے مامور کیا اور اس نے جو رپورٹ پیش کی اس سے برطانیہ کو معلوم ہوا کہ جب تک تولیت نہ اٹھ جائے گی، مصریوں کو اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ لیکن تولیت کا اٹھا لینا اور مصر کا آزاد و خود مختار ہونا دو جدا چیزیں تھیں۔ اور زاغلول کا مطالبہ مکمل آزادی ہی کا تھا، اس لئے زاغلول کو پھر جلا وطن کر دیا گیا اور فروری ۱۹۲۲ء میں برطانیہ اور مصر کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رُو سے برطانیہ نے اپنی تولیت تو ختم کر دی، لیکن اور شرطیں ایسی لگا دیں کہ مصر کے ہاتھ بدستور بندھے رہے۔ مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ مصر میں غیر ملکیوں کے مفاد اور اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ برطانیہ کے ہاتھ میں رہے گا، دوسرے یہ کہ مصر پر بیرونی حملہ کی صورت میں برطانیہ مدافعت کرے گا، تیسرے یہ کہ سوڈان کا مسئلہ بالکل علٰحدہ متصور ہوگا۔ اور چوتھے یہ کہ برطانیہ کے ذرایع مواصلات جو مصر سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حفاظت بھی برطانیہ ہی کرے گا۔

پھر کہنے کو تو یہ معاہدہ ہوگیا، لیکن مصر و برطانیہ کی نزاع اس سے ختم نہیں ہوئی، کیونکہ ان شرائط میں سے بعض کی توضیح و صراحت مصر کو تسلیم نہ تھی۔ مثلاً لارڈ لائڈ کا کہنا یہ تھا کہ "برطانوی ذرایع مواصلات سے صرف نہر سوئز ہی مراد نہیں ہے بلکہ ہندوستان، آسٹریلیا، ایران، عراق اور چین تک پہونچنے والے خشکی، تری اور ہوا کے تمام راستے اور ذرایع مواصلات اس میں شامل ہیں"

مصر اس کے تسلیم کرنے کے لئے طیار تھا کہ ان ذرایع مواصلات کی حفاظت برطانیہ کے لئے ضروری ہے لیکن وہ یہ ماننے کے لئے طیار نہ تھا کہ حفاظت کی یہ خدمت مصر سے چھین کر خود برطانیہ اپنے ہاتھ میں لے۔

سوڈان کے معاملہ میں بھی مصر، برطانیہ سے متفق نہ تھا، سوڈان بڑی وسیع سرزمین ہے اور دریائے نیل کا منبع و مخرج ہے، اس لئے مصر کی آبپاشی بالکل سوڈان پر منحصر ہے۔ مصر کا کہنا یہ ہے کہ نہر سوئز پر اقتدار کے باب میں برطانیہ جو دلیل پیش کر سکتا ہے، وہی دلیل سوڈان کے باب میں مصر کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے کیونکہ مصر کی تمام اقتصادیات سوڈان پر منحصر ہیں۔ علاوہ اس کے مصریوں کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ مصر و سوڈان کی آبادی ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان، ایک ہی کلچر رکھتی ہے اور محمد علی پاشا بانی خرطوم کے زمانہ میں مصر و سوڈان ایک ہی مملکت میں شامل تھے۔

اس کا جواب برطانیہ یہ دیتا ہے کہ سوڈان کو برطانیہ ہی نے مہدویوں سے چھینا تھا، پھر اس کے بعد ریلوں اور بندرگاہوں کی تکمیل و تعمیر اور روئی کی پیداوار بڑھانے میں برطانیہ نے بہت صرف کیا ہے اس لئے سوڈان پر ان کا بھی مصر کے برابر حق ہے۔

بہرحال مصر و برطانیہ کا یہ اختلاف ۱۹۲۲ء سے برابر چلا آرہا ہے اور آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ فواد کی تخت نشینی کے بعد جب مصر کی نئی کابینہ میں زاغلول پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے مامور ہوئے تو اکثریت اس کے ساتھ تھی اور اگر برطانیہ، زاغلول پاشا پر اعتماد کرکے اپنا نقطۂ نظر دوستانہ انداز میں اس کے سامنے پیش کرتا تو بہت ممکن ہے کہ مصر کا جھگڑا طے ہوجاتا، لیکن برطانیہ نے زاغلول کو ہمیشہ ایک باغی و انقلابی کی حیثیت سے دیکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی قومی تحریک نے زیادہ تشدد آمیز صورت اختیار کرلی اور قتل و خونریزی کے واقعات بھی پیش آنے لگے، یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء میں سوڈان کا گورنر جنرل مار ڈالا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زاغلول کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا اور شاہ فواد نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیلی ــ جب ۱۹۲۶ء میں عام انتخاب ہوا تو زاغلول کی وفد پارٹی کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ لیکن برطانوی ہائی کمشنر نے پھر زاغلول کی مخالفت کی اور وہ کابینہ میں نہ آسکا۔ آخرکار ۱۹۲۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور سارے مصر نے اس کا ماتم کیا۔

زاغلول کی وفات کے بعد مصطفےٰ نحاس نے وزارت قایم کی جو قوم پرست جماعت کے افراد پر مشتمل تھی اس لئے برطانیہ اور مصر کے تعلقات بدستور کشیدہ رہے۔ ۱۹۳۰ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے مصر سے نیا معاہدہ کیا جس کی رُو سے مصر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیلے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لڑائی کے زمانہ میں برطانیہ، مصر کی سرزمین پر اپنی فوجیں جمع کرسکے گا۔ برطانوی ہائی کمشنر کا عہدہ بھی منسوخ کردیا گیا اور سوڈان کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ دونوں حکومتوں کے زیر اثر رہے گا۔ لیکن نحاس کی وزارت نے ان شرایط کو رد کردیا۔ اور شاہ فاروق نے برطانیہ کی تحریک پر وزارت توڑدی اور عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیکر تمام اختیارات اسماعیل صدقی کو دیدئے جس نے ۱۹۳۰ء سے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اکتوبر میں ایک نئے کانسٹی ٹیوشن کا اعلان کیا گیا جس کی رو سے بادشاہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جب چاہے پارلیمنٹ کو توڑ کر سینٹ کے ۱۰۰ ممبروں میں سے ۴۰ ممبروں کو نامزد کردے۔ انتخاب ممبران کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ پبلک ہر ۵۰ رائے دہندوں کے لئے ایک کا انتخاب کرے، لیکن وفد پارٹی کو کوئی موقع انتخاب میں شرکت کا نہیں دیا گیا، اسکے اخبارات

کو بند کر دیا گیا، اس کے لیڈروں کو قید میں ڈال دیا گیا اور انتخاب کے وقت سیکڑوں آدمی زخمی ہوئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدقی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔

لڑائی کے بعد سنہ ۱۶ء اور سنہ ۲۰ء کے درمیان مصر نے بہت کمایا، روئی کی قیمت تقریباً ایک ہزار گنا بڑھ گئی اور دس سال تک مصریوں کے پاس اتنی دولت رہی کہ وہ سیاسی اصلاحات کے ہنگامہ کو قایم رکھ سکے، لیکن اس کے بعد جب کساد بازاری شروع ہوئی تو پھر یہاں ڈکٹیٹر شپ کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

سنہ ۳۳ء تک مصر کا سوال بدستور اپنی حالت پر رہا، نہ سویز پر اسے اقتدار حاصل ہوا نہ سوڈان پر۔ اور برطانوی اثرات میں کچھ کمی بھی ہوئی تو وہ ایسی نہ تھی کہ مصر اپنے آپ کو ایک خود مختار و آزاد حکومت کہہ سکے۔

ایران کی بیداری

ایران، کبھی ترکی سلطنت کا حصّہ نہیں رہا۔ لیکن ترکی کی طرح دوسری ملحقہ اسلامی حکومتوں سے اسکے بھی تعلقات بہت وسیع رہے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایران، برطانیہ اور روس کی شاہنشاہیت کا شکار رہا اور اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کی رو سے اس کا جنوبی حصّہ برطانیہ کے زیر اثر آگیا اور شمالی حصّہ پر روس کا اقتدار قایم ہوگیا۔ جب سنہ ۱۹۱۷ء میں زاریت کا خاتمہ ہوا تو روس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کو موقعہ مل گیا کہ ایران کو پوری طرح برطانیہ کے زیر اثر لے آئے، لارڈ کرزن کی اسکیم یہ تھی کہ خلیج فارس سے بحر کاسپین (اخضر) تک تمام حصّہ برطانیہ کے اقتدار میں لاکر اسے برطانوی ہند کا ایک سرحدی صوبہ قرار دیدے۔ چنانچہ جب سنہ ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے ایران کے خاص، خاص اہم مقامات پر اپنی فوجیں متعین کردیں اور شاہ ایران کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ برطانیہ کے مطالبات کو تسلیم کرے۔ اس طرح سنہ ۱۹۱۹ء میں ایران سیاسی و فوجی حیثیت سے برطانیہ کے زیر اثر آگیا۔

رضا شاہ لیکن یہ حالت عرصہ تک قایم نہیں رہی، کیونکہ سنہ ۱۹۲۰ء میں بالشیوکوں نے شمالی ایران کے صوبۂ گیلان پر حملہ کرکے اسے سوویٹ ریپبلک میں شامل کرلیا اور مازندران کے زرخیز میدانوں پر بھی دھاوا بول دیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔

انھیں ایرانی کاسکوں کی شکست خوردہ افسروں میں ایک نوجوان افسر ایسا بھی تھا جس کی پرورش مازندران کے ایک فارم میں ہوئی تھی اور جو اپنے ملک کی تباہی کو دیکھ دیکھ کر بہت متاثر ہو رہا تھا۔ یہی گمنام فوجی افسر سنہ ۱۹۲۱ء میں تہران آیا اور صرف تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے اس نے ایران کے تمام بڑے بڑے عمال کو گرفتار کرلیا اور شاہ ایران کو مجبور کیا کہ اسے سپہ سالار اور وزیر حربیہ مقرر کرے۔ اس نوجوان کا نام رضا خان تھا۔ یہ ایران کی کاسک فوج میں جو زار کے فوجی افسروں کی نگرانی میں تھی، چند سال سے ملازم تھا۔

گو رضا خاں کو نہ پبلک کی اعانت حاصل تھی اور نہ وہ کوئی منظم جماعت رکھتا تھا، لیکن محض اپنی شخصیت اور جذبۂ قوم پرستی کی وجہ سے وہ کامیاب ہوگیا۔

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں وہ ایران کا وزیر اعظم ہوگیا اور شاہ ایران سیاحت یوروپ کے لئے چلے گئے۔ ٹھیک یہی وہ وقت تھا جب مصطفےٰ کمال ترکی جمہوریت قایم کرکے اس کی عنان صدارت اپنے ہاتھ میں لیلی تھی۔ اس لئے رضا خاں نے بھی اس کے تتبع میں ایران کو جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہا، لیکن یہاں کی مذہبی جماعت نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہ مصطفےٰ کمال کے نقش قدم پر چل کر ایران میں وہ انقلاب پیدا نہ کرسکا جو ترکی میں رونما ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ ایران نہ جمہوریت بن سکی اور نہ شاہنشاہیت رہی، کیونکہ شاہ ایران موجود نہ تھے۔ آخرکار ۱۹۲۵ء میں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے رضا خاں کو بادشاہ بنا دیا اور اس نے شاہ رضا پہلوی کے نام سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیلی۔

چار سال کے اندر رضا شاہ نے ایران کے لئے بہت کچھ کیا۔ امن وسکون کے قیام کے ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام کو بھی کمزور کردیا اور برطانوی فوجوں کو بھی جنوبی ایران سے ہٹ جانے پر مجبور کیا۔ یہاں تک شط العرب کے شیخ نے بھی جو برطانیہ کی حمایت میں ایران کے ایک ٹکڑے کا خود مختار فرمانروا بنا ہوا تھا، حکومتِ تہران کو تسلیم کرلیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایران اب آزاد تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں آزادی کا قیام مشکل ہے جب تک عہدِ حاضر کے ذرایع ترقی سے کام نہ لیا جائے۔ اس لئے رضا شاہ کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایران کو کس طرح مغربی اصول پر عمل کرکے ترقی کی راہ پر لگائے۔ وہ مغربی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی اغراض سے خالی الذہن ہوکر آئیں گے نہیں اور خود ایران کے لوگوں میں یہ اہلیت نہ تھی کہ وہ ازخود ترقی کی راہیں تلاش کریں، آخرکار مجبور ہوکر نظم ونسق سلطنت میں اسے مغربی ماہرین سے کام لینا ہی پڑا۔ مالیات کا شعبہ ایک امریکی ماہر ڈاکٹر ملسپاگ کے سپرد کیا گیا کسٹمس کے لئے بلجیم کے ماہرین سے مدد لی اور شعبۂ تعلیم میں فرانسیسی ماہرین سے۔ اس حد تک تو کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ فرانس بلجیم اور امریکہ کی سیاسی اغراض ایران سے وابستہ نہ تھیں۔ لیکن روس اور برطانیہ سے معاملہ کرنے میں اسے بڑا تردد تھا۔ ایک طرف ماوراء قاف اور ماوراء بحر اخضر کا علاقہ سوویٹ یونین میں شامل ہوگیا تھا اور بالشیوک کوشش کررہے تھے کہ قاف سے خلیج فارس تک ذریعہ آمد ورفت قایم ہوجائے۔ دوسری طرف برطانیہ تھا جو اینگلو پرشین آیل کمپنی کا اجارہ دار تھا اور جس میں ۲۰ ہزار ایرانی ملازم تھے۔ راموز سے آبادان تک پائپ لائن ڈال لی تھی اور یہ کوشش ہورہی تھی کہ بغداد سے تہران

تک ریل جاری ہو جائے اور ایران و ہندوستان کے درمیان ہوائی تعلق قایم ہو سکے۔

ایران کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت تھی وہ ذرایع حمل و نقل تھے، سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ایران کے ایک حصہ میں غلہ کی پیداوار پڑی سڑا کرتی تھی اور قحط کی وجہ سے لوگ مرتے رہتے تھے، اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ بھی تھا کہ اگر نقل و حمل کے لئے سڑکیں یا ہوائی راستے بنائے بھی جائیں تو ان پر بیرونی اقتدار نہ ہونا چاہئے۔ رضا شاہ نے بڑی ترکیب سے کام لیا اور وہ یہ کہ برطانیہ اور روس دونوں کو انھوں نے راضی رکھنے کی کوشش کی۔ بغداد سے طہران تک ریل جاری کرنے کی جو اسکیم برطانیہ نے بنائی تھی اس کو تو رضا شاہ نے منظور نہیں کیا لیکن اس کی جگہ سڑک بنانے اور قاہرہ سے کراچی تک ہوائی راستہ قایم کرنے کی اجازت دیدی اس شرط کے ساتھ کہ ہوائی اڈے ایران کی ملکیت متصور ہوں گے، دوسری طرف روس کو اجازت دیدی کہ وہ ماسکو سے طہران تک ہوائی سروس قایم کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ ایران بحر کاسپین سے خلیج فارس تک ریلوے جاری کرے گا۔ اس لائن کا آخری اسٹیشن شمال کی طرف بحر کاسپین کے ساحل پر ایسی جگہ مقرر کیا گیا جو روس کے اقتدار سے باہر تھا اور جنوب کی طرف کا آخری اسٹیشن خلیج فارس کا ایک ایسا مقام تجویز کیا گیا جو برطانیہ کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔

رضا شاہ نے اس خطرناک کھیل کو بہت ہوشیاری سے کھیلا اور بغیر اپنی خود مختاری و آزادی کو صدمہ پہونچائے، روس اور برطانیہ کے صرف پر اس نے ایران کے لئے ذرایع حمل و نقل و مواصلات فراہم کر دئے۔

اقتصادی آزادی کا حصول البتہ زیادہ مشکل کام تھا، کیونکہ ایران باوجود اس کے کہ اس کی اقتصادی پوزیشن بُری نہیں ہے، وہ کفیل بالذات نہیں۔ کپڑا، شکر اور مشینری سب باہر سے آتی ہے۔ کپڑے کے تو خیر پانچ کارخانے رضا شاہ نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قایم کرائے۔ لیکن شکر اور مشینری کے متعلق وہ کچھ نہ کر سکے۔ ایران سے جو چیزیں باہر جاتی ہیں ان میں پٹرول، قالین پھل اور افیون خاص چیزیں ہیں، لیکن وہ پٹرول کے مارکیٹ کے لئے برطانیہ کا دست نگر ہے، اینگلو پرشین آیل کمپنی اسمیں شک نہیں ایران کے رایلٹی میں اتنی رقم ادا کرتی ہے کہ اس کا چوتھائی بجٹ اسی سے پورا ہوتا ہے، لیکن آمدنی کی یہ کوئی اطمینان بخش صورت نہیں ہے، علاوہ اس کے اہل ایران جب یہ دیکھتے ہیں کہ کمپنی اپنے مغربی حصہ داروں کو ۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ ہر سال تقسیم کرتی ہے تو ان کو رشک آتا ہے کہ خود ان کے حصہ میں جو کچھ آتا ہے وہ کتنا کم ہے، حالانکہ زمین اور پٹرول دراصل سب انھیں کا ہے۔

قالین اور پھلوں کی برآمد میں ایران دوسرے ملکوں کے محکمۂ کروڑ گیری اور خصوصیت کے ساتھ روس کے رحم وکرم کا محتاج ہے۔ افیون کی برآمد بین الاقوامی میلانات حایل ہوتے ہیں۔

مجلس اقوام نے ایران سے کہا کہ افیون کے بجائے وہ دوسری اشیا بھیجے، رضا شاہ نے جواب دیا کہ وہ پوست کی کاشت میں کمی کرنے کے لئے طیار ہے بشرط آنکہ ایران کی دوسری پیداوار پر محصول کروڑگیری کم کردیا جائے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

رضا خاں نے بین الاقوامی مسایل میں بھی ایران کی خودداری قایم کرنے میں بڑا کام کیا۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے شاہ ایران کی حکومت تہران کی چاردیواری کے اندر محدود تھی، لیکن رضا شاہ نے ہر صوبہ پر اقتدار قایم کرکے صحیح معنے میں اپنی حکومت قایم کرلی۔ رضا شاہ نے پارلیمنٹ بھی قایم کی، لیکن وہ ایسی ہی بیدست وپا تھی جیسے ترکی اور اطالیہ کی پارلیمنٹ۔ حکومت در اصل فوج کے بل پر کی جاتی تھی جو ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی۔ رضا شاہ نے جبریہ فوجی بھرتی کی تحریک شروع کی تو علماء نے اس سے اختلاف کیا لیکن جب رضا شاہ نے ان کو بہت عزت واحترام کے ساتھ ان کے لیڈروں کو پارلیمنٹ میں جگہ دیدی تو یہ مخالفت ختم ہوگئی۔

ایران کے بہترین سپاہی وہاں کے خانہ بدوش قبایل میں ملتے ہیں، لیکن رضا شاہ کے سامنے یہ مسئلہ بڑا مشکل تھا کہ وہ ان کی سپاہیانہ خو کو بھی قایم رکھے اور ان کی لوٹ مار کی عادت کو بھی ترک کرائے۔ اس نے یہ ترکیب اختیار کی کہ ایسے قبایل کے چند خاندانوں کو تو مویشی پالنے کے لئے مخصوص کردیا اور باقی خاندانوں کو کاشتکار بنانے کی کوشش کی اور انھیں زراعتی علاقوں میں آباد کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے قبایلی علاقوں کے چاروں طرف کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق دیکر بسا دیا اور ان کی کافی مدد کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی و ایران کے حالات میں بہت مماثلت نظر آتی ہے مثلاً یہ کہ دونوں جگہ تنہا ایک سپاہی نے قوم میں بیداری پیدا کی غیر ملکی رعایا کو جو مراعات حاصل تھیں وہ دونوں جگہ ختم ہوگئیں، نظم ونسق میں مغربی اصول دونوں جگہ اختیار کئے گئے، پھر بھی دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ ترکی کا انقلاب ایک ایسی قوم کا انقلاب تھا جو اس سے قبل قوم کے مفہوم سے ناآشنا تھی، برخلاف اس کے ایران کا انقلاب بہت پرانی قوم کا انقلاب تھا جس میں مختلف جماعتیں شامل تھیں اور سب ملک کی آزادی و خود مختاری کے لئے کوشاں تھیں۔ مصطفے کمال نے قدامت پسندی کے قیود کو بہت　　　کے ساتھ دور کیا اور رضا شاہ کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ مصطفے کمال نے ترکوں کا روایتی کلچر بدلنا چاہا اور رضا شاہ نے قدیم ایرانی کلچر کو بڑی حد تک بدستور قایم رکھا۔

افغانستان

بیسویں صدی کی ابتدا میں تمام اسلامی ممالک میں مغربی تقلید اور قومیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا لیکن اس میں ہر ملک کامیاب نہیں ہوا۔ اور انھیں ناکامیاب ممالک میں افغانستان بھی تھا۔

افغانستان عرصہ سے روس و برطانیہ کے درمیان ایک بفر (B U F F E R) حکومت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس طرح اسے کافی نقصان پہونچ رہا تھا۔ یعنی روس و برطانیہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ وہ حد فاصل کی حیثیت سے قایم رہے لیکن اس کو پوری طرح آزاد بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ جب ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس ہوا اور روس کی طرف کا خطرہ دور ہو گیا تو امان اللہ نے سوچا کہ اب برطانیہ کی مدد و حمایت کی ضرورت نہیں ہے اور اس لئے بھی اس کے ملک کو آزاد ہونا چاہئے، اسی کے ساتھ چونکہ اس وقت برطانیہ، ترکی کا دشمن تھا اور مذہباً خلیفہ کا اثر افغانستان میں کافی تھا، اس لئے امان اللہ نے ۱۹۱۹ء میں ایک مہم درۂ خیبر پہ برطانیہ کے خلاف روانہ کی لیکن افغانی سپاہ جس کے پاس نہ ہوائی جہاز تھے، نہ مشین گنیں، برطانوی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور آخرکار ۱۹۲۱ء میں افغانستان کو برطانیہ سے صلح کرنا پڑی۔ اسی کے ساتھ امان اللہ نے روس سے بھی معاہدہ کر لیا اور یہ سمجھ کر کہ اب وہ برطانیہ اور روس دونوں کے دست اندازی کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہے، ایران اور ترکی کی تقلید میں مغربی قسم کی اصلاحات شروع کیں۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا کیونکہ اول تو وہ خود قومی لیڈر کی حیثیت نہ رکھتا تھا اور دوسرے یہ کہ مذہبی قدامت پرستی افغانستان میں بہت زیادہ تھی اور ملّاؤں کا اثر لوگوں پر بہت تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۸ء میں امان اللہ کے خلاف سارے ملک میں شورش پیدا ہو گئی اور ۱۹۲۹ء میں اسے معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک اضطراب و ہیجان کا دور قایم رہا اور حکومت جم کر حکومت نہ کر سکا۔ آخر نادر شاہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اس نے ۵ لاکھ پونڈ نقد، دس ہزار رائفلیں اور [illegible] کارتوس برطانیہ سے قرض لیکر حکومت کو سنبھالا لیکن نومبر ۱۹۳۳ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا ظاہر شاہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

رجسٹر نمبر ایل ۲۶۶

قیمت فی کاپی ۱۰/

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۷۰۰ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے

(۸/۷) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا و توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ ذوالقرنین اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۴۴ صفحات۔ کاغذ سفید دبیز

قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں و مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان، قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپکو نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپکو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا

قیمت: دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو بہت سے واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من و یزداں" کے دونوں حصے تیرہ روپے (۱۳؍) میں معہ محصول حاصل کرسکیں گے ۔ **ورنہ**
غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور آیندہ اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں "من و یزداں" ایک صحیفۂ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ مذہب کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے ۔

منیجر نگار

رعایتی قیمت

مجموعۂ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات ۔ جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار

نگار کی جلدیں

جولائی تا دسمبر سنہ ۳۲ ۔ سنہ ۳۹ مکمل علاوہ محصول ڈاک
۵ ؍
۱۰ ؍
سنہ ۴۰ تا سنہ ۵۰ء کی مکمل جلدیں فی جلد ۱۰ ؍ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

ایک نہایت ضروری اعلان

(قارئین نگار اور ایجنٹ صاحبان کی خدمت میں)

عام طور پر جو کاغذ رسایل و اخبارات میں استعمال کیا جاتا ہے اسے "نیوز پرنٹ" کہتے ہیں، یہ کاغذ ہندوستان میں اس سے پہلے بھی کبھی طیار نہیں ہوتا تھا اور نہ اب ہوتا ہے، زیادہ تر ناروے سے آتا تھا اور اسی لئے اس کا دوسرا نام "ناروے کاغذ" بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں ناروے سے اس کی آمد بند ہوگئی اور کناڈا نے مہیا کرنا شروع کیا، چنانچہ اب اس کاغذ کی بہت بڑی منڈی کناڈا ہی ہے اور وہیں سے ہندوستان کو بھی فراہم کیا جاتا تھا، لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے اور وہ یہ کہ جنگ کوریا کی وجہ سے چونکہ امریکہ کو اس کاغذ کی ضرورت زیادہ ہے، اس لئے کناڈا کا بنا ہوا کاغذ تقریباً سب کا سب امریکہ چلا جاتا ہے اور ہندوستان میں اس کا میسر آنا مشکل ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس وقت حالت یہ ہے کہ بازار میں کاغذ کمیاب ہوتے ہوتے نایاب ہوتا جا رہا ہے اور اگر بلیک مارکیٹ سے تھوڑا بہت مل بھی جاتا ہے تو اتنی گراں قیمت پر کہ اس کا حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

آپ کو کاغذ کی گرانی کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہی نیوز پرنٹ جس کی قیمت کسی وقت صرف ڈھائی روپیہ ریم تھی، اب بازار میں اٹھارہ روپیہ فی ریم حساب سے بھی نہیں ملتا اور اخبارات و رسایل پر اس گرانی و نایابی کا بہت بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ پبلک کے ذوق کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی رسالہ یا اخبار قیمت میں ایک روپیہ کا بھی اضافہ کر دے تو وہ اسے گوارا نہ کریگی اور خریداری بند کر دیگی ـــ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نگار کی گزشتہ ۳۰ سال کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پرچہ وقت پر شایع نہ ہوا ہو یا کسی مہینہ ناغہ ہوا ہو لیکن اب کہ کاغذ بازار میں نہایت دشواری سے دستیاب ہوتا ہے اور وہ بھی حد درجہ گراں قیمت پر، اس لئے اس کا امکان ہے کہ کسی وقت (جب ہمارے تمام ذرایع فراہمی کاغذ کے لئے ختم ہو جائیں) ہم رسالہ کا حجم کم کرنے پر مجبور ہوں، گو ہم کوشش تو یہی کر رہے ہیں کہ اس کی نوبت نہ آئے، لیکن اگر کبھی ایسا ہو تو قارئین کرام کو ہماری مجبوریوں کے پیش نظر اسے گوارا کرنا چاہئے۔ حجم کے کم ہونے کی صورت میں ہم رسالہ کا مسطر اور خط گنجان کر دیں گے تاکہ جس حد تک مضامین کا تعلق ہے ان میں کمی نہ ہو اور وہی ۶۴ صفحات کا مواد ان کو فراہم ہوتا رہے۔

منیجر نگار

پاکستان میں نگار و ہماری کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیج دیں، ہم کتابیں ان کو بذریعہ رجسٹری بھیج دیں گے اور وہ ان کی قیمت ہمارے حسب ذیل نمایندوں میں سے کسی کو دست بدست دے دیں گے یا بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں گے۔

(۱) ڈاکٹر عباس ہاشمی - ۲۲۲ پیر الہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی - (۲) حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۹ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۵۱ء | شمارہ ۳

ملاحظات

یہ ہے ہندوستان اور یہ ہے چین!

یہ ہے ہندوستان ! جس کو آزاد ہوئے تین سال سے زاید ہو چکا، لیکن آزادی کی سچی خوشی اس وقت تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ کسی ملک کی آزادی کے ساتھ سب سے پہلا تصور جو انسان کے ذہن میں قایم ہوتا ہے وہ اس احساس سے وابستہ ہے کہ حکومت ہماری ہے لیکن اس تصور کے ساتھ سچی خوشی پیدا ہوتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ ملک کی اقتصادی بدحالی (جس کا سبب غیر ملکی حکومت کے استحصال کو قرار دیا جاتا ہے) ختم ہو جائے گی اور ملک کی آبادی اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرے گی ۔

یہ تھا وہ یقین جس نے ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جنگ پر آمادہ کیا اور یہ تھی وہ امید جو ملک نے کانگریس حکومت سے قایم کی تھی۔ لیکن تین سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ حکومت اب تک اپنا اعتماد قایم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی اور اقتصادی دشواریاں روز بروز

بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد سے حکومت کو چند در چند مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے جو داخلی و خارجی سیاست دونوں سے تعلق رکھتی ہیں اور عالمگیر اقتصادی بدحالی کا اثر قدرتاً ہندوستان پر بھی پڑنا چاہئے، لیکن غالباً حکومت کو بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو تدابیر ان مشکلات کے ازالہ کے لئے اختیار کی جا رہی ہیں، ان میں سے اسوقت تک کوئی کامیاب نہیں ہوئی اور اسی لئے مستقبل کی طرف سے ملک میں عام مایوسی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حکومت سرمایہ داروں کی حامی ہے اور ان کی دولت سے مرعوب ہے، حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ جنتا کی طرفدار ہے اور ان کی فلاح و بہبود اس کا اصل مقصد ہے، لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ نہ سرمایہ دار حکومت سے خوش ہے نہ جنتا بلکہ ہندوستان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جو حکومت کا شاکی نہ ہو۔

مسلمانوں کو چھوڑئے کہ ممکن ہے کہ ان کی مشکلات کا سبب زیادہ تر ذہنی ہو، لیکن آپ ہندوؤں کو کیا کہیں گے جن کی یہاں اکثریت ہے اور جو جایز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ حکومت انھیں کی ہے، لیکن میں نے ہندوؤں کے مختلف طبقات کے خیال معلوم کرنے کی کوشش کی اور مجھے کسی طبقہ کا کوئی انسان ایسا نہیں ملا جس نے حکومت کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہو۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب صرف تجارتی و اقتصادی دشواریاں ہیں۔ زمیندار اس لئے برہم ہیں کہ ان کی جایدادیں چھینی جا رہی ہیں، کاشتکار اس لئے ناخوش ہیں کہ ان سے جبراً غلہ حاصل کیا جاتا ہے اور نئے نئے مطالبات ان پر عاید کئے جاتے ہیں، تجارت پیشہ جماعت اس لئے ناخوش ہیں کہ درآمد برآمد اور حصول لائسنس کی دشواریاں ان کی راہ میں حایل ہیں، مزدوروں کی شکایات یہ ہیں کہ جو مزدوری ان کو ملتی ہے وہ ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ متوسط طبقہ کو تو خیر پریشان ہونا ہی چاہئے کہ ایک طرف اس غریب کی آمدنی بہت محدود ہے اور دوسری طرف اشیاء کی گرانی ناقابل برداشت حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عہد حاضر کی یہ الجھنیں حکومت کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں، لیکن عوام کسی منطق و استدلال کو نہیں سنتے، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کھانے کو غلہ، تن ڈھاکنے کو کپڑا ملتا رہے اور جب ان کا یہ مطالبہ پورا نہ ہوگا تو ان میں ذہنی بے چینی پیدا ہوگی۔

اب غور کیجئے کہ حکومت نے اس مسئلہ کا حل کیا سوچا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئی۔ سب سے پہلے غلہ کو لیجئے کہ یہی اولین ضرورت انسان کی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں غلہ کی پیداوار اس کی آبادی کے لحاظ سے کم ہے اس لئے حکومت نے زیادہ غلہ اگانے کی اسکیم کو چلایا لیکن لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ راشن بجائے بڑھنے کے اور کم ہو گیا۔ کپڑے کے کارخانے ہندوستان میں بہت ہیں، اور کثیر مقدار میں کپڑا یہاں طیار ہوتا ہے، لیکن غریبوں کی دسترس سے بالکل باہر۔ دودھ گھی وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ اول تو حکومت اس کا انتظام نہیں کر سکی کہ یہ چیزیں خالص مل سکیں اور اگر ملیں بھی تو امراء کے سوا کسی اور کو نہیں میسر ہو سکتیں۔ مختلف قسم کے ٹیکسوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی ہے، ریل کا کرایہ پہلے سے دوچند کر دیا گیا ہے اور انصاف حاصل کرنے کے مصارف رشوت ستانی کی وجہ سے بہت زیادہ ہو گئے ہیں، الغرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی طرف سے ملک کو اطمینان ہو اور اسی لئے حکومت کی طرف سے بددلی بڑھتی جا رہی ہے۔

حکومت ان حالات سے بخوبی واقف ہے، لیکن چونکہ اسے نہ ایڈمنسٹریشن کا تجربہ حاصل ہے اور نہ اس کے عمال میں اس کی اہلیت پائی جاتی ہے، اس لئے ہر شعبہ میں بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اور راعی و رعایا کے درمیان جو رشتہ اعتماد پیدا ہونا چاہئے وہ بالکل مفقود ہے۔

یہ چین ہے! چین کو سامراجی گرفت سے آزاد ہوئے کم و بیش صرف ایک سال ہوا ہے، لیکن اسی قلیل مدت میں اس نے جو ترقی و اصلاح کی ہے، حد درجہ حیرتناک ہے۔ ایک سال قبل وہاں کمی پیداوار کی وجہ سے غذا کی قلت کا یہ حال تھا کہ کسی کو پیٹ بھر کھانے کو بھی نہ ملتا تھا، لیکن اب وہاں نہ صرف یہ کہ فقر و فاقہ ختم ہو گیا ہے، بلکہ پہلے سے بہتر غذا ہر شخص کو ملنے لگی ہے۔

پچھلے سال حکومت نے اندازہ کیا تھا کہ چین کا کسان زیادہ سے زیادہ ۵۰ لاکھ ٹن غلہ پیدا کر سکے گا، لیکن سال کے اختتام پر معلوم ہوا کہ اس نے ایک کروڑ ٹن سے زیادہ غلّہ پیدا کر کے دکھا دیا ہے۔ روئی کی پیداوار میں بھی اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ وہاں ۴۰ کروڑ ۵۰ لاکھ آبادی کی ضرورتیں اس سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح چاء، ریشم اور سن وغیرہ کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ نظر آتا ہے۔

لڑائی کے بعد وہاں یہ حالت تھی کہ دیہات میں سناٹا نظر آتا تھا، کھیت ویران، گھر لٹے ہوئے اور آبپاشی کے ذرایع بالکل درہم برہم ہو چکے تھے۔ بچے کھچے کسان جو کہیں کہیں رہ گئے تھے وہ خود اپنا پیٹ بھی نہ پال سکتے تھے۔ لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد کمیونسٹوں کی حکومت قایم ہوتے ہی بالکل رنگ بدل گیا کیونکہ اس نے سب سے پہلے زراعتی اصلاح کی طرف توجہ کی اور امتحاناً اس نے ایک ایسے رقبہ میں جس کی آبادی دو کروڑ ۷۰ لاکھ تھی زمینداری و جاگیرداری ختم کر کے کسانوں کو کھیت کا مالک بنا دیا۔ لگان کم کر دیا، زمینداروں نے کسانوں سے جو کچھ وصول کیا تھا وہ بھی انھیں واپس دیدیا۔ ۵۴ فیصدی زراعتی ٹیکس بھی کم کر دیا، ۷ لاکھ ٹن غلہ کی تقاوی بھی تقسیم کی اور پیداوار غلّہ کے لحاظ سے بازار کے اشیاء کا نرخ بھی مقرر کر دیا، ٹریکٹروں کے ذریعہ سے مزید پیداوار پر کوئی ٹیکس قایم نہیں کیا۔ ذرایع آبپاشی کی مرمت و توسیع کے لئے نہروں اور دریاؤں کی صفائی، کھدائی اور بندوں کی مرمت کے لئے ۴۵ لاکھ کسانوں کو مامور کیا گیا۔ ان کے کام کا اندازہ یہ کیا گیا تھا کہ وہ ایک سال کے اندر ۵۰ کروڑ مکعب میٹر مٹی کھود سکیں گے اور بندوں کی مرمت کے لئے ۱۲ لاکھ مکعب میٹر اینٹ گارا لا سکیں گے، لیکن وہاں کے کسانوں نے جس غیر معمولی محنت سے کام کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر انھوں نے اس سے دو چند مٹی کھود کر باہر پھینکدی جتنی ۹ سال کے اندر نہر پناما کی تعمیر کے وقت کھودی گئی تھی۔

۱۰ لاکھ ایکڑ زمین جو دریائے زرد کی طغیانی کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی اور دس سال سے اس میں کاشت نہ ہوئی تھی پھر کام میں لائی گئی۔ اس کے علاوہ ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین جو بنجر پڑی ہوئی تھی اس میں بھی کاشت کی گئی اور آبپاشی سے غیر معمولی پیداوار حاصل کی گئی۔

حکومت نے ۱۹۵۰ء کے لئے ۴۰ کروڑ پودے نصب کرنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن چینی آبادی نے اسے ۵۰ کروڑ تک پہنچا دیا۔ یہ چینی کاشتکار کی محنت کا صرف ایک پہلو ہے، اس نے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کیا ہے۔ [illegible]

خراب کر دینے والے کیڑوں کا مقابلہ، اچھی کھاد کی فراہمی، طریق زراعت کی اصلاح، نئے آلات کا استعمال، جانوروں کی اچھی نسل کشی یہ تمام باتیں نہایت وسیع پیمانے پر اختیار کی گئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت چین کا گاؤں ایک سال قبل کے گاؤں سے بالکل مختلف حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو ایک کاشتکار نے صدر جمہوریہ چین کو حال ہی میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :- "اس سے قبل گاؤں کے بیس خاندانوں میں سے صرف دو گھرانے ایسے تھے جو پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے تھے، آج نہ صرف یہ کہ سارے گاؤں کے لئے غذا کی افراط ہے بلکہ ہزاروں من غلہ کا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہماری پیداوار ۵۰ سے ۱۰۰ فی صدی تک زیادہ ہوگئی ہے۔ دودھ دینے والے جانور اور بھیڑوں کی تعداد بھی اب بہت کافی ہے"۔

ایک دوسرے گاؤں کا کسان لکھتا ہے کہ :- "اب سے قبل میرا خاندان گھاس پات پر زندگی بسر کرتا تھا، بدن پر چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا اور گھر بھر کے لئے صرف ایک ہی کمل تھا، لیکن اس وقت ہم میں سے ہر ایک کے پاس روئی کا لحاف ہے، غلہ کی فراوانی ہے اور مکان کے تین کمرے نئے بن گئے ہیں"۔

وہاں کے نوجوانوں کی نئی ڈیماکریٹک لیگ نے پچھلے ایک سال میں جتنی ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے ممبروں کی تعداد اس وقت ۳۰۰ لاکھ ہے۔

تعلیمی ترقیاں

مزدوروں اور کسانوں کے لئے تمام ملک میں مختصر مدت تعلیم کے لئے علٰحدہ مدارس بہ کثرت قایم کئے گئے ہیں، چنانچہ صرف شنگھائی میں ایسے مدارس کی تعداد ۱۱۲ ہے جن میں ۱۳۵۹۴ بچے مزدوروں اور کسانوں کے تعلیم پاتے ہیں اور جن کو حکومت سے وظیفہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں یونیورسٹیاں بھی قایم کی گئی ہیں جن میں ۶۳ فی صدی کسانوں اور مزدوروں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔

اس لیگ کے اخبارات بھی نکلتے ہیں، جن میں سے "چائنا یوتھ" کی اشاعت ایک لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔ یہ ادارہ کتابیں بھی شایع کرتا ہے چنانچہ پہلے سال اس نے ۱۴۰ کتابیں شایع کیں جن کی کاپیوں کی تعداد ۲۶ لاکھ تھی۔

اس وقت جمہوریت چین میں ابتدائی مدارس کی تعداد ۴ لاکھ ہے جن میں ۴ کروڑ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ثانوی مدارس کی تعداد ۳۶۹۰ ہے جن میں دس لاکھ نوے ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ زیادہ بلند تعلیم کے اداروں کی تعداد ۲۲۷ ہے جن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار ہے۔ ان مدارس میں سے ۶۱ فی صدی حکومت کے ہیں باقی پرائیویٹ ہیں۔

چین کی ۴۸ کروڑ آبادی کو دیکھتے ہوئے مدارس کی یہ تعداد بھی ناکافی ہے، لیکن ۱۹۴۹ء کے مقابلہ میں یہ تعداد ۶۰ فی صدی زیادہ ہے۔

ہندوستان کو جب آزادی ملی تو صدیوں سے اس پر کسی ملک نے حملہ نہ کیا تھا اور وہ بالکل منظم حالت میں تھا، چین جب آزاد ہوا تو اس حال میں کہ وہ خونریزی و غارتگری کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان کو آزادی ملی تو اس طرح جیسے کسی کو چلتی

ہوئی مشین مل جائے، چین کو آزادی ملی تو اس حال میں جیسے کسی کو کھنڈ سونپ دئے جائیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان تین سال میں بھی کچھ نہ کرسکا اور چین نے ایک سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس فرق کا سبب یہ ہو کہ چین نے اپنی آزادی اپنا خون بہا کر حاصل کی ہے اور ہندوستان کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

ہندوستان و پاکستان کا تجارتی معاہدہ

اب سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے درمیان سکّوں کی قیمت میں اختلاف پیدا ہوجانے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات ختم ہوگئے تھے اور باہمی اختلاف کا ایک دروازہ اور کھل گیا تھا، لیکن شکر ہے کہ اب ہندوستان نے پاکستانی سکہ کی بڑھی ہوئی قیمت کو تسلیم کرکے تجارتی تعطل کو بڑی حد تک ختم کردیا۔

اول اول جب ہندوستان نے اپنے سکہ کی قیمت کم کی تھی، ہم نے اسی وقت ظاہر کیا تھا کہ یہ پالیسی صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان نے سمجھا تھا کہ ایک طرف وہ اپنے یہاں غلہ، روئی اور جوٹ کی پیداوار کو بڑھا کر یہ چیزیں پاکستان سے حاصل کرنے پر مجبور نہ ہوگا اور دوسری طرف اپنی برآمد کو بڑھا کر اپنے مالیات میں توازن پیدا کرے گا۔ اسی کے ساتھ اسے یہ خیال بھی تھا کہ پاکستان شاید اپنے سکّہ کی قیمت کم کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ پھر یہ تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کی برآمد کچھ بڑھ گئی، لیکن باقی دو باتیں پوری نہ ہوسکیں، یعنی نہ وہ اپنے یہاں کی پیداوار کو بڑھا سکا اور نہ پاکستان نے اپنے سکہ کی قیمت کم کی کیونکہ کوریا کی جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے اسے اپنی اشیاء دوسرے ملکوں میں بھیجنے کا کافی موقعہ مل گیا۔ بہرحال اسباب جو کچھ بھی سہی ہوں، اب تجارتی نقطۂ نظر سے پاکستان و ہندوستان دونوں کو پھر مل جانے کا موقعہ مل گیا ہے، جو دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں بڑی حد تک معاون ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ آیندہ ہندوستان اپنے سکّہ کی قیمت کو بڑھا کر پھر اپنی اصلی حالت پر لے آئے۔ ابھی تک لین دین کی وہ صورتیں پیدا نہیں ہوئیں جو اس سے قبل پائی جاتی تھیں، خاص خاص تاجروں اور بنکوں کو اس کی اجازت ملی ہے، لیکن امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد ہندوستان و پاکستان کے درمیان ترسیل زر کی وہی صورتیں پیدا ہوجائیں گی جو ڈیڑھ سال قبل پائی جاتی تھیں اور عوام اس سے فایدہ اُٹھا سکیں گے۔

ترقی پسند تحریک

'ترقی پسند تحریک' کے ماننے والوں کے درمیان ایک طرح کا نظریاتی اختلاف ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں جو جذباتی زیادہ ہیں۔ انکا نقطۂ نظر غیر متوازن ہے۔ کچھ لوگ ذہنی انتشار کا شکار ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ کچھ لوگ سنجیدہ اور متوازن ذہن بھی رکھتے ہیں۔ ان متوازن اور سنجیدہ لوگوں میں بھی کچھ زرا زیادہ معتدل ہیں اور باقی کم۔ کارل مارکس کا خیال ہے کہ مادی زندگی کا طریقۂ پیداوار ہی سماجی، سیاسی اور ذہنی شعبہ ہائے حیات کا تعین کرتا ہے۔ سماجی بقا سے ہم انسانی شعور کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ فن کی پیدائش میں LABOR کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انسان سماج سے الگ رہ کر اپنی شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ فنکار کو چاہئے کہ وہ اپنی روزی کمائے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ بات یہ ہے کہ مارکس تلاش معاش کو تمام انسانی جبلتوں میں اہم ترین جبلت قرار دیتا ہے۔ دوسری جبلتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ اس اولین جبلت سے اثر قبول کرتی ہیں۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر مارکس ادب اور فن، ادیب اور فنکار کو پرکھتا ہے — جب وہ BYRON اور SHELLEY کا تجزیہ کرنے لگتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ BYRON چھتیسویں سال مرگیا کیونکہ اگر وہ زندہ رہتا تو ایک رجعت پرست بورژوا ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ SHELLEY انتیسویں برس میں کوچ کر گیا کیونکہ وہ مکمل انقلاب پسند تھا اور وہ اشتراکی محاذ کا ایک سپاہی ہوتا۔ فریڈریک انگلز بھی کم و بیش انھیں خیالات کا حامی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ BALZAC "شاہیت از روئے قانون" کا حامی ہے پھر بھی اسے ایک بڑا ادیب اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کی بہتر تصانیف میں اس زمانے کے برسر اقتدار سماج کے زوال پر نوحہ خوانی کی گئی ہے۔ اسے وہ حقیقت پسندی کے مترادف سمجھتا ہے اور اسی لئے تعریف کرتا ہے۔ وہ DANTE کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ جاگیردارانہ ازمنۂ وسطیٰ کے زوال کے زمانہ میں وہ جدید دور کا شاعر تھا۔ اسی لئے تقریباً چھ سو برس بعد انگلز اس تمنا کا اظہار کرتا ہے کہ آج بھی جب ایک نئے تاریخی دور کا آغاز ہو رہا ہے کیا اٹلی ایک نیا DANTE دے گی جو اس پرولتاری دور کا پہلا نمائندہ ہو سکے؟ - GOETHE کی عظمت انگلز کے نزدیک صرف اس لئے ہے کہ وہ "خدا سے نالاں نظر آتا تھا اور اس لفظ سے اسے سکون حاصل نہیں ہوتا تھا وہ انسانی قدروں کا دلدادہ تھا اور اینگلز کے خیال میں یہ خصوصیت اسے شیکسپیر سے بھی اونچا درجہ دیتی ہے۔ LENIN کا خیال ہے کہ TOLSTOY رجعت پسند ہے اور مثالی تصورات پیش کرتا ہے مگر اس کی عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اس انقلاب کی عکاسی کی ہے جو ۱۸۶۱ء سے ۱۹۰۵ء تک روس میں ظہور پذیر ہوا۔ اس نے روس کے کسانوں، مزدوروں اور عام آدمیوں کی زندگی ہی سے اپنا خام مواد لیا ہے اور یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔ روس کے ایک

موسیقار شوستاکووچ نے عالمگیر امن کانفرنس منعقدہ نیویارک میں یہ اعلان کیا کہ "ہم آرٹ کے میدان میں کام کرنے والے تاریخ کے اس لمحے میں جبر زندگی سے الگ ہو کر اپنے کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھ سکتے کہ ہم زندگی اور اس کی کشمکش سے بالاتر ہیں۔ ہمیں زندگی کے دھارے میں کود کر اس کا رخ بدلنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ہمیں امن کے مجاہدوں کی صف اول میں رہنا چاہئے۔" اور لوئی اراگاں نے حکم دیا کہ "تھوڑی دیر کے لئے مختلف نغموں کی پر شور موسیقی بند کر دو کیونکہ اس وقت ایسا زمانہ ہے کہ جو غریب لوگ ہیں وہ لعنت کی جہان بین میں سرگرداں نہیں رہ سکتے وہ معمولی الفاظ چاہتے ہیں جنھیں سوچتے وقت وہ آہستہ آہستہ دہرا سکیں۔" یہاں جذباتیت غالب ہے۔ کامریڈ ماؤزے تنگ اعتدال سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں "ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سیاست اور آرٹ یعنی فن اور خیال میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ ہم اس رجحان کے مخالف ہیں کہ سارا زور خیال پر صرف کردیا جائے اور فن کو بالکل نظرانداز کردیا جائے اور اس طرح ادب اور آرٹ کو سیاسی اشتہار بنا دیا جائے۔" روسی ادب کا جدامجد PUSHKIN رجعت پرست یا زوال پرست ان ادیبوں کو سمجھتا ہے جو برائی کو ہمیشہ اور ہر جگہ کامیاب و کامراں دکھانا پسند کرتے ہیں اور انسانی دل میں انھیں صرف دو تار دکھائی دیتے ہیں۔ انا اور تکبر کے تار۔ جدید ترقی پسند نقاد RALPH کو یقین ہے کہ انقلابی وہ ہے جو ماضی کی میراث میں سے زندگی بخش اور امید افزا اجزا کو اخذ کر لیتا ہے اور حال کی کسی ایسی شے کو درگزر نہیں کرتا جس سے ہم مستقبل کی تعمیر میں کسی کام میں لا سکیں۔ اردو میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت سب سے پہلے سجاد ظہیر، احمد علی، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد وغیرہ نے کی۔ اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں "سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتۂ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہونچنے کے لئے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔" اسی بنا پر اختر حسین رائے پوری ٹیگور کو رجعت پرست اور اقبال کو فاسسٹ بتاتے ہیں اور قدیم و جدید ادوار کے ہندوستانی ادب کا صرف "معاشی" تجزیہ کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند ادب اور فطری ادب میں فرق نہیں سمجھتے۔ انکا خیال ہے کہ "ترقی پسند ادب کی بنیاد واقعیت اور جمہوریت پر ہوتی ہے اور وہ ماضی کا معترف ہوتا ہے لیکن وہ مستقبل اور اس کے لامحدود امکانات پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہے۔" ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے اور یہ کہ مادی زندگی میں پیداوار کے طریقے اجتماعی، سیاسی اور ذہنی زندگی کے رجحانات کی تعیین کرتے ہیں ان کے یہاں افادیت میں حسن ہے اور بغیر افادیت کے حسن کا تصور ناممکن ہے۔ وہ فن کے سماجی پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اگر ادب میں سماج کے ہر پہلو پر نظر نہ رکھی گئی تو وہ صالح ادب نہیں ہو سکتا۔ سماج کو یہ حصوں میں تقسیم کر دینے کے قایل نہیں اس کی اکائی پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہ نظریے بیشتر انتہا پسندی پر مبنی تھے اور ردعمل کے طور پر پیدا ہوئے تھے۔ ایک گروہ اور ہے جو ذرا دھیما ہے اور جذباتیت پر قدرے غالب ہے مگر قسمتی سے اسے سرکاری انجمن کی منظوری اور تائید حاصل نہیں۔ پریم چند ادب کی وضاحت یوں کرتے ہیں "ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان شستہ، پختہ اور لطیف ہو جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہیں۔" احمد علی انھیں خیالات کو دہراتے ہیں۔ "یہ

بھولنا چاہئے کہ ادب صرف اس وقت ہی زندہ رہ سکتا ہے جب کہ وہ نہ صرف سماجی احساس کو صداقت اور صدق دل سے ظاہر کرے بلکہ وہ بحیثیت ادب کے بھی عمدہ اور بلند پایہ ہو۔ فیض احمد فیض زیادہ سلجھے ہوئے انداز میں سمجھاتے ہیں " ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو سماجی ترقی میں مدد دیں اور ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں"۔ وہ شاعری کا مقصد تنقید و تفسیر حیات ہی کو جانتے ہیں مگر اس انداز سے کہ پڑھنے والے کو نشاط دل و دماغ حاصل ہو۔ عزیز احمد نے ترقی پسند ادب سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ترقی پسند تحریک دو عناصر سے مل کر بنی ہے۔ حقیقت نگاری اور انقلابی تحریک۔ ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ انسان کا ہزار ہا سال کا وجدانی تجربہ محض دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اشتراکی ملک کا رہنے والا انسان بھی جب تمام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی خلا محسوس کرے گا جس کے لئے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی۔ باقی کچھ لوگ اور بھی ہیں جو جہاں تک اصولی بحثوں کا تعلق ہے ایک غیر جذباتی اور متوازن اصول کا پرچار کرتے ہیں۔ وہ جذباتی نہیں اور توازن کا احساس ان میں موجود ہے۔

Trotsky نے اپنی کتاب لٹریچر اینڈ ریوولیوشن (ادب اور انقلاب) میں ایک جگہ ادب اور سماج کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے، اس نے فن اور پروپگنڈا کے فرق کو بتلایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ فنکار اگر ایک مقصد پر ایمان رکھتا ہے تو اس مقصد کا اظہار اس کی تخلیقات میں ہو بہو اور براہ راست اس طور پر نہ ہونا چاہئے جس طور پر وہ اس عقیدے کا حامل ہے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ جس طرح وہ اس عقیدہ کو محسوس کرتا ہے اسی احساس کی عکاسی اور جھلک اس کے فن میں موجود ہو جہاں تک کہ اس کے مواد میں اس کے عقاید پائے جانے کا سوال ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل، جو جدید ترقی پسند ادیب ہے، نے اپنی کتاب " الیوژن اینڈ ریئلیٹی (سراب اور حقیقت) میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ " جب ہم جدید کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو عام طور پر اس میں وہ تمام ثقافتی پیچیدگیاں مضمر ہوتی ہیں جو پندرھویں صدی کے بعد سے یوروپ و بیرون یوروپ میں پھیل رہی ہیں۔ ہنری تھیلس، چاسر، بیوولف کے مقابلہ میں شکسپیر میکائیل انجیلو، پوپ، گیٹے اور والیٹر زیادہ جدید ہیں اور ان سے بھی زیادہ جدید ویلیری، سیزان، جیمس جوائس، برگساں اور آئنسٹائن ہیں۔ اس پیچیدگی کا دار و مدار معاشیات پر ہے۔" پھر آگے چل کر وہ فن کے متعلق یوں رقمطراز ہے " ہمارا مطالبہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہارا فن پرولتاری ہونا چاہئے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ تم فن میں اپنے عقاید اور مارکسی محاورات کا استعمال کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم واقعتاً اس نئی دنیا میں سانس لو اور ماضی میں اپنی روح نہ چھوڑ رکھو۔ ماضی کو حال میں کھینچ لاؤ اور مستقبل کا احساس رکھو تم صرف ایک فنکار نہیں بلکہ پرولتاری فنکار ہو جاؤ گے۔ کم و بیش کاڈویل ہی کے خیالات کا اظہار اردو میں ترقی پسند نقاد احتشام حسین نے بھی کیا ہے " ادب میں ترقی پسندی زندگی میں ترقی پسندی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ہر ترقی پسند کے سامنے ایک مخصوص فلسفۂ حیات ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں حرکت اور تغیر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند ادیب ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ زندگی کی ان کشمکشوں کی توجیہ، تشریح اور اظہار کا آلہ سمجھتا ہے جن سے زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے اور اسے ان مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے جن سے آزادی امن اور ترقی عبارت ہے۔ وہ جمہوریت کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ کلچر کو چند انسانوں کی ملک بنانے کے بجائے تمام انسانوں کی چیز بنا دینا چاہتا ہے جو آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور اتحاد دشمن طاقتوں سے برسر پیکار رہیں " " ترقی پسند ادب کا زاویۂ نظر مواد اور ہیئت کے

تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعراء اور نقاد جو زندگی کو تامیاتی مانتے ہیں۔ جو خصوصیتوں سے مقدار کو اور مقدار سے خصوصیتوں کو بدلنے کے قایل ہیں، جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں، جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند شاعروں کا خیال ہے کہ دنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ رہنمائی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی سے ہو سکتی ہے۔" ہیئت اور اظہار کی بھی ایک سماجی حیثیت ہے کیونکہ وہ ادیب اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔" ترقی پسند قدیم ادب کے سرمایہ کو آگ لگا کر ختم نہیں کر دینا چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ کوئی اس کا قایل نہیں ہے کہ ایک تہذیب و تمدن کا دور اپنے گزشتہ تہذیب و تمدن کے دور سے مدد لیکر آگے بڑھتا ہے چاہے وہ مدد اثبات میں ہو یا نفی میں۔

میں نے ترقی پسند تحریک کے حامیوں کے نظریات بیان کرنے کے سلسلہ میں انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ اسی طور پر ان لوگوں کو بھی چند گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں جو ترقی پسند تحریک سے متعلق نہیں ہیں مگر جنھوں نے اس تحریک اور اس کے ادب کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو شروع شروع اس تحریک میں خاص دلچسپی لے رہے تھے مگر بعد میں انھوں نے چند شکوک کا اظہار کیا اور تحریک کے کارناموں کے غیر تشفی بخش ہونے پر رائے زنی کی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا عبدالحق اور احمد علی ان لوگوں میں سے چند ہیں۔ احمد علی تو اس تحریک کے بانیوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں اور پنڈت نہرو اور مولانا عبدالحق ابتدائی دور کے ہمدردوں میں۔ پنڈت نہرو اپنی جھجک کا اظہار یوں کرتے ہیں " ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں ہے " عبدالحق بھی ان نوجوانوں کے ادب سے مطمئن نہیں، "معاف فرمایئے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو کہیں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالاتر ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور غالباً کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات نہیں سما سکتے لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے جو اس گر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا، اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے"۔
احمد علی انھیں حقیقتوں کی روشنی میں ادب کی وضاحت یوں کرتے ہیں " ادب جان بوجھ کر پروپگنڈا نہیں کرتا۔ کم از کم اچھے ادب کو جان بوجھ کر پروپگنڈا نہیں کرنا چاہئے۔ میں اس کو ادب ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں جو ایک سیاسی لیڈر کی طرح کھڑا ہو کر دیوانہ وار چیخے کہ لوگو تم ننگے ہو تم پر ظلم ہو رہے ہیں اس لئے تم انقلاب کرو۔ میں مصنف ہوں، میں پروپگنڈسٹ نہیں ہوں۔ میں سوسائٹی کی نبض دیکھتا ہوں لیکن میں ایک اناڑی طبیب کی طرح جو سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر ایک ہی دوا سے سب مریضوں کا علاج کر دیتا ہے، پروپگنڈا کی گولی اس کو دینے کے لئے طیار نہیں ہوں۔ میں حقیقت نگاری کو نہیں بھولتا لیکن میں بیوقوفی کی حرکت کو غیر ادیبانہ تصور کرتا ہوں"۔ پہلے اس ردعمل

کے طور پر لکھے گئے ہیں جو اس تحریک کی اولین تخلیقات کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔ دوسرا گروہ بھی ان لوگوں کا ہے جو اس تحریک کو بہ نظرِ حسن دیکھتے تھے یا دیکھتے ہیں مگر چند بے ضابطگیوں سے نالاں ہیں۔ رشید احمد صدیقی، ممتاز شیریں اور آل احمد سرور کا نام اس سلسلہ میں لیا جا سکتا ہے۔ رشید صدیقی چند بے لاگ باتیں عام مفروضات کے طور پر بیان کر جاتے ہیں "ادب سنت الدین نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی ناممکن ہو۔ شعر و ادب انسانوں کی بنائی ہوئی چیز ہے اور انسانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اسے ڈھالتے رہیں۔ ترقی پسند ادب کو محض اصلاح پر کمر بستہ رہنا چاہئے۔ اس کو وادین کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کی وسعتوں پر محیط ہونا چاہئے۔ ذہنی دنیا میں رہنا یا داخلی شاعری کی آڑ پکڑنا میرے نزدیک یکسر مہمل ہے۔ اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کر لے اور خارج کو توڑنے مروڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کر دے یا نہ کر سکے۔" پھر رشید احمد صدیقی اس تحریک کے پیدا کردہ ادب کے چند عنوانات سے بحث کرتے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں اور ادیبوں کو ان موضوعات کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کے بحر بیکراں کے موضوعات میں غوطہ زن ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ سرور اس تحریک کے اعلیٰ مقاصد کو سراہتے ہیں۔ اس کے ادب کے ایک حصہ کو بھی وہ بیش قیمت گردانتے ہیں، مگر سب سے پہلے تو وہ اس کے پیروؤں ہی سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ "ہر تحریک اپنے پیروؤں سے پہچانی جاتی ہے۔" یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس تحریک کو چلانے والوں میں مبلغ نقیب، نعرہ لگانے والے بہت ہیں۔ ایسے لوگ کم ہیں جو پروپگنڈے اور آرٹ کے فرق کو جانتے ہوں۔ اس تحریک کے بعض علمبرداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے۔ یہ زندگی کو مارکسی فارمولوں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہے۔ یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فن سے ناواقفیت کو آرٹ سمجھتے ہیں اور رطوائیف کو ہیرو ین۔ یہ مذہب اخلاق اور تہذیب کو آثار قدیمہ کہتے ہیں اور مارکس کو انسانیت کا حرفِ آخر۔" یہی سبب ہے کہ اس تحریک کو دیو پیکر اشخاص نصیب نہ ہو سکے جو علی گڑھ تحریک کو نصیب ہوئے یہی وجہ ہے کہ یہ ادب ابدیت کم رکھتا ہے اور اس کے نغموں کی شیرینی کچھ عرصے کے بعد پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے پاس جذبات ہیں، ذہن نہیں ہے۔ گرمی ہے۔ روشنی نہیں ہے، دل ہے دماغ نہیں ہے۔" ممتاز شیریں کے گلے اور شکایتیں بھی ان حضرات سے ملی جلی سی ہیں۔ ان تمام حضرات کے خیالات میں خلوص ہے، سچائی ہے اور ایمانداری ہے۔ ان کے اعتراضات تعمیری ہیں۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممتاز شیریں تحریک کے علمبرداروں کے احتسابی عمل سے نالاں ہیں، "مصیبت تو یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے احتساب کے حق میں اور ذہنی آزادی کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سرے سے یہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ ادب کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ادیب کو ایک طرف یا تو صرف تفریح نگار سمجھتے ہیں یا دوسری طرف محض پرچارک جو کسی سیاسی پارٹی کی ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق اپنی تحریریں بدل سکے، جبر ادب پیدا نہیں کر سکتا جب تک ادیب بے ساختگی سے آزادی سے نہیں لکھتا ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ ادیب کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر سیاسی قوانین نافذ کرنا سیاسی مقصد کے لئے اس کی تخلیق کا گلا گھونٹنا ہے۔" کلیم الدین احمد سختی سے ترقی پسند تحریک کے اصولوں اور ان کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ان سے بالکل خوش نہیں نظر آتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس تحریک کا پیدا کیا ہوا ادب مطلق تشفی بخش نہیں۔ اس ادب کی اہم کمی یہ ہے کہ اس میں ادبی محاسن کا

فقدان ہے۔ "ترقی پسند مصنفین" ادب سے ناجائز کام لیتے ہیں اس لئے وہ اور جو کچھ بھی ہوں ادیب کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے ان کی تحریروں میں اشتراکی پہلو ادبی پہلو پر غالب ہوتا ہے وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور خیالات بالکل اخذ کر لیتے ہیں۔ طرز ادا بھی ناقص ہے۔ یہی اسباب ہیں کلیم الدین احمد کی خفگی کے۔ علاوہ بریں کلیم ان مفروضات سے بھی مطمئن نہیں جن پر اس تحریک کی بنیاد ہے۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ جن مفروضوں پر وہ اپنی دلیل کی بنیاد قایم کرتے ہیں ان کی صحت میں بہت کچھ بحث کی گنجایش ہے پھر ان مفروضوں کی بنا پر جو نتائج وہ اخذ کرتے ہیں وہ نتائج مستنبط نہیں ہوتے، لیکن سب سے اہم نقص یہ ہے کہ وہ مبہم و غیر متعین الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان سے ناجائز مصرف لیتے ہیں"۔ پھر کلیم ان اصولوں کے عمارت کی سنگ بنیاد پر ایک ضرب کاری لگاتے ہوئے کہتے ہیں "انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی نہیں انسان کی سب سے بڑی اہم، قیمتی ضرورت دماغی خواہشات کی تسکین اور دماغی قوتوں کی ترقی ہے"۔ ایک اور گروہ بھی ایسا ہے جو شد و مد کے ساتھ ترقی پسند تحریک پر معترض ہے اور "ترقی پسند مصنفین" کی دھجیاں اڑاتا رہتا ہے ان میں حسن عسکری پیش پیش ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ترقی پسند لفظ بہ لفظ سیموئل بٹلر کے ہیوریٹن عالم دین کی طرح ہیں"۔ حسن عسکری کا خیال ہے کہ فنکار کی حقیقت سیاسی یا معاشی حقیقت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کے لئے تو حسیاتی حقیقت سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے الگ رہ کر وہ فنکار نہیں رہتا۔ "فنکار کے لئے اپنے زمانہ کے مروجہ سیاسی نظریوں اور اس قبیل کی دوسری نظریاتی چیزوں کو اس طرح "سمجھنا" بالکل ضروری نہیں جس طرح سیاسی لیڈر یا اسمبلی کے لئے ووٹ دینے والوں کو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں"۔ حسن عسکری سمجھتے ہیں کہ "ہیئت ہی کل آرٹ ہے اور ہیئت ہی فنکار کی حقیقت ہے۔ ہیئت کی تلاش ایک اخلاقی جد و جہد ہے، بلکہ خود زندگی کی تلاش ہے"۔ اسی سلسلہ میں دو مغربی نقاد ایچ۔ اے میسن اور مڈلٹن مری کا حوالہ دینا بیجا نہ ہوگا۔ وہ بھی اس تحریک سے متفق نہیں اور اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ میسن کہتا ہے "جب مارکس کے پیرو ادب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں ایک عجیب باسی پن ہوتا ہے۔ پختگی کا تو ذکر ہی کیا۔" کاڈویل کی کتاب کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "اس کتاب کو پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے زیادہ تر اس کا اصلی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے صرف میکانکی طور پر مارکسی فلسفے کو ادب پر عاید کرنے کی کوشش کی ہے اور الٹی سیدھی مارکسی اصطلاحوں کی بھرمار کر دی ہے۔ یہ ساری باتیں پوری کتاب کے بجائے چھوٹے سے پمفلٹ میں کہی جا سکتی تھیں"۔ مڈلٹن مری بھی اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں "اس کتاب میں بڑا جوش ہے، بڑا جذبہ ہے، بڑی نیک دلی ہے۔ کاڈویل ایک قسم کا جدید شیلی ہے اور مارکس اس کا گوڈون ہے۔ شیلی ہی کی طرح وہ کوئی اچھا لکھنے والا نہیں۔ وہ گھسی پٹی باتیں کہتا ہے۔ یہ اس خوش یقینی اور اندھے اعتقاد کا اظہار ہے جو کمیونزم کی آخری شکل ہے۔ در اصل مارکسیوں کا پرولتاریہ محض ایک مجرد شکل ہے محض ایک مفروضہ۔ کاڈویل نے پرولتاری آرٹ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ سر تا پا حماقت ہے اس کتاب کی اصلی دلچسپی اس بات میں ہے کہ یہ ایک مخلص مارکسی کی ناکامیابی کی بڑی اچھی مثال ہے"۔ یوں تو اس تحریک اور اس کے مصنفین کے خلاف بہت کچھ کیا گیا ہے، مگر زیادہ تر اعتراضات انتہا پسندی کی مثالیں ہیں اسی لئے میں نے چند سنجیدہ اور معتدل اور مخلص ادیبوں کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ جو جذباتی یا روحانی طور پر اس تحریک پر معترض ہیں ان کا حوالہ دینا میں نے قطعی نامناسب خیال کیا ہے۔ اب انھیں بیانات کی روشنی میں "ترقی پسند ادب" کا

ایک سرسری جائزہ لینا بیجا نہ ہوگا۔

ترقی پسند ادب کو ہم یوں ہی تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد کے پانچ سال، اس کے بعد کے پانچ سال اور پھر گزشتہ پانچ سال۔ یہ تقسیم سو فیصدی درست نہ ہوگی مگر پھر بھی ان ادوار کی الگ الگ اپنی خصوصیات ہیں۔ پہلا دور عام طور پر بحران، ردعمل، جھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا دور ہے۔ جذباتیت ہر جگہ غالب ہے۔ مطالعہ کی خامکاری نمایاں ہے۔ خیالات میں وسعت کی بجائے تنگی ہے۔ ابہام اور اشاریت (ناخوشگوار حد تک) اور پھر جنسی کجروی ——————— یہ تو کہا جا چکا ہے کہ اس تحریک کا پہلا اہم کارنامہ "انگارے" کی اشاعت ہے اور انگارے کی خصوصیات بھی بتلائی جا چکی ہیں، بس یہی ساری خصوصیات کم و بیش اس دور کی تمام تخلیقات پر صادق آتی ہیں۔ احمد علی کی "شعلے"، سجاد ظہیر کا ڈرامہ "بیمار" اور ناولٹ "لندن کی ایک رات"، علی سردار جعفری کی "منزل"۔ حیات اللہ انصاری کی "انوکھی مصیبت"، اختر رائے پوری کی "محبت اور نفرت" اور رشید جہاں کی "عورت" سبھوں کا تقریباً یہی حال رہا۔ تمنائی نے چین کی کہانیوں کا ترجمہ "زندہ چین" کے نام سے شائع کرایا۔ ترجمہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تمام مجموعوں میں فنی خامیوں کا پتہ ملتا ہے۔ فارم کا احساس تو گویا کسی کو بھی نہیں۔ منتشر تاثرات بکھرے پڑے ہیں اور بس ——————

—————— یوں کہنے کو تو اس وقت پریم چند بھی لکھ رہے تھے اور پریم چند گویا اُردو فسانہ نگاری کے باوا آدم اور حقیقت طرازی کے پیغمبر اولیٰ ہیں مگر کیا ہم پریم چند کو صرف اس لئے اس تحریک سے منسلک کر دیں کہ تحریک کے قیام کے بعد ایک سال تک وہ زندہ رہے؟ ..... پریم چند کی تخلیقات پر اس تحریک کا کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ ہاں وہ اس انجمن میں شامل ضرور ہوئے تھے اور اس کے مقاصد سے ہمدردی ضرور رکھتے تھے مگر ان کے افسانوں (کفن وغیرہ) کو انجمن کے اس دور کی ادبی تخلیق میں گنوانا پریم چند کی پچھلی زندگی کی تخلیقات کو یکسر نظرانداز کر دینے کے مترادف ہوگا۔ یوں تو جوش، فراق، ساغر، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، ل۔ احمد، ڈاکٹر تاثیر وغیرہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے انجمن کے ابتدائی دور میں انجمن کا ساتھ دیا اور ان کی تخلیقات بھی ترقی پسند تخلیقات میں گنی جاتی ہیں مگر تعجب تو یہ ہے کہ اس دور کے بزرگوں کی تخلیقات نوجوانوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور یہ لوگ تو ان لوگوں میں سے ہیں جو انجمن کے قیام کے قبل ہی سے لکھ رہے تھے۔ اس وقت کے نوجوان ادب کے ہر اس ٹکڑے کو بیکار، لغو اور لامعنی تصور کر رہے تھے جو کہ اس سے قبل لکھا گیا۔ اسے پچھڑا، فرسودہ اور رجعت پسند ادب کہا جانے لگا تھا اور ہر وہ افسانہ یا شعر یا جملہ ترقی پسند کہا جانے لگا جو اس تحریک کے کسی رکن نے لکھ مارا —— "آزادی کی نظمیں" کے عنوان سے جو مجموعہ اس دور میں شائع ہوا اس کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ پھر دوسرا دور آتا ہے۔ یہ دور فن میں پختگی، تبلیغ میں توازن، فارم میں تجربے، مطالعہ میں گہرائی، جذبات میں اعتدال اور ادب میں صحیح ترقی پسندی (بہت حد تک) کا دور ہے۔ پہلے دور کا ادب ترقی پسند زیادہ تھا ادب کم تھا۔ دوسرے دور کا ادب ترقی پسند بھی تھا اور ادب بھی۔ آزادی ملک کے جذبے سے سرشار متوالا تھا اور فاسزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے کمربستہ۔ وہ نت نئے موضوعات ادیبوں اور شاعروں کو دے رہا تھا اور فارم میں ہر روز نیا تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ مانا کہ سارے تجربے کامیابی کے نمونے نہیں اور سارے موضوعات دنیا کے مسائل موضوعات کے مقابلہ میں صرف ایک مخصوص زاویہ حیات کے موضوعات ہیں پھر بھی وہ اُردو ادب میں اضافہ کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

نئے لکھنے والوں میں اچھے فنکار اُبھر رہے ہیں اور ان کی تخلیقات کا ایک حصہ یقینی ایسا ہے جو قابل اعتنا ہے۔ جوش اور احسان دانش کے کئی مجموعے، پھر فیض کا "نقش فریادی" راشد کا "ماورا"۔ مجاز کا "آہنگ" احمد ندیم کی "دھڑکنیں" جاں نثار اختر کی "سلاسل" اختر الایمان کا "گرداب" ایسے مجموعے ہیں جو کام کے ہیں ـــــ اور اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر مختار صدیقی، اختر شیرانی، شاد عارفی، یوسف ظفر، جذبی، اختر انصاری، مطلبی، مخدوم، تاثیر، میراجی، سلام، مخمور جالندھری، کیفی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس وقت سے آج تک کوشش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ابہام اور جنسی کجروی کے لئے مشہور رہیں اور کچھ اپنی یاسیت کے لئے اور کچھ اپنے ڈھنڈورے سوچن کے لئے مگر باقی ایسے ہیں جو کوشاں ہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ فیض کی "بول" اور مخدوم محی الدین کی "یہ جنگ ہے یا جنگ آزادی" اس دور کے رجحان کا صاف پتہ دیتی ہیں۔ جوش کی "فرزندان ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام" اور "تاجدار برطانیہ کے نام" اس دور کی سراسیمگی، پریشانی، پراگندگی، انتشار اور افراتفری کی مظہر ہیں۔ نثر میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، احمد عباس، سہیل، اختر انصاری، اختر اورینوی، علی عباس حسینی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور رشک کے بیشتر افسانے اُردو افسانہ نگاری میں قابل قدر افسانے ہیں۔ مقالہ نگاری میں فیض، احتشام، ڈاکٹر عبدالعلیم، سبط حسن، سجاد ظہیر، تاثیر، عزیز احمد، فراق، مجنوں، اکثر سلجھی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں اور وہ رعونت اور قطعیت نہیں جو پہلے دور میں اختر رائے پوری، احمد علی اور سجاد ظہیر وغیرہ کی بیشتر تنقیدوں میں ہے۔ تیسرے دور میں انتہا پسندی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور تنقیدوں اور تقریروں کا دور ہے۔ جھلاہٹ اور بوکھلاہٹ کی ملی جلی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ افسانے اور نظمیں مائل بہ زوال ہیں۔ صرف چند فنکاروں کے چند فن پارے ایسے ہیں جو قابل اعتنا ہیں۔ لوگ یا تو انجمن چھوڑ رہے ہیں یا چھوڑنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ احمد علی، اختر رائے پوری، عزیز احمد، جوش، ساغر، احمد عباس، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، فیض احمد فیض، بیدی، منٹو، اشک، بلونت سنگھ، جذبی، تاثیر، میراجی، راشد وغیرہ وغیرہ یا تو نکالے جا چکے ہیں یا معتوب ہیں۔ تنقیدی مضامین زور و شور پر لکھے جا رہے ہیں، مگر ان میں شدید اختلافات ہیں۔ احتشام حسین جسے ترقی پسند ادب سمجھتے ہیں وہ کم از کم آج نہیں لکھا جا رہا ہے۔ عبادت بریلوی بیچارے خواہ مخواہ اس تحریک اور اس کے ادب کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ نہ معلوم عصمت کی ڈانٹ کے بعد بیچارے کا کیا حال ہے۔ وہ مرشد کئے جاتے ہیں اور دو زخی کی لکھنے والی یہ کہ کر ڈانٹے جاتی ہے کہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ صرف کمیونسٹ ترقی پسند ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ممتاز حسین بھی سلجھی ہوئی باتیں کہ جاتے ہیں مگر ان کی سنتا کون ہے۔ مختلف ادبی انجمنیں قایم ہو رہی ہیں۔ ان کے سرکاری آرگن بھی ان سے نالاں ہو کر اپنی راہ الگ بنا رہے ہیں آج جو ادب قابلِ اعتنا ہے وہ ان لوگوں کا ہے جو سرکاری طور پر "CONDEMNED" ہیں۔ احمد ندیم قاسمی "نقوش" کے ایک شمارہ میں اپنی بہت ساری غلطیوں اور انتہا پسندیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسرے ہی شمارہ میں عصمت اسی مستقل عنوان کے تحت ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ادبی حکم نافذ کر دیتی ہے، احتشام، عبادت، ممتاز حسین، عصمت، احمد ندیم سبھوں کے زاویۂ نظر میں اختلاف ہی نہیں تضاد ہے، خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں روسی ادب (جنگ عظیم نمبر ۲ سے قبل) جن ادوار سے گزرا کہیں انہیں ادوار سے اُردو ادب بھی تو نہیں گزر رہا پھر تو ادبی ڈھنڈورے بازوں کو اپنے مستقبل سے ہوشیار رہنا چاہئے، وہ فی الحال ایسے طاقتور

بھی نہیں کہ پرولٹ کلٹ یا راپ والوں کی طرح کسی کو دار پر لٹکا دیں، کسی کو ملعون قرار دیدیں اور کسی کو جلاوطنی کی سزا دے ڈالیں
روسی ڈرامانگار کے ٹرینف نے اپنی تصنیف BENOTRFRFRAIDTODRRE میں لکھا "اسٹالن گراڈ پر دس سے زاید ڈرامے لکھے گئے مگران میں سے ایک بھی قایم نہ رہ سکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اچھا مستند ادب نہ تھا وہ کارنامے فنی تھے"
سنہ ۱۹۳۲ء میں روس کی کمیونسٹ پارٹی نے راپ کا خاتمہ کردیا۔ اور اس کی شایع کردہ بیس ہزار کتابیں اور ان کے ساتھ راپ کے ۴۰ لاکھ اعلانات نذر آتش کردئے گئے۔ سرکاری اعلان ہوا کہ اس زمانے (سنہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۲ء تک) کی تصنیفات کا بیشتر حصہ قابل اعتنا نہ تھا پھر ملک کے ادیبوں کو ہدایت کی گئی کہ اشتہار بازی کے بجائے وہ "سوشلسٹ واقعیت" کی طرف رجوع کریں۔ کیا انجمن ترقی پسند مصنفین کی موجودہ ادبی ڈکٹیٹری کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے ؟

اب نتیجے کے طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ادب ہے کیا۔ اس کا زندگی سے تعلق کیا ہے۔ ادب کی ماہیت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ سیاست اور ادب یا مقصد اور ادب کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ مواد اور ہیئت میں باہمی کیا تعلق ہے۔ یہ سوالات آج سے ہزاروں سال پہلے سے لوگوں کے ذہن کے گرد چکر لگا رہے ہیں اور مختلف خیالات کا اظہار اس بارے میں کیا جارہا ہے۔ ارسطو نے بھی اس معاملہ پر غور کیا تھا اسی لئے اس نے شاعری کو نقالی (IMITA IRON) سے تعبیر کیا تھا۔ مگر آج تک کسی ایک فیصلہ پر نہیں پہونچا جا سکا ہے۔ پھر بھی چند بنیادی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں مدنظر رکھتے ہوئے ہم چند عام، اہم اور ضروری مفروضات قایم کرسکتے ہیں جس سے شاید ہی کسی مخلص ادیب کو انکار ہو۔ آج "ادب برائے ادب" "ادب برائے تفریح" یا "ادب برائے تعیش" جیسے نعرے لایعنی ہیں۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ دلی سے دور ہو جانے پر تیر بھی شکوہ کرتے ہیں، اور اپنے اوپر خود مختاری کی تہمت لگائی جانے اور بدنام کئے جانے پر یہ کہنے کی ہمت بھی کرتے ہیں کہ کرتے تو آپ وہی ہیں جو چاہتے ہیں۔ مجھے مفت بدنام کرنے سے کیا فایدہ ! چراغ مفلس کے پیچھے سے رہنے پر ان کا بھی جی اُداس ہوا ہے اور میں نے بیشتر بڑے شاعروں کے متعلق یہی کہا ہے کہ وہاں بھی زندگی کے چھینٹے مل جاتے ہیں۔ کمی یا زیادتی یا طریقہ استعمال کا سبب وہ خود نہیں ہیں بلکہ انکا زمانہ، ماحول اور ادبی شعور اس کا ذمہ دار ہے۔ ادب کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لئے جس طرح کھانا پینا، روٹی کپڑا سونا اور کام کرنا ضروری ہے ویسے ہی ادب ضروری ہے۔ ادب اور زندگی کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ مگر زندگی سے میری مراد صرف سیاست نہیں، یا صرف روٹی یا صرف اشتراکیت نہیں، زندگی سے مراد وہی ہے جو بقول خورشید الاسلام " اونچی نیچی سڑکیں، چھوٹی بڑی دکانیں، جیٹھ کی دھوپ، برسات کی اندھیری بھیانک، مچل جانے والی راتیں، قہوہ خانے، گلابی جاڑوں میں نظریں بچا بچا کر مسکرانے والے پھول، جواری، پی کر گلاس چور چور کردینے والے شرابی، فضا میں خوشبوئیں بکھیرنے والے دوپٹے، مرجھائے ہوئے معصوم چہرے، پرانی چیزوں کا نیاپن، سادگی میں بناوٹ، نیکیوں میں چھپی ہوئی کمزوریاں، پندار کی تہ میں انکسار، آہنا اور طلع الملک اور سنگر مشین" سے مشابہ ہے۔ یعنی ہر وہ شے جس کا تعلق انسانی تمدن کے تاریخی ارتقا سے ہر زندگی میں داخل ہے۔ سیاست زندگی کا صرف ایک شعبہ ہے لہذا ادب میں بھی اس کی جگہ اسی تناسب سے ہو سکتی ہے۔ اور پھر اس کا تعلق مواد سے اور مواد کا تعلق ہیئت سے

یہی بنیادی پتھر ہے جس پر ادب کی عمارت کی تعمیر ہوسکتی ہے ۔ ادب میں زندگی کی صرف مصوری، عکاسی یا نقالی نہیں ہوتی۔ بلکہ شاعر، ادیب یا فنکار بدہ اگر بڑا اور اچھا شاعر، ادیب اور فنکار ہے تو یقیناً اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے اور زیادہ حساس ہوتا ہے، جو قیمتی اور انمول تجربات حاصل کرتا ہے انھیں پیش کرتا ہے ایک مصور کی طرح حسین، دیدہ زیب اور دلفریب رنگوں کی آمیزش سے ساتھ ہی ساتھ فنکار کی اپنی تنقید بھی پنہاں ہوتی ہے ۔ ان تجربات کا براہ راست بیان نہیں ہوتا بلکہ حسین، مکمل اور موزوں بیان ہوتا ہے۔ اگر مقصد کا براہ راست اظہار ادب ہوتا تو پھر "کمیونسٹ مینی فسٹو" کیوں نہ دُنیا کے بہترین ادبی پاروں میں شمار کیا جاتا ؟ اور اگر حقیقت نگاری یا واقعات، تاثرات اور تجربات کا سیدھا سادھا بیان ادب میں شمار کیا جاتا تو پھر دُنیا کے سارے اخبارات کیوں نہ ادبی شاہکار تصور کئے جاتے ؟ صرف خیالات و تجربات ہی ادب نہیں پیدا کرتے ۔ ان خیالات اور تجربات کی نوعیت کیا ہے وہ اچھے ہیں یا برے اور پھر ان کا اظہار کیسا ہے ۔ حسین یا بھونڈا اسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ مواد اور ہیئت دو نہیں ایک ہیں۔ ایک کو دوسرے سے اسی طرح جدا نہیں کیا جاسکتا جیسے روح کو جسم سے ۔ مواد اور ہیئت جسم و روح کے مترادف ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ انقلاب روس سے قبل کا ادب انقلاب کے بعد کے ادب سے زیادہ گراں قدر ہے اور جاگیردارانہ دور کے ادب کا ایک کثیر سرمایہ پرولتاری دور کے ادب کے بیشتر حصہ سے زیادہ بیش قیمت اور زیادہ ترقی پسند ہے ۔ خیالات اور ان کا اظہار بہت کچھ ادیب کی شخصیت اور اس کے ماحول اور تاریخ تمدن انسانی سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہے ۔ اس لئے ادیب کو ماحول سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اپنی منفرد آزاد رائے رکھنی ضروری ہے ۔ میں نے ماحول کی ترقی کے ساتھ ساتھ انفرادی ترقی پر اسی لئے زور دیا ہے ۔ ادیب ماحول کی پیداوار ضرور ہوتا ہے مگر ماحول کی ترقی اور اس کی نئی نشو ونما اور تعمیر میں اس کی شخصیت کا بہت ہاتھ ہوتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ جب روس میں پرولیٹرین خیالات کے پرچار کے لئے ایک تنظیم "سپیر ولٹ کلٹ" کی بنا رڈالی گئی اور جب انھوں نے ادبی Regimentation شروع کیا تو وہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکے ۔ اور ۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کے اجلاس میں یہ بتایا گیا کہ "کسی مزدور مصنف کی کتابوں کی مانگ نہیں ہے اور ناشر کو مجبوراً انھیں ترازو پر تول کر کوڑیوں کے مول بیچنا پڑتا ہے " ۔ پھر پنج سالہ پروگرام کی تبلیغ کرنے کی غرض سے سرکاری انجمن "راپ" کی بنا ڈالی گئی اور حکومت نے اس جماعت کو ادبی ڈکٹیٹری سونپ دی، تب بھی یہ جماعت کامیاب نہ ہوسکی اور ۱۹۳۲ء میں ادبی پارٹی بندیوں کا خاتمہ کرنے کی نوبت آن پہونچی ۔ نپولین، ہٹلر اور مسولینی نے بھی اپنے مقاصد کی ترویج کی غرض سے ادب کو استعمال کرنا چاہا اور ناکامیاب رہے ۔ آخر مارکس کو ہین (Heine) اور گیٹے کیوں زبانی یاد تھے ؟ شاید آپ کو واقفیت ہو، مارکس نے Aeschylus کا مطالعہ یونانی زبان ہی میں کیا ۔ مارکس کو شیکسپیر بہت عزیز تھا اور اس کی لڑکیوں کو بھی شیکسپیر کی لائنیں زبانی یاد ہوگئی تھیں ۔ مارکس بہترین اور مناسب استعمال الفاظ کی تعریف کرتا تھا اور اسی لئے وہ گیٹے، لیسنگ، شیکسپیر، دانتے اور سروانتیز کو روز پڑھتا تھا اسے پوری ڈیوائن کامیڈی زبانی یاد تھی اور شیکسپیر کی لائنیں اگر وہ بھول جاتا تو اس کی بیوی اسے یاد دلاتی ۔ ڈارون اور بسمارک، اور مارکس سب ناول کے دلدادہ تھے اور آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ مارکس، بالزک، فیلڈنگ اور سروانتیز کے ساتھ ساتھ Dumas, the Elder اور Paul de Kock میں بھی کافی دلچسپی لیتا تھا ۔ آخر یہ سب

کیوں ہوتا تھا۔ مارکس تو اپنے دور کا سب سے بڑا انقلابی تھا۔ بسمارک تو رجعت پرست نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ ادب کی اپنی ایک الگ دنیا ہے جو معاشیات، تاریخ، ڈائری اور مینوفسٹو سے مختلف ہے۔ یہ ساری چیزیں ادب میں پائی جاتی ہیں مگر معاشیات اور تاریخ کی حیثیت سے نہیں ادب کی حیثیت سے۔ کیا وہ انتہا پسند ترقی پسند جو ترقی پسندی کو اشتراکیت کا بدل اور ادب کو سیاست کا ایک شعبہ، ایک نامہ خراو تصور کرتے ہیں یہ بتا سکیں گے کہ گیٹے، دانتے، شیکسپیر، سروانتیز اور راسین کو ادبی تاریخ میں کون سی جگہ دی جائے؟ عصمت چغتائی، نیاز حیدر، سلام، فکر تونسوی اور مخمور جالندھری سے آگے یا پیچھے؟ انھیں چھوڑئے میں بلا جھجک یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میر، غالب، انیس، اقبال، حالی، پریم چند، سرشار میں سے کوئی بھی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، ہمت یا عبادت بریلوی سے کم مرتبہ رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کسی تھیوری پر ایمان رکھنا اور بات ہے، کسی انقلاب کی رہنمائی کرنا چیز دگر ہے مگر بڑا فنکار اور ادیب ہونے کے لئے یہ عناصر اسی قدر ضروری نہیں جس قدر ایک سیاسی لیڈر کی پلیٹ فارم تقریر، کسی جلسے کے ریزولیوشن اور پھر کسی افسانے یا نظم میں فرق ہے اور اسی فرق سے آج کے بیشتر ترقی پسند فنکار نابلد ہیں۔ یہ تجربات کے فرق کو محسوس نہیں کرتے۔ ان کی مثال لکھنؤ اسکول کے ان شعراء کی سی ہے جن کے تجربے میں صرف پردہ نشین عورت، بوالہوسی اور عیاشی آئی تھی، وہ ہجر، وصل، فراق، رقیب اور بیوفا معشوق کا رونا بار بار روتے تھے تو آپ سرخ ستاروں، سرخ پرچم، سرخ لب اور سرخ شفق کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ طرز بیان ان کا بھی بھونڈا اور عریاں تھا آپ کا بھی ہے۔ عریانی ادب میں بذات خود کوئی بری شے نہیں بشرطیکہ فنی توازن برقرار رہ سکے۔ عریانی برائے اشتہائے جنس یا لذت اندوزی نہیں، بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے! جو کچھ زندگی میں واقع ہوتا ہے سب کا ادب میں آجانا ضروری نہیں۔ زندگی آمیز قدروں کا ادب میں وجود ضرور رہے۔ تحلیل جنسی کے لئے ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو خود نفسانی خواہشات کے شکار نہ ہو بیٹھیں۔ کیا جنسی موضوعات سے بحث کرنے والے بیشتر ادیبوں کو خود جنسی تجزیہ کی ضرورت نہیں ہے؟ ماحول، حالات یا نفسانی خواہشات کا غلام بن کر رہ جانا فنکار تو کیا کسی انسان کے لئے زیبا نہیں اسے تو ماحول سے دست و گریباں ہو کر منوں مٹی کے ڈھیر تلے دب کر ہیرا بن کر نکلنا ہے اور اسی آویزش اور جد و جہد کی عکاسی تجربات زندگی کے طور پر حسین اور فنی شکل میں ادب کے ذریعہ کرنی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند فیض اور بیدی جیسے فنکاروں کو نہ سراہ سکے۔ انھیں فن کا احساس ہے۔ انھوں نے چیزوں کو اس طور پر پیش کیا ہے جیسے انھیں محسوس کیا ہے اور جس طور پر انھوں نے ان کے ذہن میں گھر کر لیا ہے، سرکاری ترقی پسند شعراء میں سے بیشتر نے اپنے خیالات اس طور پر پیش کئے ہیں جس طور پر انھوں نے ان خیالات کو سُن پایا ہے، اخباروں، پارٹی لٹریچروں میں پڑھا پایا ہے، کسی ساتھی کو تقریر کرتے سن لیا ہے یا کسی اشتراکی ادب کے خیالات کے بارے میں کسی نے کہدیا ہے۔ کیا ترقی پسند انجمن کے سنجیدہ نقاد ہمیں یہ بتائیں گے کہ فیض اور بیدی کو وہ ترقی پسندوں کی صف میں کہاں جگہ دینگے؟

——— میں احتشام حسین سے پوچھتا ہوں کہ کیا بہت سارے وہ فنکار جو انجمن سے سرکاری طور پر متعلق نہیں مگر آزادی کی حمایت میں، رجعت پسندی کی طاقتوں کی مخالفت میں عوام کو علم اور کلچر سے آشنا بنانے کے لئے، انسانیت کو سربلند کرنے کے لئے، دنیا کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے، حقیقتوں سے روشناس کرانے اور حالات کے بدلنے پر آمادہ

کرنے کے لئے لکھ رہے ہیں تو وہ ترقی پسند نہیں ؟ آپ کے بیان کی روسے تو وہ ترقی پسند ہوئے مگر سرکاری انجمن انھیں ترقی پسند توکب رجعت پرست مانتی ہے۔ پھر آپ کو کچھ کہنے کے لئے اس کا اعلان کرنا ہوگا کہ آپ کے خیالات ذاتی ہیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے خیالات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو انجمن کے سرکاری جلسوں کی تقاریر، تجاویز اور تحریروں اور آپ کے مضامین کے تضاد کا ذکر کیا جائے۔ میں نے جتنے سوالات کئے ہیں، موضوع کی مناسبت کے خیال سے انکا تفصیلی ذکر مناسب نہیں سمجھا کہیں کہیں جا بجا اشارے کئے ہیں۔ اگر حالات اسی طرح قائم رہے تو تحریک محدود ہو کر صفر رہ جائے گی۔ ادب، زندگی، مقصد، سیاست، کمیونسٹ پارٹی، مواد اور ہیئت میں تفریق کرنا ہوگا اور ان کے باہمی رشتہ کو صرف واضح کرنا نہیں عملی طور پر ظاہر کرنا ہوگا۔

ہر بڑے فنکار کو حیات کے متعلق اپنا زاویۂ نگاہ رکھنا ضرور ہے۔ اسے بنیادی انسانی آدرشوں کا پرچار کرنا ہے۔ مگر اسے پروپگنڈا کا شکار ہو کر نہیں رہ جانا فن پر بھی توجہ دینا ہے تب وہ بڑا فنکار ہو سکتا ہے۔ عریانی اور جنس کو فن کے لئے مقصود بالذات سمجھنا ترقی پسندی کی علامت نہیں۔ صرف واقعہ نگاری کا دوسرا نام ادب نہیں۔ ادیب اور فنکار کو وقتی چیزوں سے اثر ضرور قبول کرنا ہے مگر اسکی تخلیقات کو وقتی بننے سے بچنا ہے۔ یہاں پر اس کی انفرادیت درکار ہے۔ انفرادیت، خارجیت، ماحول، عصریت اور داخلیت ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ یہی وہ چونا، گارا اور سیمنٹ ہے جس پر عمارت ادب کی مستحکم بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ادب کا مواد ہیرے کا ٹکڑا اور ہیئت اس کی تراش ہے جو اسے زینت دستار بناتی ہے۔ مواد خارجی، عصری اور سماجی اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ ہیئت کا تعلق زیادہ تر فنکار کی اپنی شخصیت اور اس مواد کو پیش کرنے کی صلاحیت سے ہے۔ سنگ مرمر کا ایک بیکار ٹکڑا چاہے وہ سنگ مرمر ہی کا کیوں نہ ہو، مٹی کے اس ٹکڑے سے یقینی بہتر نہیں جسے لیونارڈو ڈاونچی، رفائل یا مائیکل انجیلو نے ایک صورت، ایک حسین شکل دے کر لافانی بنا دیا ہو۔ مواد کی حیثیت الہامی نہیں ہونی چاہئے اور نہ فنکار کو ان خیالات کو بار بار دہرانا چاہئے جو متعدد بار دہرائے جا چکے ہیں۔ اسے اپنے خیالات کو جس طور پر وہ محسوس کرتا ہے اپنے انفرادی رنگ میں پیش کرنا ہے تاکہ سب اس کی جانب رجوع ہوں اور پھر اس کا مقصد بر آئے، لوگوں پر اس کا اثر دور رس اور دلپذیر ہو، ہنگامی اور وقتی اور جذباتی نہ ہو۔ محض ایک شعبہ حیات، چند نعرے، چند فقرے اور چند موضوعات پر پہنچنے کا انجام یہی ہو سکتا ہے جو آج اس انجمن کا ہوا۔ موضوعات ختم ہو گئے اور گلا بھی سوکھ گیا۔ انھیں ادیبوں اور فنکاروں نے پانچ سال پہلے جو کچھ لکھا آج وہی اس سے گھٹیا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی دوکان کی رنگا رنگی ختم ہو چکی۔ وہاں تو بے نمک سالن اور ابالی کھچڑی کا پتہ بھی نہیں۔ ادیبوں کو حالات، واقعات اور اصولوں کا غلام ہو کر نہیں رہ جانا۔ اپنی بھی کچھ کہنا ہے۔ انھیں صرف ایک "ازم" یا ایک موضوع سے واقفیت نہیں پیدا کرنی۔ تمام اصولوں بلکہ تاریخ تمدن انسانی، نفسیات، معاشیات، سیاسیات اور مختلف زبانوں کے ادب کا بغور، ٹھنڈے دل سے اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنا ہے۔ فنکار کے لئے نہ تو فطرت اور اس کے ذہن کے بیچ کوئی پردہ حائل ہے اور نہ ہی اس کے اور اس کے شعور کے بیچ کوئی رکاوٹ۔

غلام سرور

ہندوستان کا اولین ریاضی داں

(آریا بھٹ)

آریا بھٹ کے زمانے میں مروجہ زبان جس میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی سنسکرت تھی جس کا اثر ہندوستان پر تقریباً دو ہزار سال تک رہا۔ یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ آریا بھٹ کے پیش رووں یا اس کے ہمعصروں کی تصانیف باضابطہ طور پر نہیں پائی جاتیں بلکہ منتشر صورت میں بعض بعض جگہ ملتی ہیں، آریا بھٹیّہ (Aryabhattiya) اس کی بہت مشہور کتاب ہے۔ شکاگو (امریکہ) کے پروفیسر والٹر کلارک (Walter Clark) آریا بھٹیّہ کے مترجم لکھتے ہیں:۔

"ہندوستانی ریاضی اور علم نجوم سے متعلق سب سے قدیم محفوظ کتاب جس میں سائنٹفک نقطۂ نظر سے علم نجوم اور علم ریاضی کے مسایل نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں آریا بھٹیّہ ہے۔"

یوں تو بہت سے آریا بھٹ ہوئے ہیں لیکن یہاں میرے مضمون کا تعلق صرف ایک آریا بھٹ سے ہے جو قدیم تاریخ کے مطابق سنہ ۴۷۶ء سے سنہ ۵۵۰ء تک تھا، اور حالیہ تحقیق کے مطابق اس کا عہد سنہ ۴۹۹ء سے سنہ ۵۵۰ء تک بیان کیا جاتا ہے۔ آریا بھٹ کے سارے مضامین ایک ہی کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں جس کا نام آریا بھٹیّہ ہے اور یہ سنسکرت نظم میں ہے۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ "گیتکا پد" (Gitika - Pad) ہے۔ دوسرے حصے کا نام "گنت پد" (Ganit - Pad) ہے۔ تیسرے حصہ کو "کل کریا پد" (Kal - Kriya - Pad) اور چوتھا حصہ "گول پد" (Gol - Pad) کے نام سے موسوم ہے۔

پہلا حصہ خدائے برتر کی حمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے اس کے بعد مصنف کا نام، دیباچہ اور آخر میں اس کے حالات زندگی درج ہیں۔ دوسرے حصے میں علم ریاضی کا بیان ہے، تیسرے حصے میں وقت کا اندازہ لگانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور چوتھے حصہ میں کُرَوی علم مثلث (Spherical Trigonometry) کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا پہلا مکمل سنسکرت ترجمہ ۱۸۷۵ء میں پہلی بار ایچ کرن (H. Kern) کی طرف سے ہالینڈ میں لیڈن (Leiden) سے شایع ہوا۔ اس کا دوسرا باب جو علم ریاضی پر مشتمل ہے اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۸۰ء میں ایل۔ روڈٹ (L. Rodet) Lecongi (de calcul d'Arya bhat) کے عنوان سے کیا ہے جس کا نقش ثانی ۱۸۷۹ء میں شایع ہو چکا ہے۔ اس کے سنسکرت ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن مظفر پور (بہار) سے ۱۹۰۶ء میں اودے نراین سنگھ کی ہندی تشریحوں کے ساتھ شایع ہوا۔

اس کے آخر کے تینوں حصے (Sambha Shiva Sastri) تراونکورم کی طرف سے سنسکرت میں جستہ جستہ شایع کئے جارہے ہیں۔ دوسرا حصہ جو گنت پد (Ganit Pad) پر مشتمل ہے، تیسرا حصہ جس میں (Kal-Kriya Pad) کا بیان ہے ۱۹۳۰ء میں شایع ہوئے اور چوتھا حصہ زیر طبع ہے۔

حسب ذیل تین مصنفوں، جی۔ آر۔ کائے (G. R. Kaye) کلکتہ نے قدیم کتابوں کے بہت بڑے دلدادہ ہیں ۱۹۰۸ء میں، پربودھ چندر سین گپتا (Probodh Chandra Sen Gupta) کلکتہ نے ۱۹۲۷ء میں اور (W. E. Clark) شکاگو نے ۱۹۳۰ء میں آریا بھٹیہ کا انگریزی ترجمہ کیا۔

کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مصنف کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنا قطعی طور پر ایک فطری امر ہے جس کی تحریروں نے عالمگیر دلچسپی کا سامان پیدا کردیا اور جس کی کتاب کے بہت سارے تراجم اور اڈیشن طبع ہوئے اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔

—— اگر ہم آریا بھٹ کے ابتدائی حالات کی تحقیق و تفتیش کریں جو ہندوستان کا اولین ریاضی داں سمجھا جاتا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ لوگ اس کے سوانح، اس کی پیدایش اور اس کے کارہائے نمایاں کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ چھٹی صدی عیسوی میں (۴۹۹ء ۔ ۵۰۰ء) پٹنہ میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اسوقت پٹنہ کو "پاٹلی پتر" کہتے تھے، اور یہ گپتا سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ ایک بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے بعضوں نے اسے ہندوستان کا (Rome) کہا ہے۔ پٹنہ میں آریا بھٹ نے ریاضی کا ایک اسکول قایم کیا اور طالبعلموں کی ایک جماعت کو تعلیم دی، اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ غیر ممالک کے مشہور و معروف اہل علم اور مذہبی رہنما علمی پیاس بجھانے کے لئے ہندوستان آئے۔ "پاٹلی پتر" میں مصوری، ادب، سائنس اور مذہب کی اس قدر ترقی ہوئی کہ یہ ہندوستان کا آکسفورڈ (Oxford) کہلانے لگا۔

—— اس سلسلہ میں ہمیں معلوم ہوگا کہ آریا بھٹ نے عدد پڑھنے میں مقامی قیمت (Place value) کا اصول اور نشان کے لئے نقطہ کا رواج کس طرح جاری کیا۔ عدد کا نام مثلاً اکائی، دہائی، سیکڑہ اور اعشاریہ کا پیمانہ (Decimal Scale) بھی وہ استعمال کرتا تھا۔ جذر المربع (Square Root) اور جذر المکعب (Cube Root) کی تفریق کا قاعدہ بھی اس نے ہمیں بتایا اور مثلث کے دریافت کرنے کرہ اور اہرام (Pyramid) کا حجم معلوم کرنے کے قاعدے مقرر کئے۔

(اہرام کا حجم = $\frac{1}{3}$ چوڑائی × اونچائی، کرہ کا حجم = $\frac{44}{21}$ (نصف قطر)۳) اور ثابت کردیا کہ $\pi = 3\frac{177}{1250} = 3.1416$

الٹ پلٹ کرنے کا طریقہ (Method of Inversion) جس کی مثالیں یورپ اور امریکہ میں سولھویں صدی عیسوی میں بہت عام تھیں، آریا بھٹ کا بہت دلچسپ تفریحی مشغلہ تھا۔

مربع مساوات (Quadratic Equation) اور غیر معین مساوات (Indeterminate Equation) کا حل کرنے کا طریقہ اسے معلوم تھا جو اس کے علم نجوم کے مسایل کی تخلیق تھے۔ اس نے حسب ذیل اصول (Formula) استعمال میں لاتے ہوئے علم مثلث کے علامات کا ایک نقشہ طیار کیا۔

$$\text{Sin}(n+1)A\ \text{Sin}\ nA = \text{Sin}\ nA - \text{Sin}(n-1)A - \text{Sin}\ nA\ \text{Cosec}\ A.$$

گرچہ اس اصول میں کچھ نقص تھا لیکن دس صدی قبل اس نے دنیائے ریاضی میں ایک سنسنی پیدا کر دی تھی۔

اس کے مشاہداتی علم نجوم کے مطالعہ پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ موجودہ رصدگاہوں کی صفائی کے بغیر اس نے نتائج متخرج کئے۔ ان نتائج میں ان رصدگاہوں کے نتائج سے بہت تھوڑا فرق ہے جو موجودہ آلات تحقیق و درستگی کی مدد سے تعمیر کیگئی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ زمین، گنبد فلک، آفتاب، ماہتاب اور سیارے کروی ہیں۔ اور اس نے زمین کے قطر کا تخمینہ ۱۰۵۰ Yojans لگایا تھا، نیز ماہتاب کا طولی قطر (Linear Dimeter) ۳۱۵ Yojans ماہتاب کی اصطلاح میں ہر سیارہ کا طولی قطر (Linear Dimeter) یعنی زہرہ، مشتری، عطارد، زحل اور مریخ کا طولی قطر (Linear Dimeter) بالترتیب ماہتاب کا $\frac{1}{5}$، $\frac{1}{10}$، $\frac{1}{15}$، $\frac{1}{20}$ اور $\frac{1}{25}$ تھا۔

اس نے آسمان کا نقشہ بنایا، چھوٹے چھوٹے ستاروں کے مجموعوں، خاص خاص ستاروں اور بروج کا ایک فلک تیار کیا، اس کا خیال تھا کہ خط استوا لنکا سے ہو کر اور مخصوص خط نصف النہار (Prime Meridian) لنکا اور اجین (گوالیار میں اندور کے قریب) سے ہو کر گزرتا ہے۔

اجین کا عرض البلد اس کی پیمایش کے مطابق $۲۲\frac{۱}{۲}$ درجہ شمال میں تھا، لنکا میں شہری ضروریات کے لئے دن کی ابتدا طلوع آفتاب سے اور علم نجوم کی ضروریات کے لئے نصف شب سے شمار کی جاتی تھی۔ علم نجوم کے بعض نتائج جو اس نے اخذ کئے ہیں قابل ذکر ہیں :-

	آریا بھٹ	موجودہ
(۱) طریق الشمس کا جھکاؤ دکھنی جانب	۲۴ درجہ	$۲۳\frac{۱}{۲}$ درجہ
(۲) طریق الشمس پر ماہتاب کے مدار کا جھکاؤ	$۴\frac{۱}{۲}$ "	۵ "
" " مریخ	$۱\frac{۱}{۲}$ "	$۱\frac{۴}{۵}$ "
" " مشتری	۱ "	$۱\frac{۱}{۳}$ "
" " زحل	۲ "	$۲\frac{۱}{۲}$ "

آریا بھٹ (Geocentric Theory) کا قایل تھا، اور اس نے ستیاروں کے حرکات اور ماہتاب کی بے قاعدہ حرکت کو دائروں (Circles) اور (Epicycles) کے مناسب اجتماع یا میل جول کے ذریعہ تشریح کرنا چاہی۔ آریا بھٹ نے یہ خیال ظاہر کر کے کہ زمین اپنے طور پر گردش کرتی ہے جس کی وجہ سے

آسمانی مخلوقات (سیارے وغیرہ) روزانہ طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ زمین کی اس روزانہ گردش سے اس نے علم ریاضی کی ایک نہایت تعجب خیز دریافت یعنی کششِ زمین کے نظریہ کو بطور نتیجہ اخذ کیا اور اس کی توسیع اشاعت کی۔

یہ امر قابل تعجب نہیں کہ آریا بھٹ کی فطری صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں نے تمام دنیا کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا، اس کی کارگزاریوں کے مترتب ریکارڈ اور اس کے نتائج کا صرف سولھویں اور سترھویں صدی کے ماہرین ریاضی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے، جس وقت خوردبین کی ایجاد عمل میں آئی اور قوانین کیپلر (Laws of Kepler) متعین کئے گئے۔ بہرکیف، اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آریا بھٹ نے ایک گراں قدر سرمایہ اور ختم نہ ہونے والی متاعِ بے بہا ریاضی کی تحقیق و تدقیق کے لئے چھوڑی ہے۔ اگرچہ آریا بھٹ ہم میں نہیں ہے لیکن اس کی آریا بھٹیہ نے اسکو غیر فانی بنا دیا ہے۔ (ماخوذ) کلیم سہسرامی

انقلاب حیدرآباد کی داستان پر پہلی کتاب

"مشاہدات"

یعنی

حضرت ہوش بلگرامی

(المخاطب بہ نواب ہوشیار جنگ بہادر)

کے خود نوشتہ سوانح زندگی جو نہ صرف اپنی بلند انشا بلکہ سیاسیات و مذہبیات پر بھی ایک بے لاگ حکیمانہ تبصرہ کے لحاظ سے اپنے رنگ کی بالکل پہلی کتاب ہے۔ جناب ہوش کی عمر کا بڑا حصہ ریاستوں ہی میں بسر ہوا ہے اور ان کی پالٹکس کو مشکل ہی سے کسی نے ان سے بہتر سمجھا ہوگا۔ یوں تو اس میں رامپور، بھوپال، گوالیار، ادے پور، الور، جے پور وغیرہ متعدد ریاستوں کے دلچسپ حالات نظر آتے ہیں لیکن کتاب کا وہ حصہ جو "ریاست حیدرآباد اور اس کے انقلاب" سے تعلق رکھتا ہے، دیکھنے کی چیز ہے کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصود ہی حیدرآباد کی تاریخ پیش کرنا تھا۔ جناب ہوش ایک چوتھائی صدی سے حیدرآباد کی پالٹکس اور دربار عثمانی کے رجحانات کا مطالعہ کر رہے تھے اور نظام کے یہاں ہر وقت کی حضوری کی وجہ سے وہاں کی ان تمام اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے واقف تھے جو کسی دوسرے کے علم میں آ ہی نہ سکتی تھیں ــــ رضاکار تحریک، ارباب حکومت کی سازشیں، سچے مشیروں کی مشکلات، دربار عثمانی کے حیرتناک حالات، سیرت نظام کی عجیب و غریب خصوصیات، پولس ایکشن کی داستان، اور اس کے بعد نظام اور اہل ملک پر اس کا ردّ عمل۔ اگر آپ کو ان تمام واقعات کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو "مشاہدات" ملاحظہ فرمائیے

کاغذ ولایتی، حجم ۷۰۰ صفحات، ۱۰ تصاویر، نفیس جلد، قیمت دس روپے علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

اُردو کا پہلا واسوخت

غالباً حضرت امیر خسرو دہلوی سب سے پہلا مصنف تھے جنھوں نے "ہندوی" زبان میں بتیں سنائیں، گیت گائے پہیلیاں بجھوائیں، دوسخنے بیان کئے۔ ان چیزوں نے بقائے دوام اور قبول عام کا خلعت پہن لیا ہے۔ اگرچہ ان تمام چیزوں کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشکوک سمجھی گئی ہے تاہم اس قدر یقینی ہے کہ ان میں سے کچھ چیزیں انہی کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں۔ موصوف کی پیدائش کا سال سنہ ۱۲۵۳ء اور سن وفات سنہ ۱۳۲۵ء ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اُردو شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اُردو نثر کی ابتدا کب ہوئی اس بات کی تحقیق مشکل ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو نثر میں لکھی گئی اور اب حیدر آباد سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے معراج العاشقین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مذہبی رسالہ کے مصنف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔ خواجہ صاحب سنہ ۱۳۲۱ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۴۲۲ء میں انھوں نے وفات پائی۔ گویا یہ کتاب چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی تھی۔ بہرکیف اُردو زبان کی پیدائش کو کم ازکم ساڑھے چھ سو سال تو ضرور ہوئے۔

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اُردو زبان کی صحیح و مکمل، جامع و مبسوط تاریخ اب تک مرتب نہ ہو سکی۔ اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا، یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ تاریکی میں ہے۔ سب سے پہلا تذکرہ میر نے سنہ ۱۱۶۵ھ (م سنہ ۱۷۵۲ء) میں لکھا جس کا نام نکات الشعرا ہے۔ گردیزی نے بھی اسی سال اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ اُسکے بعد متعدد تذکرے لکھے گئے، مثلاً قایم کا مخزن نکات (سنہ ۱۱۶۸ھ)، میر حسن کا تذکرۂ شعرا (سنہ ۱۷۷۶ء) خلیل عظیم آبادی کا گلزار ابراہیم (سنہ ۱۷۸۳ء)، شفیق کا چمنستان شعرا (سنہ ۱۱۷۵ھ)، مصحفی کا تذکرۂ شعرائے ہندی (سنہ ۱۲۰۹ھ) اور ریاض الفصحا (سنہ ۱۲۳۶ھ)، قاسم کا مجموعۂ نغز (سنہ ۱۲۲۱ھ)، شیفتہ کا گلشن بیخار (سنہ ۱۲۵۰ھ) لطف کا گلشن ہند (سنہ ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء) وغیرہ وغیرہ۔ تذکروں کی فہرست نہایت طویل ہے اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔ ان تذکروں میں خامیاں بہت ہیں۔ ان میں علمی ترتیب کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ تذکرہ نویس حضرات نہ زبان کی ابتدا اور نشو ونما سے بحث کرتے ہیں نہ شعرا کے حالات تفصیل سے لکھتے ہیں، نہ زبان کے ارتقا کے مدارج دکھاتے ہیں نہ شعرا کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان حضرات کو تحقیق و تنقید سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تنقید کا یہ حال ہے کہ اس کو مشاعرے کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ جدید اصول پر سب سے پہلے آزاد نے تقریباً سنہ ۱۸۸۰ء میں آبحیات لکھی، جس میں زبان کی تاریخ سے بھی بحث کی اور شاعری کے مختلف دور قائم کرکے

تدریجی ارتقا بھی دکھایا، شعرا کے حالات بھی ذرا تفصیل سے بیان کئے اور ان کے کلام پر اپنی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق تنقید بھی کی۔ آزاد کی انشا پردازی مسلم ہے، ان کی تحریر میں تمثیلی کیفیت پائی ہے۔ آبحیات میں شعرا چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، مشاعروں میں شرکت کرتے اور شعر پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ خوبی کسی اور تذکرے میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس کتاب میں تاریخی ثقاہت کی بڑی کمی ہے۔ آزاد کے بہت سے بیانات غیر مستند بلکہ بعض محض بے بنیاد ہیں۔ تذکروں میں ایک بڑی فروگذاشت یہ نظر آتی ہے کہ عموماً صرف شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے اور نثر نگاروں کا کچھ ذکر ہے بھی تو اسی قدر جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے، تقریباً پچیس سال کے اندر دکن سے کئی تذکرے شایع ہوئے ہیں مثلاً اُردوئے قدیم، دکن میں اُردو، اُردو شہپارے، ان کتابوں میں قدیم ادبیات اُردو سے بحث کی گئی ہے۔ ارباب نثر میں اُن قدیم اُردو مصنفین کا ذکر ہے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا پنجاب میں اُردو از محمود شیرانی، اس کتاب میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ اُردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی۔ اُردو شہپارے میں ولی کے دور تک کی ادبیات سے بحث کی گئی ہے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا نے سیر المصنفین دو جلدوں میں لکھی لیکن تحقیق سے مطلق کام نہ لیا اور آزاد کی اندھی تقلید میں اُردو کی پیدایش کا غلط نظریہ بیان کیا اور قدیم نثر نگاروں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہ کتاب نثر نگاروں سے متعلق ہے لیکن آب حیات کے ابتدائی صفحات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو میں نظم و نثر سے بحث کی گئی ہے، لیکن ادب شناسوں کے ذوق کی پوری آسودگی نہیں ہوتی کیونکہ تنقید و تبصرہ میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مرزا محمد عسکری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے بہت سی مفید اور قابل قدر باتیں اضافہ کی ہیں، پھر بھی قدیم اُردو لٹریچر کی تاریخ نامکمل رہ گئی۔ اس سے بہتر کتاب ڈاکٹر بیلی کی تاریخ ادب اُردو ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہو افسوس ہے کہ ڈاکٹر بیلی نے بھی متعدد جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے بیانات انتہا سے زیادہ مختصر، نامکمل اور تشنہ ہیں۔ مذکورۂ بالا پنجابی اور دکنی تذکرے بھی جامع اور مکمل نہیں اور ان کے نام ہی سے ان کی حدود متعین ہو جاتی ہے۔

غرضکہ میرا نظریہ اپنی جگہ پر قایم ہے یعنی اُردو زبان کی صحیح و مکمل اور جامع و مبسوط تاریخ کسی نے اب تک نہیں لکھی خمخانۂ جاوید ہے تو بہت مبسوط تذکرہ جو کئی جلدوں میں تمام ہوا ہے لیکن اس کو شاعروں کی فہرست کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اُردو کی جامع اور مکمل تاریخ کی ترتیب و تدوین میں بہت سی دقتیں سد راہ ہیں۔ کتنے مصنفین ہیں جن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں اور جن کی تصنیفیں ہنوز گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ خاصکر صوبۂ بہار کے ارباب ادب کی طرف بہت بے توجہی برتی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اُن تمام قلمی کتابوں کو شایع کر دیا جائے اور ان کے مصنفین کے سنین ولادت و وفات اور دوسری ضروری حالات کی تحقیق کی جائے یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے، اس "ہفتخواں" کو طے کرنے کے لئے رستمانہ جرأت کی ضرورت ہے۔ ابھی تک عوام کو اس کا صحیح علم نہیں کہ پہلا غزل گو اور قصیدہ گو کون تھا، سب سے پہلا رُباعی اور مثنوی کس نے لکھی اور واسوخت کی اولیت کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔ جن شعرا داد بانے کافی شہرت بھی حاصل کرلی ہے اُن میں سے بھی بعض ایسے ہیں جن کی ولادت یا وفات کا صحیح سال معلوم نہیں۔ مثلاً پبلک کو ہنوز معلوم نہیں کہ ولی دکنی کس سال پیدا ہوئے اور کب مرے، میر و سودا، مصحفی و انشا،

تاریخ وآتش کا صحیح سال ولادت کیا ہے۔ بعض شعرا کے سال ولادت و وفات کی تعیین کی کوشش بھی جو کی گئی ہے وہ محض ظنی و قیاسی ہے۔ اسی لاعلمی کا نتیجہ ہے کہ مضمون نگار حضرات اپنے مضامین میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک مجلس ادارہ قایم کی جائے جس کے ارکان اُردو زبان کی تاریخ کا صحیح علم رکھتے ہوں، اُن کی طبیعت میں تحقیق و تنقید کا کافی مادہ ہو، مذاق صحیح اور وجدان سلیم ہو، شعروادب کا ذوق بلند ہو اور انشا پردازی بھی اچھی خاصی ہو۔ اور یہ مجلس ایک ایسی مبسوط تاریخ مرتب کرے جو جامع و مکمل اور صحیح و معیاری ہو۔ لیکن اس اہم خدمت کے سرانجام کی اب توقع نہیں ؎

تہی ساغر حریفاں مست خواب انصاف کو ساقی　　　دل ما ذوق صافی دارد انصاف کو ساقی

اس مقالے میں مجھے واسوخت کی ایجاد سے متعلق کچھ کہنا ہے۔ واسوخت معاملہ بندی کی انتہا ہے، اس میں معشوق سے جلی کٹی باتیں کی جاتی ہیں اور ظلم و ستم سے مجبور ہو کر کسی اور پری پیکر سے دل لگانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ واسوخت کی ابتدا ایران میں ہوئی اور سب سے پہلے وحشی یزدی نے واسوخت لکھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو میں واسوخت کی ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے۔ نگار ۱۹۵۰ء کے اگست نمبر میں محمد حسن صاحب ایم، اے نے واسوخت پر ایک مضمون لکھا ہے لیکن انھوں نے اس مضمون میں واسوخت کی ایجاد سے متعلق کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے، محض آزاد کا قول نقل کرنے پر اکتفا کی ہے کہ واسوخت کے موجد میر ہیں۔ عظیم آباد کے رسالہ معاصر ۱۹۴۲ء کے ستمبر نمبر میں اُردو زبان کے مشہور محقق قاضی عبدالودود بار ایٹ لانے ایک تحقیقی مقالہ بعنوان "اُردو کا پہلا واسوخت" سپرد قلم کیا ہے جس میں واسوخت کی ایجاد سے بحث کی ہے لیکن حسب عادت بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کاش اس مضمون میں کچھ اور کاوش اور تفصیل سے کام لیا جاتا۔ ابھی تک دنیا یہی جانتی تھی کہ اُردو میں سب سے پہلے میر نے واسوخت لکھا۔ لیکن قاضی صاحب نے تحقیق کا قدم آگے بڑھایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو میں واسوخت کے موجد شاہ مبارک آبرو تھے جن کا سال وفات قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۱۶۱ھ ہے۔ میر کی پیدایش غالباً ۱۱۵۲ھ میں ہوئی، گویا میر صرف گیارہ سال کے تھے کہ آبرو نے وفات پائی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جو واسوخت قاضی صاحب نے پیش کیا ہے وہ آبرو ہی کا لکھا ہوا ہے تو ماننا پڑے گا کہ آبرو ہی واسوخت کے موجد تھے۔ قاضی صاحب کے مضمون مذکورہ سے متعلق کچھ اور باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ "میر کے کلیات مطبوعہ میں دو واسوخت ہیں۔ ان کے ابتدائی مصرعے یہ ہیں :-

(۱)　طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے

(۲)　سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو"

لیکن یہ بیان محل نظر ہے کیونکہ جب میں مطبوعہ کلیات پر نظر ڈالتا ہوں تو دو ہی نہیں بلکہ چار واسوخت ملتے ہیں۔ محمد حسن صاحب ایم اے بھی لکھتے ہیں کہ میر کے چار واسوخت نہ صرف ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں بلکہ واسوختوں کے ان تمام مجموعوں میں موجود

ہیں ـــــــ بلکہ واسوختوں کے ان تمام مجموعوں میں بھی شامل ہیں جو اسی دور میں لکھنؤ سے شایع ہوئے تھے۔ میرے پاس کلیات میر کا ایک پرانا نسخہ ہے جو "مطبع نامی منشی نولکشور" میں طبع ہوا تھا، سن طباعت درج نہیں ہے۔ اس میں میر کے چار واسوخت موجود ہیں۔ میں ہر واسوخت کا پہلا بند نقل کر دیتا ہوں:۔

(۱) طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے
داغ رکھنے کو مرے اُن ہی سے گل بازی ہے ہمدمی ان سے انھی سب سے ہم آوازی ہے
گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ
رکتے رکتے روش غنچہ ہوا ہوں دل تنگ

(۲) سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو یاں بہت رہتے ہو خوش باش کہ واں رہتے ہو
ان دنوں یاروں کی آنکھوں سے نہاں رہتے ہو خوش رہو میر مری جان جہاں رہتے ہو
اک طرف بیٹھے ہوئے ہم بھی لہو پیتے ہیں
عشق کی جان کو دیتے ہیں دُعا جیتے ہیں

(۳) یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی سرمۂ و آئنہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکر آراستگی شام و سحر تجھ کو نہ تھی زلف آشفتہ کی سدھ دو دو پہر تجھ کو نہ تھی
شانہ تھا نابلد کوچۂ گیسو تیرا،
آئنہ کاہے کو تھا حیرتی رو تیرا

(۴) ایک دن وے تھے کہ تم کو نہ فریب آتے تھے ادلے سولے بھی مرے آگے اُٹھا جاتے تھے
مدعی کا ہیکو مجلس میں جگہ پاتے تھے چھوتے تھے پاؤں تو پھر سر میں وہی کھاتے تھے
یا تو اب شام و سحر پاس لگے رہتے ہیں
کر کے سرگوشی جو کچھ چاہتے ہیں کہتے ہیں

غالباً اب کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ میر کے چار واسوخت ہیں:۔

آگے چل کر قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ " ایسے شعرا کے کلام کا جایزہ لینے سے جو زمانہ کے اعتبار سے مقدم ہیں حسب ذیل واسوختوں کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) سودا (سال ولادت ۱۱۱۵ھ کے لگ بھگ اور سال وفات ۱۱۹۵ھ) کلیات مطبوعہ (نولکشوری) میں ایک واسوخت ہے:۔

یاالٰہی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال زلف خوباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال

(۲) حشمت (سال ولادت قریب ۱۱۱۰ھ سال وفات ۱۱۶۳ھ) ایک قدیم بیاض میں جو جناب حکیم سید محمد صالح صاحب
ملک ہے اور کچھ کم دو سو سال قبل کی لکھی ہوئی ہے حشمت کا وہ واسوخت ملتا ہے جس کا ذکر تذکرۂ میر حسن میں ہے ۱۔

کیوں رے دل جا ہی پھنسا میں نہ تجھے کہتا تھا　　　عشق ہے دام بلا میں نہ تجھے کہتا تھا

(۳) تاباں (سال ولادت ۱۱۲۵ھ اور ۱۱۳۰ھ کے درمیان۔ وفات ۱۱۶۲ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان) دیوان مطبوعہ
ں ترکیب بند کے نام سے ایک واسوخت درج ہے :-

ہرن مو کے تئیں اپنے زباں کرتا ہوں　　　وا طرح غنچہ کے اب اپنا دہاں کرتا ہوں

(۴) حاتم (سال ولادت ۱۱۱۱ھ سال وفات ۱۱۹۷ھ) دیوان زادہ کے قلمی نسخے میں جو رام پور میں ہے ایک واسوخت
وجود ہے، غلطی سے میں نے اس کا پہلا شعر نقل نہیں کیا۔"

آزاد نے سودا کے متعلق لکھا ہے کہ ۱۱۹۵ھ میں تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ گل رعنا میں بھی اسی کی تقلید کی گئی
ہے۔ اس بنا پر سودا کا سال ولادت ۱۱۲۵ھ قرار پاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر بیلی نے بھی سودا کی پیدائش کا سال
۱۷۱۳ء (م ۱۱۲۵ھ) درج کیا ہے۔ لیکن یہ سب ظن و قیاس ہے۔ سودا کی پیدائش کا صحیح سال پردۂ خفا میں ہے معلوم
ہیں کس بنا پر قاضی عبدالودود صاحب کا اصرار ہے کہ سودا ۱۱۱۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ مضمون کے حاشیہ میں
نھوں نے لکھا ہے کہ یہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات کھٹکتی ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ سودا نے شاہ حاتم
ے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ آزاد کا بیان ہے کہ حاتم نے دیوان زادہ کے دیباچہ میں اپنے پینتالیس شاگردوں کا ذکر
یا ہے جن میں ایک سودا بھی ہیں۔ حاتم کا سال ولادت ۱۱۱۱ھ ہے۔ اب اگر سودا کا سال ولادت ۱۱۱۵ھ کے لگ بھگ
رار دیا جائے تو اس حساب سے حاتم سودا سے عمر میں صرف چار سال بڑے ٹھہرتے ہیں اور یہ بات خلاف قیاس ہے کہ سن کے
یں تفاوت کے باوجود سودا جیسے زبردست شاعر نے حاتم سے اصلاح لی ہو۔ غرض حاتم کی استادی اور سودا کی شاگردی
ی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ پھر بھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سودا کس سن میں پیدا ہوئے تھے۔ جن حضرات کو اس قبیل کی
حقیقات کا شوق ہو اور موقع حاصل ہو اور قلمی و مطبوعہ ماخذ پر دسترس ہو تحقیق کی طرف متوجہ ہو کر قاضی صاحب کے بیان
ی تصدیق یا تردید کریں، یہ ایک مفید کام ہوگا۔

قاضی صاحب نے حشمت کے واسوخت کا ذکر کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قاضی صاحب نہایت اختصار پسند واقع ہوئے ہیں۔
ہ اپنے مضامین میں شعرا کا صرف تخلص درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اکثر غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے۔ تخلص کا یہ حال ہے
ہ وہ کوئی مابہ الامتیاز چیز نہیں، کیونکہ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر ہوتے ہیں مثلاً اکبر الہ آبادی، اکبر دانا پوری، اکبر میرٹھی،
شوق قدوائی، شوق نیموی، شوق سندیلوی۔ نسیم دہلوی، نسیم لکھنوی، نسیم بھرتپوری۔ اس لئے نام کے ساتھ تخلص درج کرنا
لکھ زیادہ محفوظ و مستقیم ہے کہ اس سے اشتباہ و التباس واقع نہیں ہو سکتا۔ حاتم کے معاصرین میں حشمت تخلص کے دو شاعر

تھے، ایک محمد علی حشمت جو میر عبدالحی تاباں کے استاد تھے اور دوسرے محتشم علی خاں حشمت - معلوم نہیں قاضی صاحب کی مراد محمد علی حشمت سے ہے یا محتشم علی خاں حشمت سے، اور حکیم صالح صاحب کی بیاض میں جو واسوخت درج ہے وہ اول الذکر کی تصنیف ہے یا ثانی الذکر کی۔ مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں لکھتے ہیں کہ "میر حسن نے بھی محتشم علی خاں حشمت کے مشہور واسوخت کا ایک بند بھی اسی طرز (سودا کی طرز) میں ہے نقل کیا ہے :۔ " حاسداں تم کو جدا بیٹھ کے بہکاتے ہیں " میر حسن کا تذکرۂ شعرا میرے پاس موجود نہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اُس واسوخت کو محمد علی حشمت کی تصنیف بتایا ہے یا محتشم علی خاں حشمت کی۔ قایم نے مخزن نکات میں دونوں کا ذکر کیا ہے لیکن محتشم علی خاں کی نسبت وہ لکھتے ہیں :۔ " از مردان مشاہیر بود گاہ گاہ دو سہ شعر ریختہ و فارسی با کمال تازگی می گفت " اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے شاعر تھے اور اُردو میں کبھی کبھی دو تین شعر کہہ لیتے تھے۔ لہذا یہ بات تحقیق طلب ہے کہ جو واسوخت تذکرۂ میر حسن میں منقول ہے وہ کس حشمت کی ملک ہے۔

قاضی صاحب نے حشمت کا سال وفات ۱۱۶۳ھ لکھا ہے، معلوم نہیں کون حشمت، محمد علی یا محتشم علی خاں ؟ — اگر محمد علی حشمت مراد ہیں تو اُن کا سال وفات ۱۱۶۳ھ نہیں ہے بلکہ ۱۱۶۱ھ ہے۔ ثبوت میں اُن کے شاگرد رشید تاباں کے نوحۂ مخمس کا آخری بند ملاحظہ ہو :۔

تیرا تاباں غریب و خستہ جگر   فکر تاریخ میں تھا حد مضطر

مصرع آخری پہ کی جو نظر   کہہ ہے[۲۴] ہاتف نے اُسکو دی خبر

ہائے حشمت شہید وا ویلا

۱۱۳۷ × ۲۴ = ۱۱۶۱ھ

اور اگر حشمت سے محتشم علی خاں مراد ہیں تو بھی ان کی تاریخ وفات ۱۱۶۳ھ محل نظر اور محتاج ثبوت ہے۔ قایم نے مخزن نکات ۱۱۶۸ھ میں مرتب کیا (یہی تذکرہ کا تاریخی نام بھی ہے)۔ اس کتاب میں درج ہے " قبل ازیں ہفت سال بہ مرگ دفعتاً ازجہاں رفت او تعالیٰ رحمتش کناد " اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کا تقریبی سال ۱۱۶۱ھ ہے نہ کہ ۱۱۶۳ھ۔

قاضی صاحب کا خیال ہے کہ تاباں کے مطبوعہ دیوان میں " ترکیب بند کے نام سے ایک واسوخت درج ہے " لیکن دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو نظمیں اور بھی اسی قبیل کی ہیں جو تضمین کے عنوان سے چھپی ہیں اور ان نظموں کا انداز بھی واسوخت ہی کا ہے۔ میں دونوں نظموں کا ایک ایک بند پیش کرتا ہوں :۔

(۱) میں تیرے عشق سے از بسکہ کفر میں آیا   طریق مسجد و بت خانہ ایک سا بوجھا

تمام خلق نے مشہور ملحدوں میں کیا   دیا ہے قتل کا قاضی نے بھی مرے فتویٰ

بجرم عشق توام میکشند و غوغائے ست   تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائے ست

(۲) نازک اندام تجھے دیکھ ہوا میں مفتوں عقل اور ہوش کو کھو نام رکھا یا مجنوں،
زور پھبتی ہے ترے بر میں قبائے گلگوں اس کے تئیں جھوٹ تو مت جان میں سچ کہتا ہوں

شمع گر با تو کند دعوئے نازک بدنی
کشتنی سوختنی باشد و گردن زدنی

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ "آزاد کا دعویٰ ہے کہ اُردو میں پہلا واسوخت میر تقی میر نے لکھا ہے - لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ جب ایسے شاعروں کے واسوخت موجود ہیں جن کی شاعری کا آغاز میر کی شاعری سے پہلے ہو چکا تھا تو میر کے واسوخت کو زمانی حیثیت سے مقدم سمجھنے کی کیا وجہ ہے"۔

اُردو شعرا میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کا سال تصنیف نہیں درج کرتے، اس لئے یہ بات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ کون غزل یا کون نظم کس سن میں لکھی گئی - قاضی صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ میر کے دوسرے واسوخت کا پہلا شعر (سچ کہو شہر میں) میر حسن کے تذکرے میں نقل کیا گیا ہے اور یہ تذکرہ ۱۱۸۶ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا ہے اس لئے اس واسوخت کے زمانۂ تصنیف کی آخری حد متعین ہو جاتی ہے - لیکن میں کہتا ہوں کہ اولیں حد تو متعین نہیں ہوئی - یہ کیونکر مانا جائے کہ یہ واسوخت ۱۱۸۶ھ سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا - میر ایک فطری و وہبی شاعر تھے، انھوں نے یقیناً بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا ہوگا - اگر میر کی ولادت ۱۱۳۵ھ میں ہوئی تو کیا یہ ممکن نہیں کہ انھوں نے بیس پچیس ہی سال کی عمر میں واسوخت لکھا ہو اور دوسرے شعرا نے جو میر سے بیس پچیس برس بڑے بھی ہوں ان کی تقلید کی ہو - حاتم، حشمت، تاباں اور سودا میر سے عمر میں یقیناً بڑے تھے لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ پہلے میر نے واسوخت لکھا ہو اور ان شعرا نے ان کی تقلید کی ہو - یہ کوئی عیب کی بات نہیں کہ ایک مسن شاعر ایک کمسن شاعر کے تتبع میں کوئی نظم لکھے - حاتم عمر میں انعام اللہ خاں یقین سے تقریباً بیس پچیس سال بڑے تھے، مگر انھوں نے یقین کی کئی غزلوں پر غزلیں لکھیں - ناسخ عظیم آبادی آتش سے سن میں بڑے تھے، لیکن انھوں نے آتش کی ایک غزل پر تضمین کی - حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی سر اقبال سے عمر میں بڑے تھے مگر انھوں نے آخر عمر میں اقبال کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے تتبع میں جدید رنگ کی متعدد نظمیں بھی لکھیں - لہذا یہ بات کوئی مستبعد یا ناممکن نہیں کہ میر نے واسوخت کی ابتدا کی ہو اور حاتم، حشمت، تاباں اور سودا نے ان کی تقلید کی ہو - میں صرف امکان سے بحث کر رہا ہوں، ثبوت نہیں دے سکتا - زمانی حیثیت سے مؤخر ہونے کی بنا پر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ میر نے حاتم وغیرہ کے بعد واسوخت لکھا جب تک کہ قطعی ثبوت نہ مل جائے - اتنی بات تو قاضی صاحب بھی مانتے ہیں کہ "عجب نہیں کہ میر پہلے شاعر ہوں جس نے واسوخت مسدس کی شکل میں لکھا ہے" کیونکہ حاتم وغیرہ کے واسوختوں کے ہر بند میں چھ کے بجائے آٹھ آٹھ مصرعے ہیں -

اب رہ گئے شاہ مبارک آبرو - آبرو کا واسوخت حکیم صالح صاحب کی ایک قلمی بیاض میں پایا جاتا ہے - قاضی صاحب کا بیان ہے کہ یہ بیاض کچھ کم دو سو سال کی لکھی ہوئی ہے (غالباً ۱۱۶۵ھ اور ۱۱۷۰ھ کے مابین لکھی گئی ہوگی) اور اس بیاض

میں ایک اور واسوخت "سوز و گداز" کے عنوان سے کسی نامعلوم شاعر کا لکھا ہوا ہے جو حاتم اور آبرو کا معاصر معلوم ہوتا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے :-

دوستاں شرح مرے حال پریشانی کی   گوش کرنا یہ حکایت ......[1] ہجرانی کی

معلوم نہیں یہ واسوخت کس شاعر کا ہے اور یہ شاعر کس زمانہ میں تھا۔ اہلِ ذوق حضرات اس کی تفتیش کریں تو بہتر ہے۔ بہرکیف آبرو کے واسوخت کے متعلق مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ قاضی صاحب کے قول کے مطابق آبرو کے دیوان کے دو نسخوں میں یہ واسوخت موجود نہیں۔ بہرحال اگر یہ واسوخت فی الواقع آبرو ہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے تو انھیں کو واسوخت کا موجد ماننا پڑے گا۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ مسدس کی شکل میں سب سے پہلے میر ہی نے واسوخت لکھا۔

قاضی صاحب آخر میں فرماتے ہیں کہ " یہ بیاض جابجا سے کرم خوردہ ہے اور اس میں املا و کتابت بھی بکثرت ہیں مزید یہ کہ صاحب بیاض نے صریحاً واسوخت کو نامکمل نقل کیا ہے۔ آخری شعر کے بعد بیاض میں سادہ جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ دوسری بیاض سے (یہ واسوخت ایک اور قلمی بیاض میں بھی موجود ہے) مقابلے کی کوئی صورت اس وقت نہ نکل سکی "

قاضی صاحب کی تحقیق لائق ستائش ہے لیکن ضرورت ہے کہ کوئی صاحب ذوق مزید تحقیق کر کے اس واسوخت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ چونکہ معاصر قلیل الاشاعت رسالہ تھا اور اس کی اشاعت عموماً صرف کالجوں تک محدود تھی اور نگار ایک قدیم اور کثیر الاشاعت رسالہ ہے اس لئے مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں کہ آبرو کے واسوخت کو نقل کر دوں تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے اور مزید تحقیق کی کوئی صورت نکل سکے۔

(۱)
یارب اب حال مرا صبر سے در گزرا ہے   دل مرا صبر جو کرتا تھا سو کر گزرا ہے
سر کو شمشیر تلے ظلم کے دھر گزرا ہے   دل قیامت سوں ترے ہجر کے بھر گزرا ہے
جیوتے جان کفن غم سوں پہر گزرا ہے   بلکہ سو بار ترے واسطے مر گزرا ہے
اب نہیں تاب مجھے اشک سوں چپ رہنے کی   .... ظلم و ستم سہنے کی

(۲)
روز اول کہ ترا کوئی خریدار نہ تھا   .... یہ چرچا شور یہ بازار نہ تھا
کسی کو زلف تری سوں یہ سروکار نہ تھا   کسی کے دل منے اے یار ترا پیار نہ تھا
تیری نرگس کے کوئی شوق سوں بیمار نہ تھا   ....
اک ہمیں تھے کہ کبھی تجھ پہ نظر کرتے تھے   گاہ گاہے ترے کوچہ میں گزر کرتے تھے

---

[1] یہ جگہ کرم خوردہ ہے شاید "غم ہجرانی" ہو۔ ولی

(۳) شوق نے دل کے ہمارے تجھے معشوق کیا،　　ہو کے مشتاق ترا رے تجھے معشوق کیا
نار کی طرح پیار سے تجھے معشوق کیا　　بوجھ تو کن نے پیار سے تجھے معشوق کیا
سب طرح تجھ کو سکھائی تجھے معشوق کیا　　کیا برا تیرا کیا رے تجھے معشوق کیا
نہیں اور تجھ سے کئی خوار پڑے پھرتے تھے　　بر سر کوچہ و بازار پڑے پھرتے تھے

(۴) دل میں تو بوجھ اول کن نے تجھے پیار کیا　　جیو کو دے ہاتھ ترے کن تجھے دل دار کیا،
کس کی نظروں کے سبب حسن وانکار کیا　　تری کن نے تجھے دل دار کیا
باغباں ہو کے کنے تجھکو چمن زار کیا　　کن کھلا کر کے تجھے حسن کا گلزار کیا
اب تجھے شوق ہوا غیر سوں جا ملنے کا　　اب تو پھر اور سے ہر وقت مزہ ملنے کا

(۵) رات کو دیکھ کے اے یار ترے طور مجھے　　اپنے احوال کے دل بیچ ہوا غور مجھے
یاد ہے وہ ترے سب ظلم و ستم جور مجھے　　غم نے آ گھر کیا اے جان برے دور مجھے
جیو میں بھی آیا تھا اُس وقت میں کچھ اور مجھے　　ایک اک پند کہ آتا تھا کبھی فی الفور مجھے
ایسے اک بند کو میں ورد زباں کرتا ہوں،　　پڑھ کے پھر بھی اسی اک بند کو میں مرتا ہوں

(۶) آہ افسوس مرا یار مجھے بھول گیا　　غیر سے مل کے ستمگار مرا بھول گیا
جان اور بوجھ کے اب حال مرا بھول گیا　　درد اور شوق اور آزار مرا بھول گیا
محنت و رنج کا بستار مرا بھول گیا　　آہ یہ حال اُسے یک بار مرا بھول گیا
جیو میں آتا ہے کہ اُس یار سوں جا کر رہئے　　یا زمیں کھود اسی شرم سوں جا گڑ رہئے

(۷) ہم جو جب پاس تمھارے اے سجن آتے تھے　　دیکھ کر ہم کو گویا جان سا تم پاتے تھے
جوں نہ آتے تھے کبھی آپ بلواتے تھے　　دیر کرتے تھے تو لے آپ کو پہنچاتے تھے
بیٹھ کر پاس ہمیں پیار سے پھسلاتے تھے　　ہر طرح ساتھ منا کر بھی لے جاتے تھے
منتیں کر کے نہیں چھوڑتے تھے راتوں کو　　اک گھڑی بیٹھ کے کہتے تھے سجن باتوں کو

(۸) اب وہ اخلاص محبت کی طرح بھول گئے　　چھپ کے ملنے کی وہ خلوت کی طرح بھول گئے
ہم نشینی کی وہ صحبت کی طرح بھول گئے　　پیار کی ناز کی الفت کی طرح بھول گئے
مہربانی کی وہ شفقت کی طرح بھول گئے　　غیر سوں مل کے محبت کی طرح بھول گئے
اب وہ انکھیاں ترے لے یار وہ ابرو بھی نہیں　　وہ جو اخلاص تھا دل کا کہیں اب بو بھی نہیں

(۹) جان جاتے ہو تو تم ہم ستی بے دل جاؤ　　گرچہ جانا ہے ضروری تو گلے مل جاؤ

دُنیا کے مہاجرین

تارکین وطن کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے نیا ہو، لیکن یوروپ اور مشرق وسطی یورپ کے لئے نیا نہیں - یہودی مصر سے نکالے جانے کے بعد آج تک مہاجرین کی حیثیت رکھتے ہیں اور اہل یوروپ کی ہجرت کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہاں کی سائنسی دور تہذیب نے غلط راستہ اختیار کرکے استعماریت کی بنیاد ڈالی اور حکومتوں نے ایک دوسرے کو باہر نکالنے کی کوشش شروع کی - لیکن مہاجرین کا مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ پہلی جنگ عظیم کے بعد سامنے آیا کیونکہ اس نے متعدد حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور وہاں کی آبادیوں کو خانماں برباد ہو کر اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔

ذیل کے نقشہ سے آپ کو مختلف ممالک کے مہاجرین کی تعداد کا اندازہ ہو سکے گا۔

روس = سنہ ۱۹۲۲ء میں = ۱۷ اور ۲۷ لاکھ کے درمیان

سنہ ۱۹۳۰ء میں = ۵ اور ساڑھے ۵ لاکھ کے درمیان

سنہ ۱۹۳۶ء میں = ساڑھے تین لاکھ سے زاید اور اگر اس میں مشرق بعید کے روسی مہاجرین بھی شامل کئے جائیں تو ساڑھے چار لاکھ سمجھئے -

آرمینیا = سنہ ۱۹۲۴ء میں = ۲ لاکھ ۵ ہزار

سنہ ۱۹۳۰ء میں = ۲ لاکھ ۱۰ ہزار

سنہ ۱۹۳۶ء میں = ۲ لاکھ ۲۵ ہزار - ان میں سے تقریباً ایک لاکھ ۴۳ ہزار نے شام اور لبنان میں سکونت اختیار کرلی

اسپین = سنہ ۳۹ء میں = ۴ لاکھ -

اٹلی = سنہ ۳۹ء میں = ایک لاکھ ۹۰ ہزار

جرمنی = سنہ ۳۸ء میں = ۳ لاکھ ۵۰ ہزار

دوسری لڑائی کے بعد دنیا کے تقریباً ۸۰ لاکھ انسانوں کو ترک وطن کرنا پڑا۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں متحدہ اقوام نے مہاجرین کے بسانے کے لئے ایک اسوسی ایشن قایم کی، اس نے مہاجرین کی امداد پر ۳۶۸۲۵۸۳۲۳۹ ڈالر خرچ کئے۔

غذا پر اور دوسری ضروریات پر = ۲۹۷۵۱۳۴۹۹۵ ڈالر

کپڑوں پر = ۴۱۹۰۷۴۰۰۰ ڈالر

دواؤں پر = ۱۱۶۲۲۹ ڈالر

نقل و حمل اور اشاعت = ۵۹۰۰۲۱۰۰۴۰ ڈالر

۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو جب یہ اسوسی ایشن ختم ہوئی تو اس کی امداد کا اندازہ یہ تھا:-

جرمنی میں	=	۲۳۰۵۹	مہاجرین
آسٹریا میں	=	۱۶۹۸۳	"
اٹلی میں	=	۲۶۰۰۵	"
وسطی شرقی یورپ میں	=	۲۶۶۰۵	"
چین میں	=	۱۰۱۴۹	"

پہلی جولائی ۱۹۴۷ء کو اس ادارہ کا انتظام بین الاقوامی تارکین وطن کی انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب اس نے امداد کا اعلان کیا تو ۱۶ لاکھ درخواستیں اسے موصول ہوئیں ـــــ پہلی جولائی ۱۹۴۷ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۹ء تک اس نے ۷ لاکھ مہاجرین کو دوبارہ بسایا، ۶۷ ہزار کو ان کے وطن واپس کیا، ۱۰ لاکھ سے زیادہ کے عارضی قیام کے لئے کمپ بنائے اور ۶۲۲۰۰۰ مہاجرین کو ریل اور جہازوں کے ذریعہ سے ۸۰ ملکوں میں پہونچایا ـــــ لیکن اسی زمانہ میں مہاجرین کی تعداد اور بڑھتی گئی۔ کیونکہ چین میں ۴۰۰ شہر برباد ہوئے اور وہاں کی ایک کروڑ آبادی خانماں برباد ہوگئی۔

ہندوستان میں تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ آدمی ترک وطن پہ مجبور ہوئے۔

یہودیوں کی حکومت اسرائیل فلسطین میں قایم ہوئی تو دس لاکھ عربوں کو ہجرت کرنا پڑی۔

اینگلو امریکن بلاک اور روسی بلاک نے یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ۱۵ لاکھ آدمیوں کو مشرقی بلاک سے مغربی بلاک کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ برما، ملایا، انڈونیشیا کے تارکین وطن کی صحیح تعداد کا حال معلوم نہیں، لیکن یقینی ہے کہ وہاں بھی انکی تعداد بہت زیادہ ہے ـــــ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۹ء تک (۲۷ مہینوں میں) بین الاقوامی تارکین وطن کے ادارہ نے تقریباً ۶۲۲۰۰۰ مہاجرین کی مدد کی۔ ان میں سے ۱۱۸۶۲۰ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں دوبارہ آباد کئے گئے اور ۱۱۴۱۱۹ یہودی حکومت اسرائیل میں بسائے گئے۔ ۸۲۶۲۵ برطانیہ میں، ۵۱۸۰۰ کناڈا میں، ۳۶۵۲۵ فرانس میں، ۲۶۲۵۵ ارجنٹائن میں، ۲۲۲۰۵ برازیل میں، ۲۲۱۰۶ بلجیم میں، ۱۳۳۴۳ وینزویلا میں اور ۳۲۲۴۱ دوسرے ملکوں میں آباد کئے گئے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے اخیر تک ۳۵۰۰۰۰ مہاجرین کو اور آباد کیا جائے گا اور اس طرح پانچ سال میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ تارکین وطن کو بسایا جا سکے گا۔ اس میں چین، انڈونیشیا، برما، انڈوچائنا، ہندوستان، پاکستان، فلسطین، یونان اور ان دوسرے ملکوں کے مہاجرین شامل نہیں ہیں جن کا تعلق اس ادارہ سے نہیں ہے۔

آرٹ کی ماہیت اور آغاز

آرٹ زندگی اور کائنات سے متعلق انسانی تجربات کا حسین اظہار ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں آرٹ کی ابتدا جمالیاتی احساس کے بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ ہوئی ہے۔ لیکن آرٹ کی دُنیا ہماری آپ کی دنیا کا عکس ہوتے ہوئے بھی کچھ نئی معلوم ہوتی ہے۔ ہماری خارجی اور باطنی زندگی کے مراحل سے گزر کر، زندگی کے مختلف تقاضوں سے اکتساب حرارت کرتے ہوئے آرٹ ہمیں جن کیفیتوں سے آشنا کرتا ہے وہ ہمارے علم اور تجربے کی حدوں میں ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئی ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ آرٹ میں ہمیں زندگی کی عام حقیقتوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن انسانی ذہن کا تخلیقی عمل انھیں تراش کر نئی نئی شکلوں میں ڈھالتا رہتا ہے اور انفرادی تجربے کی تازگی اور گہرائی انھیں نئی معنویت اور توانائی عطا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے فنی تجربہ فطرت سے مستعار ہوتے ہوئے بھی بلند تر معنویت کا حامل ہے اور اسی لئے آرٹ کو عام تنقیدی نظریے کے مطابق محض زندگی کی تنقید یا تعبیر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فنی تجربے کی جڑیں زمان و مکان کی گہرائیوں میں پیوست ہیں لیکن فنی تخلیق ایک نئی اور بہتر حقیقت کی دریافت ہے۔

زندگی کے اعلیٰ تجربے کی حیثیت سے آرٹ کا وجود فنکار سے سنجیدگی اور گہرائی کا تقاضا کرتا ہے وہ سنجیدگی اور گہرائی جس میں ساری کائنات فنکار کے ذہن کے لئے خام مواد بن جاتی ہے جس سے وہ حسیاتی پیکر تراشتا ہے۔ اس لمحہ موضوع کے تاثرات فنکار کے شعور کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور تخلیقی جذبہ بن کر ابھرتے ہیں۔ اسی لئے تخلیق کے اس لمحے میں صدیوں کے تجرباتِ زندگی جھلکنے لگتے ہیں۔

آرٹ کا موضوعِ بیان ہمیشہ انسان رہا ہے۔ اگرچہ ٹرنر ([illegible]) کا قلم اور ورڈزورتھ ([illegible]) کی شاعری اکثر مقامات پر عالمِ فطرت کو پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو خالص فطرت کے نظاروں میں بھی ہمیں انسانی تجربۂ حیات کے کسی خاص لمحے یا کسی خاص ذہنی کیفیت کی جھلک مل جائے گی۔ اس لحاظ سے فن خواہ خارجی حقایق کی ترجمانی کرے یا داخلی کیفیات کو پیش کرے، بہر حال انسانی زندگی سے متعلق رہتا ہے اور اس لحاظ سے انسانی امنگوں، آرزوؤں اور حسرتوں کا کسی نہ کسی جہت سے ترجمان بن جاتا ہے۔ وہ فنکار جو کسی نقطۂ نظر کے قایل نہیں ہیں اور زندگی کو جس صورت میں دیکھتے ہیں، پیش کر دینے کے حامی ہیں ان کے یہاں بھی کسی نقطۂ نظر کی کارفرمائی مل جاتی ہے۔ اس لحاظ سے خارجیت نگاری بھی ایک نقطۂ نظر بن جاتی ہے جو زندگی کی موجودہ صورت کو بدلنا نہیں چاہتی بلکہ اسے

اسی طرح قایم رکھنے کی قابل ہے۔ لیکن یہ خارجیت نگاری اپنے حدود میں کبھی بے لاگ نہیں رہنے پاتی اور اس میں جگہ جگہ ذاتی رجحان کی جھلک مل جاتی ہے۔ زندگی کی ساری داستان سے چند ٹکڑوں کا انتخاب ہی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ فنکار نے کچھ چیزوں کو بیان کرنے کے قابل پاکر چن لیا ہے اور باقی کو غیر اہم جان کر چھوڑ دیا ہے لیکن جہاں اہمیت کا سوال آجائے وہیں یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب تک فنکار کے ذہن میں اہم یا غیر اہم کا کوئی مفہوم متعین نہ ہو یعنی وہ زندگی کی بعض قدروں کو دوسری قدروں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ فنکار نے شعوری طور پر ان قدروں کو سمجھا ہو اور اپنے نقطۂ نظر سے خود بھی باخبر ہو۔ لیکن دانستہ یا غیر دانستہ اسکا نقطۂ نظر اس کی ذہنی تخلیقات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایمل زولا (Emil Zola) اور نظیر اکبرآبادی جیسے بڑے خارجیت نگار بھی اپنے فن پاروں کو ذاتی احساسات سے غیر متعلق نہیں رکھ سکے ہیں۔ ایمل زولا کی خارجیت نگاری کم از کم اس کی دو ناولوں "Abbe Mourat's Transgression" اور "The Dream" میں مدہم ہوکر صرف انداز بیان کی حد تک باقی رہ گئی ہے۔ لیکن موضوع کی دل آویزی اور رنگینی میں صاف اس کے نقطۂ نظر یا افتادِ طبع کی جھلک ملتی ہے۔ اسی طرح نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی دنیا میں جو انسان سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی کے تمام ہنگاموں میں شریک ہونے کے باوجود منفرد ذہن رکھتا ہے اور اپنے گرد و پیش کا اسی انفرادی انداز میں جایزہ لیتا ہے۔ اسی داخلی احساس کی شعوری لے کبھی تیز ہوکر فنکار کو خارج سے بے نیاز بھی کردیتی ہے۔

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما　　　(حافظ)

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندارِ من است　　　جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من،　　　چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است　　　(اقبال)

کہاں کا میخانہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دو بے خودی کو　　　یہی بنائے گی جام و ساغر یہی کرے گی شراب پیدا　　　(جگر)

حقیقت یہ ہے کہ فطرت اور خارجی حقایق انسانی ذہن میں بجنسہ منعکس نہیں ہوتے ہیں۔ گزرے ہوئے پچھلے واقعات کے نقوش، ماثل تصورات، حال کی کیفیتوں اور ملتی جلتی ذہنی تصویروں کے علاوہ زندگی کی طویل راہوں میں آغاز حیات سے لے کر حال تک جو نشانات ملتے ہیں وہ بھی فطرت سے حاصل کردہ تاثرات کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فطرت اور خارجی حقایق سے انکار کردیا جائے، یا انھیں محض داخلی ذہن کا کرشمہ سمجھ لیا جائے۔ انکا وجود اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے اور اگر ہم انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا اور فنون لطیفہ کے آغاز پر غور کریں تو ہم پر کھل جائے کہ دراصل ہمارے شعور کی پرورش بھی خارجی حقایق اور عالمِ فطرت کے آغوش میں ہوئی ہے۔ اس لئے آج بھی فطرت کے مظاہر ہمارے جذباتی تصورات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ بائرن (Byron) کہتا ہے کہ میں صرف میں

نہیں رہتا ہوں بلکہ اپنے گردوپیش کا جزو بن جاتا ہوں اور میرے لئے اونچے پہاڑ بھی جذبات کا کام کرتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ فطرت فنکار کے لئے ہمیشہ ایک اہم اور وسیع موضوع رہی ہے - لیکن آرٹ میں فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو سمجھ لینا ہے کہ مشاہدۂ فطرت میں مشاہد کی شخصیت بھی کارفرما ہے جس کے بالواسطہ نظام سے فطرت اثر قبول کرتی ہے - اسی حقیقت کو حال کی ایک شاعرہ Alice Meynell نے اپنی ایک نظم "To any poet" میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے - وہ شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے :-

Sing thy sorrow, sing the gladness
In thy songs must wind and tree
Bear the fictions of thy sadness
Thy humanity

فطرت اور فنکار کی وابستگی بہت قدیم ہے - فن محض انفرادی تجربہ نہیں ہے - اس میں سماج اور فطرت کی جلوہ گری کے علاوہ ہزارہا سال کی انسانی زندگی کے نقوش بھی قدم قدم پر ملتے ہیں - اس آئینہ خانہ میں انسانوں کی تہذیبی زندگی کلچرل روایات، معاشرتی تعلقات اور معاشی حقیقتیں عکس فگن نظر آتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ انسانی تہذیب کی پہلی جھلک بھی ہمیں فنونِ لطیفہ کی کرنوں سے منور نظر آتی ہے اور زندگی کے گرد آرٹ کی قوس قزح رنگ و نور کا طوفان لئے ہوئے ہے لیکن اس کی ابتدا قبل تاریخ کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی ہے اور اسے سمجھنے کے لئے ہمیں انسانوں کی ابتدائی معاشرت کا جایزہ لئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے -

ذہنِ انسانی اپنے ارتقائی سفر کے دوران میں تہذیب کی بہت سی منزلوں سے گزرا ہے اور اس نے اکثر روایت کی گھنی چھاؤں میں دم لے کر آگے بڑھنے کی نئی طاقت کا احساس بھی کیا ہے - اس لحاظ سے انسانی زندگی ایک تجربہ ہے مسلسل اور غیر منقطع ———— جس کا رشتہ بقائے حیات کی اولین کوششوں سے قایم کیا جا سکتا ہے - دراصل اس کرۂ ارض پر انسان کی پیدایش فطرت کی معجزانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تکمیل کی جانب پہلا قدم بھی ہے اور انسانی زندگی نے زمانۂ قبل تاریخ سے آج تک جو منزلیں طے کی ہیں ان کے خوشگوار اجالے میں ہم صدیوں کی تہذیب کا رقص دیکھ سکتے ہیں - تاریخ کے تال اور آہنگ پر رقص کرتے ہوئے اکثر زندگی نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دی ہے اور اسکے حسنِ بے حجاب کی کارفرمائیوں نے جس طرح دورِ وحشت یا قدیم و جدید پتھر اور دھات کے انسانوں کو اپنا دلدادہ و شیدا بنایا ہے اسی طرح آج مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش محفل کو بھی جگمگایا ہے اور تابانی بخشی ہے - وہ مقام جہاں زندگی کے چہرے سے نقاب سرک جاتا ہے اور اس کے حسنِ بے باک کی نور افشانی میں کوئی حجاب مانع نہیں رہتا، آرٹ کی جلوہ گاہ ہے اور یہاں زندگی گردشِ چشم کے اشارے پر زمین اپنی گردشیں سمیٹ لیتی ہے، زمان و مکان کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں اور حیات و

کائنات ایک نقطہ پر سمٹ آتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسانوں نے پہلی بار جب چند کھینچی ہوئی لکیروں، جسم کی کچھ مسلسل حرکتوں اور آوازوں کے اُتار چڑھاؤ کے مجموعوں میں تناسب اور توازن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کی کسی محسوس حقیقت کی جھلک دیکھی ہوگی تو دم بخود رہ گئے ہوں گے اور اسے کسی عظیم و پرہیبت طاقت کا پرتو سمجھ کر سر جھکا دئیے ہوں گے۔ اسی لئے قدیم انسان کا احساس جمال ٹونے ٹونکے اور جادو کے تصورات و توہمات کا پابند رہا تھا۔ چنانچہ قدیم انسان جہاں ہمیں ایک جانب فطرت کی عظیم طاقتوں کے سامنے سربسجود ملتا ہے وہاں اس کے آرٹ میں بھی ہمیں مافوق الفطرت عناصر سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں خیر و شر اور رحم و غضب کے پیکر سمجھ کر وہ کبھی مدد کا خواہاں ہوتا ہے اور کبھی رحم کا طالب۔ اس طرح انسان کے ان فوق الفطری تصورات میں ہمیں اس کے تخیل کی کارفرمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ دراصل اس کے جسم کی ساخت نے جہاں اسے خطرات سے بھری دنیا میں غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا وہاں اسے عقل کا استعمال بھی سکھایا تھا اور اس کے تخیل کی جولانگاہوں کے لئے بھی وسیع میدان فراہم کیا تھا۔ پھر اس کے دونوں ٹانگوں کے بل سیدھے کھڑے ہونے اور ہاتھوں کے آزاد رہنے کی وجہ سے نہ صرف اسے زندگی کی جدوجہد میں مدد ملی بلکہ اس کا ذہن گرد و پیش کا جایزہ لے کر مختلف نتائج اخذ کر سکا اور ان نتائج کو بیان کرنے کے لئے ہر لحظہ ترقی پاتی ہوئی آوازوں کا سہارا لیا گیا جس نے آخر کار زبان کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح زبان ایک سماجی ورثہ بن جاتی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ نوعِ انسانی میں منتقل ہوتا اور ترقی پاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ زبان جہاں سماجی ضرورتوں کی ترجمانی کرتی ہے وہاں رقص، موسیقی، مصوری اور بت گری کے پہلو بہ پہلو انسان کے جمالیاتی احساس کا اظہار بھی ہے۔ اسی کی مدد سے اس نے اپنی فتحمندی کے گیت گائے، فطرت کی وحشی طاقتوں کو رام کرنے کے منصوبے سوچے اور دل کی دھڑکنوں کو وسیع و بےکراں فضاؤں میں منتشر کیا۔

وقت آہستہ خرامی سے گزرتا گیا اور رفتہ رفتہ دجلہ و فرات کی وادی اور ہڑپا و موہن جو دڑو کے میدانوں میں دریائے نیل کے کنارے کنارے اور یونان، مصر، و بازنطینیہ کی آبادیوں میں شورشِ حیات کا نغمہ گونج اُٹھا۔ ان محفلوں میں زندگی کے مغنی نے آرٹ کے جو گیت گائے ہیں ان میں انفرادی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ اس وسیع کائنات کی تھرتھراہٹ بھی شامل ہے۔ اس لئے ان گیتوں میں معاشرت کی سادگی اور احساس کی معصومیت کے ساتھ ساتھ آسمانوں کی بلندی، مرغزاروں کی شادابی اور آبشاروں کا ترنم بھی ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ذہن نے روزِ آغاز ہی سے فطرت کے نرم و نازک جلووں اور اس کے ہیبت ناک و پرعظمت مظاہر سے حسن و جمال کا درس لیا ہے اور اس کا احساسِ جمال فطرت کی رعنائیوں اور عظمتوں سے وابستہ رہا ہے۔ اس نے بادل کو بدلتے ہوئے رنگوں اور تبدیل ہوتی ہوئی حالتوں میں دیکھا ہے، سمندر کے جوش میں آنے کا مشاہدہ کیا ہے اور اسے طوفانوں کے جلال کا اندازہ ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں، ہرے بھرے گھاس کے میدانوں اور ریگ زاروں کے غیظ اور سناٹے میں جو ہزار ہا کیفیتیں پوشیدہ ہیں انسانی ذہن کبھی ان سے بیگانہ نہیں رہ سکا ہے۔ اس لئے یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ہمارا جمالیاتی احساس کلیتاً ایک نفسی تجربہ ہے یا اس کا دور و نزدیک پھیلی ہوئی کائنات سے بھی کوئی علاقہ ہے ؟ -

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی دلکشی دیکھنے والی نظروں کو ازل سے اپنے دام میں گرفتار کرتی رہی ہے ۔ چنانچہ صبح کی زرنگار سرخی شام کے سرمئی دھندلکے اور شب کی پراسرار تیرگی نے انسانی ذہن پر ہمیشہ جادو سا کیا ہے ۔ اکثر تاروں بھری رات کی خموشیوں اور چاندی کے سیلاب میں اس نے فضاؤں سے سرگوشیاں کی ہیں ۔ ان دھیمی اور مبہم سرگوشیوں نے آرٹ کے مختلف روپ بدلے اور اپنے لافانی احساس میں آخرکار دوسروں کو بھی شریک کرلیا ۔

اپنی مختلف خارجی شکلوں میں آرٹ نے ایک سماجی حیثیت اختیار کرلی ۔ اس طرح تمدن کی ان ابتدائی منزلوں میں جہاں تاریخ کے قدم بھی لڑکھڑانے لگتے ہیں ، شکار کے بعد کے جلسوں ، کھلیان بھرے جانے کی خوشی میں رقص و سرود کی محفلوں اور رات کو الاؤ کے گرد جمگھٹوں میں فنونِ لطیفہ کا آغاز ہوتا ہے ۔ لیکن یہ آرٹ توہمات کے چھائے ہوئے بادلوں کے باوجود کھلی فضاؤں اور سورج کی جاں بخش کرنوں کی ضیاؤں سے قریب تر ہے اس لئے اس آرٹ میں فطرت کی ساری دل کشی اور رعنائی گھل ملجاتی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رگوید مقدس کے گیتوں اور زبور کے سہانے نغموں کو چمکتے سورج کا سونا اور بہتے دریا کی چاندی تابانی بخشتی ہے ۔

قدیم انسان کے شعور کی پہلی انگڑائی حیرت تھی ۔ حال کے غیر یقینی حالات ماضی کی پرصعب راہوں اور مستقبل کے دشوارگزار تصور نے انسان کے ذہن پر تحیر کی کیفیت طاری کردی تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ ازل اور ابد کے درمیانی وقفہ سے گزرتا ہوا وقت بھی اپنے جلو میں ہزاروں مسایل لایا تھا ۔ موت اور حیات کی الجھنوں کو بھی انسان کے ناخن تدبیر کو حل کرنا تھا ۔ لیکن ابھی تک اس کا ذہن اس قدر خام کار تھا کہ تخلیق کے راز کو نہ سمجھ سکا تھا ، موسم کی تبدیلیوں کا واضح ادراک نہ رکھتا تھا اور ہر خوشگوار یا ناخوشگوار طبعی و غیرطبعی تبدیلی کو دیوتاؤں کے رحم و غضب سے تعبیر کرتا تھا ۔ لیکن زندگی کی تڑپ اور اس کے امکانات نے خارجی حالات کی بے رحم جبریت سے سازکرکے اپنے جال انسانی ذہن کے گرد بننا شروع کردئے تھے ۔ وقت کا پہیہ برابر گردش کررہا تھا اور تہذیب و مدنیت کی اولین منزلیں طے ہوتی جارہی تھیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی خواہشوں ، امنگوں اور آرزوؤں کی جنگ خارجی حالات کے خلاف شدید ہوگئی تھی کبھی اسے سارے عالم میں ایک بے رحم طاقت کارفرما نظر آتی تھی جو اس کی بہترین آرزوؤں کو پامال کردیتی تھی اور اسے گلشنِ حیات سے نشاط کی کلیاں نہیں چننے دیتی تھی ۔ کبھی اس بے پناہ طاقت کے روبرو اس کا سر عبودیت اور عقیدت کے انداز میں جھک جاتا تھا اور کبھی والہانہ سرشاری اور وارفتگی کے عالم میں اس کے دل کی گہرائیوں سے جو نغمہ بلند ہوتا تھا وہ اس طاقت کے دل کش مظاہر کی محبت اور تعریف میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا ۔ اس طرح انسان نے فطرت کی دلکشی اور رعنائی میں گم ہوکر جیالیاتی حیرت کا جو پہلا درس لیا تھا وہ اسے ذہن کے اس پراسرار دھندلکے کی جانب لے گیا جہاں علم کی راہیں پوری طرح روشن نہیں ہوتی ہیں ۔ پھر بھی زندگی کی جدوجہد اور بقائے حیات کی ہر کوشش کے ساتھ جہاں بہت سے نئے مسایل ابھرتے جارہے تھے وہاں کئی پرانی الجھنیں سلجھ بھی گئی تھیں اور زندگی کی ہر نئی منزل انسانی علم و یقین میں اضافہ کرتی جارہی تھی ۔

غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے انسان نے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر رہنا سیکھا تھا اور جنگلی پھلوں کی تلاش میں یا جانوروں کے شکار کی خاطر گھومتے پھرتے اسے ایک جگہ مل جل کر معاشرتی زندگی گزارنے کا سلیقہ آیا تھا۔ اب تک انسان کی حیثیت اس وسیع کرۂ ارض پر ایسے غیر اہم حیوان کی تھی جو خوراک کی تلاش میں جگہ جگہ مارا مارا پھرتا ہے اور جسے آسانی سے دوسرے قوی الجثہ جانور اپنی غذا بنا لیتے ہیں لیکن انسان کی مسلسل کاوشوں سے پانسہ پلٹ گیا اور وہ جو اب تک فطرت کی ناز برداری میں مصروف تھا فطرت اس کے ناز اٹھانے لگی۔ اب سے تقریباً چھ سات ہزار سال قبل جب انسان نے مستقلاً ایک جگہ قیام کرکے زرعی زندگی شروع کی تھی تو اس نے گویا منظم اجتماعیت کی جانب پہلا قدم اٹھایا تھا۔ ہماری آج کی تہذیب بہت کچھ اس پہلے قدم کی رہین منت ہے۔ اس وقت پہلی بار انسان کو خیال ہوا تھا کہ خارجی ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول کو بھی سماجی زندگی کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور یہی خیال تہذیب کی ابتدا ہے یہیں سے معاشرت میں سماجی یکجہتی (Social Solidarity) کی بنیاد پڑتی ہے اور تسخیر کائنات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ انسان نے اس معاشرت میں نہ صرف زرعی آلات، پودوں اور جانوروں کی کاشت پر توجہ کی بلکہ موسیقی، رقص، ڈراما اور شاعری بھی کسی نہ کسی شکل میں پروان چڑھتی رہیں۔

اس دور کی ذہنی تخلیقات کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں اس عہد کے رسم و رواج کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اس وقت جب ریاست کسی باقاعدہ شکل میں قائم نہیں تھی یہ ضروری تھا کہ انسانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے تحفظ کی خاطر انھیں رسوم کی کڑی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تاکہ اجتماعیت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ اس لئے انسان نے سماجی ضرورتوں کے تحت اپنے افعال کو رسموں کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور رواج کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح اس کی انفرادی آزادی اجتماعی مفاد کی پابند ہو گئی تھی اور اصلیت یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ہی انسان کی انفرادی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ورنہ خانہ بدوشی یا زرعی زندگی کے ابتدائی دور میں انسان بہت کم قبیلے یا خاندان کی زندگی سے غیر متعلق ہو کر سوچتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی سرداری کی خاطر یا خوبصورت عورتوں کے لئے کشت و خون کر سکتا تھا لیکن وہ ہر حالت میں خود کو قبیلے کی زندگی سے وابستہ سمجھتا تھا اس لئے تہذیب کے ابتدائی دور میں انسانوں کے نفسیاتی اور جمالیاتی محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ان کی معاشرتی زندگی میں روایات، رسمیات، اور مذہبی یا نیم مذہبی اثرات کی اہمیت کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اجتماعی روح کا پرتو نظر آتا ہے اسی طرح عبادت اور مذہبی رسوم کی بھی ان کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ فصلیں بوئی جانے سے پہلے زمین کی شادابی کی خاطر اجتماعی طور پر مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ اسی طرح فصلیں کاٹے جانے کے بعد خوشیاں منانے میں سب شریک ہوتے تھے اور دیوتاؤں کے حضور میں اپنی شکرگزاری کے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ دھرتی کے ان بیٹوں کی نظر ہمیشہ آسمان پر رہتی تھی اور بارش کا پہلا چھینٹا ان میں نئی زندگی پیدا کر دیتا اور انھیں نئی امنگ اور سرشاری بخشتا تھا۔ اسی طرح قحط کے دنوں میں یا ناکافی بارش کی وجہ سے ان کے دل کے کنول مرجھا جاتے تھے اور وہ لرزتے ہوئے قدموں اور کانپتی ہوئی آواز میں اپنے دیوتاؤں سے رحم کی التجا کرتے تھے۔ ان کی خوشی اور غم کا پیمانہ محدود تھا جو ذرا سی موسم کی تبدیلی سے بھر جاتا اور چھلک اٹھتا تھا لیکن انکا زندگی

سے قریب حقیقی تھا اور انھیں آج کے انسان کی طرح جھوٹی خوشیاں اور موہوم غم پریشان نہیں کرتے تھے۔ ان کا تخیل لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے سائے میں پروان چڑھتا اور گیہوں کے سنہرے خوشوں کی ضیائیں جذب کرتا رہتا تھا۔ ان کے افکار میں ان کی زندگی کی حقیقتیں جھلکتی تھیں۔ قبیلوں کے الگ الگ دیوتاؤں کا وجود اس امر کا شاہد تھا کہ تہذیب ابھی ابتدائی حالت میں تھی لیکن ایک ہزار سال قبل مسیح جب اسرائیلی تہذیب میں توحید کا عقیدہ آیا تو انسانی سماج نے بڑی حد تک منظم وحدت کی شکل اختیار کر لی تھی اور انسانی تصور رفتہ رفتہ سلجھ کر خدا اور کائنات کے متعلق ایک واضح اور مربوط نظریہ قایم کر رہا تھا۔

آج کے انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ اگر اسے کسی سنسان اور غیر آباد جزیرے میں رہنا پڑ جائے تو بھی وہ اپنی ذہنی تخلیقات جاری رکھ سکے۔ کیونکہ اس کے پاس روایات کا لامحدود ذخیرہ ہے۔ انسانی محسوسات کے متعلق اس کا علم کافی وسیع ہے اور پھر مختلف جذبات واحساسات کا اسے ذاتی تجربہ ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ اسے آرٹ کے واضح طریقۂ اظہار سے بھی آگاہی ہے جس کی مدد سے وہ احساس اور اظہار کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی اور تنہائی میں بھی اس کی روح کا کرب یا ذہن کا لاوا کبھی کسی واضح شکل میں پھوٹ نکلے اور آرٹ کے اعلیٰ سانچے میں ڈھل جائے۔ اس کے برخلاف ابتدائی انسان کے متعلق جسے ابھی سماجی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے آرٹ کی تخلیق کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (حالانکہ انسانی زندگی میں ایسے وقت کا قیاس بھی مشکل نظر آتا ہے)۔ ہاں جب سے انسانوں نے گروہ بنا کر خانہ بدوشی کی زندگی شروع کی تب سے آرٹ کے کسی واضح تصور کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے متعلق انسان کا احساس حیرت یا وہ کیفیتیں جنھیں وہ اس وسیع کرۂ ارض پر وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہا ہے، بذاتِ خود آرٹ نہیں ہیں جب تک کوئی مناسب ذریعۂ اظہار ڈھونڈھ کر معرضِ اظہار میں نہ آجائیں۔ اور اظہار کی حیثیت ہمیشہ سماجی رہی ہے۔ اس لئے آرٹ سے پہلے ہمیں سماجی زندگی کا وجود فرض کرنا پڑتا ہے جہاں انسان کسی نہ کسی شکل میں اپنی باتیں دوسروں کو سمجھاتا اور ان کی باتیں خود سمجھتا ہے۔ انسان تو خیر ایسا جانور ہے جسے سلسلۂ ارتقاء نے دوسرے حیوانات سے ممتاز کر دیا ہے، وحشی جانوروں کے وہ ریوڑ بھی جو اکھٹے زندگی گزارتے ہیں اپنی ضرورت کی خاطر چند آوازوں کا تعین کر لیتے ہیں۔ ان بدلتی ہوئی آوازوں کی خصوصیت سے ان کے جنسی جذبے، رنج اور غصے یا کسی آنے والے خطرے کے اشارے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اس لئے جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے ہم بغیر کسی شک کے مان سکتے ہیں کہ اس کی ابتدائی آوازیں بھی اس کے ماحول کے تقاضوں کا بے ساختہ اظہار تھیں اور ان میں مفہوم کو ادا کرنے کی قوت پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ انسان کی ضروریات ان آوازوں کو ماحول اور سماج کے مطابق نئی نئی شکلوں میں ڈھالتی رہیں۔ آوازوں کی ان ہی ترقی پاتی ہوئی شکلوں نے باقاعدہ طور پر زبان کا نام پایا جسے انسان کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ آوازیں جانوروں کی آوازوں سے اس لئے مختلف تھیں کہ ان میں انسان کے شعور کی جھلک تھی اور اس کے احساس و تجربے کے ساتھ ساتھ ان آوازوں میں ہر لحظہ ترقی اور تغیر ہوتا رہتا تھا۔

اس لحاظ سے زبان کی ترقی اور نشو و نما میں انسان کی جسمانی ساخت خصوصاً اس کے ہونٹ، دانت، زبان، تالو، حلق،

گردن کی رگیں اور پھیپھڑوں کی بناوٹ نے آواز پر قابو پانے میں کافی ساتھ دیا ہے۔ رفتہ رفتہ زبان جس کی ابتدا سماجی زندگی میں خیال کے اشارے کی حیثیت سے ہوئی تھی انسان کے ترقی پاتے ہوئے شعور کا عکس بن گئی۔ انسانی علم کی طرح زبان بھی ہمیشہ ترقی پذیر اور تغیر پسند رہی ہے۔ جب بھی اسے جکڑنے اور محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے سرچشموں سوتے خشک ہو گئے ہیں زبان کی ارتقاء سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تہذیب اور کلچر کا ایوان آباد ہو گیا بلکہ انسان میں موجوداتِ عالم کی حقیقت اور ماہیت جاننے کی خواہش بھی بیدار ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان انسانی جذبات اور احساسات کا آئینہ بن گئی۔ کارزارِ حیات میں مرد اور عورت کے بے قید اور بے موسم کے ساتھ نے جنسی طور پر مرد کی فاعلیت اور عورت کی انفعالیت سے ساز کر کے نیاز و ناز کے ہزاروں راگ چھیڑ دیئے۔

انسانوں کی تہذیبی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس کے دوسرے بڑے کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ کارنامہ تحریر کی ایجاد تھی۔ جس کے بغیر معاشرت کا وجود مستحکم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تحریر کی اولین صورتوں سے بحث نہیں، تصویری خطوں کے ذریعہ یا مختلف اشکال کے طور پر جس طرح بھی تحریر کی ابتداء ہوئی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی ایجاد نے نہ صرف روایات، قانون اور ریاست واضح شکل دیدی بلکہ انسانی جذبات کو بھی ایک معین سانچہ مل گیا جس کی مدد سے وہ ایک حد تک وقت کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہو گئے۔ یعنی اب ادب کی مدت حیات انسانی حافظے کی جلد ہی اُلٹ جانے والی بساط نہ رہی تھی بلکہ خود ادب کے حیات بخش عناصر اس کی زندگی متعین کرتے تھے۔ سالہا سال گزر جانے کے باوجود آج بھی یونانی ادب دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کیونکہ اس میں انسان کے عہدِ طفلی کی سادگی جھلکتی ہے۔ جیسے کائنات نے شرمیلی دلھن کی طرح پہلی بار اس ادب کے آئینہ میں اپنی آنکھیں کھولی ہوں۔ یونانی ادب حیات کی عشوہ سامانیوں کے متعلق پہلا رچا ہوا احساسِ جمال ہے۔ جس میں احساس کی تازگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اسی لئے سفوکلیس (Sophocles) کی شاعری میں بلبل کا نغمہ اچھوتی تھرتھراہٹوں کا حامل ہے۔

قدیم انسانی سماج میں شاعری کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ کا وجود بھی اپنی ابتدائی شکل میں مل جاتا ہے جس میں شاید سب سے زیادہ قدامت رقص کو حاصل ہے۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی دونوں زبان کی پیدائش کے بعد کی چیزیں ہیں لیکن رقص میں جسم کی حرکات ہی اظہار کا واحد ذریعہ بن جاتی ہیں۔ رقص اور موسیقی دونوں وسیلوں سے دیوتاؤں کے حضور میں انسان نے اپنے احساسِ عبودیت کا اظہار کیا ہے۔ اسی لئے رقص اور موسیقی عبادت میں شامل رہے ہیں۔ جس کا سلسلہ مندر کی دیوداسیوں اور کلیسا کی کنواریوں تک چلتا ہے۔ انسانوں کی تہذیبی ترقی کے دور میں مذہبی کرداروں اور دیومالاؤں کو بھی خاص خاص موقعوں پر پیش کیا جانے لگا تھا جسے ہم اسٹیج کی پہلی منزل کہہ سکتے ہیں جس نے بعد میں ڈرامانگاری کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں موسیقی اور ڈرامہ نگاری بھی شاعری کا سہارا لیتی رہی ہیں اس لحاظ سے فنونِ لطیفہ میں شاعری کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ شاعری کا تعلق ہمیشہ انسانوں کے شعورِ نغمہ سے رہا ہے اور شاعری و غنائیت کا یہ ربط باہمی آج بھی باقی ہے۔

حنیف فوق ایم۔ اے

باب الاستفسار

رویتِ ہلال

(جناب عبدالعلی محسن علی صاحب - مندسور)

رویتِ ہلال پر آپ نے نگار میں اظہار خیال فرمایا ہے یا نہیں، اس کی مطلق خبر نہیں، لہذا اسی کے متعلق چند باتیں دریافت کرکے زحمت دے رہا ہوں۔ براہِ کرم معاف فرمائیں

پیروانِ اسلام میں بہ استثنائے فرقہ شیعہ اسماعیلیہ باقی تمام حضرات سال، ماہ اور ایام کی تعیین کے لئے عینی مشاہدۂ ہلال پر یقین رکھتے ہیں فقط مذکورۂ بالا فرقہ ہی ایسا ہے جو حساب سے برسوں قبل کے مہینے اور تاریخ معلوم کرلیتے ہیں۔ رویت ہلال کی حمایت میں بطور ثبوت جو حدیث نبوی پیش کی جاتی ہے اس سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو تعیین تاریخ ایسے زبردست اور ضروری مسئلہ کا محض چاند کے مشاہدہ پر ہی منحصر ہونا اسلام ایسے مذہب کے لئے جو کہ نوع انسانی کے لئے باضابطہ نظام حیات پیش کرنے کا مدعی ہے نہایت ہتک آمیز بات ہے۔ زمانۂ موجودہ میں جبکہ سائنس اور فلکیات کی ترقی کا یہ عالم ہو کہ ہیئت داں برسوں قبل دور دراز سیاروں اور ستاروں کی رفتار معلوم کرکے ان کے نظر آنے کا وقت بتا دیتے ہیں تو پھر تعیین تاریخ جیسا معاملہ رویتِ ہلال پر موقوف رکھنا کہاں تک مناسب ہے۔ فرقۂ شیعہ اسماعیلیہ (جماعت بوہرہ) کے پاس اتنا مکمل حساب تعیین تاریخ قمری کا ہے جو ہمارے لئے نہایت مفید و کارآمد ہو سکتا ہے تو پھر کیوں تمام مسلمان اس حساب پر اتفاق نہ کرکے آج بھی اسی صدیوں کے پرانے طریقے اڑے ہوئے ہیں۔

اس مسئلہ پر براہِ نوازش مذہبی و سائنسی نقطۂ نظر سے بالتفصیل بحث فرما کر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں۔

(نگار) مذہب کے مسایل پر سائنس کے نقطۂ نظر سے غور کرنا، سائنس کی خدمت تو خیر ہو ہی نہیں سکتی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ مذہب کی بھی خدمت نہیں، کیونکہ مذہب کا مقصود صرف اخلاق کی اصلاح ہے اور سائنس کو اس کی صحت کا معیار قرار دینا کبھی مفید نہیں ہو سکتا جبکہ خود سائنس کے نتائج بھی یقینی نہیں۔

اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ سائنس کے مسایل پر روشنی ڈالنے آیا ہے لیکن اس نے ہر شخص کو غور و تفکر کی دعوت دیکر

اس کی اجازت ضرور دیدی ہے کہ انفرادی طور پر وہ علوم وفنون حاصل کرے، بشرطیکہ یہ ترقی اخلاق کو خراب کرنے والی نہ ہو اور اسی لئے اجتماعی مسائل میں اس نے سائنس کے درخور کو کبھی پسند نہیں کیا کیونکہ اس طرح اصولی اختلافات اور تشتت وانتشار کا اندیشہ تھا۔

رویت ہلال کا مسئلہ بھی اجتماعی مسئلہ ہے اور اس میں اُلجھن پیدا کرنا مناسب نہ تھا، اس لئے اس کو نہایت سادہ طور پر اس طرح طے کر دیا کہ جب ۲۹ کو چاند نظر آجائے تو سمجھ لو کہ مہینہ ختم ہو گیا اس اُلجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ مطلع ابر آلود تھا یا نہیں یا یہ کہ ریاضیات فلکی کی رو سے اس کی رویت فلاں دن ضرور ہونا چاہیئے۔

ایک مہینہ کا اختتام اور دوسرے مہینہ کا آغاز متعین کرنے کے لئے یہ اتنا سادہ طریقہ تھا کہ اس کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا تھا اور آپس میں کسی اختلاف کی گنجایش نہ رکھتا تھا۔ آپ غالباً یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی تقریبات ساری دنیا میں ایک ہی دن منائی جائیں لیکن یہ ممکن نہیں۔

زمین چونکہ کروی شکل رکھتی ہے اس لئے چاند اور سورج کے طلوع وغروب کے اوقات اس میں ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتے۔ جس وقت آفتاب یہاں غروب ہوتا ہے امریکہ میں طلوع ہوتا ہے اور اس طرح تقریباً ایک دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے اگر تاریخ قمری کا آپ کے یہاں کوئی مکمل حساب ہو تو بھی دن کا اختلاف تو ضرور ہوگا اور آپ کا یہ مقصود کہ کسی تقریب کو تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی دن منائیں کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں کوئی ضرورت اس کی محسوس نہیں ہوتی کہ رویتِ ہلال کے مسئلہ میں فلکیات سے کام لیا جائے۔

آج کل رویتِ ہلال کے باب میں تار اور ریڈیو کی خبروں پر بھی اعتماد کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی کوئی مناسب طریقہ نہیں کیونکہ اس سے بھی مسئلہ کی سادگی پر اثر پڑتا ہے۔

اگر مختلف مقامات کے تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر عیدین کی نماز ادا نہیں کر سکتے، تو اس میں کیا حرج ہے کہ مختلف مقامات کے مسلمان مختلف دنوں میں اسے ادا کریں جبکہ اس طرح اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کی سادگی بھی قائم رہتی ہے اور غرہ ومحاق کے حسابات سمجھنے پر بھی عوام مجبور نہیں ہوتے۔

باؤرے نین

(جناب اکرم دھولیوی)

ہندی میں "باؤرے نین" بڑی کثرت سے مستعمل ہے۔ اُردو یا فارسی میں اتنی ہی رنگین و برجستہ ترکیب کی مجھے تلاش ہے۔ "متوالی آنکھ" اور "چشم خمار آگیں" میری نظر سے گذرے مگر تسلی نہ ہو سکی، اگر آپ کی نظر میں کوئی اور ترکیب ہو تو مطلع کیجئے۔ عین کرم ہوگا۔

(نگار) اُردو میں "آنکھ" سے متعلق محاورات تو سیکڑوں ملتے ہیں لیکن اس کی صفات بہت کم نظر آتی ہیں، اور جو صفات ہیں بھی تو

ان کا تعلق زیادہ تر فارسی سے ہے۔

نین آنکھ کے معنے میں قدماء کے یہاں مستعمل تھا، لیکن بعد کو ترک کر دیا گیا، حالانکہ ایسے سبک لفظ کو ترک نہ کرنا چاہئے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ "باؤرے نین" بڑی پیاری ترکیب ہے، یہاں تک کہ خود ہندی میں جو چند مخصوص و متعین صفات آنکھ کی مستعمل ہیں، ان میں بھی اس ترکیب کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ "باؤرے نین" کے علاوہ "مدبھرے نین" اور "چنچل نین" بھی ہندی میں بکثرت مستعمل ہیں، لیکن شاید "باؤرے نین" سے بہتر نہیں۔

اُردو میں آنکھ کی صفت شرابی، متوالی اور موہنی بھی استعمال کی گئی ہے جو نسبتاً ہندی سے ترکیبوں سے قریب تر ہے، اُردو میں آنکھ کے معنی میں فارسی لفظ چشم بکثرت استعمال کیا گیا ہے، لیکن ہمیشہ ترکیب کے ساتھ۔ تنہا لفظ چشم بغیر کسی ترکیب کے آنکھ کے معنے میں اُردو ادب میں کہیں نظر نہ آئے گا۔ یعنی یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "اس کی چشم اچھی ہے" یا "اس کی چشم نے مجھے مار ڈالا" بلکہ ایسے مواقع پر ہمیشہ آنکھ ہی کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔ فارسی میں البتہ چشم کے لئے اتنے صفاتی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ شاید ہی کسی اور ادب میں نظر آئیں۔

ان صفات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم ان کی تقسیم کرنا چاہیں تو "دُنیائے کمیت وکیفیت" کی شاید ہی کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے شعرائے فارسی نے چشم کی صفات متعین کرنے میں کام نہ لیا ہو۔

فارسی میں لفظ چشم، آنکھ اور نگاہ کے علاوہ امید کے معنے میں بھی مستعمل ہے۔ (غالب کا مصرعہ ہے :- خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم)، لیکن ہمیں اس مفہوم سے بحث نہیں صرف آنکھ اور نگاہ کے مفہوم کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہے کہ اس کی صفات میں کن کن جدتوں سے کام لیا گیا ہے۔

وہ ترکیبیں جن کا تعلق دُنیائے حیوانات سے ہے ان میں زیادہ تر آہو کو سامنے رکھا گیا ہے مثلاً آہو فریب - آہو گیر - آہو بچہ - آہو انداز - جانوروں میں شیر کو بھی لیا گیا ہے جیسے شیر شکار و شیر گیر لیکن کم۔

اس سلسلہ میں شکاری چڑیوں کی طرف بھی ان کا خیال گیا اور شہباز و تیز جنگ کی ترکیبیں اختراع کی گئیں۔ کیڑے مکوڑوں میں سے انھوں نے صرف زنبور سرخ کو تشبیہ کے لئے منتخب کیا۔

جنگ وقتال اور اسلحۂ جنگ کو سامنے رکھ کر انھوں نے البتہ بہت سی صفات ایجاد کیں مثلاً : تیر انداز - کماندار - ناوک افگن - خونریز - خونخوار - قاتل - ظالم - غارتگر - مردم آزار - مردم کُش، یہاں تک کہ نمرود، ضحاک اور فرعون بھی۔

سحر و ساحری کے سلسلہ میں - جادو وش - جادو فریب - جادو فن - فسوں ساز - ہاروت - چاہ بابل وغیرہ کی ترکیبیں استعمال کی گئیں۔

پھولوں میں البتہ صرف ایک نرگس کو لیا اور اس پر خوب خوب طبع آزمائی کی۔ مثلاً :- نرگس بیمار - نرگس گویا - نرگس لالہ رنگ - نرگس نیم خواب - نرگس مستانہ - نرگس خواب آلود - نرگس فتنہ زا وغیرہ وغیرہ - نیلگوں آنکھوں کے لئے نیلوفر کو سامنے

رکھ کر شعلۂ نیلوفری کی ترکیب اختراع کی۔ پھلوں میں بادام کے سوا انھیں کوئی اور چیز نہیں ملی۔ شراب و متعلقات شراب کو سامنے رکھ کر بہت سی صفات پیدا کی گئیں۔ مثلاً :۔ مست ۔ سیہ مست ۔ نیم مست ۔ مخمور ۔ خمار آلو ۔ بادہ پیما ۔ میگوں ۔ مے پرست ۔ پیمانہ ۔ ساغر ۔ شیشہ ۔

کیفیاتی تشبیہات بھی فارسی میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً :۔ شرگیں ۔ شرم آلود ۔ حجاب آلود ۔ خوش نگاہ ۔ طناز ۔ دل آشوب ۔ تغافل شعار ۔ سخن گو ۔ دلبر ۔ دلفریب ۔ ناتواں ۔ بیمار وغیرہ ۔

یہ تو وہ صفات ہیں جن کا تعلق معشوق کی آنکھ سے ہے۔ عاشق کی آنکھ کی جو صفات فارسی میں پائی جاتی ہیں، ان میں زیادہ تنوع نہیں ہے، زیادہ تر اشک و گریہ کو سامنے رکھا گیا ہے :۔

پُرآب ، نم زدہ ، ژالہ بار ، گہر بار ، گہر فروش ، دُرفشاں ، دجلہ بار ، خونبار ، خونفشاں ، اشکبار ، طوفانی ، طوفاں خیز وغیرہ

کیفیات کے لحاظ سے بھی بعض صفات وضع کئے گئے مثلاً :۔

حیران ۔ حیرت آلود ۔ حسرت نشان ۔ گراں خواب وغیرہ ۔

اب رہا آپ کا اصل سوال کہ باورے نین کے انداز کی کوئی ترکیب اردو فارسی میں کیا ہو سکتی ہے، سو اس کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں "متوالی آنکھ" اور فارسی میں چشم مخمور، چشم مست، چشم سیہ مست، کی ترکیبیں "باورے نین" سے زیادہ ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں ۔

زندگی کی قدریں

(جناب سید محمد حسنین صاحب ۔ فیض آباد)

آجکل لٹریچر میں اکثر "اقدارِ حیات" کا ذکر سننے میں آتا ہے۔ ازراہِ کرم مطلع فرمائیے کہ یہ کیا چیز ہے اور موجودہ زمانہ میں کون سے اقدارِ حیات کام کر رہے ہیں ؟

(نگار) نوعِ انسان کے زندگی کی ضروری قدریں کیا ہیں ؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہر قوم کی قدریں مختلف ہوتی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، تاہم اچھی غذا، اچھی صحت، زندگی کا تحفظ، اور خوف و فکر سے آزادی ضرور ایسی مشترک اغراض ہیں جن پر قریب قریب تمام قوموں کا اتفاق ہے اور اس لئے ان کو زندگی کی ضروری قدریں کہا جا سکتا ہے۔

ایک شخص خود اپنے ہی اغراض میں منہمک رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کے اغراض جو اس سے مختلف ہوتے ہیں اسے بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی چیز جو ایک قوم کے لئے قیمتی ہے دوسری قوم کے لئے ناقابل توجہ ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی جو چیز آج عزیز ہے وہ دس سال کے بعد اپنی قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم ایک چیز کی اسی وقت قدر کرتے ہیں جب تک وہ ہمارے اغراض کا ساتھ دیتی ہے۔

زندگی کی قدروں کے متعلق جو مختلف رائیں اور اصول قائم کئے جاتے ہیں ان کا تعلق مختلف اسباب سے ہے۔ مثلاً موسم کو لیجئے گرم ممالک کے رہنے والے اپنے مکانوں کے چاروں طرف سایہ دار درخت نصب کرنا پسند کرتے ہیں اور سرد ملکوں کے باشندے ایسی جگہ پسند کرتے ہیں جہاں دھوپ کا گزر آسانی سے ہو۔ ہمارے ماحول کو بھی اقدار زندگی کے انتخاب میں بڑا دخل ہے، افریقہ اور آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں کے لئے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہ درندوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ لیکن شہر کے رہنے والوں کے سامنے یہ سوال نہیں ہے۔

قومی روایات اور رسم و رواج کو بھی اقدار زندگی کی تعیین میں بڑا دخل ہے، مثلاً قدیم ہندوستان میں ایک عورت کے لئے یہ امر باعث لعنت خیال کیا جاتا تھا کہ وہ شوہر کے بعد زندہ رہے اس لئے شوہر کی وفات کے بعد موت کی جستجو اس کی زندگی کی ایک ضروری قدر تھی لیکن اب یہی رسم جرم خیال کی جاتی ہے۔

یونان کی اسپارٹا قوم میں سپہ گری زندگی کی نہایت اہم قدر تھی، چنانچہ ان کے یہاں رسم تھی کہ نوجوانوں کو جنھیں فوجی تربیت دی جاتی تھی مامور کیا جاتا تھا کہ رات کے وقت قفل توڑ کر یا نقب لگا کر لوگوں کے مکانوں میں گھسیں اور چوری کریں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی التزام تھا کہ جن مکانوں میں انھیں داخل ہونا ہوتا تھا وہاں کے لوگ پہلے سے ہوشیار کر دئے جاتے تھے۔ اگر یہ نوجوان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تھے اور گرفتار کر لئے جاتے تھے تو وہ نااہل سمجھے جاتے تھے۔ الغرض وہاں نقب زنی اور چوری زندگی کی نہایت اہم قدر سمجھی جاتی تھی، لیکن اب وہ جرم ہے۔

یہ مثل سچ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جب تک ہمارا کام کسی بات سے نکلتا رہتا ہے ہم اس کو اپنی زندگی کا اہم مقصد سمجھتے رہتے ہیں لیکن جب اس سے کوئی کام نہیں نکلتا تو اسے ترک کر دیتے ہیں۔

اس زمانہ کے اقدار کا تعلق یکسر اقتصادیات سے ہے، یعنی اب صرف ایک ہی فکر انسان کے سامنے ہے، یعنی یہ کہ وہ بڑھتی ہوئی گرانی بڑھتی جا رہی ہے، اور حکومتیں اس مسئلہ کو بھی صرف سیاسیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں۔ پھر اگر تمام دنیا کی حکومتوں کا نظریہ ایک ہی ہوتا تو بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان اس حیثیت سے دو محاذ میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ دنیا کا امن و سکون اور اقتصادی دشواریوں کا علاج صرف ڈیماکریسی میں ہے، دوسرا محض اشتراکیت کو ذریعۂ نجات قرار دیتا ہے۔ اس لئے جب تک اصولاً یہ طے نہ ہو جائے کہ ان دو میں کون صحیح و درست ہے، اس وقت تک اقتصادی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

اگر دونوں نظریوں کے حامی واقعی خلوص نیت سے غور کرنے پر آمادہ ہوں تو ممکن ہے کوئی درمیانی صورت مفاہمت کی پیدا ہو جائے، لیکن وہاں تو صورت حال یہ ہے کہ ایک دوسرے کی سننا ہی نہیں چاہتا۔ اشتراکیت کے خوف سے ڈماکریسی پر خفقان کے دورے پڑ رہے ہیں اور اشتراکیت کو چونکہ اپنی کامیابی کا یقین ہے اس لئے وہ ڈماکریسی کے اس خوف و ہراس سے نہایت خاموشی کے ساتھ فائدہ اٹھا رہی ہے اور کھلم کھلا تصادم سے گریز کر رہی ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ ڈماکریسی ایک نہ ایک دن خود اپنے ہی بوجھ سے فنا ہو جاتا ہے۔

پھر سچ پوچھئے تو خطرہ یہ نہیں ہے کہ اشتراکیت و جمہوریت میں جنگ کے امکانات قوی ہوتے جا رہے ہیں بلکہ یہ کہ اشتراکیت جنگ کرنا نہیں چاہتی اور لڑائی ملتوی ہوتی جا رہی ہے اور یہی وہ بیم و رجا کی کیفیت ہے جس نے انسان کے دل و دماغ کو بیکار کر رکھا ہے، کسی مصیبت کا اندیشہ خود اس مصیبت سے زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتا ہے اور آج کل دنیا اسی دور سے گزر رہی ہے۔

ان حالات میں اقدارِ حیات کے تعین کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انسان اس سیلاب میں بہا جا رہا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ انجام کیا ہونا ہے، کہیں پاؤں ٹکیں تو وہ سوچے کہ سیلاب اسے کہاں سے کہاں لے گیا اور ساحل کہیں نظر بھی آتا ہے یا نہیں۔

نگار کے پرانے پرچے

سنہ ۳۷ء = سالنامہ (ڈرامہ اصحاب کہف) عا ر۔ مارچ ۶ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی ۸ر۔ جون ۶ر۔ جولائی ۸ر۔ اگست ۸ر
سنہ ۳۱ء = سالنامہ (فراست التحریر) عا ر۔ جولائی ۶ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۱۲ر۔ نومبر ۶ر۔ دسمبر ۶ر۔
سنہ ۳۲ء = فروری ۸ر۔ مئی ۸ر۔ جولائی ۸ر۔ ستمبر ۸ر۔ سنہ ۳۳ء = فروری ۸ر۔ سنہ ۳۸ء = سالنامہ (تاریخ اسلامی ہند) عا ر۔ اپریل ۸ر۔ مئی ۶ر۔ جون ۶ر۔ جولائی ۶ر۔ اگست ۶ر۔ ستمبر ۶ر۔ اکتوبر ۶ر۔ نومبر ۶ر۔ دسمبر ۶ر۔
سنہ ۳۹ء = سالنامہ (مصحفی نمبر) عا ر۔ فروری ۶ر۔ مارچ ۶ر۔ اپریل ۸ر۔ مئی ۶ر۔ سنہ ۴۰ء = فروری ۶ر۔ مارچ ۶ر، اپریل ۶ر۔ مئی ۶ر۔ اکتوبر ۶ر۔ سنہ ۴۱ء = جون تا دسمبر ۶ر فی پرچہ۔ سنہ ۴۲ء = مارچ، اپریل، مئی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶ر فی پرچہ۔ سنہ ۴۳ء = سالنامہ ریاض نمبر عہ ر۔ سنہ ۴۵ء = سالنامہ (قرآن نمبر) ے ر۔ اپریل ۶ر۔ اگست ۶ر۔ ستمبر ۶ر۔ اکتوبر ۶ر۔ نومبر ۶ر۔ دسمبر ۱۲ر۔ سنہ ۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) ۸ر۔ اپریل ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۶ر۔ جولائی ۴ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر ۱۲ر۔ اکتوبر ۱۲ر۔ ستمبر عہ ر۔ سنہ ۴۷ء = سالنامہ (ماجد علی نمبر) ۸ر۔ مارچ ۱۲ر۔ اگست ۱۲ر۔ ستمبر ۸ر۔ اکتوبر ۶ر۔ نومبر ۱۲ر۔ سنہ ۴۸ء = سالنامہ پاکستان نمبر) ے ر۔ مارچ ۱۲ر۔ مئی ۱۲ر۔ جون ۱۲ر۔ جولائی ۱۲ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر ۱۲ر۔ نومبر ۱۲ر۔ دسمبر ۸ر۔ سنہ ۴۹ء = سالنامہ افسانہ نمبر عا ر۔ مارچ ۶ر۔ اپریل ۶ر۔ مئی ۸ر۔ جون ۸ر۔ جولائی ۶ر۔ اگست ۶ر۔ سنہ ۵۰ء = سالنامہ (تنقید نمبر) عا ر۔ مارچ ۱۲ر۔ اپریل ۸ر۔ مئی ۱۲ر۔ جون ۱۲ر۔ جولائی ۱۲ر۔ اکتوبر، نومبر عہ ر۔

دوزخ

(تیرے "دوزخ" کی یہ "فردوس نمائی" کب تک)

چھا گیا کتنے شگوفوں پہ تباہی کا غبار
کتنے سورج ہیں زمانے میں اندھیرے کا شکار

ذرہ ذرہ ہے یہاں صدق و صفا کا مدفن،
حسرتیں بیچتی پھرتی ہیں شہیدوں کے کفن

ابھی برپا ہے وہی انجمنِ اہلِ کتاب
کارفرما ہیں ابھی میری شہنشاہی کے سراب

دشت بہتر ہے ترے اِن چمنستانوں سے
باز آیا میں حقیقت کے نہاں خانوں سے

کھا گئی بادِ خزاں کتنے سمن زاروں کو
تیز کرتی ہے اجل یاس کی تلواروں کو،

کس قدر چاند اُجالے کے لئے روتے ہیں
اپنے ہر داغ میں ناسور لئے ہوتے ہیں

کب سے خاموش ہیں عرفان و صداقت کے چراغ
عرش پر نقرہ و نیلم کے خداؤں کا دماغ

زندگی ہوگئی تبدیل گراں جانی میں،
موت رقصاں ہے کلاہوں کی زر افشانی میں

امن و اخلاص کو انسان ترستا ہی رہا
آگ بڑھتی ہی رہی، زہر برستا ہی رہا

رگِ احساس پہ چلتے رہے نشتر اب تک
عشق و ادراک کے پرچم ہیں نگوں سر اب تک

روزنِ روشن کے جلو میں ہیں اندھیرے کتنے
بن گئے قافلہ سالار لٹیرے کتنے،

دین و دولت کے صنم، نسل و سیاست کے صنم
یہ فلاکت کے بیاباں، یہ امارت کے صنم

کارواں خاک بسر، شعلہ چکاں راہ گزار
دیکھ ہر موڑ پہ وجدان و بصیرت کے مزار

یہ تمدن کے پجاری، یہ قدامت کے امام
یہی دنیا ہے تو یارب تری دنیا کو سلام

لہلہاتے ہی رہے جہل و قیادت کے علَم
بھوک کھاتی رہی بکتی ہوئی عصمت کی قسم

تو نے آدم کو دئے خلد و جہنم کے فریب
کبھی تسنیم کے دھوکے کبھی زمزم کے فریب

یہ خدائی ہے تو بیزارِ خدائی کب تک!

افسر سیمابی احمد نگری

تخلیقِ آدم

(۱)

فضاؤں میں پیدا ہوئی تھرتھراہٹ خلاؤں میں بننے لگے کچھ ہیولے
خدا کے تصور کا شہکار بن کر کوئی خطۂ ارض پر مسکرایا
ہجومِ ملائک نے آنکھیں بچھائیں، وفورِ مسرت سے سجدے لٹائے
ہوئی بارشِ نور کی زرفشانی، دو عالم نے مستی کا انداز پایا
لیں وسعتیں تنگنائے زمیں کو، نئی عظمتوں کے دیئے جگمگائے
افق تاب جلووں نے خود کو سنبھالا بکھرنے لگا حسنِ عالم پناہی
ہویدا ہوا خود بخود سینۂ ارض سے بن کے اک غنچۂ ماہتابی،
جو آدم کے خوابوں کی تعبیر بن کر بڑھا لینے عالم کی کل بادشاہی
بکھرنے لگیں حسنِ نو کی شعاعیں، جلوسۂ افق میں سحر مسکرائی
شفق کی صباحت گلوں کی نزاکت نے حسنِ مجسم کا انعام پایا
نکل آئے دیدارِ انساں کی خاطر مہ و مہر و انجم کی خلوت کدوں سے
اور اس آدمِ نو کی عظمت نے اک "پیرِ دانا" کی عظمت کو نیچا دکھایا

(۲)

ارتقاء:-

تفوق کی سطوت، عزائم کی صولت، فشارِ تدبر کا یہ زندہ پیکر
اٹھا بربطِ عقل کی لرزشوں میں حدودِ مسلسل کا اعجاز پاکر
کبھی سبزہ زاروں پہ آنکھیں بچھائیں، کبھی لالہ زاروں کو مسکن بنایا
گزرتا رہا منزلِ نو بہ نو سے شعور و تخیل کو رہبر بناکر

کبھی مہر و مہ سے نگاہیں لڑائیں، نگاہِ تجسس کے ابواب کھولے
فروغِ تفکر کی غمناکیوں نے ہر اک شئی کو پروردۂ جہل پایا
رموزِ جہاں کی حکایات چھیڑیں، طربناکیوں کے فسانے سنائے
کبھی زارِ ہستی کو سیمیں عذاروں کے رقصِ مسلسل سے رنگیں بنایا

عروجِ تفکر کے سحرِ ترنم نے اہلِ حرم کے قدم ڈگمگائے
اسی سیرگاہِ تخیل میں پھنسکر بنایا یقیں اپنے حسنِ گماں کو
کیا ادّعا منکرِ روح ہوکر، کہ بنیاد ہے مادہ اس جہاں کی
یہ اپنی غلط رہروی تھی، جو تسلیم کرتے تھے ہم قدرتِ بے نشاں کو

بہلتا رہا فکرِ سود و زیاں سے، مصائب کو خود کردہ اعمال سمجھا
مگر مدتوں بعد سرِ بستہ رازوں میں پھر ایک حرکت سی پیدا ہوئی ہے
یہ کہتے ہوئے بندۂ عقلِ باطل نے پھر پایا اعترافِ مشیت
"تفکر کی ناپختگی کی بدولت مری زندگی کتنی رسوا ہوئی ہے"

(۳)

یہ انساں — یہ انساں کہ جس نے خلاؤں میں افکار کے جال پھینکے
ہزاروں تبسم کے ارمان لیکر، نئی آرزوؤں کے ساغر اچھالے
مصائب تشدد کی پہنائیوں سے ابھرتا رہا عزم کی آنچ کھا کر
جنوں آشنا عزم کی مشعلوں کو بانداز نو دست تو میں سنبھالے

پہونچ کر خراباتِ افکار میں جس نے دیکھی امنگوں کی حسرت نوازی
ستاروں کی دنیا تبسم کی لہریں، فضاؤں کی شوخی بہت مختصر ہے
مگر عشرتوں کی یہ محدود دنیا بھی انساں کی دسترس میں نہیں ہے
اگر ہے تو بس آرزوؤں کی حسرت، سقوطِ تبسم بہت معتبر ہے

ازل سے یہی سعیِ پیہم رہی ہے کہ انساں بنے وارثِ عیش گاہی
مگر جانے کب آئے وہ دورِ عشرت، نہ معلوم کب وہ سکوں لوٹ آئے
کہ جس سے تمنائے خفتہ بر آئے، باندازِ نو زندگی مسکرائے

عبدالہادی رفعت بنگلوری

اہرمن زار

العجب، یہ جہانِ تیرہ و تار ——— اہرمن زار ہے کہ آدم زار؟
یہ خراباتِ پُر خراش و خروش ——— صاعقہ گاہ و دوزخِ خس پوش
وقت، تخریبِ وقت کا منّاد ——— دہر، بازیچہ گاہِ شر و فساد
یہ بہشتوں میں سوزِ نارِ جحیم ——— ساغرِ لالہ گوں میں مارِ حمیم
متلاطم یہ خون کا دریا، ——— یہ سلگتے ہوئے یم و صحرا
موج در موج ابلہی و جنوں ——— خم شکستہ، صراحیاں پُر خوں،
تہ بہ تہ برق و شعلہ و صرصر ——— زہر میں یہ بجھے ہوئے نشتر
ریگ زاروں میں برق کے تودے ——— مرغزاروں میں آگ کے خیمے،
آفتابوں پہ ظلمتوں کے غلاف ——— سینۂ عیش میں غموں کے شگاف
تارے ذروں کی بارگہ میں ندیم ——— صبحِ روشن دیارِ شب میں مقیم
تیرگی، چاندنی کے ڈیروں میں ——— ماہ و خورشید گھپ اندھیروں میں
تلخ تر زندگی کا نوشینہ، ——— زنگ خوردہ نفس کا آئینہ
پرنیاں کی تہوں میں خشت و خزف ——— تہی نقدِ گہر سے مشتِ صدف
غم کی پرچھائیاں تبسم ہیں، ——— ظلمتیں خوابگاہِ انجم میں
پھول کی خلوتوں میں بادِ سموم ——— آشیانوں میں عندلیب کے بوم
ہاتھ میں جہل کے خرد کی عناں ——— برف زاروں میں قید برقِ تپاں
نغمے مجروح، ساز و دف زخمی ——— سوزِ دل میں نہ روح میں گرمی
سرِ کوثر سلگتے جام و سبو ——— موجِ نمناکِ وقت، صاعقہ خو
یہ لہو چاٹتے ہوئے شعلے ——— گرتی بجلی، برستے انگارے

قوم کے سر پہ نکبتوں کے تاج
علم کی پستی، جسم کی معراج

طاق و محراب خون سے لبریز　　یادگارِ ہلاکو و چنگیز ،،

زہر، تریاق کے سبوچوں میں　　موت ، انسانیت کے کوچوں میں

بھیس میں آدمی کے چوپائے　　یہ ہلاکت کے رینگتے سائے

ذہن صدیوں کی وحشتوں کا مزار　　مردہ مردہ ضمیر کی جھنکار

خوں اُگلتے ہوئے بلند و پست　　نیشتر کتنے روح میں پیوست

آدمی شیطنت کے زینوں پر　　عصمتوں کا لہو جبینوں پر،

بھیڑئیے معتکف مساجد میں　　خون کی ہولیاں معابد میں

تیز سنگینیں نرم سینوں پر　　زودچٹانوں کی آبگینوں پر،

زندگانی کی اب سحر کیا ہو،　　کھا گئی تیرگی اجالوں کو،

اس خرابے میں زندگانی کے

شعبدہ گہ میں دہر فانی کے

آدمی کی تلاش ہے مجھ کو

فضا ابن فیضی

نازش پرتاب گڈھی :

میں نے تو ڈگمگا دئے ہیں جان کر قدم
اب تم ہی دے سکے نہ سہارا تو کیا کروں

چاہا تھا طول دینا شبِ انتظار کو
مانے مگر نہ صبح کا تارا تو کیا کروں

دے رہے ہیں صدائیں وہ مجھ کو
میں سمجھتا ہوں دل کی دھڑکن ہے

چین نہ پایا الم کے خار تمام،
عیش بھی کتنا تنگ دامن ہے

بہتر ہے کہ تم بھی مجھے اُسوقت نہ چھیڑو
جب دل کو صدا دیتے ہوں گزرے ہوئے لمحات

کھوئی کھوئی سی خیالوں میں مسرت کی کرن
جانے یہ کیوں ہے کہ اُس نے تو پکارا بھی نہیں

اب اور کتنا ترکِ تعلق کروں کہ میں
خود سے بھی پیش آتا ہوں بیگانگی کے ساتھ

اکثر ہوا ہے یہ کہ نشیمن کے پاس سے
گزرا چلا گیا ہے زمانہ بہار کا

ترکِ الفت پر ہوں میں یوں مطمئن،
جیسے سب کچھ کھو کے بھی کچھ پا گیا،

صفیہ شمیم ملیح آبادی :

یہ کس کے فریب کھا رہے ہیں،
ارمانوں سے دل بسا رہے ہیں

رہ رہ کے اُمڈ رہے ہیں آنسو
یہ دل سے کسے بھلا رہے ہیں

بیچین ہیں بجلیاں فلک پر
گلشن ہیں کہ مسکرا رہے ہیں

ہو خیر، چراغِ بزمِ حسرت،
کیوں شام سے جھلملا رہے ہیں

ساون کے شمیم مست بادل
کیا جانئے کیوں رُلا رہے ہیں

سید شاہ ولی الرحمان ایم۔ اے :

آج اُٹھتی نہیں میرے دلِ ناکام سے آگ
آکے برسا دے فروغِ رخِ گلفام سے آگ

ہے فروزاں یہ سرِ طور چراغِ لالہ !
یا ہے روشن ترے جلوے کی لبِ بام سے آگ

یہ تری برقِ نگاہی کا اثر ہے کہ ہنوز
گوشۂ دل میں بھڑکتی ہے ترے نام سے آگ

تیرے جاتے ہی بجھی آتشِ رونق گھر کی
تیرے آتے ہی لگی اُٹھنے در و بام سے آگ

سرد ہیں قلب و جگر خاک ولی اب نکلے
نعرۂ کفر سے یا نعرۂ اسلام سے آگ

مطبوعات موصولہ

تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت

انجمن ترقی اُردو پاکستان کی یہ پہلی قابل ذکر تالیف ہے جو قیام انجمن کے بعد وہاں سے شایع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں محمد ابن قاسم فاتح سندھ کے زمانہ سے لیکر عہد اورنگ زیب تک کی تاریخ تمام ان خصوصیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو ایک اچھی اور مستند تاریخ کی کتاب میں پائی جانا چاہئے۔

مقدمہ میں ہندوستان کی تاریخ قبل اسلام سے بحث کی گئی ہے جو ایک جامع تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے اور دوسرے باب میں مسلمانوں کی فتوحات سندھ اور وہاں عربی حکومت کے قیام اور ان کے عادلانہ نظم ونسق کو بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تیسرا باب سلاطین غزنویہ کے لئے وقف ہے، چوتھے باب میں سلطان معز الدین غوری سے لیکر شمس الدین التمش تک کی تاریخ درج ہے، چھٹے اور ساتویں باب میں اس عہد کے نظام حکومت اور ترقی علم و تمدن سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارھویں باب میں عہد خلجی و تغلق اور اس کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ بارھویں باب میں ان مختلف آزاد حکومتوں کا ذکر ہے جو صوبہ داروں نے مختلف اقطاع ہند میں قایم کرلی تھیں اور تیرھویں باب سے لیکر بیسویں باب تک سلطنت مغلیہ کی تاریخ ہے جو بابر سے شروع ہوکر اورنگ زیب پر ختم ہوتی ہے، اکیسویں باب میں گیارھویں صدی ہجری کی مذہبی تحریکات اور دوسری عمرانی ترقیوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو میں ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی، اور اس کے بعد پھر کوئی اہم کتاب اس موضوع پر شایع نہیں ہوئی۔ ضرورت تھی کہ تاریخ نویسی کے جدید اصول پر کوئی کتاب پیش کی جاتی اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو پاکستان نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

اس کے مولف مولوی سید ہاشمی فریدآبادی بڑے مشاق لکھنے والے ہیں اور چونکہ تاریخ سے انھیں بہت دلچسپی ہے اس لئے ان کی اس تالیف کو کامیاب ہونا ہی چاہئے تھا۔ طباعت وکتابت نہایت دیدہ زیب ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے۔ جلد بھی مضبوط وخوبصورت ہے۔ ضخامت ۵۹۴ صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر انجمن ترقی اُردو پاکستان ہسپتال روڈ

ٹھنڈا گوشت

مجموعہ ہے سعادت حسن منٹو کے آٹھ افسانوں کا۔ اور چونکہ پہلے افسانہ کا عنوان ٹھنڈا گوشت ہے۔ اسی لئے مجموعہ کا نام یہی قرار دیا گیا۔ یہ افسانہ وہی ہے جو منٹو کی تضحیک کے ساتھ ان کے ادبی شہرت کا بھی با

اس افسانہ کی اشاعت پر مقدمہ چلایا گیا، سزا ملی اور اپیل سے بری ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ افسانہ فحش و عریاں ہے۔
ابتداء میں خود منٹو نے اس مقدمہ کی تفصیل بیان کی ہے، جو بہت پُر لطف ہے اور بجائے خود ایک ادبی شاہکار ہے۔ منٹو، ہندوستان کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہے، جنھوں نے قدیم اسلوب کو بدل کر جدید ٹکنک کو رواج دیا اور تکمیل کے ساتھ نباہا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض افسانوں کو مخصوص اخلاقی معیار کے لحاظ سے ناقابل برداشت قرار دیا جائے، لیکن جس حد تک آرٹ کا تعلق ہے ادب میں ان کو خاص جگہ حاصل ہے اور ناک بھوں چڑھانے سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔
کتاب بہت اہتمام کے ساتھ نہایت نفیس کاغذ اور بہت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے۔ اور اس باب میں مکتبہ جدید لاہور کے ذوق کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ قیمت تین روپیہ۔

نگارخانہ ترجمہ ہے سنسکرت کی قدیم نظم کٹنی متم کا جسے میراجی نے غالباً انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ جنسیات کے سلسلہ کی کتاب ہے، جس میں ایک تجربہ کار نائکہ نے نوجوان طوائف کو اپنے فن کے اسرار و رموز سمجھائے ہیں۔ ابتداء میں منٹو کا دیباچہ ہے، جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔
میراجی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ جنسی بھوک کے مریض ہیں اس لئے قدرتاً انھیں اس کتاب کے ترجمہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا، اور اس میں شک نہیں کہ ترجمہ انھوں نے اس خوبی سے کیا ہے کہ یہ خود ان کی تصنیف ہو کر رہ گئی ہے۔
اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
ملنے کا پتہ: مکتبہ جدید لاہور۔

بیکار دن بیکار راتیں مجموعہ ہے عزیز احمد کے سات افسانوں کا، ان میں سے بعض کا پس منظر جنگ ہے اور بعض کا تقسیم ہند کے بعد کا فساد اور جس حد تک افسانوں کی ٹکنک کا تعلق ہے، ان کو کامیاب افسانے کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ عزیز احمد صاحب جزئیات کی تفصیل اور واقعات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں اور کہیں کہیں مزاح کی چاشنی سے انداز بیان کو بہت پر لطف بنا دیتے ہیں۔
ان افسانوں کا پلاٹ بھی بہت دلچسپ ہے اور کردار نگاری بھی بڑی حد تک مکمل ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے بھی یہ افسانے بے معنی نہیں ہیں اور ان کے پڑھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اقدار حیات سے اگر جذبۂ انسانیت کو علحدہ کر دیا جائے تو اس کارگاہ عالم میں انسان کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔
کتابت و طباعت وغیرہ بھی بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت ہے ۸؍ اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ جدید لاہور۔

سنہ ۴۹ء کا بہترین ادب اس مجموعہ کو چودھری برکت علی اور میرزا ادیب نے مرتب کیا ہے اور مکتبۂ اُردو لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ اس میں نو ادبی مقالے، ۱۰ افسانے و ڈرامے، ۲۵ نظمیں، ۲۵ غزلیں، ۸ گیت اور دو طنزیہ مقالے شایع کئے گئے ہیں جو سب کے سب مشہور و

مستند ادیبوں اور شاعروں کی فکر کا نتیجہ ہے۔

یہ تمام چیزیں پہلے اتنے مختلف رسایل میں شایع ہو چکی ہیں، کہ ان کا مطالعہ بیک وقت بہت دشوار ہوتا، اگر انکو اس طرح یکجا نہ کر دیا جاتا۔ اس لئے مکتبۂ اُردو کی یہ کوشش یقیناً قابل قدر ہے۔ اس میں تمام مقالے انھیں حضرات کے ہیں جو کسی نہ کسی نہج سے ترقی پسند جماعت کے افراد شمار کئے جاتے ہیں، لیکن شاید اس کے معنے یہ نہ ہوں گے کہ اس جماعت کے لٹریچر سے ہٹ کر کوئی اور چیز قابل ذکر لکھی ہی نہیں گئی۔ بہتر ہوتا اگر خالص لٹریچر سے ہٹ کر دوسرے موضوع کے مقالات کا بھی انتخاب اس میں شامل ہوتا، کیونکہ ادبیات میں شعر و شاعری یا افسانہ و ڈرامہ کے علاوہ تاریخ و تذکرہ بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب بہت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت چھ روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ اُردو لاہور۔

ٹھگ جلد اول ترجمہ ہے کرنل میڈوز ٹیلر کی مشہور کتاب کا جس میں امیر علی ٹھگ کی داستان خود اس کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جو ٹھگی کی تحریک سے متعلق ہے، بڑا دردناک حصہ ہے، لیکن اس کی تفصیل کسی کو نہ معلوم ہوتی اگر کرنل میڈوز ٹیلر کو خود امیر علی سے ملنے کا موقعہ نہ ملتا۔

امیر علی جب گرفتار ہونے کے بعد حیدر آباد کے قید خانہ میں بھیجا گیا تو مصنف نے مل کر اس کے تمام واقعات زندگی معلوم کئے اور ایسے دلچسپ اسلوب سے ان کو پیش کیا کہ جب تک ملکۂ وکٹوریہ اس کتاب کے پروف کو (جبکہ وہ زیر طبع تھی) روزانہ صبح کو نہ پڑھ لیتیں انھیں چین نہ آتا۔

اسی دلچسپ کتاب کا ترجمہ حسن عابد جعفری نے کیا ہے اور اتنی خوبی سے کیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتی۔ کتاب کی ضخامت ۴۰۰ صفحات کی ہے اور خاص اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ کراچی کتب خانہ۔ اولڈ کرنسی ہاؤس۔ ساؤتھ نیپر روڈ کراچی۔

نشاط خاطر مسٹر ڈیل کارنیگی جدید عملی نفسیات کے بڑے ماہر ہیں عملی نفسیات سے مراد وہ اصول ہیں جن پر عمل کر کے انسان بہت سے جسمانی و ذہنی امراض سے نجات پا سکتا ہے۔ مسٹر کارنیگی عرصہ سے اس کے تجربات کر رہے ہیں اور سالہا سال کی تحقیق و جستجو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ تمام امراض کا حقیقی سبب (خواہ وہ جسم سے متعلق ہوں یا ذہن و دماغ سے) فکر و پریشانی ہے۔ یعنی اصول ہومیوپیتھی کے مطابق وہ بھی اس بات کے قایل ہیں کہ بیماری پہلے نفس میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر کارنیگی نے صرف اسی دریافت پر قناعت نہیں کی بلکہ دماغی افکار اور ذہنی اُلجھنوں کے عملی طریقے بھی معلوم کئے اور کامل سات سال تک انکا مسلسل تجربہ کرنے کے بعد انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں ہر قسم کی فکر و پریشانی کو دور کرنے کی تدابیر بتائی ہیں، جن پر عمل کر کے اس وقت تک لاکھوں انسان فایدہ اُٹھا چکے ہیں۔ اس کتاب میں سیکڑوں طریقے غم و الم دور کرنے کے بتائے گئے ہیں اور سب کے سب تجربات پر مبنی ہیں۔

یہ کتاب کارنیگی کی اس تصنیف کا ترجمہ ہے جسے حسن عابد جعفری نے نہایت سلیس زبان میں پیش کیا ہے اور اس وقت جبکہ ہر

انسان فکر و پریشانی میں مبتلا ہے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جعفری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے نوع انسانی کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کتاب کو مدارس کے نصاب میں شامل کرکے ابتدا ہی سے بچوں کو علمی نفسیات کے ان مصدقہ تجربات کی طرف متوجہ کیا جائے۔ کتاب چونکہ بالکل واقعات پر مبنی ہے اس لئے دلچسپ بھی ہے اور ایک انسان ناول کا سا لطف اس سے اُٹھا سکتا ہے۔ ضخامت ۵۲۸ صفحات۔ طباعت، کتابت و کاغذ وغیرہ سب پسندیدہ ہے۔ قیمت پانچ روپیہ بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کراچی کتب خانہ اولڈ کرنسی ہاؤس۔ سوتھ نیپیر روڈ۔ کراچی۔

ہفت رنگ مجموعہ ہے جناب عرش ملسیانی کی غزلوں اور نظموں کا جس کا نام انھوں نے ہفت رنگ اس لئے رکھا ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اس میں واقعی کافی تلون پایا جاتا ہے۔

پہلے رنگ میں جس کا عنوان انھوں نے "خونِ آدم" رکھا ہے ۱۵ نظمیں شامل ہیں اور ان سب کا تعلق مظلوم انسانیت سے رکھنے والے واقعات و حالات سے ہے۔ دوسرا رنگ عشق و محبت سے تعلق رکھتا ہے، تیسرے رنگ میں واردا تی نظمیں ہیں، چوتھا تاثرات سوز و گداز سے تعلق رکھتا ہے، پانچویں کا عنوان متفرقات ہے، چھٹے کا رباعیات اور ساتواں رنگ گیت کا ہے۔

عرش صاحب کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے اور ایک مستحق کی حیثیت سے ملا ہے۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں ہیں جو علم سے بے نیاز رہکر شاعری کرتے ہیں، بلکہ ان کا شمار اُن پڑھے لکھے وسیع المطالعہ شعراء میں سے ہے جو لغت، عروض اور معانی وغیرہ کے نکات سے بھی واقف ہیں۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں جو فن کو جذبات پر قربان کر دیتے ہیں یا اپنے جہل کو "ترقی پسندی" کے پردہ میں چھپانا چاہتے ہیں، انھوں نے جہاں جہاں فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں، اُن سے ان کی پوری "کارآگہی" ظاہر ہوتی ہے اور اسی لئے ان کے کلام میں وزن ہے اور استادانہ معقولیت!

جناب عرش کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ گیتوں کی زبان سے ہوتا ہے جو پنجاب سے اس قدر دور کی چیز ہونے کے باوجود جناب عرش کے گہوارہ کی چیز نظر آتی ہے۔ کتاب کی کتابت و طباعت بھی بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ رہنمائے تعلیم بک ڈپو مفتی والان۔ دہلی۔

شہیل مجموعہ ہے جناب آغا حیدر مرزا کے چند افسانوی و ادبی مقالات کا جن میں سے بعض ٹیگور کے رنگ کے ہیں۔ مصنف نے ظاہر کیا ہے کہ اس مجموعہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے واردات حیات اور ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہیں اور کتاب کے مطالعہ سے ان کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

بعض مضامین اس میں ٹیگوری انداز کے ہیں اور باوجود اس کے کہ یہ رنگ اب متروک ہو چکا ہے، اس میں کافی جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، گو ندرت نہ ہو۔

طباعت و کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کتاب کو مجلد شایع کیا گیا ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ تاج آفس۔ کراچی۔

رعنائیاں مجموعہ ہے جناب برج لال رعنا کی رباعیوں، غزلوں اور نظموں کا۔ رعنا بھی انھیں ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں، جن کو تقسیم ہند کے بعد پاکستان سے ہندوستان آنا پڑا اور جو باوجود غریب الوطن ہونے کے اپنے فطری ذوق کو بھی پورا کرتے رہتے ہیں۔

رعنا صاحب راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور چونکہ خود انھوں نے اپنے حالات نہیں لکھے ہیں، اس لئے ہمیں نہیں معلوم کہ اردو شاعری کا ذوق کب اور کیونکر ان میں پیدا ہوا اور وہ ماحول کیا تھا جس نے انھیں اتنا اچھا شاعر بنا دیا۔ اس مجموعہ کا بڑا حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے جن سے جناب رعنا کی خوش فکری اور پختگی عیاں ہے۔ رباعیوں کے بعد غزلیں اور نظمیں درج ہیں، غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لیکن ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے اور بڑے پاکیزہ ذوق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ مجموعہ مجلد مجلد شایع ہوا ہے اور مکتبہ شان ہند دہلی سے ڈیڑھ روپیہ میں مل سکتا ہے۔

سفینہ وساحل مجموعہ ہے عزیز وارثی کی غزلوں کا جسے مکتبہ شان ہند دہلی خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے جناب عزیز، حضرت نوح ناروی کے شاگرد اور اوگھٹ شاہ صاحب وارثی کے مرید ہیں۔ وارثی سلسلہ کے شعراء میں تصوف کی چاشنی بیدم شاہ مرحوم کے کلام میں زیادہ پائی جاتی تھی، لیکن وہ ریاض وجلیل کے دور کے شاعر تھے اور اس لئے ان کے کلام میں تصوف کا وہ رنگ نہیں تھا جو اصغر گونڈوی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ عزیز وارثی، گو شاگرد حضرت نوح کے ہیں، لیکن ان کا رنگ اپنے استاد سے بالکل علحدہ ہے اور اصغر کا رنگ اس میں زیادہ جھلکتا ہے اور ایسا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ عزیز وارثی کی شاعری کی ابتدا اس ماحول میں ہوئی ہے۔ جب سوچنے، سمجھنے اور کہنے کے بہت سے نئے نئے اسلوب پیدا ہوگئے ہیں۔ عزیز کے کلام کی خصوصیت اس کی کیفیت ہے جو غالباً تعرف ہے ان کے پیر و مرشد کا۔ عزیز کا کلام سخافت سے بالکل پاک ہے اور مشاعروں کی محفل سے ہٹ کر بھی ان کے کلام کو پڑھ کر لطف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مکتبہ شان ہند شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے یہ مجموعہ شایع کرکے ایک اچھے شاعر کو ملک سے روشناس کرایا۔ قیمت عہ

بیس سو گیارہ یہ ایک طنزیہ تبصرہ ہے دنیا کے موجودہ سیاسیات پر جس میں مستقبل کا ایک زمانہ ۲۰۱۱ء فرض کرکے متعین کیا گیا ہے اور جمہوریت یوکناپٹلاڈا یا سے متعلق ہے جہاں کے صدر پوپوپالنہار نے اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں — یہ ترجمہ محمد خالد اختر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا باب جو مصنف کا پیش لفظ ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

حجم ۲۲۲ صفحات۔ قیمت ۶ عہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جدید لاہور۔

پرچھائیاں انجمن ترقی اردو (ہند) کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو پوری کی پوری نہایت خوشنما ٹائپ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تصنیف ہے آصف علی صاحب کی جو دہلی کے بیرسٹر، کانگرسی خیال کے مشہور لیڈر تھے اور فی الحال آسام کے گورنر ہیں۔ آصف علی صاحب کے جاننے والے واقف ہیں کہ وہ ایک نہایت اچھے ادیب بھی ہیں اور یہ تصنیف ان کی یکسر ادبیات ہی سے تعلق رکھتی ہے، جو قلعۂ احمد نگر میں محبوس رہنے کے دوران میں انھوں نے لکھی تھی۔

یہ کتاب بقول ناشر زندگی کے ایک دلچسپ پہلو کا فلسفیانہ مطالعہ ہے، ہو سکتا ہے کہ ناشر کا یہ بیان صحیح ہو، لیکن چونکہ یہ کتاب بالکل ٹیگور کے گیتانجلی کے لب ولہجہ میں لکھی گئی ہے، اور کوشش کی گئی ہے اس معنویت کے پیدا کرنے کی جو نیٹشے کی کتاب Thus spoke Zarathustra میں پائی جاتی ہے، اس لئے افسوس ہے کہ ہم اس کی ادبیت و فلسفیت کے امتزاج کو بالکل نہیں سمجھ سکے اور یہ کتاب ہمارے لئے بالکل ایک معمہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

بینکوں کا جائزہ

آر میک نائٹ ولسن مالیات کا بڑا ماہر ہے، اس نے ایک کتاب لکھی ہے جو مالیات کے اصول اور بنکوں کے طریق کار پر حرفِ آخر شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ حسن عابد جعفری بیرسٹر اور سید نظیر حیدر بی اے ایل ایل بی نے اُردو میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں مالیات اور بنکاری کے مسایل نہایت پیچیدہ ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں، لیکن اس وقت یہ ایسے مسایل ہیں جن کا سمجھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ولسن نے یہ کتاب لکھی تھی جس میں نہایت آسان پیرایہ میں ان تمام مسایل کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ معمولی سا معمولی انسان بھی اسے سمجھ سکے۔

یقیناً اس کتاب کا ترجمہ بہت دشوار تھا لیکن خوشی کی بات ہے کہ فاضل مترجمین اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے یہ کتاب کراچی کتب خانہ کراچی سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

لکیریں

مجموعہ ہے جناب نازش پرتاب گڈھی کی غزلوں کا۔ نازش صاحب کا شمار ان شعراء میں ہے جنھوں نے اپنے لئے ملک میں ایک جگہ پیدا کرلی ہے اور بربنائے استحقاق پیدا کی ہے۔ ان کا کلام اکثر مشہور رسایل میں شایع ہوتا رہتا ہے اور ملک ان سے ناواقف نہیں ہے۔

خود انھوں نے اپنی غزل گوئی کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے وہ یقیناً صداقت سے خالی نہیں یعنی یہ کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں خود انھیں کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ بات ان کے کلام سے بخوبی واضح ہے۔

ان کے تغزل کا معیار کافی بلند ہے اور ان کی غزلوں میں ہم کو بہت سے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جن کو ایک صاحب ذوق کبھی نہیں بھلا سکتا۔ مثلاً :-

رگ رگ سے دل کی، قوتِ گفتار ہی گئی　　جب جاکے داستانِ محبت کہی گئی

اب تک مری زباں پہ ہے لبیک کی صدا　　کیا جانے کس طرح مجھے آواز دی گئی

قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- ایس۔ یو۔ واچ کمپنی۔ کچہری روڈ پرتاب گڈھ (اودھ)

ہومیوپیتھک دُنیا

ماہوار رسالہ ہے جو ایک سال سے ڈاکٹر امر پرکاش ارورا کی ادارت میں لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ ہومیوپیتھی علاج بالمثل کا دوسرا نام ہے جس کا موجد جرمنی کا مشہور شاہی ڈاکٹر ہنی من تھا۔ اب اس طریق علاج نے اتنی مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ شرق و غرب کا شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اس سے واقف نہ ہو۔

اس طریق علاج نے اپنی آسانی، ارزانی اور علمی اصول کے لحاظ سے دُنیا میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے اور اس کی تعلیم کے بڑے بڑے ادارے شرق و غرب میں قایم ہو چکے ہیں۔

ضرورت تھی کہ اس طریق علاج کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستان سے بھی کوئی مفید رسالہ اُردو زبان میں رائج کیا جائے، چنانچہ اس ضرورت کو ڈاکٹر اروڑا نے پورا کیا اور بوجہ احسن پورا کیا۔

اس رسالہ کا خاص حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف خود اپنے تجربات پیش کرتے رہتے ہیں اور ان سے علاج میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ دوسرے مضامین بھی بہت مستند ذرایع سے فراہم کئے جاتے ہیں اور علامات کے لحاظ سے مختلف امراض کے طریق علاج بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اس رسالہ کو زندہ رکھا جائے اور لوگ اس کی خریداری کی طرف توجہ کریں۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے پتہ:- پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲ - لکھنؤ۔

کلید بایوکیمسٹری ہومیوپیتھی کے ساتھ ساتھ ایک اور طریق علاج ڈاکٹر شسلر نے ایجاد کیا جسے بارہ نمکیات کا علاج کہتے ہیں اور تجربہ سے یہ بھی ازبس مفید ثابت ہوا ہے۔ اس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ تمام امراض کا علاج صرف بارہ دواؤں سے ہوتا ہے۔ اس طریق علاج پر بھی بڑی بڑی کتابیں اس وقت تک لکھی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر اروڑا نے اُردو میں اس کے اصول بیان کئے ہیں اور تمام امراض کا علاج ان دواؤں کے ذریعہ سے نہایت آسان زبان میں بتایا ہے۔ بڑی مفید کتاب ہے اور دو روپیہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

نسیم سحر مجموعہ ہے ۶۶ روایات کا جنھیں عثمان حید مرزا ایم۔ اے نے عربی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ مترجم نے تمہید میں ظاہر کیا ہے کہ "یہ مختصر مجموعہ جو منتخب و مستند روایتوں پر مشتمل ہے، بزرگان سلف کی پاکیزہ زندگی کا ایک دلکش مرقع ہے اور یہ روایات زیادہ تر دوسری تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں۔"

ہو سکتا ہے کہ ان روایات سے بزرگان سلف کے اخلاق پر روشنی پڑتی ہو، لیکن ان کو مستند کہنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر اساطیری رنگ کی ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تمام روایات تقریباً وہی ہیں جو تمام کم علم واعظوں کی زبان سے سنی جاتی ہیں اور قطعاً اس قابل نہیں کہ پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کی جائیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عثمان حید مرزا صاحب نے ان کا ترجمہ کر کے اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی، بلکہ سچ پوچھئے تو اسے اور رسوا کیا ہے۔ جن ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں سے اکثر ناقابل اعتبار ہیں اور ان کی حیثیت بازاری گپ سے زیادہ نہیں۔ کاش وہ وقت جو ان لغو و مہمل روایات کے ترجمہ کرنے میں ضایع کیا گیا ہے، کسی بہتر کام میں صرف کیا جاتا اور اگر روایات اسلامی ہی کو لینا تھا تو انھیں مستند روایات بھی مل سکتی تھیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔

تاریخ

تاریخ امریکہ ۔۔۔۔ یحییٰ تنہا ۔۔۔۔ قیمت ۸/۶ر

" اندور ۔۔۔۔ امیر احمد علوی ۔۔۔۔ " ۸ر

" گجرات اسلامی ۔۔ غلام محمد ۔۔۔۔ " ۸/۶ر

" ہند (انگریزی) " ۔۔۔۔ " ۸/۴ر

دواوین و مثنویات

باقیات فانی بدایونی ۔۔۔۔۔۔۔۔ " ۳ر

مجموعہ نظم بے نظیر ۔۔۔ ڈپٹی نذیر احمد ۔۔ " ۸/۴ر

مشعل ۔۔۔۔ فراق گورکھپوری ۔۔ ۔ ۱۲/۶

ظہور رحمت ۔۔۔ شاد عظیم آبادی ۔۔۔ " ۸ر

مثنوی راہ حق ۔۔۔۔ " " " " ۸ر

مطلع الانوار ۔۔۔ برق دہلوی ۔۔۔ " ۶ر

تذکیر کامل ۔۔۔ زین العابدین " ۱۲ر

سفرنامے

صراط الحمید ۲ حصے ۔۔۔ الیاس برنی ۔۔۔ " للعہ

سفر سعادت ۔۔۔ امیر احمد علوی ۔۔۔ " ۸/۴ر

سفرنامہ حرمین شریفین ۔۔ مولانا محی الدین ۔۔ " ۳ر

" شاہ ایران ۔۔ استاد نواب رامپور ۔۔ " ۸/۶ر

ناول

اسرار رنگون ۔۔۔۔ برمی سیاح ۔۔۔ " ۱۲/۴ر

اصرار خانم کی سازش ۔۔ رازدار ۔۔۔ " ۸ر

درد ۔۔۔۔ احمد حسین خاں ۔۔۔ " ۸/۴ر

سرخ حرف ۔۔۔۔ " " ۔۔۔ " ۸/۴ر

نظیر بیگم ۔۔۔ " " ۔۔۔ " ۱۲/۴ر

واہ ۔۔۔۔۔ " " ۔۔۔ " ۱۲ر

کوہ شملہ ۔۔۔ احمد حسین خاں ۔۔۔ قیمت ۱۲ر

وہ عورت جس نے کرد کھایا " ۔۔۔ " ۸/۴ر

فل بوٹ ۔۔۔ عظیم بیگ چغتائی ۔۔ " ۸/۴ر

لفٹنٹ ۔۔۔۔ " ۔۔۔ " ۸ر

شریر بیوی ۔۔۔۔ " ۔۔ " ۶ر

کنولا ۲ حصے ۔۔۔ شفیع خاں تنیر ۔۔ " ۸/۶ر

سورج مکھی ۔۔۔ خان محبوب طرزی ۔۔ " ۶ر

آفتاب ۔۔۔ سید نصیر حیدر ۔۔۔ " ۸/۴ر

افسانے

ہندوستان ہمارا ۔۔ بلونت سنگھ ۔۔ " ۸/۳ر

پلکوں میں آنسو ۔۔ صدیقہ بیگم ۔۔ " ۳ر

شہر خموشاں موپاساں مترجمہ نصیر حیدر " ۸/۳ر

ڈرامے

آدمی ۔۔۔ نسیم الہ آبادی ۔۔ " ۱۲/۳ر

انقلاب فرانس ۔۔ بارتی ۔۔۔ " ۸ر

روح سیاست ۔۔۔ نور الٰہی محمد عمر ۔۔ " ۸ر

متفرقات

ذکر طیب محمد عربی ۔ مشیر حسین قدوائی میلاد پاک " ۱۰ر

ہندو شعراء ۔۔ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ۔۔ " ۸ر

آب بقا ۔۔۔۔ " " " " ۶ر

لغات مصادر اردو " " " ۸/۳ر

اساس التعلیم ۔ مولوی عبدالحق ۔ فن تعلیم " ۳ر

مکاتیب ۔۔۔ محسن الملک ۔ خطوط " ۸/۴ر

امداد باہمی ۔ منشی اظہر علی علوی ۔ معاشیات " ۵ر

مکتوبات نیاز تین حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جنکے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان وتخییل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی جس میں بھاشا کے کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ ادیئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت۔

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح وخوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص بآسانی ہاتھ کی ساخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل یعنی عروج و زوال ہوت حیات صحت و بیماری شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان ملت وعلماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب وغریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ وطباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت:۔

ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے تھے پہلے حصے میں وہ مقالات تھے جنمیں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن ظفر، غالب مصحفی نظیر، سینا، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔ حصہ اول ختم ہوگیا حصہ دوم للعہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نظریات کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام بلاغت کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام تاجدار لین نمبر ہے جس میں ایک بہترین فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

پاکستان نمبر ۱۹۴۸ء کا پہلا نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت … و تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ سلطنت پاکستان کے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اس کا مقصد نگاہوں سے نہ چھوٹنے پائے جس پر اسلامی حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین … کے شائع کئے گئے ہیں اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے پاکستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

نوٹ، رسالہ ہر ماہ کی … تاریخ تک شائع ہوتا ہے … اطلاع … پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔

جواب کیلئے …

نرخنامہ اجرت اشتہار

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجیے "منیجر"

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ کے لئے قیمت فی کاپی ۱۰؍

ضروری اعلان

پاکستان کے ایجنٹوں اور خریداران نگار کے لئے

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان شرح تبادلہ کی تعیین کے باوجود نگار کا سالانہ چندہ بدستور دونوں ملکوں میں (۔۔۔ روپیہ) رہے گا، اور دونوں جگہ کے ایجنٹوں کو وہی رقم ادا کرنا ہوگی جو اب تک ادا کرتے رہے ہیں۔ [illegible] ہندوستان پھر جلد ہی اپنے روپیہ کی قیمت کو اس کی اصلی حالت پر لے آئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی ہم [illegible] ہندوستان کے چندہ میں اضافہ کرنے پر غور کریں گے۔

[illegible] رقوم ذیل کے پتہ پر جانا چاہئے۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۲۲ پیر الٰہی بخش [illegible] کراچی۔

داہنی طرف کا صلیبی نشان اطلاع ہے
اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس مہینہ میں ختم ہوگیا

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان کے لئے
چھ روپے
اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۵۹ | فہرست مضامین اپریل سنہ ۵۱ء | شمار ۴

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا

یعنی کاغذ کی گرانی و کم یابی نے ہمیں مجبور کر دیا کہ "نگار" کی ضخامت ایک جزو کم کر دیں، یعنی بجائے ۶۴ صفحات کے ۴۸ صفحات پر شایع کریں۔ اس سے قارئین نگار کو یہ دشواری تو ضرور پیدا ہوگی کہ کتابت کے باریک و گنجان ہو جانے کی وجہ سے مطالعہ کے وقت ان کو نگاہ پر زیادہ زور دینا پڑیگا لیکن اسی کے ساتھ ایک فایدہ یہ بھی ہوگا کہ مضامین کے لحاظ سے ۴۸ صفحات کی جگہ ۷۲ صفحات کا مواد ان کو حاصل ہو جائے گا، کیونکہ اب ایک صفحہ میں بہ نسبت پہلے کے تقریباً ڈیوڑھی عبارت آتی ہے۔ موجودہ کتابت و مسطر کی پابندی صرف اسی وقت تک رہیگی جب تک کاغذ کے ملنے میں دشواری ہے۔ اس کے بعد نگار پھر مثل سابق ۶۴ صفحات پر شایع ہوگا۔

منیجر

ملاحظات

کوریا، ایران یا کشمیر؟

آج کل حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر مستقبل کے متعلق کوئی پیشینگوئی نہیں کی جا سکتی۔ انقلابات پہلے بھی ہوتے تھے اور یقیناً بغیر اسباب کے نہ ہوتے تھے، لیکن وہ اسباب نہ اس قدر جلد پیدا ہوتے تھے نہ ان کے نتائج میں اتنی شدت و تیزی ہوتی تھی۔ پہلے صدیوں کا اندازہ سو سال کے زمانہ ہی کو سامنے رکھ کر کیا جاتا تھا اس لئے غور و تدبیر دونوں کے لئے کافی وقت مل جاتا تھا، لیکن اب کہ صدیاں ہفتوں کے اندر سمٹ رہ جاتی ہیں اور پلک جھپکانے ہی کا وقفہ سا لہا سال کے برابر ہے، انسان کیا سوچے اور "اہلِ تدبیر کی واماندگی" کی شکایت کس سے کرے۔ تاہم ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ دُنیا کا نقشہ بدلنا ضروری ہے اور یہ تبدیلی ایسی نہ ہوگی کہ مختلف حکومتوں کا علاقہ مختلف رنگوں سے ظاہر کیا جائے بلکہ اس میں صرف ایک حکومت کا ایک رنگ نظر آئے گا اور اسی ایک حکومت کے قیام کے لئے دُنیا کی موجودہ کشمکش کو ایک نہایت زبردست فیصلہ کن جنگ میں تبدیل ہونا ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر جب غور کیا جاتا ہے تو بحالت موجودہ ہم کو اس وقت دو ہی قوتیں (روس و امریکہ) متصادم ہوتی نظر آتی ہیں اور انھیں دو میں سے کسی ایک کا ساری دُنیا پر تسلط ہونا ہے — ایک بڑی جماعت جسے عوام کی ہمدردیاں حاصل ہیں اشتراکیت کی کامیابی کی متمنی ہے اور دوسری جماعت جو سرمایہ داری اور شخصی تسلط و اقتدار کی حامی ہے، امریکہ کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن ذہنی حیثیت سے ان دونوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ امریکہ سمجھ رہا ہے کہ اشتراکیت چاروں طرف سے اس کو گھیرتی چلی آ رہی ہے، اس لئے اس کی طیاریاں زیادہ تر مدافعانہ ہیں اور روس یہ سمجھتا ہے کہ بغیر جنگ کے بھی اشتراکیت کو دُنیا پر چھا جانا ہے، اس لئے وہ کوئی جارحانہ اقدام کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنی قوت کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب امریکہ خود کوئی جارحانہ قدم اُٹھائے اور چونکہ اب امریکہ جارحانہ حدود سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اس لئے جنگ کا خطرہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔

اس وقت ایشیا میں تین مقامات ایسے ہیں جو روس و امریکہ دونوں کو میدان میں لا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کوریا ہے، دوسرا ایران اور تیسرا کشمیر

کوریا کی پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ اتحادی افواج خط ۳۸ کے قریب آ گئی اور چینی افواج ان کے مقابلہ سے ہٹ کر منچوریا کی طرف اپنا خط دفاع قائم کر رہی ہیں — اس وقت تک روس نے کوریا کے معاملہ میں بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی، لیکن اگر یہ جنگ کوریا کے حدود سے آگے بڑھ کر چینی حدود تک پہونچ گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چین کھلم کھلا میدان میں آ جائے گا اور حسب معاہدہ روس بھی اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوگا، جیسا کہ روس کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے اسی خطرہ سے بچنے کے لئے انگلستان اس کا موافق نہیں کہ اتحادی فوجیں خط ۳۸ سے آگے بڑھیں اور غالباً امریکہ کی ایک جماعت بھی یہی چاہتی ہے، لیکن میک آرتھر ایک بڑی زبردست چال چل رہا ہے۔ اس نے پہلے تو چینی جنرلوں کو گفتگوئے صلح کی دعوت دی اور اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ منچوریا تک پہونچے بغیر کوریا کی جنگ ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ صلح کی دعوت دینے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور چین اس دعوت کو ٹھکرا دیگا اور پھر اسکے بعد وہ اپنی صلح جویانہ چال کی آڑ میں امریکن پبلک کو متاثر کر کے چین پر حملہ کرنے کا جواز حاصل کر سکے گا۔ الغرض کوریا کی موجودہ پوزیشن خطرہ سے خالی نہیں اور بالکل ممکن ہے کہ یہ لڑائی آگے چل کر روس و امریکہ یا بالفاظ دیگر تمام دُنیا کی جنگ بن جائے۔

دوسرا خطرہ جو حال ہی میں پیدا ہوا ہے ایران کا ہے۔ وہاں کے وزیر اعظم رزم آرا کا قتل اور اس کے جانشین حسین اعلیٰ پر قاتلانہ حملہ کی سازش، ان دونوں سے وہاں کے عوام کی ذہنی انقلاب کی نباضی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ ایران کی پبلک چاہتی ہے کہ وہاں کے پٹرول کو قومی ملکیت قرار دیکر انگریزی ٹھیکہ منسوخ کر دیا جائے، جسے انگلستان اور امریکہ دونوں گوارا نہیں کر سکتے، کیونکہ اس طرح نہ صرف یہ ہوگا کہ ان کی کروڑوں روپیہ کی آمدنی ختم ہو جائے گی بلکہ یہ بھی ہوگا کہ وہاں کے پٹرول کی ذخائر پر روس کا تسلط قائم ہو جائے گا اور آجکل پٹرول ہی ایک ایسی چیز ہے جسکے لئے انسان کا زیادہ سے زیادہ خون بہایا جا سکتا ہے۔ پھر اگر انگلستان و امریکہ نے وہاں کے پٹرول پر قابض رہنے کے لئے فوجیں روانہ کر دیں، تو اس معاہدہ کی رو سے جو مابین روس و ایران ہو چکا ہے، روس بھی اپنی فوجیں لے آئے گا اور عالمگیر جنگ شروع ہو جائے گی۔ اس وقت تک جتنی خبریں آئی ہیں وہ بہت

تشویشناک ہیں، کیونکہ وہاں کے عوام کے بڑھتے ہوئے جوش کو دیکھ کر مارشل لا جاری کر دیا گیا ہے اور تقریباً تمام ملک میں فوجی حکومت قایم کردی گئی ہے۔ خود شاہ ایران یا ان کی کابینہ کیا چاہتی ہے، اس کا اب کوئی سوال باقی نہیں رہا، کیونکہ اگر حکومت نے عوام کے منشاء کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو خود اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی اور بالکل ممکن ہے کہ ایران اپنے آپ کو سوویٹ یونین سے وابستہ کرکے اشتراکی حکومت قایم کردے اور وہاں کی شاہنشاہیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس لئے ایران کے موجودہ حالات کو امریکن بلاک اور انجمن اقوام نہایت تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر ایران کی پبلک اپنے مطالبہ پر قایم رہی تو امریکن بلاک اپنی فوجیں وہاں اتار دیگا اور یہ سمجھ کر اتاریگا کہ روس سے اسے جنگ کرنا ہے۔

تیسری جگہ خطرہ کی کشمیر ہے۔ یوں تو کشمیر کا مسئلہ ایسا ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان و پاکستان سے ہے اور اصولاً انجمن اقوام کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن شمالی وجنوبی کوریا کا اختلاف بھی اسی نوعیت کا تھا اور انجمن نے اس کو بین الاقوامی مسئلہ قرار دیکر اپنی فوجیں وہاں بھیجدیں، اس لئے کشمیر کے مسئلہ میں بھی اس اصول پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، علاوہ اس کے چونکہ ہندوستان نے خود اس کا فیصلہ مجلس اقوام سے چاہا تھا اس لئے وہ اس سے پورا پورا فایدہ اٹھائے گی اور کشمیر کے مسئلہ پر اس نقطۂ نظر سے غور نہ کرے گی کہ وہ صرف پاکستان و ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہ یہ دیکھے گی کہ بصورت جنگ امریکن بلاک کشمیر کو روس کے خلاف اپنی کمینگاہ بنانے میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ آیا کشمیر کو ہندوستان کے حوالہ کر دینے کے بعد یا پاکستان کے سپرد کر دینے کے بعد یا اس کے دونوں کٹڑے کرکے ؟ اور وہ غالباً اب تک اس باب میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکی کیونکہ وہ پاکستان و ہندوستان دونوں میں سے کسی کو اس وقت تک ناخوش کرنا نہیں چاہتی جب تک خود اس کا مفاد اس کی اجازت نہ دے لیکن اگر روس و امریکن بلاک کے درمیان اختلاف بڑھتا گیا جس کے اسباب کوریا اور ایران میں زیادہ قوی ہوتے جا رہے ہیں تو اسے بہت جلد ادھر یا ادھر اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا اور پھر اس کے سامنے ہندوستان و پاکستان کی خوشی ناخوشی یا حق و انصاف کا کوئی سوال نہ ہوگا بلکہ صرف اس بات کا کہ اس کی توقعات زیادہ سے زیادہ کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔

لیکن کیا یہ بات اتنی ہی آسان ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے ؟ ہرگز نہیں۔ آیئے اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ غور کریں کہ موجودہ پوزیشن اس مسئلہ کی کیا ہے۔ یہ بات تو اصولاً دونوں ملکوں نے تسلیم کرلی ہے کہ کشمیر کا فیصلہ عوام کی رائے سے ہوگا، لیکن رائے شماری کیونکر ہو اس پر دونوں متفق نہیں۔ آزادانہ رائے شماری کے لئے یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں ملکوں کی فوجیں وہاں سے ہٹالی جائیں اور فریقین میں سے کسی کا اثر وہاں نہ رہے۔ ہندوستان کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ حملہ کی ابتدا پاکستان کی طرف سے ہوئی ہے، اس لئے اس کے خلاف یکطرفہ فیصلہ اسی طرح کا ہونا چاہئے جیسا شمالی کوریا کی حکومت کے خلاف کیا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی فوجیں ہٹانے کے لئے طیار نہیں ہے کیونکہ حفاظت کشمیر کی جو ذمہ داری اس نے اپنے سر لی ہے اس کو اس سے نقصان پہونچ جائے گا۔ ——— اس سے قبل مسٹر ڈکسن کو مامور کیا گیا تھا کہ وہ اس باب میں فریقین کو کسی ایک نقطۂ اتحاد واشتراک پر لانے کی کوشش کریں، لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور سیکورٹی کونسل پھر کچھ دنوں کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس دوران میں کوریا کے مسئلہ نے زیادہ اہمیت حاصل کرلی اور کشمیر کا مسئلہ ملتوی ہوتا گیا، لیکن اب اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ نزاع کوریا، چین و امریکہ کی جنگ قرار پا جائے، نیز اس اندیشہ سے کہ مبادا ایران کی شورش روس و برطانیہ میں تصادم پیدا کردے، کشمیر کی طرف پھر کونسل کو توجہ ہوئی اور اب وہ ثالثی کے ذریعہ سے ہندوستان و پاکستان کی فوجیں ہٹانے کے مسئلہ کو طے کرنا چاہتی ہے۔ جسے پاکستان نے منظور کرلیا ہے اور ہندوستان نے نامنظور۔

ان دونوں کی منظوری و نامنظوری کے جو اسباب بھی ہوں، لیکن اگر پاکستان یہ توقع کرتا ہے کہ فیصلہ بالکل اس کے موافق ہوگا تو یہ بھی بالکل اسی طرح غلط ہے جس طرح ہندوستان کا یہ سمجھنا کہ ثالثی فیصلہ سے انکار اسکے پلہ کو جھکا دیگا۔ اس لئے اس سلسلہ میں یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اگر یہ مسئلہ جنرل اسمبلی میں گیا (جس کا یقین ہے) اور وہاں بھی ثالثی فیصلہ کی تجویز کو برقرار رکھا گیا تو پھر ہندوستان کیا کریگا کیونکہ اگر اس نے پھر تسلیم نہ کیا تو بجبر تسلیم کرایا جائیگا اور اس وقت ہندوستان کے لئے (اگر وہ اپنے مطالبۂ کشمیر پر بدستور قایم رہا) اسکے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ امن وا انجمن سے علحدہ ہو جائے اور اس علحدگی کے صرف ایک ہی معنی ہیں اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو روسی بلاک سے وابستہ کردے۔ ——— الغرض اس وقت کوریا، ایران اور کشمیر تین ایسے بڑے خطرے ہیں جو ہر وقت جنگ عظیم کا سبب بن سکتے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے اولیت کا فخر کسے حاصل ہوگا۔ بہرحال جنگ سے مفر نظر نہیں آتا ——— اور بقول میر :-

دل کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا

آتش اور شاد

(ایک غزل گو کی حیثیت سے)

عنوان مضمون کا تقاضا تو یہ تھا کہ آتش اور شاد کو ایک غزل گو کی حیثیت سے پیش کرنے سے قبل، غزل کی اہمیت، اس کی ساخت، اس کی اثر آفرینی اور اس کی تدریجی ترقیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جاتا مگر چونکہ دور حاضر میں اس موضوع پر کافی مضامین منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکے ہیں اور غزل کی حمایت اور مخالفت میں اتنا سرمایہ موجود ہے کہ اس پر مزید اضافہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ اردو میں غزل گوئی کے خلاف پہلے پہل اردو کے ایک خوش فکر غزل گو ہی نے آواز اٹھائی۔ لوگوں نے غلط سمجھ لیا کہ غزل گوئی سرے سے بیکار ہے اور اس صنف کو ختم ہی کر دینا چاہئے۔ بعضوں نے حالی پر لے دے بھی کی کتنوں نے انھیں سراہا بھی مگر یہ دونوں گروہ حقیقت کی تہ تک نہ پہونچ سکے۔ کچھ آج ہی پر موقوف نہیں اگلے زمانہ میں بھی علماء کے خلاف آوازیں اٹھائی گئیں مگر کن علماء کے خلاف؟ یقیناً علماء سو کے خلاف اسی طرح کن غزل گو شعراء پر سب و شتم کیا گیا؟ یقیناً ان پر جو غزل کو ہزل بنا چکے تھے یا بنا رہے تھے۔ اصلاح کی سخت ضرورت تھی ورنہ عیب بھی ہنر بن جاتا اور ایک زمانہ میں ایسا ہوا بھی۔ لکھنؤ میں ایک طرف زبان کی حیثیت سے شاعری ترقی پذیر ہوئی بھی تو دوسری حیثیت سے مائل بہ زوال بھی ہو گئی، اور اس زبان کی اصلاح کے پیچھے اس نے اپنا قیمتی متاع ہوا ضائع کر دیا جو شاعری کی روح تھی۔ عہد ناسخ و آتش میں شاعری کی یہ بیہودگی، مگر زمانہ اسی رنگ میں رنگا جا رہا تھا، لکھنؤ تو لکھنؤ، دہلی بھی اسی لپیٹ میں آ گیا اور مومن اور غالب جیسا شاعر بھی ناسخ کے کاکل پیچاں میں گرفتار ہو گیا۔

غزالاں حرم تک بھی اسی حلقے میں در آئے　　کہاں تک سلسلہ پہونچا ترے زلف پریشاں کا

لا ریب مومن اور غالب اپنی اپنی افتاد طبع اور رنگ مزاج کی وجہ سے اس دام میں دیر تک اسیر نہ رہے اور دامن چھڑا کر الگ ہو گئے ورنہ یہ دونوں بھی ناسخ کی طرح غزل کی قلمرو سے باہر رہتے۔ ناسخ اگر خود بگڑے تھے تو کوئی شکایت کی بات نہ تھی، ان پر تو الزام اس کا ہے کہ کتنوں کو خراب کیا۔ اور آج بدقسمتی سے ناسخ کے رنگ کوئی پیرو نظر آتا ہے تو اس پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ ناسخ نے اپنے ہم عصر آتش کو بھی خراب کیا، جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو کوئی کیا کرے، اگر آتش اپنی طبیعت کی گرمی اور مزاج کی خودداری سے کام نہ لیتے تو ان کا خاتمہ تھا۔ آتش کی یہ بدنصیبی تھی کہ ہمیشہ ان کو ناسخ کا حریف سمجھ کر ان کا مطالعہ کیا گیا۔ دوسری بدنصیبی یہ تھی کہ غالب کے کلام کی طرح کوئی منتخب دیوان ان کا شائع نہ ہوا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ گوہر ہائے تابان خس و خاشاک میں دبے پڑے رہے اور کسی نے ان کی حقیقی اور واجبی قدر و منزلت نہ کی جس کے وہ مستحق تھے۔ آتش کا ناسخ کے ساتھ مطالعہ کرنا آتش کی توہین ہے، مگر یہ بھی ایک ناگوار حقیقت ہے کہ ایک گروہ آج بھی ناسخ کو آتش پر ترجیح دیتا ہے مگر سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ :-

زمانے میں خدا یا کان دے ان آنکھ والوں کو　　تمیز خر کجا نغمہ کہاں مرغ خوش الحان کا

غزل صرف ایک Mannerism ہی کا نام نہیں، جس کسی نے بھی محض مطلع و مقطع اور ردیف و قافیہ کی پابندی سے چند طرح کے اقتدا و مضامین موزوں کر دئے وہ ہرگز غزل گو نہیں کہا جا سکتا۔ محض حقایق و معارف کا بیان کرنا بھی غزل گوئی نہیں، اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اور صوفیانہ مسایل کا بیان کر دینا بھی غزل گوئی نہیں، نفسیاتی کوایف اور محض حسن و عشق کے معاملات کا بیان بھی غزل گوئی نہیں، اس منفی پہلو سے قطع نظر اگر اثباتی پہلو کی طرف سے کیجئے تو کہا جا سکتا ہے کہ غزل ایک خاص Temperament ہے، حقایق و معارف کا بیان کرنا بھی غزل گوئی ہے، اخلاقی مضامین و تصوف کے اہم مسایل کا بیان بھی غزل گوئی ہے نفسیاتی کوائف اور معاملات حسن و عشق کا ذکر بھی غزل گوئی ہے، مختصر یہ کہ غزل کا دایرہ بہت محدود بھی ہے اور لامحدود بھی، غزل گوئی بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی، یہ ایک ادنیٰ ترین صنف شاعری بھی ہے اور اعلیٰ ترین بھی۔ غزل ایک نیم وحشیانہ طرز شاعری بھی ہے اور مہذب ترین طرز شاعری بھی، تصور غزل کا نیس ترجمہ کا ہے

ایک صناع ہے جو سنگ و خشت سے تاج محل کی تخلیق کرتا ہے، سنگ مرمر میں زندگی کی روح ڈال دیتا ہے وہی دوسرا اناڑی کاریگر انھیں سامان سے ایک بھدی عمارت کھڑی کر دیتا ہے۔ اُردو شاعری گل و بلبل کی وجہ سے بدنام ہے مگر جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ پرلے درجے کے نافہم ہیں۔ کوئی چیز بذات خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی اس کا استعمال اسے اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔ ایک لکھنوی شاعر گل و بلبل کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے:۔

باغ جاتے تو ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی　　　　بلبل بے ادب آ بیٹھے نہ اے جاں سر پر

تصور کو ذرا اور تیز کر کے دیکھئے اگر واقعی بلبل گلابی ٹوپی کو گل سمجھ کے اس پر چونچ مارنے لگے تو کتنا مضحکہ خیز منظر نگاہوں کے سامنے ہو۔ یہ بیچارہ شاعر گل و بلبل کے مفہوم کو اپنی بے بضاعتی اور ماحول کی غلط بینی سے اسی رنگ میں سمجھ سکا۔ ایک دوسرا لکھنوی شاعر جو فطرتاً دہلی اسکول کا متبع تھا اسی ماحول میں گل و بلبل کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے:

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے　　　　ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

یہ عام خیال ہے اور ایک حد تک درست بھی کہ شاعر ماحول کی پیداوار ہے یعنی وہ وہی کہتا ہے جو اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعر ماحول آفریں بھی ہوتا ہے یعنی بعض کی فطرت اتنی بلند ہوتی ہے کہ ماحول سے متاثر ہونے کے بدلے ماحول کو بدل سکتے ہیں، وہ زمانہ کی رو کے ساتھ بہہ نہیں جاتے بلکہ زمانہ کے بہاؤ کو اپنی مرضی کے موافق موڑ کر اپنی راہ الگ نکالتے ہیں۔ آتش کہتا ہے:۔

کرتا ہے مجھ سے ابلقِ ایام شوخیاں　　　　پہچانتا نہیں مگر اس سوار کا

آتش بھی ایسا ہی بلند فطرت شاعر تھا۔ ایک طرف ماحول کی اثر آفرینی سے مجبور دوسری طرف ماحول کی زنانی زندگی سے بیزار، اسی کشمکش میں اسکی ساری زندگی کٹی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں ہم دو رخی رنگ متوازی پاتے ہیں، ایک مصنوعی دوسرا حقیقی۔ خود آتش کو بھی اس کا احساس تھا ایک طرف شاعری کو وہ تصنع اور دروغ بافی کا مترادف سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ:۔

آتش بُرا نہ مانئے، حق حق جو پوچھئے　　　　شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے،

اور دوسری طرف شاعری کو حقیقت و معرفت کا مرقع جانتا ہے:۔

غزل خواجہ ہے مطلب کو پہونچ اے آتش　　　　نالۂ بے اثر مرغ نواسنج نہیں،

شاعر کچھ تو اپنی طبیعت کے تقاضے اور امنگ سے کہتا ہے اور وہی اس کا اصل فطری کلام ہوتا ہے اور کچھ ماحول کے تقاضے اور دوسروں کی فرمائش سے جو اکثر غیر فطری ہوتا ہے۔ آتش کے یہاں یہ دو متضاد تقاضے باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں کبھی تو وہ قافیہ سے مضمون پیدا کرتا ہے اور کبھی مضمون سے قافیہ پہلی صورت غیر فطری ہے اور دوسری فطری، جس طرح ایک دوکاندار کبھی کبھی سستا اور گھٹیا مال عوام کی پسند کے لایق اور بازار کی چلن کے مطابق سر دوکان لگا دیتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اہل نظر اور شائقین کے لئے کچھ "الگ" باندھ کے رکھتا ہے جو "مال اچھا ہے" اب یہ خریدار کی پسند ہے جیسا مال خریدے۔ آتش کی غزل کا پہلا مطلع ہے:۔

معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے،　　　　اُڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

دوسرا شعر ہے:　قید رکھتے موسم گل کی نہیں،　　　　دلوے تیرے گریباں چاک کے،

اب اسی غزل میں لکھنوی ماحول کے تقاضے سے مجبور ہو کر یعنی اس وجہ سے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ مسواک کا قافیہ قلمبند کرنے سے طبیعت عاجز اور قاصر رہی یہ شعر بھی لکھنا پڑا:۔　نیشکر کی پور اے شیریں دہن،　　　　پھیکی ہے آگے تری مسواک کے

یہی حال آتش اور غزلوں کا بھی ہے، اب قارئین پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ مصنوعی آتش اور حقیقی آتش میں امتیاز کرے۔

غزل پر بعضوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کے مضامین کبھی متضاد، کبھی بے ربط اور کبھی بے آہنگ ہوتے ہیں یعنی ایک شعر طرادالی پر تو دوسرا تحت الثریٰ میں، مگر خدارا کوئی ان سے پوچھے کہ آپ غزل کو ایک "مسلسلہ [illegible]" کیوں تصور کرتے ہیں، غزل کا ہر شعر الگ ایک "مکمل" مستقل ایک نظم ہے بلکہ نظم کی ایک ارتقائی شکل۔ میں یہاں پر صرف ایک مثال پیش کر کے خاموش ہو جاؤں گا، ابھی جوش کی ایک پرکیف نظم پر نظر پڑی۔

غالباً عنوان تھا "باغی انسان" ابتدا یوں ہوتی ہے :-

حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا! وہی دفتر ہے وہی مہر و نشاں کیا کہنا!

نظم کافی طویل ہے اور الفاظ کی خوب خوب قلابازیاں ہیں مگر مطلب ہر مصرع کے وہی ایک، ایک ہی اجمال کی ہے جا تفصیل۔ اس پیرایہ میں اپنی ہی نظم کی تضمین کی ہے، ہر شعر پر تین تین مصرعوں کا اور اضافہ! وضاحت پر وضاحت تکرار پہ تکرار۔ بکواس، پر بکواس۔ ایک شعر اور بھی سنئے :-

ترش ہیں ممبر و محراب کے لہجے کب سے پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا!

پوری نظم پڑھ لینے کے بعد حافظہ پر زور دیا تو خیال آیا کہ یہ مضمون کہیں دیکھا ہوا ہے۔ یکایک آتش کا شعر نگاہوں کے سامنے تڑپ اٹھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے مضمون کو اس چستی اور صفائی اور زورِ بیان کے ساتھ شاعر نے صرف دو مصرعوں میں ایک غیر فانی نقش بنا دیا۔ شعر یہ ہے :-

پائے خُم مستوں کے ہوتی کا جو عالم ہے سو ہے سر ممبر وہی واعظ کا بیاں ہے کہ جو تھا

اب آپ ہی بتایئے کہ اس ایک مکمل شعر کے بعد کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم غزل کے دوسرے اشعار کے مضمون کی طرف نگاہ اُٹھائیں، اور خواہ مخواہ ایک کو دوسرے سے پیوستہ کر کے بے ربطی کا الزام بے جا عاید کریں۔

غزل گوئی کو اکثر ناقدین بہت آسان سمجھتے ہیں، ردیف و قافیہ کے زور پر اشعار کہتے چلے جانا اگر یہی غزل گوئی ہو تو ان کا خیال درست ہے۔ مگر ایک حقیقی اور کامیاب شاعر کے لئے ردیف و قافیہ ان کے دلی جذبات کے ادا کرنے میں سدِ راہ نہیں ہو سکتے، ردیف، قافیہ بھی الفاظ ہی کی طرح شاعر کی قدرت کا ملہ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں ورنہ ہر شاعر یا غیر شاعر بھی "کام کیا، نام کیا" کی زمین میں میر کے سے اشعار نکال نہ لیتا۔ مشاعروں میں تو ردیف و قافیہ ہی کی پابندی سے غزلیں کہی جاتی ہیں، سیکڑوں شعراء، اگر آپ کو شاعر کہہ سکتے ہوں، شریکِ بزم ہوتے ہیں، غزل کے اشعار حقیقی معنوں میں صرف وہی ہوتے ہیں جو سامعین کے دلوں میں اثر کریں اور نقش ہو جائیں، باقی سب بکواس، زمانہ خود ایک بڑا نقاد ہے، وہ سب کو کسوٹی پر کس کر کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرتا ہے اور انہی کو خلعتِ دوام بخشتا ہے جن میں صلاحیت ہوتی ہے۔ ولی سے لیکر آج تک ہزاروں ہی نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں غزل گو ہوئے ہوں گے اور حقیقی غزل گو آئندہ بھی زیادہ شاید ہی نکل سکیں، اچھے غزل گو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، آیئے گنیں، میر۔ غالب۔ مومن۔ آتش۔ داغ۔ شاد۔ اصغر۔ حسرت۔ اقبال اور آپ اللہ الصمد فیصلاح۔ یہی اُردو کے عشرہ عشیر ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ "تلک عشرۃ الکاملہ" ان کے بعد دوسرے درجہ کے خوشگو غزل گو ہیں ان کی تعداد بھی کم ہی ہے۔ بقیہ سب قافیہ پیمائی کرتے تھے جو اب بادیہ پیمائی کر رہے ہیں اور ان کا کوئی نام و نشان نہیں۔

غزل گوئی کا معیار قایم کرنا بڑا مشکل کام ہے، میں نے دس شعراء کے نام گنانے کو تو گنا دئے اور ان میں گل سرسبد میر ہی ہیں مگر آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی اور یہ بات صرف کان میں کہنے کی ہے کہ باوجودیکہ میر غزل گوئی کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں مگر ان کے اقلیمِ سخن میں دس غزلیں بھی یکساں، ہموار اور ہم آہنگ نہ ملیں گی۔ اپنی ایک زیرِ قلم تصنیف "میخانۂ تغزل" کے سلسلہ میں مجھے میر کے معاملہ میں بڑی دقت پیش آئی اور ابھی تک میر کی دس غزلیں یکساں رنگ کی مجھے دستیاب نہیں ہوئیں۔ شاید حضرت نیاز میری رہنمائی کر سکیں۔ میر کے منفرد اشعار بے پناہ ہوتے ہیں، مگر پوری غزل ہموار نہیں ہوتی، اس حیثیت سے صرف دو شاعر قابلِ ذکر ہیں، ایک غالب دوسرے شاد۔ غزل کی غزل معیاری ہوتی ہے اور ایک رنگ کی۔ مومن کے ایسے شوخ غزل گو کے یہاں بھی یہ ہمواری نہیں ہوتی۔ بہرکیف کہنے کا مقصد یہ ہے کہ غزل کے اشعار کو تغزل کے معیار پر پرکھنا چاہئے۔ ذوق کا شعر ہے اور غزل کا مطلع ہے

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

انھوں نے کارِ خیر کی فہرست تو بنا دی مگر پھر بھی اس فہرست کو اور طویل کیا جا سکتا ہے مگر ایک دوسرا شاعر اسی مضمون کو کتنی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ادا کرتا ہے

یارے دُنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

یہی وہ نازک فرق ہے جو غزل کو اتنا مشکل بنا دیتا ہے۔ غزل میں ہر قسم کے مضامین کی کھپت ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی، اسلوبِ بیان، الفاظ کا انتخاب، انداز ان سب کا خوش اسلوبی کے ساتھ امتزاج ہو تو وہی چیز "در تاسئے شاعرے چیزے دگر" ہو جاتی ہے یہ محض وجدانی چیز ہے اور ذاقِ سلیم ہی پرکھ سکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے اخلاقی یا مذہبی مضامین بھی اگر شاعرانہ انداز میں قلمبند نہیں ہوتے ہیں تو تغزل میں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ داغ کا شعر ہے اور

حقیقت پر مبنی کہ:-
یہاں بھی تو، وہاں بھی تو، زمیں تیری، فلک تیرا ۔۔۔ کہیں ہم نے پتہ پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

محض اظہار واقعہ ہے مگر شاد اس کو یوں کہتے ہیں :-

ہر طرف ہے وہی ہر شے میں ہے جلوہ اس کا ۔۔۔ ترک نعمت جو کرو، یا ترک ہے گویا اس کا

اور
صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پہ کر نگاہ ۔۔۔ آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

اس مضمون میں مجھے اور غزل گو شعراء سے مطلب نہیں، صرف آتش اور شاد کو لوں گا اور دونوں کی غزل گوئی کے رنگ میں مماثلت اور مخالفت کو جانچنے کی کوشش کروں گا۔ دونوں کے دیوان کے غائر مطالعہ کے بعد ایک شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ دونوں قادر الکلام شاعر تھے، انداز بیان بھی بہت ملتا جلتا ہے، مضامین اکثر مشترک ہیں۔ اکثر غزلیں دونوں کی ایسی ہیں کہ اگر مقطع کی وضاحت نہ کی جائے تو امتیاز مشکل ہے۔ دونوں لفظی حیثیت سے لکھنؤ کے اور معنوی حیثیت سے دہلی کے ہیں۔ دونوں کا دبستان ایک ہے۔ خمریات میں وہی گہرائی اور رندیت ہے، بادۂ تصوف سے دونوں سرشار۔ اخلاق و موعظت کے دونوں مدرس، حقایق و معارف دونوں کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود اور انداز بیان میں شاعرانہ لب و لہجہ دونوں کے یہاں۔ سادگی، غزلیت پیدا کرنے کی مشترک صنعتوں کے دونوں حامل ہیں۔ مگر ایک طرف مماثلت ہوتے ہوئے بھی دونوں کا انفرادی رنگ بھی الگ الگ ہے۔ آتش کے یہاں طنز اور بیکسی پن اس غضب کا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ کلام میں گرمی اور انداز بیان میں تڑپ اس بلا کی ہے کہ کوئی دوسرا شاعر ان کا سہیم نہیں۔ سرور و انبساط، جوش و خروش اور نشاط حیات کی جتنی فراوانی ان کے کلام میں ہے کسی دوسرے کے یہاں نہیں۔ ان کے غم میں بھی ایک مہک ہے، افسردگی میں بھی ایک چمک۔ "قفس میں بھی ہے دھیان چہچہا گلستاں کا"۔ شاد کے یہاں دلگدازی، غم طرازی، افسردہ حالی اور زندگی سے فرار کا عنصر بہت زیادہ ہے اور اس حیثیت سے وہ آتش سے زیادہ میر سے مشابہت رکھتے ہیں، خصوصاً طویل بحروں میں جو سوز و گداز، یاس و الم، غم پژوہی اور سینہ کاوی کے جو نمونے ہم شاد کے یہاں پاتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ آتش غم میں مسکراتے ہیں یا کم از کم اظہار غم نہیں کرتے :

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو ۔۔۔ دل پر ہجوم غم ہو جبیں پر شکن نہ ہو

شاد کا غم چھپانا کیسا اور تڑپتے اور لوٹتے ہیں :-

خود کشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے ۔۔۔ تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

یا دوسری جگہ کہتے ہیں :-

یونہی راتوں کو تڑپیں گے یونہی جاں اپنی کھوئیں گے ۔۔۔ تری مرضی نہیں اے درد دل اچھا نہ ہوئیں گے

ایک دوسرا نمایاں اور قابل ذکر فرق جو ان دونوں کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آتش کے کلام میں ابتذال اور سوقیانہ پن کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ ایسی مثالیں ہوں تو قابل نظرانداز بھی تھیں، مگر شاد کے کلام میں اتنی سنجیدگی، وقار، تمکنت اور ستھرا پن ہے کہ اس حیثیت سے اردو شاعری میں وہ امام نظر آتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی اپنی شاعری کے متعلق کہتے ہیں: "سلسلۂ شعر مہذب کا مرے گھر سے چلا" مگر یہ مصرعہ شاد پر صادق آتا ہے۔ میر کے یہاں بھی کثرت سے ابتذال ہے اور بقول کسی کے ان کے دیوان میں "دہلی کے لونڈے بکھرے پڑے ہیں"۔ غالب بھی "دھول دھپے" پر اتر آتے ہیں اور "بوقت سفر انگشت" تک دکھاتے ہیں، مومن رقیب کا مارا سب کچھ برداشت کرتا ہے اور "شب وصل غیر" بھی کاٹ ہی لیتا ہے، غرض کسی شاعر کا دامن فحاشی اور عریانی سے پاک نہیں۔ مگر شاد کے یہاں الشاذ کالمعدوم، حتیٰ کہ "بوسہ" کا لفظ بھی متانت کے خلاف کہیں استعمال نہیں ہوا۔ کھل کھیلنے کا کیا ذکر، حالانکہ شاد پر بھی جوانی آئی تھی اور ان کو اقرار ہے کہ "جو کیا ہم نے جوانی میں وہ سب کرتے ہیں"۔ غالب تو کھلم کھلا 'بوسہ بازی' کی تحریک کرتے ہیں کہ :-

"بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں"۔ آتش کے یہاں بھی 'بوسہ بازی' ابتذال کا رنگ اختیار کر لیتی ہے:-

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو ۔۔۔ منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں حیا سے پیدا

شاد کے یہاں 'بوسہ' پاکبازانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے:-

بوسۂ سنگ آستاں مل نہ سکا ہزار حیف ۔۔۔ آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمت سرفراز کا

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے
بھر گیا دامنِ نظارہ، گلِ نرگس سے — آنکھ اٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا
وعدہ خلافِ یار سے کہیو پیام بر، — آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا
تری مستانہ آنکھوں کی یہ گردش کا اثر دیکھا — بنے گل رنگ سے سو سو طرح پیمانہ بھر دیکھا
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے
پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی — جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری
کون سی شب ہے جو رو رو کے نہیں کٹتی ہے — شام ہوتی ہے اُدھر چھاتی اِدھر پھٹتی ہے
فسانۂ رخِ رنگیں یار کیا کہئے، — چمن کو آگ لگاتا جو باغباں سنتا،
چشمِ نامحرم کو برقِ حسن کر دیتی تھی بند، — دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا

اب شاد کے کچھ اشعار سنئے :-

ابھی بہت دل میں ہیں امیدیں تڑپ کے حسرت سے مر نہ جائے — ملا اگر شاد سے عزیزو تو ذکر کرنا نہ آرزو کا،
اب اس کا ذکر کیا، قاصد یہ جو گزری گزرنے دو، — نہ کہنا اس خبر کو شاد سے دل ہے گداز اس کا
ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہئے — منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا
خزاں میں سوگوارِ باغ جب فریاد کرتے ہیں — تڑپ جاتے ہیں ہم اپنی مصیبت یاد کرتے ہیں
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں، — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں،
چشمِ سیہ میں سرمہ دے، زلفِ رسا میں شانہ کر — قتلِ جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر
خیالِ وصل کو اب آرزو جھولا جھلاتی ہے — قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دور ہو جانا
اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا — زندگی! چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا!!
زمانہ آرزو کا جا چکا اب آرزو کیسی، — خزاں سے دل لگا دے گل تلاشِ رنگ و بو کیسی
پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں تا کہ رگڑنی سجدوں پہ سجدے — جو نہیں جائز اس کی دعائیں - اُف ری جوانی ہائے زمانے
جذبِ بلبل کھینچتا ہے اک طرف گیسوئے صبا، — دم گھٹا جاتا ہے کیا پھولوں کی بو مشکل میں ہے،
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر — دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے — آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار ——— دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یونہیں رونے میں کٹا ——— کیا کہیں چپ کے سوا

(باقی) سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

۱ خارجی رنگ سے داخلی رنگ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے "ع"
۲ خاقانی سے — [illegible] چوں رستم — [illegible] رستم "ع"

فلسفی اور فطرت

(مکالمہ)

فلسفی :- "تجھے ہم فطرت، طبیعت یا نیچر کے نام سے پکارتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ تو ایک چھپا ہوا راز ہے، ایک معمہ ہے جو حل نہیں ہوتا۔ کامل ۵۰ سال ہوگئے کہ رات دن میں تجھے ڈھونڈھ رہا ہوں لیکن تجھے نہیں پا سکا، تیری حقیقت جاننے کے لئے بیتاب ہوں لیکن تجھے نہیں سمجھ سکا۔ کچھ تو بتا کہ تو کیا ہے؟"

فطرت :- "قدیم اہل مصر بھی (جن کی متعلق کہا جاتا ہے کہ بارہ سو سال تک انھوں نے اپنی انتہائی فراست و دانائی کا ثبوت دیا) تیری ہی طرح میری جستجو میں سرگرداں رہ چکے تھے اور انھوں نے میرا نام ایزیس (Isis) رکھا تھا، لیکن تجھے معلوم ہے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوا۔ انھوں نے میرا نام رکھ کر میرے چہرہ پر ایک اور زبردست پردہ ڈال دیا اور میرا علم ان کے لئے اور دشوار ہوگیا۔"

فلسفی :- تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ میں کوئی معمولی انسان نہیں ہوں۔ میں نے کائنات کے نہ جانے کتنے کُرّوں کا فاصلہ و حجم دریافت کرلیا ہے بلکہ ان کی پیمائش تک کرلی ہے اور ان کی گردش کے اسلوب کو بھی بتا سکتا ہوں، لیکن یہ آج تک نہ جان سکا کہ تو کون ہے، کیا ہے؟

کیا تو ہمیشہ حرکت میں رہنے والی چیز ہے کیا تجھے دائمی سیلان پسند ہے، تجھ میں ہر وقت کیوں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، فعل و انفعال سے تجھے کیوں رغبت ہے۔ کیا تیرے عناصری اجزاء از خود مرتب ہوگئے ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ پانی کی سطح ہمیشہ ایک سی رہتی ہے، پانی میں جب تیل ڈال دیا جاتا ہے تو وہ اوپر آجاتا ہے اور ہوا اس تیل کے اوپر رہتی ہے، ایسا کیوں ہے، کیا روحانیین کا یہ خیال صحیح ہے کہ تیرے اندر روح پائی جاتی ہے۔ تو ادراک و شعور کی مالک ہے اور اسی لئے ایسی عجیب و غریب باتیں تجھ سے ظاہر ہوتی ہیں؟"

فطرت :- "اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میں کل اعظم ہوں۔ میں ریاضی داں یا مہندس نہیں ہوں، لیکن میرے تمام اجزاء بالکل ریاضی کے اصول پر مرتب و منظم ہیں۔ پھر تو ہی بتا کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟"

فلسفی :- "مانا کہ تو کل اعظم ہے اور تیری ترتیب بالکل علوم ریاضی و ہندسہ کے مطابق ہے، لیکن بغیر عقل و ارادہ، بغیر اختیار و اقتدار کے تو یہ سب کچھ کیونکر کر سکتی ہے؟"

فطرت :- "تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں پانی ہوں، خاک ہوں، آگ ہوں، ہوا ہوں، دھات ہوں، معدن ہوں، پتھر ہوں، نباتات ہوں، حیوان ہوں اور میں خود محسوس کرتی ہوں کہ میرے وجود میں شعور و ارادہ پایا جاتا ہے لیکن کیا تو خود شعور و ارادہ نہیں رکھتا؟ پھر کیا تو اسے دیکھ سکتا ہے؟ اسی طرح میں بھی اپنی قوت شعور و ادراک کو نہیں دیکھ سکتی۔ میرے اندر ایک نظر آنے والی قدرت ضرور پائی جاتی ہے لیکن میں اس کو جان نہیں سکتی۔ تو بھی تو میری ہی ہستی کا ایک جزو ہے اور اپنی قوت شعور و ادراک کی حقیقت کو نہیں جان سکتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ تو میری قوت شعور و ادراک کی حقیقت جان سکے اور جو چیز مجھ سے بھی چھپی ہوئی ہے وہ تجھ پر ظاہر ہو جائے؟"

فلسفی :- "ہماری نوع انسانی تو اس میں شک نہیں بڑی دقیق و پیچیدہ ہے، لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جنگلوں، پہاڑوں، میدانوں اور دریاؤں میں تو تیرا جلوہ بڑا سادہ و بغیر کسی تصنع و زینت کے نظر آتا ہے لیکن حیوانات و نباتات میں پہنچ کر کیوں اس قدر پیچیدہ و دقیق ہو جاتی ہے؟"

فطرت :- "سچ تو یہ ہے کہ تو نے اس وقت تک جو کچھ سمجھا ہے وہی صحیح نہیں۔ تو نے میرا ایک نام رکھ دیا ہے جو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، تو مجھے فطرت کہتا ہے، طبیعت یا نیچر کے نام سے موسوم کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں کوئی صنعت ہوں، حالانکہ میں سراپا صنعت و تکلف ہوں۔"

فطرت :- "یقیناً خالی نہیں ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ دریاؤں، پہاڑوں، بیابانوں میں بھی کتنی صناعیاں پائی جاتی ہیں۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ پانی کی ہلاک کی طاقت ایک ہے اور اس کی سطح کبھی نہیں بدلتی، کیا تو واقف نہیں کہ یہ اونچے اونچے پہاڑ کیسی کیسی چیزیں اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ان سے پھوٹنے والے چشمے اگر آج بند ہو جائیں تو دریا خشک ہو جائیں اور حیوانات و نباتات فنا ہو جائیں۔ تو نے موجوداتِ عالم کو صرف تین قسموں میں تقسیم کیا ہے، حیوانات، نباتات و جمادات، لیکن تجھے خبر نہیں کہ ایسے ہزاروں طبقات موجود ہیں جن تک تیری عقل نہیں پہونچ سکتی۔ چیونٹی، گیہوں کا دانہ، چھوٹی سی چھوٹی پتی ان سب کو دیکھ کر ان میں سے ہر ایک بے شمار صنایع و بدایع کا مظہر ہے۔"

فلسفی :- "سچ ہے، میں جتنا غور کرتا ہوں اسی نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ تجھے کسی ایسے صانع دانا اور قادر توانا نے پیدا کیا ہے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جسے ہم کبھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔"

فطرت :- "تو بھی میرے اجزاء وجود کا ایک حقیر سا جزو ہے، اس لئے صرف ان چند ذرات کے سمجھنے پر قناعت کر جو میرے اجزاء وجود سے تجھ کو اعاطہ کئے ہوئے ہیں۔ صرف ان چند قطرات کو غنیمت جان جو میرے بحر بے پایاں سے تجھے نصیب ہو گئے ہیں، چند روز میری آغوش میں رہ کر زندگی اور نشوونما تیرے لئے بہت ہے، یہ سمجھنے کی کوشش نہ کر کہ تو کہاں سے آیا، کیونکر آیا اور ترا پیدا کرنے والا کون اور کیسا ہے۔"

فلسفی :- "اے مادر محترم یہ بالکل صحیح ہے لیکن کچھ تو بتا کہ تیرے وجود کی علت کیا ہے اور تو کس مقصود کے لئے عرصۂ وجود میں آئی ہے۔"

فطرت :- "اے فرزند عزیز، یہ سوال صدیوں سے کیا جا رہا ہے اور جو جواب میں نے اس سے قبل اور سب کو دیا ہے، تجھے بھی دیتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم، میں کیا ہوں اور کیوں عرصۂ وجود میں آئی ہوں۔"

فلسفی :- "سچ تو یہ ہے کہ عدم شاید ان موجودات سے بہتر ہے جو صرف تغیر و تبدل کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ بعض کے ذرات ایسے متصل کہ کبھی جدا نظر آتے ہیں بعض کے ایسے بیتاب کہ ہر وقت نشوونما میں منہمک ہیں، بعض دوسروں کو کھا جانے والے، بعض اپنے آپ کو ہلاک کر دینے والے، بعض ایسے جو شعور و ادراک رکھتے ہیں اور رنج و اندوہ میں مبتلا رہتے ہیں، بعض ایسے ہیں جنھیں کوئی احساس ہی نہیں۔ پھر کچھ تو بتا کہ یہ حیرتناک اختلافات کیونکر پیدا ہو گئے اور اس کا سبب کیا ہے؟"

فطرت :- "اسی سے پوچھ جس نے مجھے پیدا کیا اور بغیر میرے علم و ارادہ کے پیدا کیا۔ خدا حافظ اے فرزند عزیز!"

موجودہ ادیبوں اور شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ

جارحانہ جنگ جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے حیوانیت کا مکمل مظاہرہ ہے۔ وحشت و درندگی، خونریزی و سفاکی اُس کی ذات سے لپٹی ہوئی حقیقتیں ہیں، آگ اور خون کا یہ کھیل فریقین جنگ کے اعصاب میں خطرناک کھنچاؤ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے جو قومیں اور جو ملک ایک دوسرے کے خلاف اسلحۂ جنگ اُٹھاتے ہیں اُن کی نفسیات حیوانی خشونتوں کی حامل بن جاتی ہیں۔ اُن کے جذبات میں بہیمانہ درشتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُنھیں خون کی چاٹ لگ جاتی ہے اور اُن کے ہر عمل سے بربریت کی بو آنے لگتی ہے۔ مختصر لفظوں میں حرب و ضرب کی آگ بھڑکانے والوں کا اخلاقی مزاج بالکل ہی بگڑ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خونیں ڈرامہ کے خاتمہ کے بعد بھی اُن کا یہ رنگِ طبیعت بدلتا نہیں، مزاج کا یہ فساد مختلف بھیسوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور سماج کے تنظیمی نظام کو مختلف گوشوں سے خراب کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ہمارے چاروں طرف ایک "دائرۂ خبیثہ" Vicious Circle قایم ہو جاتا ہے جس کا توڑنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔

اگرچہ خوش قسمتی سے ہندوستان براہ راست دوسری آتش بار جنگ عظیم میں شریک نہیں ہوا تھا اور انگریزوں کے جابرانہ تسلط سے آزاد ہونے کے لئے اُسنے "پریم اور شانتی" کے مجسمہ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں عرصۂ دراز تک جو شاندار کامیاب لڑائی لڑی اُس میں بھی اُس نے اپنے مخالفوں کے خلاف مادی اسلحۂ جنگ نہیں استعمال کئے بلکہ خود رضاکارانہ طور پر زخم کھا کر جیل جا کر بندوقوں کا نشانہ بن کر آزادی کی منزل حاصل کی لیکن اس کے باوجود حیوانیت دوست رجعت پسند طاقتوں نے جو پہلے ہی سے ظالم شہنشاہیت کے ظلِ حمایت میں انسانیت کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی سازشیں طیار کر رہی تھیں، گاندھی جی کی آفریدہ پریم اور شانتی کی یہ فضا ختم کر دی۔ یوم آزادی پندرہ اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے ہی اُنھوں نے فتنوں کی دبی ہوئی چنگاریاں آسمان سے باتیں کرنے والے شعلوں میں بدل دیں اور وہ ہاتھ جو آزادی کی جنگ میں حاکموں کے خلاف نہیں اُٹھتے تھے وہ نہایت وحشیانہ طور سے اپنے بھائیوں کے حلقوموں کی طرف بڑھنے لگے، مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے گلے کاٹے اور ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں، ایک دوسرے کے معصوم بچے ذبح کئے گئے، ایک دوسرے کی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالے۔ ایک دوسرے کا مال و متاع لوٹا اور ایک دوسرے کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس سے انسانیت کے دل میں ہزاروں ناسور پڑ گئے۔ غرضکہ مغرب میں فسطائی اور جمہوری طاقتوں نے تباہ کن جنگ کا جو آتشکدہ روشن کیا تھا، اس طرح ہم نے انسانیت کو پھونک دینے والے اُس کے چند شعلے اس امن و آشتی کی سرزمین تک کھینچ لئے۔ اگرچہ پریم اور شانتی کے دیوتا گاندھی جی نے اس خوفناک آگ کو بہت کچھ اپنے بے گناہ لہو کے چھینٹوں سے بجھا دیا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تھوڑے عرصہ ہی کی اس وحشیانہ فرقہ وارانہ جنگ نے ہمارے دل بگاڑ دئے۔ ہمارے دماغ بگاڑ دئے۔ ہمارا سیاسی شعور برباد کر دیا۔ ہماری وطن پرستی کا تصور مسخ کر دیا۔ ہمارے بڑے بڑے سیاسی مفکرین کے خیالات بنیادی مسایل میں صاف نہیں رہے، تنگ نظری نے تاریکی کا ہالہ اُن کے ارد گرد پیدا کر دیا۔

ان تمام باتوں کے عمل اور ردِ عمل کے نتائج کی اب جو تصویر ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ لوٹ کھسوٹ کا جو ذوق پہلے دبا ہوا تھا وہ طبقاتی اور مذہبی نفرتوں کے ساتھ ساتھ اُبھر کر سطح پر آ گیا ہے۔ قریب قریب ہم میں سے ہر شخص کی خواہش یہ ہے کہ دُنیا کا تمام مال و زر اپنی خود غرضی کے دامن میں سمیٹ لے خواہ اس کے لئے چور بازاری، رشوت جعلسازی، فرقہ بندی وغیرہ وغیرہ جیسے قابلِ نفرت اعمال کا مرتکب ہونا پڑے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان تمام باتوں سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی کی تعمیر کی تخریب ہو رہی ہے۔ ہمارے قومی کردار کا یہ تنزل ہماری ہستی کے لئے بہت ہی خطرناک ہے۔

یہ بالکل واضح بات ہے کہ اگرچہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہماری گردنیں برطانوی پنجۂ استبداد کے قبضہ میں نہیں رہی ہیں تاہم ہمارے قافلۂ آزادی کی یہ آخری منزل نہیں ہے۔ یہ تو پہلا قدم ہے۔ ابھی ہمیں بہت آگے جانا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ ممکن ہو سکے تو ساری دنیا کو جنتِ ارضی میں تبدیل کرنا ہے۔ گرد و غبار ہیں ہر انسان جینے والے کے لئے رنگ و نسل و مذہب کا امتیاز کئے بغیر طبقاتی اور فرقہ وارانہ اختلافات مٹا کر ہر طرح کی فراغت

آسائشوں کی دودھ اور شہد کی نہریں جاری کر دینا چاہیں لیکن اس مقصد کا حاصل ہونا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ موجودہ بداعمالیوں کا "ذخیرۂ خفیہ" زر کا افرادی و اجتماعی اخلاق کی سطح بلند نہیں کی جاتی۔ اس لئے آزادی کے بعد سب سے اہم سوال ہمارے واسطے یہی ہے کہ جبر و ظلم و استبداد و استحصال کی مختلف سمتوں میں پھیل جانے والے بدکرداری کے اس "شجرۂ خبیثہ" کا اچھی طرح استیصال کر دیا جائے۔ اسی طریقہ سے انسانی آسائشوں کی لوٹ کھسوٹ رک سکتی اور تہی دست انسانوں کی زندگی اور اُن کی عزت سے اہلِ ثروت کی دست درازیوں کا کھیل بند ہو سکتا ہے۔

یہ کام ہے درحقیقت ملک کے بے لوث تیز نظر مفکروں کا۔ ملک کے بے لوث ذہین ادیبوں کا، ملک کے بے لوث نکتہ رس شاعروں کا۔ "حال" کی نبض پر اُن کی انگلیاں ہوتی ہیں۔ "مستقبل" کے دل کی دھڑکنیں جو پہلو اختیار کرنے والی ہوتی ہیں اس کا انھیں احساس ہوتا ہے۔ "انسانیت" کے دُکھ درد سے وہ آشنا ہوتے ہیں اور پھر وہ جرأت کے ساتھ موثر عنوان سے اپنے جذبات و احساسات کو جنتا کے سامنے پیش کرنے کے اسلوبوں سے واقف ہوتے ہیں۔ انھیں یہ ڈھنگ آتا ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی کی اُلجھنوں میں پھنسے ہوئے عوام کی توجہ زندگی کے بنیادی مسایل کی طرف موڑ دیں اور انھیں انسانیت کے خدمت گزاروں کی صف میں شامل کر لیں اور اُن برباد کن تحریکوں سے بچائے رکھیں جو "کلیت پسندانہ فسطائیت" کا دودھ پی پی کر پلتی ہیں اور ذرا پُرچال ہو کر قتل و غارت کے فتنے اُبھارتی ہیں۔

ادب و شعر غیر ہنگامی مستقل۔ اعلیٰ قدروں کے حامل ہیں یا نہیں اس بحث سے بالفعل قطعِ نظر کرتے ہوئے یہ عرض کیا جائے گا کہ قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے قیامت خیز لمحے آجاتے ہیں جن کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے مشاغل چھوڑ کر خواہ وہ کتنے ہی مستقل قدروں کے مالک ہوں، کسی خاص مسئلہ کی طرف انسانیت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے سرتاپا ملتفت ہو جائیں گو وہ مسئلہ دیکھنے میں کتنے ہی ہنگامی نوعیت کا ہو اور اُس کی قدر و قیمت کتنی ہی عارضی ہو۔ اسے یوں سمجھئے۔ کسی مکان میں آگ لگ جائے اور وہ اپنے تباہ کن شعلوں میں اس چار دیواری کے اندر جو کچھ زندگی کی کائنات ہے اُسے تیزی سے لپیٹ رہی ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے آتش ریز ہنگام میں اس کا کوئی محل نہیں ہے کہ ہم ان شعلوں کے سایہ میں لطیف شعر ڈھالنے بیٹھ جائیں اور اُس گھر کا مال و متاع جلنے دیں۔ ایسے وقت میں تو ہمارا ایک ہی فرض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح ممکن ہو یہ آگ بجھا دی جائے۔ پیروں سے روند کر۔ پانی ڈال کر ــــ اُس وقت اس فریضہ کی بجا آوری میں غفلت کرنے والا باحواس و با احساس انسان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس بھڑکی ہوئی آگ پر پانی ڈالنے کے بجائے "حسین و جمیل شعری شاہکار" اس قیامت کی گھڑی میں سنانے بیٹھ جانا بے وقت کی راگنی ہوگی۔ یہی صورت اس وقت ہمارے انفرادی و اجتماعی کردار کی ہو رہی ہے۔ ہماری زبوں افعالی، دیش اور انسانیت دونوں کی آبرو ریزی پر تلی ہوئی ہے۔ حیوانیت نے مختلف حالات کے تحت ہم پر اپنا تسلط قائم کر لیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ عبوری دور سے گزر رہے ہیں لیکن ہمیں جن کالی بلاؤں نے گھیر لیا ہے اُنھیں عبوری دور کی ناگزیر چیز سمجھ کر دامن چھڑایا نہیں جا سکتا ان کا مقابلہ کرنا ہے اور پامردی سے مقابلہ کرنا ہے کیونکہ اسی طریقہ سے وطن اور انسانیت کی فلاح کا سامان نکل سکتا ہے۔

ان نازک حالات میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو نہ تو حسن و عشق کے متعلق "فکرِ جمیل" ہی کا موقع ہے، نہ مخالفوں کی دھجیاں چھانٹنے والے جوشیلے انقلابی نعروں کی ضرورت۔ اس وقت انھیں ایسے ادب و شعر کی تخلیق کی ضرورت ہے جو انسان دوستی کا دبا ہوا کچلا ہوا جذبہ دلوں میں اُبھار دے جو دلنشین پیرایہ میں عوام کو یہ سکھائے کہ انسانیت کا احترام دُنیا کا سب سے بڑا فرض ہے۔ انسان دوستی ہی کے مقدس آستانہ پر جبینِ عقیدت رکھ دینا ہمارے تمام موجودہ دکھوں کی دوا ہے، اگر ہم میں انسان دوستی کا جذبہ بیدار ہو جائے تو ہمارے سر سے یہ سب بلائیں دور ہو جائیں۔ انسان دوستی کا مفہوم تو ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس سے نوعِ انسانی صالح ارتقائی منزل کی طرف جادہ پیما ہو سکے۔ اسی لئے اس کے دائرہ میں اگر غور کیا جاوے تو تمام اخلاقی اور معاشرتی تہذیب آجاتی ہے جس سے کسی قوم کے افراد کی انفرادی اور اجتماعی صورتوں میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اُسی میں وہ تمام اقتصادی و معاشی تعمیریں بھی آجاتی ہیں جن سے زندگی کا مادی نظام صحت مند اور معتدل ہو سکتا ہے۔ ایک طرف کی توانائی پر توازن کا لحاظ کئے بغیر انسان دوستی زور نہیں دے سکتی کیونکہ اس سے "یک رخا پن" پیدا ہوتا ہے اور زندگی کا ساز بے آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس انسان دوستی سے انسان صحیح معنوں میں ذمہ دار اور فرائض شناس انسان بنتا ہے۔ انسان دوست انسانیت کا احترام کرنے والا ایسی انفرادی و اجتماعی حرکتوں کا مرتکب نہیں ہو سکتا جن سے نوعِ انسانی تکلیفوں میں مبتلا ہو جائے۔ اُس کے نقشۂ عمل میں انسانیت کے احترام کو برباد کرنے والی جنگ کی کہیں سے گنجایش نہیں نکلتی۔ اُس کے دربار میں "فرقہ وارانہ سودے" کے جھگڑوں اور "شمبہ و دھارمی رقابتوں" کو بار نہیں مل سکتا۔ اُس کے منہ سے امن و آشتی ہی کے نغمے

نکل سکتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں انسانیت کے لئے موجودہ ناسازگار حالات کی موجودگی میں اس وقت ادیب و شاعر کے لئے ضرورت ہے ایسے ادب و شعر کی تخلیق کی جو ہمارے عوام میں شدت کے ساتھ انسانیت کا شعور پیدا کرے جو اُس کے ذہنوں میں یہ بات اُتار دے کہ اُس کے موجودہ سیاسی و اقتصادی دُکھوں اور اخلاقی و روحانی بیماریوں کی اصلی دوا انسانی اقدار کا پُر خلوص احترام ہے۔ اس کے لئے اُسے مذہب کی سکون بخش دامن آفریں قدروں پر زور دینا پڑے گا لیکن وہ اپنے حلقہ میں انسانیت کو مختلف خانوں میں بانٹنے والی مذہب نما جارحانہ رسموں کو نہیں لے سکتا۔ انسانیت دوست ادب کبھی بیر نہیں سکھاتا۔ اُس کا نعرہ "وصل" ہے "فصل" نہیں۔ انسانیت دوست ادب سماج میں اقتصادی و معاشرتی عدل و انصاف پیدا کرنے والے نظام اور اُس کی طرف لیجانے والے مقدمات کو گلے لگائے گا لیکن ایسی چیزوں سے رشتہ کسی صورت سے نہیں جوڑ سکتا جو انسانی اخلاق سے بیگانہ وار گزر جاتا ہی اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتی ہیں اور جو مادیت کو اوڑھنا بچھونا بنا کر سماج کا رجحان "یک رخا" بنائے دے رہی ہیں۔

جاگیرداری و سرمایہ داری کی مجرمانہ بدعنوانیوں اور دست درازیوں نے اس طرح اپنے ردعمل کے طور پر ہمارے شعر و ادب کا مزاج بہت کچھ "انقلابی" بنا دیا ہے اور اُس کا منہ پھولوں کے بجائے بیشتر انگارے اگل رہا ہے اس تیغ در دست و خوں چکاں و آتش بر ہاں ادب و شعر کی بنیاد انتقامی جذبات پر ہے اور ایسے "مادی فلسفہ" پر جو اخلاق و مذہب سے قطع تعلق پر مصر ہے اور جو تمام ادب و شعر کو سرخ سیاسی تحریکوں کا نقیب بنا دینا ضروری سمجھتا ہے اب خواہ اس طریقہ سے اُسے خون کے تیز دھارے ہی پر کیوں نہ بہنا پڑے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اس "مادی فلسفہ" سے ہمیں ایک قسم کا ایسا مادی شعور تو مل سکتا ہے جو اپنی حدوں میں ایک حد تک کارآمد سہی لیکن موجودہ آزاد ہندوستان میں جو سماجی بیماریاں اُبھر آئی ہیں اور جن جن پہلوؤں سے اُن کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے اُن کا اس سے علاج نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں آگ اور خون برسانے والے ادب کی جگہ جب تک کہ "انسانی شعور" پیدا کرنے والا ادب نہیں لے لیتا ہمارے قومی کردار کا نقشہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ یہ "انسانی شعور" حاصل ہو سکتا ہے مادی و روحانی شعور اور اقتصادی و اخلاقی شعور کے متوازن اجتماع سے یہی متوازن اجتماع جنم دیتا ہے عام انسانی خوش حالی اور عام انسانی آسودگی کو۔ اسے بھولنا نہیں چاہئے کہ مادیت اور روحانیت جب تک کہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر صحت مند ذہنیت کا لباس پہن نہیں لیتے انسانیت کے مقدس صحیفہ کے اوراق تیز و تند انقلابی ہواؤں سے بچ نہیں سکتے۔ اور ہندوستانی سماج میں صالح رجحانات پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ میں اس عقیدے کے تحت موجودہ ناسازگار حالات میں اس خیال کا بار بار اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے لئے نہ یہ مناسب ہے کہ وہ روایتی حسن و عشق کے چمنستان ہی کے گل گشت میں محو رہیں اور گلاب کے تختوں ہی میں اپنے شاعرانہ خوابوں کے رومانوی گنبد بنا کے بیٹھے رہیں کیونکہ اس کی نوعیت میدان جنگ سے بھاگ کر شبستانِ عیش میں چھپ رہنے کی ہے۔ روم جل رہا ہو اور نیرو بانسری بجا رہا ہے۔ اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح نہ یہ کوئی دانشمندی کی بات ہے کہ صرف آگ اور خون کی شاعری میں اپنی زندگی کے قیمتی دن ختم کر دئے جائیں۔ اس سے زندگی میں عام ہیجانی کیفیت پیدا ہو کر اجتماعی نفسیات زیر و زبر اور ارتقا کی رفتار ٹیڑھی میڑھی ہو جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں زیادہ صاف طور پر یوں سمجھئے کہ مختلف ناسازگار حالات کے دباؤ نے ہمیں جس زبوں حالی کے شکنجہ میں گرفتار کر دیا ہے اور ہماری سیرتیں جس قدر گھنونی بنا دی ہیں اُس کا علاج نہ تو بے روح کہنہ و فرسودہ ادب کی تخلیق ہے اور نہ مقامی حالات کا لحاظ کئے بغیر دوسروں سے کسی خالص مادی "ازم" کو مستعار لے کر اُس کی اُلٹی سیدھی ترجمانی کر دینا اور "امن خواہی" کے دعووں کے پردے میں جنگ و حرب کی فضا پیدا کر دینا۔ بلکہ اس صورتِ حال کا اصلی درمان ایسے افکار و خیالات کو ادبی و شعری قلموں میں ڈھالنا ہے جن پر انسانیت پسندی کا گہرا ٹھپا لگا ہوا ہو جو اپنے پس منظر میں صحت بخش مذہب و صحت مند اخلاق کا پُر خلوص احترام رکھتے ہوں۔ ایسے ہی انسانیت دوست ادب و شعر کے سرچشموں سے پریم اور شانتی امن اور محبت کی وہ نہریں پھوٹ کر بہہ سکتی ہیں جن سے باہمی رقابت اور عداوتوں کی خونریز جنگوں کے آتش کدے بجھ جائیں اور دُنیا کے قدم عام فلاح و آسائش کی منزل کی طرف بڑھ سکیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح مسولینی اور ہٹلر کی "قوم پرستانہ ازم" سے انسانیت کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوا بلکہ اُن کے جبر و تعدی نے اس کے دل میں گہرے گھاؤ ڈال دئے اسی طرح دوسرے موجودہ آمروں کی جابرانہ نظام بھی اُس کے زخموں پر مرہم نہیں رہ سکتے

[illegible] انسانیت کی تباہی کو ختم کرنے والے جراثیم موجود ہیں۔

[illegible] انسانی ارتقاء انھیں تحریکوں سے حاصل ہو سکتا ہے جو اپنے بنیادی عناصر کے لحاظ سے امن پسند اور صلح جو ہوں اور جو موجودہ اندھی سرمایہ داری تباہ کن رجعت پسندی خون آشام فرقہ غارت اور فتنہ انگیز قومیت کی بربادیوں کا سلسلہ ایسے ذرائع سے روکنے کی کوشش کریں۔ جو غارت پسند نہ ہوں، ایسے ہی پُر امن وسیلوں کے راستہ پر جو انقلاب چلے گا وہ ہمارے سماج کے لئے "ہمہ رخی ترقی" کا سامان ہوگا۔ امن و آشتی کے سایہ میں نشوونما پانے والا انقلاب یا ارتقا جو چاہے کتنے آہستہ خرام سہی غیر ہنگامہ خیز سہی مگر یہی وہ انقلاب جو ہمارے سماج کی کراہیں، ہمارے معاشر کے دکھ درد دور کرے گا اور ہمارے لئے مستقل آسائشوں کے دروازے کھولے گا۔

غیر امن پسند تحریکوں نے انسانیت کے دل میں جو بڑے بڑے گہرے زخم ڈال دئے ہیں، انھیں اگر بھر سکتا ہے تو یہی امن نواز، آشتی پسند انسانیت دوست فلسفہ اور اسی کے دامن سے لپٹی ہوئی صاف ستھری تحریکیں۔

کاش کہ ہمارے شاعر اور ادیب انسانیت دوستی کے فلسفہ کی روح کو پالیں اور اس کی آواز کو اپنے شعر و ادب کے نغموں میں خوبصورتی سے تحلیل کرلیں، ان کے ادبی و شعری تخلیقات کے ساگر سے جو لہریں بھی اٹھیں وہ اسی مقصد کی پیام بر بنتی ہوئی، ان کے گلے سے جو راگ بھی نکلیں ان میں اسی کی دھن ہو۔ اسی کی لے ہو۔

اپنے ادیبوں اور شاعروں سے آج کل کے آزاد ہندوستان کا یہی مطالبہ ہے۔

اختر علی تلہری

سرقہ، توارد، استفادہ

فطرت حد درجہ تنوع پسند واقع ہوئی ہے اور انسان چونکہ قدرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے، اس لئے وہ جدت و تنوع کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جس طرح دو آدمی صورت و شکل میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح عادات و خصایل وغیرہ میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانوروں کی حالت یہ ہے کہ ایک جنس کے تمام جانور یکساں عادت رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے انسان سب ایک ہی جنس ہیں مگر ان میں باہمی اس قدر اختلاف ہے کہ کوئی دو آدمی آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ جس کا سبب وجدان و ضمیر کا اختلاف ہے اور اسی لئے کہ ہر شخص اپنی مخصوص و منفرد بصیرت لیکر پیدا ہوتا ہے اور اسی کے زیر اثر وہ فطرت و کائنات کا مطالعہ کرتا ہے۔ جس کی نظر سطحی ہوتی ہے وہ معمولی انسان سمجھا جاتا ہے، جس کی نظر میں گہرائی ہے وہ فلسفی، سائنسداں یا حکیم کہلاتا ہے اور اگر وہ اپنے غور و فکر کے نتیجہ کو دلنشین اسلوب ادا سے بیان کرنے پر قادر ہے تو وہ شاعر ہے۔ ایک فلسفی یا حکیم سامع کے دماغ کو مخاطب کرتا ہے اور ایک شاعر سامع کے دل یا صحیح تر الفاظ میں جذبات کو مخاطب کرتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک مسئلہ حکمت و فلسفہ بغیر شاعرانہ انداز بیان کے شعر کی صف میں جگہ نہیں پا سکتا اسی طرح صرف رنگین بیانی بغیر تخیل کی گہرائی کے شعر نہیں کہی جا سکتی۔

اسلوب ادا شعر کا ایسا لازمی جزو ہے کہ شعر کی تمام عمارت اس پر قایم ہے۔ یہ اسلوب ادا ہی کا لحاظ تھا جس کے باعث تشبیہ و استعارہ کا ایک مستقل فن بن گیا۔ مولانا عراقی کہتے ہیں :-

بادہ حدیث جاناں دیگر ہمہ حکایت نغمہ خروش مستاں دیگر ہمہ فسانہ

مولانا جامی مے و شاہد کے معنے سنئے، فرماتے ہیں :-

مے چیست؟ جذب عشق کہ بد را و نیک را سازد تہی ز وسوسۂ نیکی و بدی

دوسری جگہ خرابات کی تفصیل کرتے ہیں :-

جامی ز خرابات بود بادۂ عشقت، خواہی ز سبو درکش و خواہی ز سبو نوش

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں شیخ سعدی فرماتے ہیں :-

آنانکہ بدانند پریشانیِ عشاق، دانند کہ نالیدنِ بلبل بچہ نام

گویا سعدی نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ شعر میں بلبل کے نالہ سے شعراء کا کیا مدعا ہوتا ہے۔ اسی بات کو نظیری نے کہا ہے :-

نیست از رنجش نظیری گر شکایت می کنم عندلیبم نالہ کردن ہست رسم و عادتم

مولانا جامی گل و بلبل کی داستان کی تشریح یوں کرتے ہیں :-

ہر کس از دفترِ گل فہم معانی نکند، شرحِ ایں قصۂ ننوشتہ ز بلبل بشنو

اس مضمون کو پھر دہراتے ہیں اور زیادہ زوردار انداز میں :-

ہردم ز دفتر گل خواند بباغ بلبل حرفے کہ شرح دادن نتواں بصد رسالہ

عہد اکبری کے ملک الشعراء فیضی نے ایک قصیدہ میں "بت" اور "برہمن" کے جو معنی ظاہر کئے ہیں قابلِ غور ہیں :-

شکر خدا کہ عشق بتاں است رہبرم بر ملت برہمن و بر دین آزرم،

بت چیست؟ رخ نگاشتۂ معنی ببیں کاندر کلیسیائے ضمیر ست مضمرم

استاد برہمن کہ زبت خانۂ خیال — در سجدۂ حضور فرود آورد دسرم (فیضی)

تشبیہ و استعارہ کا استعمال شعر میں کیونکر اثر پیدا کرتا ہے، اس کے متعلق حضرت عارف رومی فرماتے ہیں کہ:-

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مرزا غالب نے اس کو بالکل صاف صاف کہدیا ہے کہ:-

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن مرزا نے اس کی وجہ نہیں بتائی کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بغیر بادۂ و ساغر کے کام کیوں نہیں چلتا۔ اس کی تشریح علامہ اقبال سے سنئے:-

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی ست — حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

الغرض شاعر کے لئے زبان و بیان اور اسلوب ادا کو خاص طور پر نگاہ رکھنا بیحد ضروری ہے لیکن تخئیل میں اگر ندرت اور بلندی موجود نہ ہو تو بیان کی رنگینی بالکل بے نتیجہ ہے۔

کائنات کے رموز و غوامض پر غور کرنا فلسفہ کا موضوع ہے۔ حقیقی شاعر کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ شاعری کا موضوع دراصل یہ ہے کہ انسان کا تعلق کائنات سے کیا ہے۔ ایک فلسفی فطرت کے خزائن و دقائق کھود کر نکالتا ہے اور ایک شاعر ان کو حیات تازہ عطا کرتا ہے ایک فلسفی اور شاعر کے مطالعہ کائنات میں یہ فرق ہے کہ فلسفی بعض مخصوص اصول و نظریات کو سامنے رکھکر کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اور شاعر صرف اپنے وجدان و ضمیر کو اپنا رہبر بناتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ فلسفی کے بیانات میں اتنا تضاد نہیں ملتا، جتنا تضاد و اختلاف قریب قریب ہر شاعر کے کلام میں ملتا ہے، کیونکہ جذبات میں ہر وقت مختلف قسم کے تغیرات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اس لئے شاعر کی واردات بھی مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ اسی لئے شیخ سعدی کو کہنا پڑا کہ:-

گہے بر طارم اعلےٰ نشینم ، — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

خواجہ حافظ کا شعر ہے :-

حافظا عشق و صابری تا چند — نالۂ عاشقاں خوش ست بنال

دوسرے شعر میں خواجہ خود ہی اس کی تردید بھی کرتے ہیں کہ:-

مرا چو خلعت سلطان عشق می دادند — ندا زدند کہ حافظ خموش باش خموش

اسی طرح نظیری کا شعر ہے کہ:-

آہ کہ عاشق کشد از خامی ست — دود کند دل چو نباشد کباب

پھر خود ہی اس کی تردید کی ہے کہ:-

خاطر بخندۂ گل و مل دائمی شود ، — غیر از گریستن غم دل را علاج نیست

ہر چند کہ شعراء کے بیانات میں بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شاعر کی اپنی مخصوص انفرادیت اس کے پورے کلام میں موجود و نمایاں ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہتا جو غیر شاعر نہ کہہ سکتے ہوں، لیکن اس کے باوجود شعر کی برابر اثر کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے اور اس کا سبب صرف اسلوب بیان ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کام تشبیہ و استعارہ سے لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر گل و بلبل کی داستان کو لیجئے کہ اسکے ذریعہ سے کتنے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ بلبل کے ساتھ عشق کی ایک کیفیت وابستہ ہے اور شعر میں صرف ایک بلبل کا ذکر کر دینے سے وہ تمام حالت سامنے آجاتی ہے اسی کو شیخ سعدی نے واضح کیا ہے کہ:-

آنانکہ بدانند پریشانی عشاق ، — دانند کہ نالیدنِ بلبل بچہ ماند

اسی طرح گل کے ساتھ حُسن کی ایک پوری داستان وابستہ ہے۔ خواجہ وزیر لکھنوی کا مشہور شعر ہے :-

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو ہو کر　　روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر

اس شعر میں جو مضمون گل و بلبل کی داستان کے ساتھ ملا کر ظاہر کیا گیا ہے اس کو کسی دوسری طرح کہیں تو وہ لطف باقی نہیں رہ سکتا۔

غالب کا شعر ہے :- ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار　　سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

سبزہ کے لئے بیگانگی - صبا کے لئے آوارگی - گل کے لئے نا آشنائی محض روایاتی باتیں ہیں، لیکن غالب کے اس شعر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان روایات کو شعرا حقیقت سے کیونکر مربوط کرتے ہیں۔ یعنی بہار کا زمانہ ہی جنون کے جوش کا زمانہ ہوتا ہے اور بہار کے اجزا بھی سبزہ و گل اور صبا ہی ہیں اور ان تینوں کی صفات وہی ہیں جو جنون کی خاص کیفیات ہیں یعنی بیگانگی - آوارگی اور نا آشنائی۔

تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے سلسلہ میں سترھویں صدی کا ایک انگریزی شاعر میتھو پرائر (Matthew Prior) کہتا ہے کہ :-

Similies are like song in love
They much describe, they nothing prove

یعنی تشبیہات ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے کہ محبت کے گیت کہ وہ بیان تو بہت کچھ کرتے ہیں لیکن ثابت کچھ نہیں کر سکتے۔

تشبیہ و استعارہ نہایت مفید ذریعہ ہے جس سے کلام میں زورِ تاثیر، رنگینی اور وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کو ابھی اور زیادہ وسعت دینا چاہئے مگر اس کوتاہ نظری کا کیا علاج کہ ایسی مفید اور ضروری چیز کو سرقہ کی پابندیوں میں جکڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تشبیہ و استعارہ میں سرقہ کرنے کے سلسلہ میں آزاد نے آبِ حیات میں میر تقی میر اور بقا اللہ خاں بقا کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ بقا نے یہ دو شعر کہے تھے :-

(۱)　اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے　　دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

(۲)　سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں　　ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

میر صاحب نے بھی اسی دو آبے کے مضمون کو لکھا :-

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں　　سوکھا پڑا ہے مدت سے یہ دو آبہ

بقا نے اس کو سرقہ سمجھا اور حسبِ ذیل قطعہ کہا :-

میر نے گر ترا مضمون دو آبہ کا لیا　　اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو

یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آبہ کر دے　　اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو　　(آب حیات صفحہ ۲۲۲)

لیکن میر صاحب کی جلالت شان مسلم ہے اور یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس معمولی سے مضمون کے لئے میر صاحب نے سرقہ کرنے کی جرأت کی ہو تاہم چونکہ ہمارے سامنے ایسا کوئی اصول مسلمہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر ہم میر صاحب کو اس سے بری کر سکیں اس لئے بقا کے خیال کی تردید بھی مشکل ہے مگر جب زیادہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بقا نے اس کو سرقہ کہنے میں سخت غلطی کی اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میر صاحب نے بقا کا شعر سننے کے بعد ہی اپنا شعر کہا ہے تب بھی اس کو سرقہ نہ کہنا چاہئے۔ علامہ شبلی، ظہیر فاریابی کے اس شعر کو

اندیشہ کہ گم شود از لطف در ضمیر　　گردوں بہ راز با کمرت در میاں نہاد

کے متعلق فرماتے ہیں کہ :- "متاخرین نے کمر کی تعریف میں نہایت دقت آفرینیاں کی ہیں یہاں تک کہ کمر کو ایک لطیف خیال - ایک باریک مضمون - ایک موہوم تخیل کہتے ہیں - ان سب خیالات کی اصل یہی ظہیر کا شعر ہے" (شعر العجم جلد ۵ صک) اگر بقا کے بیان کردہ سرقہ کو تسلیم کر لیا جائے تو ظہیر کے اس تخیل سے تو تمام شعرائے مابعد نے بقول مولانا شبلی استفادہ کیا ہے اور اس طرح ایک شاعر بھی سرقہ کے الزام سے بچ نہ سکے گا۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں صرف ایک ظہیر کے اس شعر پر کیا منحصر ہے سیکڑوں ہزاروں تشبیہات ہیں جو اردو اور فارسی میں مستعمل ہیں اور سب شعراء ان کو یکساں استعمال کرتے رہے ہیں پھر کیا وہ سب سرقہ کے مجرم ہیں؟ کیونکہ ان کی ابتدا بھی مختلف زمانوں میں مختلف شعرا ہی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے استعارات - تشبیہات اور کنایات

کے بیان میں سرقہ کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہونا چاہئے اور اس کا سبب یہ ہے کہ شعر میں اصل مضمون تو دوسرا ہی ہوتا ہے استعارات و تشبیہات وغیرہ رنگینی، زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ گویا شعر کے لئے تو یہ بھی بمنزلۂ الفاظ کے ہیں۔ جس طرح الفاظ میں سرقہ نہیں ہو سکتا اسی طرح استعارات۔ تشبیہات و کنایات میں سرقہ کا خیال ہی غلط ہے۔ شعراء نے زلف کے لئے مار۔ پیشانی کے لئے لوح سیمیں۔ ابرو کے لئے خنجر۔ مژگاں کے لئے تیر۔ چشم کے لئے نرگس۔ رخسار کے لئے گل، دہن کے لئے نقطہ۔ دندان کے لئے موتی وغیرہ کی تشبیہات استعمال کی ہیں۔ پھر کیا اس کو سرقہ کہا جا سکتا ہے حالانکہ ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جو کسی شاعر پر بذریعہ وحی آسمان سے نازل ہوئی ہو بلکہ انسانی دماغوں ہی نے ان کو پیدا کیا اور ایک سے دوسرے نے اخذ کر لیا۔ اگر دوآبہ کا مضمون میر صاحب نے قصداً وارادتاً بھی بقا کے شعر سے لیا ہو، تب بھی اس کو سرقہ نہ کہنا چاہئے کیونکہ اصل مقصد دوآبہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ فراق محبوب میں اپنی ویرانی کا ایک احوال پیش کرنا ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے :-

آئینۂ سکندر جام جم است بنگر　　تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

اس شعر میں "آئینۂ سکندر"۔ "جام جم" اور "ملک دارا" کا بیان خود مقصود بالذات اشیاء نہیں ہیں بلکہ شاعر جو بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس کے لئے ان استعارات سے کام لیکر مضمون کو زیادہ پر اثر۔ زیادہ رنگین و لطیف بنایا گیا ہے۔ خواجہ حافظ ہی کا ایک اور شعر ہے :-

چنداں بود کرشمۂ و ناز سہی قداں　　کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

اپنے محبوب کے لئے "سرو صنوبر خرام" اور دیگر حسینان جہاں کے لئے "سہی قداں" کے جو الفاظ اس شعر میں آئے ہیں ان کا بیان اصلی مقصد نہیں ہے بلکہ اصلی مقصد اپنے محبوب کا تمام دیگر حسینوں پر تفوق ظاہر کرنا ہے۔ ان الفاظ نے کلام میں شگفتگی و تاثیر ضرور بڑھا دی۔ خواجہ نظیری کا شعر ہے :-

پیوستہ ابرو دکشش ہموارہ مژگاں در زدن　　تا کے کسے بر دل خورد ایں دشنہ ہائے تیز را

محبوب کے ابرو و مژگاں کو "دشنہائے تیز" سے جو تشبیہ اس شعر میں دی گئی ہے اس کا استعمال خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ محبوب کے دیکھنے سے جو ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اس کے لئے یہ ایک موثر پیرایۂ بیان ہے۔ خواجہ نظیری ہی کا ایک اور شعر ہے :-

دل در امید مرہم و ایں آہوان مست　　ریزند بر جراحت ما مشک سودہ را

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ نظیری کا اصل مقصد "آہوان مست" اور "مشک سودہ" کے الفاظ کا استعمال تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان الفاظ نے کلام میں زور پیدا کر دیا۔

ان مثالوں سے یہ امر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تشبیہ و استعارات چونکہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں ہیں اس لئے ان میں سرقہ کا خیال ہی سرے سے غلط ہے اور جب یہ تشبیہات و استعارات خود مقصود بالذات بن جاتے ہیں تو اصل شاعری فنا ہو جاتی ہے جو حال ناسخ اور ان کے تلامذہ و متبعین کا ہوا۔ وہ شاعری نہیں صرف لفاظی ہے۔ وہ ایک بے جان مجسمۂ شعر ہے جس سے کسی کو کوئی فایدہ نہیں ہو سکتا نہ خود آرٹ ہی کی کوئی خدمت انجام پاتی ہے۔

تشبیہ و استعارہ میں سرقہ کے لئے میر شمس الدین فقیر دہلوی حدایق البلاغت میں لکھتے ہیں کہ :- "باید دانست کہ اتفاق قائلیں عموماً در غرضے از اغراض مثل آنکہ شخصے را بشجاعت یا سخاوت یا غیر آں ستایش نماید یا بضد ایں صفات مذمت کنند داخل در سرقہ نیست چہ ایں معنی در عقول و عادات کافۂ ناس تقرر دارد و فصیح و غیر فصیح ہمہ دریں امور شریک اند و اوجوہے کہ دلالت بر آں غرض می نماید مانند تشبیہ و استعارہ و کنایہ و نظائر آں سرقہ را دراں وجوہ داخلت می تواند بود مگر بعضے از تشبیہات و استعارات کہ از غایت شہرت در عقول و عادات استقرار یافتہ باشد و حکم غرض مذکور پیدا کردہ مثل تشبیہ شجاع باسد و جواد بدریا و اشباہ آں" (حدایق البلاغت صفحہ ۱۴۹) اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ جن خصائل کو عام طور پر قابل مدح یا لایق مذمت تصور کیا جاتا ہے ان کی مدح یا ہجو اگر ایک شاعر نے کی ہے اور پھر کسی دوسرے نے بھی کی تو وہ سرقہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص کوئی تشبیہ یا استعارہ وضع کرے اور دوسرا اس کو استعمال کرے تو وہ سرقہ میں شمار کیا جائے گا لیکن اس میں وہ تشبیہات و استعارات شامل نہیں ہیں جو عام طور پر شایع ہو چکے ہیں۔

کوئی تشبیہ یا استعارہ کسی شاعر پر آسمان سے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ سب انسانی دماغوں ہی نے پیدا کئے ہیں اور ان کی اشاعت و رواج بھی اس طرح ہوا ہے کہ ایک کے بعد دوسرے نے ان کو استعمال کیا اور کثرت استعمال کے باعث ہی ان کی یہ حالت ہو گئی کہ "از غایت شہرت و قبول معادات استقرار یافتہ باشد" اگر یہ صحیح ہے تو نئے استعارات و تشبیہات پر پابندی عاید کر دینے کی کوئی معقول وجہ ہونا ضروری ہے۔ جو کچھ پچھلوں نے کیا ہے بعد کے آنے والوں کے لئے اس پر امتناع کے سلسلہ میں اصولی طور پر دلیل و برہان کی حاجت ہے۔

میر شمس الدین فقیر جو کچھ فرماتے ہیں ہمیں اس کی اتباع سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اصولاً درست ہے بھی یا نہیں۔ جو خیال حدائق البلاغت کی متذکرہ عبارت میں پیش کیا گیا ہے وہ اصول پر مبنی ہے کہ تشبیہ و استعارہ و کنایہ ہی وہ چیزیں ہیں جن سے کسی شعر میں شعریت پیدا کی جاتی ہے اور اس لئے کسی ایک شاعر کی ایسی کاوش کو جو صرف اس کے اپنے دماغ سے پیدا ہوئی ہے کسی دوسرے کو استعمال کا حق نہیں ہے اگر کوئی ایسا کرے تو وہ سرقہ ہے لیکن اگر اسی تصور کو اور وسعت دی جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو سرقہ کہا گیا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔

(ا)　تشبیہ و استعارہ ایک شاعر جس مضمون کے ساتھ بیان کرتا ہے دوسرا شاعر بھی اس کو اسی مضمون کے ساتھ بیان کرے، چاہے الفاظ کا رد و بدل ہو جائے

(ب)　تشبیہ و استعارہ کو ایک شاعر جس مضمون کے ساتھ بیان کرے، دوسرا شاعر اس تشبیہ کو کسی دوسرے مضمون سے متعلق کر کے بیان کرے۔

پہلی صورت میں تو سرقہ تشبیہ و استعارہ کا نہیں بلکہ اصل مضمون کا ہوا جس کی بحث آگے آئے گی۔ اور دوسری صورت میں وہ سرقہ ہی نہیں بلکہ ایک دوسری ہی جدت ہوئی جو خود قائلین و ناقدین کی نظر میں بھی معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ مثال کے طور پر اس بقا اور میر کے واقعہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ بقا نے علاقہ دوآبہ کی تری سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ میری دونوں آنکھوں سے بھی اسی طرح ہمہ وقت آنسو نکلا کرتے ہیں جو حالت دوآبہ کی ہے پہلا شعر تو ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف دوآبہ کی تشبیہ بیان کرنے کے لئے ہی شعر کہا گیا ہے لیکن دوسرے شعر میں یہ نقص تو نہیں ہے تاہم مضمون اس کا بھی وہی ہے جو پہلے شعر کا ہے اس کے بعد میر صاحب کے شعر کو دیکھنا چاہئے۔ اولاً تو میر صاحب نے دوآبہ کا لفظ مجرد استعمال نہیں کیا ہے پہلے مصرعہ میں "دریا" کا لفظ لانے سے مضمون صاف ہو گیا۔ جو بقا کے یہاں نہ تھا۔ یہ تو اضافہ ہوا بقا کے مضمون میں۔ دوسرے میر صاحب کا مضمون بھی بقا سے علیٰحدہ ہے کیونکہ بقا تو صرف "دوآبہ" کا لفظ لانے کے لئے رونے کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور میر صاحب عشق کے ایک مخصوص احوال کا ذکر کر رہے ہیں جبکہ انسان پر کمل ویرانی طاری ہو جاتی ہے۔ بقا کے اشعار میں "دوآبہ" کا ذکر کس قدر نمایاں ہے۔ میر صاحب کے یہاں یہ بھی مضمون کا ایک معمولی جزو ہے۔ دوآبہ اپنی تری کے لئے مشہور ہے اور اسی کو بقا نے اختیار کیا ہے۔ لیکن میر صاحب اس میں بھی خشکی پیدا کئے دیتے ہیں۔

متقدمین نے جو تشبیہات وضع کیں ان میں سے بعض کو تو زمانہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اکثر کو قبول عام کی سند عطا کر دی۔ یہی تشبیہات ہیں جو عام زبانوں پر جاری ہیں۔ لیکن اگر حدائق البلاغت کے بیان کو شروع ہی سے اختیار کیا گیا ہوتا تو آج وہ تمام تشبیہات بھی عام نہ ہوتیں۔ دوسرے متقدمین نے صرف معمولی تشبیہات وضع کی تھیں۔ متاخرین نے ان میں سے اکثر پر پوری پوری عمارتیں قایم کر دیں۔ مثلاً جذبۂ شوق میں ایک سرور ہوتا ہے اس کے لئے متقدمین نے شراب کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن متاخرین نے اس لفظ سے جو جو کام لئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے ایک علیٰحدہ تصنیف درکار ہے صرف خواجہ حافظ ہی نے جس مخصوص فلسفہ کی اشاعت میں اپنی ساری عمر صرف کر دی اس کی بنیاد یہی شراب کی تشبیہ ہے جس شخص نے سب سے پہلے اس کو اختیار کیا تھا اس کو اس کی اطلاع نہ تھی کہ آیندہ اس سے کیا کیا کام لئے جائیں گے اور خواجہ حافظ کے فلسفہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے اس سے زیادہ موزوں لفظ ملنا مشکل تھا لیکن اگر شروع سے حدائق البلاغت کے اصول کو اختیار کیا جاتا تو یہ سب فواید یکسر مفقود ہوتے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن تشبیہات۔ استعارات۔ کنایات یا ترکیبوں میں قبول عام حاصل کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے ان کے لئے قائلین یا ناقدین کوئی اصول وضع کریں زمانہ ان کا پابند نہیں ہے وہ شایع اور رائج ہو کر رہتی ہیں اور جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ شعرائے مابعد کی کوششوں کے باوجود بھی زندہ نہیں رہ سکتیں۔ مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں:

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(غالباً) سب سے پہلا "ستم ظریف" کی ترکیب استعمال کی ہے لیکن آج یہ اردو میں ایک عام شایع و رائج ترکیب ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے

مرزا کے بعد سے اس کو کسی نے شعر میں استعمال نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود عام طور پر رائج ہو گئی۔ یہی حال تشبیہات و کنایات یا ترکیبوں کا ہے۔ اس وجہ سے ان کے لئے کوئی ایسا اصول وضع کرنا جو زمانہ کے عام اصول کے مطابق نہ ہو وقت اور زمانہ سے جنگ کرنا ہے۔ زمانہ خود اپنی روش کا پابند ہے قائلین کے اصول روایات کا پابند نہیں ہے۔ اس لئے تشبیہات و استعارات میں سرقہ کو تسلیم کرنا دشوار ہے۔

اس سلسلہ میں اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ بعض تشبیہات یا ترکیبوں سے استفادہ کر کے شعرائے مابعد نے دوسری ہی تشبیہات یا ترکیبیں وضع کر لی ہیں مگر ان قائلین نے اس کو بھی سرقۂ غیر ظاہر قرار دے کر اس کا بھی سدباب کرنا چاہا ہے۔ لیکن اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو شاعری کی تمام ترقی دفعتاً رک جائے گی مگر شعرا نے قائلین کے اس اصول کو عملاً مسترد کر دیا ہے اور شروع سے آج تک برابر یہی ہوتا چلا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ قائلین نے سرقہ کے عنوان کو اس قدر وسعت دیدی ہے کہ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو متاخرین کی تمام کاوشیں سرقہ کے ذیل ہی میں آجاتی ہیں۔ سرقہ کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سرقۂ ظاہر اور سرقۂ غیر ظاہر۔ اور پھر ہر ایک کی مختلف قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ سرقۂ ظاہر کی پہلی قسم انتحال ہے جس کے لئے رسالہ عبدالواسع میں تحریر ہے کہ: "انتحال عبارت است ازآنکہ متکلم کلام دیگرے را بے تغیر در الفاظ و اختلاف مضمون در کلام خود آرد بے قصد اقتباس با وجود علم با آنکہ ایں کلام دیگراست"۔ اور اس کی اکثر مثالیں مجمع الصنائع اور حدائق البلاغت میں درج ہیں۔ بلاشبہ یہ سرقہ ہے اور سخت مذموم قسم کا سرقہ۔ لیکن ہمارے نزدیک سرقہ کی اس قسم کو ادبیات سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ صاحب حدائق البلاغت نے خود بھی اس کو محسوس کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ: "و ایں قسم را شعرائے صاحب قدرت بعمد ارتکاب نمی نمایند مگر بر سبیل توارد خاطر"۔ اور اس کے بعد خواجہ حافظ اور علی حزیں کے دو اشعار نقل کئے ہیں۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے:

زباغ وصل تو یابد ریاض رضواں آب — زتاب ہجر تو دارد شرار دوزخ تاب

پورا شعر بالکل ان ہی الفاظ میں اور اسی ترتیب سے سلمان ساؤجی کے یہاں موجود ہے۔ دونوں بلند پایہ شاعر ہیں اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ ایک نے دوسرے کا سرقہ کر لیا ہے۔ حزیں کا شعر ہے:-

زلفت بمدد گاری آں لب نمکی چند — با مشک بہم کرد و بداغ دل ما ریخت

یہ شعر بعینہ نقی اوحدی کے یہاں موجود ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جو صاحب قدرت شعرا ہیں وہ اس قسم کا سرقہ کرنے کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

انتحال کی دوسری صورت یہ ہے کہ "معنی را بتمام اخذ نمایند و جمیع الفاظ را یا بعضے الفاظ را مترادف بیارند" اس کے بعد تیسری قسم یہ ہے "معنی را با جمیع الفاظ یا بعض الفاظ اخذ نمایند و ترتیب نظم را تغیر دہند و ایں قسم را غارہ و مسخ نامند و دریں قسم اگر شعر ماخوذ از ماخوذ منہ ابلغ باشد مقبول و ممدوح است"۔ چوتھی قسم سرقہ کی یہ ہے کہ "معنی را تمام اخذ نمایند و در کسوت الفاظ دیگر دا اساز ند و دریں قسم نیز اگر شعر ثانی بلیغ تر از اول باشد مقبول و ممدوح است"۔

جس طرح سرقۂ ظاہر کی چار اقسام ہیں۔ اسی طرح سرقۂ غیر ظاہر کی پانچ اقسام قرار دی گئی ہیں جو مختصراً حسب ذیل ہیں:- "اول آنکہ ہر دو شعر در معنی تشابہ داشتہ باشد و شاعر ماہر آنست کہ در اخفائے تشابہ کوشد۔ دوم۔ "آنست کہ معنی شعر ثانی عام تر و شامل تر از اول باشد" سوم۔ آنکہ معنی را از حالے بحالے نقل کنند"۔ چہارم۔ "معنی شعر ثانی ضد معنی شعر اول باشد"۔ پنجم۔ بعضے از معانی شعر دیگرے را اخذ نمایند و چیزے با کہ مورث مزید حسن کلام باشد برآں بیفزایند"۔ آخری قسم کے لئے رسالہ عبدالواسع میں حسب ذیل عبارت موجود ہے "معنی کلام دیگرے را بگیرد بے تعرض بالفاظ اما در معنی دیگر سے چنداں تصرفات حسنہ بکار برد کہ مرتبہ کلام جدید برسد و ایں از سرقات شعر نیست بلکہ مستحسن است و ایں مادہ استعداد ہمہ را بدیع ابداع گویند"۔

سرقہ اور توارد میں فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے مضمون کو جب قصداً اخذ کر لیا جائے تو وہ سرقہ ہے اور اگر اتفاقاً ایسا ہو جائے تو وہ توارد ہے جیسا کہ صاحب حدائق البلاغت سرقہ کی بحث ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں " باید دانست کہ حکم بسرقہ وقتے می تواں کرد کہ علم باخذ شاعر حاصل باشد و ایں اشعار اساتذہ کہ بطریق امثلہ مذکور شد ممکن است کہ بہ قبیل توارد خاطر باشد " (کتاب مذکور صفحہ ۱۹۸) اس سے بھی زیادہ واضح اور شدید الفاظ صاحب مجمع الصنایع لکھتے ہیں کہ " حکم باخذ و سرقہ نباید نمود تا معلوم نبود کہ شاعر دویم شاعر اول بر دو در ہنگام انشاء شعر او را بخاطر داشتہ والا می تواند بود کہ از قبیل توارد خاطر با باشد یعنی انچہ بہ ذہن شاعر اول خطور کردہ بحسب اتفاق بہ ذہن ایں ہم خطور نمودہ باشد کمال اسمٰعیل گوید -

نگر توارد خاطر کہ در مجارے آں، 　　　　نہ ممکن است کہ کس معترض شود بروے
دو ساہ رو کہ براہے روند بر یک سمت، 　　　　عجب نباشد اگر او فتد دیے بر پے

و ایں ابیات امثلہ کہ راقم الحروف جہت اقسام سرقہ نمودہ کلا و حاشا کہ سرقہ باشد بلکہ جمیع توارد خاطر است " (مجمع الصنایع نسخہ قلمی)

گویا سرقہ کے متعلق سوائے احتمال کے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر قطعی حکم لگایا جا سکے کیونکہ کسی شخص کے قصد و ارادہ کو دوسرے کیسے جان سکتے ہیں اور اس طرح ہر سرقہ توارد ہو سکتا ہے اور ہر توارد سرقہ۔ کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ جب ہم کسی شاعر کے ایک شعر کو سرقہ سمجھیں وہ در اصل توارد ہو اور جس کو ہم اپنی خوش فہمی سے توارد سمجھ رہے ہوں وہ دراصل سرقہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ فرض کر لینے کی کیا دلیل ہے کہ جو شخص شاعری کر رہا ہے اس کی نظر سے اپنے پیشروں کے دواوین نہیں گزرے۔ لیکن یہ امر تسلیم کر لینے کے بعد کہ فلاں مضمون پر فلاں شاعر کا مطلع تھا اور اس کے باوجود اس نے وہ مضمون کہا ہے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ شعر کہتے وقت بھی پہلے شاعر کا مضمون پیش نظر تھا یا نہیں۔ اس امر کو ایک انگریزی مصنف سٹرن (Sterne) نے واضح کیا ہے کہ جو لوگ علمی کام کرتے رہتے ہیں ان کے لئے اپنے پیشروں سے توارد ہونا کس طرح ممکن ہے وہ کہتا ہے :-

It is almost impossible for any one who reads much, + reflects a good deal, to be able on every occasion to determine whether a thought was another's or his own.

(ترجمہ) جن کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور جو کافی غور و فکر کرتے رہتے ہیں ان کے لئے ہر موقع پر اس امر کو متعین کر لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کہ یہ خیال خود انکا ہی ہے یا کسی دوسرے کا۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں حکیم آغا جان عیش اور ذوق کے توارد کا واقعہ لکھا ہے کہ دونوں نے ایک ہی مشاعرہ میں غزلیں پڑھیں اور دونوں کے یہاں ایک ہی مضمون موجود تھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے 　　　　تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے 　　　　(عیشؔ)
اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات 　　　　رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے 　　　　(ذوقؔ)

مجمع الصنایع میں خلاصۃ الاخبار سے حسب ذیل واقعہ نقل کیا ہے کہ میر نظام الدین نے سلطان احمد سمرقندی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور بغرض اصلاح میر نظام الدین علی شاہ کے پاس لے گئے۔ موصوف نے فرمایا کہ جس شعر میں ممدوح کا نام آیا ہے اس کے بعد ایک شعر اور اضافہ کرنا چاہئے تاکہ کلام زیادہ مربوط ہو جائے لہٰذا میر نظام الدین نے موصوف ہی سے درخواست کی کہ وہ شعر آپ ہی کہہ دیں انھوں نے فرمایا کہ تم بھی فکر کرو اور میں بھی غور کرتا ہوں۔ غرض دونوں نے علیحدہ علیحدہ شعر لکھنے کے بعد ایک دوسرے کو دکھایا تو دونوں کے شعروں میں ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا وہ شعر یہ ہے :-

بہار باغ جوانی نہال گلشنِ عدل 　　　　گلِ ریاض کرم سرو جوئبار وقار

اس کے علاوہ بھی اور چند واقعات صاحب مجمع الصنایع نے نقل کئے ہیں۔

اس تمام بحث سے قطع نظر سرقۂ غیر ظاہر کی تمام اقسام کے لئے خود ان قائلین کی بھی جو رائے ہے اس کے لئے حدائق البلاغت میں تحریر ہے :-

" اقسام غیر ظاہر سرقہ کہ مذکور شد نزد بلغا مقبول و ممدوح ست بلکہ اطلاع بر آں سرقہ روا نیست چنانکہ صاحب تلخیص گفتہ "

واکثر ہذہ الانواع ونحوھا مقبولۃ، ومنھا ما اخرجہ حسن التصرف من قبیل الاتباع الی حیز الابتداع وکل ما کان اشد خفاء لکان اقرب الی القبول (صفحہ ۱۹۸)

اور ان اقسام میں سے اکثر ایسے ہیں جنکی مثالیں بہتر اور قابل قبول ہوتی ہیں اور وہ وہ ہیں جن کو حسن تصرف نے قبیل اتباع سے حسین ابتداع کی جانب کھینچ لیا ہے اور ہر وہ قسم جس میں خفاء زیادہ ہوتا ہے اقرب الی القبول ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ سرقۂ غیر ظاہر کو سرقہ کہنے کے باوجود یہ قائلین خود بھی سرقہ تسلیم نہیں کرتے اور اس لئے اس پر کوئی مزید بحث کرنا فضول ہے سرقۂ ظاہر کی اقسام میں سے بھی قسم سوم و چہارم نے لئے ان قائلین نے جو کچھ لکھا ہے اوپر گزر چکا ہے کہ اس میں بھی مذموم و معیوب صرف ایک صورت ہے کہ شعر ثانی شعر اول سے کم رتبہ ہو ورنہ وہ بھی معیوب نہیں اور سرقۂ ظاہر کی پہلی قسم یعنی انتحال کے متعلق ہم اپنی رائے پہلے لکھ چکے ہیں۔

سرقہ یا توارد یا شعرائے سابق سے استفادہ کرنے کی بحث میں ابھی مزید تشریح کی ضرورت ہے اور چونکہ مضامین کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اس لئے سرقہ یا توارد کو اسی لحاظ سے متعین کرنا چاہئے اس کی تفصیل یہ ہے کہ:-

تمام اقسام شاعری رزمیہ۔ عشقیہ۔ مدحیہ۔ فخریہ۔ صوفیانہ۔ رندانہ۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تاریخی۔ قومی۔ مراثی وغیرہ پر اگر غائر نظر ڈالی جائے تو اسکو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو شاعر کی ذاتی واردات ہوتی ہے اور دوسری وہ جو تصور و تخئیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱) وارداتی شاعری کے ذیل میں عشقیہ شاعری تو آہی جاتی ہے کیونکہ وہ شاعر کا ذاتی احوال ہونا ہی چاہئے لیکن اس کے علاوہ بھی شاعری کی ہر صنف میں وارداتی شاعری موجود ملتی ہے کیونکہ شاعر فطرتاً حساس دل اور باریک بین نظر لیکر پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ ہر واقعہ و مشاہدہ سے خود متاثر ہوتا ہے اور اپنے تاثرات دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا واقعہ جس سے بذاتہٖ شاعر کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا اکثر اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے جیسے خود اس کا ذاتی واقعہ ہے اور اس میں وہ ایک ایسی تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر سننے والے کی ذاتی واردات بن جاتی ہے۔

(۲) تخئیلی شاعری وہ ہے جس میں شاعر علم و فلسفہ اور تخئیل و تصور کی مدد سے کوئی مضمون پیش کرے۔ تصوف۔ اخلاق۔ رزم۔ فلسفہ۔ فخریہ وغیرہ سب تخئیلی شاعری ہے۔

ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ دونوں اقسام شاعری میں کیا فرق ہے۔

(۱) اقبال کی بے ثباتی پر کسی کا شعر مشہور ہے:

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

اس شعر میں کوئی جزو ایسا نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ جس چیز کو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے خود بھی اس سے متاثر ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر صرف ایک فلسفہ بیان کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف خاقانی جب مدائن کے کھنڈروں سے گزرا تو وہاں کی حالت اور ویرانی کو دیکھ کر اس نے جو قصیدہ لکھا ہے وہ سرتاپا جذبات میں ڈوبا ہوا ہے، کھنڈروں کی زبان سے کہتا ہے:

ما بارگہِ دادیم این رفت ستم بر ما بر قصر ستمگاراں آیا چہ رسد خذلاں

چونکہ مدائن کسریٰ نوشیرواں کا پایۂ تخت تھا اور وہ عدل گستری کے لئے مشہور ہے اس لئے اس لئے اس کے قصر کے کھنڈروں کا نالہ کرنا اول تو خود ہی ایک موثر پیرایہ ہے، پھر ان کی زبان سے یہ مقابلہ کرانا کہ ہم بارگہ عدل تھے۔ جب ہمارے اوپر یہ تباہی آتی ہے تو ستمگاروں کے محلوں پر کیا کچھ بربادی نہ آتی ہوگی اور زیادہ تاثیر پیدا کرنے کا باعث ہے اور اس تقابل میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ جو تباہی ہمارے اوپر آئی ہے باوجود بارگہ عدل ہونے کے آئی ہے اس کے سزاوار تو ستمگاروں کے قصر ہیں۔ جو تباہی کی داستان پہلے شعر میں ہے وہی دوسرے میں ہے لیکن دوسرے شعر میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی ذاتی واردات ہے۔

(باقی)

عزیز حسن مرادآبادی

علمی نفسیات کی فتوحات کے چند نمونے

"توجہ اور مرکزِ توجہ میں تبدیلی"

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہم ہر وقت اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک مخصوص وقت میں ہم ایک اور صرف ایک ہی چیز کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، گو دوسری چیزیں بھی ہمارے احساس کے پس منظر میں موجود رہتی ہیں اور ہم کسی خارجی اثر کی بنا پر ان کی طرف بھی متوجہ ہو سکتے ہیں مفہوم کی وضاحت کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھ کر ہم کوئی کتاب دیکھ رہے ہوں اور اس میں اس طرح کھو گئے ہوں کہ باہر بیٹھے ہوئے دوستوں کی گفتگو، نزدیک کے چمن میں بیٹھی ہوئی فاختہ کی کوکو، موٹر اور دوسری سواریوں کے گزرنے کا شور اور خود ہمارے جسم پر کرسی کے دباؤ وغیرہ کا احساس بے معنی ہو گیا ہو۔ لیکن اس کا قطعی طور پر امکان ہے کہ کسی چڑیا کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہم کو اس خیالی دنیا سے علٰحدہ کر کے اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اس موقع پر ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ ایک مخصوص وقت تک ہم اپنی کتاب ہی کے مطالعہ میں غرق تھے لیکن اور دوسری چیزیں بھی ہمارے احساس کو متاثر کر رہی تھیں، گو وہ ہمارے شعور سے عارضی طور پر باہر ہی تھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو ان تمام باتوں کا جو ہمارے دائرۂ احساس سے باہر تھیں، علم ہی کیونکر ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ فی الفور ان کا علم ہمیں نہیں ہوا لیکن بعد میں جب وہ کیفیات و احساسات شعور کی سرحد میں آگئے تو ہم ان کی موجودگی کو محسوس کرنے لگے۔ مثلاً ٹرین کے سفر کو لیجئے۔ انجن کی سیٹی، پہیوں کی گڑگڑاہٹ، مسافروں کی چیخ پکار ٹرین کے چلتے وقت ہمارے لئے بے معنی تھیں لیکن جیسے ہی گاڑی اسٹیشن پر آکر رکی تو ہمیں ان تمام باتوں کا احساس ہو گیا حالانکہ جس وقت ہمارے حسیات ان آوازوں سے متاثر ہو رہے تھے ہم کو ان کا علم نہ تھا، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم ان کی طرف متوجہ نہ تھے، لیکن ہم متوجہ کن چیزوں کی طرف ہوتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں یا خیالات ہمارے لئے فوری دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں ہم ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں گویا اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ ہماری "مرکزِ توجہ" صرف وہی چیزیں یا خیالات بن سکتے ہیں جو ہمارے شعور کے نزدیک منتخب حیثیت رکھتے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت بدستور اپنی جگہ پر ہے کہ عموماً ہم کو ایک مخصوص لمحہ میں ایک ہی چیز کا احساس ہوتا ہے خواہ اس سے زیادہ دلچسپ چیزیں کیوں نہ موجود ہوں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اشیاء یا خیالات سے ہماری مراد کیا ہے۔ اشیاء یا خیالات مفرد بھی ہو سکتے ہیں اور مرکب بھی پھر ہم "لمحۂ توجہ" میں پورے مرکب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا مفرد کی طرف۔ اس کا جواب ماہرین نفسیات نے یہ دیا ہے کہ مفرد اور مرکب کی بحث ہی فضول ہے دراصل ہم ایک مخصوص اکائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ مفرد ہو یا مرکب۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ہمارے سامنے ہمارا قلم موجود ہے اب اگر ہم اس نقطۂ نظر سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ صرف اس کی نب کو بغور دیکھیں تو یقیناً ہم صرف نب ہی کو دیکھیں گے اور قلم کا بقیہ حصہ اگرچہ وہ ہماری قوت باصرہ کو متاثر کر رہا ہے، ہمارے دائرۂ احساس سے خارج ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا مقصد پورے قلم کو سرسری طور پر دیکھنا ہے تو پورا قلم ہمارے شعور میں آجائے گا گویا اول الذکر صورت میں قلم کا نب ایک اکائی تھا اور دوسری صورت میں پورا قلم۔ اس حقیقت کو مہابھارت کی ایک حکایت جس میں ارجن نے اپنے استاد سے تیر اندازی کرتے وقت یہ کہا تھا کہ مجھے تو درخت پر صرف چڑیا کی آنکھ ہی دکھائی دیتی ہے جسے مجھے نشانہ بنانا ہے بخوبی واضح کرتی ہے۔ دراصل ارجن کی (جو بعد میں بہترین تیرانداز ثابت ہوا) توجہ اتنی شدت سے اپنے نشانہ پر مرکوز تھی کہ پورا درخت اور اس پر چڑیا کا جسم

ان کے لاشعور میں آگیا تھا۔ لیکن اور شہزادے پورے وقت کو (معہ چڑیا کے) اس وجہ سے دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر میں پورا درخت ایک اکائی تھا جس پر وہ اپنی توجہ مرکوز کر رہے تھے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ اگر سکنڈ کے سویں حصہ ($\frac{1}{100}$) یا پانچویں حصہ تک کے لئے کوئی عدد ہماری نظر کے سامنے سے گزار دیا جائے تو ہم بیک نظر عموماً چار پانچ ہندسوں سے زیادہ ذہن میں محفوظ نہیں کر سکتے۔ بعد میں تجربہ اور عقل کی پختگی کے ساتھ ساتھ بعض لوگ چشم زدن میں ۹، ۱۰ یا ۴۰ ہندسے تک ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کا "دائرہ فہم" عمر کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے در حقیقت یہ تفریق اکائیوں کی تبدیلی کے باعث رونما ہوتی ہے اولاً دیکھنے والا ایک عدد کو ایک اکائی فرض کرتا تھا لیکن بعد میں وہ چار یا پانچ ہندسوں کو اکائی فرض کر کے سارے اعداد کو ذہن میں محفوظ کرنے لگا۔ دراصل "دائرہ توجہ" بھی ذہانت کی طرح ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کو جتنا مل گیا اس کی خوش نصیبی ہے۔ اس سلسلہ میں ہزارہا تجربات کئے گئے ہیں اور ماہرین کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس شخص کا "دائرہ توجہ" وسیع ہوتا ہے جو ذہن میں خیالی تصاویر کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کے خیالات جتنی مدھم تصاویر کی صورت میں اس کے دماغ میں پیدا ہوں گے اتنا ہی اس کا دائرۂ فہم تنگ ہوتا چلا جائے گا۔ اس لئے طلبا اور اساتذہ کا فرض ہے کہ اگر وہ کسی کے "دائرہ توجہ" کے متعلق تجربہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو سب سے پہلے اس بات کا امتحان لیں کہ وہ خیالی تصاویر کو کتنی دیر تک ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

"دائرہ توجہ" (Span of attention) کو ناپنے کے لئے ماہرین ٹچسٹاسکوپ (Tachistoscope) نام کا ایک آلہ استعمال کرتے ہیں اس آلہ میں ایک کھٹکے کی مدد سے مختلف کارڈ جن پر اعداد (۳، ۴، ۵ سے لیکر آٹھ) لکھے ہوئے ہیں باری باری $\frac{1}{5}$ سکنڈ کے وقفہ کے لئے دکھلائے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ "جو کارڈ تم نے ابھی دیکھا اس پر کتنے اعداد تھے؟" اور اس کا جواب نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح آٹھ یا دس مرتبہ یہ کارڈ علیٰحدہ علیٰحدہ دکھائے جاتے ہیں اور غلط یا صحیح جواب کے اعتبار سے اس کے "دائرۂ توجہ" کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ بالعموم لوگ چار پانچ سے لیکر سات اعداد تک صحیح جواب دیتے ہیں لیکن بعض حضرات جن کو ریاضی سے شغف ہوتا ہے اس سے اچھے نتائج پیش کرتے ہیں مثال کے لئے ہم برلن یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر ریاضیات کو لے سکتے ہیں جس کا دائرہ توجہ ۴۰ اعداد تک تھا۔ لیکن دراصل یہ دائرہ توجہ کی وسعت نہیں تھی بلکہ وہ اعداد سے انتہائی مانوس ہونے کے باعث چھ چھ، سات سات اعداد کو ایک اکائی تصور کر کے فی الفور چالیس ہندسے تک یاد رکھتا تھا۔ اسی تجربہ کو ہم بجائے اعداد کے نقاط کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ بہتر اس وجہ سے ہے کہ نقاط کو تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں ہی قسم کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔

اسی مسئلہ سے ملتا جلتا ایک مسئلہ "دھیان کے بٹنے" یا توجہ کے ہٹ جانے کا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس ذہنی کیفیت سے واقف ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کسی مخصوص چیز کی طرف متوجہ نہیں رہ سکتا تجربات شاہد ہیں کہ ہر چوتھے اور پانچویں سکنڈ ہمارا "مرکز توجہ" بدلا کرتا ہے اگرچہ ایسے لوگ بھی دیکھے گئے ہیں جو ۲۵ سکنڈ تک اپنی توجہ کو ایک خاص چیز پر مرکوز کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہ سکتے ہیں توجہ کی بیرونی سرحد ۱۵ سکنڈ سے شروع ہو کر ۳ سکنڈ تک ہے۔ ان مختلف نتائج کی مدد سے ہم بخوبی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی کا وقفۂ توجہ کتنا وسیع ہے اور کتنا تنگ۔ دراصل توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے سکوت کی انتہائی ضرورت ہے۔ ایسی جگہ جہاں شور وغل ہو رہا ہو توجہ کا دائرہ گھٹ جاتا ہے "مرکز توجہ کی تبدیلی" پر قوت سامعہ اور باصرہ دونوں ہی کی مدد سے تجربات کئے جا سکتے ہیں۔ اگر قوتِ سامعہ کے ذریعہ تجربہ مقصود ہو تو ہم میٹرانوم (Metronome) نامی ایک آلہ استعمال کرتے ہیں۔ (کسی اچھی گھڑی کی ٹک ٹک سے بھی یہی کام لیا جا سکتا ہے) جو اتنے فاصلے پر رکھا جاتا ہے کہ اس کی آواز اُسے بمشکل سنائی دے چنانچہ بموجب ہدایت وہ اپنی پنسل کو آواز سنتے ہی میز پر مارتا ہے اور اتنے وقفہ تک خاموش رہتا ہے جب تک کہ میٹرانوم دوبارہ ٹک ٹک کی آواز نہ پیدا کرے۔ اس تجربہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک شخص اکثر آواز سننے سے غافل کرتا ہے اور بالعموم

ے یہ گھڑی کی طرح ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتا ہے اور ایک مخصوص وقفہ کے بعد بجتی جاتی ہے۔ وقفہ حسب منشا کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہر ۵ یا چھ سکنڈ بعد اس کی توجہ آواز سے ہٹ جاتی ہے اور وہ غلطی سے پنسل سے آواز پیدا کرتا ہے۔

دائرہ توجہ کو قوت بصارت کی مدد سے بھی ناپا جاتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک گول دفتی جس پر مرکز سے محیط کی طرف تقریباً آٹھ نشانات لگے ہوتے ہیں[1] بجلی کے پنکھے کی مدد سے تیزی سے گھمائی جاتی ہے اور دیکھنے والے کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ محیط سے نزدیک ترین سرکل کو (جو دفتی کے گھومنے سے بنتی ہے) بغور دیکھتا رہے اور جب سرکل کا نشان نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو ایک کھٹکے پر خاموشی سے انگلی جمائے رہے لیکن جیوں ہی سرکل پھر نظر آ جائے وہ کھٹکے کو دبا دے۔ یہ کھٹکا ایک ڈھول (Drum) پر جو سیاہی مائل کاغذ سے ملفوف ہوتی ہے گراف بناتا رہتا ہے اور اس طرح "توجہ کے ہٹنے" کا اس گراف سے بخوبی پتہ لگ جاتا ہے۔ اس تجربہ کے دوران میں دیکھنے والے کو اپنا سر دفتی کی سیدھ میں رکھنا ضروری ہے اور اس تجربہ کو کم سے کم دس دفعہ دہرانا چاہئے تب جا کر ہم کہیں صحیح نتیجہ پر پہونچ سکیں گے، علاوہ ازیں اس عمل میں چونکہ آنکھوں پر کافی زور پڑتا ہے اور سیدھے بیٹھے رہنے سے تکان محسوس ہونے لگتی ہے اس لئے ڈھول کے ہر چکر کے خاتمہ پر اس کو تھوڑا سا آرام کرنے کی مہلت دینا ضروری ہے۔

مرکز توجہ کی متواتر اور دم بدم تبدیلی کی مختلف ماہرین نے مختلف طریقے سے توجیہ کی ہے بعض کا خیال ہے کہ کسی چیز کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھنے سے آنکھ کے بعض حصوں کو تھکن محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے اس تھکن کا ازالہ کرنے کے لئے نگاہ خود بخود اپنی مرکز توجہ کو تبدیل کر دیتی ہے دیگر نظریات کے متبعین نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک مخصوص قسم کی لہر کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو ہر پانچ سکنڈ کے بعد ہمارے جسم سے گزرتی رہتی ہے۔ کچھ ماہرین نے دھیان کے ہٹنے کے مسئلہ کو پٹھوں کے سکڑنے اور پھیلنے سے متعلق کرنے کی کوشش کی ہے، بعض نے سانس کے اتار چڑھاؤ اور نبض کی رفتار وغیرہ کو اس کا باعث قرار دیا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ تجربات اس کے خلاف شہادت پیش کرتے ہیں میرے خیال میں سب سے بہتر نظریہ "توجہ کی لہروں" کا ہے۔ کیونکہ یہ لہریں (Ergograph) الیتھس موگراف آلے کی مدد سے ناپی جا چکی ہیں۔ عضلات یا پٹھوں کے پھیلنے اور سکڑنے کا خیال بھی کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے، بہرحال یہ مسئلہ ہنوز زیر بحث ہی ہے کہ توجہ کن اسباب کی بناء پر ہٹتی ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ شیر شاہ سوری میں یہ غیر معمولی قوت موجود تھی کہ وہ بیک وقت دو یا دو سے زیادہ مسئلوں کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا چنانچہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی آدمیوں سے گفتگو کر سکتا تھا اور ایک زیر بحث مسئلہ کا رشتہ دوسرے مسئلہ کی موجودگی کے باوجود ذہن سے محو نہیں ہوتا تھا۔ ماہرین نفسیات کے تجربات شاہد ہیں کہ ایسا ناممکن ہے کیونکہ اگر کوئی شخص دو مسائل کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کرے گا تو دونوں ہی کام خراب ہو جائیں گے لیکن اگر اس طبیعاتی دقت کے باوجود کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو یقیناً ایک کام کو کرتے ہوئے دوسرا کام از خود (مشق کی بناء پر) ہوتا رہے گا۔

"توجہ" کے بیان میں شور و غل اور دوسرے پریشان کن اثرات کا ذکر جو مرکز توجہ کی تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں، ناگزیر ہے، ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ذہنی انتشار دو قسم کا ہوتا ہے، ایک اندرونی، دوسرا بیرونی۔ اندرونی انتشار جسم کے اندر کے نظام میں کسی تبدیلی کے باعث پیدا ہوتا ہے اور بیرونی انتشار شور و غل اور دیگر بیرونی واقعات و حالات کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ دراصل میں دونوں قسم کے مصنوعی حالات پیدا کئے گئے۔ مثلاً بعض لوگوں کے ہاتھ پر "دوران کار" میں بار بار بجلی کے ہلکے صدمات پہونچائے گئے، اس کے باوجود بھی کام کی مقدار فی منٹ میں کوئی مخصوص تبدیلی نہیں ہوئی، اسی طرح باوجود شور و غل کی موجودگی کے بعض معمول بہ ستعد کام کرتے رہے۔ ایسا تجرباتی واقعات کی بناء پر کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ قائم کیا کہ شور و غل اور پریشانیاں خواہ وہ بیرونی ہوں یا اندرونی کام کی مقدار پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

خواجہ جلیل احمد (علیگڈھ)

؎ (۱)

معین احسن جذبی

غدر کے بعد سر سید اور حالی کی تعلیمی تحریک نے جس کا اثر براہ راست شعروادب پر پڑا اُردو غزل کو بڑا صدمہ پہونچایا۔ غزل کا مخصوص لب و لہجہ ادب کے افادی تصور کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا چنانچہ شعروادب کے مقصدی رجحانات کے سامنے غزل کی آواز مدھم پڑ رہی تھی۔ داغ اور امیر کی آواز میں نہ کوئی نیا پن تھا اور نہ کوئی کشش۔ اقبال اور چکبست کی قومی اور وطنی شاعری نے جدید ادب کی رفتار میں تیزی پیدا کردی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چراغ اب بہت جلد بجھنے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو اُس وقت غزل کو سینے سے لگائے ہوئے تھے یا تو وہ لوگ تھے جو اس کو ماضی کی میراث سمجھ رہے تھے یا وہ لوگ جو زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن حسرت، عزیز، شاد، اصغر اور فانی کی شاعری نے اُردو غزل کو نئی زندگی اور تقویت بخشی۔ انھیں کی دل نشین آوازیں تھیں جن سے اُردو غزل کا احیاء ہوا اور اس چراغ کی لو میں تابناکی پیدا ہوئی۔ جنگ عظیم کے بعد شعروادب کے بدلتے ہوئے میلانات اور زندگی کے نئے تقاضوں نے اُردو غزل کو پھر بڑا نقصان پہونچایا لیکن اس کے نغموں کا اثر فضا میں باقی تھا چنانچہ شعروشاعری کی ابتدا زیادہ تر غزل نگاری سے ہوتی رہی۔

جذبی کی شاعری کا آغاز بھی غزل گوئی سے ہوا۔ ۱۹۲۹ء سے ۳۲ء تک یعنی برابر چار سال انھوں نے صرف غزلیں کہیں۔ بقول آل احمد سرور یہ جذبی کی ذہنی مشق کا دور ہے۔ اس ذہنی مشق نے جذبی کو بڑا فایدہ پہونچایا۔ ان کی بعد کی شاعری کا جو مخصوص لب ولہجہ ہے اس کے متعین کرنے میں اس غزل گوئی نے بڑی مدد دی۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جذبی کے لب ولہجہ میں جو نرمی، افسردگی اور موسیقی ہے ان کے یہاں اشاروں اور کنایوں میں بات کہنے کا جو انداز ہے وہ نتیجہ ہے اسی غزل گوئی سے شغف کا۔ اس سے ایک فائدہ اور بھی ہوا یعنی ۱۹۳۶ء میں جذبی جب ترقی پسند ادب کی تحریک میں شامل ہوئے تو ان کے یہاں وہ بے راہ روی پیدا نہ ہوسکی جو اکثر دوسرے ترقی پسند شاعروں میں ہمیں ملتی ہے۔ جذبی کے اندر فن کی عظمت کا جو احساس ہے وہ بھی اسی غزل گوئی کا نتیجہ ہے۔

جذبی کی شاعری نے جس فضا میں آنکھیں کھولیں وہ پراگندگی اور مایوسی کی فضا تھی۔ یہ دور قدیم وجدید تصورات کے تصادم کا دور تھا۔ نئی تعلیم نے جو نئے اور صالح ذہن پیدا کئے تھے وہ زندگی کی بُرائی اور فرسودہ قدروں سے مصالحت نہیں کرسکتے تھے۔ سماج کی غلط بندشوں کو جو ان کے لئے سوہان روح تھیں وہ توڑنا چاہتے تھے لیکن اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتے تھے۔ سیاسی اور معاشی حالات بھی اسی حد تک غیر اطمینان بخش تھے۔ ہندوستان آزادی کی جدوجہد میں ناکام رہا تھا اور ملک میں ہر طرف شورش برپا تھی۔ پوری دُنیا معاشی بدحالی کا شکار تھی۔ جنگ عظیم ختم ہوچکی تھی، لیکن وہ سیاسی اور اقتصادی بحران جو اس کے نتائج کی شکل میں نمودار ہوا تھا باقی تھا۔ جنگ کی دیوی سوچکی تھی لیکن اس کی روح بیدار تھی۔ امید کی کوئی کرن پھوٹتی بھی تھی تو ایک لمحے کے بعد فضا کی تاریکیوں میں ڈوب جاتی تھی۔ ان حالات میں حساس ذہنوں کا یاس زدہ اور غم پرست ہوجانا لازمی تھا۔ جذبی کی شاعری کا پہلا دور یعنی وہ دور جب کہ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے تھے، اگرچہ محض شخصی غم یا غم عشق کا مظہر ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔ بہرحال جذبی کو ابتدا ہی سے ایک مایوس دل ملا اور یہ مایوسی ان کی شاعری کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ جذبی کی پوری شاعری میں مایوسی کی جو لہر ہے اور ان کے لہجے میں جو شدید لمناکی ہے وہ ان کی ذہنی افتاد کا پتہ دیتی ہے۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "۱۹۳۳ء سے ہمیں جذبی کے یہاں ایک خاص لب ولہجہ کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس میں بہت کچھ فانی کا فیضان ہے" ہمارا خیال ہے کہ اگر فانی

نہ بھی ہوتے تو جذبی کی شاعری کا لب و لہجہ ایسا ہی یا اسی کے لگ بھگ ہوتا۔ یہ جذبی کی ذہنی اُفتاد اور ان کا فطری میلان تھا جو انھیں فانی کی طرف لے گیا۔

۱۹۳۸ء میں جذبی ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ ان کے یہاں اب تک صرف انفرادی غم کی جھلک تھی لیکن اب ان کا لگاؤ غم دیگراں سے بھی ہوا جس کی بنا پر ان کی شاعری میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ اب جذبی کی شاعری میں نہ صرف ایک دل کے درد و دام بلکہ پوری انسانیت کے غم کی داستان جھلکنے لگی۔ لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک جذبی کو وہ رجائیت نہ دے سکی جو ہمیں دوسرے ترقی پسند شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو ان کی طبعی یاس پرستی تھی اور دوسرا سبب جنگ عالمگیر کی ہولناکیاں تھیں۔ اس جنگ نے زندگی کی رہی سہی مسرتوں کو کس طرح پامال کیا اور اس کی زبوں حالی میں کتنا اضافہ کیا یہ خود جذبی کی زبانی سنیئے :-

اور یہ شور گرجتے ہوئے طوفانوں کا
ایک سیلاب سسکتے ہوئے انسانوں کا
ہر طرف سیکڑوں بل کھاتی دھوئیں کی لہریں
ہر طرف ڈھیر جھلستے ہوئے ارمانوں کا
زندگی اور بھی کچھ خوار ہوئی جاتی ہے
اب تو جو سانس ہے آزار ہوئی جاتی ہے (آزار)

اس آزار کا احساس برابر بڑھتا رہا۔ جنگ میں فاشستی طاقتوں نے جمہوری اور عوامی طاقتوں سے شکست کھائی لیکن اسکے بعد کیا زندگی کے افق پر امن و راحت کا ستارہ چمکا؟ کیا حسن و صداقت کی کرنیں فضا کی تاریکیوں کو اُجالے سے بدل سکیں؟ کیا انسانیت کے ماتھے پر کسی نے کوئی دمک محسوس کی؟ آفتاب حیات اس تیرہ و تار کائنات کو کب روشن کرے گا کسی کو معلوم نہیں۔ ہمیں جذبی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے :-

کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانئے کب وہ دن آئے
جس دن کے لئے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

مستقبل سے آس لگانا اچھی چیز سہی لیکن آیندہ کے متعلق کوئی بات قطعیت سے کہی جا سکتی ہے اس میں شبہ ہے اور یہی وہ شبہ ہے جو جذبی کی شاعری میں رجائی عناصر پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اس وقت دُنیا کی جو حالت ہے وہ یہ ہے :-

ہر طرف کارگہ دہر میں اُٹھتا ہے دھواں
ہر طرف موت کے آثار تباہی کے نشاں
سرد اجسام بتاتے نہیں منزل کا پتہ
راہیں ویران ہیں ملتے نہیں راہی کے نشاں (میری شاعری اور نقاد)

لیکن اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھی امید کے دئے جل اُٹھتے ہیں اور راہیں روشن ہو جاتی ہیں مگر اجالے کا یہ آثار مستقل نہیں ہوتا تھوڑی دیر بعد دئے بجھ جاتے ہیں۔ چاند چھپ جاتا ہے اور زندگی کے حصے میں تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں آتا :-

یک بیک آندھیاں اُٹھنے لگیں ہر جانب سے
آن کی آن میں گل ہو گئے حکمت کے دئے
آن کی آن میں گہنا گیا امید کا چاند
تو دیوانہ کا دامن دریدہ ہی رہا

نہ تو مے خوار کو اک قطرۂ صہبا ہی ملا
کلیاں کھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ مرجھانے لگیں (میری شاعری اور نقاد)

جذبی کی اس یاسیت سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ان کا رجحان فراریت کی طرف ہے۔ ایسا بالکل نہیں۔ وہ زندگی کی تصویر بڑی سچائی سے کھینچ دیتے ہیں اور بس۔ اس مایوسی کی بنیاد صداقت پر ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں رجائی عناصر اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتے جب تک کہ خود زندگی میں اس قسم کا کوئی موڑ پیدا ہو جائے۔

جذبی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت داخلیت اور تغزل ہے۔ ان کی شاعری میں جو افسردگی، دردمندی اور ترنم ہے وہ مجموعی طور پر ان کی شاعری کو زیادہ حسین اور مہذب بنا دیتا ہے۔ یہی تغزل ان کا سب سے بڑا شاعرانہ اکتساب ہے۔ جذبی کے داخلی رنگ کی سب سے اچھی مثالیں 'موت'، 'بیزار نگاہیں'، 'توہم'، 'طوائف' اور 'احساس' ہیں۔ جذبی نے کبھی کبھی خارجیت کا سہارا بھی لینا چاہا ہے لیکن اس وقت ان کی آواز میں بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے۔ "نیا سورج" شاعر کی پھیکا پن محسوس ہوتا ہے اور یہ پھیکا پن اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، جب ہم اسی موضوع پر فیض کی نظم جو بڑی کامیاب ہے اور داخلی رنگ کا بڑا اچھا نمونہ ہے سامنے رکھتے ہیں۔ جذبی کی اس غزل کی ناکامیابی کا راز جس کا مطلع ہے:۔

زمیں آسماں چاند سورج ستارے
ہمارے ہیں لیکن نہیں ہیں ہمارے

یہی خارجیت ہے۔ بڑا اچھا ہوتا اگر جذبی صرف داخلی رنگ سے لگاؤ رکھتے۔

جذبی کا شاعرانہ فن ان کا اشاروں اور کنایوں میں بات کہنے کا ڈھنگ ہے۔ شاعر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار براہ راست نہیں کرتا۔ وہ لطیف اور نازک سہارے ڈھونڈتا ہے اور یہ سہارے تشبیہ، استعارے، اشارے اور کنائے ہوتے ہیں۔ وہ ایسا نہ کرے تو اس کی تخلیق میں حسن اور دلکشی نہ پیدا ہو۔ غالب کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف تھا:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو،
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

شاعر "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کے لئے "بادۂ و ساغر" کا وسیلہ اس لئے اور بھی ڈھونڈتا ہے کہ انسانی ذہن حقیقت کا ادراک اشاروں کے ذریعہ زیادہ اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اشاروں اور کنایوں میں ابہام ہوتا ہے، ابہام میں استعجاب اور استعجاب میں حسن۔ اشارے اور کنائے اسی لئے ہمیں زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اشاروں اور کنایوں کا اس حد تک مبہم ہونا کہ شعر کا مفہوم واضح نہ ہو سکے بہت بڑا نقص ہے اور شاعر کو اس نقص سے بچنا چاہئے۔ جہاں ابہام کی سرحد ختم ہوتی ہے اہمال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ شاعر بھٹکتا اسلئے ہے کہ وہ ابہام اور اہمال میں تمیز نہیں کرتا۔ میراجی اور اردو کے اکثر دوسرے ترقی پسند شعراء اشاریت کی اسی رو میں بہے ہیں لیکن جذبی کے اشاروں اور کنایوں کے استعمال کا طریقہ بڑا فن کارانہ ہے۔ 'اے کاش'، 'طوائف'، اور 'احساس' جیسی نظمیں جذبی کے اس فنی کمال کی مظہر ہیں۔ 'میری شاعری اور نقاد' میں انھوں نے دنیا کی موجودہ حالت کی جو تصویر اشاروں کنایوں کے رنگوں سے بنائی ہے وہ حسین و دلکش بھی اور واضح بھی۔

آخر میں ہمیں جذبی کی ترقی پسندی یا رجعت پسندی کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ بعض "نقاد" جذبی کو رجعت پسند بتاتے ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ جذبی کو رجعت پسند کہنا ادبی ترقی پسندی کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ جذبی کو رجعت پسند کہنے کی بنیاد یہ باتیں ہو سکتی ہیں۔ جذبی کی یاس زدہ شاعری میں حیات نو کی جھنکار سنائی نہیں دیتی۔ اور نہ اس میں ہمیں وہ پیغام ملتا ہے جس سے زندگی کو

سنوارنے اور اسے خوشگوار بنانے میں کوئی مدد مل سکے۔ اور یہ کہ جذبی وقتی موضوعات کو چاہے وہ کتنا ہی اہم ہوں کبھی نہیں اپناتے اور ابدیت کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ جذبی کی شاعری کی یاسیت اور المناکی کے جواز میں ان کی مایوسی پر لکھتے ہوئے بتایا جا چکا ہے کہ ان کی شاعری، ماحول اور زندگی کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔ جب خود زندگی کیف و سرمستی سے خالی ہو پھر اس کے آئینے یعنی شعر و ادب میں مسرت کی روح کیسے اور کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ ترقی پسند شاعر اپنی نظموں میں رجائیت کا پیوند بھی لگائے۔ جہاں تک زندگی کے پیغام اور عمل کی راہوں کے تعین کا سوال ہے ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دائرۂ عمل شاعر کا نہیں بلکہ سیاسی قاید اور قوم کے مصلح کا ہے۔ ترقی پسند ادب سڑے گلے سماج اور بدبودار ماحول سے نفرت اور بیزاری پیدا کرتا ہے اور زندگی کی تلخیوں کا احساس دلاتا ہے اور بس۔ وہ راہیں نہیں بتاتا اس لئے کہ وہ ہر حال میں ادب ہوتا ہے۔ شاعری میں مقصد کا اظہار واضح طور پر کرنا فن کا خون کرنا ہے۔ رہیں وقتی اور ابدی موضوعات کی باتیں سو ہمارا خیال ہے کہ جذبی کا تغزل ان کی شعریت اور اشاریت یعنی ان کا مخصوص آرٹ ہنگامی موضوعات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ جذبی ترقی پسند شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں اردو کے کتنے شاعر ہیں جن میں یہ دونوں باتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

محمود الحسن ایم۔ اے (علیگ)

نظامی گنجوی

(ایک روسی ادیب کی نظر میں)

نکولائے تخونوف، موجودہ سوویٹ ادیبوں میں بڑے پائے کا شاعر و مصنف سمجھا جاتا ہے۔ پچھلے سال وہ پوری ادبی تنظیم سوویٹ یونین کا صدر رہ چکا ہے۔ ذیل کا مضمون اسی مقالہ کا ترجمہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویٹ عوام اور ادیب نظامی کو کتنا بلند مرتبہ دیتے ہیں۔

آذربیجان کے شاعر اعظم نظامی گنجوی کی آٹھ سوویں سالگرہ کے جلسہ سے اٹھ کر میں ایک دوست سے ملنے چلا گیا۔ اس کا کمرہ مختصر اور پرسکون تھا، شاید اس کمرے کی طرح مختصر جس میں بیٹھ کر نظامی اپنے غیر فانی شاہکار لکھا کرتا تھا۔ اس کمرے میں مجھے دو چیزیں ایشیائی مذاق کی نظر آئیں ایک قالین اور ایک دوات جو اونٹ کی وضع کی تھی۔ میرے دوست کا نام کرولیوف ہے۔ ادبی مذاق کے اعتبار سے وہ ایک مستشرق اور فارسی زبان کا ماہر و عاشق ہے۔ اس کی الماری میں جو کتابیں چنی ہوئی تھیں وہ زیادہ تر پرانی اور گرد آلود تھیں۔ شہر لینن گراڈ کے ایک معمولی کمرے میں اس کا فارسی شعر گنگناتے رہنا مجھے ایک ذرا انوکھی سی بات محسوس ہوئی۔

کرولیوف فوج میں لفٹنٹ تھا اور اس وقت وردی کا فوجی کوٹ پہنے تھا، جب وہ میرے لئے چائے بنانے کے لئے انگیٹھی میں اخبار کے ورق جلانے لگا تو اس کی روشنی میں کالر پر فوجی افسری کے دو امتیازی نشان لگے نظر آئے۔ چائے طیار ہوئی اور ہم دونوں مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے، نظامی کے متعلق گفتگو ہوئی، نئی سوویٹ نسل کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا جس نے اپنے مطالعہ کے کمروں کو سرنگوں اور خندقوں سے بدل لیا ہے، نازی دشمنوں کا ذکر آیا جنھوں نے انسانیت اور کلچر کو طلاق دیدی ہے، پھر آذربیجان اور نظامی کے فن و کمال پر بات چیت ہوتی رہی۔ کرولیوف نے سردی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نظامی کا زمانہ بھی خون خرابے کا زمانہ تھا، جیسا ہمارا ہے، لیکن نظامی کو اپنی قوم کی قوت مدافعت اور اس کے مقصد کے برحق ہونے پر کامل عقیدہ تھا، اس عقیدے میں کسی وقت اضمحلال یا کمزوری نہیں آئی"

"ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے اور ہم بھی اس پر مستحکم ہیں!" میں نے کہا

"ہاں، نظامی کو پختہ یقین تھا کہ دنیا کو حرکت میں رکھنے والی قوت نیکی اور انسانیت پرستی کی قوت ہے، بدی اور بربریت کی نہیں، اور یہ اس کی اس حکایت سے ثابت ہے:۔

"ساسانی بادشاہ انوشیرواں شکار میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ اس کے ساتھ بس اس کا وزیر تھا۔ ان کا گذر ایک ویران گاؤں کی طرف ہوا جہاں کوئی انسان کیا معنی جانور تک بھی نہ تھا، البتہ ایک شکستہ دیوار پر دو الو بیٹھے بڑے زور سے "گھو گھو" کر رہے تھے۔ ویرانی اور سناٹے میں الوؤں کی آواز سن کر انوشیرواں کے دل میں خوف سا پیدا ہوگیا۔ اس نے وزیر سے پوچھا کہ تم تو پرندوں کی زبان جانتے ہو، یہ الو کیا باتیں کر رہے ہیں؟ وزیر نے کہا کہ ایک الو دوسرے سے اپنی بچی کی شادی کر دینے کے عوض گاؤں کا یہ ویرانہ اور ایسے ہی دو اور مانگتا ہے۔ دوسرا کہہ رہا ہے کہ دو کیا تم دو تین نہیں تین سو دے دوں گا اگر خدا نے چاہا کہ انوشیرواں کی حکومت عرصہ تک قائم رہے، کیونکہ اس کی حکومت ظلم و ستم اور تباہ حالی کی شناسا ہے"

کرولیوف نے حکایت ختم کر کے اپنی بات جاری رکھی :-

" نظامی کی شاعری میں، صدیوں کے فاصلہ کو طے کر کے خوف و دہشت کی سانسیں اور تباہی و بربادی کی گرد ہم تک پہونچتی ہے
نظامی نے حکایت کو ان لفظوں پر ختم کیا ہے کہ " نظامی قصہ مختصر کر، تیرا دل خون ہو رہا ہے !"

یہ کہکر میرا دوست ذرا چپ ہو گیا اور کھڑکی میں سے نیوا ندی کو دیکھتا رہا، جہاں پت جھڑ کے موسم کا دھندلکا چھایا ہوا اور اسٹیمروں کے مستول اور چمنیاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آج کا انوشیرواں، نظامی کے انوشیرواں سے زیادہ ظالم و سفاک ہے جو ایک روس ہی کو نہیں ساری دنیا کو ویرانہ بنا دینے کے لئے نکلا ہے! میں کہتا ہوں کہ ہماری ادبی صناعت اتنی مکمل کیوں نہیں جو اس جدید خونخوار کو اس کے اصلی رنگ روپ میں نقش کر سکتی جس طرح نظامی کی صناعت نے اس وقت کے خونخوار کو نقش کیا ہے؟ تم ادبی کارناموں کا ذکر کر رہے تھے مگر نظامی کا سا ادبی کارنامہ ہم کہاں پیدا کر سکتے ہیں ؟"

اس کے جواب میں نے اسے بتایا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب دنیا بھر کے شاعر و صناع جرمنی کے انوشیرواں اور اس کے خونخوار جتھے کو رسوا کریں گے اور اس کے بعد وہ زمانہ بھی ضرور آئے گا جب دُنیا اس کو بالکل بھلا دے گی "

" نظامی کے کچھ شعر سنو، میں اصل زبان میں اس کے شعر پڑھتا ہوں" کرولیوف نے کہا۔

" مگر میں سمجھوں گا کیا ؟ "

" میں اس کا ترجمہ سناؤں گا ؟ "

یہ کہکر اس نے ذرا اونچی آواز اور لہجے میں ایرانی ترنم کے ساتھ شعر پڑھے۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی اور کمرے کی تاریکی میں ان لفظوں کے ترنم نے جذبات کی لہر ایک ہیجان سے بھری ہوئی پھریری پیدا کر دی تھی، اور میں ان لفظوں کے اندر جنگی ہتھیاروں کی جھنکار سننے لگا تھا۔ شعر کی روانی میں ایک میدانی ندی کی آہستہ خرامی محسوس ہوتی تھی جیسے اونچائی سے پتھر پر بلور کے ٹکڑے ٹپکتے جا رہے ہوں۔ کرولیوف نے اپنے ہاتھ بغلوں میں دبا رکھے تھے اور آہستہ آہستہ ہلتا جلتا تھا میری پشت کی جانب دیوار پر ایک خوش رنگ اور خوش وضع قالین ٹنگا ہوا تھا اس نے قالین پر ایک نظر ڈالی اور پھر مصرعہ پڑھنے لگا :-

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

اس شعر میں نظامی نے لڑائی کی شدت بیان کی ہے اور کہتا ہے کہ اس بلا کا رن پڑا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کا ایک طبقہ گرد ہو کر اڑا اور آٹھواں آسمان بن گیا "

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ نظامی کے رنگ میں خود اس کے تاثرات جنگ کیا تھے :-

" سورج نے جنگل کے درختوں کے پیچھے سے سر نکالا تھا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ دوپہر کے سورج کا چہرہ لڑائی کے گرد و غبار میں چھپ گیا تھا۔ لڑائی جاری تھی کہ رات نے دنیا کو اندھیرے کی چادر اڑھا دی، شاہی قصر و باغات اندھیرے میں چھپنے لگے۔ جب محل کا گنبد گرا تو اس کے دھکے سے میرا طاس ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لیکن یہ آنسو میرے چہرے پر خاک و خون نے جذب کر لئے۔ دشمنوں کو ہم نے بڑی بے رحمی سے قتل کیا۔ میرے چہرے پر خاک و خون تھا، مگر دشمنوں کے چہرے سیاہ تھے۔ میری نفرت بھری نگاہوں کو ان کی شکلیں کالی دکھائی دے رہی تھیں اور اتنی سیاہ تھیں کہ اپنی چغلی آپ کھا رہی تھیں۔ دشمن زخم کھا کر گرتا اور زمین کو چومتا تھا۔ مارتے مارتے ہمارے بازو شل ہو گئے تھے دیکھا میری تلوار ٹوٹ گئی ہوئی شہر پر پڑی۔ ایسا معلوم ہوا کہ ہزاروں لاکھوں مشعلیں روشن کر دی گئی تھیں، اس روشنی میں میں نے اپنے خون سے تر ہوئے ہاتھ دیکھے۔ یہ خون جنہیں اپنے منہ پر مل لیا۔ یہ اپنے دشمن کے خون سے " سرخ رو " تھا جس نے میرے وطن کی سرزمین کو پہنچ کر پامال کیا تھا۔ دشمنوں کی لاشیں ہر طرف کھیت پر بکھری پڑی تھیں، گویا ان کو اپنے قتل ہو جانے پر حیرت تھی میرا چہرہ

خاک دھوئیں سے آلودہ تھا مگر میرے دل میں گلاب کا چشمہ ابل رہا تھا۔ اس لڑائی میں میرے ہاتھ سے نو فاشی جہنم رسید ہوئے، نواں ایک افسر تھا جس کی وردی پر سہ سہ کا نشان لگا ہوا تھا۔ یہ نشان دیکھ کر مجھے بڑی خوشی تھی کہ دنیا سے ایک موذی اور کم ہوا۔"

وہ ذرا دیر ذرا چپ رہا اور پھر کہنے لگا۔

"یہ گنت چینا کی لڑائی کا واقعہ ہے مگر میری نظامی کے رنگ میں بیان کرنے کی بھدی کوشش تھی۔ میں اسی لڑائی میں زخمی ہوا تھا۔ گنت چینا میری آنکھوں کے سامنے خاکستر ہوا۔ ...."

میں نے اس سے کہا کہ گنت چینا کی طرح اور بہت سی آبادیاں جلا دی گئیں، اس شہر میں کیا کوئی خاص بات تھی۔ تب اس نے بتایا کہ:-

"میری پیدائش گنت چینا ہی کی ہے۔ اور تمھارے سوال کا جواب نظامی کے حوالے سے دیتا ہوں: سنو، نظامی کی شاعری کا مرکزی نقطہ محبت ہے۔ وہ ہر بات کو اسی استعارے سے بیان کرتا ہے اور محبت کے موضوع پر اس کی نفیس ترین نظم 'لیلے مجنوں' ہے۔ یہ مثنوی حقیقتاً محبت کا قصیدہ ہے۔ نظامی نے خود لکھا ہے کہ یہ اشعار ان تمام دور و دراز ملکوں میں پہونچیں گے، جہاں کے لوگوں کا ایمان محبت ہوگا۔ نظامی کا کلام سوویٹ ملک میں پہونچ گیا ہے!

اس مثنوی میں نظامی نے لیلے کے حسن و جمال کی حد درجہ تعریف کی ہے۔ جو مبالغے کی حد تک جا پہونچی ہے۔ لیکن حکیم شیراز سعدی اعظم نے اس مبالغے کو حقیقت بتایا ہے۔ سعدی نے لکھا ہے کہ مجنوں کے عشق کا چرچا سن کر بادشاہ وقت نے سمجھا کہ لیلے غیر معمولی حسین ہوگی لیکن جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے محل کی ادنےٰ کنیزیں لیلے سے زیادہ حسین و جمیل ہیں۔ مجنوں نے بادشاہ کو بتایا کہ لیلے کو دیکھنے کے لئے مجنوں کی آنکھ درکار ہے!

چنانچہ میں اپنی جنم بھومی کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، میں اپنے پیارے وطن کے لئے لڑا ہوں اور لڑوں گا، یہاں تک پورا بدلا لے لوں!"

کرولیوف پھر چپ ہوگیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سینٹ آزاک کے گرجے کے مینار پر بادل جھکے ہوئے تھے اور ندی کے کنارے اسٹیم اور کشتیوں کے مستول اور چمنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

کمرے کی اس خاموش فضا میں، کرولیوف کی باتیں سننے کے بعد مجھے اچانک خیال ہوا کہ ہماری قوم سچ مچ ایک نہایت قوی محبت کی گرفت میں ہے جس کے لئے ہم ہر چیز قربان کرنے پر خوشی خوشی آمادہ ہیں۔ اور اگرچہ نظامی کو گزرے ہوئے آٹھ سو سال ہو گئے ہیں مگر وہ لینن گراڈ کی گلیوں میں گھوم رہا ہے۔ نظامی اپنے اندر محبت کے جذبے کی شدت سے واقف کرتا ہے! نظامی ہمارا دوست ہی نہیں جنگی ساتھی بھی ہے!

ل ۔ احمد

باب الاستفسار

فوجی بینڈ کا رواج اسلامی دُنیا میں

(جناب سید اطہر علی صاحب - مان بھوم)

ازراہ کرم مطلع فرمایئے کہ فوجی بینڈ کا رواج اسلامی حکومتوں میں کبھی ہوا تھا یا نہیں اور اگر ہوا تھا تو اس کی کیا نوعیت تھی۔ کیا اس کو بھی موسیقی کی شاخ سمجھ کر ممنوع قرار دیدیا گیا تھا ؟

(نگار) آپ نے یہ مشہور مثل سنی ہوگی کہ: "نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے" لیکن شاید یہ بات آپ کے علم میں نہ ہو کہ اسلامی دنیا میں نقارخانہ سے مراد وہی جگہ تھی جہاں فوجی بینڈ بجایا جاتا تھا اس کو طبل خانہ بھی کہتے تھے اور نوبت خانہ بھی، لیکن مفہوم کے لحاظ سے نقارہ و نوبت میں بہت فرق ہے۔

عام طور پر لوگ نقارہ اور نوبت کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نقارہ نام ہے اس پیالہ نما بڑے ظرف کا جس پر کھال منڈھی ہوتی ہے اور ضرب لگا کر آواز پیدا کرتے ہیں[1] نوبت نام ہے ایک خاص لحن یا آواز کا جو متعین وقفہ کے ساتھ نقارہ سے پیدا کی جاتی ہے[2]۔

قدیم زمانہ میں اہلِ مشرق، فوجی مظاہرہ کے وقت جو ساز استعمال کرتے تھے وہ زیادہ تر ایسے ہی ہوتے تھے جن سے رگڑ یا ضرب کے بعد آواز پیدا ہوتی تھی۔ یونانیوں کی ترقی کے عہد میں جنگ کے وقت قرنا اور بانسری کی طرح کے ساز رائج تھے، لیکن عہدِ وحشت میں وہاں بھی رگڑ والے سازوں ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ یونانیوں میں سب سے پہلے سکندر اعظم نے فوج میں طبل یا نقارہ کا استعمال کیا۔ عربی میں طبل کو دبدبہ اور دبداب بھی کہتے ہیں (جمع = دبابیب) اور ہو سکتا ہے کہ دبدبۂ سکندری سے مراد یہی ہو۔

اسطرابو (جس کا زمانہ ایک صدی قبل مسیح کا تھا) کا بیان ہے کہ ایران میں فوجوں کو مسلح ہونے کا حکم برنجی سازوں (جھانجھ وغیرہ) کے ذریعہ سے دیا جاتا تھا، لیکن فردوسی نے شاہنامہ میں مختلف سازوں کا ذکر کیا ہے، مثلاً قرنا، نے، شیپور، بُوق (بگل کے قسم کے ساز) نے، رویین نے[3] (بانسری کے قسم کے ساز)، تبیرا، کوس (طبل کی قسم کے ساز) زنگ، سنج (جھانجھ کی قسم کے ساز)

عربوں کے عہدِ جاہلیت کے متعلق بعض یونانی مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ اہلِ عرب لڑائی کے وقت جلاجل (جھانجھ) بجاتے تھے، لیکن

---

[1] عربی میں نقر کے معنی کھودنے اور مارنے کے ہیں اور نقارہ اسی سے مشتق ہے۔ چونچ کو بھی منقار اسی لئے کہتے ہیں کہ چڑیاں اس کی مدد سے [illegible] یا لکڑی کو کھودتی ہیں

[2] یہ مصرعہ آپ نے سنا ہوگا۔ "چند نوبت می زند بر گنبد افراسیاب"۔ یہاں نوبت سے مراد اُنکی آواز ہے یا نقارہ بجانا۔ نوبت کے معنی مقدر اور باری کے ہیں مثلاً "دورِ مجنوں گزشت و نوبتِ ماست" یعنی مجنوں کا زمانہ ختم ہوگیا، اب ہماری باری ہے۔ چونکہ نقارہ کی آواز بھی ٹھہر ٹھہر کر متعین وقفہ کے ساتھ پیدا کی جاتی تھی اس لئے اس کا نام بھی نوبت رکھدیا گیا۔

[3] دھات کی بنی ہوئی نے یا بانسری۔

عرب مورخین کا بیان یہ ہے کہ اُن کے یہاں صرف دُف[1] کا رواج تھا۔ چنانچہ جنگ اُحد و بدر میں دف کا استعمال کیا گیا تھا۔
اولیا چلپی (ترکی مورخ) لکھتا ہے کہ عہدِ نبوی میں لڑائی کے وقت صرف نقارہ بجایا جاتا تھا، لیکن ابن خلدون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء عہدِ اسلام میں لڑائی کے وقت نہ بوق (قرنا) بجایا جاتا تھا نہ طبل یا نقارہ، یوں دوسری تقریبات میں بیشک بوق کا استعمال رائج تھا۔

سب سے پہلے بنو امیہ کے زمانہ میں طبل و نقارہ فوجی باجوں میں شامل کیا گیا جو بہ نسبت دُف کے مزامیر (منہ سے بجائے جانے والے ساز) کا ساتھ اچھا دیتے تھے، بعد کو عہد عباسیہ میں جب ایرانی اثرات بڑھے تو سُرنائے (بانسری) بھی فوجی بینڈ میں شامل کی گئی جو ایرانیوں کے یہاں نقارہ کے ساتھ بجائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں شہنائی اسی کی یادگار ہے۔
دسویں صدی تک مسلمانوں میں "طبل المرکب" کا رواج بھی ہو گیا یعنی اونٹ یا گھوڑے کی گردن کے دونوں طرف دو طبل یا نقارے لٹکا دئے جاتے تھے اور سواران دونوں کو بجاتا تھا۔ کبھی کبھی کوس[2] (بڑا نقارہ) بھی استعمال ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ بوق[3] (قرنا) بھی بجایا جاتا تھا۔
دسویں صدی تک طبل خانہ یا نقارخانہ کا استعمال (جس میں طبل، نقارہ، قرنا اور بانسری وغیرہ سب کچھ شامل تھا) خلیفۂ وقت کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے بعد جب خلافت کا اثر کم ہوا اور مختلف اقطاع کے گورنر اپنی اپنی حکومتیں علٰحدہ قایم کرنے لگے تو انھوں نے اپنے لئے نقارخانہ رکھنے کی اجازت بھی طلب کی، چنانچہ بعد کو یہ دستور ہو گیا کہ جب خلیفہ کسی امیر کو حکومت کے اختیارات تفویض کرتا تو سندِ حکومت اور پرچم کے ساتھ ساتھ نقارہ بھی دیتا۔ لیکن نقارہ و نوبت دونوں کی تعداد متعین کر دیتا۔ بعض امیروں کی اس درخواست کو رد بھی کر دیا جاتا۔ چنانچہ یہ امیر معزالدولہ کو نقارخانہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کہا جاتا تھا کہ سب سے پہلا امیر جس کو نقارخانہ رکھنے کی اجازت دی گئی عضدالدولہ تھا لیکن وہ صرف تین وقت (ظہر، عصر اور مغرب) نوبت بجا سکتا تھا۔ پانچوں نمازوں کے وقت نوبت کا بجایا جانا صرف خلیفہ کے لئے مخصوص تھا۔
سلجوقی امراء کو یہ مراعات بہت زیادہ حاصل تھیں اور ان میں سے بعض (الپ ارسلان اور قزل ارسلان) کو پنج وقتہ نوبت کی اجازت حاصل تھی۔
فاطمی خلفاء بھی اپنے ماتحت امراء کو طبل و علم عطا کرتے تھے چنانچہ جب العزیز نے شام کی طرف کوچ کیا تو ۵۰۰ بوق (قرنا) اس کے ساتھ تھے۔ ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ فاطمیوں کے فوجی بینڈ میں بوق، سُرنائے، طبل، کوس اور جلاجل تمام ساز شامل تھے۔
مملوک سلاطین کے زمانہ میں فوجی بینڈ اور زیادہ شاندار ہو گیا تھا، چنانچہ سلطان بیبرس اول کا بینڈ ۴ کوس، ۴ طبل، ۴ بانسریوں اور ۲۰ نفیریوں پر مشتمل تھا۔

ایلخانی مغلوں کے زمانہ میں شاہزادوں، وزیروں اور فوجی کمانڈروں کو حسب تفاوت مراتب نقارخانہ رکھنے کی اجازت تھی۔ خود ایلخان ابوسعید کے نقارخانہ کا طبل بہت بڑا تھا جسے ابن بطوطہ نے "طبل الکبیر" لکھا ہے، مغلوں میں اس کا نام کورگا تھا اور ایلخان کی وفات کے بعد توڑ دیا گیا۔ جب کوئی غمی ہو جاتی تھی تو نوبت کا بجانا روک دیا جاتا تھا اور یہ رسم خلیفہ مقتدی کے وقت سے چلی آ رہی تھی جس نے اپنے بیٹے محمد کی وفات پر پنج وقتہ نوبت کو روک دیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی کو جب حروب صلیبی جنگ میں پہلی بار اس کو شکست ہوئی تو اس نے بھی نوبت خانہ بند کر دیا تھا اور جب تک اس کو فتح حاصل نہیں ہو گئی بند ہی رکھا۔
تیموری مغلوں میں بھی امراء و وزراء کو حسب مراتب نقارخانہ رکھنے کی اجازت تھی۔ مغلوں کے ہندوستان آنے کے بعد بھی نقارخانہ

---

[1] اس کا تلفظ عام طور پر دَف (بہ فتح دال) کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔ فارسی میں گولائی کے لحاظ سے اس کو دائرہ بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں دَف بجانے والا ڈفالی کہلاتا ہے۔ [2] حافظ کہتے ہیں "بہ بانگ کوس می خورم" یعنی شراب میں ڈنکے کی چوٹ پیتا ہوں۔ [3] بوق اصل اصل صرف سینگ کا ہوتا تھا، بعد کو دھات کا بھی بننے لگا جس کی ترقی یافتہ شکل آجکل کا بگل ہے۔ اولیا چلپی کا بیان ہے کہ برنجی بوق سب سے پہلے الپ ارسلان سلجوقی نے رائج کیا۔ ... نفیر بھی کہتے تھے۔ نفیر کے معنی جماعت کے ہیں۔ ہندوستان کی نفیری یہی ہے جسے شہنائی بھی کہتے ہیں۔

ان کی عظمت کا نشان تھا اور بادشاہ کے سوا کسی کی ڈیوڑھی پر نوبت نہ بجتی تھی۔ صاحب مسالک الابصار شاہنشاہ دہلی کی پنج وقتہ نوبت کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کا نقار خانہ دو سو نقاروں، ۸۰ کوس، ۲۰ قرنا اور دس جوڑ جھانجھ پر مشتمل تھا۔

شاہنشاہ اکبر کا نقار خانہ (حسب صراحت آئین اکبری) ۱۸ جوڑ کورگا (بڑے طبل) ۲۰ جوڑ نقاروں، ۴ ڈہل، ۹ سُرنائے، ۴ بڑے قرنا اور ۳ جوڑ جھانجھ پر مشتمل تھا۔ بڑے بڑے امراء اور عہدہ داروں کو بھی نقار خانے رکھنے کی اجازت دی جاتی تھی اور جن امراء کو اس کی اجازت ملتی تھی وہ اپنے گلے میں چھوٹے چھوٹے ڈھولنے ڈالے رکھتے تھے۔ ترکی میں بھی بادشاہ اور امراء کے یہاں نوبت خانے پائے جاتے تھے۔ سلطان ترکی کے فوجی بینڈ میں ۹۲ آدمی تھے اور بینڈ ماسٹر کو وہاں "میر مہتر طبل و العلم" کہتے تھے۔

یورپ کے عہد وسطیٰ میں بینڈ کا تصور اسلامی حکومتوں ہی کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا اور ڈھول وغیرہ کا استعمال اس نے ترکی سے سیکھا، بلکہ بینڈ کی موسیقی بھی ترکی ہی سے لی، چنانچہ عرصہ تک یورپ میں بینڈ کی موسیقی کو ترکی موسیقی ہی کہتے تھے۔

مغلوں کی تاخت سے قبل بھی، مشرق وسطیٰ میں نقار خانہ اور نوبت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ غیاث الدین غوری نقارے یا کوس خالص سونے کے بنوائے تھے جو گاڑیوں میں رکھ کر لیجائے جاتے تھے۔ خوارزمشاہی خاندان کے آخری فرمانروا کے نقار خانہ میں ۲۷ طبل تھے جو سب کے سب سونے کے تھے اور ان میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

الغرض تمام اسلامی حکومتوں میں نقار خانہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور فوجی بینڈ کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے۔

نگار کے پرانے پرچے

۱۹۳۶ء = سالنامہ (ڈرامہ اصحاب کہف) ۱۲ر - مارچ ۶ر - اپریل ۱۰ر - مئی ۸ر - جون ۶ر - جولائی ۸ر - اگست ۸ر
۱۹۳۱ء = سالنامہ (فراست التحریر) ۱۲ر - جولائی ۶ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۰ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۶ر -
۱۹۳۲ء = فروری ۸ر - مئی ۸ر - جولائی ۸ر - ستمبر ۸ر — ۱۹۳۳ء = فروری ۸ر — ۱۹۳۸ء = سالنامہ (تاریخ اسلامی ہند) ۱۲ر
اپریل ۸ر - مئی ۶ر - جون ۶ر - جولائی ۶ر - اگست ۶ر - ستمبر ۶ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۶ر — ۱۹۳۹ء = سالنامہ (مصحفی نمبر) ۱۲ر
فروری ۶ر - مارچ ۶ر - اپریل ۸ر - مئی ۶ر — ۱۹۴۰ء = فروری ۶ر - مارچ ۶ر - اپریل ۶ر - مئی ۶ر - اکتوبر ۶ر —
۱۹۴۱ء = جون تا دسمبر ۶ر فی پرچہ — ۱۹۴۲ء = مارچ، اپریل، مئی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶ر فی پرچہ —
۱۹۴۴ء = سالنامہ ریاض نمبر ۱۰ر — ۱۹۴۵ء = سالنامہ (قرآن نمبر) ۳ر - اپریل ۶ر - اگست ۶ر - ستمبر ۶ر - اکتوبر ۶ر
نومبر ۶ر - دسمبر ۱۲ر — ۱۹۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) ۱۰ر - اپریل ۴ر - مئی ۴ر - جون ۶ر - جولائی ۴ر - اگست ۸ر
ستمبر ۱۲ر - اکتوبر ۱۲ر - دسمبر ۱۰ر — ۱۹۴۷ء = سالنامہ (ماجدولین نمبر) ۱۰ر - مارچ ۱۲ر - اگست ۱۲ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۱۲ر
۱۹۴۸ء = سالنامہ (پاکستان نمبر) ۳ر - مارچ ۱۲ر - مئی ۱۲ر - جون ۱۲ر - جولائی ۱۲ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۲ر - نومبر ۱۲ر - دسمبر ۸ر
۱۹۴۹ء = سالنامہ (افسانہ نمبر) ۱۲ر - مارچ ۱۲ر - اپریل ۶ر - مئی ۸ر - جون ۸ر - جولائی ۶ر - اگست ۶ر — ۱۹۵۰ء سالنامہ (تنقید نمبر) ۱۲ر - مارچ ۱۲ر - اپریل ۸ر - مئی ۱۲ر - جون ۸ر - جولائی ۸ر - اکتوبر ۱۰ر - نومبر ۱۰ر - دسمبر ۱۰ر -

منیجر نگار لکھنؤ

شکوہ

ترے جہاں میں وہ انساں بھی پائے جاتے ہیں

حقیقتوں پہ بھی جن کو گمانِ خواب رہا
جو فصلِ گل کو سمجھتے رہے سرابِ نظر
خرابِ یورشِ صرصر مدام جن کے چمن
ازل سے جن کے نشیمن میں رقصِ برق و شرر
وہ جن کے پیرہنوں میں بوجہِ بے نوری
کبھی ہوا نہ فروزاں چراغِ قلب و نظر
جبیں پہ وہم کے بادل، خیال آوارہ
نہ دل میں نورِ تمنا نہ خال و خط میں سحر
ہنوز اشکِ مسلسل ہے زندگی جن کی
ہنوز جن کی دعاؤں کو ہے تلاشِ اثر
نہیں ہے تابشِ اوراک جن کی دُنیا میں
جو ظلمتوں میں لٹاتے رہے متاعِ نظر
وہ تیرہ بخت کہ جن کے غریب خانوں تک
پہونچ سکی نہ کبھی روشنیٔ مہر و قمر،
جو غفلتوں کے پجاری ہیں، بے حسی کے غلام
جو ڈھونڈتے ہیں تہی سیپیوں میں جوشِ گہر
انھی پہ صَرف ہوئی تیری قوتِ تخلیق!
انھی پہ ختم ہے تیرا کمالِ علم و ہنر!
ہر ایک چیز کو ہے انتظارِ آدمِ نو،
نجوم چشم براہ و غمیں نگارِ سحر،
یہ صبح و شامِ چمن! یہ بہارِ توبہ شکن!
حسین ہے تری فرسودہ کائنات - ! مگر
یہاں اُداس بیاباں بھی پائے جاتے ہیں!!

[illegible]

انتخاب کلام نیرؔ اکبر آبادی

حضرت نیرؔ اکبر آبادی جس دور کے شاعر ہیں، وہ گزر گیا، لیکن اس کی بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جن کو زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جناب نیرؔ کا کلام انھیں خصوصیات کا آئینہ دار ہے لیکن وہ خصوصیات کیا ہیں، ان کو الفاظ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف وجدان سے سمجھا جا سکتا ہے۔

نیاز

مرنا تو مقدر تھا صیاد نے عجلت کی
جیتے نہ چمن والے جب دورِ خزاں ہوتا

غلط فہمی نہ ہو جائے کسی کو میری جانب سے
خدا کے واسطے دیوانہ کہدو ایک بار اپنا

وہ ایک تم تمھیں پھولوں پہ بھی نہ آئی نیند
وہ ایک میں مجھے کانٹوں پر اضطراب نہ تھا

یہ بھی ہو سکتا ہے کیوں اے چمن آرائے بہار
میں اِدھر قید سے چھوٹوں اُدھر آجائے بہار

فصلِ گل یادِ خزاں میں مجھے یوں آتی ہے
جب کوئی خار چبھا۔ میں نے کہا ہائے بہار

چمن کو کون یوں برباد ہوتے دیکھ سکتا ہے
ٹھہر اتنا کہ بند آنکھیں ہم اے دورِ خزاں کرلیں

دیا ہوا ہے غم اُن کا۔ چھپائے جاتے ہیں
مگر یہ آنکھوں سے آنسو جو آئے جاتے ہیں

مایوسیاں پہونچ گئیں حدِّ کمال تک
جب خاک ہم ہوئے تو اُدھر کی ہوا نہیں

نہ دل بدلا ہمارا اور نہ دل کی آرزو بدلی
ہمیں پھر اعتبارِ انقلابِ آسماں کیوں ہو

اسی دُنیا کی اکثر تلخیوں نے مجھ کو سمجھایا
کہ ہمت ہو تو پھر ہے زہر بھی اک چیز کھانے کی

امید و بیم میں نیرؔ ابھی اک جنگ برپا ہے
مری کشتی پلٹ آتی ہے ٹکر کھا کے ساحل سے

نہیں ہے کچھ اور یاد مجھ کو ہے یاد اتنا مگر کہ جس دن
اسیر ہو کر میں جا رہا تھا بہار گلشن میں آرہی تھی

وہ بھی سچے خواب میں آنے کا وعدہ بھی درست
شک مگر ہم کو شبِ غم نیند کے آنے میں ہے

آؤ ذرا سکون کی دنیا بھی دیکھ لو
تم کو شکایتیں تھیں مرے اضطراب کی

کچھ اس کے آنے سے تسکین سی ہوتی ہے نیرؔ
کہاں سے آتی ہے بادِ صبا خدا جانے

کچھ ایسا ڈوبنے کا نہ ہوتا مجھے ملال
مشکل یہ آپڑی تھی کہ ساحل نظر میں تھا

صحرا کی وسعتوں میں بھی، بہلا نہ میرا جی
اب میں یہ کیا کہوں کہ پریشان گھر میں تھا

بڑھی ہے قلب کی دھڑکن [illegible]
امیدوار کرم [illegible] اضطراب نہ تھا

خموش ہوگیا نیرؔ۔ اجل سے کیا کہتا
سخن وہ بات کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا

اُس نے یوں دیکھا مجھے گویا کہ دیکھا ہی نہیں
پھر بھی مجھ تک اِک پیامِ نا تمام آ ہی گیا

فیضِ ساقی کے لئے نیرؔ نہیں قیدِ حدود
دور تھا میں، پھر بھی مجھ تک دو بجام آ ہی گیا

حدودِ سعیٔ طلب سے گزر گیا ہوں میں
وہ مِل گئے ہیں۔ مگر اُن کو ڈھونڈھتا ہوں میں

پسینہ پھولوں کو نیرؔ چمن میں آتا ہے
نگاہ بھر کے جو کانٹوں کو دیکھتا ہوں میں

کروں گا شیب میں انجامِ عشق پر بھی نظر
ابھی شباب ہے، فرصت مجھے بہت کم ہے

نہیں کہ درد نہیں۔ میرے دل میں اے نیرؔ
مگر یہ ہے کہ اب احساسِ درد کچھ کم ہے

جیسے کارواں چھوڑ کر بڑھ گیا تھا،
وہی گردِ اب کارواں ہو رہی ہے

دل سے گرم و سرد کا احساس تک جاتا رہا
زندگی یہ ہے تو نیرؔ موت کس کا نام ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی :-

باغباں کو کوئی اے کاش خبر کر دیتا
لالہ و گل سے شرارے بھی نکل سکتے ہیں

وہ تصور میں یکایک آ گئے
ہجر کی صورت بدل کر رہ گئی

یہ کس کے اشک تھے جو بن گئے تبسمِ گل
یہ کس کے دل کی تمنا بہار ہو کے رہی

جل بجھی شمعِ آرزو لیکن،
اک دھواں سا ضرور اُٹھتا ہے

کیا قیامت تھی پردہ داریِ غم
مسکراتے ہی آ گئے آنسو،

مدت ہوئی گری تھیں یہاں بجلیاں ہنوز
رہ رہ کے اُٹھ رہا ہے چمن سے دھواں ہنوز

بیخبر منزلِ مقصود نہیں دور، مگر
عالمِ ہوش سے ہستی کو گزر جانے دے

اُن کی نظر کو جراتِ پرسش نہ ہو سکی
دلِ غم پہ اِس قدر ہوا نازاں کبھی کبھی

دردؔ سعیدی :-

کر گئی کتنے چاک گریباں،
یونہی سی اک جنبشِ داماں

اہلِ نشیمن! سوئے قفس بھی
جاتی ہے اک راہِ نشیمن،

لرزاں ہے دیوارِ زنداں،
کوند رہی ہے برقِ نشیمن،

یوں بھی گری ہے برقِ حوادث
جاگ اُٹھی تقدیرِ نشیمن،

پھول ہیں، کوئی خار نہیں ہیں
ایسی بھی کیا تنگیٔ داماں!

جانے کس منزل پہ چھوٹا
شوقِ طلب میں اُن کا داماں

دردؔ وہی اُجڑا اُجڑا سا
یاد آتا ہے اپنا نشیمن

مطبوعات موصولہ

ستاروں سے ذرّوں تک مجموعہ ہے جگن ناتھ آزاد کی نظموں، رباعیوں اور غزلوں کا جو ۱۹۴۹ء کے آخری چند مہینوں اور ۱۹۵۰ء کے ابتدائی چند مہینوں میں انھوں نے کہی ہیں۔ انکی نظموں کا ایک مجموعہ "بیکراں" جو اس سے قبل شایع ہو چکا ہے، وہ ۱۹۴۷ء و ۱۹۴۸ء کے افکار سے تعلق رکھتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد فساد اور فساد کے بعد ذہنیتوں میں انقلاب ضروری تھا اور اس انقلاب سے ہمارا ادب بھی کافی متاثر ہوا۔ وہ ادیب جو ہندوستان سے پاکستان گئے، ان میں کتنے ایسے ہیں جو وطن کی یاد اپنے ساتھ لے گئے، اس کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں، لیکن پنجاب سے آنے والے بعض ایسے ہندو ادیبوں اور شاعروں کا حال ہمیں معلوم ہے جو ہنوز اپنی خانماں بربادی پر آنسو بہاتے ہیں اور وطن کی یاد انھیں اب بھی ستاتی ہے۔

———— ایسے ادیبوں اور شاعروں میں جگنّاتھ آزاد کے تاثرات بہت زیادہ گہرے ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شاعری کی ابتداء ہی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ جلاوطنی پر مجبور ہو کر پاکستان سے ہندوستان آئے۔

جگن ناتھ آزاد کی محبت سرشت اور وطن پرست طبیعت کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی صرف ایک نظم "سیر پاکستان" کا مطالعہ کافی ہے جس میں انھوں نے اپنا دل چیر کر سامنے رکھدیا ہے اور جس کے ایک ایک لفظ سے ان کی شیفتگی وطن خون بنکر ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

جب وہ پاکستان جانے کے لئے ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو طیارہ سے خطاب کرتے ہوئے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو شاید مجنوں نے محملِ لیلیٰ کو دیکھ کر کسی وقت کہا ہوگا:۔

گزرے ہوئے دور کو بلانے والے — بچھڑی ہوئی دنیا سے ملانے والے
اللہ تجھے اور سبک بال کرے — اے مجھ کو وطن میں لیکے جانے والے
آ ہوئے رمیدہ کو ختن میں لے جا — بچھڑے ہوئے بلبل کو چمن میں لے جا
آزاد کے منتظر ہیں یارانِ وطن — آزاد کو یارانِ وطن میں لے جا

اس کے بعد جب وہ لاہور پہونچتے ہیں تو وہ اپنے جذبات مسرت سے مغلوب ہو کر کہ اٹھتے ہیں:۔

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا — مہجور وطن، وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن، چمن میں اعلان کرو — شیدائے چمن، چمن میں واپس آیا

اس کے بعد جب لوٹتے ہیں تو ان کا دل بھر آتا ہے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ:۔

دل میں نہ نسیم تازہ بسا لاتا میں — اے کاش نہ یوں جلد پلٹ آتا میں،
اشجار وطن کی چھاؤں میں دم لینے — اے کاش ذرا اور ٹھہر جاتا میں،

ان اشعار سے جس پرخلوص والہانہ کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، وہ کوئی مستعار چیز نہیں ہو سکتی، اس کا تعلق یکسر صداقت احساس سے ہے اور جس شاعر میں فطرتاً ایسی پاکیزہ حس ہو اس کے کلام میں جوش و صداقت و محبّت سبھی کچھ ہونا چاہئے۔

تقسیم ہند کے بعد فساد و خونریزی نے جگن ناتھ آزاد کے دل میں جذبۂ انتقام پیدا نہیں کیا، بلکہ ان جذبات محبت و انسانیت کو بیدار

کر دیا جو اس وقت تک ان کے دل میں سو رہے تھے اور وہ دفعتاً شاعری کی اس منزل پر پہونچ گئے جہاں تک بہت کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے
آزاد ملک کی آزادی کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے وہ سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی ہے اور اس لئے وہ اس پر آنسو بہاتا ہے اور ایسی آزادی پر جو گوشت سے ناخن جدا کر دینے والی ہو، اس کا دل ہر وقت دکھتا رہتا ہے، چنانچہ جس وقت جشن آزادی کی شرکت کے لئے اسے دعوت دیجاتی ہے تو وہ اس کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے:

مجھے کیا پھر نوید جشن آزادی سناتے ہو

نہیں بھولا ابھی تک میں چمن زاروں پہ کیا گزری　　　چمن زاروں پہ جب لے دوست ہنگام بہار آیا
گرا پتھر کی صورت خاک پر ہر قطرۂ باراں،　　　ہر اک جھونکا صبا کا مثل تیغ آبدار آیا
نشیمن جل اُٹھے شاخیں گریں اشجار سے کٹ کر　　　چمن اک چمن اک آتشیں رو چل گئی گویا
خلوص و صدق پر تھی بزم ارباب چمن قایم،　　　وہ بنیادیں رہیں یکسر وہ محفل جل گئی گویا

پیش لفظ میں خود آزاد نے اپنی شاعری کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے کہ "جو کچھ دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، اور محسوس کرتا ہوں اسی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں" اور چونکہ ان کا یہ دیکھنا، سننا اور محسوس کرنا ایسے زمانہ میں ہوا جب "اِدھر کی دُنیا اُدھر" ہو رہی تھی، اس لئے یہی رنگ ان کی شاعری کا بھی ہے اور اک کراہ ان کے ہر ہر شعر میں چھپی ہوئی ہے۔ خواہ وہ شعر نظم کا ہو یا غزل کا اور اس لئے ان کی غزلیں بھی تسلسل بیان کی وجہ سے نظم ہی کا انداز رکھتی ہیں اور اکثر غیر مردّف ہیں۔ مثلاً:-

تری نوا سے شکایت ہے مجھ کو مرغ چمن　　　کہ تار تار ہوا ہے خرد کا پیراہن
قفس نصیب پرندوں کو ساز گار نہیں　　　ہوائے دشت و بیاباں، فضائے صحن چمن
نصیب سبزۂ خوابیدہ کا نہ جاگ سکا　　　چمک چمک کے فسردہ بھی ہو گئی ہے کرن
خرام گردشِ دوراں ذرا تو مہلت دے　　　ذرا میں دیکھ تو لوں جلوہ زار کوہ و دمن
ترے ہی ساتھ مجھے بھی سفر پہ جانا ہے　　　ٹھہر تو قافلۂ نو بہار سرو سمن
کوئی نہ ہمدم تو ہے نہ ہے رفیق کہن،　　　اسی سے پیار کروں میں یہی ہے میرا وطن
وطن سے دور رہی منزل کا یہ سوال نہیں　　　وہ بے وطن ہوں کہ جس کا نہیں ہے کوئی وطن

کنارِ سندھ پہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں
وہ تجھ میں بات کہاں اے دیار گنگ و جمن

اس مجموعہ میں جابجا ان کی رُباعیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن رندی و سرمستی کی جگہ ان میں بھی وہی درد و سوز پایا جاتا ہے جو آزاد کی شاعری کی جان ہے مثلاً:-

نکلے جو چمن سے نغمہ سنجانِ چمن　　　دیکھی نہ گئی حالتِ ویرانِ چمن
پھولوں کا کہیں نشاں نہ تھا گلشن میں　　　معمور تھا خار و خس سے دامانِ چمن
اے منظرِ بیقرار دم بھر تو ٹھہر　　　اے جلوۂ زر نگار دم بھر تو ٹھہر
جی بھر کے میں اکبار تجھے دیکھ تو لوں　　　اے قافلۂ بہار دم بھر تو ٹھہر

اس مجموعہ کی سب سے پہلی نظم "میرا موضوعِ سخن" بہت اہم ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی فکر کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے گویا ایک "شہر آشوب انسانیت" پیش کیا ہے۔

آزاد کے کلام کی ایک اور خصوصیت جو اولین نگاہ میں سامنے آجاتی ہے، اس کا بڑی حد تک بے عیب ہونا ہے۔ آزاد فارسی تراکیب

استعمال کرتے ہیں لیکن مقلدانہ نہیں بلکہ "کار آگہانہ" جس سے اُن کے وسیع و صالح مطالعہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شاعری کا پس منظر چونکہ روایات ماضی سے علٰحدہ نہیں ہے، اس لئے اس میں ترنم بھی پوری طرح پایا جاتا ہے اور ذہن سامع اس سے کافی متاثر ہوتا ہے ایک دو نظمیں انھوں نے "آزاد شاعری" کے انداز کی بھی کہی ہیں، لیکن وہ کامیاب نہیں ہیں۔ کیونکہ اس آرٹ کے لئے ان کا مزاج موزوں نہیں ہے
ان کے متفرق اشعار میں سے بعض اشعار قطعاً غیر فانی ہیں مثلاً :-

میں نے پوچھا کہ زندگی کیا ہے ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا

تو کہاں ہے بادِ خزاں کہ پھر ہے چمن کو تیری ہی جستجو وہ فضا میں رنگ بکھر گیا وہ زمیں پہ پھول نکھر گئے

یہ مجموعہ اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے اور دو روپیہ بارہ آنے میں مکتبۂ شاہراہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

ساتواں شاستر مجموعہ ہے فکر تونسوی کے چند مقالات کا جو تقسیم ہند کے بعد دو سال کے اندر لکھے گئے تھے۔ فکر تونسوی طنز نگار ادیب ہیں اور طنزیہ انداز ہی میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے مسایل پر ان مقالات میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

ادب میں مزاح نگاری اور طنز نگاری دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان دونوں کا باہم گہرا اتنا گہرا تعلق ہے کہ کوئی مزاح نگار اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ طنزیہ نگاری پر قادر نہ ہو، اسی طرح اگر طنز نگار میں ہیومر (humour) نہ ہو تو وہ قطعاً ناکام رہے گا۔

فکر تونسوی کی طنز نگاری میں ظرافت کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے، لیکن اس میں بجائے بے ساختگی کے تکلف و آورد ہے اور اسی لئے بہت اُکھڑا اُکھڑا سا نظر آتا ہے۔

طنز نگار نقاد سے زیادہ محتسب ہوتا ہے، اس لئے اس کے یہاں تلخی زیادہ ہوتی ہے، لیکن یہ تلخی زیادہ فلسفیانہ انداز کی ہوتی ہے، فکر تونسوی کے یہاں یہ تلخی زیادہ تر شخصی و عامیانہ ہے اور اس میں وہ شاید ایک حد تک معذور بھی تھے، کیونکہ یہ بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں، جن کو فساد کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا اور یہاں ان کو عوام ہی سے واسطہ پڑا جو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکتے تھے۔

اس مجموعہ میں چودہ مضامین ہیں اور ان سب کا تعلق ان ذہنی انقلابات سے ہے جن کا تقسیم ہند کے بعد پبلک اور افراد حکومت میں پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ بعض مضامین میں ان کا طنز کامیاب ہے اور بعض میں ان کا احتساب ادب کے حدود سے آگے گزر گیا ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ فکر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں خلوص و صداقت کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے اور ان کا مقصود تخریب نہیں تعمیر ہے۔

مصنف نے دیباچہ میں طنزیہ رنگ اختیار کرنے کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ :-

> "جب سامراجیوں نے ملک بانٹا، تو میں نے یک لخت محسوس کیا کہ لوگوں کی باتوں کا ایک خاص روپ کچھ زیادہ ہی تیز ہوتا جا رہا ہے اور یہ روپ تھا۔ طنز! ---- چنانچہ لوگ ایسی باتیں کرنے لگے جیسے وہ کڑوے کسیلے گھونٹ پینے پر مجبور کر دئے گئے ہوں اور سپر پینے کے بعد یہ کہہ رہے ہوں کہ "جی ہاں بالکل شہد ہے شہد" باتوں کا یہ انداز میرے لئے ایک ہیمبر سے کم نہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے طنز کا کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا ہے اور گلیوں، بازاروں، محلوں، سڑکوں اور چوراہے پر زہریلے گرم گرم لاوے کی طرح بہ رہا ہے۔
>
> چنانچہ لوگوں کی باتوں کے اس تیکھے روپ نے مجھے یک لخت طنز نگار بنا دیا"

اس میں شک نہیں ایک ادیب کے لئے جس میں طنز نگاری کی اہلیت موجود ہو، یہ حالات ضرور ایسے تھے کہ اس کی طنز نگاری بروئے کار آجاتی لیکن چونکہ جذبات شدید اور احساس زیادہ تیز تھا اس لئے ایک "حار مرض" کی سی بے چینی اس میں پیدا ہوگئی اور مصنف کو یہ سمجھنے کا کم موقع ملا کہ اگر وہ ان حالات سے زیادہ مانوس ہو جاتے تو ان کا رنگِ تحریر کیا ہوتا۔

ان مضامین میں بھی زندگی کے انھیں مسایل کو لیا گیا ہے جو موجودہ "بحرانی دور" میں ہمارے شاعروں کے پیش نظر ہیں اور انھیں عوامی

گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور حکومت کی نااہلی کی وجہ سے اور زیادہ اُلجھتی جارہی ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ بعض مقالات میں وہ خاصی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس قسم کے مضامین میں چور آیا - شراب قادہ - واالگہ کی بہر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ آسمانی کتاب ان کا ایک طویل مضمون ممکن ہے بعض کے نزدیک صحیح طنز نگاری کے حدود میں آتا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہی مضمون ایسا ہے جو اس مجموعہ میں شامل نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس میں ضرورت سے زیادہ تکلف و تصنع پیدا ہوگیا اور طنز و مزاح دونوں سے خالی معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے فکر تونسوی کا یہ ادبی تجربہ سراہے جانے کے قابل ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اگر انھوں نے یہ رنگ چھوڑ کر دوسرا رنگ نہ اختیار کیا تو چند دن کے بعد وہ اچھے طنز نگار بن سکیں گے اور زبان و بیان کی اُلجھن و ناہمواری بھی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔

یہ مجموعہ مجلد شایع کیا گیا ہے اور ۲۰۲ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ شاہراہ دہلی۔

میراث مجموعہ ہے پرکاش پنڈت کے تیرہ افسانوں اور ایک پیش لفظ کا جسے ممتاز حسین صاحب (کراچی) نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کے گرد پوش پہ کرشن چندر، احتشام حسین اور کنھیا لال کپور کی رائیں درج ہیں جن میں سے دو مشہور افسانہ نگار اور ایک مشہور نقاد ہیں۔

کرشن چندر کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ: - "پرکاش پنڈت نے اپنے سماجی تجربے، ماحول اور ذہنی کاوش سے اس سماجی شعور کو پالیا ہے جس کے بغیر موجودہ سماج کے تکلیف دہ سوال کسی طرح حل نہیں ہوسکتے، اس لئے ان کے افسانے حیات افروز ہیں"۔

کنھیا لال کپور کے نزدیک پرکاش پنڈت "ذہن انسانی کے آزمودہ (آزمودہ کار ؟) اور ہوشیار سیاح ہیں، انھیں علم نفسیات سے شغف ہی نہیں بلکہ اس پر پورا عبور حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کرداروں سے روشناس ہو کر قاری سوچتا ہے کہ افسانہ نگار کی نگاہ دوربین "دل و جگر" کو چیرتی ہوئی جارہی ہے"۔

احتشام حسین کا خیال ہے کہ "پرکاش پنڈت کے افسانے زندگی کے افسانے ہیں، سادے اور سچے۔ فن زندگی کے تعلق کو انھوں نے سمجھا ہے اور یہی افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی کامیابی کی شاہراہ ہے"۔

پیش لفظ میں ممتاز حسین نے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ فسانہ نگار کی فنی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "ان میں فسانہ لکھنے کی صلاحیت فطری ہے۔ ان کو انسانی نفسیات کی پُرپیچ راہوں میں اترنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل ہے"۔

ان رایوں کے ساتھ یہ کتاب شایع ہوئی ہے اور جب مجھے کسی کتاب کے پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی تو میں ہمیشہ ایسی رایوں پر اعتماد کر لیا کرتا ہوں، چنانچہ اس کتاب کے باب میں بھی میرا کچھ ایسا ہی ارادہ تھا، لیکن ورق گردانی کے سلسلہ میں ایک افسانہ میں نے پڑھ ہی لیا اور اسکے پڑھنے کے بعد میرا بے اختیار دل چاہا کہ باقی افسانے بھی دیکھ ڈالوں اور آخر کار میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہمارے یہاں کم کسی نے اتنے اچھے افسانے لکھے ہوں گے جتنے پرکاش پنڈت نے لکھے ہیں۔ اُردو میں افسانہ نگاری کا موجودہ رنگ وہی ہے جو کسی وقت روس میں پایا جاتا تھا اور چیخوف جس کا علمبردار تھا۔

ادب کی ترقی کا پہلا دور تقلید اور دوسرا اجتہاد ہوا کرتا ہے، ہم ابھی تک غالباً پہلے ہی دور میں ہیں اور اسی لئے ہمارے موجودہ افسانہ نگار زیادہ تر روسی افسانہ نگاروں کی تقلید کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ آئندہ چل کر کوئی اجتہادی صورت بھی پیدا ہو جائے۔

پرکاش پنڈت کے افسانے زیادہ چیخوف کے رنگ کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کامیابی کے ساتھ انھوں نے اس رنگ کو نباہا ہے۔

طباعت و کتابت وغیرہ کے لحاظ سے یہ کتاب مکتبۂ شاہراہ دہلی نے بہت اچھی شایع کی ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ حجم ۲۲۲ صفحات۔

ناول کیا ہے یہ کتاب لکھنؤ یونیورسٹی کے دو استادوں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہے ان میں سے ایک ڈاکٹر محمد احسن فاروقی انگریزی کے استاد ہیں اور دوسرے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اُردو کے، اس لئے مفہوم و عبارت دونوں حیثیتوں سے

اس کو مکمل ہونا چاہئے۔

یہ کتاب دس ابواب میں منقسم ہے۔ سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ ناول کے عناصر ترکیبی کیا ہیں، اس کے بعد ناول اور زندگی کے تعلق پر گفتگو کرکے اس کی ہیئت اور اس کے اقسام سے بحث کی گئی ہے۔ اخیر کے چند ابواب میں ناول کی اہمیت، اس کے ارتقاء اور مستقبل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اب سے تیس چالیس سال قبل چونکہ ہمارے یہاں زیادہ تر لوگوں کو ناول ہی پڑھنے کا شوق تھا اس لئے اُس وقت بہت سے انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہوا اور خود ہمارے یہاں بھی چند مشہور ناول نگار پیدا ہوئے جن میں رسوا، شرر، حکیم محمد علی اور احمد حسین نے خاص شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد لوگوں کو افسانوں کے پڑھنے کا شوق ہوا اور ناولوں کی مانگ کم ہوگئی۔ لیکن اب پھر ان لوگوں کا رجحان ناول کی طرف ہوا ہے اور اس لئے اس کتاب کی اشاعت یقیناً برمحل ہوئی ہے۔

تاریخی و فنی حیثیت سے اس کتاب میں زیادہ تر مغربی ناول نگاروں کو سامنے رکھ کر گفتگو کی گئی ہے اور کافی تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ناول کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو مغربی ادیبوں کے یہاں پائی جاتی ہیں اور ہمارے یہاں اس وقت تک جتنے ناول لکھے گئے ہیں انکی نوعیت کیا تھی۔

اس کتاب کا آٹھواں باب جس میں اُردو ناول نویسی پر تاریخی و فنی تبصرہ کیا گیا ہے بہت اہم ہے۔ فاضل مصنفین نے اس باب میں سب سے پہلے غدر سے قبل کی قصوں کہانیوں کا مختصر سا ذکر کیا ہے اور پھر آرائش محفل، توتا کہانی، چہار درویش، فسانۂ عجائب، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا وغیرہ کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء کے بعد کے اس دور کو لیا ہے جو ڈپٹی نذیر احمد اور شرر و سرشار کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر کافی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے، اخیر میں انھوں نے عہد حاضر کے ناول نگاروں کا ذکر کرکے ان کے خصوصیات پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ الغرض یہ کتاب ان تمام حضرات کے لئے جو ناول کا ذوق رکھتے ہیں یا ناول نگاری کرنا چاہتے ہیں، بہت مفید و کارآمد ہے۔

کتابت و طباعت بہت روشن ہے اور کاغذ بھی اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ قیمت عہ، حجم ۰۰ ۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ:- دانش محل لکھنؤ۔

ذکرِ غالب

دوسرا اڈیشن ہے، مالک رام صاحب ایم۔ اے کی تالیف کا جو اس سے قبل شایع ہو کر ملک میں کافی مشہور و مقبول ہوچکی ہے۔ اس اڈیشن میں فاضل مولف نے بہت سی نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے جو پہلے اڈیشن کی اشاعت کے بعد ان کے علم میں آئیں، حالی کی یادگار غالب کے بعد غالب پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور متعدد کتابیں اس موضوع پر شایع ہوچکی ہیں لیکن ان میں دو ہی چار ایسی ہیں جو معیاری حیثیت رکھتی ہیں، اور انھیں میں سے ایک ذکر غالب بھی ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں غالب کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں، دوسرے باب میں ان کی تصانیف کا ذکر ہے اور تیسرے میں ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر بحث میں تمام جزئیات کا احاطہ کرتے ہوئے صحت و تحقیق کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اُردو تذکرہ نگاری کا قدیم رنگ سب سے پہلے حالی اور آزاد نے بدلا۔ ایک نے یادگار غالب لکھ کر اور دوسرے نے آب حیات — لیکن جس حد تک مورخانہ کاوش و جستجو کا تعلق ہے ہم اس سلسلہ میں صرف حالی اور یادگار غالب ہی کا ذکر کرسکتے ہیں، کیونکہ آب حیات اپنی طرز تحریر کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو، لیکن صحت واقعات کے لحاظ سے وہ کچھ نہیں ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد ہمارے ادیبوں میں صحیح تذکرہ نگاری کا احساس پیدا ہوا اور جس حد تک غالب کا تعلق ہے سب سے پہلے ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے اس طرف توجہ کی، گو انھوں نے بھی مقدمہ میں زیادہ تر شاعری سے کام لیا ہے۔

اس کے بعد غالب پر ریسرچ کرنے کی طرف لوگوں کو توجہ ہوئی اور اس سلسلہ میں جو کتابیں شایع ہوئیں، ان میں علاوہ ان کتابوں کے جو کتب خانۂ رامپور کے ناظم مولانا عرشی نے مرتب کی ہیں، غلام رسول مہر کی کتاب غالب، محمد اکرم صاحب کا غالب نامہ اور

مالک رام صاحب کا ذکر غالب بہترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

ذکر غالب کے مولف مالک رام ام۔اے، بڑے اچھے ذوق کے ادیب ہیں اور تحقیق و ریسرچ کی طرف ان کو فطری میلان ہے۔ خود وہ شاعر نہیں ہیں، لیکن شعر و شاعری کی خدمت کا جذبہ ان میں شاعروں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس وقت تک وہ دہلی میں رہے غالب اور مومن کے متعلق ان کا ریسرچ جاری رہا اور اسی زمانہ میں انھوں نے غالب کی تمام فارسی تصانیف کی جستجو اور اشاعت کے مسئلہ پر بھی کافی وقت اور روپیہ صرف کیا، چنانچہ سبد چین کا ایک نہایت صحیح اڈیشن شایع کرنے کا فخر انھیں کو حاصل ہے۔ غالب اور قتیل کے جھگڑے کے سلسلہ میں انھوں نے قتیل کے حالات پر بھی ایک مقالہ لکھ کر نگار میں شایع کرایا، الغرض غالب کے ساتھ ان کی بڑھی ہوئی عقیدت اور ان کے صحیح ادبی ذوق کا نتیجہ ذکر غالب ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ جس میں تصانیف غالب کا ذکر کیا گیا ہے، بہت اہم ہے اور اس کے پڑھنے سے ہم کو بہت سی باتیں ایسی معلوم ہو سکتی ہیں جو اب تک پردۂ خفا میں تھیں۔ اگر کوئی کمی اس کتاب میں محسوس کی جاتی ہے تو صرف یہ کہ غالب کے فارسی و اردو کلام پر تنقید و تبصرہ نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ چیز اس کتاب کے موضوع سے خارج تھی اور اس کے لئے علاحدہ اک مستقل تصنیف کی ضرورت تھی اس لئے ہم اس کمی کو کمی نہیں کہہ سکتے اور یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے ہر نوع مکمل ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر دہلی سے ۸/ میں مل سکتی ہے۔

نگار کے پُرانے فایل

...... سنہ۳۱ء - سنہ۳۲ء - سنہ۳۵ء

سنہ۳۶ء - سنہ۳۷ء - سنہ۳۹ء - سنہ۴۲ء - سنہ۴۳ء

سنہ۴۴ء - سنہ۴۶ء - سنہ۴۷ء - سنہ۴۸ء - سنہ۴۹ء

اور سنہ۵۰ء کے مکمل فایل۔ قیمت فی مکمل فایل معہ محصول دس روپے

جولائی تا دسمبر سنہ۳۲ء = قیمت معہ محصول پانچ روپے۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

رعایتی قیمت

مجموعہ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے، لیکن اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جانعالم واجد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے۔

قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔　　منیجر نگار۔ لکھنؤ

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ بکتی ہے

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

ضروری اعلان

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ صاحبان کے لئے

پاکستان کے بعض حضرات کا مطالبہ ہے کہ نگار اور مکتبۂ نگار کی کتابوں کی قیمت بھی اسی شرح تبادلہ کو سامنے رکھ کر متعین کیجائے جسے دونوں حکومتوں نے تسلیم کرلیا ہے، لیکن وہ اس حقیقت کو سامنے نہیں رکھتے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو مفاہمت ہوئی ہے اس کا تعلق زیادہ تر مال کے تبادلہ سے ہے یعنی جس قیمت کا مال پاکستان سے ہندوستان آئے گا اتنی ہی قیمت کا مال ہندوستان سے پاکستان جائے گا، نقد نہ یہ ادا کرے گا، نہ وہ۔ اسی طرح بعض بڑے بڑے تاجروں کے لئے بھی یہ آسانی پیدا کی گئی ہے کہ وہ بنکوں کے ذریعہ سے مال اِدھر اُدھر بھیج سکیں، لیکن عام پبلک کے لئے اس وقت تک کچھ نہیں کیا گیا۔ پبلک شرح تبادلہ سے اسی وقت فایدہ اُٹھا سکتی ہے جب چھوٹی سی چھوٹی رقم بھی یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں بھیجی جا سکے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک منی آرڈر کی آمد و رفت شروع نہ ہو جائے۔ اس لئے ہم اپنے تمام کرمفرمانِ پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس باب میں قدرے صبر و تحمل سے کام لیں۔ ہم قطعاً ان سے کوئی زائد رقم لینا نہیں چاہتے، اور جس چیز کی جو قیمت ہمیں یہاں ملتی ہے، وہی ان سے بھی چاہتے ہیں۔ منیجر

نگار کا آیندہ سالنامہ

ایک ایسی معرکۃ الآرا تصنیف ہوگی جسکی اسوقت سب سے زیادہ ضرورت ہے،

یعنی

اُردو زبان کی لسانی تاریخ

(پروفیسر شوکت سبزواری کے قلم سے)

جس میں اُردو زبان کے مآخذ کا کھوج کیا گیا ہے اور اس کے تمام صوتی، صرفی، نحوی سرمایہ کی مفصل و جامع تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب نتیجہ ہے سالہا سال کے غایر مطالعہ کا اور علاوہ طلبہ کے ہر اس شخص کے لئے بھی جو اُردو زبان سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے — یہ کتاب نگار کے سایز پر نہیں بلکہ کتابی سایز پر شایع ہوگی اور تقریباً ۲۵۰ صفحات کو محیط ہوگی۔ اس کی قیمت چار روپیہ ہوگی، لیکن نگار کے مستقل خریداروں کو صرف ڈیڑھ روپیہ میں مل سکے گی۔

اس لئے وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے ابھی سے نوٹ کرلیں کہ ان کے نام سالانہ وی پی سات روپیہ تیرہ آنے میں بھیجا جائے گا۔ جن کا چندہ ۱۹۵۲ء کے کسی مہینے میں ختم ہوتا ہے ان کے نام سالنامہ کا وی پی ایک روپیہ تیرہ آنہ میں روانہ ہوگا۔

پیشگی چندہ بھیجنے والے پانچ آنے زاید مصارف رجسٹری کے لئے ضرور روانہ فرمائیں۔ — منیجر نگار

جلد ۵۹ | فہرست مضامین مئی ۱۹۵۱ء | شمارہ ۵

ملاحظات

کوریا کی جنگ عالمگیر جنگ کی تمہید ہے

جب سے کوریا کی لڑائی شروع ہوئی ہے، سب سے زیادہ اہم واقعہ جس نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈالدیا، جنرل میک آرتھر کی معزولی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ سانس لینے کے لئے شاید کچھ دیر کو ٹھہر گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آیندہ اس کے التہاب و اشتعال میں کچھ کمی ہو جائے، لیکن وقت کے نبض شناس جانتے ہیں کہ اس وقفۂ سکون کی کیا حقیقت ہے اور جنگ کے بحران میں اس سے کسی کمی کی توقع رکھنا عبث ہے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک مریض شدید تپ میں مبتلا ہو اور کسی وقت جب اس کا ہذیان کم ہو جائے تو اسکے تیمار دار یہ سمجھ کر خوش ہو جائیں کہ اب بیمار اچھا ہو چلا ہے، حالانکہ طبیب جانتا ہے کہ تپ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا حقیقی سبب زائل نہ ہو۔ بالکل یہی حال کوریا کی لڑائی کا ہے کہ اس کا تعلق نہ جنرل میک آرتھر کی ذات سے ہے، نہ ٹرومین کی شخصیت سے، بلکہ اس عالم خوف و جنون سے ہے، جو اشتراکیت کے اندیشہ سے اس وقت تمام سرمایہ پرست حکومتوں پر طاری ہے اور جس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کوریا میں امریکہ کا اپنی فوجیں اتارنا، میک آرتھر سے گفتگو کرنے کے لئے ٹرومین کا امریکہ سے ایشیا آنا، اور میک آرتھر کا معزول کرنا

جانا، سب کی سب مذبوحی حرکات تھیں، جو بالکل بے اختیارانہ طور پر سرزد ہوئیں اور جن سے بجائے صحت و سکون کے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں عالم احتضار تو قریب نہیں آگیا ؟

امریکہ اور اس کے تمام حوارئین کہتے تو یہی ہیں کہ وہ دنیا میں امن و سکون قایم کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، لیکن دل کی جو بات ہے وہ زبان پر نہیں لاتے اور اس قارون کا ذکر نہیں کرتے جو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور جس نے جملہ انسانی و اخلاقی احساسات کو محو کر دیا ہے۔

ان کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ روس کے پاس ۲۰۰ ڈویزن فوج کیوں موجود ہے، وہ کیوں اپنی بحری قوت کو نہایت تیزی سے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے ہوائی جہازوں کی تعداد کیوں روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے، آٹم بم اس نے کیوں طیار کر لیا، مختلف قسم کی ہلاک گیسیں اس نے کیوں دریافت کر لیں، اس کے پاس ذخایر حرب کی کمی کیوں نہیں، اس نے یہ اندیشہ کیوں پیدا کر دیا ہے کہ معلوم نہیں وہ کس وقت مغربی یوروپ پر حملہ کر دے اور بحر الکاہل پر چھا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو کیا یہ اشتراکی نظام کی برتری کا ثبوت نہیں ہے اور اگر آہستہ آہستہ یہی نظام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے، تو امریکہ کو اس سے کیوں تکلیف پہونچتی ہے اور وہ کیوں اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار حکومت امریکہ کی ہے اور وہ اپنا اقتدار قایم رکھنے کے لئے وسعت اشتراکیت کے بعید ترین امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ہر چند اس کے حدود حکومت روس کے حدود سے بہت دور ہیں، لیکن اس اندیشہ سے کہ جس طرح وہ وسطی یوروپ میں پھیلا ہے اسی طرح وہ مغربی یوروپ میں بھی پھیل سکتا ہے اور مغربی یوروپ کا اشتراکی ہو جانا امریکہ کی موت ہے، وہ مارشل پلان اور اٹلانٹک پیکٹ کے ذریعہ سے روس کے خلاف محاذ طیار کر رہا ہے۔

اس کا مقصود مغربی یوروپ کی حکومتوں کی مدد کرنا ظاہر کیا جاتا ہے، حالانکہ امریکہ کا اصل مدعا یہ ہے کہ اشتراکیت پر ان حکومتوں کی بھینٹ چڑھا کر خود زیادہ سے زیادہ محفوظ رہ سکے۔

ان مغربی حکومتوں میں سب سے زیادہ اہم برطانیہ ہے اور گو اس وقت وہ امریکہ کے اشارہ پر چل رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر روس کو جنگ کے لئے مجبور کر دیا گیا تو سب سے پہلے اسی کو اشتراکی بموں کا نشانہ بننا ہے اور اسی اندیشہ سے وہ چین کی اشتراکی حکومت کو تسلیم کر کے سکورٹی کونسل میں اس کے شامل کئے جانے پر مصر ہے، جسے امریکہ نے ابتک تسلیم نہیں کیا۔

برطانیہ و امریکہ کی پالیسی میں یہ اختلاف بظاہر بہت غیر اہم نظر آتا ہے، لیکن حقیقتاً اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ اختلاف ٹرومین اور میک آرتھر دونوں کے لئے کافی دردِ سر بنا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جو بات میک آرتھر نے علی الاعلان کہی ہے وہی ٹرومین کے دل میں بھی ہے، اور دونوں یہی چاہتے ہیں کہ نہ صرف شمالی کوریا، بلکہ فارموسا، منچوریا اور ممکن ہو تو خود چین کے بعض علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جائے، لیکن ان دونوں کی تدابیر میں فرق ہے۔ میک آرتھر یہ سمجھتا ہے کہ روس ابھی تک جنگ کا خطرہ مول لینے کے لئے طیار نہیں اس لئے اشتراکی چین کو ختم کر دینے کا وقت یہی ہے، ٹرومین، روس کی طرف سے اتنا مطمئن نہیں ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک جاپان اور مغربی جرمنی کو پوری طرح مسلح نہ کر لیا جائے، روس کو جنگ کی دعوت دینا بڑے خطرہ کی بات ہے۔ اس لئے سوال لڑائی کے ختم کر دینے کا نہیں بلکہ اسکو پوری کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کا ہے اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر برطانیہ اور دوسری بڑی بڑی سلطنتیں، طیاریاں کر رہی ہیں اور دنیا کی تمام صنعت گاہیں پھر اسلحہ جنگ اور ذخایر حرب کی طیاری و فراہمی میں مصروف نظر آتی ہیں۔

بہر حال یہ خیال کرنا کہ کوریا کی لڑائی جلد ختم ہو جائے گی یا یہ کہ وہ صرف کوریا تک محدود رہے گی بالکل غلط ہے کیونکہ نہ امریکہ جنگ سے دست کش ہو کر اپنے اقتدار کو صدمہ پہونچا سکتا ہے اور نہ چین یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اسکے ملک پر کسی سرمایہ دار حکومت کا اقتدار قایم ہو۔

امریکہ کو سب سے زیادہ اعتماد ایٹم بم پر ہے اور سمجھتا ہے کہ ہیروشیما کی یاد تازہ کرکے وہ جاپان کی طرح چین کو بھی مفتوح و مغلوب کرسکتا ہے، لیکن اس کو سمجھنا چاہئے کہ پچھلے دس سال کے زمانہ میں دوسری قومیں بھی بیکار نہیں بیٹھی رہی ہیں اور اگر چین امریکہ کے مقابلہ میں آئے گا تو یہ سمجھ کر آئے گا کہ اسے جوہری بم کی تباہکاریوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

بہرحال جنرل میک آرتھر کی معزولی کا سبب یہ قرار دینا کہ کوریا کے باب میں امریکہ کی پالیسی بدل جائے گی، قطعاً غلط ہے، بلکہ اس میں اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جنرل میک آرتھر کے امریکہ پہونچ جانے سے ریپبلکن پارٹی کو اور زیادہ تقویت پہونچ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ ٹرومین کو اپنی اور اپنی ڈیماکریٹک پارٹی کی ساکھ قائم رکھنے کے لئے، میک آرتھر کے ہاتھ میں دوبارہ جنگ کوریا کی کمان دینا پڑے۔

تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ کوریا کی اشتراکی فوجوں نے، لاکھ کی سپاہ سے پھر حملہ شروع کردیا ہے اور اتحادی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دباؤ زیادہ بڑھکر اتحادی افواج کو پھر اسی خط دفاع تک پہونچا دے جہاں سے ان کا جارحانہ اقدام شروع ہوا تھا، لیکن اشتراکی فوجوں کی یہ کامیابی بھی کوئی فیصلہ کن چیز ثابت نہ ہوگی۔ اس سے قبل یہ مد و جزر کئی بار دیکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی یہی سلسلہ برابر جاری رہے گا تا آنکہ امریکہ کی پالیسی نہ بدلے اور اتحادی افواج کوریا سے واپس نہ آجائیں یا یہ کہ چین کی اشتراکی فوجوں کی قوت بالکل نہ ٹوٹ جائے اور یہ دونوں باتیں بظاہر ناممکن العمل نظر آتی ہیں۔

اسوقت تک جنگ صرف شمالی و جنوبی کوریا کی جنگ سمجھی جاتی ہے جس میں نہ اتحادیوں کی طرف سے چین کو الٹی میٹم دیا گیا ہے اور نہ چین نے اپنی شرکت کا اعلان کیا ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ شمالی کوریا کی فوج بڑی حد تک چینی رضاکاروں پر مشتمل ہے اور اسلحہ وغیرہ کی مدد بھی چین اور روس کی طرف سے پہونچ رہی ہے، اس لئے اس جنگ کا پس منظر بہت بھیانک ہے اور اتحادی افواج یا ٹرومین کی ذرا سی غلطی سے یہ تیسری عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔

چینی حکومت کا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ اسے مجلس اقوام میں جگہ دیجائے، جس کی موافقت ہندوستان و برطانیہ نے بھی کی ہے، دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ جزیرۂ فارموسا جو دراصل چین ہی کی ملکیت ہے خالی کردیا جائے اور تیسرے یہ کہ اتحادی افواج کوریا سے ہٹالی جائیں لیکن امریکہ ان تینوں میں سے کوئی بات ماننے کے لئے طیار نہیں اور اس ضد کا نتیجہ ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ چین بھی میدان میں آجائے اور اس کے ساتھ روس بھی۔

بہرحال اس جنگ کے وسیع ہو جانے کے تمام امکانات قوی ہوتے جارہے ہیں اور بظاہر کوئی صورت مفاہمت کی ایسی نظر نہیں آتی جو اس خطرہ کو دور کردینے والی ہو۔

دستور میں تبدیلی

اس میں شک نہیں ہندوستان کی موجودہ حکومت بڑے صبر آزما دور سے گزر رہی ہے اور اس وقت تک اپنے مخالف جماعتوں کی جرح و تنقید کو جس ضبط و تحمل کے ساتھ سنا ہے، وہ یقیناً مستحق تعریف ہے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دستور کی بعض دفعات میں ترمیم کرکے اپنی اس بلند خصوصیت کو ہاتھ سے دیدینا چاہتی ہے۔

کسی قوم و ملک کا دستور ایسی بنیادی چیز ہے کہ اگر اس کی طرف سے لوگوں کا اعتماد و یقین اٹھ جائے تو حکومت کے وجود کا متزلزل ہو جانا بھی یقینی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جیکار نے جو ہندوستان کے بہت بڑے مقنن و قانون ساز سمجھے جاتے ہیں، حال ہی میں ایک کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ اگر حکومت نے بہ سلسلۂ ترمیم ان اصولی حقوق کو ہاتھ لگایا جو دستور نے ملک کے باشندوں کو عطا کئے ہیں تو اسکی سخت مخالفت کی جائے گی اور اس سے ملک کے امن و سکون کو سخت صدمہ پہونچے گا۔ دستور کی حیثیت ایک پودے کی سی ہے جس کو زمین پر اپنی جگہ پکڑنے کے لئے کچھ زمانہ درکار ہوتا ہے اور جس طرح ایک پودے کو نصب کرنے کے بعد گھڑی گھڑی اکھاڑ کر یہ دیکھنا کہ اسکی جڑیں پھیلی ہیں یا نہیں، غلط طریقہ ہے، اسی طرح دستور میں ترمیم و تبدیلی بھی اسکو مستحکم ہونے سے روکتی ہے۔ دستور بچوں کا گھروندا نہیں کہ آج بنایا کل توڑ دیا، وہ بنیاد ہے تعمیر حکومت کی اور بنیاد کو چھیڑنا پوری عمارت کو متزلزل کردینا ہے۔

آتش اور شاد

(بہ سلسلۂ ماسبق)

آتش اور شاد کی یکرنگی اور ہم آہنگی کا پتہ اس وقت زیادہ چلتا ہے جب دونوں کی ہم طرحی غزلیں ساتھ ساتھ پڑھی جائیں۔ شاد نے آتش کی طرحوں میں بہت سی غزلیں لکھی ہیں، دونوں کے دواوین سے چند غزلیں ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا اس لئے ناگزیر تھا کہ بغیر اس کے دونوں شعراء کی غزل گوئی کا فرق، ان کے اسلوب بیان اور انداز طبیعت کا رنگ ظاہر نہ ہوتا۔ میں نے چاہا ہے کہ آتش اور شاد کے متعلق کافی مواد اس مضمون میں جمع کردوں تاکہ آیندہ کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں تو ان کے لئے سہولت ہو ہم طرحی غزلوں کے موازنہ کے بعد میں نے متحدالخیال مضامین کے اشعار کا موازنہ پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دونوں نے کس کس طریقہ سے لکھا ہے۔ میں نے جا بجا اپنی رائے کا بھی اظہار کردیا ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنی اپنی پسند کا اختلاف ہو۔ بخوف طوالت کے خیال سے ایک ہی مضمون کے تحت دونوں کے ہم خیال اشعار لکھ دئے گئے ہیں اور آگے چل کر مزید اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک طرف آتش کے اشعار اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کردئے ہیں، آپ خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ کون لایق ترجیح ہے۔ انداز بیان اور اسلوب ادا کا فرق ہو تو ہو مگر اجمالی طور پر میں یہ کہنے میں تامل نہیں کرتا کہ شاد کو آتش پر ترجیح ہے۔ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے شاد کو آتش پر فوقیت حاصل ہے، اور غالب کے بعد شاد جیسا کوئی زبردست غزل گو پیدا نہیں ہوا۔ میں آتش کا پرستار ہوں، ان کے کلام کی تڑپ، تیور، اور تیکھاپن پر جان دیتا ہوں، ان کے طنز کے طرز کو سراہتا ہوں، مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ شاد کے یہاں کی بلند آہنگی، علوئے تخئیل، پاکیزہ انداز بیان کا جواب نہیں ہوسکتا۔

آتش

وہ نازنیں یہ نزاکت میں کچھ یگانہ ہوا
جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا

شب اس کے افعئی گیسو کا جو فسانہ ہوا
ہوا کچھ ایسی بندھی گل چراغ خانہ ہوا

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اثر کیا تپش دل نے آخر اس کو بھی
رقیب سے بھی مرا ذکر غائبانہ ہوا

گناہگار ہیں محراب تیغ کے ساجد
جھکا یا سر تو ادا فرض پنجگانہ ہوا

شاد

زہے شرف ترے در پر بسر زمانہ ہوا
خوشا نصیب کہ میں خاک آستانہ ہوا

سیاہ بختوں کا آغاز جب فسانہ ہوا
خموش اول شب سے چراغ خانہ ہوا

خدا برا کرے اس نیند کا یہ کیسی نیند
کھلی کب آنکھ کہ جب کارواں روانہ ہوا

چھپی نہیں ہے کوئی شے نگاہ والوں سے
وہ بے بصر ہے جسے عشق غائبانہ ہوا

تمام رات جو گزری تھی مے پرستی میں
خلوص دل سے ادا صبح کا یگانہ ہوا

آتش

بھرا ہے سینۂ دل کوئے محبت سے
خدا کا گھر تھا جہاں واں شراب خانہ ہوا
ہمیشہ شام سے ہمسائے مر رہے آتش
ہمارا نالۂ دل گوشش کو فسانہ ہوا
پامال کیجئے انھیں رفتار ناز کا
طاؤس و کبک رکھتے ہیں دعویٰ نیاز کا
ہوجائے حسن معنی بے صورت آشکار
روئے حقیقت اٹھے جو پردہ مجاز کا
عمر خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی
دھوون پئے جو یار کی زلفِ دراز کا
ساقی زلال دور دجو توفیق ہو سو دے
مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا
ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر
مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا
اللہ رے صفائے بیان حدیث دوست
دم بند ہے فصاحت اہلِ حجاز کا
نیرنگ حسن و عشق کی اللہ رے بہار
بے کار کوئی فعل نہیں کارساز کا
کیونکر وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں
اندازے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا
پتلوں سے خاک کے یہ کرشمے بھر چکیں کہیں
دھبے مٹے زمیں کے نشیب و فراز کا
آتش جگہ نہ دل میں ہوا و ہوس کو دو
کم زہر سے اثر نہیں اس شہر آز کا
تار تار پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں پاپہلوئے دوست
چہرۂ رنگیں کوئی دیوان رنگیں ہے مگر
حسن مطلع ہیں میں مطلع ہے صاف ابروئے دوست
یاد کرکے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست

شاد

غضب کیا ترے جانے نے بزم میں ساقی
بلند چار طرف شور عامیانہ ہوا
بہت ضعیف ہوا اے شاد رہ نہ جاؤ کہیں
بڑھاؤ تم بھی قدم کارواں روانہ ہوا
جانے بھی دے محل نہیں یہ کبر و ناز کا
آخر ہے رات وقت ہے راز و نیاز کا
ان کی نگاہ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا
جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں قیدیوں کی طرح
اللہ رے سلسلہ تری زلفِ دراز کا
دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا
اے رند قصد سجدۂ خم کا رہے ضرور
داخل نماز میں ہے تہیہ نماز کا
اللہ رے بلندیٔ بام ثنائے دوست
ہے پست حوصلہ قلمِ سرفراز کا
صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پہ کر نگاہ
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا
کس طرح دل پہ فتنۂ محشر کا ہو اثر
ہنگامہ یاد ہے تری رفتار ناز کا
عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں
اس میں قصور کیا نگہ فتنہ ساز کا
شاید صفِ نعال میں تھوڑی سی جا ملے
اے شاد ہم بھی رکھتے ہیں دعویٰ نیاز کا
محو ہیں اپنی جگہ آسودگانِ کوئے دوست
آرزو دل میں ہے دل آنکھوں میں آنکھیں سوئے دوست
زندگی تا چند محراب دعا میں کاٹئے
کاش اک دن ذبح کر چھوڑے خم ابروئے دوست
لاشۂ عریان عاشق کا کوئی دیکھے وقار
ڈھانکتی ہے اٹھ کے کس الفت سے خاک کوئے دوست

داغ دل پر خبر گذری تو غنیمت جانیے
دشمنِ جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست

دو مریں گے زخمِ کاری سے تو حسرت سے ہزار
چار تلواروں میں شل ہو جائیگا بازوئے دوست

فرشِ گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیرِ سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

ہجر کی شب ہو گئی روزِ قیامت سے دراز
دوش سے نیچے نہیں اُترے ابھی گیسوئے دوست

دور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا
آئینہ کو سینہ صافی نے دکھایا روئے دوست

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

دیکھ لیں ہے جو قیامت کا تماشا باقی
ہو چکے وہ بھی جو ہو صحبتِ فردا باقی

فرقتِ یار میں مردہ سا پڑا رہتا ہوں
روح قالب میں نہیں جسم ہے تنہا باقی

اس قدر سینۂ غمِ عشق سے معمور ہوا
نہ رہی دل میں مرے حسرتِ دنیا باقی

گرمیاں ہیں جو یہی آہ شرر افشاں کی
نہیں رہنے کا مرے یار کے پردا باقی

محفل آباد ہے منہ پر سے نقاب الٹو تو
دیکھ لیگا کوئی ہووے گا جو بینا باقی

چھیڑ بیٹھے جو ہم افسانۂ گیسوئے دراز
صبح ہو گی نہ رہے گی شبِ یلدا باقی

جان پر بن گئی دم گھٹنے لگا میں شبِ ہجر
گنتے گنتے نہ رہا جب کوئی تارا باقی

کون وارفتہ ترے گیسوئے پیچاں کا نہیں
کس کو سودا نہیں یہ سلسلہ ہے تا باقی

یہی آتش کی دُعا ہے یہی آتش کی دُعا
مغفرت ہووے مری بعد فنا یا "باقی"

تو بڑا عاقل ہے ناصح تو ہی سمجھا دے مجھے
کون شے رہ رہ کے دل کو کھینچتی ہے سوئے دوست

خط گلے پر پڑ چکا تھا خون دیتی تھیں رگیں
وائے حسرت کس جگہ آکر تھکا بازوئے دوست

کس خوشی سے تہنیت دیدے کے یوں کہتا ہے دل
وصل کی شب ہے مبارک دوست کو پہلوئے دوست

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم
آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

نکلے آتے ہیں زمیں سے پھول کس کس رنگ کے
شعبدے دکھلا رہی ہے نرگسِ جادوئے دوست

شاد اہلِ شک یوں ہی شک میں پڑے رہجائینگے
ہم ان ہی آنکھوں سے اک دن دیکھ لینگے روئے دوست

سیر کر سیر جو ہے دیدۂ بینا باقی
جب تک آنکھیں ہیں جبھی تک ہے تماشا باقی

میکدہ میں نہ وہ ساغر ہے نہ خم ہے نہ وہ جام
چل بسے یار، رہے ہم تنِ تنہا باقی

کاش جیتے یونہیں مر مر کے کئی بار اے دل
سیکڑوں سال رہے گی ابھی دنیا باقی

چار دیوار عناصر کو گرایا بھی تو کیا
وہی دھوکا ہے وہی ہے ابھی پردا باقی

جلوۂ یار ابھی تک وہی عالم ہے ترا
شجرِ طور ہی باقی ہے نہ موسیٰ باقی

نہ سہی چار گرہ کا جو گریباں نہ سہی
مدد اے عشق کہ ہے دامنِ صحرا باقی

نت نئے کھیل زمانے کو نظر آئیں گے
جب تک اس خاک پہ ہے خاک کا پتلا باقی

مجھ سے مایوس ہزاروں ہی تصدق تجھ پر
تو سلامت رہے تجھ سے ہے تمنا باقی

ہاتھ اُٹھا کر جو وہ دے اسکو غنیمت سمجھو
شاد ساقی یہ تمہارا نہیں آتا باقی

اک حال پر کبھی نہیں اس کو قیام ہے
دُنیا کا کارخانہ طلسمی مقام ہے

عاشق نواز حسن کی تعریف کیا کروں
یوسف سے بھی عزیز اُسے اپنا غلام ہے

سودائی زلف یار کا جب سے ہوا ہے دل
قالب میں مرغ روح کو ایذائے دام ہے

جب تک کرے حلال نہ مجھ بے گناہ کو
قاتل کو دھنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے

معشوق ہی نہیں جو نہ وعدہ خلاف ہو
چاہے جو تجھ سے پختگی عہد خام ہے

ہم چشم تر کو سامنے کرتے ہیں ابر کے
تم ہنس پڑو تو برق کا قصہ تمام ہے

دولت کے سامنے نہیں کچھ قدر حسن بھی
محمود کا ایاز سا خوشرو غلام ہے

صبح بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

مطلب ہے دفتر گل و لالہ میں مختصر
دو دن کی سیر میں یہ گلستاں تمام ہے

آتش بُرا نہ مانیو حق حق جو پوچھئے
شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

اے چشم رات دن تجھے رونے سے کام ہے
ملتے ہیں دونوں وقت ذرا تھم کہ شام ہے

ستوں پہ منحصر ہے نہ اہل شعور پہ
ساقی ترا تمام زمانہ غلام ہے

اُڑ کر چمن سے جا نہیں سکتی کہیں غریب
بلبل ازل کے دن سے گرفتارِ دام ہے

اتنا بھی میکشوں کو نہیں میکشی میں ہوش
حد سے اگر سوا ہو تو پینا حرام ہے

تیغ نگاہ یار تری کاٹ الاماں
فولاد بھی تو آگے ترے موم خام ہے

دو چار نالے اور کرو صبح ہو چلی
ہاں عاشقو بس اب شب فرقت تمام ہے

کہتے ہیں کس کو حسن کی خدمت گزاریاں
جس مبتلا کو دیکھئے دل کا غلام ہے

اک جام کی بساط تو ساقی بہت نہ تھی
پانی بھی اب مجھے ترے گھر کا حرام ہے

سرمست اپنے حال سے بے حال ہو گیا
ہم کیا کہ اب یہ بزم بھی ساقی تمام ہے

مہماں سرائے تن سے چلی روح کہہ کے آہ
اس گھر میں اب نہ آئیں گے گر شاد نام ہے

میں نے التزام کیا ہے کہ حتی الوسع دونوں کے یہاں قافیہ کی پابندی کے ساتھ موازنہ نہ کیا جائے مگر اکثر وبیشتر شاد نے آتش کے قافیہ کو ہاتھ نہیں لگایا اس لئے مجبوراً مقابلہ میں دوسرے قافیہ کا شعر لکھ دینا پڑا۔ بہرحال انداز بیان اور اسلوب ادا کا پتہ چل جاتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ اس نتیجہ پر بھی ضرور پہونچیں گے کہ موازنہ میں شاد کا پلہ اکثر بھاری ہے۔ شاد کے یہاں مضامین کی رفعت، انداز بیان کا دبدبہ، الفاظ کا ستھرا پن آتش سے زیادہ ہے۔ اب آتش اور شاد کے متحد الخیال اشعار کو لیجئے :۔

عدم احسان پذیری :۔

آتش : دست یاران وطن سے نہیں مٹی درکار
دب مروں گا میں کہیں ریگ بیاباں کے تلے

شاد : لب تشنہ رہنا احسان سے بہتر
دیکھا کیا منہ دریا ہمارا

خوش ہیں گر تشنہ لبی نے یونہی مارا ہم کو[1]
چینِ ابرو نہیں دریا کی گوارا ہم کو

---

[1] غالب کہتا ہے :۔

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا "ع"

صفائے باطن - آتش : ہمیشہ جھاڑتے ہیں گردِ پیرہن غافل　　نہیں سمجھتے کہ ہے زیرِ پیرہن مٹی،
شاد : شستگیِ زباں عبث دل میں بھرے ہیں خار و خس　　چھوڑا ابھی برونِ در فکرِ درونِ خانہ کر
موت میں راحت - آتش : آسماں مر کے تو راحت ہو کہیں تھوڑی سی　　پاؤں پھیلانے کو ہاتھ آئے زمیں تھوڑی سی
شاد : آرام سے ہوں قبر کے اندر جو بند ہوں　　میں بھی تو آدمی ہوں فراغت پسند ہوں
ماعرفناک حق معرفتک - آتش : معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے　　اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے
شاد : ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا　　اسی قدر اسے حیرت ہے جس قدر سمجھا
عشق نے نکما کر دیا - آتش : دونوں جہاں کے کام کا رکھا نہ عشق نے　　دنیا و آخرت سے کیا بے خبر مجھے
شاد : فلک کا ذکر تو کیا ہے زمیں کے بھی نہ رہے　　ہم اپنی چال سے آخر کہیں کے بھی نہ رہے
شوق دیدار - آتش : بینا ہوں جو آنکھیں تو رخِ یار کو دیکھیں　　نظارہ کے قابل جو تماشا ہے تو یہ ہے
شاد : یہ آرزو ہے تری جلوہ گاہ میں جا کر　　ہزار آنکھیں ہوں اور سب سے یار ہم دیکھیں
خدا جانے قیامت کب ہو؟ - آتش : حشر پر وعدۂ دیدار نہ کر عاشق سے　　کس کو معلوم ہے فردائے قیامت کب ہے
شاد : تکیہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں تہِ خاک　　کل قیامت جو نہ آئی تو قیامت سمجھو
جمال یار کی تابانی - آتش : ٹھیرا حضورِ یار نہ ماہِ چہاردہ　　دن ہو گیا نقاب جو شب کو اٹھا دیا
شاد : شبِ وصل اپنی ہی آنکھوں سے یہ اندھیر دیکھا ہے　　نقاب ان کا الٹنا رات کا کافور ہو جانا
دل کا مول - آتش : مول اک نگاہ ہے جو ہو دل یار کی پسند　　بڑھ کر جو لے تو آگے خریدار کی پسند
شاد : حاضر ہے گر پسند ہے کیا دل کا مول ہے　　قسمت کو پوچھتے ہو تو سونے کی تول ہے
پیغام موت مبارک ہے - آتش : ہوتی ہے تن میں روح پیامِ اجل سے شاد　　دن وعدۂ وصال کے نزدیک آ چکے
شاد : سعوبت سہہ چکے اے شاد اب چین سے کاٹو　　مبارک ہو قضا خود لیکے فرمانِ اماں پہونچی
شاعری صناعی ہے - آتش : بندش الفاظ جڑنے سے نگیں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا
شاد : دُرِ مضموں کوئی یوں باندھ لے اے شاد مشکل ہو　　سلیقہ انتہا کا چاہئے موتی پرونے میں
مضامین تازہ کی تلاش - آتش : رہتی ہے فکرِ تازہ مضامیں کی منتظر　　اس گھر میں آ نکلتے ہیں مہماں نئے نئے
شاد : قلم اپنا مضامینِ کہن منسوخ کرتا ہے　　دماغ اپنا ہے تازہ محکمہ قانون سازی کا
چشم یار کی نیرنگ سازی - آتش : لاتی ہے ہر نگہ میں نیا چشمِ یار رنگ　　دکھلا رہی ہے گردشِ لیل و نہار رنگ
شاد : پوچھو نہ حال چشمِ دل آویزِ یار کا،　　کھولو نہ راز گردشِ لیل و نہار کا
مقام روح - آتش : قالبِ خاکی کو تو سنتے ہیں آتش زیرِ خاک　　کچھ نہیں معلوم ہم کو روح کس عالم میں ہے
شاد : جسے پاک رکھنے کی تھی ہوس وہ تو تیرے در پہ پہونچ گئی　　یہ جو مشتِ خاک زمیں پہ ہے اسے پھینک آؤ کہیں سہی
نفس کی آمد و شد - آتش : کھلا یہ ہم کو دمِ نزع کے تنفس سے　　کشاں کشاں لئے جاتا ہے شوقِ منزل کا
شاد : پیغام آ رہے ہیں تواتر وصال کے　　ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا
افشائے راز عشق - آتش : وقتِ آخر عشقِ پنہاں یار پر ظاہر ہوا　　نزع نے عیسیٰ نے پہچانا مرے آزار کو
شاد : تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے　　اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز ان کے

اختصار کے خیال سے اب ایک طرف آتش اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کرتا ہوں آپ خود مماثلت پر توجہ کریں اور یہ

دیکھیں کہ دونوں میں کتنی ہم آہنگی ہے:

آتش:- سعی لا حاصل مداوائے جنون عشق ہے
تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا
ہاتھ قاتل کا مرے خنجر تک آکر رہ گیا
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا
چھیڑ بیٹھے جو ہم افسانۂ گیسوئے دراز
صبح ہوگی نہ رہے گی شب یلدا باقی
مشکلِ نزع بھی آسان ہوئی جاتی ہے
نفس چند کی ہے روح کو ایذا باقی
ثبات اس کو نہیں یہ عالم واشد دو روزہ ہے
ہنسو اتنا بھی اے غنچو نہ تم کھل کھل گلستاں میں
عدم سے ہستی میں جاکر یہی کہوں گا میں
ہزاروں حسرت زندہ کو گاڑ داب آیا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھکو دعویٰ ہے خدائی کا
چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے
رُت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے
عالم سے کچھ غرض نہیں اے جانِ جاں ہمیں،
دل کو نہیں ہے کوئی تمھارے سوا قبول
کہاں تک آنکھوں میں سرخی شراب خواری سے
سفید مو ہوئے باز آ سیاہ کاری سے
راز دل افشا نہ ہو اسے دل کہے دیتا ہوں میں
پھوڑ ڈالی آنکھ اگر آنسو نظر آیا مجھے،
نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے
حکایت گل رنگین یار کیا کہتے
چمن کو آگ لگاتا جو باغباں سنتا،
جنوں نے چل عدم کو یاں بھی گھبراتا ہے دم اپنا
کیا ہے تنگ وحشت نے ہماری عرصہ ہاموں کا
درد مریں گے زخم کاری سے تو حسرت سے ہزار
چار ہی ہاتھوں میں شل ہو جائیگا بازوئے دوست

شاد:- مرض کی دھیمی دھیمی آنچ کیا دھوکے میں رکھتی ہے
مریضِ عشق کب چیتا کہ جب نوبت یہاں پہونچی
ہماری جان صدقے نوجوان قاتل کے غصہ پہ
کوئی انداز دیکھے آستینوں کے چڑھانے کا
جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے جو سنے کوئی تو خلش رہے
یہ فسانہ زلف دراز کا مری زندگی سے دراز ہے
آخر ہے عمر ضیق میں دل بھی ہے جان بھی
مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی
یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمر ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آئے ذرا نمو کا
ابھی بہت دل میں ہیں امیدیں تڑپ کے حسرت سے مر نہ جائے
ملو اگر شاد سے عزیزو تو ذکر کرنا نہ آرزو کا،
کچھ تعجب نہیں آنکھوں نے اگر مان لیا
دل نے دیکھا نہیں اس پر تجھے پہچان لیا
خزاں میں خشک شاخوں سے لپٹ کر مفت جی کھونا
بہار آئے گی گھبراؤ نہ اے اُجڑے چمن والو
ہزار مجمع خوبان ماہ رو ہوگا،
نگاہ جس پہ ٹھہر جائے گی وہ تو ہوگا
اب اجتناب مناسب ہے شاد رندی سے
سفید آپ کے داڑھی کے بال ہونے لگے
ہجوم اشک سے دیدار میں خلل نہ پڑے
جو ابکے روؤں تو آنکھوں کو میں نے پھوڑ دیا
گلہ جلوے کا تیرے کیا کہ عالم آشکارا ہے
ہمیں رونا تو جو کچھ ہے وہ اپنی کم نگاہی کا
جمالِ یار کا قصہ چمن میں چل کے کہو
گلوں کے کان کھڑے ہوں گے اس حکایت سے
پاؤں کی خاک ہیں یہاں لاکھ بیاباں ایسے
ایک صحرا کو لئے پھرتی ہے وحشت میری
صف آخر میں ہوں میں وا اسفا اے قاتل
خوف یہ ہے کہ تھکا جاتا ہے بازو تیرا

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال
کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے

چمن کو یاد کر کے دیر تک آنسو بہاتا ہوں
کوئی تنکا جو مل جاتا ہے اُجڑے آشیانے کا

ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

کرم کیا جو ستم نے ستم زیاد کیا
شبِ فراق میں میں نے خدا کو یاد کیا

کوئی خفا ہو تو ہو امر حق مگر یوں ہے
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

سب سے روشن اور نمایاں پہلو دونوں کے کلام کا یہ ہے کہ دونوں حافظ شیراز سے بہت قریب تر ہیں۔ دونوں بادۂ حافظ کے جرعہ کش ہیں ہے اور متفاول رنگ بھی دونوں کے یہاں نمایاں ہے مگر چونکہ آتش فطرتاً باغ و بہار تھے ان کے لئے متفاول رنگ زیادہ نکھرا ہوا ہے شاد چونکہ فطری طور پر حسرت و غم کا مرقع تھے اس لئے ان کے یہاں یہ رنگ اتنا نمایاں نہیں اور نہ ہونا چاہئے تھا مگر پھر بھی جو ہے وہ غنیمت ہے۔

شاد کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو علاوہ دیگر متداول مضامین کے جو ان کے "خاصہ" کی چیز ہے وہ ان کا "خمریات" ہے۔ حیرت ہے نظیر صدیقی صاحب کی اس رائے پر کہ " شاد نے خمریات پر بھی توجہ کی ہے لیکن زیادہ تر رسمی، وہی شراب کی رندانہ تعریف، وہی زاہد کی عدم مے نوشی پر طنز، وہی ساقی کی نشیلی آنکھوں کا تذکرہ جو قدما کے عہد سے چلا آرہا تھا ان کے یہاں بھی ہے اور اس میں بھی کیف و سرود اور جوش و مستی کے عناصر بہت کم ہیں[1]" لیکن کلامِ شاد کے آئینہ میں اس تنقید کے خدوخال کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تنقید شاد کے کلام پر صادق نہیں آتی۔ اب ایک ایک کرکے ان کو پرکھئے۔

جہاں تک رسمی مضامین کا تعلق ہے، یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ شاد کے یہاں مے نوشی عبادت ہے، میکدہ کا احترام فرض ہے، ان کے خمریات کی ایک خاص تکنیک ہے۔ ساقی اور پیرِ مغاں کا خاص مفہوم ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انکے مذہبی خیالات کی ترجمانی بھی انہی خمریاتی شاعری کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

اداؤں میں کرامت ناز میں اعجاز ساقی کا
نہ بھولے گا ہمیں اے میکشو انداز ساقی کا

بجز پیرِ مغاں کے کس نے کی تعظیم ساقی کی
وہی کچھ جانتا تھا میکشو اعزاز ساقی کا

سبو ہو، جام ہو، مینا ہو سب منہ تکنے والے تھے
بھری محفل میں آخر کون تھا دمساز ساقی کا

تھکے وہ لب مذمت جس سے نکلے ساغرِ مے کی
خدا رسوا کرے اس کو جو ہو غماز ساقی کا

پوری غزل کی غزل ایک رنگ میں ہے۔

کیا اس قسم کی شاعری کو رسمی کہیں گے۔ ایک دوسری غزل جس کی ردیف ہے " میں قربان ساقی پر" اسی ایک رنگ میں ہے یہ خمریاتی رنگ نہ میں نے قدما کے کلام میں پایا اور نہ شاد کے معاصرین میں، یکرنگی غزلوں کو جانے دیجئے، منفرد اشعار جو مے و مینا کی اصطلاحی زبان میں ادا ہوگئے ہیں، شاد کے مخصوص رنگ اور انداز بیان کی غمازی کرتے ہیں اور کوئی دوسرا شاعر ان کا حریف نہیں ہوسکتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لے کے خود پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا آیا
میکشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

منہ بچے ہیں متحیر، متبسم ساقی
پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا

---

[1] نگار دسمبر ۱۹۶۵ء

اسی امید میں باندھے ہوئے ہیں ٹکٹکی میکش کفِ نازک پہ ساقی رکھ کے اک دن جام آئیگا

ایک چھوٹی سی غزل کے چند اشعار سنئے :۔

ساغر ہمارا ، مینا ہمارا جنت ہماری ، طوبیٰ ہمارا
داتا کے در سے لیکر پھریں گے بھر دے گا اکدن کاسا ہمارا
مے پر کسی کو ، خم پر کسی کو ساقی پہ اپنے دعویٰ ہمارا

کیا ان اشعار میں کیف و سرور ، جوش مستی اور والہانہ انداز کا فقدان ہے ؟ ۔ چند اشعار اور اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں :۔

بجائے بات الگ سے الگ سبو لیتے یہ کیا مجال کہ ساقی کے ہاتھ چھو لیتے
حریفِ بزم میں گستاخ ہو چلے ساقی ذرا تو کھیل سے آنکھوں کو خشمگیں کر لے
ساقی کی چشم مست پہ مشکل نہیں نگاہ مشکل سنبھالنا ہے دلِ بے قرار کا
کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب لے ساقی خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا
نہ دے الزام بدمستی کا اک افتادگی ساقی مرا گرنا بھرے ساغر کا چکنا چور ہو جانا
غضب نگاہ نے ساقی کی بند و بست کیا شراب بعد کو دی ، پہلے سب کو مست کیا
دے کے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا
مشتاق کب سے ہم ہیں فقط ایک جام کے قربان اپنے ساقیِ ہوش کے تام کے
دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھکر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
برا اس بزم میں تھا یا بھلا میں ، خدا حافظ ہے لے ساقی ! چلا میں ! !

خمخانۂ آتش بھی کچھ کم سرور افزا نہیں ، گرچہ شاد کے میخانہ کی تندی اور سرشاری نہیں مگر پھر بھی ان کی شراب کو دو آتشہ کہنا ہی پڑے گا ۔ مثالیں دیکھئے :

آتش مست جو مل جائے تو اس سے پوچھوں تو نے کیفیت اٹھائی ہے خرابات میں کیا
شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتش ، لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا
بوئے مے رکھتی ہے اس میکدہ میں کیفیت محتسب توڑ کے شیشہ کو پشیماں ہوگا
ساقیِ میکدہ نے مجھ کو یہ خدمت دی ہے نشہ میں مست جو گرتا ہے اُٹھاتا ہوں میں
مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
نشۂ مے نے نقاب رخ زیبا الٹا ٹھوکریں کھاتی ان آنکھوں کی حیا پھرتی ہے
خدا جانے کہ ہوگا حال کیا ہم بادہ نوشوں کا لڑا کر جام سے توڑا ہے بدمستی میں مینا کو

متغزلانہ رنگ

آتش کے کلام میں جو چہکار اور لپک ہے وہ ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے ۔ اُردو میں شاید ہی کوئی شاعر جوش مسرت سے اتنا لبریز اور سرشار ہو ۔ ان کے سارے کلام میں جوشِ نشاط اور سرورِ حیات اتنا رچا ہوا ہے کہ غم آگیں مضامین ان کے چہرے پر نہیں کھلتے ۔ ملاحظہ ہو :

جامہ سے باہر اپنے جو ہوں میں عجب نہیں ، کھولے ہیں کس کے بند قبا کچھ نہ پوچھئے
ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

بہار آئی، مرادِ چمن خدا نے دی
شگفتہ غنچہ ہوئے بوئے گل صبا نے دی

چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے
رُت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

خوشی سے جامے میں پھولا نہیں سماتا ہے
بہارِ گل کی جو آمد ہے باغباں سنتا

کوچۂ یار میں چلئے تو غزل خواں چلئے
بلبلِ مست کی صورت سے گلستاں چلئے

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھکو
گلِ تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا

پائے خم مستوں کے ہو حق کا جو عالم ہو سو ہے
سرِ ممبر وہی واعظ کا بیاں ہے کہ جو تھا

شاد اپنی فطرت کے لحاظ سے لحاظ سے تشائم واقع ہوئے ہیں اور اس حقیقت سے وہ میر سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں سرور و شادمانی کی جھلک بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور متفادل رنگ ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

خزاں میں خشک شاخوں سے لپٹ کر مفت جی کھوتا
بہار آئے گی گھبراؤ نہ اے اُجڑے چمن والو

دو چار نالے اور کرو صبح ہو چلی
ہاں عاشقو بس اب شبِ فرقت تمام ہے

سدھاری تیرہ بختی منزلوں تک چاندنی چھٹکی
مرے گھر چودھویں کا چاند بن کر وہ حسیں آیا

ہنسی خوشی سے زمانہ بسر کیا اے شاد
مثالِ نخلِ گلستاں نہال ہو کے رہے

شاد کے غم آشنا اور یاس پرور دل سے بہجت آفریں نغمے نکل ہی نہیں سکتے تھے ان کا دیوان حزن و یاس کا گنجینہ اور غم و الم کا سفینہ ہے، کیونکہ ان کی ساری عمر ناکامی اور پریشان حالی میں گزری، عظیم آباد کی فارغ البالی دم توڑ رہی تھی، عزیزوں اور وطن والوں نے کوئی دقیقہ ان کی رسوائی اور بدنامی کا اُٹھا نہ رکھا، "اپنچ" کا سارا زورِ قلم ایک بیچارے شاد کے لئے وقف تھا۔ چنانچہ اُنکے کلام میں جابجا اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:

حریفوں نے کہا سب کچھ ادھر روئے سخن کر کے
مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفلِ دہن کر کے

گلوں نے خاروں کے چھیڑنے پر بجز خموشی کے دم نہ مارا
شریف اُلجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی

بتا دیا مجھے بیچ بیچ کے راستہ چلنا
خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا

آتش اور شاد دونوں کے کلام میں "رمزیت" اور "اشاریت" بدرجۂ اتم ہیں۔ اور اس حیثیت سے دونوں اُردو کے حافظ کہے جا سکتے ہیں۔ آتش خود کہتے ہیں:-

غزل خواجہ ہے، مطلب کو پہونچ اے آتش
نالۂ بے اثر مرغ نوا سنج نہیں

اور شاد تو اپنے حافظِ وقت ہونے کا دعویٰ اس طرح کرتے ہیں:-

شعر کہتے ہیں کسے بزم میں کھل جائے گا
شاد آیا نہ کہو حافظِ شیراز آیا

دونوں کے یہاں ہم کو ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو حافظ کے اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً:-

حافظ	شاد
غرض ز مسجد و میخانہ ام وصال نما است	بتکدہ ہے کہ خرابات ہے یا مسجد ہے
جز این خیال ندارم خدا گواہ من است	ہم تو صرف آپ کے طالب ہیں خدا شاہد ہو
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم	دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما	چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا
در مجلس صبوحی، دانی چہ خوش نماید	اُٹھا لو جام کہ زندہ وبال جاں ہے مے پینا
عکس عذار ساقی بر جام مے فتادہ	مجھے ہنستا ہوا ساقی کا چہرہ یاد آتا ہے

سرقہ، توارد، استفادہ

(بسلسلۂ ماسبق)

(۲) حکیم سنائی کا شعر ہے:-

رفتم از ہوش وقتِ رفتنِ یار　　او چناں رفت و من چنیں رفتم

وداع محبوب کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس شعر میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کر دینا چاہتا ہے جس میں کوئی بات بھی جذبات سے اپیل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حکیم شفائی نے اسی مضمون کو پیش کیا ہے:

غافل زخود شدیم بکویش گہہِ وداع　　خود را ز اضطراب ہماں جا گزاشتیم

"رفتم از ہوش" سے کچھ ایسا مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اپنے اختیار سے کیا گیا ہے اور شعر میں نے دے کے صرف یہی ایک جملہ ہے جس میں جذبات کا کوئی جزو ملتا ہے اس کے مقابلہ میں "غافل زخود شدیم" کی بلاغت ظاہر ہے اور دوسرے مصرعہ میں تو سراپا جذبات ہی ہیں۔ پھر انداز بیان نے اس کو ظاہر کر دیا ہے کہ یہ جذبات نہیں بلکہ واردات ہے اور اس اعتبار سے دونوں شعروں کا فرق ظاہر ہے۔

(۳) غالب کا شعر ہے:

سینہ بکشودیم و خلقے دید کا نجا آتش ست　　بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست

غالب نے اس شعر کے مضمون کو جس طرح ترتیب دیا ہے اس میں گرمی دل کی شدت کا اظہار مقصود ہے وہ صرف یہ امر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میرے سینے میں جو آگ دہک رہی ہے وہی حقیقت میں آگ ہے۔ لیکن اس شعر میں جذبات کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اس کے برخلاف اُردو میں ایک شعر اسی مفہوم کا غالب نے کہا ہے:-

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں　　سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

حالانکہ اس شعر میں سوزِ غم کا مقابلہ معمولی آگ کے بجائے آتشِ دوزخ سے ہے مگر اس شعر کا اسلوب بیان بالکل جذباتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی واردات بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ مضمون یکساں ہے مگر اس شعر کی زبان جذباتی ہونے کی وجہ سے اس میں اثر بہت بڑھ گیا ہے۔

(۴) نظیری کی ایک ہی غزل کے دو شعر ہیں۔ اندازہ کرنا چاہئے کہ دونوں میں کیا فرق ہے:-

(۱) بجنت سوزِ عشقش گر نباشد،　　شود بر مومن آبِ کوثر آتش

(۲) نظیری کام دل از سوختن جو،　　شود پروانہ را بال و پر آتش

پہلے شعر میں معلوم ہوتا ہے کہ فقہ یا فلسفہ کا کوئی مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے جو بالکل تخئیل یا علم سے متعلق ہے، لیکن دوسرا شعر سرتاپا جذباتی ہے اور اس لئے اس میں اثر و گداز بڑھ گیا ہے۔

(۵) خواجہ حافظ نے ذیل کے دونوں شعروں میں ہجر کی ایک مخصوص حالت کو پیش کیا ہے اور دونوں شعروں میں سوزِ ہجر کا ذکر ہے۔

(۱) تنم از واسطۂ دوریِ دلبر بگداخت　　جانم از آتشِ ہجرِ رخِ جانانہ بسوخت

(۲) بے روئے دل آرائے تو اے شمعِ دل افروز　　دل رقص کناں بر سرِ آتش چو کباب ست

پہلے شعر میں جذبات نہیں ہیں بلکہ جان و تن پر جو مختلف اثرات ہجر کے ہیں ان کا بیان ہے لیکن دوسرے شعر میں حالانکہ جان و تن کا ذکر نہیں ہے

لیکن چونکہ جذبات کی زبان سے سب کچھ کہا گیا ہے اس لئے وہ واردات بن گیا ہے اور دونوں شعروں میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے ظاہر ہے
ان مثالوں سے اس امر کی تشریح مقصود تھی کہ بعض اوقات واراداتی شاعری اور تخئیلی شاعری میں بہت تھوڑا اور بہت ہی نازک فرق ہوتا ہے اور اس کو نگاہ میں رکھنا بیحد ضروری ہے۔

تخئیلی شاعری ایسی چیز ہے کہ اس میں توارد ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں، اس لئے کہ ایک ملک میں نصاب تعلیم ۔طریق بود و ماند ۔طرز فکر ۔آداب معاشرت وغیرہ میں اس طرح کی یکسانیت و یکرنگی ہوتی ہے کہ تخئیل و تصور میں بغیر ارادہ کے اتحاد و یکسانیت پیدا ہوجانا لازم ہے۔ علاوہ اس کے اگر کوئی شاعر اپنے پیشروؤں کے خیالات کو اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے تو اس کو سرقہ نہ سمجھنا چاہئے ۔عربی کے دو ضرب الامثال مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں نقل کئے ہیں کہ "لم تترک الاول الآخر" اور "کم تترک الاول الآخر" یعنی پہلے پچھلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑ گئے اور پہلوں نے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے ۔جب ان دونوں ضرب الامثال پر مجموعی طور سے نظر کیجائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کوئی نیا مضمون ایسا نہیں ہے جو پہلوں نے نہ کہدیا ہو اس لئے پچھلوں کو نیا مضمون نہ ملے گا اور دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگلے بہت کچھ جمع کر کے چھوڑ گئے ہیں جس سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں ۔ یہاں اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ عرب اپنے قدماء سے استفادہ کرنا معیوب نہ سمجھتے تھے جیسا کہ عرب کے اس دوسرے جملہ سے واضح ہوتا ہے ۔حضرت کعب ابن زبیر جو سبعہ معلقہ میں شریک ہیں اور جاہلیت و اسلام میں یکساں ممتاز شاعر رہے ہیں فرماتے ہیں:

ما ارانا نقول الا معارا او معاداً من قولنا مکرورا

یعنی ہم جو کہتے ہیں وہ اگلوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی ایک بار کے کہے ہوئے کو دہراتے ہیں۔
شاعر ابونواس نے فضل بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا:

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کیا دشوار ہے کہ وہ ایک شخص واحد کی ذات میں ایک عالم کو جمع کر دے۔
اس شعر میں چونکہ مضمون نیا تھا اور بلند تھا ۔شعر بغداد کی گلیوں تک میں ہر شخص کی زبان پر آگیا کسی نے ابونواس سے دریافت کیا کہ اس مضمون تک رسائی کیونکر ہوئی تو اس نے صاف کہدیا کہ جریر کے اس شعر سے میں نے یہ خیال اخذ کیا ہے کہ:

اذا غضبت علیک بنو تمیم حسبت الناس کلہم غضابا

یعنی جب بنو تمیم تم سے ناراض ہو جائیں تو سمجھ لو کہ تمام ہی آدم ناراض ہو گئے۔
ابونواس کوئی معمولی شاعر نہیں ہے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گزرا ہے مگر اس نے جریر سے استفادہ کیا اور اس کا صاف الفاظ میں اعتراف بھی کر لیا ۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدماء سے متاخرین نے کس طرح مضامین اخذ کئے ہیں۔

مولانا نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب لکھنے کی جرأت کوئی شاعر نہ کر سکا تا آنکہ حضرت امیر خسرو کا زمانہ آگیا اور موصوف نے سب سے پہلے خمسۂ نظامی پر خمسہ لکھا اور پہلی ہی مثنوی مطلع الانوار میں مولانا نظامی سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے فرماتے ہیں:-

گرچہ بملک سخن از پنج گنج، نوبت آں گنجہ نغمی گشت پنج
نوبت خسرو کہ پیچش نواست پنجہ آں نوبت آں خسرو است
ساذم ازاں ساں بسرائے سپنج پنج کلید از پے آں پنج گنج
آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں فرق ندانند ازیں تا بداں
ملک سخن را چو گرفتم بہ تیغ گوہر خود نیز فشاندم چو میغ

آخر کے دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نظامی کی روش طرز بیان ۔مضمون وغیرہ کا لفظاً معناً اتباع کیا ہے مگر اسکے باوجود

بعض اصحاب نے مولانا نظامی کی پیروی کرنے کے سلسلہ میں حضرت امیر خسرو پر اعتراض کیا تو اس کا جواب مثنوی مجنوں و لیلیٰ میں اس طرح دیتے ہیں:۔

گر ما ز ہنر تہی میانیم ۔۔۔ بارے تو بگوئے تا بدانیم

از دعوئے ایں خیال سنجی ۔۔۔ ناگفتہ ملاف تا نہ رنجی،

بنود چہ قسائۂ تو نامی، ۔۔۔ بیہودہ چہ لافی از نظامی

گفتی دم اوست مردہ رازیست ۔۔۔ آں زانِ وے است زانِ تو چیست

گر زاں قدح آرے آب خوردم ۔۔۔ بے گفت تو اعتراف کردم

آخری شعر میں کس طرح بالکل کھلے لفظوں میں مولانا سے استفادہ کرنے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ حضرت امیر کے بعد خواجہ کرمانی نے اپنا خمسہ مرتب کیا۔ خواجہ کرمانی مسترد کے لئے کہتے ہیں:۔

سوختم ایں لخلخۂ خسروی ۔۔۔ در طبق موہبتِ مولوی

مولوی سے مراد مولانا نظامی ہیں

شمس العلماء، مولوی محمد حسین آزاد نے ذوق کا واقعہ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ موصوف قصیدہ لکھ رہے تھے جس کا مطلع ہے:

زہے نشاط کہ گر کیجئے اُسے تحریر ۔۔۔ عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اس کے اشعار آزاد کو سنا رہے تھے، درمیان میں چند بار اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اسی عقیدہ میں خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی تضمین کرینگے

ع دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ ۔۔۔ ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

اس کے چند روز کے بعد جو آزاد وہاں گئے تو ذوق نے حسب ذیل قطعہ سنایا:۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط ۔۔۔ کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبرا ۔۔۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

اور اس کے بعد آزاد کی طرف دیکھ کر فرمایا "اب بھی؟" انھوں نے کہا "سبحان اللہ، اب اس کی کیا ضرورت رہی" آنکھیں بند کرکے فرمایا "اُدھر ہی کا فیضان ہے (آب حیات صفحہ ۴۶۴ و ۴۶۵) جو زور حافظ کے شعر میں ہے ذوق کے یہاں نہیں ہے مگر حافظ سے استفادہ کرنے کے ذوق خود معترف ہیں، جیسا کہ آزاد کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔

انگلستان کا مشہور و معروف شاعر رابرٹ براؤننگ Robert Browning، جو انیسویں صدی میں ہوا ہے صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ And many a thought did I build upon thought. As the wild bee hangs from cell to cell.

یعنی میں نے بہت سے خیالات دوسرے خیالات سے پیدا کئے ہیں جس طرح شہد کی مکھی ایک خلیہ سے دوسرے خلیہ کی طرف جاتی ہے۔

انگلستان کا ایک دوسرا مشہور مصنف کالٹن (C. C. Colton) جس کا انتقال سنہ ۱۸۳۲ء میں ہوا ہے اپنی کتاب (Lacon) میں کہتا ہے: Subtract from many modern poets all that may be found in Shakespeare, & trash will remain (Ref. N. S.)

گویا دنیا جن لوگوں کی شاعرانہ عظمت کے گیت گا رہی ہے ان کے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے ان میں سے اکثر شیکسپیر کی خوشہ چینی کرکے نام آوری حاصل کر رہے ہیں۔ ناسخ نے ایک جگہ بالکل صاف ہی کہہ دیا ہے کہ:

نہیں ممکن کہ نئی ساری غزل ہو ناسخ ۔۔۔ باتیں دو چار پرانی ہیں تو دو چار نئی

اسی طرح بالکل صاف اور واضح الفاظ میں انیسویں صدی کے انگریزی شاعر جان کیبل (John Keble) نے کہا ہے: As fire is kindled by fire, so is a poet's mind kindled by contact with a brother poet یعنی جس طرح ایک آگ سے دوسری آگ روشن کی جاتی ہے اس طرح ایک شاعر کا دماغ اپنے بھائی دوسرے شاعر کے کلام سے روشن ہوتا ہے۔

الغرض ہر زبان کے شعرا اور مصنفین اپنے پیشروؤں سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں اور خود ہی اس کا کھلے لفظوں میں اقرار بھی کرتے رہے ہیں اگر قایلین کے متذکرہ اصول کے مطابق متقدمین سے استفادہ کرنا ان بلند پایہ شعراء کے نزدیک بھی معیوب ہوتا تو اس طرح کھلے لفظوں میں اس کا اقرار نہ کرتے۔

علامہ شبلی شعر العجم میں تحریر فرماتے ہیں کہ " اول اول ایرانی شعرا عربی شاعری سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے۔ مشق کی ابتدا یہ تھی کہ عربی اشعار کا لفظی ترجمہ کرتے تھے۔ آج بہت سے فارسی قطعے۔ فرد بلکہ قصیدے موجود ہیں جن کو عام لوگ ایران کا سرمایہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ عربی اشعار کے ترجمے ہیں اور مترجموں نے دانستہ ترجمہ کیا ہے کہ شعراء کے لئے نمونے ہاتھ آئیں" (شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۲۳) اسکے بعد ترجمہ کی چند مثالیں پیش کی ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں " اس پردہ میں سرقہ شروع ہوگیا۔ عنصری۔ اسدی۔ کسائی۔ غفاری کے ہاں بہت سے مضامین ہیں جو قطعاً عرب سے لئے ہیں لیکن چونکہ لوگوں کی نظر کلام عرب پر نہیں ہے اس لئے کسی نے سرقہ یا ترجمہ خیال نہیں کیا مجمع الصنایع وغیرہ میں سرقہ کی مثالیں کثرت سے نقل کی گئی ہیں لیکن ان اشعار کا ذکر تک نہیں آتا۔ اس قسم کے سرقات میں ہم مثالیں نقل کرتے ہیں۔ یہ لحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ مضامین شعرائے عرب کے مخصوص اور ممتاز مضامین ہیں جن سے کوئی عربی داں ناواقف نہیں رہ سکتا اس لئے توارد کا خیال صحیح نہیں ہوسکتا" (شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۳۱)۔ اس عبارت کے بعد مولانا نے سرقہ کی چند مثالیں درج کی ہیں ہم بخوف طوالت ان کو قلم انداز کرتے ہیں صرف آخری مثال پیش کرتے ہیں۔ باقی بھی اسی طرح کی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ " برسات میں جو کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں عربی میں ان کو اولاد الزنا کہتے ہیں)۔ مشہور ہے کہ جب سہیل ستارہ نکلتا ہے تو یہ حشرات الارض فنا ہو جاتے ہیں۔ متنبی نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے:

وتنکر موتہم و انا سہیل طلعت بموت اولاد الزنا

" میں سہیل ہوں اور میرے دشمن حشرات الارض ہیں جب میں نمایاں ہوا تو وہ فنا ہوگئے"۔ نظامی نے بعینہ اس مضمون کو لے لیا چنانچہ قصیدہ فخریہ میں فرماتے ہیں:

ولد الزناست حاسد منم آنکہ طالع من ولد الزناکش آمد چو ستارۂ سہائی (شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۳۱)

مولانا شبلی کے متذکرہ بیان کے متعلق ہم موصوف سے بصد ادب اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تمام بیان میں چند امور غور طلب ہیں:-

(۱) مولانا کو تسلیم ہے کہ عربی قطعے۔ فرد بلکہ قصیدے تک ترجمہ کئے گئے۔

(۲) مولانا کو یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ سب کچھ حسن نیت سے فارسی شاعری کو ترقی دینے کے لئے کیا گیا۔

(۳) مولانا یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ جن ترجموں کو وہ سرقہ قرار دے رہے ہیں وہ عربی کے مخصوص و ممتاز مضامین ہیں جن سے کوئی عربی داں ناواقف نہیں رہ سکتا۔

(۴) مولانا اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے کہ کیوں ایک ترجمہ کو وہ ترجمہ ہی قرار دیتے ہیں اور دوسرے کو سرقہ۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ متنبی اور مولانا نظامی کے اشعار کو مولانا شبلی پیش کرتے ہیں اور نظامی کو سرقہ کا مجرم قرار دیتے ہیں لیکن مولوی محمد حسین آزاد نے اس کو ترجمہ کی سند میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ آب حیات میں سودا کے ذکر میں ہے " ان کا (یعنی سودا کا) ایک شعر اولیا ہے

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے نسیم تیر سی سینہ کے پار گزرے ہے

فارسی میں کوئی استاد کہتا ہے :-

بہار بے سپر جام و یار می گزرد نسیم ہچو خدنگ از کنار می گزرد

مگر اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ ایسی صورت خاص کو سرقہ نہیں ترجمہ سمجھنا چاہئے کیونکہ شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنا بھی ایک دشوار صنعت ہے۔ قطع نظر اس کے اسی مطلع کے بعد اور اشعار کو دیکھو کیا موتی پروئے ہیں اور کلیات ایک دریا ہے کہ اقسام جواہر سے بھرا ہوا ہے کون کہ سکتا ہے کہ اس رتبہ کا شاعر ایک مطلع کا محتاج تھا اس لئے چرالیا۔ ابوالفضل نے ایک مراسلہ میں لکھا ہے :

ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالع من ولد الزنا کش آمد چو ستارۂ یمانی

یہ شعر قصاید نظامی میں موجود ہے اور اسی مضمون کو عربی میں متنبی کہتا ہے :-

وتنکر موتہم و انا سہیل طلعت بموت اولاد الزنا " (آبِ حیات تذکرۂ سودا ص۱۶۲)

ہمیں تسلیم ہے کہ عربی شعراء کے کلام کا ترجمہ جس غرض سے شروع کیا گیا تھا وہ غرض مولانا نظامی کے عہد میں باقی نہ تھی اور فارسی شاعری خود اتنی ترقی کر چکی تھی کہ عربی سے نمونے حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی مگر شاعری کی شریعت میں شعرائے سابق کی سنت کی پیروی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور عربی اشعار کے ترجمہ کرنے کا طریقہ ایک ضرورت کے تحت شروع کیا گیا تھا جب وہ ضرورت رفع ہوگئی تب بھی عمدہ خیالوں اور بہتر اشعار کے ترجمہ کا طریقہ برابر جارتی رہا اور آج تک جاری ہے۔ مولانا شبلی نے جن اشعار کو سرقہ کہا ہے اگر وہ سرقہ ہی ہیں تو پھر ترجمہ کس چیز کا نام ہے ؟

ہمارے نزدیک تخئیلی شاعری میں سرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اول تو قدما کے یہاں ہر قسم کے مضامین موجود ہیں جیسا کہ عربی کے دو متذکرہ جملوں سے ظاہر ہوتا ہے لا محالہ انھیں انہی خیالات کو دہرانا ہے پھر اگر قصداً استفادہ کیا جائے تو بھی چنداں مضایقہ نہیں ہے دوسرے شعرا کو مشورہ یہی دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشروؤں کے خیالات سے استفادہ کریں جیسا کہ نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالہ میں کہتا ہے " اما شاعر بدیں درجہ نرسد کہ در عنفوان شباب و روزگار جوانی بست ہزار شعر از اشعار متقدمین یاد گیرد و ہزار کلمہ از آثار متاخرین در پیش چشم کند و پیوستہ دواوین استادان خواند و عروض بخواند و گرد تصانیف استاد ابوالحسن سرخسی گردد مانند غایت العروضین و کنز القافیہ و نقد معانی و نقد الفاظ و سرقات و تراجم و انواع این علوم بخواند" (چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی)

نظامی کے خیالات کا ماحصل یہ ہے کہ جو روش قدما نے اختیار کی اور جن خیالات کا انھوں نے اظہار کیا اس پر بالکلیتہً عبور ہونا ایک شاعر کے لئے لازمی ہے اور اپنے عہد کے مقتضیات و داعیات سے بھی باخبر ہونا شاعر کے لئے ضروری ہے۔ گویا خیالات و روش وہی پرانی ہونا چاہئے، اور زبان و طرز بیان اپنے زمانہ کے مطابق ہو۔ ایسی حالت میں مفہوم صرف یہ ہوا کہ پہلوں کے خیالات سے مستفید ہونا ضروری ہے اور استفادہ کرنا کوئی معیوب چیز نہیں۔

ذیل میں ہم چند مثالیں اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ خیالات میں قدما سے استفادہ کر کے متاخرین نے کس کس طرح اُن مضامین میں اضافہ کیا ہے۔

(۱) کسی فارسی شاعر کا شعر ہے :-

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں صدا بر آمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

مشہور یہ ہے کہ یہ شعر مولانا عراقی کا ہے، مگر ہمارے مطالعہ میں دیوان عراقی کا جو نسخہ ہے اس میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ اس شعر میں شاعر صرف ریا کی مذمت کرنا چاہتا ہے کہ وہ اتنی بری چیز ہے کہ زمین بھی اس سے پناہ مانگتی ہے۔ علامہ اقبال نے غالباً اسی شعر سے ذیل کا مضمون پیدا کیا ہے

کبھی سر بسجدہ ہوا جو میں تو زمیں سے آنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

فارسی شعر کے پہلے مصرعہ کا ٹھیک لفظی ترجمہ اقبال کے پہلے مصرعہ میں موجود ہے لیکن دوسرا مصرعہ حضرت امیر خسرو کے ایک شعر سے قریب تر ہے حضرت امیر کا شعر ہے :- سجدہ روم چندیں آخر چہ نماز است ایں رو کیم بسوئے قبلہ دل جانب ابروئیت

اگر یہ کہا جائے تو ایک حد تک درست ہوگا کہ اقبال کا دوسرا مصرعہ خسرو کے دوسرے مصرعہ کا آزاد ترجمہ ہے :-

(۲) ابوشکور بلخی کا شعر ہے :-

تا بہ آنجا رسیدہ دانش من ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بدانم ہمی کہ نادانم

مشہور ہے کہ کسی نے سقراط سے پوچھا کہ "آپ کا علم کس حد تک پہونچ چکا ہے ؟" سقراط نے جواب دیا کہ "مجھے اب یہ علم حاصل ہوا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا" معترض نے کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو کسان جو کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے ؟" سقراط نے کہا کہ :- "یہ فرق ہے کہ میں اس کو جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا اور یہ کسان اس کو نہیں جانتے کہ یہ نہیں جانتے"

ابوشکور نے جہل کا علم حاصل ہو جانے کو اپنی دانش کی انتہا بتایا مگر واضح الفاظ میں نہیں کہا ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی مضمون کو زیادہ وضاحت سے کہدیا ہے :-

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اسی مضمون کو فانی نے کہا ہے :-

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا

(۳) خواجہ نظیری کا شعر ہے :-

بنیاد ما خرابیِ ما استوار کرد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گوئی کہ سود ماست نظیری زیان ما

نظیری کا مطلب یہ ہے کہ ہستی ہی نیستی کی بنیاد ہے اور وجود سے ہی عدم پیدا ہوتا ہے اس لئے جس کو تو میرا فایدہ سمجھتا ہے وہ حقیقت میں میرا نقصان ہے۔ غالب کہتا ہے :-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہستی کے کتم عدم سے عالم وجود میں آنے سے پہلے صرف ذات باری تعالیٰ ہی تھی اور بعد میں کائنات کی تخلیق جو کچھ ہوئی وہ بھی اسی ذات کا جزو ہے۔ مولانا حالی مرحوم یادگار غالب میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں : " بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی مگر قایل کا مقصود یہ ہے کہ میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا" غالب نے جو تصریح کی ہے اس کی روشنی میں نظیری کے شعر کو دیکھنا چاہئے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ غالب نے اس مضمون کو اس شعر میں انتہائی بلندی تک پہونچا دیا ہے۔ غالب کا دوسرا شعر اسی مضمون کا ہے جس کو نظیری نے پیش کیا ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہیولےٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کے اس شعر کا پہلا مصرعہ نظیری کے پہلے مصرعہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔

فانی کہتا ہے : ‏ ‏ تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

فانی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیری اور غالب دونوں سے استفادہ کیا ہے، کیونکہ پہلا مصرعہ غالب کے پہلے مصرعہ سے ماخوذ ہے اور فانی کا دوسرا مصرعہ نظیری کے طرز پر ہے لیکن فانی کے یہاں شعریت نظیری سے بھی زیادہ ہے یہاں سود و زیاں کے ذکر کے بجائے اس شاخ کے جل جانے کا ذکر ہے جو تعمیر آشیاں کے لئے منتخب کی جائے۔ اس کے علاوہ نظیری اور غالب کی نسبت فانی کے شعر کے دونوں مصرعے زیادہ مربوط ہیں۔ نظیری اور غالب کے اشعار میں فانی نے اضافہ کیا ہے۔

(۴) دقیقی کی ایک رباعی ہے :

گر بند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آرے دہد ولیک بعمر دگر دہد

من عمر خویشتن بہ صبوری گذاشتم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

یعنی یہ جو کہا گیا کہ صبر کا پھل ملتا ہے صحیح تو ہے مگر بات یہ ہے کہ یہ دوسری عمر میں جا کر پھل دیتا ہے کیونکہ میں نے تو ساری عمر صبر میں گزار دی۔ اب صبر کا پھل پانے کے لئے دوسری عمر درکار ہے۔ خواجہ حافظ نے بھی اس مضمون کو کہا ہے :۔

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر آرے شود و لیک بخون جگر شود

خواجہ حافظ نے دقیقی کے مضمون میں ندرت پیدا کر دی ہے اور صبر کا اصل فلسفہ بھی اس کے ساتھ ہی پیش کر دیا ہے یعنی یہ جو کہا گیا کہ صبر کی صفت یہ ہے کہ اس کی بدولت معمولی پتھر لعل ہو جاتا ہے ٹھیک ہے مگر یہ مرتبہ جگر کو خون کر دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

(۵) شیخ سعدی کا شعر ہے :۔ ہر کہ باز آید ز در پندارم اوست تشنۂ مسکیں آب پندارد سراب

سعدی نے ایک نفسیاتی اصول کی شاعرانہ وضاحت کی ہے کہ عاشقِ مسکیں دیدارِ محبوب کے لئے ترس رہا ہے اس لئے جب بھی کوئی دروازہ سے داخل ہوتا ہے اسے اپنے محبوب کا ہی دھوکہ ہوتا ہے۔ مصرعہ ثانی نے مضمون میں جلا پیدا کر دی۔ اسی مضمون سے مولانا جامی نے دوسری ہی بات پیدا کی ہے وہ اس کو تصوف میں لے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

بس کہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

مولانا نے اپنے عشق کے اظہار کے ساتھ وحدت شہود کے مسئلہ کو بھی پیش کر دیا ہے اور سعدی کے یہاں جو مضمون محض عشقِ مجازی کی شکل میں تھا اس کو مولانا جامی نے خالص تصوف سے متعلق کر دیا ہے اور سعدی کے مضمون میں یہ ایک عمدہ اضافہ ہے اس شعر کے متعلق یہ لطیفہ آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ مولانا جامی حالت وجد میں اپنا یہی شعر بار بار پڑھ رہے تھے کسی نے آہستہ سے کہا کہ " اگر خر پیدا می شود " مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ " پندارم توئی "۔ اس کے بعد آزاد نے خواجہ میر درد کا یہ شعر لکھا ہے :۔

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

(۶) مولانا عراقی کہتے ہیں :۔ راز نیست دریں پردہ گر آں را بشناسی دانی کہ حقیقت زچہ در بند مجاز ست

عراقی صرف اتنا بتاتے ہیں کہ کائنات کے اندر جو کچھ بھی راز ہے وہ وہی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ہم مجاز کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور اس مجاز ہی میں حقیقت موجود ہے۔ اسی مضمون کو عرفی نے کہا ہے :۔

ہر کس نشناسندۂ راز ست دگر نہ ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست

عرفی نے بات کو اور زیادہ صاف کر دیا کہ جس راز کی جستجو ہے وہ تو عوام تک جانتے ہیں۔ گویا عراقی کی زبان میں ہر مجاز کے اندر حقیقت پوشیدہ ہے، عرفی کہتا ہے کہ اس حقیقت کو ہر شخص جانتا ہے لیکن یہ بات سمجھ لینا ہر شخص کے بس میں نہیں ہے کہ کائنات کا اصلی راز یہی ہے۔ عراقی نے حقیقت اور مجاز کے پردہ میں جو بات کہی تھی اس کو عرفی نے صرف معمولی الفاظ میں ادا کر دیا ہے اور مضمون میں بھی ایک قدم آگے بڑھا یا ہے اسی مضمون کو مرزا غالب نے کہا ہے : محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس شعر کی تشریح مولانا حالی یادگارِ غالب میں اس طرح فرماتے ہیں کہ " راز کے نغموں سے تو خود ہی نا آشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول اور بج رہے ہیں اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں " (کتاب مذکور صفحہ) غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس حجاب کو راز قرار دے رہے ہیں دراصل وہ حجاب ہی اُس راز کی پردہ دری کرنے کا باعث ہیں وہ پردہ ایک پردہ ساز ہے جس میں نوا ہائے راز کے علاوہ کچھ نہیں ہے اپنے آپ کو محرم بنانے کی کوشش کرنا چاہئے کہ ان نوا ہائے راز سے متاثر ہو سکے۔

(۷) خواجہ حافظ کا شعر ہے : در رہ عشق نشد کس بیقیں محرم راز ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

خواجہ حافظ کا مقصد یہ ہے کہ عشق ایک ایسی پیچیدہ اور لاینحل چیز ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے متعلق درجۂ یقین تک نہیں پہونچ سکتا کہ جو رائے وہ رکھتا ہے وہ صحیح ہے جو کچھ بھی کوئی ایک شخص کہتا ہے وہ صرف اس کا گمان ہوتا ہے جو اس کی عقل کے مطابق ہے۔

نظیری کہتا ہے : تا بکہ فکر تواں کرد و سخن تازہ نوشت قصۂ شوق حدیثے ست کہ پایانش نیست

خواجہ حافظ نے مسایل و منازل عشق کے متعلق کہا تھا کہ ان کی غایت و کنہ دریافت نہیں ہو سکتی لیکن نظیری نے اُسی مضمون سے دوسری ہی بات پیدا کی ہے کہ شوق کی منازل کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

نظیری کا دوسرا شعر ہے :- چندیں سخن عشق کہ گفتند و شنیدند، کس حق محبت نتوانست ادا کرد

یہ بالکل وہی مضمون ہے جو خواجہ حافظ نے کہا ہے اور اُسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا ہے اور خواجہ کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔

جگر مراد آبادی کا شعر ہے :-

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانہ کی سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

یہ شعر خواجہ حافظ اور نظیری کے پہلے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر حافظ اور نظیری کے دونوں مصرعوں نے مل کر اس شعر میں نیا لطف پیدا کر دیا ہے۔

(۸) مولانا حالی مرحوم مقدمہ شعر و شاعری میں تحریر فرماتے ہیں کہ " ایک روز خواجہ حافظ کا یہ شعر :

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حایل کجا دانند حال ماسبکساران ساحلہا

ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے " کاش دوسرے مصرعہ میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرعہ میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بید ردوں کو ہمارے حال کی کیا خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا رہنے اور غیر کے تصور سے ذہول ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا " میں نے غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا :

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہا کہ ہاں بس یہی میرا مطلب تھا "

مولانا حالی نے خواجہ حافظ کے اس شعر کا ماخذ شیخ سعدی کے اس شعر کو قرار دیا ہے کہ :-

از ورطۂ ما خبر ندارد آسودہ کہ برکنار ریاست

حقیقت میں حافظ اور سعدی کا مفہوم ایک ہی ہے، لیکن حافظ نے اس مضمون اور تخئیل کو انتہا تک پہونچا دیا ہے جس کی ابتدا شیخ سعدی نے کی تھی۔ شیخ کے یہاں صرف ایک لفظ " ورطہ " تھا حافظ نے پہلے مصرعہ میں اس کی پوری تشریح کر دی اور شیخ نے صرف " آسودہ " کا لفظ استعمال کیا تھا۔ حافظ نے " سبکساران ساحل " سے اس کی مکمل تفصیل کر دی۔ لیکن غالب کے " ناخدا خفتست " نے سعدی و حافظ کے مضمون کو اپنی جگہ قایم رکھنے کے ساتھ ہی معنی میں اتنی وسعت و لطافت پیدا کر دی ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اسی مضمون کو نظیری نے دوسرے پیرایہ میں ادا کیا ہے :-

بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

خواجہ حافظ نے جس بات کو بلیغ ترین پیرایہ میں بیان کیا تھا نظیری اس میں مطلق اضافہ نہ کر سکا۔ حافظ کا شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف ہے اور نظیری کے یہاں اتنی صفائی نہیں ہے۔ جس طرح حافظ کے شعر کی جان " سبکساران ساحل " کی نادر ترکیب ہے اسی طرح نظیری نے " نواگران نخوردہ گزند " کی ترکیب پر اپنے شعر کی عمارت قایم کی ہے مگر دونوں کا تفاوت ظاہر ہے۔ حافظ نے اپنے مصائب کے ذکر کے بعد ساحل کے بید ردوں آسانوں کو عمومیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور نظیری نے " نخوردہ گزند " سے اُس لطافت اور عمومیت کو کھو دیا۔ اگر نخوردہ گزند کے بجائے کوئی ایسا لفظ یہاں موجود ہوتا جو نواگری کے ساتھ ان کی تن آسانی وغیرہ کو ظاہر کرتا تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا۔

ان مثالوں سے اس امر کو واضح کرنا مقصود تھا کہ متقدمین سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہی متاخرین بعض نازک اور عمدہ مضامین پیدا کر سکے اگر متقدمین سے استفادہ کرنا سرقہ سمجھ کر ترک کر دیا جائے تو ان تمام فواید سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

(باقی) عزیز حسن

تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق

(سکندر اعظم کی تخت نشینی کی خونیں داستان)

مسیح سے چار سو سال سے قبل جزیرۂ ساسوتواس، یونان کا بڑا مشہور و مقدس جزیرہ سمجھا جاتا تھا، یہاں پہاڑ کی چوٹی پر جو سطح آب سے ۵ ہزار فٹ بلند تھی، آموآن یا زیوس دیوتا کا ایک نہایت خوبصورت و شاندار معبد قایم تھا جہاں جنسی اختلاط کی حد درجہ بیباک و شہوت انگیز رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔

ان مراسم مذہبی کی دو صورتیں تھیں ایک عوام کے لئے مخصوص تھیں دوسری خواص کے لئے۔ طبقۂ خواص کے بھی دو درجے تھے جن میں ایک درجہ صرف کاہنوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے لئے مخصوص تھا۔

ہر شخص جو اس کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا پہلے اس سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ یہاں کے راز کسی پر ظاہر نہ کرے گا اور جب حلف لیکر وہ ایک بار اندر داخل ہو جاتا تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ وہ ایسی دنیا میں پہونچ گیا ہے جہاں شرم و حجاب، عفت و عصمت کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور انسان جانوروں کی طرح جنسی اختلاط کے لئے آزاد ہے۔

معبد کے اندرونی حصہ کے بھی تین درجے تھے، ایک مردوں کے لئے، دوسرا عورتوں کے لئے اور تیسرا نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کے لئے اور ٹھیک اس وقت جبکہ فحاشی اپنی انتہائی شہوت انگیز حد تک پہونچ جاتی، سب پردے اُٹھا دئے جاتے تھے، پھر تینوں درجے کے مرد عورت، لڑکوں اور لڑکیوں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ جو چاہیں سو کریں۔

مسیح سے ٹھیک ۳۵۸ سال قبل انھیں مراسم شہوت پرستی کے زمانہ میں ایک دن مقدونیہ کا نوجوان بادشاہ فلپس یہاں پہونچا اور ایک نہایت حسین رقاصہ پر عاشق ہو گیا۔

اس کا نام "اولمپیاس" تھا جس نے اپنا حسن و جمال، اپنی رعنائی و دلکشی اور روح و جسم سب معبد آموآن کی لذت پرستیوں اور شہوت رانیوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔

معبد آموآن شمعوں اور قندیلوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے اور اولمپیاس عریاں رقص کے ذریعہ سے اپنے سڈول اور خوبصورت جسم کے ایک ایک عضو کی شہوت انگیز نمائش میں محو ہے۔ اس کے مرمریں جسم کے لوچ اور لچک کا یہ عالم ہے گویا ایک زریں موج ہے جو فضا میں ہچکولے کھا رہی ہے وہ اپنے ہاتھ میں ایک عصا لئے ہوئے ہے جو پھولوں سے آراستہ ہے اس پر ایک سانپ لپٹا ہوا ہے جو رقص کے دوران میں کبھی اولمپیاس کے سینے کو حلقہ میں لے لیتا ہے اور کبھی اس کی کمر اور گردن کو۔

وہ اپنے رقص کے انتہائی عروج پر ہے کہ فلپس اندر داخل ہوتا ہے اور اس کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتا ہے۔ فلپس اس کے چچا بادشاہ ایپرس کے پاس شادی کا پیغام بھیجتا ہے اور آخرکار دونوں درباروں میں جشن عروسی کی طیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جوں جوں شادی کے دن قریب ہوتے جاتے ہیں، خداوند آموآن کی پرستش گاہ میں اس کے رقص کی مستیاں اور رقص کے ساتھ بادۂ شباب

کی ارزانیاں بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ شادی کی رات آپہونچی اور اس نے ایک خواب دیکھا کہ،

ہوا طوفانی ہے اور بجلی چمک رہی ہے کہ دفعتاً ایک خوفناک گرج کے ساتھ بجلی اس کے جسم سے مس کرتی ہے اور اس کی ناف سے ایک شعلہ نکل کر فضا میں بلند ہوتا ہے اور پھر اس سے بہت سی شاخیں نکل کر چاروں طرف افق میں پھیل جاتی ہیں۔

اُدھر فلپس بھی شادی کی طیاری میں مصروف ہے اور بے اندازہ دولت صرف ہو رہی ہے۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ فلپس اپنی فضول خرچی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا اور وہ اپنی آمدنی و خرچ کا حساب بھی کبھی نہ رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بادشاہ نے اپنی شادی کی طیاری میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا، خزانہ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا، اشرفیاں پانی کی طرح بہ رہی تھیں اور اس نے حکم دیا تھا کہ جشن عروسی ایسے غیر معمولی پیمانہ پر منایا جائے کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہ مل سکے۔ آخر کار شادی کا دن آپہونچا اور یہ رسم بھی ادا ہوگئی۔

شب زفاف کے ایک روز بعد فلپس نے خواب دیکھا کہ اس نے اپنی دُلھن کے اندام خاص پر مُہر لگادی اور مُہر کا نقش ایک شیر کی صورت کا ہے۔

کاہنوں اور نجومیوں نے اولمپیاس اور فلپس دونوں کے خواب سامنے رکھ کر یہ تعبیر دی کہ اولمپیاس کا بجلی کو خواب میں دیکھنا تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ خداوند آمون کو اس عقد سے خاص دلچسپی تھی، لیکن شعلہ کا اس کی ناف سے نکل کر چاروں طرف فضا میں پھیل جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اولمپیاس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمام عالم کو فتح کرے گا۔ فلپس کا خواب میں یہ دیکھنا کہ اس نے اولمپیاس کے جسم پر مُہر لگادی ہے، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اولمپیاس حاملہ ہوگئی ہے اور اس کے بطن سے شیر کا سا دل رکھنے والا لڑکا پیدا ہوگا۔

اس تعبیر کو سنکر سب کو بڑی مسرت ہوئی اور میاں بیوی دونوں بڑے لطف کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ایک خاص واقعہ نے حالات کا رخ بدل دیا اور یہ تمام مسرتیں خاک میں مل گئیں۔

فلپس کو اس کا بالکل علم نہ تھا کہ اولمپیاس نے ایک سانپ پال رکھا ہے جس سے وہ بہت مانوس ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ خداوند آمون اسی سانپ کے بھیس میں اس سے اختلاط کرتا رہتا ہے۔

ایک رات فلپس ناگاہ اس کی خوابگاہ میں پہونچا تو دیکھا کہ اولمپیاس عریاں لیٹی ہوئی ہے اور سانپ سے محو اختلاط ہے۔

فلپس یہ دیکھ کر سکتہ میں رہ گیا اور ہنوز اس کی یہ حالت دور نہ ہوئی تھی کہ اولمپیاس اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے حد درجہ برہمی کے ساتھ فلپس کو ڈانٹا کہ وہ کیوں بغیر اجازت اس کی خواب گاہ میں آگیا اور خداوند آمون کے اختلاط میں حایل ہوا۔

فلپس کی پرورش بھی چونکہ یونان کی اسی اساطیری فضا میں ہوئی تھی اس لئے وہ بھی ڈر گیا اور واپس چلا آیا، لیکن بعد کو جب یہ مذہبی تاثر کم ہوا تو اس نے سوچا کہ خداوند آمون کا سانپ کے بھیس میں رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور جب اسے اولمپیاس کی چستی کا خیال آیا جو سانپ کے ساتھ اختلاط کرنے کے دوران میں اس سے ظاہر ہو رہی تھی تو اس کو یقین ہوگیا کہ یہ سب فریب ہے اور اولمپیاس اس کو دھوکا دیتی ہے۔ آخر کار اس نے کہدیا کہ اولمپیاس کے شکم میں جو بچہ پایا جاتا ہے وہ اس کے نطفہ سے نہیں ہے بلکہ کسی اور کا ہے جس سے اولمپیاس کا خفیہ تعلق ہے۔

فلپس پر ان واقعات کا بہت گہرا اثر ہوا، یہاں تک کہ اسے اولمپیاس سے نفرت ہوگئی اور اپنا دل بہلانے کے لئے اپنے فوجی افسروں کے ساتھ وہ زیادہ تر ملک کے دورہ پر باہر رہنے لگا۔

۳۵۶ ق - م میں، جبکہ وہ پایۂ تخت سے باہر ہی تھا، اسے معلوم ہوا کہ اولمپیاس کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور اس کا نام اس نے سکندر رکھا ہے، لیکن وہ واپس نہ آیا اور بدستور سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ دو سال گزر گئے اور فلپس بدستور باہر ہی رہا، لیکن اولمپیاس کو بھی اس کی پروا نہ تھی کیونکہ اس کا سارا وقت سکندر کی نگہداشت میں صرف ہوتا تھا جسے وہ خداوند آمون کا عطیہ سمجھتی تھی

جب دو سال کے بعد فلپس پایۂ تخت میں واپس آیا اور اس کی نگاہ اولمپیاس پر پڑی تو اس کا دل پھر اس کی طرف کھنچنے لگا اور رفتہ رفتہ وہی اگلا سا جوش محبت پھر عود کر آیا لیکن چند دن بعد سکندر کے مسئلۂ تعلیم و تربیت نے پھر دونوں میں اختلاف پیدا کر دیا۔ اولمپیاس کہتی تھی کہ اس کی تعلیم بالکل مذہبی ہونا چاہئے تاکہ وہ بڑا ہو کر کاہن بنے اور معبد آمون کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے، فلپس کا اصرار تھا کہ وہ ایک شاہزادہ کی سی تعلیم حاصل کرے جسے آگے چل کر بادشاہ ہونا اور ملک کا انتظام کرنا ہے چونکہ اولمپیاس کا اثر اپنے بیٹے پر زیادہ تھا اور فلپس سکندر کو اس سے جدا نہ کر سکتا تھا، اس لئے آخر کار وہی ہوا جو اس کی ماں چاہتی تھی اور سکندر کی تعلیم صرف مذہب اور فلسفہ تک محدود رہی۔ لیکن کچھ دن بعد اولمپیاس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ مذہبی تعلیم اسے دنیا و لذائذ دنیا کی طرف سے بالکل متنفر کر دے، اس لئے اس نے سکندر کو لطف و نشاط کی جانب مائل کرنے کے لئے خوبصورت لڑکیاں اس کی صحبت کے لئے متعین کیں جو ہر وقت جلوت و خلوت میں اسکو گھیرے رکھتیں لیکن سکندر زندگی کے ان اسرار سے واقف نہ ہوا جن کا انکشاف وہ اپنے بیٹے پر کرنا چاہتی تھی، سکندر ہمیشہ لڑکیوں سے الگ الگ رہتا اور جب وہ اس کی خوابگاہ میں پہونچ جاتیں تو وہاں سے باہر نکل جاتا۔

گو فلپس کی عمر اس وقت ۴۶ سال کی پہنچ چکی تھی، لیکن اس کی صحت و توانائی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اس لئے اب جو وہ لڑائیوں سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھا اور دربار کی عشرتوں کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی تمام وہی خواہشات پھر عود کر آئیں جو اولمپیاس کے دیکھنے کے بعد عنفوان شباب میں اس کے دل میں پیدا ہوئی تھیں ــ اس کا یہ میلان دیکھ کر ملک کی جمیل ترین لڑکیاں دربار میں آ آ کر شریک ہونے لگیں اور آخر کار فلپس ایک سردار کی نہایت خوبصورت لڑکی پر جس کا نام کلیوپیٹرا تھا، فریفتہ ہو گیا۔ یہ لڑکی جتنی حسین تھی اتنی ہی جاہ طلب تھی اس لئے اسنے کہدیا کہ میں شادی اسی وقت کروں گی جب اولمپیاس کو طلاق دیدی جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے فلپس سے یہ بھی کہا کہ اولمپیاس کہتی ہے سکندر فلپس کا بیٹا بھی نہیں ہے بلکہ خداوند آمون کا ہے، اور اس صورت میں وہ ولی عہد بھی نہیں قرار پا سکتا۔

فلپس نے ان تمام باتوں کا یقین کر کے اولمپیاس کو طلاق دیدی اور اس کی جگہ کلیوپیٹرا کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اولمپیاس اور سکندر نے بہت کچھ کہا لیکن فلپس نہ مانا اور اس نے حکم دیا کہ اولمپیاس اور سکندر بھی شادی کی رسم میں حصہ لیں ــ شب عروسی کا جشن پورے اہتمام کے ساتھ منایا جا رہا ہے، تمام امراء و سردار جمع ہیں، خم کے خم شراب کے لنڈھائے جا رہے ہیں اور ہر شخص بدمست نظر آ رہا ہے۔ اسی عالم میں کلیوپیٹرا کے چچا اٹلوس نے شراب گلاس اٹھایا اور بادشاہ کا جام صحت نوش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "اب مقدونیہ کو ایک حلالی ولی عہد کے ملنے کی امید ہو گئی ہے"۔ یہ سنکر سکندر بہت برہم ہوا اور اپنی جگہ سے اٹھکر بولا کہ "اے تک حرام تجھے اتنی ہمت ہو گئی کہ میرے ہی سامنے مجھے حرامی کہتا ہے" اور یہ کہکر جام شراب اس کے منہ پر کھینچ مارا ــ فلپس یہ دیکھ کر بہت برہم ہوا اور وہ ہاتھ میں تلوار لیکر سکندر کی طرف بڑھا لیکن چونکہ نشہ میں چور تھا اسلئے لڑکھڑا کر گر پڑا، سکندر نے یہ دیکھ کر باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ شخص سارے ایشیا کو فتح کرنا چاہتا ہے اور اس میں اتنی قدرت بھی نہیں کہ اٹھکر میری میز تک آ سکے"۔ یہ کہکر وہ دربار سے نکل گیا اور اپنی ماں کو ساتھ لیکر اولمپیاس کے چچا بادشاہ ایپیروس کے دربار میں جا کر پناہ لی۔

ایک سال کے بعد فلپس کی دوسری بیوی سے لڑکا پیدا ہوا، لیکن بجائے اس کے کہ امراء و اعیان خوش ہوتے، ان کو فکر پیدا ہو گئی کہ اب جانشینی کا مسئلہ کیونکر طے ہو گا اور ممکن ہے اس اختلاف کی وجہ سے خانہ جنگی شروع ہو جائے اور ملک تباہ ہو۔ لیکن قدرت نے اس کا فیصلہ یوں کر دیا کہ ایک دن فلپس دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص پارسانیاس نامی نے اس کے قلب میں خنجر پیوست کر دیا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا دربار کے امیروں نے جو اولمپیاس کا طرفدار تھا اس واقعہ کی خبر اولمپیاس کو پہونچا دی اور جب تک وہ آئے انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیکر سب سے پہلے کلیوپیٹرا کو گرفتار کر لیا اور اس سے کہا کہ یا تو وہ خودکشی کرے یا ذلت کے ساتھ وہ سولی پر جان دینے کے لئے طیار رہے ــ کلیوپیٹرا پر جو ابھی زچہ خانہ ہی میں تھی اس درجہ خوف طاری ہوا کہ اسی رات اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، لیکن اولمپیاس کے انتقام کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا، اور اسنے کلیوپیٹرا کے نوزائیدہ بچہ کو بھی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ معبد آمون میں مجسمۂ آمون کے برابر ہی اس بڑے آتش دان کے گرد جو شب و روز روشن رہتا ہے کاہن جمع ہیں اور مذہبی نغموں سے فضا گونج رہی ہے کہ اولمپیاس دفعتہً رقص کرتے ہوئی نمودار ہوتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ آمون کی قربانی سامنے لائی جائے۔ رئیس معبد کلیوپیٹرا کے بچہ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیتا ہے اور اسے آتشدان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیتا ہے۔

قوتِ متخیلہ اور روحانی تصورات

قوتِ متخیلہ کے نتائج ہمیں تقریباً ہر انسان میں ملتے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ جس شخص کے اندر اس قوت کی بہتات ہوتی ہے وہ شاعر، ادیب، سائنسداں یا اعلیٰ درجہ کا مصور بن جاتا ہے اور جس میں اس کی کمی ہوتی ہے وہ تخلیقی کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ بہرحال تخلیقی اہلیت کے لئے طاقت ور قوت متخیلہ کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ پتا لگانا کہ کس انسان کے اندر قوت تخیل زیادہ ہے اور کس میں کم، ذرا مشکل کام ہے یوں تو غیر معمولی حالات میں ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فلاں دو اشخاص میں بہ اعتبار قوت تخیل کس کی شخصیت بلند ہے لیکن اگر یک وقت ہمارے سامنے دس پندرہ آدمی لائے جائیں اور جلد سے جلد یہ فیصلہ کرنا ہو تو بلا نفسیاتی تجربات کے ہم فیصلہ کرنے میں ناکام رہیں گے۔

قوتِ متخیلہ کا اظہار بالعموم اس وقت ہوتا ہے، جب ہمارے ذہن میں ایک کے بعد دوسری تصویر آتی رہتی ہے یہاں تک کہ پورے پورے واقعات دماغ کے سامنے اس طرح آجاتے ہیں جیسے سینما کے پردے پر کسی واقعہ کی تصویر سے لیکن یہ کیفیت ہمارے احساسات کے متحرک ہونے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۸۹۵ء میں پروفیسر بینٹ اور ہنری نے قوت متخیلہ کے تجربات شروع کئے تھے، لیکن اِن تجربات کو معیاری صورت دینے کا کام پروفیسر وہیپل (Prof. Whipple) کے ہاتھوں انجام پایا۔ پروفیسر مذکور نے ۲۰ کارڈ ایسے تیار کئے جن پر روشنائی کے چھوٹے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ان کارڈوں کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کو یہ سارے کارڈ دے دئے جاتے تھے اور وہ ہر کارڈ کے دھبے کو دیکھ کر جو خیال ذہن میں آتا تھا نوٹ کرتا جاتا تھا اور اس طرح متعدد افراد کے خیالات کا موازنہ کر کے ان کی تخیل کی رسائی کے متعلق رائے قایم کی جاتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سارے کارڈ ایک شخص کے سامنے میز پر رکھے جاتے تھے اور ہدایت کر دی جاتی تھی کہ جوں ہی ایک کارڈ کھولا جائے وہ اس کے متعلق سوچنا شروع کرے اور جس وقت دھبوں کی شکل سے ملتی جلتی کسی تصویر کا اسے احساس ہو وہ میز پر ہاتھ مار کر یا "یہ رہی" کہکر اس حقیقت کا انکشاف کرے۔ ساتھ ہی ساتھ تجربہ کرنے والے کا فرض یہ تھا کہ وہ اسٹاپ واچ "بند گھڑی" کی مدد سے کارڈ کے کھلنے اور میز پر ہاتھ مارنے کے درمیانی وقفہ کو نوٹ کرے۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، غرضکہ بیسیوں کارڈ کھولے جاتے تھے اور ہر دفعہ وقت نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح پہلے طریقے میں قوتِ تخیل کا اندازہ تصاویر کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے کیا جاتا تھا اور دوسرے طریقے میں وقت کی کمی اور زیادتی پر تخئیل کی بلندی اور پستی کا پتہ لگایا جاتا تھا۔

اس طریقہ کے علاوہ بھی قوت متخیلہ پر اور مختلف طریقوں سے تجربات کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ جس کا موجد مسیلن (Masselon) ہے یہ ہے کہ معمول کو تین الفاظ دے دئے جاتے ہیں اور اسکو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پانچ منٹ کے اندر جس قدر بامعنی جملے ان تینوں الفاظ سے بن سکے بنائے۔ یہی عمل بیک وقت بہت سے لوگوں پر کیا جاتا ہے اور آخر میں جس کے جملے سب سے زیادہ اور بامعنی ہوتے ہیں اس کو سب سے زیادہ نمبر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اس طریقے میں ایک خرابی یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ کا مقداری تعین تو یقیناً جملوں کی طویل قطار سے ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک جملوں کی گہرائی اور عمق کا سوال ہے یہ مسئلہ غیر تصفیہ شدہ ہی رہ جاتا ہے پروفیسر بنٹ (Binet) نے تخیل کی شدت اور گہرائی کا اندازہ لگانے کے لئے اس سے بہتر طریقہ ایجاد کیا۔ اس ماہر نفسیات کا یہ طریقہ تھا کہ وہ معمول کو ایک جملے کے ابتدائی دو الفاظ دے دیتا تھا اور بقیہ خالی جگہ کو پُر کرنے کی ہدایت کرتا تھا

اور بقیہ خالی جگہ کو پُر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی اس طرح مختلف افراد کے جملوں سے اُس کی دماغی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً بعض زیادہ پڑھے لکھے لوگ نصف دو الفاظ [illegible] اور فلسفیانہ طرزِ فکر کا اظہار کرتے تھے اور دوسرے کند ذہن اور غبی حضرات بالکل بیہودے جملوں پر اکتفا [illegible] پر غور کرنے سے ان کی انفرادی خصوصیات کا پتہ لگ جاتا تھا۔ جہاں تک تخیل کی تیزی کا سوال تھا اس کا فیصلہ [illegible] جس وقت جملے کے الفاظ دئے جاتے تھے صحیح وقت نوٹ کر لیا جاتا تھا اور گھڑی اس وقت تک چلتی رہتی تھی جب تک کہ جملہ پورا ہو جائے اور اس طرح مختلف لڑکوں کے [illegible] پر کرنے [illegible] چل جاتا تھا۔

ان تجربات کے علاوہ بھی ماہرین نے مختلف تجربات کئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور [illegible] در جملوں کے امتحانات میں برتا جاتا ہے یہ تھا کہ نثر کا ایک فقرہ جس میں چند الفاظ کی جگہ خالی رہتی ہے لڑکے کو دیا جاتا تھا اور جتنا وقت وہ خالی جگہوں کو پُر کرنے میں صرف کرتا تھا نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ دوسرے طریقہ کی رو سے جو بالکل اس کا عکس تھا صرف چند الفاظ کی مدد سے پوری پوری کہانی بنانے کی ہدایت کی جاتی تھی اور اس طرح وقت کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے قوتِ متخیلہ کی تیزی و سستی کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ کھیل جس سے بڑی حد تک تخیل کی رسائی کا اندازہ ہو سکتا ہے یہ ہے کہ چند حروف کی مدد سے (جن کی تعداد چھ تک ہو سکتی ہے) پانچ منٹ کے اندر جس قدر الفاظ بن سکتے ہوں، بنانے کی ہدایت دی جائے اور اس طرح الفاظ کی تعداد کے لحاظ سے تخیل کی بلندی یا پستی کا امتحان لیا جائے۔

تجرباتی نفسیات کی اسی مفروضہ مداخلت بے جا کے خلاف فلسفیوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے اُن کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے کہ تجرباتی نفسیات کا دائرۂ عمل بہت محدود ہے اور صرف مخصوص قسم کی تخیلی خصوصیات کا اندازہ ان تجربات کی مدد سے ہو سکتا ہے کیونکہ جہاں تک بلندیِ فکر اور مابعد الطبیعیاتی مسایل کا سوال ہے تجرباتی نفسیات ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتی۔ میری کولنس (Mary Collins) اور جیمس ڈریور (James Drever) نے اس سوال کا بہت مسکت جواب دیا ہے اُن کا خیال ہے کہ فلاسفہ کی یہ دلیل کہ بلند خیالات جن کا تعلق روح سے ہوتا ہے، بے تصویر (Imageless) ہوتے ہیں قطعی غلط ہے کیونکہ تجربات شاہد ہیں کہ ہم جو کچھ بھی سوچتے ہیں وہ خیالات ہمیشہ باتصویر انداز میں ذہن کے اندر گذرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی فلمی کہانی پردۂ سیمیں پر دکھلائی جا رہی ہو۔ اس مسئلہ پر ارسطو و افلاطون ہی کے وقت سے لوگوں نے غور کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ ارسطو نے یہاں تک تسلیم کر لیا تھا کہ روح کی حقیقت اسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب ہم یہ ثابت کر دیں کہ وہ بلا جسم کی امداد کے کسی قسم کے خیالات کی پیدایش کا باعث ہو سکتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب کہ یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے کہ ہم روحانی مسایل پر بغیر تصویری تخیل کے بھی کچھ سوچ سکتے ہیں اور یہ بہت مشکل ہے۔ کیونکہ تجربات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہر خیال مادی وسایل کی امداد کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

یہاں پر مجھے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود ہے جو بعض قدامت پرست شعراء اور ان کے متبعین کے ذہنوں میں اب تک جاگزیں ہے اور وہ یہ ہے کہ شاعرانہ خیالات عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہوتے ہیں اور وہ ایک ایسے مخصوص وجدان کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کا اس مادی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ "شاعری جزوے است از پیغمبری" کا نظریہ اب باطل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہماری ہر حرکت خواہ وہ ذہنی ہو یا دماغی ایک یا چند اسباب و علل کی پیداوار ہوا کرتی ہے اور شعر گوئی اس منطقی گرفت سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے اس موضوع کو طوالت دینے کا افسوس ہے لیکن میں "حقایق کے انکشاف" کے مدِنظر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بہتر سے بہتر غزل، نظم یا اشعارِ معرفت، مخصوص مادی قوانین کے تحت (جو دماغی دُنیا میں تسلط پذیر ہیں) عرصۂ وجود میں آتے ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی کی کسی پیشکش کے متعلق تو نہیں (کیونکہ مجھے کسی ایسی الوہی شاعری کا علم نہیں) البتہ انگریزی کے ایک شاعر کولرج Coleridge کی ایک نظم کبلا خاں (Kubla Khan) کے متعلق انگریز و امریکی ادیبوں اور نقادوں کا خیال [illegible]

[illegible]

بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جس کا براہ راست یا بالواسطہ کولرج کی سابقہ شعوری اور غیر شعوری ذہنی پختگی سے تعلق نہ رہا ہو اور اس نظم کو "اعجازی" رنگ دینا سراسر حماقت کا اظہار تھا پھر شاعر اور شاعری پر کیا منحصر ہے، ہر فرد بشر ذہنی اعتبار سے اسباب وعلل اور ان کے نتائج کا پابند ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے حیاتی تجربات کے حلقۂ اثر سے باہر کسی بات کو سوچے یا کہہ سکے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم خود اپنے (اور دوسرے عام آدمیوں) کے تجربات سے مستفید ہو سکتے ہیں، غالباً ہم میں سے ہر شخص اس بات کا مقر ہوگا کہ بعض اوقات ہمارے ذہن میں دفعتاً ایسے خیالات آتے ہیں جن کا بظاہر ہماری موجودہ ذہنی کیفیت سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان سب خیالات کی کڑیاں ہمارے سابقہ واقعات اور احساسات سے مل جاتی ہیں۔ فرائڈ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "گفتگو اور عمل کی غلطیوں" میں اس نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہماری ہر غلطی خواہ زبان سے متعلق ہو یا اور کوئی عضویاتی غلطی ہو اپنے پیچھے اسباب وعلل کی ایک فوج رکھتی ہے۔ جن کی تاخت وتاراج کا نتیجہ اُن غلطیوں کے ظہور کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ میں نے خود اپنی چند غلطیوں کا جو میری تحت الشعوری کیفیت کی آئینہ دار تھیں تجزیہ کیا تو مجھے اس قانون کی ہمہ گیری کا احساس ہوا۔ میرے تجربات کوئی بڑی اہمیت تو نہیں رکھتے لیکن پھر بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے حسب ذیل واقعہ پیش کرتا ہوں

ابھی چند ماہ گزرے ماہ رمضان میں میں گرمیوں کی تعطیل کے سلسلہ میں گھر گیا ہوا تھا وہاں پر چونکہ اور لوگ روزہ رکھتے تھے اس لئے مجھے بھی اُن کا اتباع کرنا پڑا لیکن سگریٹ نوشی کی بُری عادت کے باعث "سحر کرنے" کے وقت سے افطار تک مجھے ہر وقت یہی انتظار رہتا تھا کہ کب دن غروب ہو اور روزہ افطار کر کے سگریٹ پیا جائے، سگریٹ کی یہ خواہش میرے اوپر ایسی مستول رہتی تھی کہ اکثر دوران گفتگو میں بجائے "سحر" کے "افطار" کا لفظ استعمال کر دیتا تھا اور اس غلطی کا احساس مجھے بعد میں ہوتا تھا۔ میں نے جب اس مسئلہ پر غور کیا کہ بالخصوص "سحر" اور "افطار" کے الفاظ ہی کے استعمال میں کیوں مجھ سے غلطی ہوتی ہے تو مجھے پتا چلا کہ اس کا سبب میرا تحت الشعور تھا جسے سحر کا لفظ زبان پر لانا بھی ناگوار تھا اور وہ بجائے سحر کے "افطار" کا انتظار کیا کرتا تھا۔

میرے ایک اور عزیز تھے جن کو اگر کسی چیز کے خریدنے کے لئے پیسے دئے جاتے تھے تو وہ ہمیشہ اس کی زیادہ قیمت بتاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ان کو بیس سیر شکر لانے کو پیسے دئے گئے لیکن وہ عادت سے مجبور تھے اس لئے انھوں نے صرف پندرہ سیر شکر لانے پر اکتفا کی اور گھر آ کر یہ کہہ دیا کہ شکر پوری بیس سیر ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کو وزن کرنے کی کون زحمت کرے گا مجھے ہمیشہ اُن پر شک رہتا تھا اس لئے میں نے اس سودے کو بھی بہ نظر اشتباہ دیکھا لیکن اُن پر اپنی اس ذہنی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا اور اُن سے اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع کی جو شکر کی خرید سے غیر متعلق تھی لیکن چونکہ اُن کا ذہن اپنی اس چالاکی پر مسرور تھا یا یوں کہئے کہ وہ ابھی تک اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے (لاشعوری طور پر) کہ آیا اُن کا دھوکا کامیاب ہو گیا یا نہیں لہذا انھوں نے گفتگو کے دوران میں ایک جگہ پر لفظ "پندرہ" (بالکل نادانستہ طور پر) استعمال کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مجھے پتہ چل گیا کہ یہ یقیناً صرف پندرہ سیر شکر لائے ہیں اور میں نے آخر کار اُن سے اعتراف کرا لیا۔

ان تمام واقعات سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہماری ذہنی کیفیت اسباب وعلل کی اسی طرح پابند ہے جس طرح اور مادی اشیا ہوتی ہیں اس لئے ان کو روحانی حیثیت دینا غلطی ہے اور اگر ہمارے خیالات مادی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر یقیناً وہ (خواہ وہ کتنے ہی دور از کار اور ابعد الطبیعیاتی حیثیت کیوں نہ رکھتے ہوں) جانچ اور امتحان کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔

جلیل احمد ایم - اے

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور کے [illegible] مقالات کا مجموعہ [illegible] فہرست یہ ہے:- اُردو ناول کا ارتقا۔ [illegible] میں فسانہ نگاری۔ اُردو شاعری [illegible] تنقید۔ [illegible] اکبر کا آرٹ۔ چکبست لکھنوی۔ اقبال اور ان کا فلسفہ۔ رتن ناتھ سرشار۔ آغا حشر [illegible]

میرو راسخ کا تقابلی مطالعہ

غم عشق جب دل میں گھر کرتا ہے تو ظاہری شکل و صورت پر بھی اثر ڈالتا ہے ۔ کوئی اس راز کو چھپانا بھی چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا عاشق کی ظاہری صورت اس کے دلی کیفیت کی غمازی کرتی ہے ، میر کے یہاں اکثر اشعار اس مضمون کے پائے جاتے ہیں :۔

میر :۔ قامت خمیدہ ، رنگ شکستہ ، بدن نزار ۔ تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

حلقے آنکھوں میں پڑ گئے ، منھ زرد ۔ ہو گئی میر تیری کیا صورت

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں ۔ کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

راسخ کی بھی ظاہری صورت سے غم عشق آشکار ہے ۔ بلکہ دیکھنے والے اس حال ابتر کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے ۔

ہونٹھ ہیں سوکھے تر ہیں آنکھیں نہ وہ چہرہ راسخ آہ ۔ بندہ سے صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

فطرت کا خاصہ ہے کہ جب کسی واقعہ یا حادثہ کا ظہور ہوتا ہے تو اس سے پہلے ہی ہزاروں وسوسے اور خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں کسی کا شعر ہے :۔ دل بہت چاہتا ہے رونے کو ۔ ہے کوئی بات آج ہونے کو

میر کے دل پر بھی یہی حالت طاری ہوتی ہے ، وہ سمجھتے ہیں کہ یار کی خبر سننے در آئے گی :۔

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی وہاں سے آوے گا ۔ یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

میر ہی کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو :

دیکھئے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے ۔ دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جان چراغ مضطر ہے

راسخ کا دل بھی بے تاب ہے ، ایک اُلجھن ہے ، مگر یہ انتہائے شعریت ہے کہ اس کا اظہار نہیں کیا جاتا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے بلکہ ایک حالت طاری کر دی گئی ہے اور انتظار ہے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔

راسخ :۔ صبح سے ہے بے تابی دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے ۔ دیکھئے کیا ہو شام تلک دل آج بہت گھبراتا ہے

حافظ نے پہلے ہی چونکا دیا تھا کہ " عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا " مگر " ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی " اور یہ سمجھا کہ منزل عشق طے کر لوں گا مگر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے ۔ میر فرماتے ہیں :

خطرے بہت ہیں میر رہ صعب عشق میں ۔ ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دیں کو کھو رہو ،

صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر ۔ یہ سیر سر کوچہ و بازار نہ ہووے

راسخ کو بھی یہی اندیشہ ہے ۔ وہ اس طرح متنبہ کرتے ہیں :۔

بے دردی سے طے کیجیو نہ راہ طلب یار ۔ ہاں دیکھو پامال کوئی خار نہ ہووے

اگر کچھ درد رکھتا ہے تو راہ عشق یوں طے کر ۔ نہ کانٹا کوئی ٹوٹے اور پھوٹے آبلہ پا کا

قدم نہ رکھ رہ مشکل گزار عشق میں تو ۔ کہ سرسری نہیں طے کرنا ایسی راہوں کا

بنا سر دئے طے ہو نہ رہ پر خطر عشق ۔ یہ راہ دم تیغ ہے ، برچھی کی انی ہے

داغ نے کیا خوب کہا ہے :۔ رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے ۔ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

عشق کی مصیبت میں پھنس کر بیچارہ عاشق پہلے ہی قدم پر رونے لگتا ہے :
میر :- ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ؟ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا !!
راسخ کو بھی یہی مصیبت پیش آتی ہے :-
ہنسی سمجھے تھے راسخ طۓ صحرائے محبت کو سو میری جان گامِ اولیں پر رو دیا تم نے
شروع عشق راسخ کہتے ہو جاتا ہے دل ڈوبا کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے
عشق کی راہ ایک پرخطر راہ ہے ۔ پھر اس پر راہ کی ناہمواری اور صعب گزارہ وادی، عاشق صبر کی تاب نہیں رکھتا اور شکوہ کرنے لگتا ہے ۔میر :- منزل پہونچنا اک طرف نے صبر ہے نہ ہے سکوں یکسر قدم میں آبلے پھر راہ پرخار اس قدر
راسخ :- کرتے ہیں شکوہ آبلہ کا ہر قدم پہ ہم طے خاک ہم سے ہوگا بیابان عشق کا
دم آخر یار کا بالیں پر آنا بہتوں نے لکھا ہے ۔ جبکہ عاشق دم توڑ رہا ہو، معشوق آیا بھی تو کیا ؟
ع : صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا ؟
غالب نے کیا خوب کہا ہے :-
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے !! یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت ؟
درحقیقت یہ شعر میر کے اس شعر سے ماخوذ ہے :-
حیف وے جب کے وہ اس وقت میں پہونچا جس وقت اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا ،
میر کے یہاں الفاظ میں اُلجھاؤ ہے ۔ غالب نے اس شعر کو بلند کر دیا ہے اس پر بلاغت کا یہ پہلو کہ وہ خود نہیں آیا بلکہ احباب اسکو لے آئے معشوق کی شانِ خودداری کو قایم رکھا ہے ۔ اسی مضمون کو راسخ نے اس طرح ادا کیا ہے :-
بیٹھے تب وے مری بالیں پہ کہ جب ضعف سے میں اُٹھ کے اُن پاؤں پہ سر رکھنے کے قابل نہ رہا ،
بیٹھنے آئے مری بالیں پہ لیکن ہائے کب جب علاقہ جاں کا جسم ناتواں سے اُٹھ گیا
نامراد عشاق کے پاس آہ و نالہ کے سوا اور کون سا مشغلہ ہے ۔ ان کی آہوں کا دھواں کائنات پر چھا جاتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ آسمان ان ہی کے آہوں کا دھواں تو نہیں :-
میر :- جس کو تم آسمان کہتے ہو سو دلوں کا غبار ہے اپنا
راسخ :- آسماں اس کو نہ جانو یہ جو آتا ہے نظر ہو گیا ہے کچھ دھواں پن اپنے دل کی آہ کا
کچھ دنوں کے بعد غالب نے بھی یہی سمجھا :- دودِ سودائے تتق بست آسماں نامیدش
دلِ بے مدعا ایک نعمتِ عظمیٰ ہے ۔ جس کو یہ حاصل ہوگیا اس کو بقول میر خدائی ہاتھ آگئی ۔
میر :- سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو وگرنہ میں خدا تھا گر دلِ بے مدعا ہوتا
راسخ بھی دلِ بے مدعا کے حصول کے لئے دست بدعا ہونا چاہیئے مگر پھر خیال آتا ہے کہ دل بے مدعا کا مدعا بھی بہرحال مدعائے دل ہی ہے پھر دلِ بے مدعا کہاں رہا ۔
اگر بابِ اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے
بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل اس قیدِ مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا
عشق ہمیشہ ایک راز ہی رہا ۔ سب نے اس کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے بہت سمجھا تو شاید سے زیادہ نہ بڑھ سکے شیفتہ نے کیا خوب کہا ہے :- شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

حالی نے بھی ایسا ہی کہا ہے ا۔

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید　　خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

سودا بے اختیار پکار اٹھے :

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف　　دل میں شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے،

میر نے بھی مختلف اشعار میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے :

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے　　اک آگ سی رہی ہے کیا جانیے کہ کیا ہے

گر عشق نہیں ہے تو پھر کیا ہے بھلا مجھ کو　　جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ　　دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

کیا جانیے کہ چھاتی جلے ہے کہ دل کا داغ　　اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے

وہی عشق کہیں سینہ میں آگ بن کر شعلہ زن ہے، کہیں ایک "شخص" بن کر دل میں سماتا ہے، کسی کے دل میں شعلہ سا لپٹتا ہے۔ کسی کا دل ملتا ہے، کسی کا دل کھپاتا ہے، وہی عشق راسخ کے جگر میں کانٹا سا کھٹکتا ہے :۔

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ　　کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

" تعرف الاشیاء باضدادہا " ایک مشہور مقولہ ہے اور حقیقت پر مبنی۔ سفید رنگ سیاہ ہی پر کھلتا ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو دن کی کوئی وقعت نہ تھی۔ قایم نے سچ کہا ہے :۔

موقوف ضد ہی پر تو ہے ہر شے کی معرفت　　کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

میر نے کفر کو اسلام کی رونق کا سبب بتایا اور اس کی شاعرانہ توجیہ کی :۔

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے　　حسن زنار ہے تسبیح سلمانی کا

راسخ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا۔

کئے اضداد نہ اہر قدر تا معلوم ہوتے گی　　جہنم کے مقابل خلد جاویداں کیا پیدا

مسلک تصوف میں ظاہری اور جسمانی تعلقات سے درگزر کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اہل تصوف کا کعبہ بھی کوئی اور کعبہ ہے، دل ہی کعبہ مقصود ہے، جہاں معشوق حقیقی جلوہ گر ہے :۔

میر :۔ بتا کے کعبہ کا رستہ بھلا دوں اسکی راہ　　نشاں جو پوچھے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا

گویا کعبہ کا رستہ بتا کر سالک کو منزل مقصود سے بھٹکا دینا ہے، حقیقی منزل تو اور ہی کہیں ہے۔ راسخ کے یہاں کعبہ محض ایک راہ ہے۔ منزل تو ان کی بھی کہیں اور ہے ا۔

مقیم [illegible] والے کعبہ [illegible] کے　　اقامت راہ میں کرتے نہیں مشتاق منزل کے

طالبان یار کا منزل کو چھوڑ از دل نہیں　　کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

قرآن کریم کی ایک [illegible] " اور حافظ کا "قرعہ فال" والا شعر بہت عام مضمون ہے۔

میر صاحب [illegible] بار نے گرانی کی،　　اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

[illegible] لکھے ہیں۔ پہلے شعر کی بلند آہنگی اور جوش و خروش دیکھئے :

[illegible] جس کا نہ یارائے تحمل تھا　　وہی صہبائے تند و خم شکن ہم کو پلا دی ہے

افلاک امانت کے نہ حامل ہوئے راسخ   کیونکر متحمل ہے تو اس بار گراں کا ؟
آسماں پر گرانی جس نے کی   بوجھ وہ تیرے ناتواں سے اُٹھا

اسی مضمون کو نئے پیرایہ میں شاد عظیم آبادی نے کس خوش اسلوبی سے لکھا ہے :۔

امانتِ غم کے سونپنے کو قضا نے جب آکے فال کھولی   جو سب سے عاجز تھے اس گلی میں انھیں غریبوں کا نام نکلا

فریاد عظیم آبادی کا ایک فارسی شعر ہے :۔

ہمسایہ نہ ژلیدن من نالد و گوید   [illegible] داد کہ شنیدن نہ توانم

اسی سلسلہ میں خاقانی کا بھی شعر سنئے :۔

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت   خاقانی را دگر شب آمد

مگر ہمسائے ہر طرح کے ہوتے ہیں، غمخوار بھی اور دل آزار بھی۔ مگر جب کوئی رات کی رات آہ و فغاں کرتا رہے تو ہمسایہ کہاں تک اپنی نیند خراب کرے گا۔ سودا نے کہا :۔

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات   اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

میر اپنے مخصوص لب و لہجہ میں یوں فرماتے ہیں :۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
کریں خواب ہمسائے کیونکر کہ یاں   بلا شور و فریاد و زاری رہے
ہمسائے مجھے رات کو رویا ہی کرے ہیں   سوتے نہیں بیچارے مری نالہ کشی سے

راسخ :۔ چپ ہو راسخ کب تلک یہ نالے یہ آہیں یہ شور   خوف ہے مجھ کو کہ ہمسائے نہ گھبرا دیں کہیں

مسئلہ جبر و اختیار اسلامی ادبیات کا ایک خاص مضمون رہا ہے اور ہمارے شعرا زیادہ تر "جبری" واقع ہوئے ہیں درد فرماتے ہیں :۔

جب کہتے ہو کہ ہے وہی ہادی وہی مضل   تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں

میر مجبورانہ شان سے یوں رقم طراز ہیں :

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی   چاہیں ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

راسخ نے بھی اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میر کی بے کسی کو نہیں پہونچتے :۔

مت کہو مختار ہم سے جبر یوں کو تم کہ آہ   چشم و دل پر بھی نہ اپنے اختیار اپنا ہوا

معشوق کی غیر موجودگی میں دل میں حوصلے بہت ہوتے ہیں اور خواہشات کی ایک دنیا بستی ہے مگر اس کے آتے ہی کچھ ایسی چپ لگ جاتی ہے کہ دل کا شوق دل ہی میں رہ جاتا ہے اور ایک حرف بھی زبان پر نہیں آنے پاتا۔ داغ کا یہ شعر کس نے نہیں سنا :۔

نکلنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری   لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

نظام رام پوری جو معاملاتی شاعری میں مشہور ہیں ان کے بھی دو شعر سن لیجئے :

باتیں تھیں دل میں کیا کیا کہنے کو تھے نہ کیا کچھ   منہ سے نہ اس کے آگے بھی کلام نکلا
حیران سے رہ جاتے ہیں ہم سامنے ان کے   ہم سے تو نظام اس کا گلہ ہو نہیں سکتا

ان سب سے بہت پہلے میر کو بھی یہی معاملہ پیش آچکا ہے :۔

کہتے تھے [illegible] ایک   [illegible] تیرے حضور نہیں

دو شعر راسخ کا ملاحظہ ہو :۔

[illegible] ہو سکتا   [illegible] کی تقریر میں کچھ بھی نہ کہا جاتا

دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار — نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

راسخ اسی مضمون کو اس طرح لکھتے ہیں :۔

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے — پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
بھلا کہو، کہیں ایسے سے اپنا کیونکر حال — کہ جب وہ سامنے ہو طاقت بیاں نہ رہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب سعدی کے خوان ادب کے زلہ ربا نہیں :۔

سعدی :۔ گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو گویم — چہ بگویم ؟ کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

عاشق خود معشوق کی طرز دلبری کا شاکی ہوتا ہے کہ تیری صورت اتنی پیاری اور دلربا ہے کہ ہم دل دینے پر مجبور ہیں تیرا تصور کیا ہے۔ تجھے آپ اپنا شاکی ہونا چاہئے۔

میر :۔ پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
راسخ :۔ دل دیا گر اس کو ہم نے مت ملامت کر ہمیں — ان سے کہہ ناصح کہ اتنے دلربا تم کیوں ہوئے

یہ دونوں اشعار سعدی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں :۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی ؟

کسی نے کیا خوب کہا ہے :

ان کی نظروں کو کوئی کہتا نہیں — دل ہمارا مفت میں بدنام ہے

وحید الہ آبادی یوں کہتے ہیں :۔

وہ مجھ سے کہتے ہیں تری آہیں غضب کی ہیں — اس کی خبر نہیں کہ نگاہیں غضب کی ہیں

عاشق کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ اگر بیچارہ دیوار یار کے نیچے پڑا رہتا ہے تو لوگ طعنہ زن ہوتے ہیں کہ وہ تو آرام طلب ہے۔ چین سے سایہ میں سوتا ہے۔ اس کو محبت سے کیا لگاؤ۔ میر کا مشہور شعر ہے :۔

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

راسخ نے بھی اسی طرح طعن آمیز اشعار کہے ہیں :۔

مت کرو عشق کا دعوے راسخ — عشق تم کو نہیں زیبا راسخ
رنج کش عشق کے کب ہو صاحب — تم تو آرام طلب ہو صاحب
سایہ ہی ڈھونڈھو ہو سونے کے لئے — دل خوش چاہو ہو رونے کے لئے

مگر جو بات میر نے ایک شعر میں کہدی راسخ تین شعر میں بھی وہ تیکھاپن پیدا نہ کر سکے۔

جو لوگ عشق میں آوارہ و سرگرداں ہیں ان کا پتہ یہی ہے کہ خاک کی طرح پریشاں حال ہیں۔ میر نے کہا ہے :۔

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

راسخ کہتے ہیں :۔ لے ایک کف خاک اڑا دیکھو پریشاں — گر پوچھے مرا حال وہ اے باد شمالی

جب کوئی واقعہ خلاف توقع ظہور پذیر ہوتا ہے جس کا سان گمان بھی نہ ہو۔ اور وہ واقعہ جس ذریعہ سے ظہور پذیر ہوا ہے، اس میں بہ ظاہر اس کی مجال نہ ہو تو کہتے ہیں کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

میر نے کیا خوب کہا ہے :۔ فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا — ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا
راسخ کہتے ہیں :۔ فلک ایسا ہمارے درپئے ایذا نہ تھا پہلے — یہ بے مہری تمہاری ہے، تمہارا ہی اشارا ہے

معشوق کے در کا گدا ہونا ایک ایسی سعادت ہے جس کی آرزو شاہوں کو بھی ہے ۔

میر کہتے ہیں :- ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے | اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو

راسخ اس طرح کہتے ہیں : شاہوں کو بھی ہے ایسی گدائی کی آرزو | رشک اس پہ ہے جو در کا تمہارے گدا ہوا

عالم بے خودی میں انسان اپنی ہستی اس طرح فراموش کر دیتا ہے کہ اپنی اس فراموش کاری کو بھی فراموش کر جاتا ہے، غالب کس بلند آہنگی سے اس مضمون کو ادا کرتے ہیں :-

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی | کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر اور راسخ نے بھی اس مضمون کو اپنے اپنے پیرایہ میں ادا کر لیا ہے :-

میر :- ہم آپ سے جو گئے ہیں گئے ہیں مدت کے | الٰہی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے

ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے | مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے

مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ نہیں ہمیں | کیا جانئے کہ میر گئے ہم کدھر تئیں

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو | دیر سے انتظار ہے اپنا

خدا جانے ہمیں اس بیخودی لے کس طرف پھینکا | کہ مدت ہوگئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

راسخ :- کیا جانوں لے گئی ہے کدھر بے خودی مجھے | برسوں ہوئے کہ آپ ہوں میں انتظار میں

کیا جانیں کہاں بے خودی تم بن ہمیں لے گئی | دشوار ہوا ہے بہت اب آپ میں آنا

عشق ایک روحانی لذت ہے، عاشق اس لذت کے لئے بے قصد و ارادہ کوچۂ محبوب کا طواف کرتا رہتا ہے ۔ یہی اس کی زندگی ہے ۔ لوگ اس کو نکلواتے ہیں مگر پھر موقع پاتے ہی چپکے سے وہ نکل کھڑا ہوتا ہے پھر وہی گلی ہے اور اس کا طواف ۔

مصحفی نے کیا خوب کہا ہے :- ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا | کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

میر فرماتے ہیں :- چلانہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر | ابھی میں اس کی گلی سے پکار لایا تھا

راسخ کہتے ہیں :- صبح ہوتے ہی گیا راسخ گلی میں اس کی پھر | کل میں ساری رات اسے بآنکہ سمجھاتا رہا

انسان کی ساری کوششوں کے بعد اگر امید اپنا رخ دکھاتی ہے تو کس قدر مسرت ہوتی ہے مگر عین اس وقت جبکہ کامیابی بالکل قریب ہے اور منزل مقصود سامنے، ناکامی اور حرماں نصیبی سے دوچار ہونا پڑے تو کس قدر جائے حسرت و افسوس ہے مصحفی کا مشہور شعر ہے :

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند | دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اسی مضمون کو میر اور راسخ اس طرح لکھتے ہیں :-

میر :- ملئے کیونکر نہ کف افسوس جی جاتا ہے میر | ڈوبتی ہے کشتی درطہ سے نکل ساحل کے پاس

راسخ :- کروں کیا شرح محرومی کو راسخ آہ میں وہ ہوں | کہ ڈوبی ہے مری کشتی پہونچ کر پاس ساحل کے

عاشق رو رو کر اپنا حال زار بیان کرتا ہے ۔ ایک بات کہتا ہے پھر روتا ہے، پھر کہتا ہے اور روتا جاتا ہے ایسی حالت میں سننے والا کیا خاک سمجھے گا ۔ میر کا شعر ہے :-

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا | کچھ زیر لب کہا بھی تو دیر دیر رو کر

مضمون معمولی، اور صاف ہے مگر اسی مضمون کا ایک شعر راسخ کا بھی ہے جو اس سے زیادہ بلند اور معنی خیز ہے ۔ حالت یہ ہے کہ عاشق معشوق کے جور و ستم کا گلہ کرتا ہے اور کہتے کہتے روتا بھی جاتا ہے ۔ سننے والا پریشان ہے کہ یہ کس طرح کا گلہ ہے کہ معشوق کا گلہ بھی ہے پھر اس کی محبت چھوٹتی بھی نہیں جاتی ۔ حالانکہ جب گلہ ہی کرنا ہے تو اس کی محبت سے دست بردار ہو جانا چاہئے، مگر عاشق اپنے دل سے

مجبور ہے۔ جب ظلم و جور سے اکتا جاتا ہے تو گلہ طرازی شروع کرتا ہے مگر ساتھ ہی محبت کرنے پر مجبور رہے۔ اس لئے معشوق سے کنارہ کش بھی نہیں ہو سکتا۔ غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را بلائے صحبتِ لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ

اب راسخ کا شعر سنئے اور لطف اٹھائیے:

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

یعنی سننے والا یہ کہہ رہا ہے کہ جب گلہ ہی کرنا ہے تو پھر روتے کیوں ہو؟ اس کی محبت کا دم کیوں بھرتے ہو؟ معلوم ہوا کہ تمہاری محبت راسخ نہیں ہے ورنہ گلہ طرازی کیوں کرتے۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس کی محبت کا بھی دعوےٰ ہے کہ پھر اسکی شکایت بھی ہے ناصح رونے سے منع کرتا ہے۔ عاشق مجبورِ گریہ ہے، کہتا ہے کہ میرا اختیار کیا ہے جو میں نہ روؤں۔ رونا اک جذبۂ اختیاری ہے میر کا شعر ہے:۔ منع گریہ نہ کر تو اے ناصح اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

لیکن اس سے زیادہ بے اختیاری اس کیفیت میں ہے کہ آپ کسی کو رونے سے منع کریں اور وہ اُلٹے اور زیادہ رونے لگے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور آئے دن کا مشاہدہ کہ رونے والے کو جتنا زیادہ چپ کرنے کی کوشش کی جائے گی وہ اور زیادہ رونے لگے گا۔ راسخ کا شعر ملاحظہ ہو:۔ ہوئے مانع گریہ راسخ کو ہم سوا اور روئے نصیحت کے بعد

رشک ایک فطری جذبہ ہے۔ خاص کر عشاق کے دل میں یہ جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے وہ نہیں چاہتے کہ رقیب معشوق کے ہاتھ سے کشتۂ تیغ ہو۔ میر کا مشہور شعر ہے:۔

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف، اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا؟

کیا کہتے ہیں:۔ چلا ہے تیغ بکف یار غیر کی جانب ہوئے ہیں میر تماشائی غیرت انکو نہیں

راسخ کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا سن لیجئے:۔

غیر ہوں کشتۂ تیغ اس کے بھلا ہم راسخ فرطِ غیرت سے گلا کاٹیں نہ کیونکر اپنا

معشوق کے حسن کی لطافت میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ اپنے اپنے حوصلے کے مطابق سب تعریف کرتے ہیں میر کے معشوق کے تن نازک کی لطافت کا مقابلہ کسی جان پاک کی لطافت ہی کر سکتی ہے مگر راسخ کے معشوق کی "جانِ مجسم" کی لطافت کا کیا پوچھنا، وہ تو اتنی لطیف ہے کہ آئینہ بھی اس کے عکس کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔

میر:۔ کہئے لطافت اس تنِ نازک کی میر کیا، شاید یہ لطف ہوگا کسو جانِ پاک میں

راسخ:۔ اس جانِ مجسم کی بیاں کیا ہو لطافت عکس آئینہ میں جس کا نمودار نہ ہووے

کس صورت اس کے تن سے آئینہ منعکس ہو وہ مایۂ لطافت جاں سے لطیف تر ہے

عاشق غیرت مند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بے حد رشک پسند واقع ہوا ہے، اس کی غیرت اور جذبۂ رشک اُسے اجازت نہیں دیتا کہ معشوق کے عکس کو آئینہ سے دوچار ہونے دے، معشوق کا آئینہ دیکھنا عاشق کے لئے آئینہ سے بیزاری کا سبب ہو گیا اور آئینہ کی طرف سے دل میں غبار پیدا ہو گیا۔

میر:۔ وجہ یہ تھی کہ ترے ساتھ لڑی اسکی آنکھ ہم جو صورت سیتی آئینہ کے بیزار رہے

راسخ:۔ یوں صاف عکس یار سے وہ ہمکنار ہو کس صورت آئینہ سے نہ ہم کو غبار ہو

کیفیت عشق چھپائے نہیں چھپتی، چہرہ اس راز کو فاش کر دیتا ہے اکثر آنسو کے قطرے اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں' حافظ کا مشہور شعر ہے:۔

ترا حیا و مرا آبدیدہ شد غماز دگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند

میر اور راسخ دونوں کے دواوین میں کثرت سے اس مضمون کے اشعار ملتے ہیں ملاحظہ ہو :-

میر :- کیا پھر نظر چڑھا ہے اے میر کوئی خوش رو ۔ یہ زرد زرد چہرہ تیرا اتر رہا ہے،

رہتے ہیں میر بے خود و وارفتہ اندنوں ۔ پوچھو کنایۃً کسو سے دل لگا نہ ہو

میرجی زرد ہوتے جاتے ہو، ۔ کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

راسخ :- مگر راسخ نے دل پر کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے ۔ شب اس کو میں نے جو دیکھا بہت گریاں و محزوں تھا

کچھ چوٹ سی دل پہ ہے جو یوں روتے ہیں راسخ ۔ صاحب تمھیں کس مرتبہ پاتے ہیں حزیں ہم

(پروفیسر) عطاء الرحمان

باب الاستفسار

نُصیری اور علی اللّٰہی

(جناب سید کرم حسین صاحب - جونپور)

غالب نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے :-

ہم اسداللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

کیا اسداللّٰہی سے مراد مسلک علی اللّٰہی ہے، اور کیا یہ اس کا دوسرا نام نصیری بھی ہے ؟ اگر یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو وجہ اختلاف کیا ہے ؟

(**نگار**) غالب نے اپنے آپ کو اسداللّٰہی یعنی پیروِ علی ظاہر کیا ہے - اور علی اللّٰہی سے مراد وہ جماعت ہے جو حضرت علی کو خدا کہتی ہے۔ نُصیری اور علی اللّٰہی دونوں جماعتیں غلوئے شیعیت کا نتیجہ ہیں، لیکن ان دونوں کے عقاید و مراسم میں بہت فرق ہے۔

علی اللّٰہی اپنے آپ کو اہلِ حق بھی کہتے ہیں، یہ مسجدوں میں نہیں جاتے اور نہ کسی ناپاکی کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ طلاق اور ایک سے زیادہ شادی کرنے کے قایل نہیں یہ سور کا گوشت کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں ان کی بے پردہ عورتیں مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آزادی سے رقص کرتی ہیں۔

تخلیق و آفرینش کو وہ پانچ مظاہر الٰہی یا قوتوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں، جن کے نام یہ ہیں :- پیر پادشاہم - پیر بنیامین - سر داؤد - پیر رمبر - پیر موسیٰ -

انسان میں وہ دو قوتوں کے قایل ہیں ایک عقل دوسرے نفس (شہوت)۔ ان کے ہاں مذہبی قیادت نسلاً بعد نسلٍ چلتی ہے اور مذہبی قاید کو پیر کہتے ہیں۔ اس کے نائبین جو پیر کی طرف سے مراسم مذہبی ادا کرتے ہیں دلیل کہلاتے ہیں اور وہ نائب جو حصوں کی تقسیم کرتے ہیں، خلیفہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

یہ جماعت آٹھ طبقوں میں منقسم ہے :- ابراہیمی - داؤدی - میری - سلطان بابری - خاموشی - یادگاری - شاہ ایازی - خان آتشی -

ان کا بیان ہے کہ بابا طاہر عریاں، ان کی بہن بی بی فاطمہ اور سید محمیری بھی انھیں کے جماعت کے افراد تھے - ان کی کتابیں کردستانی زبان میں لکھی ہوئی ہیں، جن میں بڑی خاص و اہم کتاب، کتاب سنجار یا کتاب چہار ملک ہے۔

ان کے پیر شعبدہ باز بھی ہوتے ہیں اور ایک شعبدہ دہکتے ہوے کوئلوں پر بیٹھنے کا بھی ہوتا ہے -

ان کے یہاں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کا بھی رواج ہے - وہ بھیڑ یا بیل کی قربانی کو بھی سب ساتھ مل کر کھاتے ہیں، بھیڑ کی قربانی کو قربان کہتے ہیں اور بیل کی قربانی کو گاو بران -

بکتاش اور قزلباش جماعتیں بھی قریب قریب اسی قسم کی ہیں، عام شیعہ انھیں خروس کُش بھی کہتے ہیں، کیونکہ اپنے تین دن کے

روزے کے اختتام پر وہ مرغ ذبح کرکے کھاتے ہیں۔

ایران میں ان کا مرکز کرمان شاہ ہے۔ ہندوستان میں بھی ان کا وجود کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

نُصیری یہ جماعت بھی غالی شیعوں کی ہے اور اس باب میں اختلاف ہے کہ اس کا یہ نام کیوں پڑا۔ بعض اسے نصرانی کی تصغیر بتاتے ہیں (کیونکہ ان کے بعض مراسم نصرانیوں سے ملتے جلتے ہیں) بعض اسے نزینی کی بگڑی ہوئی صورت بتاتے ہیں جو شام کی عیسائی حکومت کا نام تھا۔ بعض اس کا تعلق ناصورا سے ظاہر کرتے ہیں جو کوفہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں کا یہ نام کیوں پڑا۔ اس کے متعلق بھی اختلاف ہے، لیکن غالباً یہ زیادہ صحیح ہے کہ یہ نام محمد بن نصیر نمیری عابدی کی سکونت کی وجہ سے قرار پایا، کیونکہ نصیری جماعت کے افراد اپنے آپ کو پہلے مومنون اور نمیری ہی کہتے تھے، بعد کو ان کا نام نصیری ہوگیا۔

ابن نصیر، بصرہ کا ایک مشہور شخص تھا جو ۲۴۵ھ ہجری میں دسویں شیعی امام (علی نقی) کے مبلغ کی حیثیت سے رونما ہوا تھا۔

ان کے عقاید بہت عجیب ہیں۔ ان کے یہاں نظام عالم کا تعلق نورانی کروں یا سیاروں سے ہے جسے عالم کبیر نورانی کہتے ہیں۔ خدا جسے وہ عالم الغیب کہتے ہیں، مختلف ہستیوں کے اندر ظاہر ہوتا رہتا ہے جن کے مختلف نام اور مدارج انھوں نے مقرر کر رکھے ہیں۔ مثلاً: رسم یا باب، صامت، ناطق، معنیٰ وغیرہ۔

ان کا مذہب یکسر تاویلات کا مجموعہ ہے مثلاً نماز کے پانچ اوقات سے مراد محمدؐ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور محسنؓ ہیں۔ اسی طرح ماہ صیام کے تیس دن کو تیس مردوں اور تیس راتوں کو تیس عورتوں سے منسوب کرتے ہیں اور زکوٰۃ سے وہ سلمان فارسی مراد لیتے ہیں۔

ولایت کے مسئلہ میں وہ علیؓ اور ان کی اولاد کے سوا سب کو مردود سمجھتے ہیں اور ان کو برا بھلا کہتے ہیں۔ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ کو اس کی تعلیم جبرئیل کے نام سے سلمان ہی نے دی تھی۔ قمری حساب سے ان کے خاص تہوار یہ ہیں:- فطر، اضحیٰ، غدیر، مباہلہ، فراش، عاشورہ، ۹ ربیع الاول (یوم شہادت عمرؓ)، ۱۵ شعبان (یوم وفات سلمانؓ) کسی حساب سے وہ نوروز، مہرجان، کرسمس وغیرہ بھی مناتے ہیں۔

اس جماعت میں ایران، شام، مصر، لبنان اور فلسطین وغیرہ کے مختلف قبایل کے لوگ شامل ہیں۔ شام میں جبل لقمان کا علاقہ جو ریاست علویہ کے نام سے موسوم ہے، زیادہ تر نصیریوں سے آباد ہے، اب سے ۳۰ سال قبل انکی آبادی یہاں تقریباً سوا دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔

ادبیات ملایا پر فارسی کا اثر

اسلام تیرھویں صدی عیسوی میں براہ ہندوستان ملایا پہونچا اور اسی کے ساتھ ادبیات فارسی سے بھی وہاں کے لوگ آشنا ہوئے۔ ہر چند ہندوستان سے آنے والوں میں ایرانیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، تاہم اس کا اثر بھی وہاں کے لوگوں پر ہوا۔ سب سے پہلے اسلام کا اثر و نفوذ جزیرۂ سوماترا کے شمالی بندرگاہ پسائی اور سموررا میں ہوا اور یہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلا۔

ابن بطوطہ نے ساموررا کے سربرآوردہ عمال میں چند ایرانیوں کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک نائب امیر البحر تھا جس کا نام بہروز تھا۔ ایک قاضی بھی ایرانی ہی تھا امیر سید شیرازی اور ایک فقیہ تاج الدین نامی کا پتہ چلتا ہے جو اصفہان کا رہنے والا تھا۔

ان کے علاوہ عبداللہ بن محمد بن ابوجعفر العباسی بھی جو خاندان عباسی کے مبلغ کی حیثیت سے براہ دہلی یہاں آئے تھے اور سنہ [illegible]ء میں یہیں دفن ہوئے۔

مشہور ہے کہ مالک ابراہیم سب سے پہلے عالم دین تھے جو جاوا آئے اور سنہ ۱۴۱۹ء میں یہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ کاشان کے رہنے والے تھے اور براہ ہندوستان یہاں آئے تھے۔

سنہ ۱۴۲۰ء میں ساموررا میں ایک ایرانی حسام الدین کی قبر دریافت ہوئی جس پر سعدی کے بعض اشعار منقوش ہیں۔

پندرھویں صدی میں حکایت امیر حمزہ اور حکایت محمد حنیفہ کا ترجمہ ملایا زبان میں ہوا۔ طوطی نامہ کا ترجمہ بھی یہاں کی زبان میں کیا گیا جس کا ایک نسخہ جو سنہ ۱۶۰۰ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے، کتبخانۂ آکسفورڈ میں موجود ہے۔ کلیلہ و دمنہ اور بختیار نامہ کا ترجمہ بھی ملایا میں پایا جاتا ہے۔

مذہبی کتابوں میں ایک کتاب نور محمدی کے بیان میں، روضۃ الاحباب کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح حکایت یوسف و زلیخا اور تاج السلاطین کا ترجمہ بھی فارسی سے ملایا زبان میں کیا گیا، ایک اور کتاب ہزار سوال بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی۔

ملایا کی شاعری میں فارسی اثرات کا پتہ چلتا ہے اور وہاں کے شعراء نے بھی معشوق کی پیشانی کو ہلال اور ابرو کو کمان سے تشبیہ دی ہے۔

غیر متوقعات

ہینڈیوناگوچی

ابھی تک وہ پوری طرح ہوش میں نہ آئی تھی کہ گھبرا کر چیخ اٹھی ۔ "میرے بچہ کو لاؤ، میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں" ڈاکٹر نے متفکرانہ انداز سے نرس کی طرف دیکھا اور کہا کہ "کیا کیا جائے مجبوری ہے، جاؤ بچّہ کو لاکر اسے دکھا دو"

تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت بچہ اس کی آغوش میں تھا۔ وہ اس کے پیارے پیارے چہرہ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ گھبرا گئی کیونکہ جب اسکی کنپٹی کی طرف نگاہ گئی تو دیکھا کہ بچہ کے کان نہ تھے ۔

بچہ بڑا ہو کر مدرسہ جانے لگا، وہ بہت ذہین تھا اور کھیل کود، پڑھنے لکھنے میں اپنے تمام ساتھیوں میں اول رہتا تھا، کان نہ تھے لیکن اس کی سماعت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

ایک روز روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور بولا "اے ماں، آج میرے ایک ساتھی لڑکے نے مجھ سے کہا کہ میری پیدائش ناقص ہوئی ہے، میرے باپ کو آتشک تھی اور اسی لئے میرے کان غائب ہو گئے ہیں"

ماں نے اس کو تسلی دی اور بولی کہ "وہ جھوٹ کہتا ہے، تم رنج نہ کرو"

لیکن اُس دن سے اس کے ماں باپ کو بڑی فکر پیدا ہو گئی اور دونوں بہت افسردہ رہنے لگے ۔

لڑکا بڑھتا رہا، تعلیم پاتا رہا، یہاں تک کہ وہ مدرسہ کے آخری درجہ تک پہونچ گیا اور امتحان میں کامیاب ہونے پر اسے اول انعام ملا، لیکن والدین کا اضمحلال کسی طرح کم نہ ہوا ۔

وہ اسے ٹوکیو لے گئے اور ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ "جراحی سے اس کا یہ عیب دور ہو سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی شخص اپنے کان دینے پر آمادہ ہو جائے"

ایک ہفتہ کے بعد اس کے والدین نے اس سے کہا کہ "لو خوش ہو جاؤ، اب تمہارا یہ عیب دور ہو جائے گا، ایک شخص اپنے کان دینے پر آمادہ ہو گیا ہے ۔

چنانچہ اسی ہفتہ ٹوکیو کے شفاخانے میں عمل جراحی سے دونوں کان اس کے کنپٹی پر پیوند کر دئے گئے اور جب وہ وہاں سے شفا پا کر کالج پہونچا تو سب کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ۔

اس نے اپنے والدین سے دریافت کیا کہ "وہ کون شخص تھا جس نے اس کے لئے اتنی بڑی قربانی گوارا کر لی ۔ لیکن انھوں نے کہا کہ "یہ بات ہم نہیں بتا سکتے، کیونکہ ہم نے اس راز کے چھپانے کی قسم کھائی ہے"

باپ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ "تمھاری ماں کی آخری وصیت یہ تھی کہ دفن ہونے سے پہلے تم اس کے چہرہ کو بوسہ دینا"۔
لڑکا اپنی ماں کی میت کے پاس گیا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرہ سے چادر ہٹائی تاکہ اس کو آخری بوسہ دے سکے، لیکن اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں کان غائب ہیں۔
لڑکے نے انتہائی تاثر کے ساتھ کہا کہ "آج مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں نے کیوں بالوں میں کنگھی کرنا چھوڑ دی تھی اور اپنے بال شانہ و گردن تک بکھرائے رکھتی تھی"۔

یہ لڑکا جو بغیر کان کے پیدا ہوا اور جس کی یہ بدنمائی دور کرنے کے لئے ماں نے اپنے دونوں کان اس کی نذر کر دئے وہ تھا کہ جب اس کے ۲۲ سال بعد اس کا انتقال ہوا تو شاہ جاپان نے اس کا ماتم کیا، اور ملک بھر میں اس کی یادگاریں قایم کی گئیں، کیونکہ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے زرد بخار کی دوا دریافت کی اور خود اسی مرض میں مبتلا ہو کر جان دی۔
لیکن اس سے زیادہ اہم خدمت اس کی یہ تھی کہ اسی نے سب سے پہلے آتشک کے جراثیم دریافت کئے جس پر اسے نوبل پرائز دیا گیا۔
اس لڑکے کا نام "ہنیدیو ناگوچی" تھا جو بیسویں صدی کا بہترین "ماہر جراثیم" مانا جاتا ہے۔

والٹیر

والٹیر، فرانس کا مشہور فیلسوف و نقاد، سود خواروں میں بھی اول درجہ کا سود خوار سمجھا جاتا تھا اور عجیب ترکیب سے اس نے سودی روپیہ جمع کیا تھا۔
جب لوگ اس سے روپیہ قرض لینے آتے تو وہ کہتا کہ میں اصل رقم کبھی واپس نہ لوں گا، لیکن جب تک میں زندہ ہوں دس فیصدی کے حساب سے سود ادا کرتے رہو۔ چونکہ وہ بہت ضعیف، جثہ کا انسان تھا اور بیمار ہی بنا رہتا تھا، اس لئے لوگ اس زیادہ سود کو بھی گوارا کر لیتے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے، معلوم نہیں کس دن مر جائے۔
اگر کوئی شخص اتنا سود دینے میں کچھ تامل کرتا نظر آتا تو وہ مصنوعی طور پر کھانسنے اور کراہنے لگتا جس سے قرض خواہ کو یقین ہو جاتا کہ یہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے والا نہیں اور وہ دس فی صدی سود منظور کر لیتا۔
لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہی والٹیر جسے لوگ زندہ درگور سمجھا کرتے تھے۔ ۸۴ سال تک زندہ رہا اور اس نے لاکھوں روپیہ صرف سود سے حاصل کیا۔

قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدرآبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرف آخر" کو سامنے رکھ کر اس کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے، اس نظم میں ...۱۰ سے زیادہ اشعار ہیں اور شیطان و شاعر کے مکالمہ کے ذریعہ سے رموز کائنات اور اسرار حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے ان کے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں آسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ ۲۰ پونڈ دبیز، گردپوش رنگین، قیمت دو روپیہ

مینجر نگار لکھنؤ

مختصرات

دُنیا کے مختلف ملکوں میں انسانی دانت سے متعلق بعض توہمات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹلی میں اب بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کے دانت کھلے کھلے ہیں تو وہ ضرور اقبال مند ہوگا۔

اگر کوئی بچہ ایسا پیدا ہو جس کے منہ میں کوئی دانت پایا جاتا ہو تو وہ بہت منحوس خیال ہوتا ہے اور افریقہ کے وحشی قبایل ایسے بچہ کو نہایت بیرحمی سے فوراً ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

کرۂ زمین ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ایک بڑے خطرہ سے بال بال بچ گیا۔ اس تاریخ کو ایک جسم سیاہ چاند کے سامنے مشرق سے مغرب کی طرف ڈیڑھ سکنڈ کے اندر گزر گیا۔

یہ جسم بیضوی شکل کا تھا اور بغیر دوربین کے بھی نظر آتا تھا۔ منجمین امریکہ نے رات کو ساڑھے نو بجے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ کسی کرہ کا ٹکڑا تھا جو اس سے علحدہ ہو کر ۳۰ کیلومیٹر فی سکنڈ کے حساب سے حرکت کر رہا تھا اور اگر اتفاقاً یہ کہیں زمین سے ٹکرا جاتا تو زمین تباہ ہو جاتی

پرتگال میں ایک قوم ہے جسے برازیل کہتے ہیں، یہ پرتگال کے بڑے علاقہ پر حاوی ہیں اور اپنی حماقت کے لحاظ سے بہت بدنام ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے ایک دو سال قبل جب لڑائی کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا، حکومت پرتگال نے چاہا کہ فرانس کی مازینو لائن کی طرح خود بھی مدافعت کے لئے ایک جدید خط دفاع قایم کرے، چنانچہ کام شروع ہو گیا اور بہت سے زمین دوز قلعے تعمیر کرکے توپیں ان پر نصب کر دی گئیں۔ لیکن جب پرتگالی حکومت کے فوجی افسران اس کے مشاہدہ کے لئے گئے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ جتنے ڈھس بنائے گئے تھے ان سب کی توپوں کا رُخ خود پرتگال ہی کی طرف تھا اور بجائے اس کے کہ دشمن کے خلاف ان سے کام لیا جاتا، خود دشمن ان سے کام لیکر پرتگال کو تباہ کر سکتا تھا۔ بڑی فکر ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ان ڈھسوں کو مسمار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ انکی طیاری پر بہت روپیہ خرچ ہوا تھا۔ آخرکار حکومت اسپین سے گفتگو شروع ہوئی اور نصف لاگت پر یہ تمام قلعہ بندیاں اس کے ہاتھ فروخت کر دی گئیں، کیونکہ وہ ان سے کام لے سکتا تھا۔

امریکہ کے ایک شہر آرکانزاس میں ایک دولتمند شخص گردم کلک کو اپنے مال و متاع کے تصرف سے روک دیا گیا تھا کیونکہ اسکے ہوش و حواس کی درستی کی طرف سے اشتباہ تھا۔

ایک دن اس نے اپنے دوستوں کو جن میں وکلا اور عدالتوں کے جج بھی شامل تھے، دعوت دی کہ وہ اس کی نئی بیوی سے آکر مل جائیں۔

جب یہ سب جمع ہو گئے تو وہ ان سب کو اصطبل لے گیا، جہاں اس کی کئی گھوڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک گھوڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ میری نئی بیوی ہے۔

امریکہ میں قدیم سے یہ قانون چلا آتا ہے کہ " مرد ہر ایک زندہ مادہ سے شادی کر سکتا ہے" اور اس میں کوئی تخصیص انسان وحیوان کی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ قانوناً بیوی کی تمام دولت مرد کی ملکیت سمجھی جاتی ہے، اس لئے گرڈم کو حق پہونچتا تھا کہ یہ گھوڑی گھوڑدوڑ میں جو کچھ جیتے وہ اسے حاصل کرے۔
جب یہ معاملہ عدالت میں آیا تو اس نے اس نکاح کو تو ناجایز قرار دیا لیکن اسی کے ساتھ اُسے اپنے مال و متاع پر تصرف کی بھی اجازت دیدی کیونکہ جو شخص کسی متروک قانون سے فایدہ اُٹھانے کی اتنی عقل رکھتا ہے وہ ہوش وحواس سے بیگانہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ولایت میں ایک شہری و دیہاتی عورت کی کیا پہچان ہے؟۔ شہری عورت جب ہوا تیز چلتی ہے تو فوراً اپنی ٹوپی کو سنبھالتی ہے اور دیہاتی عورت اپنے دامن کو۔

سان فرانسسکو کانفرنس میں شرکت کے لئے ایک معمر چینی اخبار نویس بھی گیا تھا۔ جب وہ وہاں سے واپس آنے لگا تو اخبارو کے نمایندوں نے اس سے دریافت کیا کہ " آپ کو امریکہ میں عجیب چیز کونسی نظر آئی"۔
اس نے جواب دیا کہ " اہل امریکہ کی آنکھیں بہت عجیب نظر آئیں جو سیدھی اور بالکل غیر فطری ہیں"

ملکۂ " اوژنی" نپولین سوم شاہنشاہ فرانس کی بیوی، ایک جوتا کبھی دوبارہ نہ پہنتی تھی۔

ملکۂ الزبتھ (انگلستان کی بے شوہر ملکہ) لباس کی بہت شایق تھی اور روز نیا لباس پہنتی تھی۔ چنانچہ اپنی ۴۰ سال کی حکومت کے بعد جب اس کا انتقال ہوا تو ۲ ہزار جوڑے اپنے بعد چھوڑ گئی۔

کیتھرائن کبیر (ملکۂ روس) ہر وقت اپنا بدن دبوایا کرتی تھی۔

ملکۂ وکٹوریا اس ڈر سے کہ مبادا اس کے جاذب (بلاٹنگ پیپر) کے نشانات سے لوگ اس کی خفیہ و سیاسی مراسلت کو پڑھ سکیں، ہمیشہ سیاہ رنگ کا جاذب استعمال کرتی تھی۔

ملکۂ " آن بولین" ہنری ہشتم کی بیوی ہمیشہ اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلتی تھی تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ اسکے ہاتھوں میں چھ انگلیاں تھیں۔

" آن" ملکۂ روس نے ایک روز کسی بات پر شاہزادہ سے خفا ہوکر حکم دیا کہ اس کو مرغی بنایا جائے۔ چنانچہ ایک ٹوکرے میں گھاس رکھ کر انڈے رکھدئے گئے اور شاہزادہ کو حکم دیا گیا کہ اس ٹوکرے میں انڈوں پر بیٹھے اور مرغی کی سی آواز نکالے۔

مئی کی ایک دوپہر

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

شام ضَو ریز نہیں، صبح پُر انوار نہیں
سروِ آزاد نہیں، نرگسِ بیمار نہیں
رونقِ صحن و جمالِ در و دیوار نہیں
دولتِ عشق نہیں، نعمتِ دیدار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

کل یہاں خلد سے ہوتا تھا شگوفوں کا نزول
آج تکلیفِ نظر حدِ نظر تک ہے ببول
عرصۂ دہر ہے پژمردہ و بےکیف و ملول
عیشِ گلزار نہیں، عشرتِ کہسار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

گوشہ گوشہ ہے یہاں "حلقۂ صد کام نہنگ"
دلِ ہر ذرہ میں پیوست ہیں صرصر کے خدنگ
کونسا پھول نہیں نوحہ گرِ رامش و رنگ
کونسی شاخ ہے گلشن میں جو تلوار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

ہوگیا مے سے تہی رطلِ گراں اے ساقی
اب کہاں وہ مری "فردوسِ رواں" اے ساقی
کون سی آنکھ نہیں دجلہ فشاں اے ساقی
کونسا دل غمِ گیتی سے گراں بار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب وہ سوزِ فلک افروز نہیں تاروں میں
اب وہ پہلا سا ترنم نہیں فواروں میں
نگہِ شوق بھٹکتی ہے سمن زاروں میں
اب ہیں کہنے کو سمن زار۔ سمن زار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

ہیں صنوبر کے لرزتے ہوئے سائے خاموش
تتلیاں رقص کناں ہیں نہ ہوا بادہ فروش
زندگی سر بگریباں ہے، تمنا روپوش
لذتِ شوق نہیں، مستیِ بیدار نہیں،

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

اب نہیں موجِ نظر حیرتیٔ "سیم سمن"　　چار سو یاس کے پرچم ہیں، امیدوں کے کفن
اوس کی بوند پہ رقصاں تو ہے سورج کی کرن　　آہ لیکن یہ کرن زرد ہے گلنار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں

جستجوئے گل و بلبل میں پریشاں ہے نسیم　　اب کہاں شبنمِ آوارہ میں روحِ تسنیم
اب نہ وہ سبزۂ نورستہ نہ غنچوں کی شمیم　　اب وہ طوطی نہیں، درّاج نہیں، سار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں،

اب نہ وہ موسمِ نغمہ ہے نہ وہ فصلِ شباب　　غنچگی رُخ سے اُلٹنے بھی نہ پائی تھی نقاب
اُڑ گیا قافلۂ لالہ و نسرین و گلاب　　شعلۂ ساز نہیں، ابرِ گہر بار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کار نہیں!!

افسر سیابی

اکرم دھولیوی :-

تری طلب کا تقاضا ہے دل کی بے تابی　　خدا کرے کہ نہ آئے کبھی قرار مجھے،
جنوں کے جوش میں تجھ کو نہ بھول جاؤں کہیں　　بنا نہ شیفتۂ ذوقِ انتظار مجھے
اُڑا مذاق نہ میری نیاز مندی کا　　دلا یقین نہ وعدہ کا بار بار مجھے
سکون دل کی کہاں اور پھر کوئی صورت　　ترا خیال نہ رکھے جو بے قرار مجھے
مزہ تو جب ہے کہ نازو نیازِ الفت میں　　کچھ اختیار تجھے ہو کچھ اختیار مجھے
مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی　　اک انقلاب کا ہر دم ہے انتظار مجھے

بہا رہا ہوں جو میں اپنا خونِ دل اکرم
غم وفا کو بنانا ہے یادگار مجھے،

صبحِ نشور

ابھی تو کرتا ہے تکمیلِ "دین وفن" ایدوست
لہو اگلنا ہے گیتی کے ماہ پاروں کو
نسیمِ باغ کو بادِ سموم ہونا ہے
ابھی دہنا ہے شبنم فشاں بہاروں کو
زمیں سے آتشیں سیلاب کو اُبلنا ہے
لہو میں کھینا ہے اپنا سفینہ لالے کو
ابھی تو ساغرِ امرت میں زہر بھرنا ہے

ابھی "فرشتوں" کو بننا ہے "اہرمن" ایدوست
زمیں پہ ٹوٹ کے آنا ہے چاند تاروں کو
"پیمبروں" کو "ظلوم وجہول" ہونا ہے
بکھیرنا ہے ابھی آگ برف زاروں کو
ابھی اس آنچ میں انسانیت کو گلنا ہے
ابھی اندھیروں میں ہونا ہے گم اجالے کو
خضر کو موت کے ظلمات سے گزرنا ہے

ابھی بسانے ہیں آبادیوں میں ویرانے
زمیں پہ جھکنا ہے افلاکیانِ خود بیں کو
حریمِ غنچہ کو محرابِ برق ہونا ہے
مہ و ستارہ کو ہونا ہے جل کے خاکستر
ابھی زمین کو جننا ہے زلزلے، سیلاب
"خروشِ زمزمہ" کو "بانگِ صور" ہونا ہے
حریر پوشوں کو فولاد و سنگ ہونا ہے

ابھی چمن میں کچھ آتشکدے ہیں سلگانے
یہ جُرعے زہر کے پینے ہیں اہلِ نوشیں کو
جہانِ زیست کو شعلے میں غرق ہونا ہے
نگارِ وقت کو رہنا ہے صدیوں خاک بسر
ابھی اُٹھانا ہے چہرے سے حادثوں کے نقاب
ہر ایک صبح کو "صبحِ نشور" ہونا ہے
ثبات وصلح کو آشوبِ جنگ ہونا ہے

خرد کو جہل کا حلقہ بگوش ہونا ہے
یہ دین و عقل و کتاب و ہنر کے آئینے

ابھی "رسولوں" کو "ایماں فروش" ہونا ہے
ان آئینوں کو ابھی پاش پاش ہونا ہے

طلوع ہونا ہے مشرق سے تیرگی کو ابھی
ہزار ہا سال ترسنا ہے روشنی کو ابھی

فضا ابن فیضی

شفا گوالیاری :۔

روا رکھا یہاں تک احترامِ عاشقی میں نے
ہنسی آئی کبھی تو آنسوؤں کو سونپ دی میں نے

مچی ہے آج تک ہلچل سی دنیائے پرستش میں
کیا تھا ایک سجدہ ماورائے بندگی میں نے

ملیں ایسی بھی راہیں مجھ کو اکثر راہِ الفت میں
کہ خود کو اے شفا گھبرا کے خود آواز دی میں نے

ضیائے ماہ و انجم بھی اب فریبِ جلوہ نہ دے سکے گی
نگاہِ جلوہ طلب کو ہر سو اب اپنی ہی روشنی ملے گی

سبق لے! منظرِ گورِ غریباں دیکھنے والے
چراغوں کو ترستے ہیں چراغاں دیکھنے والے

قفس میں بھی تجھے رہنا کہیں دو بھر نہ ہو جائے
ارے مڑ مڑ کے او سوئے گلستاں دیکھنے والے

تو جسے ذرہ سمجھ کر کر رہا ہے پائمال،
دیکھ! اس ذرے کے سینے میں کہیں دنیا نہ ہو

شبِ غم رونے والا روتے روتے سو گیا شاید
جبینِ گل پہ شبنم کی نمی دیکھی نہیں جاتی

ارے او بیکسی پہ رونے والے کچھ خبر بھی ہے
وہی ہے زندگی، جو زندگی دیکھی نہیں جاتی

شبِ غم دیکھتا رہتا ہوں، یوں تو سیکڑوں منظر
مگر پچھلے پہر کی چاندنی دیکھی نہیں جاتی

ذوقِ سجدہ کامراں ہونے نہیں دیتا ہمیں
اب جبیں سے بھی سجا کر آستاں ڈھونڈھیں گے ہم

اِک نئی بنیاد ڈالیں گے تجسس کی شفا
ہر غبارِ کارواں میں کارواں ڈھونڈھیں گے ہم

نہ ہوگا پاس رہ کر امتحاں مشقِ تصور کا
وہ جتنا دور ہو سکتا ہو اُتنا دور ہو جائے

لبوں پہ دم ہے کسی کا، کوئی سرہا لیں،
شفا حیات کا دامن پکڑ کے آئی ہے

مطمئن دل ان کی اُلفت سے مگر آنکھیں پُر آب
آہ دیوانے کی دنیا، آہ دیوانے کا خواب

دھڑکتے دل سے شفا تک رہا ہوں یوں تارے
کسی نے جیسے کہا ہو کہ "آ رہا ہوں میں"

انجم رضوانی :۔

ہوتے ہیں بڑے قسمت کے دھنی جو یہ صدمے سہہ جاتے ہیں
طوفانِ حوادث میں ورنہ اچھے اچھے بہہ جاتے ہیں

دو اشک کسی کے دامن پر ٹپکا کر چپ رہ جاتے ہیں
یوں بات جو کہنا ہوتی ہے کہنے والے کہہ جاتے ہیں

اس یاس و الم کی دنیا میں اور اسکے سوا کیا رکھا ہے
کچھ دکھ دینے کو آتے ہیں کچھ رنج و تعب سہہ جاتے ہیں

محویتِ دل کا حال یہ ہے انجم کہ نہیں اپنی بھی خبر
شاید یہ وہی منزل ہے جہاں ہوش اور خرد رہ جاتے ہیں

رعایتی قیمت

مجموعۂ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ جسکی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن
اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار

گوہر

جناب نظیر جمیلی ام۔ اے کے قلم سے

یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبۂ بہار کا اور
ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک
معمر شوہر کی جوان بیوی اور اسکے سوتیلے جوان بیٹے کی داستان معاشقہ
ہے اور اس قدر دلچسپ انداز بیان میں کہ پڑھنے والے پر محویت طاری
ہوجاتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جانعالم واجد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ انکی مثنوی
کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے
ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم
ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے۔
قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔ منیجر نگار

تذکرۂ سخن

اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں تمام ان اعتراضات کو پیش کیا گیا
ہے جو شعرائے فارسی و اردو کے کلام پر کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتراضات
کے جوابات بھی دئے گئے ہیں اور ان پر محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ جن شعرا کا اسمیں ذکر کیا گیا ہے
انکے حالات بھی دیدئے گئے ہیں، وہ حضرات جو فن شعر کے نکات و رموز سے واقف ہونا
چاہتے ہیں، انکے لئے یہ کتاب بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ صرف چند جلدیں باقی رہ گئی
ہیں۔ قیمت معہ محصول چار روپیہ آٹھ آنے۔ کمیشن نہیں دیا جائیگا۔ منیجر نگار

کیل
چھائیوں
پھوڑے
پھنسیوں
سے
نجات
پانے
کیلئے

صافی

صافی سے خون بھی صاف
جلد بھی صاف

استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ بکتی ہے

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(ہندوستان کی سب سے پرانی جہاز ران کمپنی)

خاص حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ امسال عازمین حج بیت اللہ کے لئے رمضان سے قبل جہازوں کی روانگی کا خاص انتظام کیا ہے۔ رمضان کے بعد روانہ ہونے والے جہازوں میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے جو مایوسی ہوتی ہے اس سے بچنے کے لئے عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مندرجہ ذیل جہاز کی روانگی سے فایدہ اُٹھائیں۔ اس جہاز میں جگہ بھی کافی ہے اور انکا کرایہ بھی رمضان کے بعد جانے والے جہازوں کے کرایہ کے مقابلہ میں کم ہے۔

(ایس۔ ایس۔ رضوانی —— وزن ۴۸۴۵ ٹن)

۲۵ مئی کے قریب بمبئی سے روانہ ہوگا

جہاز کی روانگی کی صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

کرایہ بمبئی تا جدہ اور واپسی مع شرح خوراک، محصولات جدہ، قرنطینہ کامران اور جدہ کی کشتی کرایہ حسب ذیل ہے:-

	کرایہ جہاز	خوراکی	محصولات جدہ	قرنطینہ کامران	کرایہ کشتی	مجموعی رقم
پہلا درجہ	۹۷۶ روپے	۱۷۵ روپے	۶۶ روپے ۱۲ آنے	۴ روپے	۴ روپے	۱۲۲۵ روپے ۱۲ آنے
عرشہ (قبل رمضان)	۴۳۱ روپے	۵۸ روپے	۶۶ روپے ۱۲ آنے	۴ روپے	۴ روپے	۵۶۳ روپے ۱۲ آنے
عرشہ (بعد رمضان)	۳۵۷ روپے	۵۸ روپے	۶۶ روپے ۱۲ آنے	۴ روپے	۴ روپے	۴۸۹ روپے ۱۲ آنے

اہم اطلاع عازمین حج کے پاس بین الاقوامی فارم پر ہیضہ اور چیچک کے ٹیکہ لگوانے کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے۔ ہیضے کے سرٹیفکٹ میں یہ درج ہونا ضروری ہے کہ عازمین حج نے سات روز کے وقفہ سے ہیضہ کے ۲ دو انجکشن لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بمبئی سے روانگی کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے۔ اسی طرح چیچک کے سرٹیفکٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل چیچک کا ٹیکہ لگوایا گیا ہے۔ یہ سرٹیفکٹ مقررہ "انٹرنیشنل فارموں" پر مقامی میونسپلٹی کے محکمہ حفظان صحت کے حکام سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ہیضہ کے سرٹیفکٹ ۶ ماہ تک اور چیچک کے سرٹیفکٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں۔

عازمین حج کو چاہئے کہ وہ ابھی سے ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکٹ تیار رکھیں

نشستیں محفوظ کرائیے! رمضان سے پہلے اور بعد روانہ ہونے والے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جا رہی ہیں عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام ہمارے ہاں درج کرالیں تاکہ بعد میں سعادت حج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ درخواست میں مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے مثلاً ہر ایک عازم حج کا پورا نام ۲ والد یا شوہر کا نام ۳ جنسیت یعنی مرد یا عورت ۴ عمر ۵ درخواست بھیجنے والے کا پورا پتہ خوشخط ۶ کس درجہ کا ٹکٹ درکار ہوگا کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو انکا نام وغیرہ بھی درج کرنا ضروری ہے خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں۔

نشستیں محفوظ کرانے کے لئے لکھئے:-

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ
مینیجنگ ایجنٹس:- دی مغل لائن لمیٹڈ
۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

تار کا پتہ: "MOGUL" BOMBAY,

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور ادبیت کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جسمیں ہندی کا اسکے بہترین نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام روح بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں یہ انشا اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین قیمت بارہ آنہ

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل یعنی عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری ثروت و تنگنامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جسمیں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان، طریقت و علما کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لیے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اسکو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جسمیں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے تھے جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔ حصہ اول ختم ہو گیا

حصہ دوم عه/ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت ایکروپیہ علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری، فروری سنہ [illegible]ء

نگار ۲۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا مجموعہ جس میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۴۲ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام مادلین نمبر ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار تحریر کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور ان کا [illegible] سمجھ لے جبکہ پہلی مسلم حکومت کی [illegible] کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری سنہ ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر سکول کا معیاری افسانہ کیا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں "مارس ہندس" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عربیا، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زندگی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی [illegible] کہ انکا مستقبل کتنا درخشاں ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جانتے [illegible]۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ مدیر نگار کے قلم کا [illegible] جس میں [illegible] مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور انکے اسباب کو [illegible]

نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان و پاکستان کے اندر چھ روپیہ۔ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند۔ بارہ روپیہ [illegible]

[illegible] رسالہ ہر ماہ کی [illegible] تک شائع ہوتا ہے اور [illegible]

[illegible] پرچہ [illegible] کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل نہ ہوگی

اجرت اشتہار اور کمیشن وغیرہ کی تفصیلات منیجر "نگار" سے طلب کیجئے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۴۳ جون ۱۹۵۱ء

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
روپیہ سکہ

آیندہ جولائی کا "نگار" انتہائی اہم و دلچسپ پرچہ ہوگا

یہ گویا سالنامہ ہے
جو کتابی سائز پر شایع ہو رہا ہے

اس کتاب کا نام ہے

"۵۵ سال کے بعد"

یہ کتاب "نفسیات عملی" پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔

یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

۱ - دُنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا

۲ - آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا

۳ - آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائے گا

۴ - انحطاطِ عمر اور ضعیفی کا موجودہ مفہوم قطعًا باقی نہ رہے گا

۵ - شاہراہِ حیات پر چلنے کا وہ نیا طریقہ آپ کو معلوم ہو جائے گا جو اس وقت تک آپ کی آنکھوں سے اوجھل تھا

۶ - آپ زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور نہ ہوں گے بلکہ زمانہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہوگا

۷ - زمانہ آپ کے اختیار میں ہوگا اور آپ اپنی مرضی کے مطابق وقت کی سوئی کو جتنا چاہیں گے گھٹا سکیں گے

کیونکہ

زندہ رہنا ایک فن ہے

اور یہ کتاب آپ کو اسی فن کا ماہر بنائے گی

ادب و انشاء کے لحاظ سے اس کی بلندی و دلکشی کا اندازہ کرنے کے لئے آپ اس کتاب کا دیباچہ ملاحظہ کیجئے:

"انقلاب کی گرج"

کیسا عجیب منظر ہے !

مشرق و مغرب، شمال و جنوب — چاروں طرف سے گرجتے چمکتے بادل ایک ساتھ امنڈتے آرہے ہیں۔

زندگی کی — شاہراہ دھوپ چھاؤں سے کھیلتی ہوئی دور افق تک لہراتی چلی گئی ہے —

وہ سامنے — "۵۵ برس" کا سنگِ میل دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے ۔—

اور اس کے قریب — انسانوں کا ایک کارواں !!

ان کے جسم پسینے سے شرابور ہیں، ان کے دماغ خستگی سے بوجھل ہیں، روئی اور سکوں سے لدی ہوئی خوبصورت گروزنی گاڑیوں کو کھینچتے ہوئے یہ لوگ بڑھتے جارہے ہیں، ہر قدم پر رکتے ہیں اور بوجھ میں اضافہ کرلیتے ہیں۔

ان کے لئے ایک پیغام لایا ہوں میں ! — ان کو پکارنا ہے مجھے !

زندگی کی ۵۵ کامیاب منزلیں عبور کرنے والے محترم انسانو ! — ادھر دیکھئے ! — میری آواز سن رہے ہیں آپ؟

میں کچھ کہہ رہا ہوں آپ سے !

ایک عجیب خبر لیکر آیا ہوں میں آپ کے لئے — اس قدر عجیب ہے یہ خبر کہ اخباروں کے صفحات پر آ ہی نہیں سکتی۔ اخبار صرف واقعات کی اطلاع دیتے ہیں، میری خبر کوئی واقعہ نہیں۔ میری خبر ایک احساس ہے ایک شعور ہے۔ وقت کی رفتار اور زندگی کے رجحان کا ایک احساس — یہ خبر مجھے مُردہ صدیوں نے اٹیم بم کے دھماکے کی زبانی سنائی تھی۔ سمجھے آپ؟

سنئے ! — زندگی میں چاروں طرف ایک عجیب نئی سی بات چپکے چپکے پیدا ہوتی جارہی ہے۔ آسمانوں میں خاموش ستارے دبے پاؤں راستے بدل رہے ہیں۔ زمین کے ذرّے اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے ایک نئی زمین بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ صدیاں مر رہی ہیں۔ صدیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

کچھ معلوم ہے آپ کو کہ آپ کے آگے پیچھے دونوں طرف پوری دُنیا بدل چکی ہے۔ "۵۵ سال" کا سنگ میل تو وہ سامنے نظر آرہا ہے آپ کو — اس کے اُس پار جو کچھ کبھی تھا وہ بہت کچھ اب کچھ نہیں رہا۔

۵۵ سال کے بعد ؟

موت ؟

شاید !

بوڑھاپا ؟ — انحطاط ؟ — تاریکی ؟

نہیں ! — نہیں ! — یہ کچھ نہیں !

آنے کو موت کب نہیں آسکتی — بچپن میں — جوانی میں — جوانی کے بعد — عمر کے دس برس بعد — ۲۵ برس بعد — ۵۵ برس بعد — موت کا دروازہ ہر منزل پر کھلا ہے ۔ زندگی ایک قانون ہے — موت ایک حادثہ — قانون حادثہ کو نہیں روک سکتا — لیکن بوڑھاپا — انحطاط — تاریکی ؟ ؟ ؟

اب ۵۵ سال کے بعد ان کا کوئی وجود نہیں رہا ۔ زندگی کی شاہراہ پر سنگ میل ۵۰ کے بعد سے آپ کے سفر کا بہترین حصّہ شروع ہو چکا ہے ۔ میں اس کو زندگی کے "بہترین سال" کہتا ہوں ۔

ہندسوں نے آپ کو اتنا بڑا دھوکا کہیں نہیں دیا جتنا کہ سالگرہوں کی گنتی میں — "یہ گنتی جس قدر بڑھتی جاتی ہے بوڑھاپا قریب آتا جاتا ہے" — علم حساب کا سب سے بڑا مغالطہ ہے یہ ! — کاش انسان اپنی عمر کا شمار ۔ ۔ ا کے ہندسے سے اُلٹی طرف کرتا !!

عمر کی نصف صدی تک جو زندگی آپ بسر کرتے آئے ہیں وہ آپ کی نہیں تھی ۔ دوسروں کی تھی ۔ پیچھے مڑ کر دیکھئے ! وہ بہت دور کُہرے کے دھندلکے میں " ۵۰ سال" کا جو سنگ میل جھلک رہا ہے بس اسی مقام سے آپ کی زندگی کی نئی سرحدیں شروع ہو چکی ہیں ۔ اب یہ زندگی خود آپ کی زندگی ہے ۔ خود اپنی زندگی جینے کی ہمت ہے آپ میں ؟ ۔ تو آئیے ! ختم کر دیجئے اب اس پُرانی معاشی جد و جہد کو — عمر کے بہترین سال آرہے ہیں ۔ چلئے اُن کا استقبال کریں !

مگر شاید کچھ پس و پیش ہے آپ کو ؟

کیا اس لئے کہ آپ کو روٹی اور سکّوں کا ڈر ہے ؟

کیا اس لئے کہ آپ مصروف ہیں ؟

کیا اس لئے کہ آپ ابھی دُنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں ؟

کیا اس لئے کہ آپ کو اپنی صحت سے اطمینان نہیں ؟

کیا اس لئے کہ آپ زندگی کے فرائض سے آزاد نہیں ؟

مگر یہ سب کچھ تو آپ کو حاصل ہے !

جانتے ہیں آپ کہ دُنیا بھر کے بنکوں میں جمع کی ہوئی دولت نصف سے بھی زیادہ صرف اُن لوگوں کی ملکیت ہے جن کی عمر ۵۰ سال سے آگے بڑھ چکی ہے ؟ ۔ معلوم ہے آپ کو کہ دنیا میں اپنے جائز حصہ سے کہیں زیادہ مشقت آپ کر چکے ہیں اور اب اس سے زیادہ مصروفیت اپنے لئے خودکشی اور دوسروں کے لئے حق تلفی ہوگی ؟ — رہا دنیا کو سمجھنا سیکھنا تو کیا آپ نے ابتک اتنا بھی نہیں سمجھا کہ معاشی زندگی کے ہنگامہ میں دُنیا کو کوئی بھی آج تک سمجھ اور سیکھ نہیں سکا ؟ — صحت میں بھی آپ محتاج نہیں ۔ روٹی اور سکّوں کی بھاری بھرکم گاڑی کو کھینچنے والا جسم و دماغ کبھی اپاہج نہیں ہو سکتا — اور آزادی ؟ —

آزادی تو ۵۰ سالہ خوش نصیب انسانوں سے زیادہ کسی بھی حیوان کو میسر نہیں۔ آپ کا خاندان جوان ہو کر اپنے اپنے زندگی کے راستوں پر اطمینان سے رواں دواں ہے — اور آپ آزاد۔

تو پھر آیئے ! — زندگی کے "بہترین سال" آپ کے منتظر ہیں۔

آپ تیار ہیں ؟ — معاشی مشقت !— خدا حافظ !!— رخصت !!

مگر ٹھہریئے !— پورا پیغام تو سنا ہی نہیں آپ نے۔

معاشی جد و جہد کی زندگی کو چھوڑ دینے کے بعد کیا کریں گے آپ ؟ ؟ — یقیناً وہی جو آپ نے اپنے سے پیشتر دوسروں کو کرتے دیکھا ہے۔ کاروباری زندگی سے دست بردار ہونے والے بوڑھے انسانوں کو آپ نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے۔ جوانی میں دیکھا ہے — دیکھا ہے۔ سنا ہے۔ سمجھا ہے۔ اس لئے زندگی کی "آخری بہاروں" کے متعلق آپ کے خیالات بالکل قدیم و فرسودہ ہیں۔ یہ خیالات آپ نے شاید چالیس۔ پچاس یا ساٹھ برس پہلے سیکھے تھے۔ یہ خیالات مُردہ ہیں۔ مُردے زندگی نہیں دے سکتے۔ ان سب خیالات کو عمر کے پچاسویں سنگ میل کی جڑ میں دفن کر دیجئے۔ اسقدر ہمت رکھتے ہیں آپ ؟ ؟

اچھا تو اس کتاب کو پڑھئے جو میرا پیغام ہے۔

یہ کتاب تمام و کمال آیندہ جولائی ۱۹۵۸ء کے نگار میں تقریباً ۱۰۰ صفحات پر شایع ہو رہی ہے

پہلی فرصت میں اپنا چندہ معہ مصارف جسٹری ۷/۵ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمایئے، اور اپنے احباب سے بھی ذکر کر کے ان کو نگار کی خریداری کی طرف مایل کیجئے تاکہ وہ یہ کتاب مُفت حاصل کر سکیں۔ غیر خریداران نگار کیلئے قیمت ڈیڑھ روپیہ اور ایجنٹ صاحبان سے ۱۲/ یہ پرچہ دوبارہ مُفت روانہ نہ ہوگا اسلئے ۸/ کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیجدیجئے۔ مینجر

پاکستان کے خریدار نگار اور ایجنٹ صاحبان

ازراہ کرم اپنا چندہ اور مطالبہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے کسی پتہ پر روانہ فرما کر ہم کو براہ راست اطلاع دیدیں۔ کتابوں کی خریداری بھی اسی طریقہ سے ہو سکتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۲۲ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی - ۲۔ حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور

داہنی طرف صلیبی نشان اس بات کی
علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

جدید قواعد ڈاک کی رو سے
سیروی پی میں اب ڈیڑھ آنہ زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے اسلئے آئندہ نگار کا
وی پی ۸/۱۴ روپے میں جائیگا چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپکی ۶ کی بچت ہوگی۔

جلد ۵۹ | فہرست مضامین جون ۱۹۵۱ء | شمارہ ۶

ملاحظات

موجودہ بساط سیاست کا ایک اہم مہرا

اس وقت بساطِ سیاست پر ایران نے ایک نہایت اہم مُہرے کی حیثیت اختیار کرلی ہے جس کا سبب اس کی جغرافیائی اہمیت، وہاں کی اقتصادی امکانات اور حکومت کی کمزوری ہے۔

یوں تو ایران صدیوں سے ادبار و تنزل کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور اگر وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود نہیں ہوا تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ خود اس میں زندہ رہنے کی کوئی صلاحیت پائی جاتی ہے بلکہ اس کا سبب صرف روس و برطانیہ کی باہمی رقابت تھی، جو اس نیم بسمل شکار کو اسی حالت میں رکھنا چاہتے تھے اور پوری طرح کسی ایک کا قبضہ گوارا نہ کرسکتے تھے۔ لیکن اس صدی میں ۱۹۰۷ء خصوصیت کے ساتھ ایران کیلئے بڑا نامبارک سال ثابت ہوا جب روس و برطانیہ نے یہ طے کرکے کہ ایران کے شمالی حصہ پر روس کا اقتدار رہے گا اور جنوبی حصہ پر برطانیہ کا، اسکے مستقبل پر مُہر لگادی اور اسے بے دست و پا کردیا۔ یہ دوعملی اس کے لئے اور زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی اور آخرکار انتہائی اقتصادی بدحالی نے وہاں کی پبلک کو مجبور کردیا کہ وہ حکومت سے بے نیاز ہوکر خود ہی زندگی کی کوئی صورت پیدا کریں اور انھوں نے پٹرول کے ذخایر کو جو ایران کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، برطانیہ کے قبضہ سے نکال کر، قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

ایرانی پٹرول پر برطانیہ کا قبضہ موجودہ سرمایہ دار ملکوں کے مکر و فریب کی بڑی عجیب و غریب مثال ہے۔ زمین ایران کی، پٹرول چشمے ایران کے، مزدور ایران کے، لیکن نفع تقریباً سب کا سب برطانیہ کا! ہرچند حسب قرارداد نفع کا ایک حصہ ایران کو دیا جاتا ہے، لیکن اول تو وہ بہت کم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ نفع کی تعیین یا جانچ کا ایران کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ حساب کے کاغذات بھی نہیں دیکھ سکتا۔ الغرض برطانیہ جو کچھ ایران کے ساتھ کررہا ہے وہ وہی ہے جو ایک نہایت طامع و حریص قسم کا بقال کرسکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایران کی رعایا نے جو فیصلہ اس وقت کیا ہے وہ اس سے بہت قبل کرنا چاہئے تھا اور اس کو اس فیصلہ پر مضبوطی کے ساتھ قایم رہنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا برطانیہ آسانی کے ساتھ ایران کے تمام مطالبات کو تسلیم کرے گا۔ یقیناً نہیں۔ اول تو وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ یہ تحریک ہی کسی طرح ختم ہو جائے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس نفع کی مقدار کو بھی بڑھا دے جو اس سے قبل ایران کو ادا کیا جاتا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حسابات کی جانچ کی بھی ایران کو اجازت دیدے اور مزدوروں کو خاموش کرنے کے لئے ان کی اجرت میں بھی اضافہ کردے اور اگر ان میں اس کو کامیابی کی امید نہ ہوئی تو کسی ثالث کو درمیان ڈال کر کسی نہ کسی طرح ایران کو راضی کرے یا ان تمام تدابیر کے بیکار ثابت ہونے کے بعد قوت سے کام لے۔ اور یہی وہ آخری صورت ہے جس کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ عجب نہیں ایران بھی دوسرا کوریا ثابت ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تشبیہ صحیح نہیں، کیونکہ کوریا کی جنگ اس وقت تک مقامی حیثیت سے آگے نہ بڑھے گی جب تک روس اس میں حصہ نہ لے اور روس اس وقت یہاں کیا کہیں بھی اپنی خوشی سے لڑائی مول لینے کے لئے طیار نہیں، لیکن اگر ایران کے مسئلہ میں برطانیہ نے فوجی قوت سے کام لیا تو روس خاموش بیٹھا نہ رہے گا اور اس طرح ایران کی جنگ کا ایک عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کر لینا بالکل ناگزیر ہے۔

روس، ایران کے معاملہ میں کیوں خاموش نہ رہے گا، اس کے متعدد اسباب ہیں، جن کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔

یہ تو روس بھی اپنی جگہ پورا یقین رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی دن اس کو لڑائی کی آگ میں کودنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ لڑائی اس کی آخری لڑائی ہوگی جس میں اگر وہ کامیاب نہ ہوا تو اسے ہمیشہ کے لئے ختم ہونا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اتنے بڑے خطرہ کو اس وقت تک مول نہیں لے سکتا جب تک وہ پوری طرح اس کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار نہ ہو اور اسی طیاری کے سلسلہ میں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایران کے مسئلہ میں خاموش نہ بیٹھا رہے اور اسی لئے ایران کے جھگڑے کا عالمگیر جنگ میں تبدیل ہو جانا مستبعد نہیں۔

آیئے اس جگہ اس پر غور کریں کہ ایران کے مسئلہ میں روس کیوں دخل دینے پر مجبور ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ روس کی جغرافی پوزیشن اور اس کی موجودہ قوت کو سامنے رکھیں۔

اس وقت جنگ کی کامیابی کا انحصار تین قوتوں پر ہے۔ بحری، بری، ہوائی اور جب تک یہ تینوں قوتیں متوازن نہ ہوں کوئی ملک لڑائی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ روس اس میں شک نہیں اپنی بری قوت کے لحاظ سے سارے یورپ و امریکہ پر حاوی ہے۔ اسوقت اس کی مسلح سپاہ کا اندازہ ۲۰۰ ڈویژن کیا جاتا ہے جو ۳۰ ہزار ٹینکوں سے آراستہ ہے اور اس کے مقابلہ میں یورپی محاذ پر زیادہ سے زیادہ ۲۰ ڈویژن فوج کو لایا جا سکتا ہے۔ الغرض روس اپنی بری قوت کی طرف سے بالکل مطمئن ہے۔ فضائی قوت کی طرف سے بھی وہ غیر مطمئن نہیں کیونکہ امریکہ کے بعد سب سے زیادہ ہوائی جہاز اسی کے پاس ہیں، لیکن بحری قوت اس کی بہت کمزور ہے۔ روس کا نقشہ دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے پاس سمندر کوئی نہیں ہے۔ بحر اسود اور بحر کاسپین اندرون ملک کی صرف دو جھیلیں ہیں جن کا تعلق کسی سمندر سے نہیں ہے اس لئے وہاں بحری قوت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، ایشیا میں کوئی قابل ذکر ساحل اس کے قبضہ میں نہیں ہے اور اگر منچوریا کو اس کے زیر اثر سمجھ لیا جائے تو یہاں بحر جاپان ہے جس پر امریکہ و جاپان نے زبردست قبضہ جما رکھا ہے۔ لے دیکے صرف بحیرۂ بالٹک رہجاتا ہے جہاں سے اس کے جہاز گزر کر بحر اٹلانٹک میں آسکتے ہیں لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ اول تو وہ سال میں ۶ مہینے برفباری کی وجہ سے منجمد ناقابل گزر رہتا ہے، دوسرے یہ کہ سویڈن اور ناروے اس کے راستہ میں حایل ہوتے ہیں اور تیسرے یہ کہ اگر بحر بالٹک سے گزر کر وہ کسی طرح بحر اٹلانٹک میں پہونچ بھی جائے تو بیکار ہے کیونکہ وہاں پہلے ہی سے یورپ و امریکہ کی بڑی زبردست بحری قوت موجود ہے۔

روس کے لئے عرصہ دراز سے بحری قوت کا مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی بحری قوت بڑھانے میں صرف اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے کہ کسی طرح خلیج فارس اور بحیرۂ عرب پر اس کا اقتدار قایم ہو جائے اور اس کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ پہلے ایران کو اپنا طرفدار بنائے یا اس پر قبضہ کرے۔ اس اسکیم کی کامیابی سے اور بھی چند در چند فوائد اس کو حاصل ہو سکتے ہیں مثلاً ایک

یہ کہ وہ اس طرح نہ صرف ایران کے پٹرولی ذخایر پر قابض ہوجائے گا بلکہ براہ خلیج فارس، عراق و شام بلکہ ترکی پر بھی دباؤ ڈال سکے گا جو مشرق ادنیٰ میں اس کا سب سے بڑا حریف ہے اور بحر اسود سے بحیرۂ روم تک جانے کا راستہ اس کو مل جائے گا۔

روس کو ایران کی طرف اپنی کامیابی کا زیادہ یقین اس لئے بھی ہے کہ اسے اس مہم میں صرف بری و فضائی فوج سے کام لینا پڑے گا اور بحری قوت سے کام لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ روس سے ایران، ایران سے افغانستان اور افغانستان سے پاکستان و ہندوستان تک سارا راستہ خشکی کا ہے جس پر وہ آسانی سے اپنی بے شمار سپاہ کو آگے بڑھا سکتا ہے اور ان تمام ملکوں پر دباؤ ڈالکر یا انقلاب پیدا کرکے پورے ایشیاء کو اشتراکی اثرات سے متاثر کرسکتا ہے۔ الغرض ایران کا معاملہ کوریا سے بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے اور یہاں کی بے چینی سے روس کا فایدہ اُٹھانا اس کی دیرینہ تمنا ہے یہاں تک کہ اگر عالمگیر جنگ کی بنیاد کسی اور جگہ پڑی تو بھی روس ضرور ایران کی طرف بڑھیگا کیونکہ ساری دُنیا میں یہی ایک محاذ ایسا ہے جہاں وہ پوری کامیابی کے ساتھ فریق ثانی کو زک پہونچا سکتا ہے اور اسی لئے وہ ایران کی پالیسی کا ہمیشہ نہایت غور سے مطالعہ کرتا چلا آیا ہے اور اب کہ تُودا اشتراکی جماعت وہاں برسر اقتدار ہے اس کو اپنے اثرات سے کام لینے کا پورا موقعہ مل گیا ہے۔ چنانچہ آذربیجان میں قیام جمہوریت کا تقاضہ، تُودا پارٹی کا ایرانی پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کا مطالبہ اور اسی کے ساتھ اُس کا ایران کو ہر قسم کی اقتصادی امداد پہونچانے کا وعدہ کرلینا، روس کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ روس، ایران کو ہموار کرنے کے لئے جن جن طریقوں سے کام لے رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب شاہ ایران حال ہی میں امریکہ گئے اور غذائی سامان کی فراہمی کی خواہش پر امریکہ نے خشک سا جواب دیا تو روس نے فوراً اس موقعہ سے فایدہ اُٹھاکر ایران سے کہدیا کہ وہ ہر قسم کا غذائی سامان فراہم کرنے کے لئے تیار ہے جس کا اثر ایران کی رعایا پر قدرتاً اچھا پڑنا چاہئے تھا۔ اس سے قبل جب ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک آذربیجان پر روس قابض رہچکا تھا تو اس نے اپنے طرزِ عمل سے وہاں کے لوگوں کا دل موہ لیا تھا۔ اس نے وہاں کثرت سے مدارس و شفاخانے قایم کئے، سڑکیں بنوائیں، بجلی فراہم کی اور اس کے باوجود جب ایران نے روس سے اصرار کیا کہ وہ آذربیجان خالی کردے تو اس نے مطلق کوئی عذر نہ کیا۔ روس کے اس طرزِ عمل سے وہاں کے لوگ بہت متاثر ہیں اور انھیں یقین ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح روس ان کو لوٹنا نہیں چاہتا بلکہ واقعی ان کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس کا قدرتی نتیجہ ظاہر ہے کہ جب روس اور برطانیہ میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے پر ایران مجبور ہوگا تو وہ یقیناً روس کو ترجیح دے گا۔

اس میں شک نہیں کہ روس کو دوسری قوموں اور ملکوں کے آرام کرنے کا بڑا سلیقہ حاصل ہے، وہ اس فن کا ماہر ہے۔ وہ جس ملک پر تسلط قایم کرنا چاہتا ہے، اسے وہ تیغ و تفنگ کی مدد سے مغلوب نہیں کرتا، بلکہ اپنے اخلاق، اپنے اطوار و کردار سے متاثر کرتا ہے اور یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہی نہیں ہونے دیتا کہ اس کا نقطۂ نظر ملک گیری یا دوسری قوموں سے ناجائز فایدہ اُٹھانا ہے۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ یہ پالیسی وہ کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتا، وہ اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے لئے فوجی قوت بھی استعمال کرسکتا ہے اور ایران جغرافی، اقتصادی اور سیاسی ہر حیثیت سے اس مقصد کی تکمیل کا بڑا اہم ذریعہ ہے۔

وہ ایران کو مفتوح کرنا نہیں چاہتا، وہ اکاسرۂ عجم کی اس قدیم یادگار کو بدستور قایم رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ جس طرح چین پر اس کا اثر قایم ہوا ہے اسی طرح ایران پر بھی ہوجائے، جس میں وہ اس وقت تک اس لئے کامیاب نہیں ہوسکا کہ برما، ملایا، شمالی کوریا اور چین کی طرح ایران میں کوئی زبردست انقلاب پسند لیڈر اسے نہیں مل سکا اور خود ایران کی متزلزل پالیسی بھی اس دوران میں غیر یقینی رہی ہے۔ لیکن اب حالات بدل رہے ہیں۔ یعنی ایک طرف جمہوریت کا صحیح احساس بھی پیدا ہوا ہے اور دوسری طرف ایران نے روس کے ساتھ تجارتی معاہدہ بھی کرلیا ہے۔ تودا پارٹی کے دس بڑے بڑے لیڈر جیل سے باہر آگئے ہیں اور ایرانی مجلس نے پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کرکے وہاں کی سیاسیات کو بالکل بدل دیا ہے، چنانچہ اب وہاں یہ حالت ہے کہ ریڈیو طہران سے امریکہ کی نشریات تقریباً بند ہوگئی ہیں اور برطانیہ کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے، جس کی ذمہ داری خود

برطانیہ پر ہے اور ایک حد تک امریکہ پر بھی جو ایران کے مسئلہ پر برطانیہ کا زیادہ ساتھ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔
امریکہ کی بے توجہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ مارشل پلان کے تحت وہ چاروں طرف دولت کی بکھیر کر رہا تھا ایران کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا اور جب ایران نے اس سے غذائی اشیاء کی فراہمی کی درخواست کی تو اسے بھی رد کر دیا۔ اکتوبر میں ۲۵ ملین ڈالر کا قرض ایران کو دینا ضرور امریکہ نے منظور کر لیا تھا لیکن یہ بھی اسے اب تک نہیں مل سکا۔ امریکہ کی بے اعتنائی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ ایران کے مسئلہ کو غیر اہم سمجھتا ہے، بلکہ زیادہ قرینہ ہے کہ وہ مغربی یوروپ کو زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اپنی پوری توجہ اسی طرف صرف کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر ایران کے مسئلہ میں اس نے برطانیہ کی طرفداری کی تو اس کا فایدہ صرف برطانیہ کو پہونچے گا اور وہ دوسروں کے لئے خواہ برطانیہ ہی کیوں نہ ہو کوئی بڑی قربانی نہیں کر سکتا۔

خود برطانیہ کی پالیسی ایران کے باب میں حد درجہ خود غرضانہ رہی ہے۔ ایران کے وجود کو وہ صرف پٹرول کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس سے ہٹ کر اسے کوئی ہمدردی ایران سے نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ ایران ہمیشہ تباہ و برباد رہے کیونکہ وہاں کے پٹرول پر اس کا قبضہ اسی وقت زیادہ مستحکم رہ سکتا ہے جب ایران اقتصادی حیثیت سے اس کا دست نگر رہے اور پٹرول کی کمائی سے جو قلیل نفع اسے ملتا ہے اس کو غنیمت سمجھتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اپنی اس پالیسی میں عرصہ تک کامیاب رہا لیکن کب تک، آخر کار وہ وقت آ گیا کہ وہاں اقتصادی بدحالی ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی اور وہاں کی رعایا میں گریبان پھاڑ کر باہر آجانے کا جذبہ قوی ہو گیا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ اگر ایران کا مسئلہ یوں آسانی سے طے نہ ہوا اور لڑائی چھڑ گئی تو اس کا اثر ہندوستان و پاکستان پر کیا ہوگا۔ اگر برطانیہ نے سرزمین ایران پر فوجیں اُتار دیں تو ایران خاموش نہ رہے گا، یقیناً وہ روس کی مدد چاہے گا اور روس کے لئے بہت آسان ہوگا کہ وہ اپنی ٹڈی دل فوجیں اس طرف روانہ کر دے۔ اس وقت برطانیہ مجبور ہوگا کہ افغانستان پاکستان اور ہندوستان تینوں کا تعاون حاصل کرے اور ان کو اپنا فوجی مرکز بنا کر روس کا مقابلہ کرے، لیکن جس حد تک افغانستان کا تعلق ہے وہ اس کارروائی سے پہلے ہی یا تو روس کا طرفدار ہو جائے گا یا فنا ہو چکا ہوگا۔ پاکستان البتہ برطانیہ کا ساتھ دے گا، لیکن برطانیہ اس سے اسی وقت پورا فایدہ اُٹھا سکے گا جب ہندوستان بھی اس کا شریک ہو لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس کا بہت کم یقین ہے کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دے سکے گا، کیونکہ یہاں کی اقتصادی حالت بہت نازک ہے اور اشتراکی اثرات جو بہ نسبت پاکستان کے یہاں بہت زیادہ ہیں، روس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات یہاں بہت آسانی کے ساتھ اُبھار سکتے ہیں۔

الغرض ایران کا مسئلہ بہت نازک ہوتا جا رہا ہے اور اگر یہ آسانی سے طے نہ ہوا اور برطانیہ کو اس سلسلہ میں فوجی اقدام کرنا پڑے گا، تو تیسری عالمگیر جنگ کا چھڑ جانا لازم ہے اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ نوع انسانی کا کیا حشر ہونا ہے۔

اُردو ادب فساد میں

فنکار زندگی کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے تاریخی ماحول سے دور نہیں جا سکتا۔ اس کی ہر تخلیق سماجی حالات کی سچی تصویر ہوتی ہے اس لئے کہ فنکار کوئی جوگی نہیں ہوتا کہ اس کی تخلیق اس کی تپسیا کی وجہ سے وجود میں آتی ہو۔ ادب کوئی مافوق الفطرت شے نہیں، اس کا راہ راست زندگی سے تعلق ہے اور وہ زندگی اور انسانیت کا صرف عکاس نہیں اس کا نقاد بھی ہے۔ وہ جمود کو توڑتا ہے، زندگی کو جدوجہد اور تڑپ دیتا ہے۔ اس کی چڑھی ہوئی کمان سے ایسے تیر چلتے ہیں جو سکون کو ستاتے اور جمود کے جگر کو پاش پاش کر دیتے ہیں، اس سے انسانیت کی تاریکی دور ہوتی ہے، وہ زندگی کے ساتھ دوڑتا ہے اور اس دوڑ میں اُسے بہت سے نشیب و فراز ملتے ہیں، وہ دوڑتا رہتا ہے، زندگی کے ساتھ، ایک مستقل بہاؤ کے ساتھ، زندگی اور انسانیت کی عکاسی اور تنقید کے بعد وہ ان کی راہنمائی بھی کرتا ہے۔ انھیں تباہی کے گرداب سے بھی نکالتا ہے ـــــ اس کا مقصد اجتماعی ہے ـــــ مختصر یہ کہ وہ ان خیالات اور جذبات کا ترجمان ہے جو انسانیت کو مفید راہ پر گامزن کرتے ہیں۔

ہمیں اس وقت زندگی کا ایک نظام گھٹتا اور ایک اُبھرتا نظر آ رہا ہے، یا یوں کہئے کہ دوسرا نظام یہ بالکل اُبھر چکا ہے اشتراکیت نے روس اور چین میں ایک نئی دنیا پیدا کر دی ہے اور دنیا کے دوسرے گوشے انھیں دیکھ کر اپنے سینے سے بھی لگانے کے لئے بے چین ہیں۔ ـــــ

ـــــ انھیں اشتراکیت اسی مادی دنیا کا نظام معلوم ہوتی ہے، بہت ہی وسیع اور حسین نظام جس کی کشش ہماری زندگی کو اس کی طرف کھینچ رہی ہے، کروڑوں فاقہ کشوں اور بے گناہوں نے اس کا انتظار کیا ہے، وہ نظام ایک ایسی زندگی کا مطالبہ کر رہا ہے جس میں دنیا کے سارے انسانوں کے لئے برابر آسانیاں ہوں، ذاتی ملکیت کا کوئی سوال نہ ہو، فرقہ بندی نہ ہو، نفاق نہ ہو انسان ہوں اور زندگی ہو!

اور ایسی فضا میں سانس لینے والا فنکار یقیناً اپنے فن کو اُن جذبات اور خیالات کا ترجمان بنائے گا جن سے انسانیت کو نئے اقدار ملتے ہوں وہ اپنی داخلی دنیا میں سمٹ جانا ہرگز نہ چاہے گا، وہ خارجی دنیا میں اجتماعی تعلقات کو حسن دینے کے لئے داخلیت کے اندھیرے سے نکل آئے گا اُس کی تخلیق میں مقصد ہوگا، وہ حیات کی تخلیق کرے گا، پھر مریضانہ انفرادیت پرستی ختم ہو جائے گی اور ییلمرعتینا Barren Literature اپنی تمام ویرانیوں کے ساتھ سمٹ جائے گا، اشتراکی حقیقت نگاری کے سامنے لاشعور، روح اور جنسی و مذہبی جذبے کو حقیقت بتانے والے اپنے ہنگاموں میں گم ہو جائیں گے اس لئے کہ ادب تفریح کی شے نہیں رہ جائے گا بلکہ اجتماعی زندگی کے حسین ابھری لکیروں اور صحت مند عناصر کا عکاس ہوگا، غرض زندگی اور ادب کا تعلق بڑا گہرا ہے اور زندگی کی تلاش میں ادب نہ تو ستاروں کی دنیا میں جاتا ہے اور نہ پاتال میں، وہ اسی دھرتی پر رہتا ہے اس لئے کہ اسی دھڑکتی ہوئی دھرتی پر زندگی ناچتی، دوڑتی اور تھرکتی ہے۔

چونکہ فنکار کی تخلیق میں صرف داخلی زندگی کی لکیریں تڑپتی نظر آتی ہیں بلکہ اس میں انسانیت کا دل بھی دھڑکتا ہے اس لئے سماج سے اس کا تعلق اس کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیتا ہے اور اسی وسعت کی وجہ سے فنکار سیاست سے علٰحدہ نہیں ہو سکتا، سیاست سے الگ ہونا سماجی تعلقات سے علٰحدہ ہونا ہے اور فسطائی قوتوں کو ابھرنے اور پھیلنے میں ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ادب کو سیاست سے الگ دیکھنا چاہتے ہیں لاشعور کے دل سے ابھی تک باہر نہیں آ سکے ہیں، غلامی کی زنجیر اُن کے جسم سے لپٹ کر رہ گئی ہے، وہ احساس کمتری، روحانیت اور مریض رومانیت کو اس دور میں بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتے، ادب کی نبضوں میں سیاست کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہوئے انھیں خطرہ معلوم ہوتا

ہے اس لئے کہ وہ جاگیردارانہ نظام سے اپنی زندگی وابستہ کر چکے ہیں۔ تاریکی میں زندگی گزار دینے کے بعد نئی سیاست کی تیز روشنی انھیں کیسی بھلی معلوم ہو؟ ان کی زندگی فرسودہ نظام زندگی کی غلیظ سیاست میں اُلجھ کر رہ گئی ہے، وہ اپنے گندے نظام کو پیار کرتے ہیں اور اسی پیار کا نتیجہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ فنکار کے پیش کردہ نئے عناصر میں سیاسی عناصر زندگی پیدا کر دیتے ہیں، اقتصادیات اور سیاست کا تعلق بھی بہت ہی گہرا ہے۔ فنکار بین الاقوامی سیاست سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا، وہ ادب کو سیاست سے علیٰحدہ کر دینے کا نعرہ بلند کرتے ہیں — اور میرے خیال میں یہ نعرہ صرف اس لئے ہے کہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے فرسودہ عناصر کی پردہ پوشی ہو اور اشتراکی حقیقت نگاری کی کمان سے چلے ہوئے تیر اُن عناصر کے جگر میں پیوست نہ ہو جائیں جنھیں وہ پیار کرتے ہیں اس لئے کہ ان سے ابھی تک ان کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، اگر فنکار کے دل میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کے نشانات بھی ہوں تو وہ اپنے دامن کو سیاست سے نہیں بچا سکتا۔ خارجی زندگی میں اُبل آنے کے بعد اُسے حقیقت داخلی نہیں بلکہ خارجی نظر آئے گی، وہ دُنیا کی تاریکی دیکھ کر ستاروں کے مدھم روشنی میں جذب ہونے کی کوشش نہ کرے گا، بلکہ اس تاریکی کو دور کرنے کے لئے اپنی تخلیق سے کام لے گا اس لئے کہ ادب زندگی میں آہنگ پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے احوال کے انداز بدل جاتے ہیں، اس سے دنیا بدل جاتی ہے۔

اگر ادب اور زندگی کا ساتھ چولی اور دامن کا ہے اور زندگی کا تعلق حکومت سے ہے تو پھر ادب اور حکومت کے تعلق کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ ادیب سیاست کے اُن عناصر کو اپنے یہاں کیوں جگہ نہ دیں جن سے عوام کی زندگی میں آہنگ پیدا ہو جائے اور انسانیت کے بکھرے ہوئے شیرازوں کا ایک سنگم بن جائے؟ ادب سیاست کے اُن عناصر کا عکاس کیوں نہ ہو جن سے جنتا کی زندگی اور موت وابستہ ہے؟ انفرادیت کی کشتی سمندر کے طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ ادیب یقیناً زندگی کو مہمل جھنکاریں دے گا جو اپنے ماحول کی ترجمانی سے گریز کرے گا۔ آج زندگی اودے شنکر کا اساطیری ناچ اور گوتم یا گاندھی کا مجسمہ نہیں، یا اس کا دائرہ رومان اور جنس تک محدود نہیں ہو سکتا۔ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے جیسے کہ جسم میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، دو عناصر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں اور تیسری چیز وجود میں آ جاتی ہے اس تیسرے عنصر سے دوسرا عنصر جنگ کرتا ہے، کشاکش ہوتی ہے اور پھر ایک تضاد جنم لیتا ہے اسی طرح ایک نظام کے بعد دوسرا نظام عالم وجود میں آتا رہتا ہے اور ہر نظام زندگی کو کچھ نئے انداز بخش دیتا ہے، زندگی حسین ہوتی جاتی ہے اور اس طرح مستقبل سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ نظام زندگی میں ہمیشہ تغیر اور انقلاب آتے رہتے ہیں، تغیر، تبدیلی اور انقلاب کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، نئی چیزیں ہمیشہ ابھرتی اور بڑھتی رہتی ہیں اور تاریک لکیریں ٹوٹتی، بکھرتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں اُبھرتے ہوئے عناصر اور پگھلتے ہوئے عناصر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں، اُبھرتے ہوئے نقوش اُبھر کر رہتے ہیں اور ——— پُرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں لے لیتی ہیں اور اس طرح زندگی کے پردہ پر حسین نغمے اُبھرتے رہتے ہیں (اس کے ساتھ یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ زندگی کو ہر نظام سے صرف عناصر ہی نہیں ملتے یا سماجی زندگی صرف خوبصورت راہوں سے ہو کر چلتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام نے جو تاریک اشارے جنم دئے ہیں اسے تاریخ انسانی فراموش کب کر سکتی ہے؟) ہماری زندگی میں وسعت ہے، حسن ہے اور آہنگ ہے، مارکس (Marx) نے اپنی زندگی کو گہرائیاں، نئی گونجیں اور نئے انداز دئے ہیں۔ ہیگل (Hegel) نے کہا تھا کہ دُنیا کی ہر چیز اپنی ضد پر قایم ہے، زندگی کا ارتقا اضداد ہی کی جنگ پر منحصر کرتا ہے۔ ہیگل کے فلسفۂ اضداد (Thesis opp) میں جو سب سے بڑی خامی تھی وہ یہ کہ اس نے یہاں صرف تصور جدلیاتی عمل (Dialectic Process) سے متاثر ہوتا ہے، تصور اور فکر (Ideas & Thoughts) کی کائنات سے آگے اضداد کی کوئی جگہ نہیں۔ دُنیا میں انقلاب آتے رہتے ہیں اور ان انقلابات کی وجہ تصورات (Ideas) کی جنگ ہے کائنات میں رونق پیدا کرنے کے لئے تصور اپنا حریف مقابل بناتا ہے تاکہ اس سے آمادہ پیکار رہ کر اپنے ذوق جدوجہد کی تسکین کر سکے، دُنیا میں رونق صرف تصورات کی جدوجہد اور ان کے آپس کی کشاکش سے ہوتی ہے۔ ہر تصور کی ایک ضد پیدا ہو جاتی ہے،

دونوں کی جنگ ایک نئے تصور کو جنم دیتی ہے جس سے پہلے تصور کا حسن جاتا رہتا ہے۔ ہر تصور میں کچھ نہ کچھ خامی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ نئے تصور کی تخلیق ہوتی رہتی ہے، ہیگل (Hegel) کے نزدیک دُنیا میں مادہ کی کوئی خاص جگہ نہیں۔ مادہ بھی تصور ہی کا غلام ہے۔

کارل مارکس (Karl Marx) ہیگل کی طرح خارجی دنیا کو تصور اور فکر کی تصویر نہیں سمجھتا۔ جنگ اضداد کا وہ بھی قایل ہے لیکن تصورات کی دنیا سے الگ ایک ٹھوس مادی دنیا میں اس جنگ کو قبول کرتا ہے۔ وہ داخلی دُنیا میں فکر اور تصورات سے اُلجھنا پسند نہیں کرتا، خارجی دُنیا ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ وہ تصور کو نہیں مادہ (Matter) کو کائنات کی بنیاد سمجھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ مادہ (Matter) سے تصور کا جنم ہوتا ہے یعنی مارکس نے ہیگل کے جدلی تصور (Dialectical Idealism) کو جدلی مادیت (Dialectical Materialism) سے بدل دیا۔ جنگیں تصورات کی نہیں نظام کی ہوتی ہیں۔ کائنات کو حُسن دینے کے لئے ایک معاشی نظام کے سامنے دوسرا معاشی نظام آجاتا ہے تاکہ ایک کشاکش پیدا ہو سکے اور دونوں کی کشاکش اور تصادم سے تیسرا معاشی نظام پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح زندگی میں ہمیشہ انقلابات آتے رہتے ہیں۔ ان انقلابات کی وجہ صرف (Historical Materialism) اور کچھ نہیں۔ لینن نے ایک جگہ مارکس کے نظریہ مادیت کو یوں صاف کر دیا ہے:-

The world picture is a picture how matter moves and how matter thinks

(Lenin)

ہیگل کا تصورِ جدلیات کائنات اور اس کے قانون کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے برعکس، مارکس کا خیال ہے کہ کائنات اور اسکا قانون کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ مارکس فضاؤں میں پرواز نہیں کرتا، اسکی آواز کائنات کی آواز ہے، ہم اس کی آواز کی تھرتھراہٹ، موسیقی اور آہنگ کو محسوس کرتے ہیں۔

نئی سماجی زندگی کو نئی قدروں کو اُردو ادب نے اپنے سینے سے لگایا ہے۔ زندگی اپنے دور کے معاشی نظام پر کھڑی ہوتی ہے کسی دور کے معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا اندازہ اُسی دور کے معاشی نظام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ معاشی نظام سے جب زندگی الگ نہیں ہو سکتی تو وہ ادب کیونکر دور ہو سکتا ہے جو اس زندگی کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے؟ اس طرح معاشی نظام کی سیاست بھی ادب سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ ادب کو نئی گونجیں عطا کرتی رہے گی!

جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے سیاست سے ہمیشہ وابستہ رہا ہے۔ سیاسی عناصر صاف بھی نظر آئے ہیں اور بعض وقت جھلکتے بھی رہے ہیں لیکن کسی نہ کسی صورت میں اُردو ادب سے ان کا تعلق رہا ہے۔ اُردو شعرا کے کلام کے تجزیے میں ایسے عناصر بھی ملتے ہیں جن میں زندگی کی تڑپ ہے، جو زندگی کے ہر رُخ کو سمجھنے اور اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت جبکہ سیاست اور ادب کا تعلق بہت ہی گہرا ہو گیا ہے، ادب کو سیاست سے آزاد کرنے کا مطالبہ بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ سرمایہ داری ختم ہو رہی ہے، اشتراکیت سماج کو لیکر ایک نیا جہان بنانے کی خاطر آگے بڑھ رہی ہے، سماج کی طبقاتی تقسیم ختم ہو رہی ہے اور اشتراکی سماج کی تعمیر کا خواب عوام دیکھ رہے ہیں، سیاسی ماحول سے دور رہ کر ادیب کس زندگی کی عکاسی کرے گا؟ اس کی کسی تخلیق میں اس طرح کوئی حُسن بھی پیدا ہو سکے گا؟ ماحول کی ان نئی قدروں سے دور جانے والوں کو مستقبل اسی طرح بھول جائے گا جس طرح زار شاہی ماحول کے اُن فنکاروں کو بھول گیا جنھوں نے آنے والی سوسائٹی کے خلاف آواز بلند کی تھی اور شہنشاہیت کو سراہا تھا۔ میکسیم گورکی (Maxim Gorki) نے نئے نظام کو سلام کیا تھا اور اسی نظام کی ترقی کا ہمیشہ خواہاں رہا اس لئے وہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

غرض عصری ماحول سے کوئی فنکار دور نہیں جا سکتا، عصری ماحول سے رشتہ توڑنا انسانیت پر ظلم کرنا ہے۔ جس ادبی تخلیق میں

روح عصر نہ ہوگی، ادبی نظام میں اس کی کوئی جگہ نہیں اور زندگی کے لئے اس کی حیثیت ایک مٹی ہوئی لکیر کی ہے اس لئے کہ زندگی کی تنظیم سے اسے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ تاریخ کا کوئی دور اسے کوئی اہمیت نہیں دے سکتا ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سماج کی مادی زندگی کے حالات میں انسانی آبادی کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس لئے کہ انسان سوسائٹی کی مادی زندگی میں کوئی حسن پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن انسان کے سماجی نظام کو صرف انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی زندگی نہیں دے سکتی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی سماج کو وسیع کرتی ہے اور زندگی کے خوبصورت اشاروں کو جنم دیتی ہے لیکن یہ آبادی سماج کو حسن دینے کا سب سے بڑا ذریعہ نہیں اس لئے کہ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ کیوں ایک خاص نظام کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے کے لئے ایک مخصوص نظام جنم لیتا ہے۔ اس مخصوص نظام کی جگہ کوئی اور نظام اس کام کو انجام کیوں نہیں دے سکتا؟ اس ماحول میں نگاہیں ڈالنے پر محسوس ہوتا ہے کہ صرف بڑھتی ہوئی آبادی سوسائٹی کو زندگی نہیں دے سکتی۔ سوویٹ روس، چین، امریکہ اور بلجیم کی مثالیں سامنے ہیں۔ مادی اور سماجی زندگی کو حسن دینے کا سب سے بڑا ذریعہ وہ طریقے ہیں جن سے انسانی زندگی کی ضروریات کامیابی کے ساتھ پائی جا سکیں اور اس کے ساتھ مادی قدروں کی پیداوار کو مئے انداز دینے کے طریقے بھی شامل ہیں، زندگی کی خاطر انسان کو کھانا، کپڑا اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہے، انھیں حاصل کرنے کے لئے انسان کو اُن چیزوں کی ضرورت ہوگی جن سے یہ چیزیں تخلیق کی جا سکیں۔ ضروریات زندگی کی خاطر انسان کو کھانا، کپڑا، اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہوگی جن سے یہ چیزیں تخلیق کی جا سکیں۔ ضروریاتِ زندگی کی خاطر انسان نئی چیزوں کی تخلیق کرے گا ـــــ نئے نئے اوزار مشینیں بنائے گا تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ وہ لوگ جو ان اوزاروں اور مشینوں سے اپنی زندگی قایم رکھیں گے وہ یقیناً اُن لوگوں سے اچھے تعلقات پیدا کریں گے جنھوں نے اپنی جسمانی اور ذہنی طاقت سے پیداوار کی خاطر ایسی مشینیں اور اوزار بنائے ہیں اور یہ ساری چیزیں مجموعی طور پر سماج کو زندگی دیں گی۔

زندگی کی ضروریات کو حاصل کرنے کے طریقے ایک انسان سے دوسرے انسان کے اچھے تعلق پیدا کر دیتے ہیں اور یہ تعلق یا رشتے بہت ہی گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں انسان فطرتی طور پر زندگی میں جدوجہد کرتا ہے اور دنیا کی چیزوں کو پیداوار کی خاطر استعمال کرتا ہے ایسے وقت میں ہر آدمی انفرادی طور پر اس کام کو انجام نہیں دیتا بلکہ ایک کو دوسرے کا سہارا لینا پڑتا ہے سب ایک ساتھ جدوجہد کرتے ہیں اور یہ پھر اجتماعی اور سماجی جدوجہد ہو جاتی ہے۔ زندگی کی خاطر جو کچھ بھی پیدا کیا جاتا ہے وہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں بلکہ وہ ہر حالت میں سماج کی چیز ہوتی ہے ـــ اور انسان کا ایک دوسرے سے ایسا گہرا رشتہ سماج کو زندگی بخش دیتا ہے۔

آفرینش دولت کے طریقے کبھی ایک نقطہ پر نہیں ٹھہر سکتے، یہ ہمیشہ بدلتے بھی رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ ترقی بھی کرتے رہتے ہیں اور انکی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ سماج کے سارے عناصر میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہتی ہے۔ خواہ وہ سیاسی تصورات ہوں یا سماجی، سیاسی ادارے ہوں یا سماجی ادارے، تبدیلی ضرور ہوگی، سارے سماجی اور سیاسی گوشوں میں نئی تعمیریں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح جب ہماری نگاہیں تاریخ انسانی پر جاتی ہیں تو ہر نئے نظام میں زندگی بسر کرنے کے نئے طریقے نظر آتے ہیں۔ آفرینش دولت کے طریقے بھی بدلے نظر آتے ہیں معاشی نظام (Economic System) کے ساتھ سماج کے ہر گوشہ میں تبدیلیاں آجاتی ہیں سوسائٹی کے آفرینش دولت کے جو بھی طریقے ہوں، اصل عنصر خود سوسائٹی ہے۔ سوسائٹی کے تصورات ہیں، اس کے سیاسی خیالات اور سیاسی ادارے ہیں۔ سماجی ترقی کی تاریخ مادی قدروں کی تخلیق کرنے والوں کی تاریخ ہو جاتی ہے، یعنی محنت کشوں اور مزدوروں کی تاریخ، وہ محنت کش اور مزدور جو آفرینش دولت کے طریقے لاتے ہیں، ان طریقوں کو زندگی بخشتے ہیں اور سماج کی زندگی کی خاطر جگر کا لہو دیتے ہیں، ــــ Primitive Communal System میں پیداوار یعنی ضروریات زندگی کی چیزیں حاصل کرنے کا طریقہ سماجی تھے۔ پتھر، کمان اور تیر کے ذریعہ انسان انفرادی طور پر نظام زندگی میں جدوجہد کیا کرتے تھے۔ جانوروں کا شکار کرتے تھے اپنے ننھے مکانات کی تعمیر کی خاطر جنگل کے پھلوں کو یکجا کرنے اور مچھلیوں کو پکڑنے کی خاطر انسان ایک دوسرے کا ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ خود جانوروں یا

قحط کے شکار نہ ہو جائیں اور یہ سماجی طریقے اتنے اچھے تھے کہ پیداوار کے ذرائع کسی ایک طبقہ کی خاص ملکیت نہ ہو سکی، ذاتی ملکیت کا وجود نہ تھا۔ ان چند ہتھیار ایسے تھے جنھیں بعض بعض لوگ ذاتی طور پر رکھتے تھے اور جن سے جنگلی خوفناک جانوروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود نہ تو طبقات کا وجود تھا اور نہ انفرادی محنت اور مشقت کا۔ دورِ غلامی میں غلام رہنے والے ہی ساری پیداوار کے مالک تھے اور آفرینش دولت کے طریقے جاننے والے غلاموں کے بھی مالک تھے وہ غلاموں کو فروخت بھی کرتے، خرید بھی لیتے اور موت کے گھاٹ بھی اُتار دیتے۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں حاصل کرنے کے لئے نئے نئے ہتھیار اور اوزار بنائے گئے، دولت اقلیت کے ہاتھوں میں تھی، اکثریت غلاموں کی تھی۔ پیداوار بڑھانے اور پیدا کرنے میں پورے سماج کی محنت صرف نہ ہوتی تھی صرف غلام محنت کرتے تھے اس دور میں سماجی طریقے انفرادی اور ذاتی طریقوں میں تبدیل ہو گئے۔ آقا ہر چیز کے آقا تھے اور غلام ہر وقت غلام ہی تھا۔ دولت مند برباد کرتے تھے، غریب برباد ہوتے تھے، ایک ننھا طبقہ زندہ رہ سکتا تھا، اسے زندہ رہنے کا حق تھا اور ایک بڑا طبقہ صرف محنت کرنے اور مرنے کے لئے پیدا ہوا تھا، اسے انسان کی طرح زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ سامنتی دور میں پیداوار کے مالک جاگیر دار ہو جاتے ہیں لیکن اسکے ساتھ وہ دورِ غلامی کے آقاؤں کی طرح مزدوروں اور کسانوں کے مالک نہیں ہوتے، جاگیر داروں اور سامنتوں کے ساتھ ساتھ کسانوں کا وہ طبقہ بھی اُبھرنے لگا جو پیداوار پیدا کرنے اور بڑھانے کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے مالک تھے۔ اپنی ذاتی محنت اور مشقت سے اس طبقہ نے اپنی دنیا الگ بنا رکھی تھی، مزدوروں اور کسانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ بھی پیداوار پیدا کرنے اور بڑھانے میں جاگیر داروں کے ساتھ رہیں گے، جاگیر دار انھیں غلام سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مزدور ہیں اور انھیں صرف مزدور اور غلام کی طرح کام کرنا چاہئے۔ اس دور میں ذاتی ملکیت کا دایرہ اور زیادہ وسیع ہو گیا اور طبقاتی جنگ کی بنیاد پڑ گئی۔ سرمایہ دارانہ دور میں ذرایع پیداوار کا سب سے اہم حصہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہنے لگا۔ یہاں مزدوروں کو دورِ غلامی کے آقاؤں کی طرح نہ تو وہ جان سے مار سکتے تھے اور نہ انھیں غلاموں کی طرح فروخت کر سکتے تھے۔ اگرچہ مزدوروں کا طبقہ آزاد ہے پھر بھی سرمایہ دار انھیں لوٹ کر رکھ دیتے ہیں ذرایع پیداوار سے خود کو محروم دیکھ کر یہ طبقہ اپنی محنت فروخت کرتے ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داروں کے علاوہ کوئی مسکراتا نظر نہیں آتا، صرف صنعتوں کی نہیں بلکہ حکومت کی بھی پالیسی کی تخلیق کر کے سرمایہ دار انسانی زندگی پر چھا گئے ہیں اور حکومت کی وجہ سے وہ ہر اُس آواز کو کچل دینا چاہتے ہیں جن میں انقلابی عناصر ہوں' سرمایہ داری ترقی کرتی رہی اور ساتھ ساتھ تضاد بھی بڑھتا رہا۔ پیداوار پر مخصوص طبقہ کی ذاتی ملکیت نے خود سرمایہ داروں کے درمیان طوفان برپا کر دیا ہے، وہ آپس میں سرمایہ دارانہ مقابلے (competitions) جھگڑے، لڑائیاں اور عظیم جنگوں کی شکلیں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیداوار بڑھانے کی آواز بلند ہوئی' پیداوار بڑھتی گئی، دوسری طرف عوام کی زندگی پر تاریکیاں چھانے لگیں، اُن کی زندگی کا معیار Standard of Life ڈھلتا گیا۔ مزدوروں میں بے روزگاری بڑھنے لگی' اور یہ بے روزگاری سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے گہرا زخم ہے جو خراب ہو گیا ہے اور جس میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اس نظام میں اخلاق کی کوئی جگہ نہ رہی، عوام کھانے کو ترس رہے ہیں' مزدوروں اور کسانوں کی بہت بڑی تعداد زندگی کی تاریک گوشے سے لپٹ کر رہ گئی ہے۔

منافع کی ہوس نے اخلاق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سرمایہ داروں کی جنگوں نے زہریلے گیس اور بم کو جنم دیا ہے۔ خوفناک بیماریوں کو پیدا کیا ہے، سائنس کی ترقی روک دی گئی — اور ایسی تاریک لکیروں کو جنم دیا جسے دیکھ کر انسانیت کانپ اُٹھی ہے۔

فنکاروں نے سماج کے ہر نظام کی عکاسی کی، قبایلی ادب بھی اپنے وقت کا ترقی پسند ادب تھا، جاگیر دارانہ ادب اور پھر سرمایہ دارانہ ادب بھی اپنے وقت کے نئے اور ترقی پسند ادب تھے، اب جبکہ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی ہے ایک نیا نظام وجود میں آ گیا ہے ادب بھی اس نئے نظام کی عکاسی کے لئے آگے بڑھا ہے، اس وقت ادیب تاریخی قوتوں کا ساتھ کیوں نہ دیں؟

آج عوام سرمایہ دارانہ نظام ختم کر کے ایک ایسے نظام کو لانا چاہتے ہیں جہاں پیداوار کا موجودہ طریقہ بالکل فنا ہو جائے گا، طبقات

ختم ہو جائیں گے، انسان محنت کشوں کی سوسائٹی بنائیں گے، اجتماعی محبت اور طاقت پیدا ہوگی انسان کو کوئی لوٹ نہ سکے گا، تمام ذرایع پیداوار سماج کی ملکیت ہوں گے قحط، بیماری، بے روزگاری، منافع کی ہوس اور دوسرے سارے تاریک عناصر ختم ہو جائیں گے، زندگی کا معیار بلند ہوگا۔ سبھوں کے حقوق برابر ہوں گے، جسمانی اور دماغی محنت کشوں کی کشمکش ختم ہو جائے گی، غلامی ختم ہوگی، اسٹیٹ کا کوئی وجود نہ ہوگا، مادی فلسفہ سے انسان اپنی اور کائنات کی صحیح حقیقت سمجھ سکے گا۔ عوام کی صلاحیتوں کو زندگی ملے گی، انسان، انسان کے خلاف جنگ نہ کرے گا، پیداواری قوتوں کی ترقی کوئی روک نہ سکے گا، عوام تعلیم یافتہ ہوں گے، شہر اور دیہات کا فرق مٹ جائے گا، سائنس کی ترقی رک نہ سکے گی، تمدن اور تہذیب کو حسن دینے کی جدوجہد ہوگی — سماج کتنا حسین ہو جائے گا!

اس دور کا ادب سرمایہ داری کی گندی سیاست کے خلاف ایک آواز ہے جس کے پس پردہ تعمیر کی حسین پرچھائیاں بھی موجود ہیں۔ ہر نئے ہنگامے، انقلاب اور تغیر و سیاست سے فنکار متاثر ہوتے ہیں، جس طرح دوسری جنگ عظیم کے طوفان عظیم نے فنکاروں کو متاثر کیا تھا اسی طرح اس جنگ کے دوران میں بنگال کے قحط نے ایک نیا ہنگامہ پیدا کر کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ فنکاروں کو زندگی کے اس ہنگامہ سے متاثر ہونا تھا۔ وہ اپنے معاشرتی اور سیاسی و اقتصادی ماحول سے مجبور تھے۔ چونکہ اس وقت ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس لئے ہندوستان کی زندگی کے لئے یہ جنگ کوئی کشش نہ رکھتی تھی، حکومت جنگ میں شریک تھی، عوام نہیں، عوام کی نگاہوں میں انگریزی شہنشاہیت کی وہی حیثیت تھی جو نازیوں اور فاشسٹیوں کی تھی۔ جنتا سرمایہ داری کی سیاہ لکیروں کو خوفناک سانپوں کی طرح رینگتی دیکھ رہی تھی، ہندوستانی انگریزی حکومت سے نجات چاہتے تھے، ان کی حکومت انھیں برباد کر رہی تھی اور اس جذبہ نے ایک عجیب صورت اختیار کر لی، نازیوں نے انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کو جہاں شکست دی، وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے دشمن کو شکست ہوئی — اور ایسی فضا میں فنکاروں نے جب سماج کی تصویریں پیش کیں تو وہ تصویریں ہو بہو وہی تھیں جو عوام کے جذبات تھے اور ہندوستان کے اس طبقہ کے بھی جذبات اور خیالات تھے جو بین الاقوامی محبت اور دوستی چاہتے تھے یا جن کا نظریہ انسان تھا۔ کرشن چندر نے "بھوت" اور "خوبی" کی تخلیق کی، علی سردار جعفری نے "جنگ اور انقلاب" لکھا، احمد ندیم قاسمی نے "ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" میں ماحول کی حسین عکاسی کی۔ اور جوش ملیح آبادی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" میں انگریزی شہنشاہیت کی ساری تاریخی تاریک لکیریں سمیٹ کر رکھ دیں الغرض ان فنکاروں کا کارواں تھا جو مجروح زندگی اور اسکے نصب العین کی جھلکیاں پیش کر رہا تھا۔

۱۵ر اگست بڑا ہی دلچسپ خواب تھا، جسے دیکھ کر ہمارے ادیب خوشی سے بیتاب ہونے لگے اور اس مسرت میں جوش، جعفری، جذبی، ندیم، مجاز، پریم دھون اور جاں نثار اختر سبھی شریک تھے۔

لیکن زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ زندگی کی ویرانیاں اسی طرح ہیں، کارخانوں کی مشینوں سے مزدوروں کی زندگی اُسی طرح لپٹی ہوئی ہے اور انھوں نے محسوس کیا کہ عوام کو آزادی نہیں ملی ہے، سرمایہ داروں کی آزادی کو زندگی دی گئی ہے، مزدوروں کی آزادی نہیں ملی، ان کی عورتیں، اُن کے بچے ابھی تک غلام اور قیدی ہیں، فنکاروں کی زبان اور قلم کو آزادی نہیں ملی، برلا اور اصفہانی کی آزادی آئی تھی، کسانوں اور ادیبوں کی نہیں۔ انھیں اس کا احساس ہو گیا کہ جسے وہ نئی زندگی سمجھ بیٹھے تھے وہ نئی زندگی نہ تھی۔

اُردو کے ادیب ابھی اس پر غور ہی کر رہے تھے کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اُبل پڑے۔ ہندوستان اور پاکستان میں خون کی ندیاں بہ گئیں، برہنہ عورتوں کے جلوس نکالے گئے، ننھے بچوں کو قتل کیا گیا، بنگال جل گیا — ٹیگور اور نذر الاسلام کے گیتوں کو آگ لگ گئی بہار لہولہان ہو گیا — گوتم بدھ کا سفید مجسمہ ٹوٹ کر انسان کے خون میں لت پت ہو گیا۔ پنجاب برباد ہو گیا۔ تمدن اور تہذیب کو تباہ کر دیا گیا۔ ایسے وقت میں فنکار خاموشی اختیار نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ وہ آگے بڑھے اور انھوں نے آزادی کے اس مدھم پہلو کی ماتم و

وہ اور بڑھ گیا۔

جوش ملیح آبادی اپنے مخصوص طنز کے ساتھ بڑھے :۔

جب تک کہ دم ہے ہندو مسلم کے درمیاں ،
ہاں ہاں چھڑی رہے گی یونہی جنگ بے اماں
اُلجھی رہیں گی شام و سحر زیر آسماں
یہ چوٹیاں سروں کی یہ چہروں کی داڑھیاں،
ہاں ہوش میں قتال کا جنگی نہ آسکے گا
جس وقت تک پلٹ کے فرنگی نہ آسکے گا

کرشن چندر نے "ہم وحشی ہیں" کی تخلیق کی۔ یہ مجموعہ کرشن چندر کی زہریلی طنزوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں مظالم کی حقیقی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

کرشن چندر اسی سلسلہ میں ایک ایسے کردار کی بھی تخلیق کرتا ہے جس کا نقطہ منظر انسان ہے ، اس کا آرٹ اس میں بہت ہی بلند نظر آتا ہے ، وہ سمجھتا ہے کہ فسادات کا سیلاب ہندو ، مسلمان اور سکھ سبھوں کو بہالے جا سکتا ہے لیکن ان کے ساتھ انسانیت نہیں بہہ سکتی کرشن چندر ایسے نازک موقعہ پر ہمیں ہمت ، حوصلے اور بلندی دیتا ہے۔ ہمیں ناامیدی کہیں نہیں ملتی۔ مستقبل کی تصویر اس کے یہاں بڑی حسین ہے۔

خواجہ احمد عباس نے " میں کون ہوں " " سردارجی " اور " اجنتا " کی تخلیق کی۔ " میں کون ہوں " میں صرف شعلے ہیں جن سے تخریب کی امید زیادہ ہوتی ہے اور تعمیر کی کم !

" سردارجی " میں عباس نے حیوانیت میں انسانیت ڈھونڈ نکالی ہے۔ متعصب مسلمانوں کے خیالات کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔ عباس نے سکھوں اور مسلمانوں کو انسانیت کی کسوٹی پہ پرکھا ہے۔ طنز کی نزاکتیں دیکھ کر عباس کے فن کی گہرائی کا احساس ہوتا ہے سردارجی فرقہ وارانہ فسادات میں زندگی کے حسین راستوں کو روشن کر رہا ہے ایسے افسانہ کو دیکھ کر قسطائی قوتیں گھلتی نظر آتی ہیں

" اجنتا " میں بھی اُسے بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کہانی میں عباس کا فن بڑی بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

علی سردار جعفری ، " ہندوستان کے شرنارتھیوں اور " پاکستان کے مہاجرین " کے نام ایک پیغام لیکر آیا اور ایک حسین نصب العین کی تصویر بھی لیکر عوام سے مخاطب ہوا۔

جعفری کو انسان کی عظمت کا پورا احساس ہے وہ انسان سے مایوس نہیں ، وہ سمجھتا ہے کہ اس مخصوص مقام پر آکر انسانی زندگی میں حسن پائے گا اور اسی وقت انسانیت مسکرا اُٹھے گی۔

اس کے یہاں طنز کے ساتھ عمل بھی ہے ، جدوجہد بھی ہے وہ سرمایہ داری کے چہرے کا نقاب اُتار پھینکتا ہے۔ تاکہ عوام فسادات کی اصلیت سمجھ کر نصب العین کے لئے جدوجہد کریں۔ جعفری ایسے وقت میں عوام میں محبت پھیلانے آیا ، نفرت نہیں اور یہ عنصر اُسکے آرٹ کو بڑی زندگی بخش دیتا ہے۔

کیفی اعظمی نے " فسادِ جنگی " کی تخلیق کی۔ اس مثنوی میں ماحول کی سچی تصویر پیش کرنے کے بعد کیفی نے انسانیت کو ایک نئی راہ بھی دکھائی ہے۔ ان کی اس مثنوی اگر ایک طرف فسادات کی تصویر ہے ، تو دوسری طرف زندگی کو حسن دینے کے حسین ارادے بھی ہیں۔

کیفی کے پاس اتحاد و امن ہے ، وہ جذبات کی رو میں بہتا نہیں۔ انسان کے مستقبل سے اُسے مایوسی نہیں ، وہ سمجھتا ہے کہ ایک نیا آفتاب طلوع ہوگا جو انسانیت کو آزادی کی روشنی دے سکے گا۔ کیفی عالمگیر قدریں پیش کرنا چاہتا ہے۔

عصمت چغتائی کا "دھانی بانکپن" اور اوپندر ناتھ اشک کا "طوفان سے پہلے" دو ایسے ڈرامے ہیں جو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دو ڈراموں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نویس بھی ایسے ماحول میں خاموش نہیں رہے۔

سعادت حسین منٹو نے "سیاہ حاشئے" پیش کئے لیکن اس نے اس مخصوص ماحول میں کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دی۔ اس سلسلہ میں راما نند ساگر کے ناول "....اور انسان مرگیا" کا ذکر نہ کیا جائے تو کمی رہ جائے گی۔ راما نند کے اس ناول کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

ساگر نے سمجھا انسانیت مرگئی، زندہ نہیں ہوسکتی، ساگر نے پریشانی میں انسانی عظمت کو فراموش کردیا۔ زندگی کے لئے جدوجہد اور عمل اس کے نزدیک بیکار ثابت ہوئے۔ ہندو نے مسلمان کے سینے میں چھری ماری اور مسلمان نے ہندو کے، مگر راما نند ساگر نے انسان کے سینے میں اپنی پستول کی ساری گولیاں خالی کردیں اور اس طرح وہ بہت بڑا ظالم ہوگیا۔

گریز کے جذبہ نے ساگر کے فن پر جمود طاری کردیا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اس ناول کا دیباچہ لکھ کر ہمیں بالکل اسی طرح حیران کردیا جس طرح منٹو نے عسکری سے اپنا دیباچہ لکھوا کر حیران کردیا ہے۔

راما نند ساگر، قرۃ العین حیدر، ام۔ اسلم اور ڈاکٹر شفیق الرحمٰن ادب میں زہر کیوں نہ پھیلاتے جبکہ وہ اس نظام کے ہمنوا ہیں جو کسانوں اور مزدوروں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتا ہے۔ ان کے خون کو چوس لینا چاہتا ہے، جنتا کے اتحاد کو توڑنا چاہتا ہے اور عوام کے کلچر کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

شکیل الرحمٰن شکیل

نگار کے پرانے پرچے

سرقہ، توارد، استفادہ

(مسلسل)

ابتک تمام بحث صرف تخئیلی شاعری کے متعلق تھی جذباتی شاعری کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ فلسفہ، علمی مسایل اور دیگر تخئیلی مضامین میں تو تمام شعرا کم وبیش یکساں ہیں لیکن وجدانیات اور واردات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چونکہ شاعر خود فلسفہ اور وجدان دونوں سے کام لیتا ہے، اس لئے اس کے افکار بھی دو طرح کے ہوتے ہیں تخئیلی اور وارداتی۔ تخئیلی شاعری کی بحث گزر چکی ہے واراداتی شاعری شاعر کی ذاتی چیز ہے اس لئے اس سے استفادہ جایز نہیں ہے وہ سرقہ ہے اور انتہائی مذموم۔ ہمیں تسلیم ہے کہ دو آدمیوں کے حالات وتاثرات میں بھی اتفاقاً توارد ہوجانا ناممکن نہیں ہے مگر صرف اس امکان عقلی پر شاعری میں اس کو اتفاقیہ توارد قرار دینا انصاف سے بعید ہے۔ ہر چند اکثر مستند اور مسلم الثبوت اساتذۂ فن کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جذباتی اور وارداتی مضامین میں دوسروں سے توارد ہوا ہے مگر ان مثالوں کو بھی اگر بنظر غایر دیکھا جائے تو ان میں بھی قدرے اختلاف ضرور ملے گا۔ وارداتی شاعری میں یکساں مضامین کے جو اشعار مختلف شعراء کے یہاں ملتے ہیں ان میں اکثر کوئی نہ کوئی مخصوص فرق ضرور ہے اور ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ صرف اسلوب بیان کی قدرت یا برجستگی کے باعث کسی شاعر نے دوسرے شاعر کا کوئی مصرعہ ترجمہ کردیا یا اس سے صرف اسکے اسلوب کو لے لیا لیکن مضمون کے لحاظ سے ترجمہ بہت ہی کم کیا گیا ہے اور اگر کیا بھی گیا ہے تو اس میں کوئی ایسی دوسری خوبی ضرور موجود ہے جو اصل شعر میں نہ تھی اور اس کی وجہ یہی ہے کہ شعراء خود اس چیز کو محسوس کرتے تھے کہ جو کچھ واردات سے متعلق ہے اس میں ترجمہ یا استفادہ سرقہ ہے کیونکہ ہر شاعر کی انفرادیت قطعًا اس کے وجدان پر منحصر ہے۔ اگر وہ وجدانیات وجذبات میں بھی دوسرے سے استفادہ کرنے لگے تو اس کی انفرادیت بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ علاوہ بریں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ایسی چیز کے صحیح خط وخال واضح کرسکے جس کو اُس نے کبھی ایکبار محسوس نہ کیا ہو۔ اور ایک شاعر محض نادانستہ طور پر کسی جذبہ کو پیش کرکے اس میں اصلی جوش واثر کیونکر پیدا کرسکتا ہے۔ اکثر بعض صوفیاء کے کلام میں جو غیر معمولی جوش اثر پایا جاتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ صاحب کیف وحال تھے اور جو کچھ کہتے تھے وہ ان کی اپنی روئداد ہوتی تھی۔ شیخ بوعلی سینا نے بعض دقیق فلسفی مسایل حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر کے سامنے بیان کئے تو حضرت سلطان نے فرمایا کہ "آنچہ میدانی می بینیم" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن بزرگوں کے کلام میں اثر ہونے کی وجہ کیا ہے۔

شاعر مختلف احوال وکیفیات کی جو تصویریں پیش کرتا ہے وہ در اصل اس کے اپنے احساسات وتصورات کے خاکے ہوتے ہیں اور ان خاکوں کو وہ شاعرانہ صنعت کے ذریعہ سے اس طرح منظر عام پر لاتا ہے کہ وہ تمام سننے والوں کی اپنی روئداد بن جاتی ہے۔ خاقانی جب مدائن کے کھنڈروں سے گزرا تو خود اس کے قلب ودماغ پر اُس تباہی، بربادی اور ویرانی کے جو اثرات مترتب ہوئے اُس نے ان کو خود کھنڈروں کی زبان سے کہلوایا کہ:-

از نوحۂ جغد الحق مائیم بدرد سر	از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشاں
آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی	جغد ست پے بلبل نوحہ ست پے الحاں
ما بارگہ دادیم ایں رفت ستم بر ما	بر قصر ستمکاراں آیا چہ رسد خذلاں

اسی طرح میر تقی میر کے اس قطعہ میں صرف ایک بے جان کاسۂ سر کی زبان سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ در اصل میر کے اپنے احساس و تصور کا ایک خاکہ ہے :-

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا　　　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　　میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

شاعر چونکہ زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کرتا ہے اور اسی کو بیان کر دیتا ہے لیکن اس کا یہ بیان اس وقت کا ہوتا ہے جب وہ تاثر گزر چکا ہو اور وہ حافظہ کی مدد سے اپنے اس تصور کو پھر سامنے لا کر کھڑا کرے کیونکہ علم النفس میں اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کے لئے بھی مطالعہ باطن (Introspection) ممکن نہیں ہے یعنی جو حالت تاثر کسی انسان کی ایک واقعہ کے وقوع کے وقت ہوتی ہے وہ اس کو شعوری طور پر محسوس نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ اس کے تاثر سے اتنا مغلوب ہوتا ہے کہ اس کو سوچنا اس وقت اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے اور اس تاثر کے گزر جانے کے بعد وہ اس تاثر کا تجزیہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے جس کو یاد ماضی (Retrospection) کہتے ہیں، اس لئے جذباتی شاعری کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جس جذبہ کی عکاسی شاعر کرتا ہے وہ تمام تر عقل و حافظہ کی مدد سے ہوتی ہے۔ انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کہتا ہے : Poetry is emotion recollected in tranquillity شعر ان جذبات کو کہتے ہیں جن کو بحالت سکون دماغ میں دوبارہ تازہ کیا جائے اس اعتبار سے شاعری خالص عکاسی کا نام ہے لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ عکاسی کرنے والے کے پاس قلب و دماغ کتنا بلند و حساس ہے اس لحاظ سے اگر کوئی شاعر دوسرے کے احساسات کو خود بیان کرنے لگے تو گویا خود ہی اعتراف کر رہا ہے کہ وہ اس تمام صلاحیت سے قطعاً عاری ہے جو شاعر کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یعنی ایک منظر دیکھ کر اس سے متاثر ہونے کی قابلیت - کسی تاثر سے گزر جانے کے بعد اس کو اپنے حافظہ میں بیدار کر کے بیان کرنے کی اہلیت اور جو کچھ اس کو صرف تصور میں نظر آ رہا ہے اس کو الفاظ کی محسوس شکل میں بیان کر دینے کی قوت۔ لیکن یہ ادنیٰ بیان صرف اس وقت اور اس حالت کے لئے ہے جب کوئی شاعر اپنے قصد و ارادہ سے شعر کہنا چاہے لیکن اس حالت کے علاوہ اور اس سے بہت زیادہ بلند اور ارفع و اعلیٰ وہ حالت ہے جب ایک شخص بالکل جذبات سے مغلوب ہو اور اس کے اپنے احساسات بے اختیار شعر کی شکل اختیار کر لیں۔ اس وقت بالکل غیر شعوری طور پر اس کا وہ اندرونی اور پوشیدہ شاعر بیدار ہو جاتا ہے جو اس کو اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں سے ممتاز کر دینے کا ضامن ہوتا ہے اور اس حالت میں وہ شعر کہتا ہے جو قطعاً اس کی اپنی واردات ہوتی ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوتا نہ کسی سے سرقہ یا استفادہ کا سوال پیدا ہوتا ہے، یہی ہے وہ شاعری جو دل کی زبان اور جذبات کی صحیح اور سچی ترجمانی کہی جاتی ہے۔ یہی ہے ہماری شاعری کا وہ جزو جو انسانوں کے نہیں قوموں کے مزاج اور اخلاق میں انقلاب پیدا کر دیا کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مصنوعی تکلفات سے پاک ہوتی ہے۔

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ شعر کے لئے 'آمد' اور 'آورد' کی دو خصوصیات کے اعتبار سے جو تقسیم کی گئی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے اور سرقہ اور استفادہ کی بحث میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ تخیلی شاعری میں آمد کا سوال صرف اس حد تک قابل غور ہے کہ شعر کی بندش میں ایسی غیر معمولی برجستگی ہو کہ سننے والے کی طبیعت کو اپنی طرف کھینچ لے۔ مثلاً فردوسی شاہنامہ میں رستم اور سہراب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو　　　دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

دوسرا مصرعہ معلوم ہوتا ہے کہ یکدم شاعر کے قلب پر نازل ہوا ہے یا مولانا نظامی، سکندر نامہ میں وہ خط پیش کرتے ہیں جو سکندر نے دارا کو لکھا ہے اور اس میں اپنی فتوحات وغیرہ کا بیان کیا ہے کہ :

بہ یک تاختن تا کجا تاختم　　　چہ گردن کشاں را سر انداختم

پہلے مصرعہ کی بلاغت اور برجستگی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ جذباتی شاعری میں البتہ "آمد" اور "آورد" کا سوال بہت اہم اور قابل غور ہے۔ ہم نے سطور بالا میں دونوں حالتوں کی نفسیاتی کیفیت کو مجملاً پیش کردیا ہے۔ جذباتی شاعری کے اس حصہ میں جس پر "آمد" کا اطلاق ہوتا ہے چونکہ استفادہ اور سرقہ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اس لئے اس کو معرض بحث میں لانا بالکل فضول ہے لیکن جو حصہ "آورد" کا ہے اس میں یہ سوال البتہ کافی قابل غور ہے کالنس اور ڈریور Collins + Drever کا بیان اس سلسلہ میں ایک حد تک قابل لحاظ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"جو عمل خیال و تصور کے تحت بلا قصد و ارادہ اور براہ راست سرزد ہو جائے (ideo motor) ہے (Sensori - motor) اور (ideo - motor) کے درمیان اکثر تفریق کی گئی ہے، لیکن حقیقتاً کوئی مخصوص حد فاصل موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ اول الذکر حالت میں عمل کا محرک براہ راست کوئی حس یا ادراک (   ) ہوتا ہے۔ جس غیر ارادی عمل کا محرک حس ہوتا ہے اس کے اور اس عمل کے درمیان جو صرف خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ تمام مدارج موجود ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں انتہائی حدود کے درمیان وہ عمل ہوتا ہے جس کو "غیر شعوری طور پر نقل اتارنا" کہہ سکتے ہیں۔ جس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ہم انتہائی مرتکز توجہ کے ساتھ دوسروں کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور دفعتاً ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود بغیر ارادہ کے وہی عمل کررہے ہیں یا کرچکے ہیں جو دوسروں نے انجام دیا ہے"۔

علمائے نفسیات کی رائے میں ایک وقت شاعر پر ایسا بھی آتا ہے جب دماغ بالکل غیر شعوری طور پر نقل اتارنے میں منہمک ہوجاتا ہے۔ وہ دوسرے شاعر کا شعر سنتا ہے۔ مضمون کی بلندی، بندش کی چستی - ترکیب کی برجستگی وغیرہ بے اختیار اس کی توجہ کو ایک مرکز پر جما دیتے ہیں اور وہ ذرا دیر کے لئے بالکل اسی جذبہ یا حالت کو محسوس کرنے لگتا ہے جو پہلے شعر کہنے والے شاعر پر گزرچکی ہے اور بالکل غیر ارادی طور پر اس کا دماغ اسی مضمون کو دوسرے قالب میں ڈھال کر پیش کردیتا ہے۔ یہاں غیر شعوری حالت سے مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے قصد و ارادہ سے نقل نہیں اتارتا بلکہ یہ بھی ایک دماغی عمل ہے جس میں اس کے قصد و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے پہلے شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ ممکن ہے کہ آمد ہو مگر شعر کو سننے والے کی وہ روئداد نہیں ہے وہ اس کو دل سے نہیں دماغ سے سوچتا اور محسوس کرتا ہے اس لئے وہ بہر حال آورد ہے لیکن سرقہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ سرقہ کی تعریف میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ "قصد و ارادہ" سے دوسرے کے مضمون کو اپنانے کی کوشش کی جائے۔

اس بحث سے یہ اشتباہ پیدا نہ ہونا چاہیئے کہ ہمیں سرقہ کے وجود سے انکار ہے یا وہ اشعار و مضامین جو شعرائے سابق کے کلام کو سامنے رکھ کر کہے گئے ہیں سب اسی میں شامل ہیں۔ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ ہم نے متوارد مضامین کے سلسلہ میں جو نفسیاتی اصول پیش کیا ہے اس کا کوئی لحاظ ہمارے نقادوں نے نہیں کیا اور اس سے کافی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

اس تمام تفصیل کے بعد فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس غلطی کے پیدا ہوجانے کی کیا وجہ ہوئی کہ شعرا تو برابر اپنے پیشروؤں سے استفادہ کرتے رہے اور کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کرتے رہے لیکن لوگ اس کو سرقہ قرار دیتے رہے۔

جذبات و احساسات - خیالات و رجحانات کے اعتبار سے ایک معمولی انسان میں بھی اتنے تغیرات ہوتے رہتے ہیں کہ ان کا کوئی حد و شمار نہیں اکثر و بیشتر یہ تمام تغیرات بیرونی محرکات کے تابع ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات کوئی بیرونی سبب موجود نہیں ہوتا اور یہ تغیرات پھر بھی واقع ہوتے ہیں۔ علم النفس میں اس کی تمام اشکال و وجوہ پر کافی طویل بحث موجود ہے۔ ایک شخص اچھا خاصہ ہشاش بشاش بیٹھا ہے اور ذرا ہی دیر میں بیت مضمحل اور افسردہ ہوجاتا ہے۔ اس تغیر احوال کا سبب یا تو کوئی بیرونی محرک ہوگا یا کوئی ذہنی ردعمل کے یا پھر اسکے تحت شعور میں کوئی احساس پیدا ہوگا جس سے وہ خود بھی باخبر نہ ہوگا۔ جس طرح ان تغیرات کا احصار و شمار دشوار ہے اسی طرح ان کے مختلف النوع اثرات کو ضبط تحریر میں لانا بھی ناممکن ہے۔ لیکن ان تمام ذہنی احوال و کیفیات کی ایک مخصوص حالت یہ ہوتی ہے کہ باوجود خوشی و شادمانی

کے ایک دماغی و ذہنی تکان موجود ہوتی ہے اور کہیں احساس غم و فکر میں بھی ذہنی غلو اور دماغی عظمت ضایع نہیں ہوتی۔ اسی طرح تمام دوسرے جذبات کیفیات اور احساسات کی حالت ہے۔ خوشی کا کام دماغی انبساط پیدا کرنا ہے اور غم و فکر کا ذہنی اضمحلال پیدا کرنا۔ اور بلاشبہ یہ خود وفادارانہ اپنے مقررہ فرایض ضرور انجام دیتے ہیں لیکن ان بیرونی محرکات کے علاوہ ایک کیفیت خود دماغ کی بھی ہوتی ہے کہ وہ خود کسی بیرونی محرک یا عمل سے کتنا اور کس حد تک متاثر ہونے کے لئے آمادہ ہے۔ علمائے نفسیات میں سے اکثر اصحاب اس امر پر متفق ہیں کہ خوشی کا وجود بغیر غم کے یا لذت کا وجود بغیر الم کے ناممکن ہے کیونکہ لذت و خوشی اور ابتہاج و شادمانی اعصاب میں ایک طرح کے ہیجان کا ہی دوسرا نام ہے اور اس ہیجان و اضطراب کے بعد تکان کا محسوس ہونا لازمی ہے اور اسی کا نام نفسیات کی اصطلاح میں غم و اضمحلال ہے اس وجہ سے تمام جذبات کے وجود کو صرف اعتباری سمجھنا چاہئے کہ ان کا حقیقی وجود اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ایک انسانی دماغ کسی ایک حالت سے متاثر ہونے کے لئے کس حد تک طیار ہے۔ یہ تمام ذہنی تغیرات ہر شخص پر طاری ہوتے رہتے ہیں اور کوئی انسان اس سے بری نہیں ہو سکتا۔ شاعر بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں ان کے دماغ پر بھی علو و پستی۔ جوش و اضمحلال کے وہ تمام مدارج و احوال گزرتے رہتے ہیں جو دوسرے انسانوں پر گزرتے ہیں اور جب دماغ علو و عظمت کی طرف مایل ہوتا ہے تو مضمون میں جدت۔ بندش میں چستی اور مجموعی طور پر شعر میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ایک پامال سے پامال مضمون میں بھی شاعر کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور کہہ جاتا ہے جو اس کی اس دماغی حالت کا پتہ دیتی ہے۔ اس کے برعکس جب دماغ میں تکان موجود ہو تو صاحب قدرت شعرا بھی جو اشعار کہتے ہیں وہ محض کثرت مشق و مزاولت کا نتیجہ ہوتے ہیں جن میں صرف تنوع نظر آتا ہے اور بس۔ ان اشعار میں مضامین بھی وہی ہوتے ہیں جو پہلے لوگ کہہ گئے ہیں۔

جب یہ امر تسلیم ہے کہ شاعر جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اپنی اس روئداد کو جو اس پر گزر گئی ہے از سرنو دماغ میں تازہ کرنے کے بعد کہتا ہے اور وہ اس واقعہ کے وقت کے تمام و کمال تاثرات نہیں ہوتے بلکہ ایک گزری ہوئی حالت کو دماغ جس قدر بھی یاد کر سکتا ہے وہ ہوتی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ایک واقعہ کے ورود کے وقت ممکن ہے کہ انسان بالکل پست مضمحل۔ افسردہ اور دل شکستہ ہو کر رہ گیا ہو۔ مگر جس وقت وہ شعر کہہ رہا ہے اس وقت اس حالت کا باقی رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے اور اسی طرح اس کے برعکس حالت ہے کہ خوشی و شادمانی میں ممکن ہے ایک شخص نہایت جوش و خروش اپنے اندر پاتا ہو مگر اس حالت کے گزر جانے کے بعد جب وہ اس کو یاد کر کے بیان کرنا چاہے تو وہ تمام ذہنی انبساط ختم ہو چکا ہو۔

میر تقی میر کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی ایک صاحبزادی تھیں اور ان کی شادی میں میر صاحب نے باوجود مالی مشکلات کے کافی حوصلہ مندی سے کام لیا۔ لیکن وہ شادی کے فوراً ہی بعد علیل ہوئیں اور قضا کر گئیں۔ میر صاحب کو اس سے جو کچھ بھی صدمہ ہوا ہوگا محتاج بیان نہیں۔ اسی حالت میں شعر کہتے ہیں کہ؛

اب آیا یاد اے آرام جاں اس نامرادی میں — کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

یہ شعر درد و اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور مضمون بھی نہایت دردخیز ہے مگر رنج و غم میں جو ذہنی اضمحلال پیدا ہو جانا ضروری ہے اس کی بجائے جوش نظر آ رہا ہے۔ فیضی کا ایک خورد سال بچہ مر گیا اور اس کو اس کا بیحد رنج تھا۔ اس کا مرثیہ بڑا ہی دردخیز لکھا ہے۔ تین شعر حسب ذیل ملاحظہ ہوں

اے روشنیٔ دیدۂ روشن چگونۂ — من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونۂ

ماتم سراست خانۂ من در فراق تو — تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونۂ

بر خار و خس کہ بستر و بالیں خواب تست — اے یاسمیں عذار سمن تن چگونۂ

مد تک ... ماتم میں رنج

کیا ان اشعار میں شاعر کے دماغی اضمحلال کا کہیں پتہ چلتا ہے؟ اس کے برخلاف وہ جوش صاف نظر آ رہا ہے جو ہر تخلیق ہوا کرتا ہے۔ مومن خاں نے اپنی محبوبہ کا ایک بہت ہی طول طویل مرثیہ لکھا ہے جو ان کی کلیات میں موجود ہے۔ یہ شاعری کے ... پیش کرتے ہیں جو مسلمہ ہے اور کم از کم اردو شاعری میں تو اس کا جواب مشکل ہی سے مل سکے گا۔ تقریباً ہر شعر میں غم و رنج کی جھلک نمایاں ہے مگر کہیں بھی وہ ذہنی اضمحلال و افسردگی نظر نہیں آتی جو غم و الم کے باعث پیدا ہو جانا ضروری تھی۔ بلکہ اس کے بجائے وہ

نمایاں ہے جو جدت اور تخلیق کے لئے ضروری ہے۔ عارف سے غالب مرحوم کو کس قدر الفت تھی اور عین عالم جوانی میں ان کے انتقال کر جانے سے غالب کو کتنا رنج ہوا تھا ان کے تمام سوانح نگار اس کو بیان کر رہے ہیں مگر جب غالب نے عارف کا مرثیہ لکھا تو اس میں باوجود تمام غم و الم کے ذہنی جوش اور دماغی بیداری ہی کا ثبوت ملتا ہے۔

میر، فیضی، مومن اور غالب پر ان واقعات کے پیش آنے کے وقت ضرور وہ حالت طاری ہوئی ہوگی جس سے دماغی اضمحلال پیدا ہو جائے مگر جب وہ اپنے اپنے مرثیے لکھنے بیٹھے تو دماغ کی حالت بالکل دوسری ہو چکی تھی اور وہ ایک بالکل دوسرے قسم کے احساس میں گھر چکے تھے۔ جس طرح مضامین غم و الم کے بیان کرتے وقت بھی ان شعرا کا دماغی جوش موجود تھا اسی طرح خود جوش کے مضامین بیان کرتے وقت ممکن ہے کہ دماغ میں اضمحلال پیدا ہو چکا ہو اور شعر صرف رسم قدیم کی پابندی و اتباع سے آگے کچھ بھی نہ ہو سکے۔ کیونکہ دماغی نکات کے ساتھ وہ ذہنی رفعت و جوش جمع نہیں ہو سکتے جو مضمون میں جدت اور بلندی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہماری شاعری کا جس قدر حصہ بھی اس رسمی شاعری کے طرز پر ہے اس میں مضامین کی یکسانیت کے باعث قائلین اکثر دھوکہ میں پڑ گئے۔ حالانکہ اس حصہ میں وہ حقیقی شاعر خود ہی سرے سے مفقود ہوتا ہے جو اس کو اپنے دوسرے ہم مشرب انسانوں سے ممتاز کرنے کا ضامن ہوتا ہے۔ اس رسمی شاعری کا ایک حصہ تو وہ ہوتا ہے جس میں چند مباحث ہیں جو شعرائے سابق سے ورثہ اور ترکہ کے طور پر شعرائے مابعد کے حصہ میں آئے ہیں اور ان کو مختلف نوعیتوں اور ترکیبوں سے شعرائے مابعد نے اپنے اپنے طور پر کہا ہے۔ مثلاً حسن۔ عشق۔ ہجر۔ وصال۔ جدائی۔ وداع محبوب۔ فنا۔ بقا وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں حقیقتاً شعرائے سابق سے کسی مخصوص حصہ میں استفادہ کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے کسی مبحث پر شعر کہتے وقت اگر دماغ تکان سے آزاد نہیں ہے تو شعر میں جدت اور بلندی ہرگز نہیں ہو سکتی اور چونکہ ان میں سے ہر مضمون پر لاکھوں کی تعداد میں اشعار کہے جا چکے ہیں اس لئے دانستہ یا نادانستہ کسی پہلے شعر سے تھوڑا بہت توارد ضرور ہو جائے گا۔

اس کے برعکس، دوسری حالت وہ ہے جب دماغ رفعت و عظمت کی طرف مائل ہو اور ذہنی جوش موجود ہو اس حالت میں کوئی نہ کوئی جزو ضرور شعر میں ایسا ہوگا جو شعر کو سرقہ کی حد سے نکال کر ابداع کے ذیل میں لے آئے۔ دوسرے حصہ کی حالت اس سے مختلف ہے کیونکہ شعرائے سابق کے اشعار میں سے جن مخصوص اشعار کو سامنے رکھ کر شعرائے مابعد نے طبع آزمائی کی ہے ان کی یہ حالت نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ ان مضامین میں ان شعرا کے لئے ایسی کشش موجود تھی کہ وہ اس پر شعر کہنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے اور جب اس طرح کا جذبہ کسی پر طاری ہو جائے تو اس کی ناقدانہ صلاحیت بہت کچھ کمزور ہو جاتی ہے اور اس کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ پہلے شعر سے بڑھ گیا یا نہیں۔ حضرت امیر خسرو کا شعر ہے:۔

کرشمہ چند کنی بر من آخر ایں جان ست نمی دمد ز زمین و "صبا نمی آرد"

حضرت امیر کے تین سو برس بعد اہلی شیرازی نے اس شعر میں اصلاح دینے کی کوشش کی ہے کہ:۔

کرشمہ چند کنی بر من آخر ایں جان ست نمی دمد ز زمین "آسمان نمی بارد"

وہ حضرت امیر نے جو "صبا نمی آرد" کہا ہے تو اس سے ان کا مدعا یہ ہے کہ وہ گھاس کوڑا، پتے وغیرہ ہوتے ہیں جن کی کوئی قدر کسی طرح ہوتی جذبات ہی اور ہوا ان کو ہر طرف اڑائے اڑائے پھرتی ہے تو میری جان کو بھی جان سمجھ۔ نہ یہ خودرو گھاس ہے نہ وہ گرد او پتے جن کو ہوا اٹھا کر ایک بے تجربہ تمام دوسری جگہ پہونچا دے اور اس سے ان کا مطلب اپنے محبوب کی انتہائی بے التفاتی کا اظہار ہے کہ وہ ادا و ناز و انداز کے وقت اسکو نہیں علم النفس میں جانتا ہے کہ میرے دل و جان کی کیا حالت ہوئی جاتی ہے۔ اس مضمون میں اہلی شیرازی نے جو تبدیلی کی کہ "آسمان نمی بارد" تو اس سے بہت مضمحل ہو نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ زمین کے مقابلہ میں آسمان آ گیا لیکن حضرت امیر نے جو اپنی جان کی بے قدری دکھائی ہے وہ احساس پیدا ہو نہیں پوری شدت سے نظر آتی ہے اور "آسمان نمی بارد" میں اس کے عشر عشیر بھی نہیں، اہلی صاحب طرز شعرا میں سے ہے اور ضبط تحریر میں لانے کی قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر حضرت امیر کا شعر پڑھ کر اس کا ذہن صرف زمین و آسمان کے مقابلہ میں الجھ کر

رہ گیا اور پوری ناقدانہ بصیرت سے وہ اُس مضمون کا احاطہ نہ کرسکا جو حضرت امیرؔ نے کہا ہے ورنہ اس کو ایک مبتدی بھی محسوس کرسکتا ہے کہ "آسماں نمی بارد" کے مقابلہ میں "صبا نمی آرد" میں کہیں زیادہ حسرت ہے۔ اس ایک مثال ہی سے دماغ کی اُس کیفیت کا اندازہ ہوسکتا ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، مولانا جامیؔ کا شعر ہے :۔

میلِ خم ابروئے توام پشت دوتا کرد　　　در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد

حزیںؔ نے مولانا کو اصلاح دینا چاہی ہے کہ :۔

"بارِ غم عشق" تو مرا پشت دوتا کرد　　　در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد

مولانا جامیؔ نے جو "میل خم ابرو" کا لفظ کہا ہے اُس سے مراد خود "بارِ غم عشق" ہے اور اس میں اگلے مصرعہ کے "ماہ نوم" کی رعایت بھی موجود ہے۔ جس سے شعر میں ایک شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔ حزیںؔ کا ذہن اس طرف گیا کہ کمر کے خم ہوجانے کے لئے کسی بار کی ضرورت ہے اور وہ واضح الفاظ میں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ مولانا جامیؔ کے "میل" میں بھی اطلاق "بارِ غم عشق" پر ہی موجود ہے مگر حزیںؔ اس اطلاق سے مطمئن نہیں ہوتا اور مولانا کے شعر میں اصلاح دیتا ہے حالانکہ مولانا کے شعر میں جو "ماہ نو" کی رعایت تھی وہ بالکل ظاہر ہے مگر حزیںؔ ایک تصور میں اتنا ڈوب گیا کہ مولانا کے خیال اور تصور کو بالکل نظر انداز کرنے پر مجبور ہوگیا اگر زیادہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حزیںؔ مولانا کے اصل مفہوم ہی کا احاطہ نہ کرسکا۔ کیونکہ مولانا کا مقصد یہ ہے کہ "میل خم ابرو" میری ذات میں اس طرح سما گیا کہ خود میرے اندر وہی صفت پیدا ہوگئی اور اس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے اب حزیںؔ کے شعر کو دیکھئے تو بارِ غم عشق کو ماہ نو سے کوئی مناسبت نہیں ہے اور الفاظ کے اس معمولی سے تغیر سے مولانا کا اصل مفہوم ہی فوت ہوگیا۔ صرف کمر کے خم ہونے کے لئے ایک "بار" تو ضرور مل گیا، مگر شعر آسمان سے زمین پر آرہا حزیںؔ کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے مگر وہ بھی شاعر ہونے کے ساتھ ہی انسان بھی تھا اور انسانی دماغ کی جو مختلف حالتیں مختلف اوقات میں ہوتی ہیں وہی اس پر بھی گزرتی تھیں۔

ایک مصنف یا شاعر کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام خود اپنے کلام کی تنقید ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ دماغ ایک مسئلہ میں صرف ایک پہلو کو سوچ سکتا ہے۔ کسی مسئلہ کے تمام اور مختلف زاویہ ہائے فکر و نظر کا احاطہ کرلینا بیک وقت کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے اور اس کا سبب تمام تر یہی ہے کہ اپنے خیال اور دماغی رجحان کے لئے اس کے اندر ایک طرح کا غیر شعوری تعصب پیدا ہوجاتا ہے جو اس کی قوتِ تنقید کو بڑی حد تک ضعیف کر دیتا ہے جو حال اہلیؔ شیرازی اور شیخ علی حزیںؔ کا متذکرہ اشعار کہتے وقت ہوا۔ شیخ بوعلی سینا جیسا فلسفی اور حکیم بھی اسی چیز کا شکار ہوگیا جب حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر سے طاعت و معصیت کی گفتگو کرتے ہوئے حسب ذیل رباعی اس نے پڑھی :۔

مائیم بعفو تو تولا کردہ　　　وز طاعت و معصیت تبرا کردہ

آنجا کہ عنایت تو باشد باشد　　　ناکردہ چو کردہ کردہ چوں ناکردہ

تو حضرتِ سلطان نے فوراً اس کا جواب دیا کہ :۔

اے نیک نہ کردہ و بدیہا کردہ　　　وانگاہ بعفو حق تولا کردہ

بر عفو مکن تکیہ کہ ہرگز نبود　　　ناکردہ چو کردہ کردہ چوں ناکردہ

یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ رباعی کہتے وقت بوعلی سینا کے دماغ پر صرف یہ اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم پر بھروسہ کرلینا ہی بالکل کافی ہے خواہ ہمارے اعمال حسنہ و سیئہ سب بے اثر ہیں۔ بوعلی سینا کے مرتبہ کے فلسفی سے ہرگز یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اس قدر غیر فلسفی بات کہتا اور انسان اور اس کے اعمال کو اس قدر بیکار، بے اثر اور ہیچ تصور کرنے کی جرأت کرتا مگر وہ اس وقت رحمت الٰہی کے تصور میں غرق تھا اور اسکے مقابلہ میں اُسے ہر چیز ہیچ اور بے حقیقت نظر آنے لگی۔ اور وہی مضمون بے اختیار اس کی زبان سے ٹپک پڑا۔ ایک

تصور میں غرق ہو جانے کے بعد قوت تنقید کے ضعف کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت درکار ہے۔

غالب نے وہ کام کیا ہے جو لاکھوں شعرا میں سے صرف چند کر سکے ہیں کہ خود اپنے اشعار کو دیوان سے چھانٹ کر کم کر دیا اور اس کے لئے جس قسم کی صلاحیت۔ قابلیت اور ہمت کی ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس سے غالب کی قوت تنقید کا ایک گرانقدر ثبوت ملتا ہے، نیز مولانا حالی نے یادگار غالب میں ذوق، مومن اور حتیٰ کہ داغ کے وہ اشعار لکھے ہیں جن پر غالب مرحوم وجد کیا کرتے تھے یہ ان کی بے تعصبی اور قوت تنقید کا دوسرا اہم ثبوت ہے مگر شہزادہ جواں بخت کا سہرا لکھنے بیٹھے تو اپنے سہرے کے اشعار سے خود اتنے متاثر ہوئے کہ مقطع میں بے اختیار پکار اُٹھے کہ:-

> ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں، دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

کس قدر عجیب بات ہے کہ اپنے ہم عصر شعرا کو دوسرے مصرعہ میں کتنی جرأت سے دعوے مقابلہ دے رہے ہے۔ حالانکہ دنیا کا کوئی انسان کسی قیمت بھی یہ دعوے کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بہمہ جہت مکمل ہے یا اس پر اضافہ کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے اور غالب جیسا فلسفی اور مفکر ہرگز اس معمولی سی بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا مگر اپنے سہرے کے اشعار سے خود اتنا متاثر ہو گیا کہ قوت تنقید بالکل غیر شعوری طور پر اس حد تک ضعیف ہو گئی کہ وہ ایسا دعوے کر گیا اور پھر ذوق کے سہرے کے جواب میں معذرت لکھنا پڑی ان مثالوں سے قوت تنقید کا ضعف ظاہر ہے اور اس پر اور کچھ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان اشعار کے علاوہ ایک دوسری قسم وہ ہے جس میں شعرائے سابق کے مضامین میں شعرائے مابعد نے اضافہ کیا ہے۔ ان کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اشعار کے کہنے والے شعرا اپنے سے پہلے شاعر کے مضمون سے متاثر نہیں ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اس کی خامی کو محسوس کر کے اس کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسکی مثالیں 'اضافہ' اور 'اختلاف' کے ذیل میں ہم آگے درج کریں گے۔

شعر کہتے وقت شاعر پر جو اور جس قسم کے حالات و جذبات طاری ہوتے ہیں ان کو لوگوں نے بالکل نظر انداز کر دیا اور صرف اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ یہ مضمون سرقہ کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ سورج کی روشنی، پھول کی مہک اور کوئل کی آواز کا کوئی کیسے سرقہ کر سکتا ہے جو شعر کسی نے کہدیا اور وہ مشہور ہو گیا اب اس کا سرقہ کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قدما کے کلام سے اس طرح کا سرقہ کرے تو وہ چھپ کیونکر سکتا ہے اور یہ سرقہ ایسا ہی ہوگا جس کے لئے خواجہ حافظ کہہ گئے ہیں کہ: " چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

علامہ شبلی اور میر شمس الدین فقیر نے جو مثالیں سرقہ کی پیش کی ہیں وہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اگر ان کو سرقہ بھی تسلیم کیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ سرقہ کرنے والے سخت احمق تھے کہ عربی اور فارسی شعرا کا کلام شایع ہو چکا ہے اور پھر اس میں سے مضمون چرا رہے ہیں گویا ایسی چوری کر رہے ہیں جو لامحالہ ظاہر ہو کر رہے گی اور ہم ان بزرگوں کو عقل و اخلاق سے اتنا عاری تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

سطور بالا میں شاعر کی اس ذہنی کیفیت کا ایک مجمل خاکہ موجود ہے جو اس پر شعر کہتے وقت طاری ہوتی ہے لیکن ہمارے ناقدین نے اس تمام کیفیت اور حالت کی نفسیاتی تحلیل اجزاء کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور جب کوئی متوارد مضمون ان کی نظر پڑا اس کو انھوں نے سرقہ کے ضمن میں شمار کر لیا۔ یہ غلطی یونہی رواج پاتی رہی اور کسی نے اس کی تصحیح نہ کی۔ ان کے اس تسامح کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ متوارد مضامین و اشعار کی انکے یہاں صرف دو ہی اقسام ہیں بالقصد سرقہ یا اتفاقیہ توارد۔ لیکن صاحب قدرت شعرا نے جب خود کھلے لفظوں میں دوسروں سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا تو اس کی یہ کوئی توجیہہ نہ کر سکے۔ نہ اس کے لئے کوئی علحدہ قسم قایم کی ہم سرقہ کی تمام اقسام حدایق البلاغت سے نقل کر چکے ہیں۔ ان کی تمام تعریفیں خود ان ہی کے الفاظ میں پڑھ جائیے، کہیں بھی نفسیات کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے صرف لفظ و معنی کی بحث میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ شاعری میں مختلف قسم کے مباحث میں سے سرقہ و توارد وغیرہ کی بحث اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ شاعر کی دماغی کیفیت اور نفسیاتی حالت کا اندازہ کرنے کا موقعہ سب سے زیادہ

یہیں، مشابہت اور افسوس ہے کہ لوگوں نے اس کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ لوگ جو اصول وضع کرتے ہیں اسکے بے لاگ نفاذ سے خود بھی ڈرتے ہیں۔ اساتذۂ فن کے یہاں جب ان کو اس طرح کے متوارد مضامین نظر آئے تو انکی عظمت سے مرعوب ہو کر یہ کہا اٹھے کہ "ایں اشعار اساتذہ کہ بطریق امثلہ مذکور شد ممکن است کہ بر سبیل توارد خاطرہا ست" (حدایق البلاغت ص ۱۹۸) ونیز۔ "وایں ابیات امثلہ کہ راقم الحروف جہت اقسام سہ رقم نمودہ کلا و حاشا کہ سرقہ باشد بلکہ جمیع توارد خاطرہا ست" (مجمع الصنایع نسخہ قلمی) لیکن یہ کیا بوالعجبی ہے کہ اگر اس قسم کا توارد اساتذہ کے یہاں ملے تو اس کو توارد خاطر کہہ کر ان کی عزت رکھ لو اور نئے سروں کے یہاں ملے تو اس کو بے تکلف سرقہ کہہ دو۔ جو اصول وضع کیا جائے اس کی زد میں کوئی شخص بھی آجائے اس کو بے تکلف کہہ دینا ہی حق کا راستہ ہے مولانا شبلی نے شعر العجم میں خواجہ حافظ اور خواجہ کرمانی کی ہم طرح غزلوں کے اکثر اشعار درج کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ نے اُن غزلوں کو سامنے رکھ کر غزلیں کہی ہیں۔ اور کسی شعر میں خواجو سے بڑھ گئے ہیں اور کہیں ایسا نہ ہو سکا۔ خواجہ حافظ کی جلالت شان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر ہمارے ناقدین ان کو سرقہ کا مجرم قرار دینے کی جرأت نہ کر سکے۔

متذکرہ تفصیلات کے بعد ایک دوسری چیز بھی ہے جو صرف ذوق سلیم سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ہم کسی ایسے مضمون کو دیکھیں جو قدما میں سے کسی نے کہا ہے اور بعد کے آنے والے شاعر کے یہاں بھی موجود ہے تو دوسرے شعر کو بے تکلف سرقہ کہہ دینے سے پہلے ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ پہلے مضمون کے بعد اس دوسرے شعر کے کہنے والے شاعر کی دماغی کاوش کا بھی کوئی ثبوت موجود ہے یا نہیں۔ اگر فی الواقع کوئی مزید کاوش عام اس سے کہ وہ اضافہ و ابداع کی حد تک کامیاب ہو یا نہ ہوئی ہو کی گئی ہے تو وہ صرف استفادہ ہے اور اگر ایسی کوئی کاوش سرے سے کی ہی نہیں گئی ہے تو البتہ اس کو سرقہ کے ذیل میں شمار کیا جانا ممکن ہے ———— کیونکہ کسی شاعر کے مضمون کی خوبی سے متاثر ہو کر اس مضمون کو اپنا نا ضرور سرقہ ہے لیکن اگر کسی مضمون میں یا صرف طرز بیان میں کوئی خامی محسوس کر کے اس کو دفع کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ سرقہ نہیں ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے شاعر کا خیال صحیح بھی ہو۔ وہ صرف اپنے خیال اور رجحان دماغی کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے اور اس لئے اگر اس کی نظر میں کوئی کمی یا خامی پہلے مضمون میں رہ گئی ہے اور وہ اس کو دفع کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا شعر ہرگز سرقہ کے ذیل میں نہیں آسکتا۔ ہم ابھی حضرت امیر خسرو اور اہلی شیرازی۔ مولانا جامی اور علی حزیں کی مثالیں درج کر چکے ہیں وہی اس باب میں کافی ہیں ——— کائنات اور انسان کے تعلق پر مخصوص طرز فکر اور ایک خاص اصول نظر میں ایک شاعر کی انفرادیت قایم ہے لیکن یہ چیز اکتساب و مشق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح صدہا اشعار شاعر کی نگاہ سے گزرتے ہیں اور جس شعر سے وہ متاثر ہوتا ہے اس کو اپنے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے اس میں قصد و ارادہ کی ضرورت نہیں اس کو ہم ذیل کی چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کا شعر ہے:۔ گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

فانی نے غالب سے یہی مضمون لیا ہے۔ کہتا ہے کہ:۔

دل ہی نگاہ ناز کا ایک ادا شناس تھا جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

غالب جو کچھ صرف ایک مصرعہ میں کہہ گیا ہے فانی نے اس کے لئے پورا شعر کہا ہے۔ غالب کے اختصار نے اس کے شعر میں زور زیادہ کر دیا ہے۔ فانی نے اس کو محسوس نہ کیا۔ غالب نے "برق گرنے" سے جو کام لیا تھا۔۔۔ فانی کو اس کے لئے ایک مصرعہ کہنا پڑا ہے غالب کے شعر میں مصرعہ ثانی کے مضمون سے زور بڑھ گیا ہے۔ فانی نے اس کو بالکل نظرانداز کر دیا غالب کا "برق تجلی" فانی کے "نگاہ ناز" سے زیادہ صحیح اور غالب کا "ہم پہ" فانی کے "دل" سے زیادہ معنی خیز ہے۔ مجموعی طور پر غالب کا بیان صاف اور واضح ہے۔ فانی کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ فانی غالب کے شعر کے تمام وجوہ بلاغت کا احاطہ نہ کر سکا بلکہ اس کا ذہن غالب کے شعر کے صرف پہلے مصرعہ کے مضمون میں ہی الجھ گیا اور چونکہ غالب کا دماغ فلسفیانہ قسم کا ہے اس لئے وہ مضمون کو بغیر دوسرے مصرعہ کے ناقص سمجھتا ہے اور اسی سبب سے اسو پہلے

مصرعہ میں اختصار کلام کو اختیار کرنا پڑا۔ غالب کو جو اعتراض ہے اس کے ثبوت میں وہ ایک اصول عام پیش کرتا ہے اور اپنی ذات کے علاوہ بھی صحیح اصول کا نفاذ کائنات میں محسوس کرتا ہے کہ: " دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر" فانی یاسیات کا امام ہے اس لئے اس میں قنوطیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ کسی اصول عام کو محسوس نہیں کرتا۔ اس کی قنوطیت اس مضمون کو اسکی ذات سے متعلق کرکے اس میں بھی یاس کا پہلو نمایاں کردیتی ہے کہ۔ " دل ہی نگاہ ناز کا ایک ادا شناس تھا" غالب کا انداز بیان ایسا ہے کہ اس کو اپنے خیال کی صحت اور پختگی پر یقین معلوم ہوتا ہے مگر فانی کے یہاں اس یقین کے بجائے شک سا نظر آرہا ہے جو یاس و قنوطیت کا لازمی اثر ہے۔ فانی چونکہ غالب کے صرف پہلے مصرعہ کے مضمون سے ہی متاثر ہوا ہے اس لئے اسی کی تفصیل و تشریح کرنے لگا۔ دوسرے مصرعہ کے مضمون کی نزاکت اور افادیت اس تاثر نے اس کی نظروں سے چھپا دی۔ غالب کا یہی شعر جب جگر کے سامنے آتا ہے تو اس پر فانی سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ :-

جس کا جتنا ظرف ہے اس سے سوا ملتا نہیں جلوۂ ساقی بقدر ہمتِ مردانہ ہے

جگر، غالب کے شعر کے صرف دوسرے مصرعہ سے متاثر ہوا ہے اور جس طرح فانی نے غالب کے پہلے مصرعہ کی تفصیل کر ڈالی تھی، جگر دوسرے مصرعہ کی تشریح کی طرف متوجہ ہوگیا۔ غالب کو اعتراض تھا کہ برق تجلی ہم پہ گرنے کے بجائے طور پر کیوں گرائی گئی ——————
—————— جگر طور اور تجلی طور کا ذکر بالکل حذف کردیتا ہے اور بادۂ ظرف قدح خوار سے اس کا ذہن " جلوۂ ساقی " کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ غالب نے اس اصول کو تسلیم کرلیا تھا کہ اس دنیا میں شراب ظرف قدح خوار کا لحاظ کرکے دی جاتی ہے۔ جگر اس اصول کو پہلے مصرعہ میں غالب کی نسبت واضح تر الفاظ میں کہہ دینے کے بعد صاحب تجلی پر اعتراض کے بجائے اس میں بھی اسی اصول کو نافذ دیکھتا ہے کہ ساقی کی تجلیات تو وہی ہیں مگر ہر شخص اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق اس سے مستفید ہوتا ہے۔

شیخ علی حزیں کا شعر ہے :-

از دوست بکونین نگردیم تسلی، ایں ہر دو بدست دکف افسوس ہماں ست

یہ مسلمہ ہے کہ یہ کل کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے مگر انسان کی تسلی خاطر کے لئے یہ بھی کافی نہیں ہے۔ انسان کے بلند حوصلہ کو حزیں بیان کرنا چاہتا ہے اور اس سے زیادہ بلند طریقہ اس بیان کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے۔ مصرعہ ثانی کو غور کرنا چاہئے کہ :-
"ایں ہر دو بدست وکف افسوس ہماں است" مولوی رضا علی صاحب وحشت نے حزیں کے اس شعر کو غالب کے اس شعر کے ساتھ درج کیا ہے کہ :-

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

غالب کے اس شعر کے لئے مولانا حالی یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں کہ " اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار کیا ہے یعنی میں جو دونوں جہان پاکر خاموش ہورہا تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اس پر قانع ہوگیا بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے کی شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی"۔ غالب کا مضمون حالانکہ بلند ہے مگر حزیں کا شعر جس پایہ کا ہے غالب وہاں تک نہیں پہونچ سکا
حزیں کے دوسرے مصرعہ کی بلندی اور بندش کی غیر معمولی چستی تو خاص طور پر قابل غور ہے۔ "کف افسوس ہمان است" اور
شرم سے تکرار نہ کرنے" میں بہت فرق ہے۔ حزیں نے اسی مضمون کو ایک اور شعر میں دوسرے پیرایہ سے کہا ہے :-

درعشق دل از کوثر و رضواں چہ کشاید از دوست تسلی نتواں گشت بہ اینہا

لیکن جو مضمون پہلے شعر میں ہے یہ اُس تک نہیں پہونچتا۔ جو مضمون اس شعر میں کہا گیا ہے وہ پہلے شعر کے صرف مصرعہ اول میں آگیا ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ یہاں صرف جنت اور اس کے لوازم کا ذکر ہے اور پہلے شعر میں "کونین" کا لفظ ہے۔ آخری شعر کا دوسرا مصرعہ اور پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کے الفاظ کی یکسانیت سے خیال ہوتا ہے کہ حزیں نے دوسرا شعر پہلے کہا ہے اور اس سے

پہلے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔ یہ گویا خود اپنے مضمون سابق میں اضافہ کرنے کی ایک مثال سمجھی جا سکتی ہے۔ ہر چند کہ اس کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ہمارا یہ خیال صحیح ہو لیکن حزیں کی نزاکت طبع کے لحاظ سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ دوسرے شعر میں جو مضمون سست بندش کے ساتھ کہا گیا تھا اس کو پھر کہا ہے اور بندش کی چستی کے ساتھ مضمون میں بھی اضافہ ہو گیا۔ غالب کے شعر کو اگر حزیں کے دوسرے شعر کے مقابلہ میں رکھا جائے تو غالب کا مضمون ضرور بڑھا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ غالب کا مدعا یہ ہے کہ وہ دونوں جہان پا لینے کے بعد مطمئن نہیں ہے اور اس میں اس امر کا اور بھی اضافہ موجود ہے کہ زیادہ مانگتے ہوئے شرم دامنگیر ہوئی۔ گویا اپنے بلند حوصلہ کا ذکر ساتھ ہی کر دیا ہے۔ فانی نے اس مضمون کے بالکل مخالف مضمون کہا ہے:-

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول　　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

فانی نے جو کچھ کہا ہے اس میں نعایم قدرت کی قیمت متعین کرنا اور ان کا تعلق انسان کے ساتھ واضح کرنا مقصود ہے۔ یعنی عیش دو عالم تو انسان کی ہوس کی غذا ہے اور دل درد آشنا جس کو نصیب ہو وہ قدرت کا کرم ہے کیونکہ یہ نعمت دو عالم سے گراں تر ہے مگر حزیں اور غالب نے جو مضمون کہا ہے کہ دونوں جہان میرے لئے ہونے کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں۔ عمومی طور پر انسانی حوصلہ کی بلندی سے عبارت ہے اور فانی اسی بلندی و وسعت ہمت کو مصائب عشق میں صبر و ضبط کے ساتھ محدود کر دیتا ہے۔ فانی نے اپنے اس مضمون کو ایک دوسرے شعر میں کہا ہے:-

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا　　　دولت دو جہان نہ دی اک دل مبتلا دیا

لیکن اس شعر میں مضمون پہلے کی نسبت فروتر ہے۔ فانی کے دونوں شعر باقیات میں ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسا شعر پہلے کہا گیا ہے۔ فانی کے کلام سے اس قسم کی چند مثالیں کسی دوسری جگہ درج ہیں۔ فانی نے پہلے شعر میں جو بات کہی ہے کہ "تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا" اسکے ساتھ علامہ اقبال کا یہ شعر یاد رکھنا چاہئے جو اس موضوع پر اصولی حیثیت رکھتا ہے کہ

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز　　　خدا کی دین ہے سرمایۂ غم فرہاد

قیاس یہ ہے کہ غالب کے سامنے حزیں کا دوسرا شعر تھا اور اس پر اس نے اپنا شعر انشا کیا کیونکہ غالب خود ایک مفکر اور فلسفی شاعر ہے اور یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ حزیں کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ کو وہ بالکل نظر انداز کر جاتا۔ حزیں دوسرے شعر میں انسانی حوصلہ کی بلندی کو جس طرح پیش کر رہا ہے۔ غالب نے اس کو انداز بدل کر حزیں سے بہتر طریقہ پر کہہ دیا ہے۔ فانی کی یاس نے اس کو یہاں بھی نہ چھوڑا۔ جس مضمون میں یاس و نومیدی کا کوئی پہلو نہ تھا فانی کی مخصوص انفرادیت اس میں بھی وہی رنگ، پیدا کر گئی جو دوسرے عام مضامین میں کرتی تھی۔ وہ شاعری میں خالص فلسفہ کو قبول نہیں کرتا بلکہ ہر جگہ جذبات کو شامل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس مضمون میں بھی اس نے جذبات کو شامل کر کے بحث کی صورت تبدیل کر دی ہے۔ جو حزیں، غالب اور فانی کی انفرادیت کس طرح نمایاں ہو رہی ہے۔

غالب کا شعر ہے:- ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غالب نے بڑی نازک بات کہی ہے کہ اگر تیرا ملنا دشوار ہوتا تو یہ بات میرے لئے آسان ہو جاتی کہ ایک امر دشوار ہے اسکے لئے اسی مناسبت سے کوشش و جدوجہد بھی کرتی طرف طبیعت راغب ہوتی مگر میرے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ پیش آگئی ہے کہ یہ امر خود دشوار نہیں ہے مگر تو مجھے پھر بھی نہیں مل سکتا۔ غالب کا ذہن دشواری اور آسانی کے فلسفہ کو انسانی ہمت اور جوش عمل کی نسبت سے دیکھ رہا ہے اور جس انداز اور اسلوب سے اس دقیق ترین مضمون کو اس شعر میں کہا گیا ہے اس سے زیادہ خیال میں نہیں آتا۔ غالب کا یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ فانی نے اس مضمون کو غالب سے لیا ہے:-

فال افزونیٔ مشکل ہے ہر آسانیٔ کار　　　میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا

فانی صرف غالب کے مضمون سے متاثر ہوا مگر اس پر اس کی نظر بالکل نہ پڑی کہ غالب کا طرز بیان اور طریق ادا کس قدر شگفتہ ہے اور ایک اصول کا افرا اپنے کاروبار عاشقی میں کس طرح محسوس کیا ہے اور غالب کے شعر کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے فانی اس سب کا احاطہ نہ کر سکا۔ اسی مضمون کو ایک جگہ پھر کہتا ہے:-

مشکل ہو تو آسان ہو مشکل ہی نہیں شاید آساں ہی نہیں ہوتی اللہ میری مشکل

اس شعر کی حالت بھی وہی ہے جو پہلے کی ہے اور غالب کے طرز بیان کو محسوس نہ کر سکنے کی وجہ سے فانی دونوں اشعار میں غالب سے پیچھے رہ گیا فانی نے دونوں جگہ صرف "مری مشکل" کہا ہے اور عشق کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسی مضمون کو جگر مرادآبادی نے کہا ہے اور آسانی اور مشکل کے اس فلسفہ میں عشق کی نسبت سے ایک لطیف اضافہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:-

وہ دشواریاں عشق کی حل ہوں کیونکر جو دشواریاں ہیں نہ آسانیاں ہیں

ہمارا تصور دشواری کو محسوس کر سکتا ہے یا اس کے مقابلہ میں آسانی کو۔ مگر عشق کی کیفیت ان سے جداگانہ ہے۔ اس کی اپنی ایک علاحدہ حالت ہے جس پر نہ دشواری کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ آسانی کا۔ اور یہ بجائے خود ایک ایسی دشواری ہے کہ اس کے حل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ گویا ایک لاینحل مسئلہ ہے اور صرف اسی سبب سے اس کو دشواری کہتا ہے ورنہ حقیقتاً وہ نہ دشواری ہے نہ آسانی۔ جگر نے بھی غالب کے متذکرہ شعر سے استفادہ کیا ہے مگر اس فلسفہ پر پوری طرح غور کر لیا ہے جس کو غالب نے بیان کیا تھا۔ اور اسمیں بڑا ہی لطیف اضافہ کیا ہے۔ فانی غالب کے طرز و فکر و نظر کو پوری طرح احاطہ نہ کر سکا جگر نے اس کا احاطہ کامل طور پر کر لیا اور اسی لئے اس کا شعر فانی سے بہت بڑھ گیا۔

اس سلسلہ میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جس طرح تمام افراد قوم وقت کے تقاضوں اور اپنے عہد کی تہذیب سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح شاعر بھی متاثر ہوا کرتا ہے۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ شاعر قوموں کی تعمیر کرتے ہیں لیکن خود شاعر کی تعمیر اس کا اپنا عہد کرتا ہے اور ہر شاعر اپنے عہد کی مقتضیات اور قوم کی نفسیات سے اس حد تک متاثر ہونے پر مجبور ہے۔ تہذیب و تمدن میں تغیر کی رفتار جس قدر سست ہے اس سے کہیں زیادہ سست اور مبہم رفتار ادبیات میں انقلاب و تغیر کی ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبیات میں تغیر کرنے والے خود ہر انقلاب تہذیب و تمدن کو اس وقت تک باشعور طور پر محسوس نہیں کرتے جب تک وہ اپنا کامل نتیجہ پیدا نہ کر لے۔

ہر عہد کی تہذیب مختلف نظریات و عقاید اور خیالات و مراسم کی حامل ہوتی ہے مگر اس میں دور گزشتہ کے اثرات ضرور شامل رہتے ہیں اور ایک شاعر یا مصنف کی تعمیر میں چونکہ ایک قوی ترین عنصر عقاید ماضی سے پوری واقفیت بھی ہے اس لئے اس کے یہاں ان افکار و خیالات کا اعادہ نہ ہونا ضرور تعجب انگیز ہوگا جو اس کے پیش روؤں نے پیش کئے ہیں۔ لیکن ہر زمانہ کی تہذیب میں دوسرے زمانوں سے جو فرق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک نظریہ کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس نظریہ کے بعض دیگر اطراف تعلیم و عمل محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے قوم کی تہذیب اور خیالات میں تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ جو نظریات کل تک صرف ضمنی اور سطحی تھے آج اہمیت حاصل کر کے مستقل مباحث بن جاتے ہیں ——————— اور جن نظریات کو واقعی اہمیت حاصل تھی وہ صرف ضمنی اور سطحی بن کر رہ جاتے ہیں اور یہی انقلاب شعرا کے کلام میں بھی ہوتا ہے مگر اس تمام تغیر و انقلاب کی رفتار بہت ہی سست ہوتی ہے۔ نیز ایک اصول یا نظریہ کی حکمرانی ایک قوم کے دل و دماغ پر اتنی مدت تک باقی رہتی ہے کہ وہ اس قوم کے خصایص میں شمار کیا جانے لگتا ہے اور اس نظریہ کی عملی اہمیت ختم ہو جانے کے بعد بھی افراد قوم اسکو ایک مسلمہ حقیقت کی طرح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس انقلاب سے شعرا کا متاثر ہونا ضروری ہے اور ان کے کلام میں شعرائے سابق کے مضامین اسی ترتیب سے ملنا لازمی ہیں جس ترتیب سے زمانہ خیالات میں تغیر کرتا چلا آ رہا ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے جس کے لئے

کوئی شاعر بھی قابلِ ملامت نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر اس مسئلہ پر ذرا وسعت اور گہرائی کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دُنیا کے تمام علوم میں یہی حال ہے کہ بعد کے آنے والے اپنے پیشروؤں سے استفادہ کرتے چلے آئے ہیں اور تمام علوم و فنون کی ترقی کا انحصار صرف اسی پر ہے اگر قدما کے افکار و خیالات سے استفادہ نہ کیا جائے تو تمام علمی ترقیاں دفعتاً رک جائیں گی۔

شیخ سعدی کے عہد میں عشق و محبت۔ تصوف اور اخلاق و موعظت کی طرف رغبت قومی خصوصیات تھیں۔ سعدی اپنے عہد کی روح ہیں اور انھوں نے قومی اخلاق کے ہر سہ عناصر کو اپنے کلام سے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن قومی اخلاق میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے اور بعد کے شعراء کے کلام میں وہ چیزیں مجموعی حیثیت سے نظر نہیں آتیں۔ خواجہ حافظ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور تصوف بھی اگر پیش کرتے ہیں تو اسی رنگ میں اور اخلاق و موعظت و پند و نصائح کے لئے بھی ان کو دوسرا پیرایۂ بیان نہیں ملتا۔ قوم کے اخلاق میں جو تبدیلی ہو چکی تھی اُس سے ان کا متاثر نہ ہونا تعجب انگیز تھا ساری قوم پر ایک خمار مستی چھایا ہوا تھا۔ جو خواجہ حافظ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود خواجہ کے یہاں سیکڑوں مضامین وہی ہیں جو شیخ نے کہے ہیں ان میں سے اکثر اشعار علامہ شبلی نے شعر العجم تذکرہ خواجہ حافظ میں نقل کئے ہیں۔ سعدی و حافظ کے زمانوں کے مقتضیات دونوں کے کلام میں علحدہ علحدہ موجود ہیں لیکن علاوہ ان کے دونوں کے زمانوں کے مشترک مقتضیات بھی تقریباً یکساں الفاظ میں ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو کے بعض اعتراضات پر ہم گزشتہ صفحات میں گفتگو کر چکے ہیں۔ غزل میں وہ شیخ سعدی کے پیرو اور متبع ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔ خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت ۔۔۔ شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔ در عزلت یا جوانی دہد ۔۔۔ در خوشی طبع نشانی دہد

تن زن از ان ہم کہ کساں گفتہ اند ۔۔۔ ہرچہ تو گوئی بہ از ان گفتہ اند

نوبت سعدی کہ مبادا کہن ۔۔۔ شرم نداری کہ بگوئی سخن

سلمان ساوجی کے لئے مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ:۔ " سلمان کے اکثر مضامین اساتذۂ قدیم خصوصاً کمال اسمٰعیل سے ماخوذ ہیں لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں ۔۔۔ خواجہ حافظ کے کمال فن نے ایک زمانہ کو مسخر کر لیا اور تمام شعرائے مابعد نے کوشش کر کے خواجہ کے اتباع میں جد و جہد کی اور اس کا اعتراف بھی کرتے رہے، عرفی کے مزاج میں صد درجہ استغنا ہے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا مگر خواجہ حافظ کیلئے پھر بھی کہتا ہے کہ:۔ بر آں تتبع حافظ رواست چوں عرفی ٭ کہ دل بکار دو دادِ سخن وری داند

صائب کہتے ہیں:۔ رواست صائب اگر نیست از رہ دعوے ۔۔۔ تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی ست

سلیم کہتا ہے:۔ سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ شد ۔۔۔ کہ نشۂ بیش بود در شراب شیرازی

اور خود خواجہ حافظ کا کیا حال ہے وہ انہی سے دریافت کیجئے۔ مولانا نظامی کے لئے فرماتے ہیں کہ:۔

چو سلک درِ خوشابست شعر نظم تو حافظ ۔۔۔ کہ گاہ لطف سبق می برد ز نظم نظامی

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:۔ چہ جائے گفتہ خواجو و شعر سلمانست ۔۔۔ کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

گویا ظہیر فاریابی کے کلام کو معیاری چیز قرار دیکر اپنے کلام کو اُس سے بھی بہتر قرار دیتے ہیں۔ خواجو کرمانی کے لئے فرماتے ہیں۔

استاد غزل سعدی پیش ہمہ کس اما ۔۔۔ دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

یہ صرف عقیدتمندانہ اعتراف ہی نہیں ہے بلکہ خواجہ حافظ نے اپنی شاعری کا سنگ بنیاد ہی خواجو کے طرز سخن پر رکھا ہے۔ علامہ شبلی شعر العجم میں تذکرہ خواجہ حافظ میں لکھتے ہیں " خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا"

اس نوع کے اعترافات ہر شاعر کے یہاں ضرور مل جائیں گے جن کا تعلق استفادہ سے ہے نہ کہ سرقہ سے۔

محمد عزیز حسن

امریکہ کا ڈالر اور روس کی جنگی طیاریاں

امریکہ اور روس کے موجودہ کشیدہ تعلقات کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خود امریکہ نے روس کی جنگی طیاریوں میں اس کی مدد کی ہے تو اس کا کسی کو یقین نہ آئے گا، لیکن واقعہ یہی ہے کہ امریکہ کے ڈالر اور وہاں کی ٹکنکل قابلیت نے روس کی فوجی آراستگی کو زیادہ آسان کر دیا۔

ہر چند براہ راست امریکہ نے روس کو نہ ڈالر دئے ہیں اور نہ اپنی صنعتی ترقیوں کے راز بتائے ہیں، لیکن امریکہ کی بہت سی ایسی مقامی پیداوار جو سامانِ حرب کی طیاری کے لئے ضروری ہے اور مشینری کے بہت سے نازک اوزار دوسرے ملکوں سے بکثرت روس تک پہونچ رہے ہیں۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک تو امریکہ نے براہ راست ایک ارب دس کروڑ ڈالر مالیت کی چیزیں ادھار پٹہ کے سلسلہ میں روس کو دیں، اس کے علاوہ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں آباد کاری کے لئے ۲۰ کروڑ ڈالر دئے ــــ اس کے بعد جب مارشل پلان کے تحت امریکہ نے دوسرے ملکوں کو ڈالر دینے شروع کئے تو روس کو اس فہرست سے نکال دیا لیکن جن سولہ ملکوں کو مارشل پلان کے تحت امداد دی گئی تھی ان کی وساطت سے روس کو بہت کچھ مل گیا۔ اور تقریبًا ساڑھے بیس کروڑ ڈالر کی خام پیداوار اور مشینری کے اوزار جو سامان حرب کی طیاری کے لئے ضروری تھے روس کو پہونچ گئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ جو خام اشیاء مغربی یورپ کے ممالک کو امریکہ کی طرف سے پہونچتی تھیں وہاں ان سے وہ چیزیں طیار کی جاتی تھیں جن کی روس کو ضرورت تھی اور روس اپنا گیہوں، روئی، تماکو اور سمور وغیرہ دیکر ان اشیاء کو وہاں سے حاصل کر لیتا تھا، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ پچھلے دس سال میں ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کا مال ان ممالک سے روس نے حاصل کیا[1]۔

۱۹۴۵ء میں مغربی جرمنی اور جاپان کے متعلق امریکہ نے جو پالیسی اختیار کی اس سے بھی روس کو بہت فایدہ پہونچا۔ جنگ کے بعد مغربی جرمنی میں اربوں ڈالر کی صنعتی مشینیں اور اوزار وغیرہ موجود تھے، لیکن امریکہ نے ان سب کو روس کے علاقہ میں منتقل ہو جانے دیا جس کے ساتھ بہت سے اچھے کاریگر بھی روس پہونچ گئے۔ اسی طرح جاپان کی طرف وہاں کی قومی حکومت کی امداد بند کر کے روس کو اس کا موقعہ دیدیا گیا کہ وہ منچوریا کی تمام صنعتی ذرایع اپنے یہاں منتقل کر دے۔

الغرض منچوریا اور مغربی جرمنی کی طرف سے صنعتی ذرایع کا روس میں منتقل ہو جانا اور مارشل پلان سے فایدہ اٹھانے والے مغربی یورپ کے ممالک اور روس کے درمیان آزاد تجارت، ان دو باتوں نے روس کو اس کی فوجی تنظیم میں بہت مدد پہونچائی، اس کے علاوہ اور بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو روس کی معاون ہوئیں، مثلًا ادھار پٹہ کی رعایت کی وجہ سے روس کو امریکی صنعت کے بہت سے راز معلوم ہو گئے اور یورپ سے پورے صنعتی پلانٹ کوہ یورال پہونچ گئے۔ ان پلانٹ میں تین پلانٹ پٹرول صاف کرنے کے اور ایک ٹایر فیکٹری کا بہت اہم تھے۔ ان کے علاوہ ایک برقی قوت کا پروگرام ساڑھے تیرہ کروڑ ڈالر کا، ریلوے روڈ اور توسیع فولاد

[1] سنہ ۱۹۵۰ء کے ابتدائی تین ماہ میں برطانیہ سے ۴ کروڑ ۲۵ لاکھ ۱۳ ہزار ڈالر کی مشینری گئی، فرانس سے ایک کروڑ ۸۶ لاکھ ۹۰ ہزار ڈالر کا مال گیا، اور بلجیم نے ایک کروڑ ۹۶ لاکھ تین ہزار ڈالر کی اشیاء روس کو فراہم کیں۔

کے دو پروگرام ۳۰ کروڑ ڈالر کے روس کو دئے گئے۔

اسی کے ساتھ جب سوویٹ کا خریداری مشن جو ۱۵۰۰ افراد پر مشتمل تھا، امریکہ پہونچا تو اس کو اجازت دیدی گئی کہ وہ امریکہ کے صنعتی مرکزوں اور نقشوں کے فوٹو حاصل کرسکے۔ آٹم بم بنانے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے وہ بھی امریکہ سے متعدد بار روس کو منتقل کی گئیں۔

بجلی کے اور جہاز سازی کے متعدد کارخانوں کے نقشے، مختلف دھاتوں کی ریسرچ کے نتائج، بہت سے فوجی راز دستاویزوں اور تصویریوں کی صورت میں جس کثرت سے روس کو حاصل ہوئے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب واسلی لنکو (جو سوویٹ خریداری مشن کا ممبر تھا) روس واپس گیا تو پورے چھ بیگ انھیں نقشوں اور دستاویزوں سے بھرے ہوئے تھے۔

لڑائی کے بعد امریکہ کے محکمہ تجارت نے روس کو اپنی پیٹنٹ مصنوعات کی رسائی تک کا بھی موقعہ دیدیا تھا اور جو علمی و ٹکنکل راز مغربی جرمنی کے قبضہ کے بعد امریکہ کو معلوم ہوئے تھے ان کا حال بھی روس سے نہ چھپایا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تیرہ ہزار پیٹنٹ چیزوں کی خوردبینی تصویریں ماسکو پہونچ گئیں۔

ادھار پٹہ کے سلسلہ میں امریکہ کی طرف سے روس کو ۳۰ فی صدی چیزیں ملیں جن میں سے چند کی تعداد یہ ہے:-

(۱) موٹر ٹرک = ۴۷۶۰۰۰ - (۲) ٹینک = ۷۰۵۶ (۳) جیب کار = ۵۱۵۰۳ - (۴) کھینچنے والا مسالہ ۴۴۵۰۰۰ ٹن (۵) فوجی جوتے ۱۴۱۵۰۰۰۰ جوڑ - (۶) مشینری اور اوزار = ایک ارب دس کروڑ ڈالر کی۔

مغربی جرمنی میں جتنے صنعتی ادارے پائے جاتے ہیں وہ بھی مشرقی جرمنی کو (جہاں روس کا اقتدار ہے) ہر قسم کا مال فراہم کرتے ہیں جن کی قیمت کا اندازہ ۳۴ کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔ ان اشیاء میں لوہے کی چادریں، اوزار، ربر اور تانبا بھی شامل ہے اسی طرح ویانا کی ٹریڈنگ کارپوریشن جو روسیوں کے ہاتھ میں ہے ۴۰ لاکھ ڈالر کی مالیت کا سامان ہر ہفتہ ماسکو پہونچا رہی ہے۔

مارشل پلان کی رو سے امریکہ نے مغربی یوروپ کے ملکوں کو امداد ۷۷ کروڑ ڈالر سے کی، اور ان ممالک نے ۱۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر مالیت کی مشینیں اور اوزار روس کے ہاتھ فروخت کئے، گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہر وہ ڈالر جو مغربی یوروپ کو امریکہ سے ملتا ہے اس میں سے ۲۲ سنٹ روس پہونچ جاتا ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۵۰ء کو رسل میک نے ایوان امریکہ میں ظاہر کیا کہ " جن مغربی ممالک کو ہم اسلحہ فراہم کررہے ہیں ان کے ذریعہ سے صرف ایک سال ۱۹۴۹ء کے اندر ایک ارب ڈالر کا مال روس کو پہونچا"

لکھنوی شاعری کی چند خصوصیتیں

پہلے "لکھنوی شاعری" کے معنی سُن لیجئے۔ "لکھنوی شاعری" سے میری مراد ناسخ و آتش کی شاعری۔ ان کے پیرؤوں اور شاگردوں کی شاعری۔ ان کے شاگردوں کے شاگردوں کی شاعری ہے۔ ان جملہ حضرات کی شاعری (غزل گوئی) کے متعلق مجموعی طور پر کبھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور انفرادی طور پر بھی تفصیلی تنقیدیں ہو چکی ہیں۔ بایں ہمہ ان بزرگوں کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ان کی شاعری کی بعض اہم خصوصیتیں ایسی بھی ہیں جنھیں یا تو ناقدین نے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا یا اس طرف اُن کی نظر ہی نہیں گئی اور اگر کسی نے ان خصوصیات کے متعلق کچھ لکھا بھی ہے تو اس کی حیثیت اجمالی اشاروں سے زیادہ نہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں جو چیزیں خاص طور پر ما بہ الامتیاز ہیں ان میں سے ایک محبوب کی جنس کا تفاوت بھی ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں شعرائے دہلی سے محبوب "دلی کے کج کلاہ لڑکے" تھے[1]

بعض بزرگوں نے اس تلخ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کی ہے مگر انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ الغرض یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بارھویں صدی ہجری میں سادہ رویوں سے عشق بازی ہماری سوسائٹی کا ایک نہایت محبوب مشغلہ تھی، شعرا بھی آخر اس سوسائٹی کے افراد تھے۔ اپنے دور کے عام رجحان سے کیونکر بچ سکتے تھے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس زمانہ میں ہر شاعر امرد پرست تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ان کا محبوب اکثر و بیشتر ایک سادہ رو کج کلاہ ہی ہے۔

اس محل پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان بزرگوں کی عشقیہ شاعری زیادہ تر "روایت" پر مبنی ہے جس میں اصلیت کم اور نقالی زیادہ ہے۔ محمد شاہی دور کے شعرا نے اپنی غزلوں میں کہیں آپ بیتی اور کہیں جگ بیتی بیان کی ہے۔ ان کے بعد آنے والوں نے روایتی طور پر عموماً اپنے پیشروؤں کی تقلید کی ہے۔ تو اس طرح گویا ایک طبقہ تو ان شعرا کا ہے جنھوں نے درحقیقت سادہ رویوں سے عشق بازی کی۔ اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی "امرد پرستی" تقریباً ۹۵ فیصدی اپنے پیشروؤں کی نقالی پر مبنی ہے۔ اصلیت نہیں۔

لکھنوی شاعری کی پہلی خصوصیت

تیسری جماعت ان لکھنوی شعرا کی ہے جن کی محبوبہ لازمی طور پر صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس محل پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لکھنوی شاعر کی محبوبہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے تو پھر وہ "خط" اور "مسوں" اور "ٹوپی" اور "دستار" کا ذکر کیوں کرتا ہے اور کنایتہً یا صراحتہً ایک سادہ رو سے سروکار کیوں رکھتا ہے؟ جواب اسکا یہ ہے کہ اول تو لکھنوی شعرا کے یہاں اس قسم کے اشعار آٹے میں نمک کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لئے ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس کے علاوہ یہ اشعار عموماً ضلع جگت یا رعایت لفظی کے شوق میں کہے گئے ہیں اور یہ حقیقت خود ان اشعار سے

---

[1] اشرف الدین علی خاں پیام :- دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا

سوز :- گئے گھر میں جو اپنے ہم سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو — اُئے ہے ہے، اُئے ہے ہے، اُئے ہے ہو

میر :- کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ — دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

ثابت ہے۔ اب رہا یہ امر کہ لکھنوی شاعری کی محبوبہ "عورت" ہے تو اس کا ثبوت ضرورت سے زیادہ خود اشعار میں موجود ہے۔ لکھنؤ کے غزلگو شعرا یا بالفاظِ دیگر لکھنؤ کے عشاق میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کسی پردہ نشیں سے محبت کرتے ہیں اور ان کی تعداد نسبتۃً کم ہے۔ دوسرے وہ جو زنانِ بازاری کے دلدادہ ہیں اور اکثریت ان ہی کی ہے۔

"پردہ نشینوں" کے عشاق نے اپنی محبوبہ کا ذکر کرتے وقت اگرچہ زبان کی روایات کو برقرار رکھا ہے یعنی اس کے لئے مونث کی بجائے مذکر کے صیغے استعمال کئے ہیں کہ افعال و صفات مذکر کے یہ گہرے پردے حقیقت کا چہرہ نہیں چھپا سکتے۔ آیئے ان عشق گرانِ پردہ نشین کی ایک جھلک آپ بھی دیکھ لیجئے:۔

قرار :- شاید کہ کوئی پردہ نشیں جھانک رہا ہے　　آج آئیں نظر روزنِ دیوار کی آنکھیں
آغا :- نظر پڑی ہے تری جب سے پٹ کی آڑ میں آنکھ　　لگی ہی رہتی ہے اب بت مری کواڑ میں آنکھ
گریاں :- ہم آئے تو چلمن میں لگائے گلِ نرگس　　در پردہ دکھاتا ہے وہ رشکِ چمن آنکھیں
نجید :- للّٰہ جھروکوں سے دکھا جایئے صورت　　مشتاق ہیں اب جلوۂ دیدار کی آنکھیں
کیف :- نگۂ عاشقِ مشتاق پہونچ جاتی ہے　　لاکھ گھونگھٹ کو کرے یار حصارِ عارض
محسن :- ہم سے کاندھا جو بدل لیں تری ڈولی کے کہار　　عرشِ اعلیٰ سے بھی اونچا ہو ہمارا شانہ

یہ پردہ اور چلمن اور کواڑ کی اوٹ سے تاک جھانک، یہ روزنِ دیوار و در اور جھروکوں سے نظر بازیاں اور یہ ڈولی کی سواری کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

دوسری خصوصیت، سامانِ آرائش :۔ زلف، کاکل، گیسو، جوڑا، چوٹی، کنگھی اور مشاطہ کے علاوہ لکھنوی شعرا کے یہاں نسوانی آرائش کی پوری تفصیل موجود ہے اور تھوڑی سی کوشش اور تلاش سے سرمہ، مسّی، غازہ، مہندی، فندق، افشاں پھول، سیندور، پان، عطر، غرض ہر چیز کے متعلق بکثرت اشعار جمع کئے جا سکتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں صرف ایک شعر ہر چیز کے متعلق نقل کرتے ہیں :۔

محسن :- ہفتے بھر میں انھیں فرصت نہیں ان ساتوں سے　　پان، عطر، آئینہ، مہندی، مسی، سرمہ، شانہ
سحر :- ہتیلی صفائی سے آئینہ ہے　　لو مسّی دیکھو دھڑی ہاتھ میں
علی :- کہکشاں دکھلاتی ہے جلوہ شبِ تاریک میں　　خط نہیں سیندور کا اے جانِ جاں بالائے سر
خلیل :- گل فندقیں ہیں وز دِ حنا موتیا کے پھول　　گلدستۂ جناں ہیں ترے اے نگار ہاتھ
بحر :- غازے سے لالہ زار شفق کو خجل کیا　　افشاں چنی تو چاندنی کا کھیت کٹ گیا

تیسری خصوصیت۔ زیورات :۔ مستورات کے دوسرے سامان آرائش کے علاوہ لکھنوی شاعری میں زیورات کی اتنی تفصیل ملتی ہے کہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ لکھنوی شاعری کو اگر زیورات کا صندوقچہ بلکہ جوہری کی دوکان یا جواہر خانہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں، جہاں ہر قسم کا زیور آپ کو بکثرت اور بہ آسانی دستیاب ہو سکتا ہے۔

مطالعہ کے دوران میں (۱) سر کے زیورات میں تعویذ، جھومر، چھپکا، چاند سورج، سرپیچ، طرہ، ٹیکا، موتی کی لڑی یا سلک گہر وغیرہ۔

(۲) کانوں کے زیورات میں بجلیاں، بندے، بالی، پتا، انتی، پتّی، کرن پھول، جھمکا، بالا، کان، بالے کی مچھلی، جھالا، مچھلی، سبزہ، چھلا اور گوہر وغیرہ۔

(۳) ناک کے زیور میں، نتھنی، نتھ، بلاق، کیل، سونے کی کیل، ہیرے کی کیل اور جڑاؤ کیل وغیرہ۔

(۴) گلے کے زیور میں، زنجیر، ہیکل، دھکدھکی، طوق، جگنی اور چمپا کلی۔
(۵) ہاتھوں کے زیورات میں، کنگن، لچھا، پہونچی، پٹڑی، جہانگیری، چھلا، آرسی، اِکّا، نورتن، جوشن، حسین بند، علی بند، شوق بند، انڈویان اور چوڑی۔
(۶) پاؤں کے زیور میں، بچھوے، چھلے، انوٹ، کڑے، گھنگرو، گل چھڑے، خلخال، پٹڑی، چھاگل اور پازیب۔

زیورات کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ نہ اسے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اگر کوئی چاہے تو اس کا امکان ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

ناسخ :۔ چمپا کے پھول میں ہے نہ گل کی کلی میں ہے — جیسی ترے گلے کی ہے چمپا کلی میں بو
برق :۔ چاند سورج نہیں بالوں میں طلسم نو ہے — ایک جا جمع ہیں مہر و مہ تاباں سر پر
ناسخ :۔ کرتے ہیں عالم کو جس کے پاؤں کے بچھوے شہید — اس ستمگر کی بلا لیتی ہے خنجر ہاتھ میں
بحر :۔ پہنے جو موتیوں کے کرن پھول یار نے — تاروں پہ اوس پڑ گئی خوشہ ٹھٹر گیا
ناسخ :۔ اجی یہ عرشِ معلیٰ کے گوشوارے کا — گہر کہاں سے تمھارے بلاق میں آیا
بحر :۔ لختِ جگر سے میرے قیمت میں بڑھ چلے تھے — جھوٹے پڑے نگینے سب اس کے نورتن میں

چوتھی خصوصیت۔ زنانہ لباس اور اجزائے لباس ۔ زیورات کے علاوہ لکھنوی شاعری میں نسوانی لباس کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ رنگ برنگ کے دوپٹوں، اوڑھنیوں اور رنگا رنگ پاجاموں، خصوصاً طرح طرح کے پائینچوں کے متعلق آپ بہت سے اشعار بآسانی جمع کر سکتے ہیں اور نیفے اور موباف کا ذکر بھی کمیاب نہیں۔ کرتی اور محرم اور انگیا نیز انگیا کے اجزاء (مثلاً انگیا کا بنگلہ انگیا کی کٹوریاں، انگیا کا گھاٹ، انگیا کا ستھرا، انگیا کے پان، انگیا کے پنکھے، انگیا کی چڑیا، انگیا کی دیواریں اور انگیا کی ڈوری) تو اس دور کی شاعری کا ایک خاص موضوع ہیں اور اکثر شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

تسخیر :۔ مثل کمر لچکتی ہیں دونوں کلائیاں — بھاری ہیں پائینچے دمِ رفتار ہاتھ میں
عشقی :۔ غضب نیرنگ عکس عارض رنگیں نے دکھلایا — سنہرا تھا دوپٹا ہو گیا گلنار کاندھے پر
بحر :۔ محرم کے ستارے ٹوٹتے ہیں — پستاں کے انار چھوٹتے ہیں
ناصر :۔ سرخ پاجامہ ہے، گوٹا ہر کلی میں ہے لگا۔ — پھولوں کی چھڑیاں ہیں اس رشکِ چمن کی پنڈلیاں
جرأت :۔ موبافِ زر لپیٹ دیا منھ کے عکس نے — گرہن پہ آکے بن گئی گوٹے کا بادلہ زلف

پانچویں خصوصیت۔ محبوبہ کے اعضائے بدن کا تذکرہ ۔ عریاں، فحش اور حیا سوز اشعار ہر زبان اور ہر زمانہ میں لکھے گئے اس لئے عریانی کو لکھنوی شاعری کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اعضائے نسوانی کا تذکرہ اس عریانی اور اس فراوانی کے ساتھ غالباً اور کہیں نہ مل سکے گا۔ پھر دوسری زبانوں میں اور خود اُردو کے مختلف ادوار میں صرف بعض مخصوص افراد کا میلان عریاں نگاری کی طرف رہا ہے لیکن لکھنوی شاعری اس خصوصیت میں کہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی کہ محبوبہ کے اعضائے بدن مثلاً سینے، چھاتیوں، ناف، پیٹ، کمر، سرین، کولوں، رانوں، اور پنڈلیوں کے متعلق عریاں اور حیا سوز اشعار صرف بازاری شعرا ہی نے نہیں لکھے بلکہ اُن بزرگوں نے بھی اس غلاظت کو اُچھالا ہے جو سوسائٹی میں معزز اور مقتدر سمجھے جاتے تھے۔ پاسِ تہذیب اجازت نہیں دیتا کہ ان اشعار کا نمونہ پیش کیا جائے۔ تحقیق کے طالب تذکرہ سراپا سخن تالیف محسن ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، عریانی اور فحش گوئی کا عنصر ہر زبان کی شاعری میں موجود ہے لیکن ہر زبان اور ہر دور میں یہ چیز صرف چند شعرا تک محدود رہی ہے اس کے برعکس لکھنوی شعرا کی اکثریت اس حمام میں یہ چیز صرف چند شعرا تک محدود نہیں ہے،

اس کے برعکس لکھنوی شعرا کی اکثریت اس حمام میں ننگی نظر آتی ہے۔ اس محل پر ہم پھر ایک بار اس بات کو دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ لکھنوی شعرا سے ہماری مراد ناسخ و آتش اور ان کے پیروؤں اور شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں سے ہے۔

چھٹی خصوصیت۔ طوائفیں اور رقص و سرود۔ ہم ابتدا میں کہ آئے ہیں کہ لکھنؤ کے غزل گو شعرا یا بالفاظ دیگر لکھنؤ کے عشاق میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کسی پردہ نشین سے محبت کرتے ہیں اور اُن کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ دوسرے وہ جو زنانِ بازاری کے دلدادہ ہیں اور اکثریت انھیں کی ہے۔ پردہ نشینوں کی تاک جھانک آپ دیکھ چکے۔ آئیے اب ذرا اِن زہرہ وشوں سے نظر ملائیے، جن کی فتنہ طرازیوں نے لکھنؤ میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ عیش و عشرت کی صحبتیں اور رقص و سرود کی محفلیں معمولاتِ زندگی میں داخل تھیں اور عشق و محبت کی رنگین داستانیں ہر روز طیار ہوتی تھیں۔ زندگی کے اس رنگین دور کی تصویریں صرف تاریخ کے اوراق ہی میں محفوظ نہیں، اشعار کے آئینوں میں بھی عکس فگن ہیں۔ اُس عہد کے اکثر ممتاز شعرا نے کسی نہ کسی رشکِ ناہید کے رقص و سرود کا ذکر نہایت بے اختیارانہ طور پر کیا ہے، آئیے گھڑی بھر کے لئے اس بزم میں آپ بھی شریک ہو جائیے۔

رقص و سرود

صحبت :- ہو گیا ہم کو جنوں ٹکڑے گریباں کو کیا / رکھ لیا اُس نے دمِ رقص جو داماں سر پہ

حسام :- بے حجابی میں بھی پردہ ہی رہا عاشق سے / رقص میں بھی نظر آئے نہ داماں عارض

فروغ :- کیا خوشنما بنائے ہیں حق نے تمھارے ہاتھ / کرتے ہو وقتِ رقص ہیں کیا کیا اشارے ہاتھ

تاثیر :- ہاتھوں کو ناچ میں جو کمر پہ اُٹھائیے / دریائے حسن آپ کا بڑھ جائے چار ہاتھ

رقت :- وقتِ رقص آگے بڑھا رکھ کے وہ جب ہاتھ پہ ہاتھ / غش ہوئے، لوٹ گئے مار کے سب ہاتھ پہ ہاتھ

شہید :- دستِ رنگیں جب کہ دکھلائی دیا ہنگامِ رقص / شمعِ محفل جل گئی اُس خوش ادا کے ہاتھ سے

سیر :- کنگن چمکتے ہیں جو دمِ رقص ہاتھوں سے / ہیں اہلِ بزم کے لئے بجلی کلائیاں

وزیر :- چل رہے ہیں پاؤں کے ہمراہ اگر ہنگامِ رقص / کرتی ہیں خوں ریزیاں ہر ہر قدم پر اُنگلیاں

مضطر :- وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے یہ کہتے ہیں رقص میں / مجرا کریں جواب کوئی ہم سے بچائے دل

قہر :- ناچ کا حسن بڑھ گیا دونا / لچکے سب اسے حسین کمر کو لے

سرور :- کرتے ہیں سحر رقص میں اس گلبدن کے پاؤں / کیا کیا سماں دکھاتے ہیں طاؤس بن کے پاؤں

مخمور :- بولی گردوں کو بھی انداز یہ آتا نہیں / رقص میں چالاک ہیں ایسے تمھارے ہاتھ پاؤں

ناسخ :- مثلِ رفتار اُج اُس کے رقص کی بھی کرے نقل / پینجنی پہنا دوں اے کبکِ خراماں پاؤں میں

سالک :- اس ادا سے بزم میں رقصاں ہوا وہ رشکِ ماہ / بن گیا گھنگرو ہر اک چشمِ تماشا پاؤں میں

ناسخ :- رقص میں آتی نہیں یہ تیرے گھنگرو کی صدا / کرتے ہیں آسودگانِ خاک شیون زیر پا

صغیر :- سیاہی پتلیوں کی یہ بھی اک پردہ ہے ظاہر کا / پھرا کرتی ہے تیری سرمئی پشواز آنکھوں میں

بہار :- ٹھاٹھ پر تم آ گئے یا ٹھاٹھ باندھا ساز کا / بھاؤ محفل میں بتایا یا بتائیں گھائیاں

محسن :- آواز تالیوں کی ترے سم سے کم نہیں / کانوں نے بھی سنیں نہیں ایسی ہتھیلیاں

ناسخ :- آواز یہ ہوتی نہیں زنہار گلے میں / سمجھو نہ رگیں، ساز کے ہیں تار گلے میں

اخگر :- ہے شرم سے ناہید کا دم بند فلک پر / گانے کی تمھارے ہے یہ تاثیر گلے میں

محسن :- بے حال کر دیا مجھے گانے نے آپ کے / لے ہے بلا کی، قہر کا کھٹکا گلے میں ہے

برق :۔ جوشِ جنوں میں رہتے ہیں صحرا کے سامنے — جنگلا وہ روز گاتے ہیں آ آ کے سامنے

لکھنؤ کے اس دور کی مخصوص سوسائٹی کے بعض پہلوؤں پر مندرجہ ذیل اشعار سے روشنی پڑتی ہے :۔

برق :۔ نیچے ہم بیٹھے ہیں کوٹھے پہ الگ صحبت ہے — اب تو ہوتے ہیں ستم اے گلِ خنداں سر پہ

قلق :۔ پھر ہاتھ میں ہے ہاتھ سرِ چوک غیر کا — نکلے ہیں رفتہ رفتہ پھر اس سیم تن کے پاؤں

امانت :۔ غیروں کے نشّے بزم میں کیا کیا ہرن ہوئے — ہاتھ اُس نے جب رکھا مرے مستانہ دوش پہ

ناسخ :۔ لوگوں میں ہونٹ چوم لئے ہم نے کیا کیا، — غصّے سے کیوں نہ دانت تلے وہ دبائے ہونٹ

محسن :۔ مانگا جو میں نے بوسۂ لب بزمِ غیر میں — تیوری چڑھائی دانت سے اُس نے دبا کے ہونٹ

سحر :۔ اپنی جگہ پہ دیکھ سکیں گے نہ غیر کو — جایا کریں گے اور ہی رستے سے سیر کو

ساتویں خصوصیت ۔ ہندوانہ الفاظ۔ رسم و رواج اور روایات ۔ لکھنوی شعرا نے اگرچہ ہندی کے بہت سے ایسے الفاظ اور محاورے ترک کر دئے جو دہلی میں عام طور پر مروّج تھے اور زبان کو نہ صرف فارسی ترکیبوں کو بھی بکثرت رواج دیا۔ بایں ہمہ لکھنوی شاعری میں ہندو سماج، ہندوانہ رسم و رواج اور ہندوانہ روایات کا اثر نمایاں طور پر موجود ہے :۔

صحبت :۔ زلفِ پیچاں یہ ہوا سے نہیں جھونکے لیتی — کالکا کھیلتی ہے اے مہِ تاباں سر پہ

قادر :۔ کالی کو پوجتا ہے سیہ قلب ہو گیا — ہے کیا ہی بد بلا دلِ ہندو پرستِ زلف

محسن :۔ اسلام والے مصحفِ رخ پر نثار ہیں — کالی سمجھ کے ہوتے ہیں ہندو فدائے زلف

بحر :۔ پچھتائے تم سے آنکھ لڑا کر ہم اے بتو — گنگا بہائی اشکِ ندامت کی آنکھ سے

مہر :۔ بخدا ہندو ہیں تیری بتِ میخوار آنکھیں — نشے کے ڈورے نہیں، پہنے ہیں زُنّار آنکھیں

عشقی :۔ ہولی میں گلال ان پہ پڑا ہے یہ نہ سمجھو — خونِ دلِ عشقی سے یہ گلنار ہیں پلکیں،

جریا :۔ پوجتی ہیں اے بتِ چالاک کہ قرآں عارض — دیکھا کرتے ہیں جو ہندو و مسلماں عارض

ناسخ :۔ ہو گیا جوگی وہ قاتل پر ہے خوں ریزی وہی — بدلے مندروں کے پڑے رہتے ہیں چکّر کان میں

مسیح :۔ قشقہ جبینِ صاف پہ سیندور کا نہیں — روشن ہے آج شمع رخِ سیم بر کی لو

شفیق :۔ پرتو سے اس کے مانگ میں سیندور بھر گیا — سر پہ حنائی رکھا جو اُس نے اُٹھا کے ہاتھ

مہر :۔ اے بت تو چیز کیا ہے، ہم ایسے ہیں بت پرست — پرشاد لے کے آئے جگن ناتھ ہاتھ میں

محسن :۔ حلقۂ گیسو میں ہے جلوہ رخِ گلرنگ کا — پائے ہے کالکا پھولوں کی ڈالی ہاتھ میں

بحر :۔ دیوالی اُس نے بھری، جان پوج بیٹھے ہم — چراغِ گور ہمارا دیا ہے جگمٹ کا

موحد :۔ پچکاریاں ہیں نور کی ہولی میں یہ کہوں، — گر دیکھ لوں میں اُن کی رنگیلی کلائیاں

محسن :۔ اے صنم تو وہ کنہیا ہے بلائیں لوں اگر — بانسلی کی طرح نالا ہوں سراپا انگلیاں

بحر :۔ ایسے عمامے سے تو انگوچھا ہی خوب ہے — زاہد کے ہاتھ چھوڑ کے لیں برہمن کے پاؤں

برق :۔ اس کے حضور ابیر ہوا رنگ یاسمن — رنگت گلوں کی بن گئی ٹیکا گلال کا

ناسخ :۔ ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے — جواریوں کا دیوالی میں جیسے جگمٹ ہو

بحر :۔ اگر آواگون سچ ہے تو پھر دونوں جنم لیں گے — سیہ گوں زلف سانپوں میں دل پر داغ موروں میں

ناسخ :۔ روئے گلرنگ اگر حوض میں ہو عکس فگن، — طورِ فوّارہ تنے میں ہو رنگ کی پچکاری کا

بحر :- اے بتو ہم بھی تو جانیں کہ جنم لیتے ہیں ۔ تم میں سے کوئی صنم جان ہماری ہو جائے
دھاگا دیا بتوں نے خفا دیکھ کر مجھے ۔ اُٹھا جو میں جنیؤ کمر سے لپٹ گیا
سنگار اسنے کیا ہے اسلئے آنکھوں سے اوجھل ہے ۔ ہمارے واسطے گویا الوپ انجن وہ کاجل ہے

محسن :- امتحاں چلنے کا میرے گر کرے ہندوے زلف ۔ پارو ملیں بھی ستی کی طرح کاجل پاؤں میں

آٹھویں خصوصیت - پَری — لکھنوی شاعری میں لفظ "پری" کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ (یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ لفظ "پری" مونث ہے لیکن شعرا نے اس کے لئے فعل مذکر کے صیغے استعمال کئے ہیں) چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

وزیر :- دیکھتا ہے وہ پری تصویر پشت آئینہ ۔ بختِ اسکندر ہوئی تقدیر پشت آئینہ
مونس :- توکان رکھ کے سن تو کسی شب کو اے پری ۔ فریاد کر رہے ہیں اسیرانِ دامِ زلف
ناسخ :- اس قدر کھب گئی ہے تیری سنہری رنگت ۔ اے پری اب تو سماتا نہیں زر آنکھوں میں
موزوں :- وہ پری رکھتا ہے ایسے پیارے پیارے ہاتھ پاؤں ۔ جان میں دل ہیں جگر آنکھوں کے تارے ہاتھ پاؤں
ناسخ :- سُرمگیں ہے وہ پری خانۂ دل ہی میں رہے ۔ کہ مرے مردم دیدہ کا ہے گھر آنکھوں میں

نویں خصوصیت - پھبتی — لکھنوی شعرا کو پھبتی کہنے کا بہت شوق ہے۔ پھبتی کو دوسرے لفظوں میں تشبیہ کہہ سکتے ہیں لیکن تشبیہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر اُس کی طرف اشارہ بھی کرے، یعنی یہ کہے کہ میں فلاں چیز کو فلاں شے سے تشبیہ دیتا ہوں چنانچہ لفظ تشبیہ اشعار میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے برعکس پھبتی کہنے والے شعرا خود لفظ "پھبتی" شعر میں ضرور لاتے ہیں۔ لکھنوی شعرا کے کلام میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

ناسخ :- اس قدر پتلی کمر ہے اس پری رخسار کی ۔ کہتے ہیں پھبتی سب اس پر میرے جسم زار کی
قلق :- آنکھوں پہ دیکھ کر وہ بھنویں خوب سوجھی ہے ۔ پھبتی کہوں کہ نکلے ہیں سر پر ہرن کے پاؤں
اسیر :- خوشہ ہائے تاک کی ہر ایک نے پھبتی کہی ۔ آبلوں سے پھل گئے جب میرے سارے ہاتھ پاؤں
بیخود :- پھبتی کہوں، شکن نہیں ماتھے پہ آشکار ۔ سطریں یہ سرنوشت کی ہیں اے قمر جبیں
عشقی :- کہوں پھبتی، تلاطم آب گوہر میں نظر آیا ۔ نمایاں کس قیامت کی ہے موجِ نور دانتوں سے
ناسخ :- چینی سے صاف تربتِ چیں ہے ترا بدن ۔ پھبتی تری کمر پہ ہے چینی کے بال کی
محسن :- دیکھ کر دستِ حنائی کو کہوں پھبتی میں ۔ داغ لالہ ہے نہیں مہندی یہ کالی ہاتھ میں

دسویں خصوصیت - داغ جنوں — لکھنوی شعرا کی ایک کثیر تعداد عام طور پر ایک خاص بیماری میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اس کا نام "داغ جنوں" ہے اس کی اصل حقیقت تو معلوم نہیں مگر اشعار سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ داغ سر پر ہوتا ہے اور جنون یا سودا کے جوش سے وجود میں آتا ہے۔ کبھی اسے کھلے ہوئے پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے، کبھی آنکھ سے، کبھی سپر سے، کبھی درہم سے اور کبھی نگین سے۔ مندرجۂ ذیل مثالیں داغ جنوں کی تشریح کے لئے کافی ہوں گی :-

گویا :- یاں خزاں میں بھی شگفتہ ہے گل داغ جنوں ۔ کہو اب بلبل سے باندھے آشیاں بالائے سر
عرفاں :- تیر پہ سلئے جو وہ ابرو کماں بالائے سر ۔ ہو سپر داغ جنوں شاید یہاں بالائے سر
وزیر :- داغ سودا سے ہوئی چشم نمایاں سر پر ۔ تیر پہ تیر لگے بن گئی مژگاں سر پر
برق :- سلطنت کرتے ہیں سودا زدگانِ الفت ۔ تاج ہے داغ سر رشکِ سلیماں سر پر
صحبت :- درہم داغ جنوں کی ہے یہ کثرت صحبت ۔ مثل قاروں ہے یہاں گنج فراواں سر پر

اثر :- جوشِ سودا نے کیا شمع کی مانند گداز — بن گیا داغِ جنوں دیدۂ گریاں سر پہ
ناصر :- غنچۂ داغ چٹکتا نہیں سر پہ میرے — نغمہ پیرا ہے کوئی مرغِ خوش الحاں سر پہ
اشک :- داغِ سر پہ، طوق گردن میں، اسیرِ عشق ہوں — حلقۂ ماتم گلے میں ہے نگیں بالائے سر
" اشک ہے داغِ جنوں سے طبع اپنی باغ باغ — ہم لئے پھرتے ہیں فردوسِ بریں بالائے سر

گیارھویں خصوصیت۔ مضحکہ خیز مبالغے۔ مبالغے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جس کیفیت یا حالت کو بیان کرنا مقصود ہو، مبالغے کے ذریعے اس کی شدت اور اہمیت کو سامع یا قاری کے ذہن نشین کیا جا سکے تاکہ وہ پورے طور پر متاثر ہو سکے۔ لیکن لکھنوی شاعری میں مبالغے کا استعمال کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اشعار مضحکہ بن کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً بیچارہ شاعر طرح طرح سے اپنی حالتِ زار بیان کرتا ہے مگر سننے والے کو اس سے کسی قسم کی ہمدردی پیدا ہونے کے بجائے اس پر ہنسی آتی ہے اور یہ نتیجہ ہے مبالغے کے نامناسب استعمال کا۔ آئیے پہلے شعرا کی اشکباری کے طوفان ملاحظہ فرمائیے:-

سرور :- ایسا فراقِ یار میں رویا میں رات کو — بستر پہ میرے ہوگیا پانی کمر کمر

کمر کمر پانی ہو جانا تو معمولی بات ہے۔ جو بڑھیا قسم کے رونے والے ہیں ان کا سیلِ سرشک، سر سے بھی دو ہاتھ اونچا رہتا ہے۔

طالب :- سر سے دو ہاتھ بڑھا رہتا ہے آبِ چشمِ اشک — ہوں وہ قطرہ کہ اٹھا لیتا ہوں دریا سر پہ

اور بعض رونے والے ان بزرگ سے بھی اونچے درجے کے ہیں:-

اک دن فراقِ یار میں رویا میں اس قدر — چوتھے فلک پہ پہونچا تھا پانی کمر کمر

استاد جرأت کی اشکباری کے سامنے دنیا کے بڑے سے بڑے رونے والے بھی گرد ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

جرأت :- طوفانِ گریہ کیا کہیں، کس وقت ہم نشیں — موجِ سرشک تا فلکِ ہشتمیں نہیں

کیا اس قسم کے اشعار پڑھ کر، کسی دردمند محبت کی اشکباری کے تصور سے آپ کے دل پر چوٹ لگتی ہے؟ کیا اس کے لئے آپ قلب میں کسی قسم کی ہمدردی کا احساس موجود پاتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے رو رو کے دریا بہا دئے، ان کا جسم گھل گھل کر کس درجہ لاغر ہو گیا ہوگا۔ ان بیچارے ناتوانوں کے حالِ زار پر بھی ایک نظر ڈالتے چلئے:-

گویا :- ناتواں ایسا ہوں گر سایہ پڑا دیوار کا — گر پڑی گویا کہ سقفِ آسماں بالائے سر
جوش :- اے سلیماں، زار ہوں یہ اک پری کے عشق میں — پھر رہی ہے لے کے مور ناتواں بالائے سر
آباد :- لاغر ہوں اس قدر کہ دکھائی نہ دوں گا میں — اپنی طرح کرے گا مجھے بے نشاں دہن
ناسخ :- لاغر ہیں ہم ایسے کہ نگل جائے جو چیونٹی — اٹکے نہ ہمارا یہ تنِ زار گلے میں
کوثر :- کیا لاغری سے قدرتِ حق ہے کہ مورچے — لیجائیں لاشِ عاشقِ دلگیر دوش پہ
سید :- یہ لاغری ہے دیکھے جو تو نبض اے طبیب — آجائے، جائے نبض، تنِ زار ہاتھ میں
ناسخ :- لاغر ہوں میں ایسا کہ ترے کان کی بالی — ہو جائے صنم طوقِ گلوگیر گلے میں
موزوں :- اس قدر اے جانِ جاں پہونچی ہے میری لاغری — چوڑی پاؤں میں پڑے پہرہ جائے چھلا ہاتھ میں
آباد :- یہ ناتواں ہیں عشق کمر میں ہم اے طبیب — مانندِ نبض گم ہیں ہماری کلائیاں
وزیر :- ہاتھ میں لے جا تنِ لاغر مرا نامے کے ساتھ — ڈر نہ اے قاصد کہ جو ہوتی ہیں اکثر انگلیاں
طالب :- ہو جاؤں میں پامال یہاں تک تو ہوں لاغر — چیونٹی بھی جو شفقت سے رکھے دوش پر انگشت
ناسخ :- کس درجہ غمِ عشق میں گھل گھل کے موا ہے — انگلی سے ہیں کم ناسخِ مغفور کی ساقیں

ناؔدر :- پاؤں جسم زار پہ میرے پڑا، بولادہ شوخ ... ڈال دی ہے فرش پر کس نے یہ سوزن زیرِ پا

محسنؔ :- میں وہ لاغر ہوں، یہی سمجھا کنوئیں میں گر پڑا ... آ گیا ہے چیونٹیوں کا جب کبھی گھر زیرِ پا

ناسخؔ :- ہے گراں مکتوب، تو کاتب سبک ہے قاصدا ... پھینک خط، لے چل ہمارا جسم لاغر ہاتھ میں

عشقیؔ :- المدد اے ضعف ایسا کر تو کاہیدہ بدن ... وہ پری رکھ لے سمجھ کر مجھ کو تنکا - کان میں

عرب میں صرف ایک شخص (مجنوںؔ) کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی پرند نے اس کے جھاڑ جھنکاڑ جیسے بالوں میں گھونسلا بنالیا تھا۔ مگر ہمارے لکھنوی شعرا میں سے ہر شخص کا جوشِ دیوانگی اس درجہ پر پہونچا ہوا ہے کہ اُسے اپنے سر و پا کا ہوش ہی نہیں چنانچہ ہر شخص کے سر پر بلبلیں، چیلیں، کوّے، طوطیاں، ہما اور دوسرے پرند آشیانے بنالیتے ہیں اور اُسے مطلق خبر نہیں ہوتی :-

عارفؔ :- جان کر مجنوں مجھے ایک لیلیٰ گلفام کا ... آ کے بلبل نے بنایا آشیاں بالائے سر

وحشتؔ :- اس قدر صحرا نوردی کی کہ مجنوں کی طرح ... طائروں نے اپنے باندھے آشیاں بالائے سر

گویاؔ :- اے خط نو رستہ مجھ کو تیرا مجنوں جان کر ... طوطیوں نے آ کے باندھا آشیاں بالائے سر

عرشؔ :- اے پری وہ شاہِ اقلیمِ جنوں آباد ہوں ... مثلِ مجنوں ہے ہما کا آشیاں بالائے سر

چند دلچسپ مبالغے اور ملاحظہ فرمائیے :-

حکیمؔ :- آئے جب زیرِ قدم یاد مژہ میں کانٹے ... نوک سر خار کی چبھ کر نکل آئی سر پہ

صباؔ :- تڑپے ہیں اس قدر پسِ دیوارِ یار ہم، ... سو بار آگیا ہے لبِ بام ہاتھ میں

افضلؔ :- ہر چند جستجو میں رہے صاحبِ نگاہ ... دیکھا جو دوربیں سے نہ آئی نظر کمر

محسنؔ :- نازکی کہتے ہیں اس کو، پاؤں زخمی ہوگئے ... آگئی چلنے میں جب تصویرِ نشتر زیرِ پا

بارھویں خصوصیت - توسّل - لکھنوی شاعری کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے غزل میں خواہ کیسے ہی رندانہ بلکہ عریاں اور حیا سوز مضامین کیوں نہ باندھے ہوں، مقطع میں وہ غالباً حصولِ سعادت کی نیت سے، اکثر حضرت علی کا اور کبھی کبھی حضرت حسین یا حضرت حسن یا رسول مقبول کا یا پنجتن اور امام زمن کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی ان بزرگوں کے توسل سے نجات کا طالب ہوتا ہے۔ کبھی ان کے مزار کی زیارت کی تمنا کرتا ہے۔ کبھی اُن کی محبت کا دم بھرتا ہے اور کبھی نعت و منقبت کو "حسن المآب" بناتا ہے :-

ناصرؔ :- غمِ شبیر سے دامن جو ہے تر اے ناصر ... گرمیِ حشر میں ہوگا یہی داماں سر پر

شجاعتؔ :- یہ آرزو ہے شجاعت کہ کربلا جا کر ... لگائے مرقدِ شہ کا غبار آنکھوں میں

رنگینؔ :- تصور میں زیارت جب ہوئی حاصل ہمیں رنگیں ... لگائی ہم نے خاکِ مرقدِ شبیر آنکھوں میں

ناؔدر :- نہیں کچھ دغدغۂ جرم و معاصی دل کو ... مغفرت حشر میں نادر کی ہے شبیر کے ہاتھ

عشقیؔ :- اور عشقی کو تمنا نہیں کچھ دُنیا میں، ... اپنے محبوب کے روضے پہ خدایا پہونچا

ناسخؔ :- کر دیا سیراب ناسخ دم میں فوجِ تشنہ کو ... چشمہائے فیض تھیں خیر البشر کی اُنگلیاں

محسنؔ :- یہ سمجھوں ہفت کشور کی ملی ہے سلطنت مجھ کو ... جگہ دے گر غلامِ بادشاہِ طوس پہلو میں

ناصرؔ :- طولِ حیات سے ہے یہ ناصر کا مدعا، ... آنکھوں سے وہ لگائے امامِ زمن کے پاؤں

شرقؔ :- خدا کے فضل سے اے شرق ایک دن ہم کو ... دکھائیں گی درِ شاہنشہِ زماں آنکھیں

جوشؔ :- تکتا نہیں ہے بندہ کہیں ہاتھ غیر کا ... اے جوش اپنی آنکھیں ہیں اور پنجتن کے پاؤں

خلیلؔ :- درگاہ میں خدا کی دعا ہے یہ اے خلیل، ... ہوں روزِ حشر سر پہ مرے پنجتن کے پاؤں

زبان اور رسم خط کا تعلق

(بحث کے لئے)

زبان کی قومی، بین الاقوامی اور تہذیبی اہمیت علمی حیثیت سے مسلّم ہے ۔ عملاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کی چھوٹی سی چھوٹی اور غیر متمدن سے غیر متمدن قوم کے پاس بھی زبان موجود ہے ۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جنھیں یہ مسئلہ پریشان نہیں کرتا کہ انسان قوت گویائی سے کس طرح کام لیتا ہے، تمدنی زندگی کی کس منزل پر زبان وجود میں آئی، اس کا ارتقا کس طرح ہوا، انسان اور زبان کا کیا تعلق ہے، زبان اور قوم میں کیا رشتہ ہے، زبان کے تغیر میں کون سے عناصر کام کرتے ہیں، مادری زبان سے کیا مراد ہے اور زبان کس طرح زندہ رہتی ہے ؟ یہ سوالات پیچیدہ ہیں اور عام ذہن تو کیا علماء کے لئے بھی مشکلیں پیدا کرتے ہیں تاہم مختلف علوم کی مدد سے انسانوں نے ان سوالات پر برابر غور کیا ہے اور آج کل جب انسانی حقوق پر علمی اور عملی حیثیت سے نگاہ ڈالی جا رہی ہے قوم اور زبان کے تعلق کا مسئلہ بھی زیر بحث آ گیا ہے۔ ہندوستان میں زبان کا مسئلہ علمی اور عقلی حیثیت سے طے نہیں کیا جا رہا ہے اس لئے بہت سے لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہیں اور گتھیاں بڑھتی جا رہی ہیں، چنانچہ زبان سے متعلق کوئی مسئلہ چھیڑتے ہوئے فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس سے جذبات اور نیتیں وابستہ کر کے اس بحث کو علمی راستہ سے ضرور ہٹا دیں گے لیکن میں یہ چند سطریں اس امید میں لکھ رہا ہوں کہ ان پر سائنس اور علوم کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی۔

زبان ہی کی طرح رسم خط کا مسئلہ بھی علمی اور غیر جذباتی غور و فکر کا مستحق ہے۔ کیا کسی زبان اور اس کے رسم خط میں کوئی باطنی تعلق ہے ؟ کیا جس زبان کے لئے جو رسم خط استعمال کیا جا رہا ہے وہی اُس کے لئے مناسب ترین ہے اور کیا ایک زبان کو دوسرے رسم خط میں نہیں لکھا جا سکتا ؟ اور اگر لکھا جائے تو کیا یہ کوئی غیر فطری کوشش ہوگی ؟ کیا اس سے زبان کی اصلیت اور حقیقت بدل جائے گی ؟ اس وقت اس مسئلہ کو کسی خاص زبان یا رسم خط کی روشنی میں دیکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ کسی زبان اور اُس کے رسم خط کے تعلق کو دیکھنا ہے ۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زبان پہلے وجود میں آئی، اُس کی ابتدا کچھ شکل بھی رہی ہو وہ اظہار خیال اور اظہار جذبات کا ایک ذریعہ تھی، اُس کا مقصد اظہار و ابلاغ تھا، اس سے وہ سماجی ضرورت پوری ہوتی تھی جس سے سماج کے ذہن میں کسی حد تک یکسانیت اور وحدت پیدا ہوتی ہے ۔ اسی سلسلہ میں یہ بحث بھی اُٹھتی ہے کہ سب سے پہلی زبان کہاں اور کن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا ابتداً ایک ہی زبان پیدا ہوئی یا کئی زبانیں ؟ لیکن یہاں اس سے بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ انسانی زندگی کی ابتدا میں زبان وجود میں آئی اور اگر یہ انسان کئی جگہ رہتے تھے تو ان کی سماجی ضروریات کے تحت مختلف مقامات پر مختلف زبانیں وجود میں آئیں، اس سے نفس خیال پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی زبان انسانوں میں پیدا ہوئی اور ایک زبردست اجتماعی اساس کی حیثیت سے ابتدائی تمدن کو منضبط کرنے میں معین ہوئی، یہ بات ناقابل انکار ہے ۔ جب زبان اجتماعی زندگی کی تشکیل اور تعمیر میں اتنی اہم ثابت ہوئی، جب اُس نے ارتقا میں مدد دی تو اُسے خود بھی ترقی ہوئی اور انسانی ذہن نے اس عجیب و غریب ایجاد کو دوام بخشنے کے لئے رسم خط ایجاد کرنے کی کوشش کی ۔ بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ زبان پہلے پیدا ہوئی اور اُس کا رسم خط بعد میں ۔ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ زبان اور رسم خط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے بلکہ رسمی ہے اور اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو زبان اور رسم خط کے متعلق جو بحث جاری ہے وہ محدود ہو سکتی ہے ۔

یہاں ذرا دیر کے لئے ٹھہر کر اگر رسم خط کی ابتدا پر غور کر لیا جائے تو زبان اور اُس کے رسم خط کے تعلق کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ زبان ہی کی طرح رسم خط کی ابتدا ابھی دھندلکے میں ہے۔ لیکن جہاں تک اس سلسلہ میں تحقیقات ہوئی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء تصویری حروف کی مختلف شکلوں سے ہوئی۔ مصری، بابلی، چینی اور ہندوستانی فنِ تحریر کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے اور یہودی حضرت ہوئی سے۔ اس میں شک نہیں کہ تحریر کی ایجاد بھی تسخیرِ فطرت کا ایک ذریعہ تھی اور اپنی قوت یادداشت کو دیرپا اور قوی تر بنانے کے لئے انسان نے اپنے خیالات کو جانی بوجھی تصویروں میں منتقل کر لیا تاکہ تلازمۂ ذہنی کی مدد سے وہ اپنے خیالات اور تجربات کی بازآفرینی پر قادر ہو سکے۔ یہ اہم سماجی کارنامہ سحر اور ٹوٹکے کے تصور پر بھی مبنی کہا جا سکتا ہے لیکن جب اس پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ سحر کی مدد سے بھی فطرت کو شکست دینے یا اُس پر قابو پانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی کیونکہ انسان اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرت کے خلاف جدوجہد کرنے لگا تھا اور اپنے محدود مادی وسائل سے کام لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ تحریر آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یادداشت میں سب سے زیادہ مدد قریب ترین مماثلت سے ملتی ہے اس لئے چیزوں کی تصویریں سب سے زیادہ فطری تحریر کہی جا سکتی ہیں۔ درخت کی تصویر دیکھ کر درخت کی یاد ضرور آئے گی اور اُس زندگی کے ابتدائی تجربوں کا جو تعلق درخت سے ہوگا تسلسلِ خیال اُنھیں بھی سامنے لا کھڑا کرے گا لیکن زبان محض اشیاء کے ناموں کا مجموعہ تو نہیں، متحرک زندگی میں بنی بنائی چیزیں کم ہیں، خیالات کی رفتارِ عمل کی مختلف صورتوں اور حالتوں میں ربط پیدا کر لیتی ہے اس لئے تصویری تحریر کے علاوہ تصوری تحریر بھی پیدا ہوئی جس میں خیالات اور تصورات کی علامتیں بھی بنائی جاتی تھیں، یعنی الفاظ خیالوں کی ملفوظی یا صوتی علامات کہے جا سکتے ہیں اور اُن کی تصویریں تحریری علامات۔ اس تحریری علامت کا مقصد کسی آواز یا آوازوں کے مجموعے یا خیال کی طرف ذہن کو منتقل کر دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔

تصویری تحریر خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتدائی اور بھدی کوشش تھی لیکن جب انسانی ذہن اور استوار ہوا اور اُسکی تجریدی طاقت بڑھی تو اُس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی کیونکہ تصویری رسم خط میں جتنے الفاظ ہوتے تھے اُتنی ہی علامتوں کی ضرورت پڑتی تھی، پھر مصوری پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بعض تصویریں ایک دوسرے سے مل جاتی تھیں اور التباس پیدا کرتی تھیں اس لئے زیادہ سائنٹفک طریقہ کی جستجو ضروری تھی۔ جلد لکھنے کی کوشش میں تصویریں محض علامت بن کر رہ جاتی تھیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ حروف تہجی انھیں تصویری یا تصوری تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ ابتدائی عبرانی اور یونانی حروف تہجی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حرف کوئی معنی رکھتا ہے اور اُن کی ابتدائی شکل اُس مفہوم یا معنی سے صوری مماثلت رکھتا ہے۔

اس وقت علمی حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ قدیم ترین رسم خط کے نمونے (جو تصویری یا ہیروغلیفی نہیں ہیں) شمالی سامی قوموں میں ملتے ہیں انھیں کی مختلف شاخیں اور شکلیں کنعانی (یعنی ابتدائی عبرانی اور فنیقی) ارآمی، جنوبی سامی اور یونانی کے روپ میں بڑھیں اور پھیلیں۔ یہ ارامی رسم خط تھا جس سے کئی رسم خط نکلے یا کم سے کم اس سے خیال اور اثر لے کر دوسرے رسم خط بنائے گئے چنانچہ قدیم پہلوی تو ارآمی رسم خط سے نکلا ہی ہے، برہمی رسم خط بھی اس کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بہت بحث طلب ہے کیونکہ ابتدا میں کبھی یہ داہنی طرف سے لکھا گیا اور کبھی بائیں طرف سے۔ یہاں نفس بحث سے اس کا گہرا تعلق بھی نہیں ہے، صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہر زبان اپنے ساتھ رسم خط لے کر پیدا نہیں ہوئی بلکہ تہذیبی ترقی، تجارتی تعلقات اور سماجی اثرات کے تحت ایک ہی رسم خط اور حروف کئی زبانوں کے لئے استعمال ہونے لگے اور آہستہ آہستہ امتدادِ زمانہ سے اُن میں تغیرات ہوئے۔ زبانوں میں بھی اختلاط ہوتے رہے لیکن پھر بھی کثرتِ استعمال اور قومی خصوصیات وغیرہ کی وجہ سے زبانوں نے اپنی آزاد حیثیت بہت کچھ برقرار رکھی لیکن فنِ تحریر جب ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر کے پہونچا تو ایک ضروری سماجی ایجاد ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اُسے اپنا لیا اور اپنے الفاظ کو بھی صوتی تحریری لباس عطا کر دیا۔ مدت گزر جانے کے بعد معمولی تغیرات کر کے ہر ملک میں اُسے قومی رسم خط یا مخصوص زبانوں سے وابستہ

م خط سمجھ لیا گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح زبانوں میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اُس طرح رسم خط میں نہیں ہوتی ہے۔ معمولی صوتی تغیرات
، لئے معمولی تبدیلیاں کر لی گئیں۔

ڈیوڈ ڈرنگر جس نے حروف تہجی پر بڑی عالمانہ کتاب لکھی ہے تحریر کے انقلابی فن کو شمالی مغربی سامیوں سے منسوب کرتا ہے۔ اُس کا
یال ہے کہ وہیں سے یہ حروف یونانیوں میں پہونچے اور یونانیوں نے ان میں اضافے کئے۔ انھیں جڑوں سے برابر شاخیں نکلتی رہیں
ور ملکوں ملکوں میں پھیلتی رہیں۔ کسی رسم خط کو مکمل طور پر تمام حروفِ صحیحہ اور تمام حروفِ علّت کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی
چند سال پہلے تک روس کی بعض زبانوں کے پاس رسم خط نہیں تھا، علمائے لسان نے ان زبانوں کو ترقی دینے کے لئے اُن کے رسم خط
یجاد کئے۔

ساری دُنیا کے انسانوں کو ایک کرنے کی کوششیں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں، کبھی مذہب نے یہ فرض انجام دینے کی کوشش
کی ہے، کبھی سیاسی فلسفہ نے، کبھی سب کے لئے ایک زبان ایجاد کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور کبھی ایک رسم خط۔ ان کے پیچھے
حکمرانی اور اقتدار کے جو جذبات کارفرما ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ اُن پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج بھی ایک قوم یا خطہ کی زبان دوسرے
خطوں پر لادنے میں یہی جذبہ کام کرتا ہے گو اُسے مختلف قسم کی توجیہوں سے فلسفیانہ اور عالمانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے
لیکن چونکہ اس میں جبر کے پہلو شامل ہوتے ہیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر
کسی طرح زبان اور رسم خط میں یکسانیت پیدا ہو جائے تو کچھ صدیاں گزر جانے کے بعد اس سے فوائد ضرور مترتب ہوں گے لیکن
اصل سوال یہ ہے، کیا جس طرح زبان قوم کی تشکیل و تعمیر میں معاون ہوتی ہے اُسی طرح رسم خط بھی کسی زبان سے وابستہ ہوتا ہے؟
تقریباً تمام ماہرینِ لسانیات اس خیال سے متفق ہیں کہ زبان اور رسم خط میں کوئی خاص تعلق نہیں، آواز اور اُس کی ظاہری تحریری
علامت میں کوئی لازمی ربط نہیں ہے۔ پھر جو یہ خیال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ اگر کسی زبان کا رسم خط بدلا گیا تو وہ زبان بھی ختم
ہو جائے گی، اس کا کیا مطلب ہے؟

جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا زبان کا استعمال محض صوتی حیثیت رکھتا تھا، اُس وقت زبان کسی رسم خط سے
وابستہ نہ تھی، لفظوں کی آواز کو محض سامعہ گرفتار کرتا تھا اور بولنے والے کی آواز جو تاثر یا ردِ عمل سننے والے میں پیدا کرتی تھی وہ
کچھ دنوں میں اُس کے پہچاننے کا عادی بن جاتا تھا، یہاں تک کہ مخصوص الفاظ مخصوص تاثر پیدا کرنے لگتے تھے اور الفاظ کے معنی متعین
ہو جاتے تھے، الفاظ کی سماجی حیثیت معنی کو بھی سماجی اہمیت بخشتی تھی۔ زبان کا جو مقصد تھا وہ اس طرح پورا ہو رہا تھا۔ جب
لکھنے کا فن ایجاد ہوا تو تاثر اور ردِ عمل کو دوام بخشنے کے لئے صوتی تصویروں کو جو سامعہ کی مدد سے ذہن میں بنتی تھیں تحریری علامتوں
میں منتقل کر دیا گیا اور وہ تاثر باصرہ کی مدد سے ذہن پر منعکس ہونے لگا۔ سیکھنے اور دیکھنے کے بعد مختلف علامات کی آوازیں اُسی طرح
ذہن میں بننے اور تاثر پیدا کرنے لگتی ہیں جس طرح سننے اور سیکھنے کے بعد۔ اگر کسی شخص کو کوئی زبان نہ معلوم ہو تو اُس کے الفاظ (یعنی
آوازوں کے مجموعے) سننے کے بعد بھی وہ انھیں سمجھ نہ سکے گا اسی طرح انھیں کسی معلوم یا نامعلوم رسم خط میں لکھا ہوا دیکھنے کے بعد بھی کچھ
نہ سمجھا سکے گا۔ تاثر یا ردِ عمل کی وہ منزل جو مفہوم تک ذہن کو پہونچا دے ہمارے علم پر منحصر ہے اور اس کا تعلق عادت سے ہے۔
جس جس رسم خط کو ہم جانتے ہیں اور جس حد تک جانتے ہیں اُسی حد تک ہم اُسے دیکھ کر جلد یا بدیر تاثر حاصل کریں گے۔ دوسرے
لفظوں میں، اس کا مقصد یہ ہے کہ مخصوص تحریری علامتوں کو دیکھ کر مخصوص آوازوں کی طرف ذہن کا منتقل ہونا محض ہماری عادت
پر منحصر ہے اور یہ عادت اکتسابی ہوتی ہے، اس مخصوص علامت کا تعلق ایک مخصوص آواز کے ساتھ ہمارا مقرر کیا ہوا ہے، مثال کے
طور پر کسی آواز کو لیجئے ـــ ج، یہ آواز تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ کچھ لوگ اسے J یا G کی شکل میں پہچانتے
ہیں، کچھ لوگ ज کی شکل میں، کچھ لوگ ج کی شکل میں، سیکڑوں رسم خط میں جن میں یہ آواز کسی نہ کسی شکل میں ملتی ہے۔ اگر

کوئی شخص تمام رسم خطوں کو جانتا ہوگا تو وہ ہر جگہ اس آواز کی تحریری صورت یا علامت کو پہچان لے گا اور چند کو جانتا ہوگا تو محض انھیں میں پہچانے گا اور اگر صرف ایک کو جانتا ہوگا تو صرف اسی ایک میں پہچانے گا، اگر کسی قسم کے رسم خط سے واقف نہ ہوگا تو وہ یہ آواز جاننے کے بعد بھی اُس کی صوری یا تحریری شکل سے بالکل ناواقف ہوگا۔ جو شخص کوئی رسم خط نہیں جانتا اُسے آوازوں کے پہچاننے کے لئے کوئی رسم خط سکھایا جا سکتا ہے اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق کے بعد اُن آوازوں کو جنھیں وہ بول چال میں استعمال کرتا ہے اُس رسم خط میں پہچاننے کا عادی ہو جائے گا، چاہے وہ رسم خط کوئی ہو اور زبان کوئی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا دنیا کا کوئی رسم خط مکمل نہیں ہے لیکن جو رسم خط جتنا اچھا ہوگا اُسی قدر وہ آوازوں کی اچھی علامتیں یعنی آوازوں سے زیادہ سے زیادہ مماثلت رکھنے والی علامتیں پیش کر سکے گا اور اُسی قدر سائنٹفک کہا جائے گا، لیکن چونکہ ہر جس رسم خط کی عادی ہو جاتی ہیں وہی اُن کے لئے آسان معلوم ہوتا ہے۔ چینی اور جاپانی رسم خط بہت مشکل ہیں لیکن جو لوگ صرف انھیں علامتوں میں آوازوں کے پہچاننے کے عادی ہو چکے ہیں، وہ آسان سے آسان رسم خط کو بھی ابتدا میں اُن کے ترجمہ میں مشکل سمجھیں گے۔ ایک شخص کئی رسم خط اور کئی زبانیں جانتا ہو تو اُس کی عادت ہر زبان کو اُسکے مروجہ رسم خط میں پڑھنے کی ہو جاتی ہے لیکن اگر ایک زبان دوسرے رسم خط میں لکھدی جائے تو زبان جاننے کی وجہ سے وہ رسم خط کی دشواریوں کو عبور کر سکے گا اور جس قدر مشق بڑھتا جائے گا اُسی قدر یہ دشواری ختم ہوتی جائے گی یہاں تک کہ وہ کسی زبان کو کسی رسم خط میں پڑھنے لگے گا۔

اِسے ایک طرح اور دیکھنا چاہئے۔ اگر زبان اور رسم خط میں کوئی ایسا تعلق ہوتا کہ ایک زبان کے الفاظ اُسی کے مروجہ رسم خط میں کوئی ردِّ عمل یا تاثر پیدا کر سکتے تو البتہ یہ سوال دشواری پیدا کرتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اصل ردِّ عمل مفہوم کی واقفیت سے پیدا ہوتا ہے تحریری علامت سے نہیں۔ مثلاً ہم بہت سے انگریزی الفاظ اُردو میں استعمال کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر انھیں اُردو رسم خط میں لکھ بھی دیتے ہیں جیسے پبلک، پوئٹری، پولیٹکل، جج وغیرہ اور ہر وہ شخص جو ان الفاظ اور ان کے معنی سے واقف ہے بغیر کسی دقت کے انھیں پڑھ لیتا ہے۔ اگر یہ الفاظ انگریزی رسم خط میں لکھے جاتے تو اُس رسم خط سے ناواقف ان الفاظ کے معنی جاننے کے بعد بھی انھیں پڑھ نہ سکتے۔ ان تمام باتوں سے یہ واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان اور رسم خط میں کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ہماری روایت اور عادت ہے جو ان میں تعلق پیدا کرتی ہے، جس طرح کی عادت ڈالی جائے پڑ جائے گی یعنی اگر انگریزی زبان کو فارسی رسم خط میں اور اُردو زبان کو انگریزی یا لاطینی رسم خط میں لکھنے لگیں تو یہ کوئی غیر فطری، ناممکن العمل یا علمی حیثیت سے غلط فعل نہ ہوگا۔ دونوں رسم خط ایسے ہیں جن میں بعض اوقات بولنے اور لکھنے میں فرق ہوتا ہے اُردو کا "بالکل" انگریزی یا لاطینی رسم خط میں اپنا "الف" کھو دے گا اور انگریزی کا HIGH اُردو میں لکھا جائے گا تو دو حرف G اور H غائب ہو جائیں گے اور اُردو میں یہ لفظ تلفظ کے مطابق ہائی رہیگا ہر زبان میں رسم خط کا مقصد ایک ہی ہے، آوازوں کی علامتیں معین کر کے اُنھیں استقلال بخشنا، کہیں بھی یہ علامتیں معنی کے متعین کرنے میں مدد نہیں دیتیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر بغیر لکھے ہوئے لفظ کے معنی کا تعین ہی نہ ہو سکتا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ تقریر کرتے وقت ہم لفظ کے معنی محض اُس کی صوتی حیثیت کو سامنے رکھ کر سمجھ لیتے ہیں — اب اگر یہ بات طے ہو جائے کہ زبان اور رسم خط دو الگ الگ چیزیں ہیں اور کوئی زبان کسی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے تو پھر اُردو کے لئے دیوناگری، لاطینی اور فارسی رسم خط میں سے کسی ایک کے منتخب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کرے گا۔ فطرت، مزاج اور نفسیات کے نام پر بہت سے علمی مغالطے طیار کئے گئے ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر رسم خط بدل دیا جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہو جائے گی۔ اگر اس بحث سے معقول نتائج برآمد ہوئے تو پھر یہ بحث شروع کی جائے گی کہ کسی رسم خط کے اختیار کرنے میں کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے اور آج اس مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔

سید احتشام حسین

(نگار) ہمارے فاضل دوست پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے بڑی اہم بحث شروع کی ہے جس پر ہر شخص کو اپنی جگہ

غور کرنا چاہیئے۔

اس میں کلام نہیں کہ زبان، رسم خط کی پابند نہیں، کیونکہ رسم خط نام ہے چند نقوش کا جو تلفظ کے ادا یا اظہار کے لئے فرض کرلئے گئے ہیں، اس کی حیثیت محض لباس کی سی ہے، اور اسی حیثیت سے اسے دیکھنا چاہیئے، لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی زبان کا کوئی رسم خط وضع ہو چکا ہے اور ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں، تو اسے کیوں بدلا جائے۔

تبدیلی کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ رسم خط پوری طرح ہماری زبان یا اس کے تلفظ کو ادا نہیں کرسکتا اور دوسری یہ کہ اس تبدیلی سے زبان یا قوم و ملک کی بہتر خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ پہلی وجہ تو معقول نہیں، کیونکہ اس صورت میں رسم خط کے بدلنے کا نہیں بلکہ اس میں ضروری تبدیلیاں پیدا کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے، دوسری وجہ البتہ قابل غور ہے۔

مصطفےٰ کمال نے آخرکار ترکی زبان کے رسم خط کو لاطینی رسم خط میں تبدیل کرہی دیا جس کا سبب رسم خط کا نقص نہ تھا بلکہ سیاسی مصالح تھے۔

فاضل مقالہ نگار نے اخیر میں جو چند سطریں لکھی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ انکا مقصود اس مسئلہ کے چھیڑنے سے کیا ہے، یعنی اگر یہ طے ہوجائے کہ رسم خط اور زبان دونوں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، تو پھر وہ یہ سوال کریں گے کہ اُردو کا رسم خط کیا ہونا چاہیئے لاطینی، دیوناگری یا فارسی؟ اور اس سلسلہ میں پھر یہی بحث شروع ہوگی کہ اُردو کے موجودہ رسم خط کو کیوں بدلا جائے۔ اگر اس میں کوئی نقص ہے تو اسے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے نہ کہ ترک کردینے کی اور اگر رسم خط کی تبدیلی کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہے، تو وہ کیا ہو سکتی ہے۔

میں اس حد تک ضرور سید صاحب کا ہمنوا ہوں کہ زبان اور رسم خط دو بالکل علحدہ علحدہ چیزیں ہیں، لیکن دو مختلف چیزوں کا ارتباط کوئی نئی چیز نہیں اور اس ارتباط کو دور کرنے کے لئے یہ صرف دلیل پیش کرنا کہ وہ کسی وقت ایک دوسرے سے جدا تھیں میرے نزدیک محل نظر ہے۔

اس وقت زیادہ تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ابھی تو یہی طے ہونا ہے کہ رسم خط اور زبان دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق کس نوعیت کا ہے، اس کے بعد جب اصولاً یہ تسلیم کرلیا جائے گا کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں تو پھر غالباً ہمارے عزیز دوست خود ہی اس بحث کو چھیڑیں گے کہ اُردو کے لئے کونسا رسم خط زیادہ موزوں ہے اور اسی وقت سید صاحب کے دلائل پر رائے زنی مناسب ہوگی۔

باب الاستفسار

ماتریدی

(جناب غفران احمد صاحب - گوالیار)

مسلمانوں میں ایک جماعت "ماتریدی" کا نام بھی سننے میں آتا ہے، جو شاید سنی شیعہ سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ ازراہ کرم اس پر روشنی ڈال کر ممنون کیجئے نیز یہ بھی بتائیے کہ اسے ماتریدی کیوں کہتے ہیں۔

(نگار) ماترید نام ہے ایک گاؤں کا جو سمرقند کے مضافات سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی جگہ ایک شخص پیدا ہوا جسکا نام ابومنصور محمد بن محمود تھا ان کا شمار متکلمین اسلام میں ہوتا ہے۔ ماتریدی، اشعری اور سنی در اصل تینوں اہل السنت والجماعت ہیں، تینوں فقہ حنفی کے مفسر و شارح ہیں اور تینوں معتزلہ کے خلاف ہیں، لیکن اس سلسلہ میں اشعری جماعت کا نام زیادہ لیا جاتا ہے، البتہ ماوراءالنہر کے علاقہ میں حنفی مسلک کا نمایندہ ماتریدی اسکول کو سمجھا جاتا ہے۔

اشعری، ماتریدی اور طحاوی تینوں ایک ہی زمانہ کے متکلم تھے اور ان کی وفات کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی تھا۔ اشعری کا انتقال ۳۳۰ھ میں ہوا، ماتریدی کا ۳۳۳ھ میں اور طحاوی کا ۳۲۱ھ میں۔ ان تینوں کا مقصد اعتزال و الحاد کا مقابلہ کرنا تھا۔

نسفی، ماتریدی عقاید کے پیرو تھے جن کی مشہور کتاب شرح عقاید نسفی، اصول فقہ پر ہندوستان و مصر دونوں جگہ درس میں شامل تھی۔ مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ بھی ماتریدی عقاید کی طرف مایل تھے۔

اشاعرہ اور ماتریدیوں کے درمیان تیرہ اختلافات تسلیم کئے گئے۔ جن میں سے سات کا تعلق خیالات سے ہے اور چھ کا الفاظ سے۔ اشاعرہ اس بات کے قایل ہیں کہ خدا کا ارادہ ہی اصل چیز ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جزا و سزا کا تعلق اخلاق سے نہیں ہے، لیکن ابوحنیفہ اور ان کے بعد ماتریدیوں کا مسلک یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال پر اختیار دیا گیا ہے اور اسی لئے وہ جزا یا سزا کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ابوحنیفہ کا عقیدہ ہے کہ انسان کا ہر فعل خدا کے ارادہ سے وابستہ ہے لیکن خدا اس پر راضی نہیں کہ اس کے بندہ سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ ماتریدی عقاید کی رو سے نجات کا یقین حاصل ہو سکتا ہے، اشاعرہ اس کے قایل نہیں۔ ایک ماتریدی کہہ سکتا ہے کہ میں خدا کا یقینی قایل ہوں، لیکن ایک اشعری صرف اتنا کہے گا کہ "میں خدا کا قایل ہوں اگر خدا چاہے"۔

بعد کو ماتریدی خیالات نے اشعری اسکول میں بھی در خور حاصل کیا اور بہت سی باتوں میں دونوں متفق ہو گئے۔

مزدکی مذہب

(ابومحمد صاحب - یاقوت پورہ، حیدرآباد دکن)

مزدکی مذہب جسے نوشیرواں کے باپ قباد شہنشاہ ایران اور کندہ کے بادشاہوں نے اختیار کیا اس کے اصول و عقاید کیا تھے اور کب سے کب تک ایران یا دیگر مقامات میں اس کا رواج رہا۔

(نگار) صحیح تلفظ مَزدک ہے، مُزدک (بہ ضم میم) نہیں۔ اس موضوع پر نگار کے باب الاستفسار میں عرصہ ہوا اظہار خیال کر چکا ہوں۔ استفسارات جلد سوم ملاحظہ فرمائیے۔

اخبار علمیہ

حاملہ عورتوں کا خون دوا ہے یہ بات عرصہ سے دیکھی جاتی تھی کہ وہ عورتیں جو گٹھیا اور وجع مفاصل کی مریض ہیں، حمل کے دوران میں اور ولادت کے بعد بھی دو ماہ تک اس مرض کی تکالیف سے محفوظ رہتی ہیں لیکن ابھی تک کسی نے غور نہ کیا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔

اب ڈاکٹروں نے اس پر علمی حیثیت سے غور کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حاملہ عورت کے خون میں ضرور کوئی نئی چیز پیدا ہو جاتی ہے جو وضع حمل کے بعد بھی دو مہینے تک باقی رہتی ہے اور اس سے دوا کا کام لینا چاہئے۔

چنانچہ حال ہی میں اس کا تجربہ کیا گیا اور وضع حمل کے بعد ایک تندرست حاملہ کا خون سات اونس کے مقدار میں لیکر گٹھیا کے مریضوں کو دیا گیا تو چند ہفتوں میں مرض کا ازالہ ہو گیا۔

اس طرح ایک اور عورت کا علاج کیا گیا جس کا وزن صرف ۹۰ پونڈ رہ گیا تھا اور حد درجہ لاغر و نحیف ہو گئی تھی۔ اس کو بھی حاملہ عورت کا خون دیا گیا اور وہ بالکل اچھی ہو گئی یہاں تک کہ اس کا وزن ۱۰۷ پونڈ ہو گیا۔ یہ خون پچکاری کے ذریعہ سے جسم میں نہیں پہونچایا جاتا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے پلایا جاتا ہے اور ایک مریض کے لئے صرف چار گھونٹ خون سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں دشواری کی بات یہ ہے کہ حاملہ عورتوں کا خون آسانی سے ہر وقت نہیں مل سکتا اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ حاملہ کا خون لیکر تحلیل و تجزیہ کے بعد معلوم کیا جائے کہ اس میں وہ کیا چیز پیدا ہو جاتی ہے جو وجع مفاصل کے لئے مفید ہے اور اس کو نکال کر محفوظ کر لیا جائے۔

کمی خون کا جدید علاج خون کی کمی کا جدید ترین علاج حیاتین ب - ۱۲ (وٹامین) کا استعمال ہے۔ اور تازہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ چیز سور کے امعاء میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ حیاتین سور کی آنتوں سے حاصل کرکے پچکاری کے ذریعہ مریض کے خون میں پہونچائی جاتی ہے اور اس سے بہت جلد سرخ خون کے صحیح ذرات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

حیات بعد الموت جامعہ ٹورین کے ایک ڈاکٹر ماریو ڈیجیلو نے حال ہی میں دو ایسے شخصوں پر آپریشن کیا جو مر چکے تھے اور آپریشن کے بعد ان میں زندگی عود کر آئی۔ اس آپریشن کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے بیان کیا کہ موت کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے لیکن دوران خون کچھ نہ کچھ جاری رہتا ہے، ان حالتوں میں اگر گردن کی ان عروق (Carotid) میں جو دماغ تک گئی ہیں، خون پچکاری کے ذریعہ سے پہونچا دیا جائے تو قلب پھر حرکت میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے دو ایسے آدمیوں پر جن کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی، یہ عمل کیا تو دوران خون شروع ہو گیا اور پھر اُن میں زندگی عود کر آئی۔

دل بدلا جا سکتا ہے ڈاکٹر ولاڈیمیر ڈیمیکوف روسی ڈاکٹر نے ایک حیرتناک آپریشن کے ذریعہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی کے قلب میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو وہ بدلا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا تجربہ اس نے ایک چوہے پر کیا۔

اس نے آپریشن کر کے اس کے سینہ کے جوف میں پہلے ایک دل نصب کیا اور جب وہ اپنا کام کرنے لگا، تو اس نے اصلی دل کو نکال لیا اس تجربہ نے اس امکان کو قوی کر دیا ہے کہ آیندہ انسان کے قلب کو بھی اسی طرح بدلا جا سکتا ہے۔

برقی دماغ کالیفورنیا کی نورتھروپ کمپنی بجلی کا ایک عجیب آلہ طیار کیا ہے جس کا نام ماڈیڈا ہے۔ اس کے ذریعہ سے نہ صرف ریاضی وحساب کے مشکل ترین مسایل حل کئے جا سکتے ہیں، بلکہ وہ ایک راکٹ جہاز کی رہنمائی بھی کرۂ قمر تک کر سکتا ہے اور کارخانے کی مشینیں بھی اس کی قوت سے چلائی جا سکتی ہیں۔

زندہ خلایا کا مطالعہ علم حیات کا یہ مسئلہ بڑا مشکل ہے کہ زندہ خلایا ([illegible]) کی ہیئت وصورت کی تحقیق جبکہ وہ صحیح حالت میں ہوں کیونکر کی جائے۔ اس مطالعہ میں دشواری یہ حایل ہے کہ ان خلایا کی بناوٹ خواہ وہ حیوانی ہوں یا نباتاتی روشنی میں بالکل شفاف نظر آتی ہے اور اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کوشش کی گئی کہ ان خلایا کو رنگین کر کے دیکھا جائے، لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہاں تک فوق النفسجی ([illegible]) شعاعیں بھی یا تو خلایا کو ہلاک کر دیتی ہیں یا مضمحل بنا دیتی ہیں۔

اب ڈاکٹر روبرٹ بادو نے نہایت کمزور بنفسجی شعاعوں سے کام لیکر معلوم کیا ہے کہ ان کا اثر خلایا پر نہیں ہوتا اور اس لئے ممکن ہو گیا ہے کہ خلایا کی کیمیائی ترکیب کا حال معلوم ہو سکے اور علم الحیات کے بہت سے رموز منکشف ہو سکیں۔

جوہری طاقت سے بجلی جوہری طاقت جس سے آٹم بم وغیرہ مہلک آلات طیار کئے جاتے ہیں، بڑی زبردست طاقت ہے اور اس سے دوسرے کام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اب ماہرین کوشش کر رہے ہیں کہ اس سے امریکہ کے صنعتی واقتصادی مسایل کی دشواریوں کو دور کیا جائے۔

اس وقت جہاں جہاں الومنیم کے کارخانے ہیں وہ سب بجلی سے چل رہی ہیں اور ان کے لئے بجلی کی بہت بڑی قوت حاصل کرنا پڑتی ہے، اسی طرح کانچ اور لوہے وغیرہ کی صنعتوں کے لئے کویلہ کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ الغرض اس وقت کوئی صنعت ایسی نہیں ہے جسکے لئے بجلی، کویلہ یا پٹرول کی ضرورت نہ ہو اور ان سب کے مہیا کرنے کے لئے بڑے مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں لیکن جوہری طاقت سے بجلی پیدا کرنے کے بعد یہ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور وہ ممالک بھی جہاں کویلہ وغیرہ کی کمی ہے آسانی سے اپنی صنعت کو ترقی دے سکیں گے۔

آزاد غلاموں کے نام

یہ ہوا، یہ دھوپ، یہ برسات، یہ خرمن، یہ کشت
اے کہ تیرے دام کا نخچیر ہے سارا بہشت

جسکی کرنوں نے کفن ظلمات دوراں کے سئے
تو سمجھتا ہے وہ سورج ہے فقط تیرے لئے

اے دلِ محراب و منبر، اے ضمیرِ خانقاہ
ہند کے زندہ شہیدوں کی طرف بھی اک نگاہ!!

تیز ہے جس کے نفس سے آج ہر لالے کی آگ
اس ہوا سے بجھ چکے ہیں سیج بتا کتنے سہاگ

جن کے زخموں پر پڑا ہے آج ملت کا نقاب
اُن شہیدوں کی رگوں سے کس نے کھینچی ہے شراب

خشت ہر دیوار سے آتی ہے جن کے خوں کی بو
آج اُنہی کے زرد چہرے دیکھ کر ہنستا ہے تو

کتنی گلیوں کے خنک سائے میں کملاتے ہیں روپ
آہ کن چہروں کو جھلساتی ہے "آزادی" کی دھوپ

تیرگی سے آج بھی بوجھل ہے پشتِ آفتاب
آج بھی سکوں میں بک جاتے ہیں لاوارث شباب

آج بھی بنتے ہیں عریانی پہ کمخواب و حریر
زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں آج بھی سونے کے تیر

آج بھی اک طنز ہے راتوں پہ سورج کا فروغ
اب بھی قایم ہے "مساوات و اخوت" کا دروغ

طاعت و تقدیس کی شمعیں ہیں اب بھی دود خیز
آج بھی ابلیس ہے یزداں سے سرگرم ستیز

زہد کی فتنہ گری ہے آج بھی پشمینہ پوش
آج بھی "گندم نما"، ہیں مسجدوں کے "جو فروش"

[illegible] درویش و صوفی اب بھی ہیں یزداں شکار
اب بھی ہر دوکاں پہ بکتے ہیں رسول و کردگار

آج بھی ریش و عبا ہے مسجد و منبر کا سود،   آج بھی ہیں رونقِ بازارِ کعبے کے یہود

رہ گئے ہیں بجھ کے جن تاریک سینوں کے چراغ   اُن کے ماتھوں پر بھی ہیں اُبھرے ہوئے سجدوں کے داغ

اب بھی سلمائے حرم جلتی ہے بُو جہل و یزید   آج بھی ارزاں ہے اس بازار میں خونِ شہید

اب بھی تیمور و ہلاکو کو ہے نازِ اعتکاف   آج بھی چنگیز کر جاتے ہیں کعبے کا طواف

دام افگن ہیں حرم پر آج بھی لات و منات   آندھیوں کی زد پہ ہے اب بھی چراغوں کا ثبات

ظلمتوں میں اب بھی ہے ڈوبی ہوئی انسانی رُوح   آج بھی درکار ہے آدم کو اک طوفانِ نوح

لب کشائی اب بھی ہے حق و صداقت پر حرام   آج بھی سقراط کا ہے زہر سے لبریز جام

اپنے بوجہلوں سے ہیں اب بھی پیمبر بیم ناک   آج بھی سکتے میں ہیں ہوش و خرد کے سینہ چاک

کارفرما اب بھی ہے دین و سیاست کا فریب   قسمتِ ہر ابنِ مریم اب بھی ہے مرگِ صلیب

اعتبارِ ناخدا و بادباں کچھ بھی نہیں   بحر کے سینے میں جز موجِ رواں کچھ بھی نہیں

ان شکستہ کشتیوں کے ڈوبنے کا غم نہ کر   فطرتِ دریا سمجھ گرداب کا ماتم نہ کر

یہ ہوائیں، یہ اندھیرا، یہ تلاطم، یہ بھنور   ہیں کسی طوفانِ نو آغاز کے پیغام بر

بحر کہتا ہے سفینے ٹوٹ کر رہ جائیں گے   موج کہتی ہے یہ ساحل دور تک بہ جائیں گے

کوئی طغیانی ہو اپنا رخ بدلتی ہے ضرور،
ناخدا ڈوبے کہ اُبھرے موج چلتی ہے فرور!!

(پروفیسر شور علیگ)

تاریک مقبرہ

یہ آندھیوں کی بغاوت، یہ چیختے بادل
جراحتوں کا نشیمن، سبز کھیتوں کی زمیں
اماں ملی ہے سفینوں کو تیز دھاروں میں
ہوئی ہے تلخیِ احساس شعلہ زن کیا کیا
یہ عشق و فرض کے دو رُخ طراز ویرانے
یہ مرگ و زیست کے ساحل، یہ رات کے گرداب
یہ دردِ دل، یہ مشیّت کی چینِ پیشانی،
یہ قہقہوں کے جہنم، یہ زلزلوں کے وطن
نہ پوچھ کتنے شرارے ہیں سرد آہوں میں،
عیاں ہے "ظلمتِ کردار" کن جبینوں سے
یہ رنگ و نور کے حاسد، یہ زندگی کے رقیب
بکھر چکے ہیں بہت برق و سیل کے گیسو
مہ و نجوم تہِ دام آئے ہیں کیا کیا
نہ پوچھ شورگہِ ممکنات کی تقدیر ـــ!
شکار کھیل چکا آسماں شہیدوں کا
بدل گئی ہیں گھٹاؤں کی نیتیں کیا کیا
لٹی ہے شمعِ سحر کس قدر فضاؤں سے
سلگنے والے ہیں جھوٹے پیمبروں کے کفن
جب انقلاب زمانے کا رخ بدلتا ہے،
نسیمِ خلد لہو میں نہا کے آتی ہے

یہ اعتبار و یقیں کے بجھے بجھے سے کنول
حیات خاک بسر اور موت عرش نشیں،
چھپے ہوئے ہیں تلاطم مگر کناروں میں
بدل چکا ہے غمِ دوست پیرہن کیا کیا
وہی طلسمِ حقیقت، وہی الم خانے
اُلٹ سکے نہ حوادث خود آگہی کے نقاب
یہ نام و نسل کے آذر کدے، یہ ویرانی
خزاں فروش بہاریں، شگوفہ سوز چمن
بھٹک رہے ہیں اُجالے سیاہ راہوں میں
ٹپک رہا ہے لہو کتنی آستینوں سے
اٹھائے پھرتے ہیں بے روح جنتوں کے صلیب
سموم یاس کرے گی کب آنسوؤں سے وضو!
شبِ فراق کے پیغام آئے ہیں کیا کیا
کہ سیم و زر کی ہواؤں سے بجھ گئے ہیں ضمیر
صنم کدہ ہے کہ مدفن خدا رسیدوں کا
لٹی ہیں گنگ و ہمالہ کی عصمتیں کیا کیا
ستیزہ کار ہے انساں کن خداؤں سے
میں سن رہا ہوں دلِ نیل و طور کی دھڑکن
تو فصلِ گل میں گلوں کا سہاگ جلتا ہے
نظر خود اہلِ نظر کی ہنسی اڑاتی ہے

بنا چکا ہے جنوں کتنے سرخ تاج محل
نگاہ و فکر کے تاریک مقبرے سے نکل!!

سرسیابی احمدنگری

دھارے

میں آخر اس زندگی میں قوم و وطن کے کتنے فریب کھاؤں
میں تیرگی کی فضا میں تا چند روشنی کے کنول جلاؤں
میں تا کجا دشتِ خشک و ویراں کو ہم سوادِ چمن بتاؤں
چمن کے پھولوں کا نام دیکر چمن کے خاروں کو کیا کرونگا

خزاں کی آندھی اُٹھی چمن میں وداعِ گل کا پیام دیتی
نہ ایک لمحہ بھی لہلہائی شعاعِ نجم و قمر کی کھیتی
سمیٹ کر اپنی دھوپ کو ساتھ لے گیا آفتاب گیتی
میں ان فسردہ بجھے بجھے زرد رو ستاروں کو کیا کرونگا

یہ آئینہ تیرہ بختیوں کا یہ بے اماں حقیقتوں کی
یہ انجمن خود فریبیوں کی یہ بزم جھوٹی صداقتوں کی
یہ پستیٔ جہل کا ہمالہ یہ خشک گنگا مروتوں کی
ضمیرِ انساں کی مقتلوں میں اک آگ روشن ہے وحشتوں کی
میں اپنی دنیا کے ایسے شاداب مرغزاروں کو کیا کرونگا

اُتر گیا چہرہ روزِ روشن کا ڈھل گئے آفتاب کتنے
اُٹھا دئے وقت کے تقاضوں نے سامنے سے حجاب کتنے
زمیں پہ ٹوٹے پڑے ہیں کردار و آگہی کے رباب کتنے
دہکتی چنگاریوں میں تبدیل ہو گئے ہیں حباب کتنے
میں پنبہ زاروں کے بدلے لیکر پھر ان شراروں کو کیا کرونگا

خزاں کا مارا ہوا ہو گلشن تو پھول کیا مسکرا سکیں گے
غلاف ہوں تیرگی کے جن پر وہ تارے کیا جگمگا سکیں گے
جو خود ہی گم کردہ کارواں ہوں وہ راستہ کیا دکھا سکیں گے
جو خود ہی دھاروں میں بہہ رہے ہوں میں ان کناروں کو کیا کرونگا

فضا ابن فیضی

رعایتی قیمت

مجموعۂ استفسار و جواب
کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات - جسکی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن
اب آپ کو صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے - منیجر نگار

خاورستان

جناب اقبال سیمابی احمد نگری کی نظموں کا مجموعہ زیر طبع ہے
۲۸ پونڈ کے دبیز کاغذ پر نہایت نفیس طباعت و کتابت کے
ساتھ مجلد شایع ہوگا۔ ضخامت تقریبًا ۲۵۰ صفحات - منیجر نگار

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جانعالم واجد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ انکی مثنوی
کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کیلئے
ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا
کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے -
قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ - منیجر نگار

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں تمام ان اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے
جو شعراء فارسی و اردو کے کلام پر کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتراضات کے
جوابات بھی دئے گئے ہیں اور ان پر محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ جن شعراء کا اسمیں ذکر
کیا ہے انکے حالات بھی دیدئے گئے ہیں۔ وہ حضرات جو فن شعر کے نکات و رموز سے واقف
ہونا چاہتے ہیں انکے لئے یہ کتاب بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں
قیمت معہ محصول چار روپیہ آٹھ آنے۔ کمیشن نہیں دیا جائے گا - منیجر نگار

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی)

خاص حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ رمضان کے بعد حاجیوں کو لیجانے والے جہاز مندرجہ ذیل تاریخوں کے لگ بھگ بمبئی سے جدہ روانہ ہوں گے :-

ایس۔ایس "مظفری" ــــ ۵۰۲۴ ٹن ــــ ۹ر جولائی سنہ ۱۹۵۱ء
" " "جہانگیر" ــــ ۳۵۶۶ ٹن ــــ ۱۲ر " "
" " "علوی" ــــ ۳۵۶۶ ٹن ــــ ۱۸ر " "
" " "خسرو" ــــ ۴۰۴۷ ٹن ــــ ۲۵ " "
" " "اسلامی" ــــ ۵۸۷۶ ٹن ــــ ۷ر اگست سنہ ۱۹۵۱ء
" " "جہانگیر" ــــ ۳۵۲۶ ٹن ــــ ۸ر " "
" " "علوی" ــــ ۳۵۶۶ ٹن ــــ ۲۵ر " "
" " "خسرو" ــــ ۴۰۴۷ ٹن ــــ ۲۶ر " "
" " "اسلامی" ــــ ۵۸۷۶ ٹن ــــ ۲۹ر " "
" " "محمدی" ــــ ۶۰۲۶ ٹن ــــ ۳۰ر " "

روانگی کی صحیح تاریخوں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

کرایہ (معہ خوراک) **بمبئی سے جدہ اور واپسی**

درجۂ اول ــــــــــ مبلغ ۱۱۵۱ روپے
عرشہ (ڈیک) ــــــــــ مبلغ ۴۱۵ روپے

اہم اطلاع ان کرایوں میں قرنطینہ کامران، محصولات جدہ اور کرایہ کشتی جو مجموعی طور پر مبلغ ۴۰ روپے ۱۲ آنے ہوتے ہیں شامل نہیں ہیں۔ عازمین حج کے پاس بین الاقوامی فارم پر ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے لگوانے کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے۔ ہیضہ کے سرٹیفکٹ میں یہ درج ہونا ضروری ہے کہ عازمین حج نے سات روز کے وقفہ سے دو انجکشن لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بمبئی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے۔ اسی طرح چیچک کے سرٹیفکٹ میں اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل چیچک کا ٹیکہ لگوایا ہے۔ یہ سرٹیفکٹ مقررہ "انٹرنیشنل" فارموں پر مقامی میونسپلٹی کے محکمۂ حفظان صحت کے حکام سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ہیضہ کے سرٹیفکٹ ۶ ماہ تک اور چیچک کے سرٹیفکٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں ــــ عازمین حج کو چاہئے کہ ابھی سے ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکٹ طیار رکھیں۔

نشستیں محفوظ کیجئے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جا رہی ہیں، عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلاتاخیر اپنے نام ہمارے ہاں درج کرائیں، تاکہ بعد میں سعادت حج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ درخواست میں مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے ۱۔ ہر ایک عازم کا پورا نام ۲۔ والد یا شوہر کا نام ۳۔ جنسیت یعنی مرد یا عورت ۴۔ عمر ۵۔ درخواست بھیجنے والے کا پورا پتہ ۶۔ کس درجہ کا ٹکٹ درکار ہے ۷۔ کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے۔ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کے نام وغیرہ بھی درج کرنا ضروری ہے۔ خواہ وہ شیرخوار ہی کیوں نہ ہوں، جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی لیکن یہ ضرور ہے کہ جن لوگوں کے نام درج ہوں گے ان کو ٹکٹ پہلے دیئے جائیں گے۔

نشستیں محفوظ کرنے کے لئے۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

تار کا پتہ "MOGUL BOMBAY" مینجنگ ایجنٹس۔ دی مغل لائن لمیٹڈ ۱۶ بنک سٹریٹ فورٹ بمبئی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۹۴۳

اگست ۱۹۵۱ء

[illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر دہلی

پیام تعلیم

ہندستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/
سالانہ قیمت پاکستان و ہندستان
[illegible] روپیہ

"نگار" کے بقا و تحفظ کا مسئلہ

نگار کی عمر کا یہ تیسواں سال ہے جو انسانی حیات کے لحاظ سے پورے شباب کا زمانہ مقصود ہوتا ہے، لیکن ہندوستان کی صحافتی دُنیا میں اس عمر تک شاید ہی کوئی رسالہ یا اخبار پہونچتا ہو۔ پھر آج میں نہ نگار کی اس سخت جانی کی داد آپ سے چاہتا ہوں اور نہ ان خدمات کا ذکر مقصود ہے جو نگار نے اس وقت تک انجام دیں، بلکہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر دنیا میں حقِ خدمت بھی کوئی چیز ہے تو کیا آپ اس حق کے ادا کرنے کے لئے طیار رہیں ؟

نگار ۲۲ء میں جاری ہوا تھا اور اس وقت جبکہ تمام اشیاء کافی ارزاں تھیں اور کاغذ کی قیمت ڈھائی روپیہ فی ریم تھی آپ اس کا چندہ پانچ روپیہ ادا کرتے تھے، اس کے بعد جب اقتصادی دشواریاں بہت بڑھ گئیں تو صرف ایک روپیہ کا اضافہ چندہ میں کیا گیا لیکن اب کہ روپیہ کی قیمت چار آنہ سے بھی کم رہ گئی ہے اور کاغذ کی قیمت اٹھارہ روپیہ فی ریم تک پہونچ گئی ہے اور آیندہ اس میں مزید اضافہ کا اندیشہ ہے، کیا ہمارے لئے ممکن ہے کہ اسی چھ روپیہ میں سال بھر تک نگار آپ کو فراہم کرتے رہیں

ہر چند جو دشواری آج ہمارے سامنے ہے وہی دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی تھی اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے لیکن ہم نے کبھی ان دشواریوں کا اظہار آپ سے نہیں کیا اور کسی نہ کسی طرح اپنی وضع نباہتے رہے، مگر اب کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور تقسیم ہند نے ہندوستان کے اُردو رسائل کا مستقبل بہت تاریک بنا دیا ہے، یہ مسئلہ بہت زیادہ اہم ہو گیا ہے اور اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر کے لئے آپ کو بھی اس پر غور فرمانا چاہئے

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی مشکلات میں ہر شخص مبتلا ہے، لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب سوال سیر و تفریح یا دوسری غیر ضروری مشاغل کا آتا ہے تو آپ اس اقتصادی دشواری کو بھول جاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے ان غیر ضروری مصارف کو پورا کرتے ہیں پھر کیا آپ کے لئے ممکن نہیں کہ صرف دو روپیہ سال کا مزید بار نگار کے لئے بھی برداشت کرلیں اور اس کا سالانہ چندہ چھ روپیہ کی جگہ آٹھ روپے ادا کریں

یقین کیجئے کہ ہم نے انتہائی مجبوری کی حالت میں یہ درخواست آپ سے کی ہے اور اس توقع کے ساتھ کہ آپ اسے منظور فرمائیں گے لیکن اگر آپ میں سے کوئی صاحب ایسے ہیں جو اس قلیل اضافہ کو بھی منظور نہیں کر سکتے تو پھر وہ سالنامہ حاصل کرنے کی توقع قائم نہ کریں یہ اضافہ ہم آیندہ جنوری ۵۲ء سے کرنا چاہتے ہیں اس لئے ابھی کافی وقت ہے، سوچ کر ہمیں اطلاع دیجئے کہ آپ سالنامہ چاہتے ہیں یا نہیں — یہ درخواست ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں کے خریداروں سے ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک کارڈ کے ذریعہ سے ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں گے تاکہ سالنامہ کی اتنی ہی کاپیاں طبع کرائی جائیں جتنی ضرورت ہے

وہ حضرات جو فی الحال خریدار ہیں یا اخیر دسمبر ۵۱ء تک ہوں گے ان سے نگار کا چندہ بدستور چھ روپیہ لیا جاتا رہیگا، لیکن سالنامہ کی زاید قیمت دو روپیہ انھیں ادا کرنا پڑے گی اگر وہ اسے حاصل کرنا چاہیں گے

مینیجر نگار

داہنی طرف صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۰ | فہرست مضامین اگست سنہ ۵۱ء | شمار ۲

ملاحظات

امریکہ و روس کی ذہنیتوں کا اختلاف

انسان ایک منطقی حیوان ہے یعنی وہ سوچتا ہے، حالات پر غور کرتا ہے، نتائج تک پہونچتا ہے اور پھر اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے ۔ یقیناً یہ ایک بڑی بلند و ممتاز خصوصیت ہے اور انسانی ترقی کا انحصار اسی چیز پر ہے، لیکن یہ یقین کر لینا کہ وہ ہمیشہ صحیح سوچتا ہے، غور و فکر میں اس سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اور اس کے سمجھے ہوئے نتائج ہمیشہ درست ہوتے ہیں، غالباً صحیح نہیں ہے یہ کوئی ایسی نازک بات نہیں کہ رہا جس کے سمجھنے کے لئے بڑی عقل آرائی کی ضرورت ہو ۔ قوموں کے انقلاب کی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی یہ حقیقت بہ آسانی واضح ہو سکتی ہے

کیا بابل و اسیریا کے کھنڈروں کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اپنے زمانۂ عروج میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی انھیں اس زوال کا خیال آیا ہوگا، کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ یونان ایسی عقل پرست قوم پر کبھی ادبار آسکتا ہے، کیا قیاصرۂ روم یہ کبھی تصور کر سکتے تھے کہ ان کی عظمت جو ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھی ایک دن محض فسانہ بن کر رہ جائے گی، کیا اکاسرۂ عجم کی شوکت و سطوت کو دیکھ کر اسوقت کا انسان کہہ سکتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے خاک میں مل جانا ہے، کیا ہارون الرشید کے دور زریں کو دیکھ کر چنگیز و ہلاکو کا تصور کسی کے ذہن میں آسکتا تھا اور کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ اکبر اعظم کی قایم کی ہوئی سلطنت کا آخری تاجدار انتہائی بیکسی کے عالم میں جان دے گا

پھر اس زمانہ کو جانے دیجئے جس کے متعلق آج کا انسان کہہ سکتا ہے کہ جہل و بے عقلی کا زمانہ تھا، لیکن آج علم و سائنس کی دنیا میں بھی وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو پہلے ہوا تھا، بلکہ شاید زیادہ شدت و تیزی کے ساتھ ۔ اس سے قبل تو خیر اشتوں کی طرح یہ سلسلہ

تک پہونچتی تھیں لیکن اب کہ انسان بہت زیادہ عقلمند ہوگیا ہے ایک صدی کے اندر ہی اندر عروج و زوال کی داستان پوری ہو چکی ہے، انقلاب کے بعد فرانس کا عروج بھی ایک صدی سے زیادہ قایم نہ رہ سکا، فرانس کے بعد برطانیہ ساری دنیا پر چھا گیا، لیکن سو سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ یہ سیادت امریکہ نے چھین لی اور ہو سکتا ہے کہ زمانہ امریکہ کو شاید اتنی مہلت بھی نہ دے اور نصف صدی گزرنے سے پہلے ہی یہ اقتدار کسی دوسرے کو سونپ دے

اس میں شک نہیں کہ یہ صدی امریکہ کی صدی ہے، جو دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد شروع ہوتی ہے، لیکن حالات بتاتے ہیں کہ یہ صدی چند سال سے زیادہ چلنے والی نہیں اور بہت تیزی کے ساتھ اشتراکی صدی کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے

ہم نے ابتدائی سطور میں ظاہر کیا تھا کہ انسان کا یہ یقین کر لینا کہ وہ ہمیشہ صحیح سوچتا ہے، سخت غلطی ہے اور امریکہ اس وقت اسی غلطی میں مبتلا ہے، جس سے روس فایدہ اٹھا رہا ہے

امریکہ سمجھتا ہے کہ کامیابی کا انحصار صرف فوجی قوت اور ڈالر کی کثرت پر ہے اور اس لئے وہ اپنے تمام ذرایع انھیں دو چیزوں پر صرف کر رہا ہے، حالانکہ دنیا کے موجودہ میلانات و رجحانات کا اقتضاء کچھ اور ہی ہے۔ امریکہ اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہے کہ آیندہ ۵۰ سال کے اندر اپنی بقاء کے لئے جو تدابیر اسے اختیار کرنا چاہئے ان کا تعلق اسلحہ و ڈالر سے نہیں بلکہ دنیا کے ذہنی انقلاب سے ہے اور یہی وہ راز ہے جسے اس کے حریف روس نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور امریکہ نے ابتک نہیں سمجھا

امریکہ کے طرزِ عمل سے تمام دنیا کو یہ سمجھنے کا موقعہ ملا ہے کہ اس کا تنہا مقصود صرف اپنے لئے نئے مارکیٹ پیدا کرنا اور دوسرے ملکوں کی خام پیداوار ارزاں قیمت پر حاصل کر کے وہاں اپنی مصنوعات گراں قیمت پر فروخت کرنا ہے، برخلاف اس کے روس اپنے طرزِ عمل سے کبھی یہ سمجھنے کا موقعہ نہیں دیتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود امریکی آبادی میں کبھی کوئی جذبۂ ایثار و قربانی اپنی حکومت کے لئے پیدا نہیں ہوتا اور روسی اثرات قبول کر لینے والے ممالک میں یہ جذبہ عام ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہم کو کوریا کی لڑائی میں ملتا ہے کہ اس وقت وہاں چین اور کوریا دونوں مل کر اشتراکیت کی طرف سے لڑ رہے ہیں حالانکہ کوئی ایک روسی ڈویزن بھی ان کے ساتھ نہیں ہے اور امریکن بلاک کی فوجوں میں کوئی ایک متنفس بھی ایسا نہ ملے گا جس نے محض ملکی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا ہو اور تنخواہ پانے والی سپاہ کے ساتھ کوئی ایک قومی دیوانہ بھی نظر آتا ہو۔ بات یہ ہے کہ اس وقت خود جمہوری حکومتوں کی کروروں آبادی کو بھی سوا چند مخصوص سرمایہ دار جماعتوں کے ڈماکریسی کی طرف سے فلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے اور اسی لئے وہاں کے عوام میں اپنی حکومتوں کے لئے قربانی کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ تیسری جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس میں امریکہ آٹم بم کی مدد سے کامیاب ہو جاتا ہے لیکن کیا اس کی یہ کامیابی حقیقی کامیابی ہوگی، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد جب نئی حکومتیں قایم ہوں گی تو کوئی ملک بھی ایسا نہ ہوگا جو ڈماکریٹک طریق حکومت کی موافقت میں رائے دے

امریکہ کا یہ دعویٰ کہ ڈماکریٹک طریقِ زندگی کی برتری ساری دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے، صحیح نہیں، خود مغربی یورپ میں بھی جو ڈماکریسی کا گھر سمجھا جاتا ہے اگر اشتراکیت پسندوں اور جمہوریت پسندوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو جمہوریت پسندوں کی تعداد اتنی نہ نکلے گی کہ وہ اشتراکیت کو اپنے ملک سے دور کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ یہ حال ہے مغربی یورپ کا پھر جائیکہ دوسرے ممالک جو ڈماکریسی سے واقف ہی نہیں ہیں

اس وقت امریکہ کا دنیا کے تمام مسایل کو صرف اسلحہ اور ڈالر کے نقطۂ نظر سے دیکھنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ لوگوں کو صرف ڈرا کر یا رشوت دے کر کام نکالنا چاہتا ہے۔ معقولیت اور تالیفِ قلوب اس کے یہاں کوئی چیز نہیں

امریکہ اس میں شک نہیں اپنے طرزِ عمل کے جواز ثابت کرنے کے لئے کافی پروپاگنڈا کر رہا ہے چنانچہ وہاں کی حکومت نے دس کرور ڈالر بین الاقوامی پروپاگنڈا کے لئے منظور کئے ہیں اور یہ رقم بظاہر بہت بڑی معلوم ہوتی ہے، لیکن روس اس وقت تک جتنی کامیابی

حاصل کر چکا ہے اس کا جواب دینے کے لئے پانچ ارب ڈالر بھی کم ہے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کروڑوں باشندوں کو ڈیماکریسی کی خوبیوں کا یقین دلانا آسان بات نہیں۔ خود یوروپ کی جمہوری حکومتوں میں بھی لاکھوں مزدور و دہقان اشتراکیت کی طرف مایل ہیں اور اشتراکی اخبارات سے وہ اس قدر متاثر ہیں کہ ان کے دلوں سے روسی نظام حکومت کا اثر مٹانا دشوار ہے کسی جماعت کو اپنی طرف مایل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کے توقعات کا لحاظ رکھا جائے لیکن امریکہ کی طرف سے جو پروپگنڈا ہوتا ہے اس میں صرف اہل امریکہ کی موجودہ کامیاب و خوشحال زندگی کا ذکر کیا جاتا ہے، حالانکہ سننے والا قدرتاً یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر امریکہ کا انسان اچھی زندگی بسر کر رہا ہے تو ہمیں کیا؟ ہم کو اس سے کیا فایدہ پہونچتا ہے

اٹلی کا ایک کسان، ایران کا ایک مزدور، چین کا غریب باشندہ اگر اشتراکیت کی طرف مایل ہے تو وہ اس کے لئے یہ دلیل بھی رکھتا ہے کہ اس طرح اس کو زیادہ زمین ملے گی، زیادہ مزدوری ملے گی، لیکن امریکہ اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی توقع پیدا نہیں کر سکتا۔

ڈیماکریسی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ اشتراکیت سے زیادہ عوام کی توقعات کو پورا کرنے والی ثابت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قول سے زیادہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت بہم پہونچائے

ایران کے علاقہ آذربیجان میں جنگ کے بعد تقریباً پانچ سال تک روس کا قبضہ رہا اور اس دوران میں وہاں کے لوگوں کی ترقی و آسایش کے لئے خدا جانے کیا کیا، لیکن جب اخیر میں ایران نے روس سے تخلیہ کرنے کے لئے کہا تو اس نے بلا عذر آذربیجان خالی کر دیا اور بہت سی نعمتیں وہاں کے لوگوں کے لئے چھوڑ گیا۔ کیا امریکہ اور دوسری جمہوریت پسند حکومتیں کوئی ایسی مثال قایم کر سکتی ہیں اور جب تک وہ اپنے اخلاق کا اتنا بلند ثبوت نہ دیں محض اپنی خوشحالی کی داستانیں سنا کر بدحال ملکوں کو اپنی طرف مایل نہیں کر سکتیں

نگار کا آیندہ سالنامہ اور

نگار کے سالانہ چندہ میں اضافہ

اس وقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کا رجحان زیادہ تر حسرت نمبر کی طرف ہے، اسلئے یہ بات تو طے ہو گئی کہ آیندہ سالنامہ حسرت نمبر ہوگا، لیکن قارئین نگار کو ابھی سے سمجھ لینا چاہئے کہ حسرت نمبر بہت ضخیم ہوگا، علاوہ ان مقالات کے جو ان کی زندگی و شاعری سے متعلق ہوں گے، خود ان کے وہ مقالات بھی ہوں گے جو سیاسیات اور خدمت زبان کے سلسلہ میں انھوں نے لکھے تھے اور اب نایاب ہیں، ان کے تمام دواوین کا بہترین انتخاب بھی شایع ہوگا، الغرض حسرت نمبر ہر لحاظ سے ایک مکمل تالیف ہوگا، جس کی تفصیلات آیندہ اشاعت میں ملاحظہ سے گزریں گی ــ ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ کاغذ کی قیمت اٹھارہ روپے فی ریم تک پہونچ گئی ہے ہم چندہ میں اضافہ کئے بغیر اس کو پیش نہیں کر سکتے

اور آیندہ جنوری سے نگار کا سالانہ چندہ قارئین نگار کو چھ روپیہ کی جگہ آٹھ روپیہ ادا کرنا ہوگا۔ وی۔ پی آٹھ روپیہ چھ آنہ میں روانہ ہوگا۔ وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم نہیں ہوتا ان کو حسرت نمبر دو روپیہ چھ آنے میں ذریعہ وی، پی روانہ کیا جائیگا اگر دو روپیہ انھوں نے پہلے سے نہ بھیج دئے۔

ازراہ کرم اس اشاعت میں صفحۂ اول کا اعلان پڑھ لیجئے

تاریخ انقلاب فرانس کا ایک پوشیدہ ورق

(حُسن کی سحر کاریاں)

فرانس میں انقلاب کی آگ پوری قوت کے ساتھ بھڑک چکی تھی اور کوچہ و بازار میں امیروں، رئیسوں کے سروں کو لوگ پاؤں سے ٹھکراتے ہوئے گزر جاتے تھے

رفتہ رفتہ یہ آگ شہر بورڈو تک پہونچ گئی اور وہاں کے اکابر (جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی) قید خانوں میں بند کر دئے گئے، جو موت کے انتظار میں نہایت کرب و اضطراب کی زندگی بسر کر رہے تھے

انھیں زندانیوں میں ایک نوجوان اسپانوی عورت ایسی بھی تھی جو اپنے انجام کی طرف سے بالکل مطمئن تھی اور خوف و ہراس کی کوئی علامت اس کے چہرہ سے ظاہر نہ ہوتی تھی اسے یقین تھا کہ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں، بڑے بڑے چمکدار بال، دلکش چہرہ اور ۲۰ سال کی بھرپور جوانی دستِ جلاد کو بھی شل کر سکتی ہے۔ اس کا نام ترزیا تھا۔ ایک اسپانوی رئیس کی لڑکی تھی اور ابتدا ہی سے اپنے غیر معمولی حُسن و جمال کی وجہ سے دُنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بچپن میں ماں باپ نے دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ اسی کی زیادہ ناز برداری کی اور جب وہ جوان ہوئی تو شہر کے تمام دولتمند نوجوان پروانہ وار اس کے گرد صدقے ہونے لگے لیکن اس نے کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں

آخر کار جب اس کی عمر ۱۸ سال کی ہوئی تو سیاسی مصلحت کے پیش نظر فرانس کے ایک رئیس کونٹ دو فونتنی سے اسکی شادی کر دی گئی

جب اس کا شوہر اسے پیرس لیکر آیا تو اس کے حُسن و جمال نے یہاں بھی آگ لگا دی اور لوئی شانز دہم اور میری انطونیٹ کے دربار میں اس کا اس قدر اثر و نفوذ ہو گیا کہ مشہور ہے دربار کے سفیر کبوتر بھی بغیر اس کی اجازت کے دانہ نہ چگتے تھے

اس میں شک نہیں اس وقت لوئی کا دربار اپنے جلال و جبروت کے لحاظ سے بظاہر انتہائی عروج پر تھا، لیکن اندرونی طور پر اس کی حالت اس عمارت کی سی تھی جس کی بنیاد ہل چکی ہو اور اس لئے جب انقلاب کی تحریک شروع ہوئی تو اس کا دبدبہ و حشم چشم زدن میں خاک ہو کر اُڑ گیا اور اس کا ایک ایک فرد اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا

انھیں بھاگنے والوں میں ترزیا اور اس کا شوہر بھی تھا جنھوں نے بورڈو میں اس لئے پناہ لی تھی کہ وہاں تک انقلاب کے اثرات پہونچنے کا بہت کم اندیشہ تھا۔ لیکن یہ آگ ایسی نہ تھی کہ پیرس ہی تک محدود رہتی۔ پوری قوم پر انقلاب کا جنون طاری تھا، اور صدیوں کی مستبد حکومت کو فنا کر دینے کا جوش اتنا زبردست تھا کہ امراء و اشراف کے خون کے سوا اور کسی چیز سے ٹھنڈا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ وہی لوگ جنھوں نے کبھی اپنے قدم زمین پر نہ رکھے تھے، ان کے پاؤں کانٹوں سے زخمی تھے اور وہی سر جن پر ہر وقت زرکار و جواہر نگار کلاہ جگمگایا کرتی تھی اب گلیوں میں گیندوں کی طرح لڑھکتے تھے

آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ خونیں سیلاب صرف پیرس تک کیونکر محدود رہ سکتا تھا، وہ چاروں طرف پھیل گیا اور آخرکار بورڈو میں پہونچ گیا جہاں ترزیا اور اس کے شوہر نے پناہ لی تھی

انقلابی حکومت کی طرف سے ایک افسر تران کا مبر تالی ین مامور ہوا کہ وہ بورڈو جا کر تمام پناہ گزین امراء و اشراف کو تہ تیغ کر دے

تالی ین ایک ... نے والے کا لڑکا تھا جو ابتداءً ایک وکیل کا منشی تھا اور بعد کو ایک روزنامہ کا نامہ نگار ہو گیا تھا، انقلاب کے زمانہ میں یہ نہایت اشتعال انگیز مضامین لکھا کرتا تھا اور جب انقلابی حکومت قایم ہوئی تو یہ بھی اس کا ایک رکن منتخب کر لیا گیا اور یہی پہلا شخص تھا جس نے میری انٹوائنٹ کے قتل کی تجویز پیش کی۔ یہ فطرتاً بڑا ہی شقی القلب انسان تھا اور خونریزی و خون آشامی اس کو بہت پسند تھی۔ چنانچہ بورڈو پہونچتے ہی اس نے امراء و اعیان کی گرفتاری شروع کر دی اور ان کو جیل میں بند کر دیا۔ انھیں قیدیوں میں ترزیا بھی تھی جس کا شوہر اسے تنہا چھوڑ کر کسی اور جگہ بھاگ گیا تھا

آخرکار ان زندانیوں کے قتل عام کی صبح آ پہونچی اور قیدیوں میں ہلچل مچ گئی، لیکن ترزیا کا عالم کچھ اور تھا، وہ اٹھی، نہائی، کپڑے بدلے، بال سنوارے اور تالی ین کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار ہو گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر تالی ین کی شقاوت و بے رحمی ضرب المثل ہے تو اس کا حسن و جمال بھی بے پناہ چیز ہے اور تاریخ کے متعدد ایسے واقعات اس کو یاد تھے کہ بے رحمی و خوبصورتی کے تصادم میں بارہا حسن ہی کو کامیابی حاصل ہوئی

جب وہ بن سنور کر طیار ہو گئی تو اس نے وہیں قیدخانہ میں بیٹھ کر تالی ین کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"میں بے گناہ ہوں اور بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا مناسب نہیں،
مجھے حاضری کا موقع دیجئے تاکہ میں اپنی بے گناہی آپ پر ثابت کر سکوں"

دوسرے دن جب تالی ین قیدخانہ پہونچا اور ترزیا کو دیکھا تو وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور باوجود جفا کار و ستمگر ہونے کے تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا قدرت کے ایسے زبردست شاہکار کو فنا کر دینا جایز قرار دیا جا سکتا ہے

اس نے حکم دیا کہ ترزیا کو داروغۂ محبس کے کمرہ میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ اس سے تنہائی میں دریافت حال کر سکے۔ چنانچہ ترزیا انتہائی خوش ادائی کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوئی اور جب تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی تو وہ آزاد تھی اور اس کا چہرہ ... مسرت سے چمک رہا تھا

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے، کیونکہ اس نے اپنے علاوہ دوسرے بہت سے قیدیوں کو بھی آزاد کرا دیا اور بورڈو کی وہی آبادی جو چند ساعت پہلے اس کے خون کی پیاسی تھی، تالی ین سے عفو ہونے کے بعد اسے آزادی کی دیوی سمجھنے لگی

اس وقت پیرس میں انقلابیوں کا سرگروہ روبسپیر تھا وہ بورڈو کی خبریں سننے کا بے تابی کے ساتھ منتظر تھا کہ جاسوسوں نے سارے پوست کندہ حالات اس کو لکھ بھیجے کہ تالی ین نے کس طرح ایک باغی حسین عورت کی محبت پر ملک کے مفاد کو قربان کر دیا اور اب وہی عورت جس کا سر قلم ہونا چاہئے تھا، اہل بورڈو کے سروں پر حکومت کر رہی ہے

روبسپیر جس کو پہلے بھی شبہ تھا کہ ترزیا جاسوس ہے اور انقلاب کے لیڈروں کو اغوا کرنے کے لئے اشراف و امراء کی طرف سے مامور کی گئی ہے، یہ حالات سنکر غصہ سے بیتاب ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ تالی ین فوراً پیرس واپس آئے تالی ین بورڈو سے چلا تو ترزیا بھی اس کے ساتھ تھی۔ لیکن مردانہ لباس میں اور جب وہ ورسائی پہونچا تو ...

وہیں چھوڑ دیا اور خود تنہا پیرس گیا۔ یہیں سے وہ روز رات کو ورسائی جاتا اور ترزیا سے مل کر صبح کو پیرس واپس آتا

روبسپیر نہایت سخت دل انسان تھا اور انقلاب کے سوا دنیا میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس کو اپنی طرف مائل کر سکتی۔ انقلاب اس کا خدا تھا اور وہ اس کا بندہ اور وہ ہر اس چیز کا دشمن تھا جو اس تعلق کو صدمہ پہونچائے، وہ جانتا تھا کہ سب سے بڑا حربہ جو مرد کے خلاف استعمال ہوتا ہے وہ حسن و جمال ہے، اس لئے وہ عورت کا قطعی دشمن تھا اور اس پر کبھی رحم نہ کرتا تھا۔ انقلاب کے زمانہ میں خدا جانے کتنی پریوش عورتیں اس کے حکم سے تہ تیغ کی گئیں اور ان میں سے ہر ایک کے تڑپتے ہوئے لاشہ سے اس نے پورا لطف اٹھایا۔ اس لئے جب اسے معلوم ہوا کہ تالی ین، ترزیا کے افسون جمال میں مبتلا ہو گیا ہے تو اس کی آتش غضب بہت زیادہ مشتعل ہو گئی اور اس نے حکم دیدیا کہ ترزیا جہاں کہیں ہو اسے گرفتار کر لیا جائے

گرمی کی رات تھی، ۲ بج چکے تھے کہ انقلابی سپاہیوں کی ایک جماعت اس مکان پر پہونچی جہاں ترزیا چھپی ہوئی تھی اور بندوقوں کے کندوں سے دروازہ کو پیٹنا شروع کیا۔ ترزیا اپنا لباس شب پہنے ہوئے دروازہ تک آئی اور پوچھا "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو" انھوں نے جواب دیا کہ "ہم حکومت کے سپاہی ہیں اور تمھیں چاہتے ہیں" ترزیا اپنا لباس شب بھی نہ بدل پائی تھی کہ سپاہی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اسے پکڑ کر لے گئے

اس کے بعد اس کے سر کے بال کاٹ دئے، ایک پھٹا ہوا لباس پہننے کو دیا اور نہایت گندے و کثیف زندان میں اسے بند کر دیا وہ تین ہفتہ تک اسکے اندر بند رہی اور اس دوران میں چوہوں نے اسکے جسم کو اتنا زخمی کر دیا کہ اسکے نشان آخر عمر تک اسکی جلد پر باقی رہے

تالی ین کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے زنداں کے سامنے ہی ایک مکان کرایہ پر لیا تاکہ صبح و شام جب ترزیا کو زندان سے باہر لایا جائے تو وہ اسے دور ہی سے دیکھ سکے۔ اس نے سپاہیوں کو رشوت دیکر خط و کتابت کی صورت بھی پیدا کرلی اور رات دن اس فکر میں رہتا تھا کہ روبسپیر سے کیونکر اس کا انتقام لے

آخر کار وہ رات آپہونچی جس کی صبح کو ترزیا کی گردن قطع کی جانے والی تھی اور تالی ین اپنی اس آخری تدبیر کو عمل میں لایا جو ترزیا کی جان بچانے کے لئے اس نے سوچی تھی

اس نے اپنے وفادار دوستوں کو ایک جگہ جمع کیا اور ان سے کہا کہ انقلاب ہماری انتہائی خواہش تھی جو خدا نے پوری کی، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ روبسپیر جس نے اب ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت اختیار کر لی ہے، یہ نعمت ہم سے چھین لینا چاہتا ہے، اس لئے اگر ہم اپنے ملک کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو روبسپیر کو راستہ سے ہٹانا لازم ہے۔ اس کی اس گفتگو کا اتنا اثر ہوا کہ ایک پوری جماعت اس کی ہمنوا ہو گئی اور تالی ین نے فیصلہ کر لیا کہ صبح تک ترزیا نہیں بلکہ خود روبسپیر کی گردن کو تن سے جدا کرنا ہے

یہاں حکومت کی مجلس قائم ہے اور مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے کہ تالی ین دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ان تمام باتوں سے زیادہ اہم بات یہ طے کرنا ہے کہ فرانس کو عوام کی آزاد حکومت رہنا ہے یا اسے ڈکٹیٹرشپ میں تبدیل کر دینا ہے یہ گفتگو ظاہر ہے کہ کیسے [illegible] بن ہو سکتی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر تالی ین نے کہا "تو پھر سب سے پہلے ہمیں روبسپیر کو ختم کرنا چاہئے جو فرانس کی عوامی حکومت کو ختم کر دینا چاہتا ہے" یہ کہکر اس نے اپنی کمر سے خنجر نکالتے ہوئے کہا اگر تم سب بزدل ہو اور کسی میں ہمت نہیں کہ اس خطرہ کو دور کر سکے تو میں خود اس خدمت کو انجام دوں گا یہ سنتے ہی مجلس میں ایک شور [illegible] پیدا ہو گیا اور روبسپیر کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتا۔ دوسرے دن صبح کو ایک طرف [illegible] روبسپیر کی گردن قطع کی جا رہی تھی اور دوسری طرف [illegible] تالی ین [illegible]

ادب کا جایزہ لیتے ہیں تو ان کے ابتدائی نقوش سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت سے ملنے لگتے ہیں

اُردو ادب میں اس رجحان کی ذمہ دار دو چیزیں ہیں ایک تو تقلید اور دوسرے تاریخ۔ تقلید کا اثر شاید اتنا دیرپا نہ ہوتا مگر تاریخ نے کچھ دیر کے لئے ماننا پڑتا ہے کہ ذہنی دھارا بالکل اس طرف موڑ دیا اور بہنے والوں نے کشتی کو تخئیل پر چھوڑ کر مزلے لیکر ہنسنا شروع کر دیا۔ تخیلیت کا نمونہ تقلیدی طور پر طلسم ہوشربا، نو راتشان، زعفران زار اور کوچک باختر وغیرہ سے مل ہی چکا تھا، جنھیں حقیقت سے بہت کم لگاؤ تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جب خفا ہوکر یہ فرماتے ہیں "جن تخیلات نے ان کو پیدا کیا ان کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ایک ایسی دُنیا پیش کرتے ہیں جو حقایق سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی وہ ایک ایسی کائنات ہوتی ہے جس میں پریاں، دیو اور عجیب الخلقت ہستیاں اشخاص قصہ کا کام دیتی ہیں" تو ان کا خفا ہونا کچھ تو ضرور ٹھیک ہے مگر ہمیں اس وقت کی تاریخ کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان دماغوں کے اس نہج پر سوچنے میں بہت کچھ ہاتھ ہندوستانی تاریخ کا بھی ہو ہندوستان کی سیاسی و اقتصادی حالت ویسی ہی ہو رہی تھی جیسی بارھویں اور تیرھویں صدی میں ایران کی۔ چنگیز، ہلاکو اور پھر بعد میں تیموری حملوں نے ایران کی سرزمین ہلا دی تھی۔ انتشار اور کس مپرسی نے عوام کو بُری طرح گھیر رکھا تھا۔ جس نے وہاں کے ادیبوں کو (جو زیادہ تر شاعر ہوا کرتے) غزل کے اس ماحول میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا جسے ہم آج کسی حد تک فراری ماحول کہہ سکتے ہیں، "بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است"۔ جیسے خیالوں نے انھیں فضاؤں میں پرورش پائی تھی مگر انھوں نے صرف فراریت ہی کو جنم نہیں دیا بلکہ کچھ تعمیری کام بھی کئے۔ عطار، سعدی اور رومی جیسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے فلسفۂ اخلاق و تصوف کو عروج دیا۔ اس "دفتر یا گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد" جیسے دور میں اخلاقیات کی سخت ضرورت تھی جو عوام سے بالکل ختم ہو چکا تھا

جب ہم ہندوستان کے مغلیہ انحطاطی دور کی تاریخ اُٹھاتے ہیں تو کم و بیش یہی منظر سامنے آتا ہے۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستانی سیاست ایک انقلاب عظیم سے دوچار ہوئی، مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور دکن وسط و شمالی ہندوستان نزاع کا شکار ہو گیا۔ مرہٹہ۔ سکھ اور پٹھانوں کی لوٹ نے ہندوستان میں انتشار پھیلا دیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ آپ نے ہم کو لوٹا۔ ہم نے آپ کو لوٹا اور پھر دونوں کو ایک تیسرا آدمی لوٹ لے گیا۔ ایسے انتشاری دور میں جادو کے زور سے طلسماتی محلوں کا کھڑا ہو جانا یا پریوں کا عاشق ہو کر انسانوں کو لے اُڑنا یا انسان کا پری پر عاشق ہو کر دیوانہ وار پھرنا کوئی نئی بات نہ تھی اور خصوصاً اس وقت کہ جب سامنے مثالیں بھی موجود ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معجون شدت احساس کی کمی کے لئے اور بے تاج کے بادشاہوں کو تاجدار سمجھتے رہنے کے واسطے اچھی چیز تھی مگر اس پر اتنا زور دیا گیا کہ ذہن انسانی سے اپنے ماحول اور واقعات کی صحیح تصویر او جھل ہو گئی اور بجائے اس کے کہ اس دور کا انتشار و کس مپرسی بھی ہمارے سامنے آتی، صرف یہ جھوٹے جنسیات کے پوٹ کے پوٹ آکر اکٹھا ہو گئے اور ہمارے آگے تعمیری یا اصلاحی طریقہ کا کوئی عنصر نہ رہ گیا۔ طلسمات اور جنسیات ہی حاصل داستان و افسانہ بنے رہے۔ چنانچہ جتنی داستانیں اور قصے ہمیں اُردو میں ملتے ہیں ان میں صرف یہی دو چیزیں ہمارے سامنے خاص طور سے رہتی ہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف شر نگار رس ہی عنصر غالب ہے اور طلسم جنات و پریاں اپنے حرکات و سکنات سے اس عنصر کے معاون نظر آتے ہیں۔ ٹکنیک کی لاعلمی نے اسی عنصر کو پلاٹ و کردار پر بھی حاوی رکھا ہے۔ اور عمل (ACTION) پر تو اس کا اثر ہوئی۔ جنس کی شدت نے انھیں یہ بھی نہ سوچنے دیا کہ ہمارا کردار کس پائے کا ہے اور ہم اس سے کس طرح کے کام لے رہے ہیں۔ اس سے متعلق اور سب چیزیں کیسے اس کے ساتھ

لہ اخلاق کی سخت پابندی فراریت اور انحطاط کا ضرور پتہ دیتی ہے۔ مگر اعتدال کے ساتھ اس کا امتزاج زندگی کو اچھے راستے پر ضرور لاتا ہے۔

تضحیکی صورت میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ جنسیات کا ایسا بیان تعیش کا پتہ دیتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور تعیش کا اندازہ اس وقت آپ کو ہوگا جب ساتھ ہی ساتھ اس زمانہ کی تاریخ کو بھی مدنظر رکھئے۔ سعدی کے وقتوں میں لوگ قحط کے باعث عشق و عاشقی بھول جاتے تھے مگر ہمارا یہ دور باوجود قحط، لوٹ غدر، بربادی کے بھی صرف اتنی رعایت کر سکا کہ جن کو اور کچھ استطاعت نہ تھی وہ ذہنی استلذاذ ہی کو کافی سمجھتے تھے اور جو سن و عمر کے لحاظ سے بیکار ہو چکے تھے وہ جمال یار کی آئینہ میں جلوۂ یار دیکھنے لگے

اسے اُردو ادب کی بدقسمتی کہئے یا ہماری کم نظری کہ آج تک صحیح طریقہ سے یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ قصۂ چہار درویش کب لکھا گیا اور کس نے لکھا۔ بہت سی روایتیں ہیں جن میں ہر شخص اپنے لحاظ سے ایک نیا مصنف لاتا ہے امیر خسرو والی روایت تو ختم پڑ چکی مگر حافظ محمود شیرانی کے بیان میں کافی جان ہے جو یقین تک پہونچ جاتا ہے وہ قصے کا اصلی مصنف حکیم محمد علی المخاطب بمعصوم علی خاں کو ٹھہراتے ہیں۔ استدلال کے طور پر مندرجہ ذیل باتیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ محمد علی کا سپاس نامہ جو محمد شاہ کے حضور میں کتاب تمام ہونے پر پیش کیا گیا

۲۔ اگر قصہ کسی اور دور میں تصنیف ہوتا تو ابوالفضل اور کتابوں کا تذکرہ کرتے وقت آئین اکبری میں چہار درویش کا تذکرہ بھی ضرور کرتا۔ اس کے علاوہ نظام الدین اولیا کے حالات، مقالات و ملفوظات میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں

۳۔ فارسی نسخہ میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو حافظ۔ نظیری۔ سعدی کے ہیں

۴۔ فارسی نسخہ میں دوربین کا ذکر ہے جو سترھویں صدی مسیحی کی ایجاد ہے

مگر ان سب پر سوائے دوسرے ثبوت کے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے بعد کے مؤلفین نے اضافہ کیا ہو۔ لہذا قصہ کا ماحول ہی ہماری صحیح رہبری کر سکتا ہے جو زیادہ تر رنگین ہے اور سارے قصہ پر حاوی ہے۔ ایسی رنگینیت جس کی مثال سوائے محمد شاہی دور کے اور کہیں مل ہی نہیں سکتی۔ پورے ہندوستان کے اسلامی دور پر نظر دوڑایئے مگر کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جہاں رعایا اور بادشاہ دونوں اتنے رنگین مزاج رہے ہوں جتنا سلطنت مغلیہ کے انحطاطی دور کے بادشاہ اور رعایا۔ کہانی ایرانی نژاد نہیں اس کے ثبوت میں بہت کچھ قصہ میں خود موجود ہے۔ مثلاً۔ اشرفی۔ وکیل السلطنت۔ خزانہ دار۔ امیر آخور وغیرہ وہ الفاظ ہیں جو خاص مغلوں کے دور حکومت میں ڈھالے گئے

عموماً چہار درویش کا نام آتے ہی میر امن و باغ و بہار کا خیال آتا ہے اور میر امن کے ساتھ نیز یہ کہ ان کے زبان و بیان ان کا حصہ کردار و پلاٹ میں ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ کے مسئلے چھڑ جاتے ہیں۔ چہار درویش ایک بڑی تبدیلی کے بعد اُردو میں ڈھالا گیا ہے جس کا زیادہ تر حصہ تو تحسین کا ہے اور کچھ حصہ میر امن کا ہے۔ اصل قصہ سے دونوں میں انحراف ہے باغ و بہار میں نوطرز مرصع کا اتباع کرتے ہوئے بھی تبدیلی ہے، حالانکہ ڈاکٹر عبدالحق اپنے مقدمہ میں باغ و بہار کو نوطرز مرصع کا ترجمہ بتاتے ہیں مگر ایسا قطعی نہیں ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے ــــ ذیل کے اقتباسات اس دلیل کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں

میر امن پہلے درویش کی سیر میں تاجر بچہ کی داشتہ کو انتہائی کریہ المنظر و بدصورت بتاتے ہیں:۔

"وہ نہیں ایک عورت کالی کلوٹی کٹنی سی جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جائے جو ان کے پاس آ بیٹھی فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا"

اب نوطرز مرصع کا بیان سنئے:۔

"میں نے کہا اسے دوست دار، تیری خوشی درکار ہے جلد بلوا۔ کہنے کے بموجب بلوائی۔ ایک عورت خوبصورت پردے

سے باہر آئی قدرت خدا نظر آئی۔

نگہ اس کی ہوئی تھی جس دم دوچار گزر جاتی تھی تیر سی دل کے پار

(۲) میر امن پہلے درویش کی سیر میں پہلے شاہزادی کا نکاح درویش سے کراتے ہیں۔ بیچ میں وہ مکالمہ تعلیں "گس بوستے پوچھتا پانی" پھر ملکہ بگڑتی ہے اور تب واقعات بیان کرتی ہے۔ مگر نوطرز مرصع میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ملکہ غائب ہوتی ہے نہ پیپل کا درخت ہے نہ کف دست میدان

(۳) میر امن تیسرے درویش کی سیر میں شاہزادے کے کوکہ کا نام نہیں بتاتے۔ کوکہ اور بہزاد خاں دو بالکل الگ کردار ہیں مگر نوطرز مرصع میں بہزاد خاں کوکہ ہی کا نام ہے اور وہی بہزاد خاں کشتی کو بھی مارتا ہے اور اسی بہزاد خاں کے گھر میں ملکہ اور درویش وارد ہوتے ہیں تو طرز مرصع کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"کہا یہ تابوت مرصع بہ گوہر و یاقوت اُسی شاہزادہ بے گناہ کا ہے اور بندہ بہزاد خاں کوکہ اس جنت آرام گاہ کا ہے۔"

یہ مثالیں غالباً میر امن کی تبدیلیوں کو کافی سے زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ اور اس طرح یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ میر امن نے نوطرز مرصع کا ترجمہ نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں کہیں اس کا سہارا لیا ہو مگر اس کا ثبوت یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ چونکہ واقعات اور کہیں کہیں عبارت مل جاتی ہے لہذا وہ نوطرز مرصع کا ترجمہ ہے۔ قصے اور واقعات تو فارسی میں بھی یہی ہوں گے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایک ہی چیز کے دو ترجمے آپس میں بہت کچھ مل جائیں۔ میر امن کا حصہ پلاٹ و کردار میں بھی ہے۔ قصہ کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات میں دہلی یا نواح دہلی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ رسم و رواج، نشست و برخاست کے آداب وغیرہ اس زمانے کی طرز معاشرت کا پتہ دیتے ہیں

آج جب ہم ان قصوں اور داستانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے نظریات، ہمارے انداز سے بالکل مختلف ہوتے ہیں کچھ یہ بھی ہوتا ہے کہ طریق اظہار و بیان کا سہارا دیکر ہم چیزوں کو اس طرح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ اب اگر ہماری نگاہیں صرف تخریبی چیزوں کو دیکھتی ہیں تو ہم اور چیزوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صرف وہی چیزیں پیش کرتے ہیں جو ہماری دلیلوں کا ثبوت بہم پہونچا سکیں۔ مگر یہ ایک صحیح نقاد کا کام نہ ہوگا۔ ہماری انفرادیت پسندی جسے تھوڑی دیر کے لئے خود پسندی کہیئے۔ اکثر غلط نتیجے نکالتی ہے۔ ہمیں چیزوں کو بہ حیثیت اجتماعی دیکھنا چاہئے اور تب صحیح رائے قایم کرنا چاہئے نہیں تو ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ وہ کہہ دے کہ "میں اسی کو درست سمجھتا ہوں" اور اس طرح معلوم نہیں کتنے اقوال سامنے ہوں گے اور ہر کہنے والا یہی دعویٰ کرے گا کہ میں زیادہ صحیح ہوں

زمانہ اور ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہماری نظریں بھی بالغ اور وسیع ہوتی جا رہی ہیں اور ہم ہر چیز کی چھان بین اسی بالغ النظری سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان پرانی چیزوں میں وہ جوش وہ کردار وہ عمل کا پیغام تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو آج کی زندگی میں ہمارے دوش بدوش ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ جب کل سائنس و ذہن انسانی اور ترقی کر جائے تو ہم ان سے اٹمی، ہائیڈروجنی اور اسی طرح ہونے والے نہ معلوم کتنے انکشافات کے متقاضی ہوں۔ یہ تنگ نظری (جسے ہم وسیع النظری سمجھ رہے ہیں) ہم کو اسی طرح غلط راستے پر ڈال دے گی جیسا کہ ۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک کے پرولٹ کلٹ (Proletcult) اور راپ انجمن کی جنونی مخالفت نے روسی ادب کو لا ڈالا تھا۔ جو چیز پنج سالہ بندوبست کے علاوہ کسی اور چیز کا تذکرہ کرے وہ رجعت پرست کہی جاتی۔ حالت یہاں تک جا پہونچی تھی کہ لوگوں نے شیکسپیئر وغیرہ کو پڑھنا اس لئے ترک کر دیا تھا کہ انھوں نے سولھویں صدی میں ان کے زمانہ کی باتوں کا تذکرہ کیوں نہ کیا۔ گوگول (GOGOL) اور ایوینوف (EVENOV) کی مصیبتوں سے آپ واقف ہی ہوں گے۔ شاعری مشین اور انجن چلانے لگی اور یہاں تک جا پہونچی کہ ایک شاعر نے کہا کہ:۔

"سرمایہ دار معشوقوں کی پنڈلیاں ہمارے پانی کے نلوں کی طرح سڈول نہیں ہیں"

یہاں تک کہ دستوسکی اور میکسم گورکی وغیرہ تک دست اندازی و حرف گیری سے نہ بچ سکے۔ اس لئے ہم ان داستانوں کو دیکھتے وقت ان کے مصنفوں اور مولفوں کی قابلیت، ذہانت اور ان کے ماحول کا ضرور خیال رکھیں۔ ہاں اگر ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک چیز سے واقف تھے مگر انھوں نے اس سے قصداً یا کسی وجہ سے روگردانی کی ہے تو ہم ضرور ان کو قصور وار ٹھہرائیں گے

عموماً آج کل جو پلاٹ و کردار کی تعریف کی جاتی ہے ہماری داستانیں اس کسوٹی پر بہت کم صحیح اترتی ہیں۔ مگر یہ داستانیں بعض مقامات پر اپنے زمانہ اور ماحول کے اعتبار سے اور اسی زمانہ کی ایک نکتہ رس نگاہوں میں بھی اس قدر ناقص ہیں کہ سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ وہ ان باتوں کو نہ سمجھتے رہے ہوں اس لئے کہ یہ ایسی باتیں ہیں جو سامنے کی ہیں اور جنھیں ہر ذی فہم ذرا سا دماغ پر زور دینے کے بعد سمجھ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم دو تین باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تیسرے درویش کی سیر میں نعمان سیاح اپنی فرنگی سیاحت کا قصہ بیان کرتا ہے:۔

"غرض سوداگروں کے آنے کا چرچا ہوا ایک خواجہ سرا معتبر سوار ہو کر اور کئی خدمتگار ساتھ لیکر قافلے میں آیا ۔۔۔۔۔
وہ محلی میرے مکان میں ۔۔۔۔ باہم سلام علیک ہوئی ۔۔۔۔ یہ وعدہ کر کر اور عطر و پان دیکر خواجہ کو رخصت کیا"

ایک جگہ ملکۂ فرنگ کا تذکرہ یوں کیا جاتا ہے:۔

"یہ سن کر قلمدان یاد فرمایا ایک شقہ لکھا اور موتیوں کی دلیاں میں رکھ کر ایک رومال شبنم کا اوپر لپیٹ کر میرے حوالے کیا اور ایک انگوٹھی نشان کے واسطے انگلی سے اتار دی"

اس کے بعد جب شاہزادے کا کوکہ تیسرے درویش کو ملکہ سے ملانے کے لئے لے جاتا ہے تو ملکہ کی نشست گاہ کا نقشہ ملاحظہ ہو:۔

"اس جوان نے قصد بادشاہی باغ کا کیا جب اندر داخل ہوا ایک چبوترہ سنگ مرمر کا ہشت پہل باغ کے صحن میں تھا اس پر ایک نگیرہ سفید بادلے کا موتیوں کی جھالر لگی ہوئی۔ الماس کے استادوں پر کھڑا ہے اور ایک مسند مغرق بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیہ اور بغلی تکیے زربفت کے لگے ہوئے"

اور دوسرا غضب دیکھئے:۔

"یہ کوکہ ادب سے دست بستہ کھڑا رہا پھر ادب سے دور فرش کے کنارے مودب بیٹھا۔ فاتحہ پڑھیں اور کچھ باتیں کرنے لگا"

ایک اور اقتباس دیکھئے۔ تیسرا درویش ملکہ فرنگ کو لیکر بھاگ رہا ہے اور صبح ہو رہی ہے۔ اس لئے اس نے ایک مکان کا قفل توڑا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ سرحد فرنگ ہے اور شہر بھی دارالسلطنت فرنگستان ہے:

"قفل توڑ کر مکان کے بھیتر گئے۔ اچھی حویلی فرش بچھا ہوا۔ شراب کے شیشے بھرے قرینے سے طاق میں دھرے اور باورچی خانے میں نان و کباب طیار تھے ۔۔۔۔۔۔ ایک ایک گلابی شراب پرتگالی کی اس گزک کے ساتھ لی ۔۔۔۔ جب صبح ہوئی شہر میں غل مچا کہ شہزادی غائب ہوئی۔ محلہ محلہ۔ کوچہ کوچہ منادی پھرنے لگی اور کٹنیاں اور ہرکارے چھوٹے"

اور اس کے بعد ایک کٹنی اس گھر میں بھی آتی ہے اور اس کے حرکات و سکنات وہی ہیں جو کہ دلّی اور لکھنؤ جیسے ہندوستانی شہروں میں عموماً دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کٹنی کا تذکرہ سنئے:۔

"ایک بڑھیا شیطان کی خالہ اس کا خدا منہ کالا کرے ہاتھ میں تسبیح لٹکائے برقع اوڑھے دروازہ کھلا پا کر نڈھڑک چلی آئی اور سامنے آکر دعا دینے لگی کہ الہٰی تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے کماؤ کی پگڑی قایم رہے"

پھر وہ اپنی لڑکی کی زچگی کے لئے ستھورا اور اچھوانی کی طالب ہوتی ہے

ان اقتباسات سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ کیسی کیسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک انگریز شاہزادی اور اس سے اس طرح کی باتوں کا اظہار اور پھر رسم و رواج، کنٹیاں، ہرکارے، فاتحہ پڑھنا، سنھوارا۔ اچھوانی۔ تسبیح۔ برقع۔ کتنی عجیب عجیب باتیں ہیں اور خصوصاً اس وقت اور حیرت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی، انگریزوں کے رسم و رواج سے کم و بیش اکبر کے وقتوں سے واقف تھے۔ اور پھر امن کے وقت میں تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ پہلو بچانے کے لئے یہ کہدیا جائے کہ یہ تو پرانے قصے ہی میں رہا ہوگا۔ میر امن نے ترجمہ کر دیا۔ مگر اس میں وزن کم ہے۔ یہ سب تبدیلیاں قریب قریب میر امن کی ہیں اور اگر ان کی نہ بھی ہوتیں تو کم از کم وہ انھیں صحیح ضرور کر سکتے تھے جب کہ وہ انگریزوں کی تہذیب اور ان کے تمدن سے بخوبی واقف تھے۔ جہاں انھوں نے اور تبدیلیاں نادانستہ یا اپنی خوشی سے کی تھیں وہاں ایسی چیزوں کو جنھیں وہ جانتے تھے کہ صریحاً غلط ہیں کیوں نہ بدل دیا۔ اس کا الزام ضرور ان پر ہے اور رہے گا۔

انھیں یہ بھی خیال نہ پیدا ہوا کہ وہ کتاب بھی انگریزوں کی خاطر لکھ رہے تھے اور پھر ایک اُنیسویں صدی کے انگریز کے لئے اور اس کے ملک رسم و رواج کو کیسے اس طرح پیش کر رہے ہیں

قصوں کے پلاٹ ویسے بالکل ہندوستانی افسانوں کی طرح ہیں۔ متوازیت (parallelism) آپ کو ہر جگہ ملیگی۔ پلاٹ کے تموج اور اُلجھاوے وہی الف لیلیٰ اور طلسم ہوشربا و حاتمی قصوں کی طرح پیچیدہ ہوتے چلے گئے ہیں۔ قصہ در قصہ کی ترکیب عمل میں لائی گئی ہے۔ قصہ جا بجا اُلجھتا چلا جاتا ہے۔ جب شاہزادہ نیمروز اپنا قصہ بیان کرتا ہے تو بالکل میر حسن کے بےنظیر سے اس کا قصہ مل جاتا ہے۔ نیمروز کا پری سے ملنا اور بےنظیر کا ماہ رخ سے ملنا قریب قریب ایک سا ہے۔ اختتام کے قریب قصہ پھر پلٹتا ہے اور وہی حاتمی قصے کی طرح اُلجھتا ہے۔ نوجوان شاہزادے کا قصہ سن کر کہتا ہے "اے شاہزادے تونے واقعی عشق کی بڑی محنت اُٹھائی لیکن قسم خدا کی کھاتا ہوں کہ میں اپنے مطلب سے درگزرا اب تیری خاطر جنگل پہاڑ میں پھرونگا"

مگر یہ الزام صرف چہار درویش ہی پر نہیں آتا بلکہ سبھی قصے اور داستانیں اسی طرح کی ہیں۔ ہر قصہ کا ہیرو کسی بادشاہ یا دولت مند کا بیٹا ہے۔ ہر ایک کا عاشق مزاج یا جانباز ہونا ضروری ہے۔ ہیرو یا ہیروئن کسی نہ کسی کو کوئی فوق فطرت ہستی اُٹھا لے جاتی ہے اور آخر میں ہر قصہ کا انجام مسرت یا شادمانی ہوا کرتا ہے۔ اس کے لئے ہم خاص طور سے چہار درویش ہی کو نہیں کہہ سکتے۔ ایسے دور میں جب بادشاہ ہی سب کچھ ہو۔ رعایا کی زندگی اور موت کا دار و مدار اسی کی خوشی اور خفگی پر ہو اور سوچا ہی کیا جا سکتا تھا۔ بات یہ بھی تھی کہ عوام کے ذہن میں اس سے اچھی اور کوئی زندگی بھی نہ تھی اور قصے چونکہ عموماً طربیہ ہوا کرتے لہٰذا ہر چیز اپنی انتہائی خوبی کے ساتھ پیش کی جاتی۔

چہار درویش کی کردار نگاری سے ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ مصنف کا مقصد صرف عریانی اور جنسیاتی چٹخارہ تھا۔ یا اگر ایسا نہیں تھا تو وہ بادشاہوں اور شہزادیوں کی زندگی سے واقف نہ تھا یا اگر تھا تو حقیقت سے ہٹکر اس نے ضرور لکھنے کی کوشش کی۔ پہلے درویش کی سیر میں جو شاہزادی دمشق کا کردار پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا عجیب و غریب ہوگیا ہے کہ سوائے اس امر کے کہ اسے روپیہ پیسہ آسانی سے کافی تعداد میں مل جاتا ہے کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بادشاہ کی لڑکی ہے۔ بادشاہ زادی چپکے سے چھپے چوری قاضی سے نکاح پڑھواتی ہے اور اس درویش سے ہم بستری کرتی ہے مگر جب وہ اپنا قصہ بیان کرتی ہے تو سوداگر کے لڑکے سے رات رات بھر سالوں بغیر نکاح کے لطف کی راتیں کاٹتی ہے۔ یہ کیرکٹر کا مخالف پہلو عجیب ہے، ایسی باتوں سے شاہزادی کا کردار کم از کم ایک اچھی عورت کا کردار نہیں رہ جاتا۔ شہزادی نہ سہی کیرکٹر بھی

ایک عورت جسے اچھا کردار سمجھ کر پیش کیا جائے اس سے اس طرح کے کام لینا کچھ عجیب سا ضرور معلوم ہوتا ہے اور پھر یہ نظریہ تو اس وقت کا ہے کہ عورت صرف عورت ہے چاہے وہ بادشاہ زادی ہو یا فقیر کی لڑکی مگر از کم اس زمانہ میں نظریہ یہی تھا کہ ہر بادشاہ زادی باعصمت اور عفت مآب ہوا کرتی ہے۔ یہاں قصہ میں شاہزادی کو ہر وقت جنسیت کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا ساری زندگی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑتی پھرتی ہے۔ گھر سے تاجر بچے کے ساتھ رات میں بھاگ نکلتی ہے اور پس منظر بالکل خاموش وجامد نظر آتا ہے نہ کوئی پاسبان ہے نہ پرسان حال۔ بعینہٖ یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک سنسان قلعہ میں ایک آبرو باختہ آوارہ عورت بند ہے وہ جب چاہتی ہے اور جس سے سودا طے ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ چل کھڑی ہوتی ہے۔ مکمل شہوانیات کا مرقع ہے۔ حیرت تو اس پہ ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ایسی چیزیں کس طرح کردار سے وابستہ کی گئیں اور اگر ایسا کیا گیا تو دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یا تو ماحول پر جنسیت کا غلبہ تھا یا مصنف کو واقعات و کردار کا صحیح علم نہ تھا۔ لاعلمی تو ہم نہیں مان سکتے اس لئے کہ یہ چیزیں ان کے سامنے تھیں اگر آج ہم کوئی ایسی غلطی کریں تو کچھ وجہ جواز ڈھونڈھی بھی جا سکتی ہے۔ حالانکہ یہ غلطی کچھ اردو ہی کے افسانہ نگاروں نے نہیں کی۔ ہندوستان کی سرزمین کی سبھی داستانیں عام اس کے کہ وہ سنسکرت ہوں یا ہندی، اس سے خالی نہیں ہیں۔ اس کے کردار بھی جنسی دباؤ کے شکار رہیں جہاں شہوت پرستی اور محبت میں کوئی امتیازی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ مرچھ کٹکا اور بیتال پچیسی وغیرہ بد اخلاقی، اوباشی اور قابل نفرت جنسی فسادات سے بھری پڑی ہیں جنھیں اس طرح مزہ لے کر بیان کیا گیا ہے گویا یہی زندگی کے سب سے اہم مسائل ہیں۔ مہابھارت میں یدھشٹر کے دھرم راج میں حکومت ۸۴ ہزار یا بہ روایتے ۸۸ ہزار ودیارتھیوں میں سے ہر ایک کے لئے ۳۰ دوشیزائیں مقرر کرتی ہے

اگر ہم تاریخ کو رہبر مان لیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ مشرقی ادب تقریباً ہر دور میں دربار یا امیروں کی بارگاہ پر جبیں سائی کرتا رہا ہے، ان ادیبوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان صاحب دربار امراء کو خوش کر کے اپنی روٹی پیدا کرنے کے لئے ایسی ایسی باتیں بنائیں جن سے ان کرم فرماؤں کی طبیعت پھڑک اٹھے اور اسی ترنگ میں وہ انعام واکرام کی تقسیم میں اضافہ کریں چنانچہ ان کے یا ان سے متاثر ماحول کے لئے یہ چیزیں پیش کی جاتیں جسے ادبیت، حقیقت یا واقعیت سے بہت کم مطلب ہوا کرتا۔ انھیں داستان سازوں کے لئے ٹالسٹائی کہتا ہے:۔

> "چونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خودداری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا۔ کی ہوس میں یہ اندھے ہو جاتے ہیں اور مدح وثنا پر اپنا دین وایمان نثار کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن با ایں ہمہ آرٹ کو فایدہ کیا الٹا نقصان پہونچاتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بے زار ہو کر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں۔ امیروں کو ان کا آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ انسانی نیکی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہیں۔ امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں ذہنی برائی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے۔ آرٹسٹ فصاحت وبلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروشی ونفس پروری کو چھپاتا ہے اور طوائف روغن وغازہ سے اپنی بدصورتی پر پردہ ڈالتی ہے۔ غرض کہ ہمارے زمانہ اور ہمارے طبقہ کے آرٹ میں اور کسی کسبی میں ذرا فرق نہیں۔ یہ تشبیہ لفظاً بہ لفظ صحیح ہے۔ آرٹ اتنا ہی خود فروش۔ سیاہ باطن اور فریب کار ہے۔"

اس اقتباس کے بعد اس ضمن میں مجھے اب کچھ نہیں کہنا اور فیصلہ کو آپ پر چھوڑکر آگے بڑھتا ہوں۔ تاجر بچے کا کردار سوائے داستان گو کے اور کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ لاؤ بالی پن اور بے پروائی عموماً تمثیلی ہے۔ جوہر امیر بچہ یا بڑے باپ کے بیٹے کے لئے عموماً لائی جاتی ہے۔ ویسے اس کی سادہ لوحی کا بھی کافی خیال رکھا گیا ہے معاملات عشق میں سوداگری کا کوئی عنصر نہیں جھلکتا۔ رحم و مروت وخلق روایتی ہے جس میں کسی انفرادیت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ عشق کی دھن میں کچھ سوچ نہیں سکتا اور شاہزادی کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔ ساری زندگی میں سوائے عشق کے اسے کوئی اور مصیبت پیش نہیں آتی جو تکلیفیں جا بجا ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ بھی اسی ضمن میں

ضرب المثل بھائی بہن کی محبت دکھائی گئی ہے اور اچھی طرح دکھائی گئی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات خاطرداری میں [illegible] مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کہ حقیقت معدوم ہو جاتی ہے۔ جب بہن کھانا کھلاتی ہے تو جتنے کھانے ہو سکتے ہیں بہ یک وقت لاتی ہے اور برابر اسی قسم کا کھانا کھلاتی رہتی ہے۔ بھائی کو مصیبت میں دیکھ کر بہن کا اظہار افسوس بہت نیچرل طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا بھائی کو صلاح دینا کہ وہ اب کسی سفر پر جائے اور اپنی حیرانی و پریشانی دور کرے۔ یہ ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ وہ بددل ہو کر اسے بھگانا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ جس عنوان سے وہ بھائی کو رخصت کرتی ہے وہ اس کی محبت کی بہترین مثال ہے

"جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سری بھاری اور ایک گھوڑا چڑاؤ ساز سے تواضع کیا۔ اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنی سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکاربند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا آنسو پی کر بولی سدھارو تمھیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھاتے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منھ دکھائیو۔"

دوسرے اور تیسرے درویش کی سیر میں کوئی کردار ہمیں ایسا نہیں ملتا جو جاذب نظر ہو۔ چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جو دھوپ چھاؤں کی طرح ہمارے سامنے سے گزرتے چلے جاتے ہیں اور قصے میں اتنی تیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والا اس دھن میں کہ پھر کیا ہوا، بجائے اثر کے ان کے سہارے ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی حرکات و سکنات اور احوال کا تضاد ہم کو ضرور چونکا دیتا ہے مگر ہم صرف مسکرا کر پھر افسانویت میں ہمہ تن ڈوب جاتے ہیں

آزاد بخت بادشاہ کی سرگزشت ہم کو پھر ایک عجیب و غریب کردار سے روشناس کراتی ہے یہ خواجہ سگ پرست ہے جس طرح پہلے درویش کی سیر میں بہن کا کردار پیش کیا گیا ہے اسی نمونہ کا یہ بھائی کا کردار ہے مگر دونوں میں زبردست فرق ہے۔ بہن کا کردار محض رسمی اور روایتی ہے۔ کوئی انفرادیت اس میں آپ کو نہ ملے گی مگر خواجہ سگ پرست کے کردار میں انفرادیت ہے اس کی زندگی کی ہر منزل دوسری ہے اور ایک نیا مرحلہ پیش کرتی ہے جسے طے کرنے کے لئے ہمارے سامنے ایک نیا سانحہ لایا جاتا ہے اور ہم ہر مرتبہ از سر نو ایک نئے سفر کے لئے طیار ہو جاتے ہیں۔ بھائی ہر مرتبہ بدسلوکی اور بدعہدی کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کی جان و مال ناموس تک کے درپے ہوتے ہیں

.... مگر خواجہ ہر مرتبہ درگزر کرتا ہے آخر کار عاجز آکر انھیں پنجرے میں قید کرتا ہے اور جو سلوک ان کے ساتھ کرتا ہے وہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں خواجہ سگ پرست کا اپنے بھائیوں کا قید کرنا بھی کردار نگاری کا زبردست نکتہ ہے اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کو خواجہ کے کردار میں ایک سپاٹ کمی کا احساس ہوتا اور مصنف کو ہم محض ہیئت پرست سمجھتے۔ ایک دشمن کے ہاتھ سے ہمیشہ اس طرح پریشان رہنا اور اسے اپنے قبضہ میں پاکر ہمیشہ اسے نہ صرف چھوڑ دینا بلکہ اس کی جان و مال سے مدد کرتے رہنا انسانی کردار سے بالاتر چیز ہے جسے صرف کوئی فوق فطرت ہستی ہی انجام دے سکتی ہے

اس موقع پر ہمیں کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔ اس کی جاں فروشی اور وفاداری کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے اور آخر میں اس کا انجام "کر بھلا ہو بھلا" کے مصداق کی تصدیق کرتا ہے

چہار درویش میں موقع موقع سے مافوق الفطرت ہستیوں سے بھی مدد لی گئی ہے جو زیادہ تر قصہ کے انسانی کرداروں کو سنبھالا دیتی ہیں۔ "نقاب پوش" ہر درویش کو خودکشی سے بچاتا ہے۔ دستِ غیب زمین سے خزانہ برآمد کرتا ہے۔ بڑا بُت اور برہمنوں کی ماتا پر فوق فطرت ہونے کا عقیدہ خواجہ سگ پرست کی دستگیری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چوتھے درویش کی سیر میں فوق فطری عنصر زیادہ تیز ہو گیا ہے اور قریب قریب پورے قصہ پر حاوی ہے۔ ابتدا۔ منتہیٰ۔ اختتام ہر جگہ یہ عنصر بہت سرگرمی سے نظر آتا ہے کشمکش (CONFLICT) میں بھی اس کا زبردست حصہ ہے۔ تہ خانے میں ایک طلسمی بندر کی کمی تصادم پیدا کرتی ہے اور قصہ کے بڑھنے اور پھیلنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ پھر ملک صادق جنوں کا بادشاہ آتا ہے۔ اس کا عشق اور عورت کی تلاش، تصادم اور ٹھہراؤ (SUSPENSE) کی ملی جلی کیفیتیں ہیں۔ ملک صادق کا کردار کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا کہ قصوں میں عموماً ان ہستیوں کا کردار پیش کیا جاتا ہے۔ معشوق کی تلاش آدم زاد کے ہاتھوں اس کے کردار کو عوامی نظریہ[1] سے کچھ الگ ضرور کر دیتی ہے اور پھر شاہزادے کی عہد شکنی پر ملک صادق کا عتاب رسمی اور روایتی ہے۔ آخر میں شہپال شاہ شہنشاہ قاف کا کردار بعینہٖ داستان امیر حمزہ کے شہپال شاہ سے ملتا ہے۔ جھولا اُٹھوا منگانے کی رسم بھی غالباً وہیں سے عبارت ہے

قصہ کے داستان گو کا کردار سرگرمی سے بہت کم اُبھرتا ہے۔ زیادہ تر وہ ایک سینمائی مشین میں ہے جو فلم رول سیٹ کر دیتا ہے۔ تصویریں آپ کے سامنے نکلتی چلی جاتی ہیں اور محویت کے عالم میں آپ داستان گو کی شخصیت و کردار پر دھیان بھی نہیں دیتے

سید محمد عقیل

---

[1] عموماً عوامی نظریہ یہ ہے کہ فوق فطری ہستیاں اپنے معشوق کو انسان کی نظروں میں ہلاک کر کے اُٹھالے جاتی ہیں

سنہ ۲۰۰۰ء کی جنگ

اگر اب سے ۵۰ سال بعد لڑائی چھڑی (گو خیال تو یہی ہے کہ زمانہ اتنی مہلت نہ دے گا) تو وہ کس نوعیت کی ہوگی اس پر ماہرین فن ابھی سے غور کر رہے ہیں یہ خیال کہ آیندہ ۵۰ سال کے بعد جنگ کی نوعیت بالکل مختلف ہوگی، ایٹم بم کی ایجاد سے پیدا ہوا ہے۔ یوں تو اس سے قبل بھی جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے، مثلاً جنگ بوئر (افریقہ) میں سوار دستوں سے کام لیا گیا، سنہ ۱۴ء کی جنگ میں دورمار توپیں زیادہ کارآمد ثابت ہوئیں اور سنہ ۳۹ء کی لڑائی ٹینکوں کی لڑائی تھی، لیکن اب آٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی ایجاد کے بعد لڑائی کے تمام پچھلے طریقوں کو بالکل بدل جانا ہے اور اس کی طیاریاں ابھی سے ہو رہی ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ آیندہ جنگ صرف ایٹم بم کی جنگ ہوگی اور تمام دوسرے ذرایع اپنی اہمیت کھو بیٹھیں گے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ ذرۂ ایٹم کے انفجار کے پیشِ نظر صرف یہی نہیں ہوا کہ ایک نہایت مہلک قسم کا بم طیار ہو گیا، بلکہ تمام دوسرے آلات و ذرایع جنگ پر بھی اس کا بڑا اثر ہوگا اور خشکی، تری اور فضا کی افواج و آلات جنگ سب میں تبدیلیاں ہو کر بالکل نیا فنِ حرب وجود میں آئے گا

اس سے قبل دنیا پر کئی دور گزر چکے ہیں، سب سے پہلا حجری دور وہ تھا جب انسان صرف پتھر کے اوزاروں سے کام لیتا تھا اس کے بعد وہ دھات کی چیزیں طیار کرنے لگا تو فلزاتی دور شروع ہوا۔ لیکن حال کا دور آٹمی دور ہے اور اس میں جو ایجادات واختراعات ہوں گی وہ نہ صرف طریق جنگ بلکہ دنیا کی تمام تمدنی و معاشرتی ڈھانچہ کو یکسر بدل دیں گی

انفجارِ آٹم میں کامیاب ہونے کے بعد ماہرین سائنس غور کر رہے ہیں کہ اس زبردست قوت سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں وہ حکما جن کے سامنے صرف انسانی معاشرہ ہے وہ تمدن و معاشرت کو بدل دینے کی فکر میں ہیں، وہ علما جن کا تعلق صنعت و حرفت سے ہے وہ صنایع ملکی پر اس قوت سے کام لینے کی فکر میں ہیں، لیکن اربابِ جنگ و حرب یہ سوچ رہے ہیں کہ آٹمی دور میں کون کون سے محیر العقول اور حد درجہ مہلک آلات حرب طیار ہو سکتے ہیں۔ اور صرف سوچ ہی نہیں رہے ہیں، بلکہ انکی طیاریوں میں مصروف ہیں

اس وقت آٹم کا راز صرف چند ملکوں کو معلوم ہے اور بدقسمتی یا خوش قسمتی سے یہ راز ایک ہی بلاک کے اندر محدود نہیں ہے بلکہ دونوں مخالف بلاک اس سے واقف ہیں اور روس و امریکہ کا ایک دوسرے سے خایف رہنے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ لڑائی میں آٹم بم کا استعمال دونوں طرف سے ایک ساتھ ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ جنگ کی ابتدا غالباً آٹم بم سے نہ ہوگی اور اس کا استعمال اگر ہوا بھی تو صرف اس وقت ہوگا جب دونوں فریق میں سے کوئی ایک جان سے ہاتھ دھولے پچھلی جنگ میں بھی زہریلی گیسوں کے استعمال کا بڑا اندیشہ تھا کیونکہ دونوں فریق کے پاس یہ گیس موجود تھی، لیکن اس سے کام نہیں لیا گیا۔ حالانکہ گیس کے اثرات سے بچنے کے لئے نقاب وغیرہ بھی طیار کر لئے گئے تھے۔ اس تجربہ کے پیشِ نظر خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ جنگ میں آٹم بم کے استعمال میں اور زیادہ احتیاط سے کام

لیا جائے گا، کیونکہ اول تو اس کے مہلک اثرات کا دفعیہ آسان نہیں اور اگر ہو بھی تو اس کی طیاری کے لئے بڑے صرف اور کافی وقت کی ضرورت ہے، تاہم انفجار آٹم کا راز معلوم ہو جانے کے بعد دیگر آلات حرب میں البتہ غیر معمولی ترقی ہو جائے گی اور موجودہ فنون جنگ کی ہیئت بالکل بدل جائے گی۔ اس وقت حملہ کے اصول یہ ہیں کہ دشمن کی فوج اور اس کے مرکزوں پر ہوائی جہازوں سے بم گرائے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ٹینک بڑھتے ہیں جن کے پیچھے پیدل فوج ہوتی ہے اور اس کے عقب میں توپ خانہ ہوتا ہے۔ لیکن آیندہ یہ ترتیب اور ان چیزوں کی ہیئت بہت بدلی ہوئی ہوگی۔ ہوائی جہاز بجائے پٹرول کے آٹمی قوت سے چلیں گے بہت تیز رفتار ہوں گے اور ان کی حیثیت فضا میں وہی ہوگی جو پانی میں جنگی جہازوں کی اس وقت ہے، ان میں بڑی بڑی توپیں نصب ہوں گی جو آٹمی گولے برسائیں گی، اور اُترنے کے لئے انھیں بہت تھوڑی سی جگہ درکار ہوگی، ان کی ساخت ایسی ہوگی کہ زمین پر اُترنے کے بعد وہ ٹرکیٹر کا کام بھی دے سکیں اور ناہموار زمین پر وہ چل سکیں یہ سہ منزلہ ہوں گے اور سپاہیوں کی ایک بٹالین ان کے اندر آسکے گی۔ ان میں ٹیلی ویزن بھی نصب ہوگا جس کے ذریعہ سے وہ دیکھ سکیں گے کہ ان کی بمباری کا کیا اثر ہوا، یہ بمباری صرف آٹم بموں کی نہ ہوگی بلکہ مہلک بیماریوں کے جراثیم کی بھی ہوگی۔ وہ جس حصۂ زمین کے اوپر سے پرواز کریں گے اس کا فوٹو بھی لے سکیں گے خواہ موسم کیسا ہی خراب ہو۔

سنہ ۲۰۰۰ء کا توپ خانہ بھی مختلف ہوگا، توپیں، ٹرکیٹروں پر قایم ہوں گی اور انجن کے ذریعہ سے منتقل کی جایئں گی، یہ ٹرکیٹر اتنے وسیع ہوں گے کہ ان میں توپ خانہ کا پورا اسٹاف بیٹھ سکے گا اور ان کی ساخت ایسی ہوگی کہ اگر دریا سامنے آئے تو وہ اس کو بھی بہ آسانی عبور کر سکیں، ان کی توپیں آٹمی گولے برسائیں گی اور ان کی ساخت موجودہ توپوں کی ساخت سے مختلف ہوگی کیونکہ آیندہ یہ پیادہ فوج کے ساتھ ساتھ چلیں گی اور ان گولے برسانے کے لئے زیادہ فاصلہ کی ضرورت نہ ہوگی

ٹینکوں کی ساخت بھی بہت بدل جائے گی اور آیندہ یہ بہت بڑے بڑے طیار کئے جائینگے اور ان پر [illegible] Radio-active ان پر اثر انداز نہ ہو سکے گی، یہ زمین کے ہر حصہ میں گزر سکیں گے خواہ وہ کیسا ہی ناہموار و دشوار گزار کیوں نہ ہو۔ یہ اپنی توپوں سے آٹم کے گولے برسائیں۔ آلات تصویر کشی، ریڈیو، ٹیلی ویزن، لاسلکی ٹیلی فون اور تمام جدید ترین ذرایع مدافعت و خبر رسانی سے آراستہ ہوں گے

آیندہ فنی حیثیت سے جو تبدیلی ہونے والی ہے، اس کی نوعیت کچھ اس طرح ہوگی کہ پہلے فضائی فوج اس مقام پر بمباری کرے گی جس پر قبضہ کرنا ہے، اسی کے ساتھ توپ خانے گولے برسائیں گے، ٹینک آگے بڑھیں گے اور اسی کے ساتھ پیادہ فوج قبضہ کرتی چلی جائے گی

جس لڑائی میں آٹم بم استعمال کیا جائے گا اس کی ترتیب کچھ اور ہوگی، سب سے آگے دشمن سے قریب تر پیادہ فوج ہوگی اس کا سبب یہ ہے کہ آٹم بم کا اثر چار مربع میل کے اندر ہی اندر رہتا ہے اور ہر فریق آٹم بم کا استعمال چار میل کے حدود سے باہر ہی کرے گا تاکہ خود اس کی فوج اس سے متاثر نہ ہو، اس لئے جو فوجیں دشمن سے قریب تر ہیں وہ بھی محفوظ رہیں گی اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہوگا کہ پیادہ فوج جلد سے جلد آگے بڑھ سکے اور یہ کام ہوائی جہازوں اور آہن پوش موٹروں سے لیا جائے گا، گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ آیندہ پیادہ فوج کو خود زیادہ مارچ نہ کرنا پڑے گا بلکہ وہ میکانکی ذریعہ سے میدان حرب میں منتقل کی جائیں گی

یہ صحیح ہے کہ آٹمی جنگ میں وہی فریق زیادہ کامیاب ہوگا جو سب سے پہلے حملہ کرے گا، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ مدافعت کے سوال کو نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سب سے پہلے کس کی طرف سے حملہ ہوگا، چنانچہ آٹمی حملہ کے نتائج کے پیش نظر تحفظ و مدافعت کی تدابیر بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے تمام اہم مقامات کو قلعہ بند کیا جائے گا اور یہ قلعہ بندیاں

زمین کے اوپر بھی ہوں گی اور زیر زمین بھی۔ زمین کے اوپر بہت سے چھوٹے چھوٹے قلعے جن کے چاروں طرف سرنگیں وغیرہ بھی ہونگی ایسے بنائے جائیں گے کہ ریڈیائی شعاعوں کی گرمی کو قبول نہ کریں گے اور جدید ترین آلات سے آراستہ ہوں گے، زمین کے اندر کی پناہ گاہیں یوں سمجھنا چاہئے کہ زمین دوز شہر ہوں گے جہاں سڑکیں، ہوٹل، تماشہ گاہیں، بجلی کی روشنی، دوکانیں وغیرہ سبھی کچھ ہوگا

پیادہ فوج کو بہت سبک سامان سے آراستہ کیا جائے گا تاکہ ان کا بوجھ بہت کم ہوجائے اس کی وردی بہت ہلکی ہوگی اور اسی چیز سے طیار کی جائے گی جو گیس، ریڈیائی شعاعوں اور موسم کی اور موسم کی صعوبتوں سے محفوظ رکھ سکے، ہر ایک کا راشن کم از کم ایک ہفتہ کے لئے وٹامین کی چھوٹی چھوٹی ٹکیوں کی صورت میں تقسیم کیا جائے گا اور کچھ ٹکیاں پیاس بجھانے کے لئے بھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ جو کچھ فراہم کیا جائے گا اس کا انتظام ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہوگا

ہر سپاہی گردن سے لیکر پاؤں تک ایک ایسے لبادہ میں لپٹا ہوا ہوگا جس پر ریڈیائی شعاعوں کا اثر نہ ہوسکے، سر پہ ایک خود ہوگا جس میں ایسی عینک لگی ہوگی جو دوربین کا کام بھی دے سکے، اس کے پاس ایک ریڈیو سٹ بھی رہے گا اور لاسلکی ٹیلی فون بھی تاکہ ہر وقت وہ خبر دے سکے اور ہدایت سُن سکے۔ اس کی بندوق ازخود چلنے والی ہوگی اور اس کو چلانے کے لئے خود اس کو کچھ نہ کرنا پڑے گا، اس کے پاس ایک ایسا آلہ بھی ہوگا جو لبادہ کے اندر کی ہوا کو ٹھنڈا رکھ سکے

تعلیم کے لحاظ سے بھی مستقبل کا سپاہی بہت ترقی یافتہ ہوگا، خصوصیت کے ساتھ اس کو نفسیات کا ماہر بنایا جائیگا اور ضرورت کے وقت وہ ٹریکٹر، ٹینک، ہوائی جہاز وغیرہ سب چلا سکے گا

پوشکن، روس کا مشہور حبشی نژاد شاعر تھا۔ ایک دن جب وہ کلیسا اپنی شادی کرنے جا رہا تھا تو راستہ میں اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ یہ میری ایک سو تیرھویں بیوی ہے اور اس سے قبل ایک سو بارہ عورتوں سے محبت کرچکا ہوں

شادی کے بعد وہ اس بیوی سے بھی نباہ نہ کرسکا اور آخرکار اس کا ایک رقیب پیدا ہوگیا جس سے اس کی بیوی محبت کرنے لگی تھی۔ پشکن کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے رقیب کو ڈوئیل کا چیلنج دیدیا اور اس لڑائی میں پشکن مارا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۷ سال کی تھی

اگر ۲۰ سال میں اس نے پہلی شادی کی تھی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ سترہ سال میں اس نے ایک سو تیرہ یعنی ہر سال تقریباً آٹھ عورتوں سے شادی کی

۱۸۲۶ء میں لارڈ بالڈوین اور اس کی بیوی میں ایک عبارت کے متعلق جسے وہ اپنی قبر کے پتھر پر کندہ کرانا چاہتا تھا اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ نوبت عدالت تک جانے کی پہونچ گئی اور بیوی نے قسم کھائی کہ جب میرا شوہر مرے گا تو میں اس کی قبر پر رقص کروں گی

کچھ دن کے بعد اتفاق سے لارڈ بالڈوین مرگیا اور بیوی بہت خوش ہوئی کہ اب مجھے اپنی قسم پوری کرنے کا موقع ملے گا اور اس کی قبر پر رقص کرکے اپنے جذبۂ انتقام کو پورا کرے گی، لیکن افسوس ہے کہ اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ کیونکہ جب بالڈوین کا وصیت نامہ پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ "میری لاش دریا میں ڈال دی جائے"

سردار جعفری کے سماجی شعور کا تجزیہ

کسی فرد یا کسی شاعر کے شعور کے مطالعہ میں بدلتے ہوئے مادی حالات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسکا شعور مخصوص مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور ردِعمل سے تشکیل پاتا ہے، یوں تو انسان کے شعور پر نہ جانے کتنی چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور ہر منزل اس کے شعور کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیتی ہے اور اس پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے لیکن اصل چیز معاشی زندگی کے حالات ہیں جو سماجی اور معاشرتی احساس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب حالات بدل جاتے ہیں تو شعور خود بخود بدل جاتا ہے اس لئے کہ شعور کسی کے پاس پہلے سے بنا بنایا موجود نہیں ہوتا ہے، گویا اب یہ ظاہر ہو گیا کہ معاشی تبدیلیوں سے سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں ہر طبقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر نہیں ہوتی ہیں، جو لوگ تاریخی جدلیت کے اصول اور معاشی تغیر کو اچھی طرح سمجھے بغیر تبدیلیوں کو قبول کر لیتے ہیں ان کے اندر ایک واضح تضاد ملتا ہے اور ان کے خیالات اور وقت کے تقاضوں میں مکمل ہم آہنگی نہیں ہوتی ہے، جذبہ اور شعور میں کوئی دیوار نہیں حائل ہے۔ بغیر شعور اور تخیل کے کسی جذبے میں گہرائی نہیں پیدا ہو سکتی، شعور جتنا رچا ہوا اور شدید ہوگا جذبہ بھی اتنا ہی شدید ہوگا لیکن کبھی کبھی جذبہ غلط بھی ہو سکتا ہے، جذبہ کی یہ خامی شعور کی خامی کو ظاہر کرتی ہے، شعور۔ احساس، تخیل اور جذبات کائنات کی ہر چیز کی طرح بدلتے رہتے ہیں، تغیر کا یہ عمل برابر جاری ہے۔ ادب اور آرٹ کبھی بھی انسان کی اس جدوجہد سے علٰحدہ نہیں ہو سکتا، طبقاتی کشمکش بھی اسی جدوجہد کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ اس کو متاثر بھی کرتی ہے اور اس عمل میں اس سے متاثر بھی ہوتی رہتی ہے، یعنی یہ کہ انسانی شعور مادی زندگی کی پیداوار ہے، لیکن جو چیز اس کو جلا دیتی ہے، وہ مادی زندگی کا عکس ہے، یعنی انسان کا علم جو مادی بنیاد پر اثر انداز بھی ہوتا ہے

ادب کا تعلق دنیا کے محسوس واقعات سے ہے۔ وہ ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا رہتا ہے جس طرح زندگی کے دوسرے حرکات اور سکنات، ادیب یا شاعر عام انسانوں کی طرح ایک خاص نظام حیات اور ایک مخصوص ہیئت اجتماعی کا پروردہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ ادبیات کے کوئی معنی نہ ہوتے۔ ادب دَور بدَور بدلتے اور بڑھتے ہوئے انسانی خیالات اور جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ادب زندگی سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں، وہ زندگی کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ وہ زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ ادب کی شخصیت اور شعور پر ماحول کی اسی اثر اندازی کی وجہ سے مارکس 'وجود' کو 'سوچنے' اور عمل کو 'نظریہ' پر فوقیت دیتا ہے

زندگی کی طرح ادب کی بھی ایک جدلیاتی ( ) حرکت ہوتی ہے۔ جو باہم متضاد پہلوؤں سے ترکیب پاتی ہے اور ایک پہلو تو خارجی، عملی یا افادی ہوتا ہے، دوسرا داخلی، تخیلی اور جمالیاتی، دوسرا پہلو فن کار کی انفرادیت کا ممنون ہوتا ہے، لیکن یہ انفرادیت اور داخلیت اجتماعی جذبات اور اجتماعی زندگی سے الگ نہیں ہوتی ہے، بلکہ شعور کی تیزی، عمل اور تخلیق کی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی مفاد کو آگے بڑھاتی ہے اور ایسی انفرادیت اجتماعیت میں گم ہو کر بھی زندہ رہتی ہے۔ سردار جعفری انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "آج یہ مجاہد اور شہید ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں کی

تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں اور ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں دُنیا کے ہر گوشے سے اُٹھ رہے ہیں۔ آج سارا کرۂ ارض ان کی گرفت میں ہے، چین کے لاکھوں سرخ سپاہی اور کروڑوں کسان، روس کے کروڑوں باشندے۔ ہندوستان، ایشیا، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، امریکہ کے کروڑوں مزدور، یہ سب نئے مجاہد ہیں، نئے ہیرو ہیں اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام اور محنت کش طبقہ سے آتے ہیں، اور ان کی شجاعت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے، آج یہ اس طرح پیدا ہو رہے ہیں جیسے موسم بہار میں پھولوں کی فراوانی ہوتی ہے، یہ بیسویں صدی کے انسان کے فاتحانہ جذبات کے صحیح ترجمان ہیں اور انھیں جذبات کی تصویر کشی آج سچی شاعری ہے...... کوئی شاعر اس وقت تک ان کی تصویر کشی نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ جذبات خود اسکے اپنے سینے میں موجزن نہ ہوں اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ اجتماعی جذبہ شاعر کا انفرادی جذبہ بن جائے اور اس کے لئے آج کے ترقی پسند شاعر کا خود بھی مجاہد ہونا ضروری ہے"

مختصر یہ کہ کسی شاعر کے شعور کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں اس کے ماحول اور مادی حالات کا بھی جایزہ لینا ہوگا، مادی حالات اور معاشی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھے بغیر شاعری کو صحیح طور پر تاریخی حقایق کی روشنی میں نہیں سمجھا جا سکتا، آیئے اسی روشنی میں سردار جعفری کی شاعری پر نگاہ ڈالی جائے:

سردار جعفری کے سماجی شعور کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس دور کے بدلتے ہوئے مادی حالات اور طبقاتی ڈھانچے کو سمجھنا ہوگا اس کی شاعری کے پیچھے جو فلسفیانہ اور نظری اور عملی پس منظر ہے جو خارجی حقایق ہیں۔ ان سے واقفیت حاصل کرنی پڑے گی، اور زندگی اور سماج کی حرکت کو سمجھنا پڑے گا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تدریجی انقلاب کے دور میں شعور کی تشکیل میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بہت دنوں تک تبدیلی کے عناصر واضح نہیں ہوتے ہیں۔ اور آگے کی راہ روشن نہیں ہوتی ہے اس کے علاوہ جو زمانہ اور ملک سیاسی اور معاشی حیثیت سے زیادہ کشمکش اور پیچیدگی کا شکار رہتا ہے اتنا ہی اُسکے تجزیے میں دشواری ہوتی ہے

جنگ عظیم کے بعد اور خاص طور سے ۱۹۳۰ء کے بعد ہندوستان نے ایک نئی کروٹ لی، آزادی کی جنگ تیز سے تیز تر ہوگئی سیاسی شعور نے سماجی شعور کو متاثر کیا اور ہمارے شعر و ادب میں ایک نئی چھوٹ اور ایک نیا انداز اور جذبہ پیدا ہوگیا، شاعر اب کھلم کھلا میدان جنگ میں آگئے اور غلامی کی طوق کو سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ملکر اتارنے کی کوشش کرنے لگے، قومی آزادی کی اس جنگ میں طبقاتی شعور بھی تیز تر ہوتا گیا، ہڑتالوں پر ہڑتالیں ہونے لگیں، اور مزدوروں اور محنت کشوں نے پہلی دفعہ ایک نئے اجتماعی شعور کی طرف قدم بڑھائے اس وقت اردو کے نوجوان شعراء اور ادبا بھی انقلاب روس سے متاثر ہونے لگے تھے، تا آنکہ ۱۹۳۵ء میں ملک راج آنند اور سجاد ظہیر کی کوششوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا، ترقی پسندی کی اس تحریک نے شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا، اب انسانیت کے بین الاقوامی تعلقات مستقل مطالعہ بن گئے، سماج کو نئے زاویوں سے دیکھا جانے لگا، تمام برائیوں اور خرابیوں کا ذمہ دار سماجی اور معاشی نظام کو ٹھہرایا گیا جو دولت کی غلط تقسیم سے عمل میں آیا تھا

سردار جعفری کی شاعری کی عمر تقریباً وہی ہے جو ترقی پسند تحریک کی ہے، شروع شروع میں اس تحریک میں شعور کی پختگی اور گہرائی کے بجائے جوش اور جذبے کی فراوانی تھی، اور ایک طرح کی رومانیت بھی، لیکن یہ رومانیت مریضانہ نہیں تھی، اسکو ایک طرح سے انقلابی رومانیت کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اس وقت ترقی پسند شعراء کی نظر زندگی اور ادب کے سماجی تعلق پر تھی، اسوقت اشتراکی جذبات کے ساتھ ساتھ قومیت اور آزادی حاصل کرنے کے جذبات بھی تھے، خواہش اور عمل کی ناقابل تفریق حدود کے اندر ایسے ہی شعور کی تخلیق ہو سکتی تھی، سماجی شعور اس وقت ایسے ہی منزل پر تھا، سردار کی ابتدائی نظمیں مثلاً بغاوت، جوانی، انتظار، نذر لکھنؤ کی ایک شام، محبت کا خون اور حسن ناتمام وغیرہ میں یہ انقلابی رومانیت کارفرما نظر آتی ہے، ان نظموں کا جو میلان ہے وہ خالص حسن و عشق کا میلان نہیں ہے۔ ان کے اندر وہ مغلوبیت اور سپردگی نہیں ملتی بلکہ اس کے برخلاف ایک حوصلہ انگیز انبساط اور

عمل اور انقلاب کی طرف ذوق انگیز اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً

برق کی طرح چمک شعلے کی مانند لپک — عمر بھر یوں تو نہ جل شمع شبستاں ہو کر
موج کی طرح سے وابستہ ساحل ہی نہ رہ — حسن کے بحر سے اٹھ عشق کا طوفاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزار میں — پھیل جا نکہتِ گل رنگِ بہاراں ہو کر

اور "انتظار نہ کر" میں سردار اپنے محبوب کو بھولتا نہیں لیکن اس سے اتنا ضرور کہتا ہے کہ تم اس وقت میرا انتظار نہ کرو، یہ عجب گھڑی ہے۔ میں سرودِ عشق کی دنیا نہیں بسا سکتا، دیکھئے وہ کس پندار اور عزم کے ساتھ محبوب سے کہتا ہے:

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرودِ عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا

میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر —

اُردو شاعری کے اندر حسن و عشق کا اتنا سائنٹفک تصور انھیں نئے شاعروں کی وجہ سے وجود میں آیا، اس سے پہلے حسن و عشق کا تصور مریضانہ تھا، وہ ہم سے زندگی تاب اور توانائی چھین لیتا تھا، لیکن ان شاعروں نے اسے ارضیت ( ) اور انسانی محبت سے ہمکنار کیا اور یہ تصور انفرادیت اور داخلیت کے محدود حلقے سے نکل کر کائنات پر محیط ہو گیا اور اُردو شاعری عشق کے ایک ایسے تصور سے آشنا ہوئی جو بدلے ہوئے ماحول اور سماجی شعور سے پوری طرح ہم آہنگ تھی، نئے دور کے شاعروں کو حالات کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ بزم ہائے رامش و رنگ سے اُٹھا کر تپتے ہوئے ریگستانوں میں پھینک دئے گئے تھے، اسی وجہ سے ان کا تصورِ عشق محض خیالی اور روایتی نہیں ہے، بلکہ اس میں غمِ جاناں وسیع ہو کر غمِ دوراں سے مل گیا ہے، مجاز نے اپنی محبوبہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے سرخ آنچل سے ایک پرچم بنالے تو او ر اچھا ہو۔ احمد ندیم قاسمی نے شاہراہِ حیات کو خون سے آلودہ دیکھ کر سرے سے حکایت عشق و جمال ہی سننے سے انکار کر دیا، اور ساحر تو محبت ہی نہیں کرنا چاہتا، اور اگر کرتا بھی ہے تو "ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی ہوئی مخلوق" اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہاں تک کہ آخر میں اپنی ناکام محبت کی کہانی بھی سننا نہیں چاہتا، غرض سماجی حالات کی ناسازگاریاں اور فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ان کی محبت کی راہ میں پہاڑ کھڑا کر دیتا ہے، اور زندگی کی تلخیاں قدم قدم پر ان کے راستے میں حایل ہوتی ہیں وہ عشق کے معاملے میں محض جذباتیت ہی کے دھارے پر نہیں بہتے بلکہ عقل و شعور کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں

سردار کی ابتدائی نظموں میں "مزدور لڑکیاں" اور "سرمایہ دار لڑکیاں" بہت اچھی نظمیں ہیں، ان نظموں میں حسن و عشق کا طبقاتی تجزیہ ہے، جب وہ سرمایہ دار لڑکیوں کے لئے کہتے ہیں:۔

عشق کے ذوقِ نظارا نے نکھارا ہے انھیں — مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں
ڈوب تو سکتی ہیں لیکن یہ اُبھر سکتی نہیں — یہ کنار و بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

اور مزدور لڑکیوں کے لئے یہ لکھنا:۔

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں — سختیٔ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب — سازِ ان کا سوزِ حسرت خامشی ان کا رباب

اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب — ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشم انقلاب
ٹھوکروں پر انکے جھک سکتے ہیں ایوان قصور — توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور
بن کے قوت ایک دن اُبھرے گی برسوں کی تھکن — دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن

ان کے بڑھتے ہوئے شعور کو ظاہر کرتا ہے، سرمایہ داری نظام میں محبت اور جنس کے ارتقاء اور سماج میں محنت کی جگہ کو جانے بغیر اس طرح نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ سردار جعفری " رومان سے انقلاب " تک منزل طے کرنے میں کہیں بھی روح عصر سے الگ نہیں ہوئے، ان کا شعور مریضانہ رومانیت اور مقصدیت کے دلدل میں کبھی بھی نہیں پھنسا بلکہ مارکسزم کی روشنی میں انھوں نے طبقاتی جدوجہد میں عوام کے ساتھ ہو کر اپنے شعور کو اور زیادہ گہرائی اور انقلابی قدروں سے وابستہ کر لیا

انقلاب روس کے بعد پوری دُنیا میں آزادی کی جدوجہد نے واضح شکل اختیار کر لی، طبقاتی کشمکش تیز تر ہوگئی، اس کشاکش اور جدوجہد کی تصویر وہی شاعر پیش کر سکتا تھا جس کا شعور واضح ہو اور جس کی شاعری آزادی اور اشتراکیت کی جدوجہد کو آگے بڑھاتی ہے، سردار کا شعور بہت تیز گام رہا ہے، وہ اپنی منزل اور اپنے فرائض بہت جلد جان گئے اور اپنی شاعری کو ایک تخلیقی عمل کی کسوٹی پر رکھا، اس طرح انھوں نے عوام کے ساتھ ہو کر طبقاتی کشمکش میں حصہ لیا اور مزدور طبقے کی جدوجہد کو اپنایا، وہ جتنا ہی عوام سے قریب ہوتے گئے، ان کی شاعری میں اتنی ہی عظمت اور بلندی، یقین اور توانائی آتی گئی، ان کے لئے "عوام سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے خواب سب سے سہانے خواب ہیں ان کا نصب العین سب سے بلند نصب العین ہے، وہ سماج اور تاریخ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں، زندگی انھیں سے حرارت حاصل کرتی ہے اور انھیں سے رنگ۔ شعر و ادب انھیں سے حسن اور قوت حاصل کر سکیں گے، اس درخت کی پتیاں توڑی جا سکتی ہیں۔ شاخیں کاٹی جا سکتی ہیں لیکن اس کی جڑیں بہت گہری ہیں، انھیں اس وقت تک نہیں اُکھاڑا جا سکتا جب تک کرۂ ارض کو پاش پاش نہ کر دیا جائے اس لئے کٹی ہوئی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں گی، نئی پتیاں نکلتی رہیں گی، نئے پھول کھلتے رہیں گے" (دیباچہ جمہور)

اسی وجہ سے اس کی انقلابی نظموں میں سوز و گداز کے بجائے جاہ و جلال ہے۔ ایک نیا عزم اور یقین اور جذبہ ہے، وہ باعمل اور محرک انسانیت کی انقلابی جدوجہد کو پیش کرتا ہے۔ وہ آہوں اور اشکوں اور سسکیوں کا طوفان نہیں پیش کرتا بلکہ صداقت کے ساتھ عوام کے انقلابی جذبات اور اپنے دور کی انسانیت کو پیش کرتا ہے، وہ دُنیا کے ہر حصہ میں عوام کی جنگ آزادی میں شریک ہے، اور ان کی فتح پر خوش ہوتا ہے اور اسے اپنی فتح سمجھتا ہے

طبقاتی شعور جعفری کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے، وہ صحیح معنوں میں انقلاب اور عوام کا شاعر ہے، اسکے یہاں شاعر کا انفرادی جذبہ اجتماعیت میں مکمل ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے یہاں وہ سچا خلوص نظر آتا ہے جو سچی شاعری کو جنم دیتا ہے، خلوص کے ساتھ، حسن، گرمی، جوش، آہنگ، موجودہ نظام کی صحیح تصویر اور اشتراکیت کے عالمگیر اثرات بھی ہیں۔ انھیں سے اس کی شاعری کا خمیر اُٹھا ہے، اس کے نزدیک سب سے بڑا حسن انسان اور اس کی جدوجہد میں ہے اس لئے کہ یہ سب سے بڑا حسن ہی نہیں ہے بلکہ حسن کے باقی تمام مظاہر کا خالق بھی ہے، جعفری کی یہی انسانیت ہے جو اسے اتنی عظمت بخشتی ہے۔ اس کے نزدیک سماجی زندگی اور اس کی کشمکش سے الگ ہو کر آرٹ کی تخلیق کرنا ناممکن ہے، وہ زندگی کے منطقی تسلسل کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور ماضی کے جاندار روایات کو بڑے سلیقے اور احترام کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے، وہ انقلاب کے ساتھ ساتھ ارتقاء کا بھی قایل ہے اس لئے کہ ارتقاء کوئی بے مقصد اور مابعد الطبیعیاتی عمل نہیں ہوتا بلکہ انقلاب ہی ارتقاء کا مقصد ہے۔ اپنی طویل نظم " ایشیا جاگ اُٹھا " میں جعفری نے اس ارتقاء کا سائینسی نگاہ سے مطالعہ کیا ہے، اور انقلاب کے رومانی تصورات سے قطعی احتراز کیا ہے، اس کے مطالعہ سے جعفری کے شعور کے ارتقاء کا اچھی

طرح احساس ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، جعفری زندگی کے منطقی تسلسل کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ زندگی کا یہ تسلسل "نئی دنیا کو سلام" میں جاوید اور مریم کی محبت میں ظاہر ہوتا ہے اور "آخری خط" میں بھی جو ایک سرخ سپاہی نے نازی حملے کے دوران میں اپنی بیوی کو لکھا تھا، آخری خط کا ہیرو اپنی بیوی کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ دوسری شادی کرلے اسلئے کہ:۔

باغ کے آغوش میں گل چاہیئے — زندگانی میں تسلسل چاہیئے
ہو اگر دل کو تسلسل کا یقین، — موت بن جاتی ہے جام انگبیں
سر سے ڈھل جاتی ہے مایوسی کی دھوپ — موت پھر لیتی ہے پیدائش کا روپ
موت جب آکے کوئی شمع بجھا دیتی ہے — زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

اسی عقیدے کی وجہ سے اس کا انقلابی ہیرو آنسو نہیں بہاتا، ماتم نہیں کرتا، اپنی خوں گشتہ تمناؤں پر فریاد نہیں کرتا اس لئے کہ اسے اپنی فتح پر یقین ہے، وہ موت کو للکاتا ہے اور زندگی کو مسرت سے ہمکنار کر دیتا ہے، وہ انیس کے مرثیوں کے ہیرو کی طرح بین نہیں کرتا۔ کانپتا نہیں، بیہوش نہیں ہو جاتا بلکہ وہ "فیوچک" کی طرح پھانسی کے سائے میں نئی زندگی کے گیت گاتا ہے، اور "زویا" اٹھارہ سالہ بہادر روسی لڑکی کی طرح نازیوں کے پھانسی کے پھندے پر لٹک کر کہتا ہے، "جیت ہماری ہوگی ایسٹالین ضرور آئے گا"۔ آج کے یہ انقلابی ہیرو پھانسی کے تختے پر چڑھ کر ہنستے ہیں اور جد و جہد کے رک جانے پر آنسو بہاتے ہیں، ان کی رگوں میں خون بجلی بن جاتا ہے اور آنکھوں کے آنسو شراروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں

جعفری بھی "آنسوؤں کے چراغ" میں شرنارتھی اور مہاجرین اور مہاجرین عورتوں سے یہی سوال کرتا ہے:

شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے ؟

اور پھر ان سے کہتا ہے تمہاری یہ آنکھیں جن میں آنسو جھلملا رہے ہیں ظلم اور سرمایہ داری کے اس جھکڑ میں چراغِ سحری کی طرح بجھ جائیں گی، اس لئے تم آنسوؤں کے بدلے اپنی آنکھوں میں شرارے بھر لو اور اس طرح:

"میں اپنے نغمے کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے"

اس لئے کہ وہ انقلاب کا قایل ہے، اس میں اصلاح پسندی کا نہیں، اسے ارتقا اور انقلاب کا صحیح شعور حاصل ہے،

موجیں جب بڑھتی ہیں دریاؤں میں طوفان بدوش
اپنے ہر لوچ کو شمشیر بنا لیتی ہیں ـــــــ
جب اترتی ہیں فضاؤں سے زمیں پر کرنیں
سرخ نیزوں پہ اندھیرے کو اٹھا لیتی ہیں ـــ

اسکی شاعری طبقاتی شعور کو برانگیختہ کرتی ہے اور پڑھنے والے کے اندر عمل کا جذبہ جگاتا ہے۔ وہ اس نظام کی ظالمانہ کرختگی اور بدصورتی نمایاں کرتا ہے، عوامی جد و جہد میں زیادہ جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوکر شاعری کو موثر حربہ بنانے کی تلقین کرتا ہے اس نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرا دیا ہے:۔ "نغمہ نہیں ہے شاعرِ نازک خیال کا" "فولاد کی گرج ہے یہ آہن کا شور ہے"

ممکن ہے کہ بعض درمیانی طبقے کے نقاد ایسی شاعری کو جس میں فولاد کی گرج اور آہن کا شور ہو "گوارا" سے یکسر خالی سمجھیں لیکن آج شاعری کے اندر جو گرج اور شور ہے وہ زمانے کی دین ہے، وہ ماحول اور زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ایسی شاعری پر پھبتیاں کسنے والوں کو دنیا کے سب سے بڑے انقلابی شاعر مایاکوفسکی کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے:

"اس شاعری پر بہت سے شاعر چیخ اٹھیں گے اور نقاد کچھ سننے سمجھنے کے لئے طیار نہیں ہوں گے وہ چلائیں گے ـــــ لیکن روح کہاں ہے؟ ـ یہ تو محض خطابت ہے۔ شاعری کہاں ہے؟ ـ یہ تو صرف صحافت ہے ـ سرمایہ داری بڑا بھدا لفظ ہے ـ بلبل کتنا حسین لفظ ہے، لیکن پھر بھی ایسی ہی شاعری کروں گا اور میرا قلم اپنے نعروں سے سیلاب میں سارے جھوٹ اور فریب کو بہا لے جائے گا"

"میں محسوس کرتا ہوں میں ایک انقلابی کارخانہ ہوں جہاں حریت ڈھالی جا رہی ہے، میں نہیں چاہتا لوگ مجھے سڑک کے کنارے کھلا ہوا پھول سمجھ لیں اور اپنے بیکار لمحوں میں دل بہلانے کے لئے مجھے توڑ لیں"

آج شاعری غلط تصوف اور مابعد الطبیعیاتی پھندوں سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے، جہاں صاف ہوا اور روشنی ہے انقلابی شاعری آج بندوق کی طرح ایک حربہ ہے، جو عوام دشمن صفوں پر گولیوں کی طرح باڑھ کرتی ہے اور اپنے سینے کے لاوے سے ظلم اور جبر کے پہاڑوں کو اکھاڑ دیتی ہے۔ "سیلاب چین" میں جعفری ایک جگہ چین کی سرزمین سے یہی التجا کرتا ہے کہ وہ اس کی شاعری کی نبضوں میں اپنا تھوڑا سا خون دیدے اپنے "طوفان کی دو ایک بجلیاں" اور اپنے "جوالا مکھی کے خزانے کی دو چار چنگاریاں" اس کے سینے میں بھر دے تاکہ شاعر اس کے انقلاب کی داستان کہہ سکے۔ اور شاید اسی جذبے کے ماتحت جب اس نے اپنی نظم "رومان سے انقلاب تک" میں پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری کا تجزیہ کیا تو اسے انقلابی جذبے اور شاعری کے اس مقدس مقصد کی کمی نظر آئی، اس کو سارے اشعار بے کیف نظر آئے، اس نے ان میں اشکوں کے طوفان اور خوابوں کے رومان تو دیکھے پر ان میں تلوار کی دھار اور بجلی کی تیزی نہیں پائی ـ تو وہ گھبرا کر کہہ اٹھتا ہے کہ:

میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دیدو

شاعر سمجھتا ہے کہ اس کی شاعری بیکار رہی ہے، وہ اپنے ساتھیوں کی حرارت، لہو کی روانی اور دلوں کی روانی اور دلوں کی تڑپ کو شعر میں منتقل نہیں کر سکا اس وجہ سے وہ اپنے بے جان گیتوں سے شرمار ہا ہے۔ حالانکہ قلم پھینک کر تلوار اٹھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، قلم تلوار سے کم طاقتور نہیں۔ میرے خیال میں جعفری جذبے کی شدت میں قلم پھینک کر بندوق اٹھانے کی تلقین کرتا ہے وہ شاعروں کو رومان کی خواب آور فضا سے نکال کر عوامی انقلابی جد و جہد میں شریک کرنا چاہتا ہے وہ شاعری کو بندوق کی طرح ایک حربہ بنانے کی تلقین کر رہا ہے، لیکن جذبے کی شدت اور ایک طرح کی شکست سے دب کر اس کا بیان گنجلک ہو گیا ـ اس کے بعد جعفری کا شعور اور زیادہ عوام سے قریب ہو تا گیا۔ اس میں اور زیادہ سادگی، جوش، عزم، یقین اور انقلابی جد و جہد کی تھرتھراہٹ آگئی، آج وہ دل و جان سے نئی زندگی کی بقا اور امن کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں اسے اپنی فتح کا یقین ہے اور یہ عزم اور یقین کسی لمحے میں بھی اس سے الگ نہیں ہوتا، وہ امن کے اس انقلابی رول کو اپنی نظم "امن کا ستارہ" میں اسٹالین کے کردار میں بھرپور طور سے ظاہر کرتا ہے، اس آزاد نظم میں جعفری نے سوویٹ روس کی امن پسندی کو بہت جاندار طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جعفری کے یہاں جو امیجری (Imagery) ملتی ہے وہ بالکل جدید قسم کی ہے، اس پر مایاکوفسکی اور پبلو نرودا کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔ وہ امیجری کے شوق میں ابہام اور دور از کار اشاریت میں نہیں پھنستا۔ بلکہ اس کے برخلاف اس امیجری سے اس کی نظمیں زیادہ حسین اور پرجوش ہو جاتی ہیں، وہ اس سے طبقاتی شعور کو اجاگر کرنے میں مدد لیتا ہے اور اپنے شعور اور جذبے کو اور بھی پُرجوش اور پُر آہنگ بنا دیتا ہے۔ کہیں کہیں اس امیجری میں انقلابی رومانیت بھی آگئی ہے اور کہیں صاف اور سیدھی، دیکھئے مزدور جنتا کے

[illegible] میں وہ کہتا ہے :-

ان کے کاندھوں پہ بھاری مشین پہاڑوں کے مانند رکھی ہوئی
ریل کی پٹریاں ان کے سینوں پہ لپٹی ہوئی
گرم بجلی کے تار ان کی نیلی رگوں سے گزرتے ہوئے

انسانیت کے بارے میں جب وہ کہتا ہے :-

ساری انسانیت ایک ہے
چین کے آتش افروز رخسار سے
خون آلودہ یونان کے چاک قلب و جگر تک
میکسکو اور اسپین کی رات سے
ہنگری اور رومانیہ کی سحر تک
سوویٹ یونین کے طرب زار سے
ہند و ایران کے آنسوؤں تک
حبشیوں کی سلگتی ہوئی روح سے
ویٹ نام اور برما کی بپھری ہوئی بجلیوں تک
ساری انسانیت ایک ہے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جعفری پرانی امیجری اور ڈکشن کے استعمال کو بالکل پسند نہیں کرتا، لیکن وہ اس کے برتنے میں احتیاط چاہتا ہے اور اس میں حسب ضرورت اضافے کی بھی ضرورت سمجھتا ہے، وہ خود اس معاملہ میں بہت محتاط ہے

"میں اپنی شاعری کے معاملہ میں کافی محتاط ہوں اور مبہم استعاروں کے چکر میں نہیں پڑتا" لیکن اسکی شاعری بالکل خشک اور سوکھی نہیں ہے۔ اسکی انقلابی شاعری کا دل بھی تغزل سے دھڑکتا ہے، لیکن تغزل یا لیرک کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ممتاز حسین کے الفاظ میں ـــ "یہ حیات بھی ہے اور حیات کا نغمہ بھی ـــ یہ تاریخ بھی ہے اور شخصیت کا اظہار بھی ـــ یہ خرد بھی ہے اور خرد سے جذباتی وابستگی بھی۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں صرف موضوع (Theme) ہی کا ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ موضوع کے ساتھ جذباتی قربت۔ اظہار میں شخصی۔ دل سے دل کی بات کہنے والا لہجہ اور صورت میں سادگی، بیساختگی اور اس سنگیت کا ہونا ضروری ہے جسے ساری قوم اپنا سنگیت کہتی ہو"

یعنی یہ تغزل اس کی سادگی میں ہے جو عوام کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے جس سے خوابیدہ جذبات از سر نو بیدار ہو جاتے ہیں لیکن یہ تغزل اسوقت حاصل ہو سکتا ہے جب شعر کو سماجی شعور کی گرمی میں پگھلایا جاتا ہے، ایسی شاعری میں شاعر کا شخصی لہجہ عوامی خیالات سے وحدت اختیار کر لیتا ہے، عوامی سنگیت شعر کو عوام کے دلوں تک لیجاتی ہے، اور انھیں عمل کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ وہ اپنے انقلابی جذبات میں اس طرح دوسروں کو بھرپور طور سے شامل کر لیتا ہے اور شاعر اور سامعین کے درمیان ہمدردی کا وہ تار اور جذبات کی وہ قربت ہو جاتی ہے جس سے ایک آواز دوسرے کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ یہ تغزل یا لیرک، مخدوم کی نظم "جانے والے سپاہی سے پوچھو" اور "ایستالن"۔ وامق کے گیت "بھوکا ہے بنگال" ساحر کی نظم "میرے گیت تمھارے ہیں" اور سردار جعفری کی نظم: "اے امیراب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا" میں موجود ہے۔ اس میں موضوع کے ساتھ جذباتی قربت لہجے میں شخصی اظہار ہے اور ساتھ ہی حب الوطنی اور عوام دوستی کے جذبے میں ڈھلا ہوتا ہے، جعفری کی اس نظم سے اس کی عوامی سنگیت سے تغزل کے انقلابی رول کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور دل کا [illegible]

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
راہ میں تیرے لئے سنگ گراں ہیں لاکھوں
تاجکستان کے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں
نیزہ و خنجر و شمشیر و سناں ہیں لاکھوں
اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رُخ کرنا

اور آخری بند کا یہ جلال:-

کوہساروں کی بلندی کو جلال آئے گا
سنگریزوں کے کلیجے سے دھواں اٹھے گا
اور دریاؤں کے سینے میں اُبال آئے گا
اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رُخ کرنا

جعفری کی اس نظم میں بالکل ویسا ہی تغزل ہے جو ترسون زادہ کی نظموں میں ہے جو سوویٹ روس کے مقبول شاعر (ایسا کر دسکی) کی شاعری میں ہے، لیکن پھر بھی ابھی ہمیں اس میں عوامی سنگیت کی بہت کمی معلوم ہوتی ہے، سردار جعفری کو ابھی اور زیادہ اپنی نظموں میں عوامی سنگیت اور ٹکنیک کا خیال رکھنا پڑے گا، انھیں عوام کی ذہنی سطح اور ادبی معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی عوام کے اور زیادہ قریب آنا ہے، تاکہ ان کی شاعری عوامی ادب کے صحیح معیار پر پوری اتر سکے۔ ترقی پسند شاعری میں اس کی بڑی کمی ہے لیکن ترقی پسند شعرا اب اس کی طرف توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ بڑی اچھی علامت ہے

مختصر یہ کہ سردار جعفری کی شاعری محض نعرہ، سیاسی اور جماعتی پروپگنڈہ نہیں ہے، بلکہ اس کی شاعری کے شعور میں انقلاب اور ارتقاء کا بہت سائنٹفک اور وسیع مفہوم ہے، ماضی کے جاندار ادبی روایتوں سے انحراف نہیں ان کا احترام ہے۔ روایتی شاعری کا پوری عظمت اور "سوز و گداز" ہے لیکن یہ سوز و گداز اس کے یہاں ماتم نہیں بنتا بلکہ نئی زندگی کا ولولہ اور جوش بن جاتا ہے، اس کی انقلابی شاعری کے اندر فلسفیانہ روح جاری و ساری ہے۔ وہ انسان کا شاعر ہے اور اپنی زندگی اور اپنے عمل سے نئی راہیں تعمیر کرتا ہے مارکسزم نے جعفری کو حیات اور کائنات سے گہرا عشق سکھایا ہے، اور انسانیت پر ایمان۔ اسی مارکسی نظریہ حیات سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ تجربے کی خاطر نفسیات کی بھول بھلیوں میں نہیں پھنستا۔ بلکہ زندگی اور ادب کے مطالعہ کی مدد سے آگے بڑھتا ہے، اس کی شاعری زندگی کے روزمرہ واقعات سے مواد لیتی ہے۔ اس میں تاریخ، وقت اور حقایق کی تھرتھراہٹ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ادبی رنگ اس نے آزاد شاعری کو کسی مریض روحانیت کے مبہم اشاروں کے لئے استعمال کرنے کے بجائے عام اور بڑی حد تک پرانے ادبی رنگ سے قریب رکھا ہے، انقلاب اور ارتقاء کے انھیں اساسی اصولوں میں یقین رکھنے کی وجہ سے وہ نراج اور ادبی دہشت پسندی سے بڑی حد تک بچ گیا۔ اس کے اندر عقل اور جنون میں ہم آہنگی ہے، یوں تو بعض اوقات وہ الفاظ کے انتخاب میں زیادہ احتیاط نہیں برتتے۔ بعض اوقات بندشیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود سردار کی جدتِ فکر، ادبی صداقت، خلوص اور خود اعتمادی سے انکار نہیں ہو سکتا، سن و سال کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی پختگی کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے، اگر انھوں نے اپنی شاعری کو اور زیادہ بلحاظ موضوع اور ہیئت، سنگیت اور ٹکنیک عوامی شاعری سے قریب رکھا تو ان کی جگہ اُردو شاعری میں مستقل ہے، آج اُردو شاعری کو ان سے بڑی امیدیں ہیں

فیض الرحمن اعظمی

باب المراسلۃ والمناظرہ

زبان کا رسم خط سے تعلق

پچھلے جون کے نگار میں پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کا ایک مقالہ زبان اور رسم خط کے باہمی تعلق پر شایع ہوا تھا اور صاحب موصوف نے اس موضوع پر اظہار خیال کی دوسروں کو بھی دعوت دی تھی

اس سلسلہ میں اس وقت تک ہم کو دو مضمون موصول ہوئے ہیں۔ ایک پروفیسر شوکت سبزواری کا اور دوسرا مولوی عزیز حسن مرادآبادی کا۔ ہم ان دونوں مقالوں کو بجنسہ شایع کرکے دیگر اہل نظر سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس بحث میں حصہ لیں گے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر سرور، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو خصوصیت کے ساتھ اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب ان دونوں مقالوں کے متعلق جو اظہار خیال فرمائیں گے، وہ بغیر کسی انتظار کے شایع کر دیا جائے گا (اڈیٹر)

پروفیسر شوکت سبزواری :-

جناب سید احتشام حسین صاحب کے مقالے میں ایک چیز بنیادی ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے فاضل مقالہ نگار نے قلم اٹھایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی زبان کا اس خط یا تحریر سے جس میں وہ لکھی جاتی رہی ہے کوئی "باطنی" تعلق نہیں۔ باطنی تعلق سے ان کی مراد فطری اور ذاتی تعلق ہے اس کی وضاحت خود انھوں نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ "مخصوص تحریری علامتوں (حروف) کو دیکھ کر مخصوص آوازوں کی طرف ذہن کا منتقل ہونا محض ہماری عادت پر منحصر ہے اور یہ عادت اکتسابی ہوتی ہے۔ اس مخصوص علامت کا تعلق ایک مخصوص آواز کے ساتھ ہمارا مقرر کیا ہوا ہے" بات بظاہر بہت صاف اور واضح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ 'ج' مثلاً جس آواز پر دلالت کرتا ہے، اس کی شکل کا اس آواز سے کوئی ایسا فطری یا قدرتی لگاؤ نہیں کہ ہم فارسی حروف تہجی جانے بغیر جہاں 'ج' لکھا دیکھیں اپنی ذات سے اس کی آواز سمجھ لیں ہمیں چونکہ یہ بتا دیا گیا ہے اور صرف بتا ہی نہیں دیا گیا بلکہ ذہن نشین کرا دیا گیا ہے کہ 'ج' کی آواز یہ ہے اس لئے اس کی شکل دیکھتے ہی اس کی مقررہ آواز ہم سمجھ لیتے ہیں۔ باقی حروف کا حال بھی یہی ہے۔ وہ سب مختلف آوازوں کے لئے ہماری مقرر کردہ علامتیں ہیں۔ ہم خود ہی ان آوازوں کو سمجھتے ہیں۔ دوسرا بغیر جانے ان علامتوں سے ان کی آوازوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا

اس بحث میں ایک بڑا اہم اور بنیادی نقطہ نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور وہ ہے حروف و خطوط کی ارتقائی تاریخ۔۔۔۔۔۔۔۔

ویسے تو فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں بہت سے حروف و خطوط کا ذکر کیا ہے اور کون ساخط کہاں سے لیا گیا ہے اور عام متداول خطوط کا ماخذ کیا ہے اس پر خاص طویل بحث کی ہے لیکن اس سلسلہ کی ایک کڑی دانستہ یا نادانستہ انھوں نے چھوڑ دی ہے اور صرف اس ایک کڑی کے چھوٹ جانے سے اور بھی کئی باتیں فاضل مقالہ نگار کے قلم سے تراوش پا گئی ہیں جن کی ان جیسے اہل قلم سے کبھی امید نہیں کی جا سکتی تھی

خطوط دو طرح کے ہیں ۔ اصلی اور فرعی ۔ اصلی خطوط کو اولین انسان نے اپنی طبیعت سے وضع کیا تھا۔ فرعی خطوط بعد میں اصلی خطوط سے نکال لئے گئے۔ اصلی خطوط صرف چار بتائے جاتے ہیں۔ ان میں قدیم مصری ہیروغلیفی بھی ہے ۔ موجودہ خطوط جو دنیا میں رائج ہیں قریب قریب سبھی ہیروغلیفی سے متفرع ہوئے ہیں۔ اصلی خطوط کو بھی چار ارتقائی دوروں سے گزرنا پڑا

(۱) صوری ذاتی - (۲) صوری رمزی - (۳) مقطعی - (۴) ہجائی صوری ذاتی دور انسان کی تہذیبی تاریخ کا قدیم ترین اور سادہ ترین دور ہے ۔ اس زمانہ میں انسان درجۂ حیوان سے بہت قریب تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت وہ نطق اور اس کی برکتوں تک سے محروم تھا۔ وہ اشاروں سے باتیں کرتا تھا اور کبھی کبھی چیزوں اور جانوروں کی بھدی تصویریں بنا کر اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھاتا تھا۔ دوسرے دور میں اس نے بعض چیزوں کے اظہار کے لئے رموز اور اشارے وضع کرلئے اور ان کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا مثلاً کثرت کا مفہوم اس نے بہت سے نقطوں سے ادا کیا۔ محبت کے لئے کبوتر کی شکل اختیار کی اور عداوت کے لئے سانپ کی۔ تیسرا اور چوتھا دور ارتقاء اور تہذیب کے دور ہیں۔ ان میں انسان نے ترقی کی طرف ایک قدم بڑھایا اور تہذیب و شائستگی کے اولین آثار اس میں نمایاں ہوئے۔ تیسرے دور میں داخل ہونے سے پہلے انسان بولنا سیکھ چکا تھا۔ مختلف چیزوں کے اُس نے مختلف نام رکھ لئے تھے اور اب وہ اس فکر میں تھا کہ جہاں ان چیزوں کا نام لے کر وہ ان کو بتا سکتا ہے کوئی ایسا ذریعہ بھی ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی جو وہاں موجود نہیں اپنے دل کی بات بتا سکے اس کے لئے اس نے ایک نیا طریقہ نکالا۔ ہر آواز کے لئے اس نے ایک صورت بنائی۔ یہ صورت اس جانور یا چیز کی تھی جس کے نام کی ابتدا اس آواز سے ہوئی تھی۔ مثلاً 'ج' کی آواز جتانے کے لئے اس نے اونٹ کی گردن بنائی۔ اس لئے کہ اونٹ کا نام اس نے "جمیل" رکھا تھا۔ 'ب' کی آواز اس نے ایک ربع شکل سے ظاہر کی جو ایک سادہ قسم کے گھر یعنی گھیر سے بہت مشابہ تھی ۔ اس لئے کہ وہ گھر کو "بیث" کہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ کام فنیقیوں کا تھا۔ اس کے بعد کچھ ہی زمانہ گزرا ہوگا کہ حروف کی شکلیں جو در اصل اشیاء اور حیوانات کی صورتیں تھیں جن کے لئے وہ مقرر کی گئی تھیں بدل بدلا کر اور ترقی پا کر کچھ سے کچھ ہوگئیں۔ انسان ان کی تاریخ بھول گیا جو ایک قدرتی امر تھا۔ اور یہ حروف علامات محض کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ حروف اور ان کی آوازوں کا قدیم فطری تعلق جب نظروں کے سامنے نہ رہا تو یہ سمجھ لیا گیا کہ حروف اور ان کی آوازوں میں محض رسمی اور اسمی تعلق ہے ۔ حروف کے ارتقائی دوروں میں یہ آخری دور ہے جس کو اس فن کے عالموں نے ہجائی کہا ہے اور جس سے گزر کر ہی موجودہ حروف و خطوط اپنی اس حالت کو پہونچے ہیں

حروف کی تاریخ کا یہ مختصر سا خاکہ ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں اور نہ اس سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں

(۱) موجودہ حروف یا تو اصلی حروف سے نکالے گئے ہیں یا ان سے متفرع ہوئے ہیں اور ترقی پا کر موجودہ شکلوں تک پہونچے ہیں

(۲) اصلی حروف اشیاء و حیوانات کی شکلوں سے لئے گئے تھے

(۳) اصلی حروف کے ارتقائی مدارج میں سے ایک درجہ وہ بھی ہے جب وہ کسی چیز یا جانور کی شکلیں تھے اور اس آواز پر دلالت کرتے تھے جو اس چیز یا جانور کے نام کے شروع میں تھی

(۴) موجودہ حروف در سوم ان ہی شکلوں کی کسی قدر مسخ شدہ اور بدلی ہوئی صورتیں ہیں

اس تفصیل کے بعد احتشام صاحب کے دعوے کو پرکھئے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ حروف کا زبان سے یا ان آوازوں سے جن پر وہ دلالت کرتے ہیں کوئی باطنی تعلق نہیں۔ حروف بہت ہیں۔ کچھ اصلی ہیں اور کچھ فرعی ۔ فرعی حروف کی بابت تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی آوازوں سے کوئی فطری تعلق نہیں رکھتے اور شاید اصلی حروف سے ترقی یافتہ اور متفرع حروف کی بابت بھی یہ کہا جاسکے لیکن اصلی حروف کے متعلق یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اصلی حروف سے ترقی پا کر بنے ہوئے حروف کے متعلق بھی کم سے کم علمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی آوازوں سے بے تعلق ہیں۔ علمی طور پر اس لئے کہ اگر ہم ان حروف کی تاریخ جانتے ہیں۔

ان کی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ حروف اپنے مدلولات (آوازوں) کی شکلوں، صورتوں اور روپوں سے ترقی پاکر ہی ان شکلوں تک پہونچے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان میں ان کے مدلولات میں کوئی فطری یا اصلی تعلق نہ مانیں۔ اگر کسی چیز کی صورت کا اس چیز سے کوئی تعلق ہے اور وہ تعلق لازمی اور فطری ہے تو ماننا پڑے گا کہ حروف کا اپنی آوازوں سے بھی تعلق ہے اور وہ بھی فطری اور لازمی ہی ہے۔ مثلاً 'ج' ہی کو لیجئے۔ یہ شکل اونٹ کی گردن کی صورت میں اب سے ہزاروں برس پہلے لکھی جاتی تھی۔ "ج" کو اس صورت کا قایم مقام سمجھنا چاہئے۔ اونٹ کی گردن کی صورت اگر اونٹ کی ذات پر دلالت کر سکتی ہے تو اس کے نام یعنی "جمل" پر بھی اور اس کے واسطے سے تنہا اس کے پہلے جزو یعنی 'ج' کی آواز پر بھی۔ دنیا کی کوئی منطق اسے ناجائز یا خلاف فطرت قرار نہیں دے سکتی۔ پہلے قسم کی دلالت اگر عقلی ہے تو دوسری فطری ہے۔ اردو میں حروف کے نام بھی اسی اصول پر رکھے گئے تھے۔ مثلاً جیم۔ صاد۔ عین۔ قاف بترتیب ان شکلوں کے نام ہیں۔ جؔ۔ صؔ۔ عؔ۔ قؔ۔ یہ شکلیں اپنے اسماء کے شروع میں بھی ہیں۔ جس طرح 'ج' سے لازمی طور پر جیم ہی سمجھا جاتا ہے اسی طرح 'جمل' بھی۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں

جہاں اصول کے طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حروف کا اپنی آوازوں سے کوئی تعلق نہیں، وہاں کسی ایک زبان کے حروف کے تعلق بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تنہا انہی حروف کا اس زبان سے لگاؤ ہے، دوسرے حروف اس زبان اور اسکی آوازوں سے بے تعلق ہیں لیکن یہ بات پہلے سے بہت مختلف ہے۔ کسی زبان کا ان تمام حروف سے یکساں تعلق ہو سکتا ہے جو ایک ہی قسم کے حروف سے ترقی پاکر یا امتداد زمانہ کے زیر اثر بدل بدلا کر وجود میں آئے۔ احتشام صاحب کا یہ دعویٰ کہ زبان کا اسکے رسم خط سے کوئی فطری تعلق نہیں کم سے کم علمی بنیادوں پر صحیح نہیں

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی غور کے قابل ہے۔ احتشام صاحب جس قسم کا تعلق زبان اور اس کے رسم خط میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ تو زبان سے متعلق کسی چیز میں بھی نہیں۔ الفاظ اور اس کے معانی بلکہ خود انسان اور اس کی زبان میں بھی احتشام صاحب کوئی "لازمی ربط" نہیں پائیں گے۔ لفظوں کے معنی ہم وہی لیتے ہیں جو برسوں سے سنتے آئے ہیں۔ احتشام صاحب کے الفاظ میں مخصوص معنی کا تعلق مخصوص لفظ کے ساتھ ہمارا مقرر کیا ہوا ہے۔" زبان کا انسان کے ساتھ بھی اسی قسم کا تعلق ہے۔ انسانوں کا کوئی طبقہ، فرقہ، یا جماعت کسی زبان سے مخصوص نہیں۔ انسان جس سرزمین میں پیدا ہوا۔ جس قوم کی آغوش میں اس نے آنکھیں کھولیں اسی کی زبان بولنے لگا۔ یہ ساری چیزیں انسان دنیا میں آنے کے بعد سیکھتا ہے اور جب وہ کسی چیز کو سیکھ لیتا اور اس کا عادی ہو جاتا ہے تو وہی چیز اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ عادت اگر فطرت نہیں تو فطرت کی شریک ہے۔ اس میں فطرت کی سی پختگی بھی ہے اور فطرت کا سا شدت تعلق بھی

احتشام صاحب نے ایک بامزہ سوال کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ "کیا جس طرح زبان قوم کی تشکیل و تعمیر میں معاون ہوتی ہے اسی طرح رسم خط بھی کسی زبان سے وابستہ ہوتا ہے" شاید وہ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ زبان سے قومیت کی تعمیر ہوتی ہی ہے کیا رسم خط کو بھی قومیت کی تعمیر میں کوئی دخل ہے۔ اگر ان کا منشا یہی ہے تو میں عرض کروں گا کہ زبان کا کسی قوم سے جو تعلق ہے قریب قریب وہی رسم خط کا بھی ہے۔ قوم کے امتیازی صفات و خصوصیات میں سے زبان بھی ہے اور اس کا رسم خط بھی۔ دنیا کی ہر چیز اپنی امتیازی صفات ہی سے زندہ ہے۔ دریا پانی سے ہے اور پانی روانی سے۔ کوئی قوم اپنی خصوصیات کھو کر اپنی قومیت کی تعمیر نہیں کر سکتی۔ احتشام صاحب کے لفظوں کا ایک مفہوم اور بھی ہو سکتا ہے۔ ہر چند ظاہر وہی ہے لیکن وہ مفہوم میں نے اس لئے نہیں لیا کہ اپنی جگہ خود وہ اپنی تردید ہے۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ زبان جس طرح قوم کی تعمیر میں دخیل ہے، کیا رسم خط بھی زبان کی تعمیر و تشکیل میں اسی طرح دخل رکھتا ہے۔ یہ مفہوم اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ زبان کی تعمیر قوم کے لئے اور رسم خط کی تعمیر زبان کے لئے ایک درجے کی ہو۔ دوسرے یہ کس نے کہا کہ رسم خط زبان کی تعمیر میں معاون ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا گیا ہے کہ کسی زبان کا اس کے رسم خط سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس تعلق کو جسم و روح کے تعلق سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ زبان اور قوم کی تعمیر اس سلسلے میں بے معنی سی بات ہے

یر ے یہ بھی کوئی ترقی پسندی ہی کہہ سکتا ہے کہ زبان قوم کی تعمیر میں معاون ہوتی ہے (جب قوم سے قومیت مراد نہ لی جائے) اس لئے کہ ہمارے زمانہ کے ترقی پسند ہر بات اُلٹی کہتے ہیں۔ وہ بقول شخصے گھوڑا گاڑی کے پیچھے جوڑنے کے عادی ہیں۔ زبان قوم کی تعمیر نہیں کرتی بلکہ قوم زبان کی تعمیر کرتی ہے

ایک بات تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ احتشام صاحب نے یہ نتیجہ کہ "زبان اور رسم خط میں کوئی باطنی تعلق نہیں بلکہ رسمی ہے" اس مقدمے سے نکالا ہے۔ "زبان پہلے پیدا ہوئی اور اس کا رسم خط بعد میں" اس مقدمے کو انھوں نے طے شدہ بتایا ہے کہ بیج پہلے ہے اور درخت اور اس کی شاخیں بعد میں۔ لیکن پھر بھی درخت اور اس کی شاخوں کا بیج سے باطنی تعلق ہے۔ اس استدلال میں ایک بڑا مغالطہ ہے۔ رسم خط سے کیا مراد ہے؟ اگر وہ صورتیں ہیں جو اول اول انسان نے اپنے دل کی بات کہنے کے لئے بنائیں تو رسم خط پہلے ہے اور زبان بعد میں۔ کوئی اہل علم نہیں کہہ سکتا کہ اس قدیم زمانہ میں انسان کی کوئی زبان بھی تھی۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہی صورتیں موجودہ حروف کی بنیادیں ہیں جن پر رسم خط کی پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے اور اگر رسم خط سے مراد عہد حاضر کے ترقی یافتہ اور ڈھلے ڈھلائے حروف ہیں تو زبان سے بھی موجودہ شستہ اور نکھری ہوئی زبان مراد کیوں نہ لی جائے۔ اس صورت میں زبان اور اس کے حروف کا تعلق چولی اور دامن کا سا ہوگا

زبان کا رسم خط سے کتنا شدید تعلق ہے آسانی کے ساتھ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے صرف مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ میں اوپر کہیں جسم و جان کے ارتباط کا ذکر کر آیا ہوں۔ زبان اور رسم خط کے ارتباط کو بھی کچھ ایسا ہی سمجھئے۔ یوں تو روح کے لئے ہر جسم برابر ہے۔ اس کو جسم چاہئے، کوئی بھی ہو۔ جسم اگر صالح، توانا اور کامل ہے تو روح کو ترقی کرنے اور اندرونی توانائی حاصل کرنے کی بڑی آسانیاں ہیں۔ زبان کو بھی رسم خط چاہئے۔ وہ بھی رسم خط کی محتاج ہے۔ اور رسم خط کی صلاحیت اور کاملیت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ ایک اور مثال درخت اور زمین کی ہے۔ درخت کو زبان سمجھئے اور زمین کو رسم خط۔ درخت ایک خاص قطعہ زمین سے متعلق ہوتا ہے جس میں اس کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ درخت کے نشو و نما میں اس قطعہ زمین کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ رسم خط کو زبان کے نشو و نما میں تو کوئی دخل نہیں لیکن وہ زبان کے مزاج، اس کی گوناگوں تبدیلیوں، اور ارتقا کی منزلوں کا حامل ہوتا ہے۔ رسم خط زبان کا آئینہ ہے جس میں اس کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ اس کی زندگی کا مقیاس ہے۔ ایک کتاب ہے جس میں زبان کی پوری تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے Know (جاننا) جس کا تلفظ ہم "نو" کرتے ہیں۔ لیکن لاطینی حروف میں، جس میں انگریزی زبان مدتوں سے لکھی جا رہی ہے، "دکنو" لکھتے ہیں۔ K کا تلفظ میں خاموش ہے۔ کسی زمانہ میں یہ بولا جاتا تھا۔ بعد میں تلفظ کی آسانی کے پیش نظر گرا دیا گیا۔ مگر بدستور لکھا جاتا رہا۔ یہ K جو آج بولا نہیں جاتا لیکن لکھا جاتا ہے اپنے اندر اس لفظ کی تاریخ پنہاں رکھتا ہے۔ ہم اس K ہی کی مدد سے یہ کھوج لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ یہ اصل میں "گن" تھا جس کے معنی ہیں گننا اور قیمت لگانا۔ یہ مادہ سنسکرت میں بھی ہے

درخت جو زمین میں جڑ پکڑ چکا ہے آسانی کے ساتھ اکھاڑا نہیں جا سکتا اور اگر کسی تختہ زمین سے اکھاڑ کر دوسری جگہ اس کو جما دیا جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ درخت خشک ہو جاتا ہے اور اگر دوسری جگہ جم بھی جاتا ہے تو اچھے پھل نہیں دیتا۔ یہ اثر اس زمین سے الگ کرنے کا ہوتا ہے جہاں عرصہ سے وہ لگا ہوا تھا۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ کسی زبان کے قدیم رسم خط کو ترک کرنا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا خط اختیار کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ اس سے زبان کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مٹ جاتی ہے۔ لفظ بے جان ہو جاتے ہیں اور زبان میں وہ اثر اور جادو نہیں رہتا جو اس نے صدیوں میں حاصل کیا تھا۔ اس کی تفصیل سے میں معذور ہوں۔ تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ میں زبان کی زندگی کی پوری تاریخ دہراؤں

مولوی عزیز حسن صاحب مراد آبادی :-

جون ۱۹۵۱ء کے نگار میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے زبان اور رسم الخط کے متعلق جو مضمون شایع کرایا ہے اس میں موصوف نے رسم الخط کی ابتداء پر کافی تفصیلی روشنی ڈالنے کے ساتھ اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی رسم الخط کو چونکہ اُس زبان سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے اس لئے کوئی بھی رسم خط کسی زبان کے لئے اختیار کر لیا جائے اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑے گا۔ اور مضمون کی آخری سطروں میں اُردو کے لئے رسم الخط کی تبدیلی کا سوال بھی پیش کر دیا ہے

یہ امر بالکل واضح ہے کہ زبانیں اول معرض وجود میں آئیں اور رسم الخط بہت بعد میں پیدا کئے گئے۔ نیز یہ کہ زبان ایک فطری چیز ہے اور رسم الخط سرتاپا وضعی۔ اور اگر ایک زبان اپنے موجودہ رسم خط کے علاوہ کسی دوسرے رسم خط میں لکھی جانے لگے تو اس سے چنداں فرق واقع نہ ہوگا۔ مثلاً انگریزی کے حرف (بی ـ B) کی شکل بدل کر کچھ اور کر دیں اور اس کو بی بی کہنے لگیں تو اس سے زبان میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ سید صاحب موصوف کی تحریر اس امر کو واضح نہیں کرتی کہ رسم خط کی تبدیلی کا مقصد حروف کی موجودہ شکل کو بدل کر دوسری طرح بنا دینا ہے یا کسی دوسرے مروجہ رسم خط کو کسی زبان کے لئے اختیار کر لینا ہے کیونکہ جب اس مسئلہ کو اس نوعیت سے دیکھا جائے کہ دنیا کی کسی زبان کے حروف تہجی میں بھی یہ جامعیت موجود نہیں ہے کہ وہ اپنی موجودہ تعداد کو برقرار رکھتے ہوئے کسی دوسری زبان کے تمام حروف کو ادا کر سکیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر زبان کو اس کے موجودہ رسم الخط میں ہی ادا کرنا ممکن ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہے

ابتدا میں انسان مختلف آب و ہوا اور مختلف ماحول میں پرورش پا رہا تھا اور ہر جگہ کی آب و ہوا اور ماحول اس کے جسمانی ساخت۔ رنگ و روپ عادات و اطوار۔ مزاج و طبیعت کی تعمیر مختلف طریقہ پر کر رہے تھے حتیٰ کہ طرز ادا اور لہجہ تک پر اس کا اثر پڑ رہا تھا اور ایک خطۂ آبادی کا لہجہ دوسرے حصۂ آبادی سے مختلف طرح پر تعمیر ہو رہا تھا۔ اس لہجہ اور زبان کی حرکت نے آوازوں کو جنم دیا جو بعد میں حروف کہلانے لگے اور یہی حروف ایک زبان کی بنیاد میں اور یہی رسم خط کی بھی۔ اکثر حروف تو ایسے بنے جو تمام زبانوں میں مشترک ہیں مثلاً ا۔ با۔ تا۔ جا۔ دا۔ را۔ ما۔ سا وغیرہ۔ اور بعض حروف ایسے بنے جو اُس خطۂ آبادی ہی تک محدود تھے مثلاً عربی کا ث۔ ص۔ ط۔ ع۔ ح۔ ظ۔ ق وغیرہ کہ ان کے خاص مخارج ہیں جن کی وجہ سے یہ معرض وجود میں آئے یا فارسی کی ژ، ہندی کی ڑ۔ انگریزی کا ایکس (X) کہ یہ حروف دوسری زبان میں نہیں ملتے۔ اِن حروف سے بنے ہوئے الفاظ کو ہم کسی طرح بھی دوسرے رسم الخط میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم ہندی کا لفظ "گڑ" انگریزی رسم خط میں لکھنا چاہیں تو (Gur) "گر" لکھیں گے (اور گر خود ایک دوسرا لفظ ہندی میں موجود ہے) اور جب اس کو عربی رسم الخط میں لکھیں تو "کر" ہو کر رہ جائے گا۔ یہ کہنا ایک حد تک ضرور صحیح ہے کہ کسی زبان کو اس کے مروجہ حروف تہجی کی شکل سے کوئی مخصوص نسبت نہیں ہے کہ وہ زبان بغیر ان کے زندہ ہی نہیں رہ سکتی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی اتنا ہی یقین ہے کہ اُن مخارج اور صوتی اسالیب کے بغیر جو اُس زبان کے حروف تہجی بیان کرتے ہیں وہ زبان باقی نہیں رہ سکتی یعنی اگر ہم حروف کی موجودہ شکل بدل کر دوسری طرح لکھنے لگیں تو اس سے زبان پر چنداں فرق نہ پڑے گا مگر کسی زبان کے لئے ایسا رسم خط اختیار کرنا کہ وہ اس کے تمام صوتی اسلوب ادا کرنے پر قادر نہ ہو زبان میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کرنے کا باعث ہو جائے گا۔ اس کی ایک بین مثال عربی کے حروف "ع" میں موجود ہے کہ دوسری زبانوں میں یہ حرف موجود نہیں ہے اس لئے رسم خط تبدیل کر دینے کی صورت میں اس کی آواز بالکل ختم ہو جائے گی اور اس حرف سے مرکب اکثر عربی الفاظ دوسرے رسم خط میں پہونچ کر کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ مثلاً اعلیٰ دوسرے رسم خط میں جا کر آلا یا آلہ ہو جائے گا۔ "جمع" "جم" "صرف" "صر" رہ جائے گا۔ "طالع" "گردش طالع" سے "تالے" ہو جائے گا۔ "طلع" "غریب جوتی کا تلہ" ہو جائے گا۔ اور "جامع" "اپنا جامہ تبدیل کر کے" "جامہ" بن جائے گا اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اتنی بڑی تبدیلی ہوگی کہ زبان کی موجودہ حالت بالکل باقی نہ رہ سکے گی۔ بلاشبہ زبان اللہ

حروف کی موجودہ شکل میں کوئی حقیقی رشتہ موجود نہیں ہے مگر کسی زبان کے رسم خط کو بالکل بدل ڈالنے کے لئے اتنا ہی تو کافی نہیں ہے کہ رسم خط کی ابتداء پر بحث کر کے یہ ثابت کر دیا جائے کہ ایک حرف کی تحریری شکل کو اس کی صوتی حالت سے کوئی مناسبت نہ پہلے تھی نہ اب ہے بلکہ اس سلسلہ میں علاوہ یہ کرنا پڑے گا کہ کوئی دوسرا مروجہ رسم خط ایسا ہے جو اس زبان کی تمام صوتی حرکات و اسالیب کو جو ایک زبان کی بنیاد اصلی میں ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر ایسی صلاحیت اُس رسم خط میں موجود نہیں ہے اور پھر بھی وہ اُس زبان کے سر منڈھا جا رہا ہے تو یہ تبدیلی صرف رسم خط کی نہ ہوگی بلکہ اصل زبان ہی بدل جائے گی کیونکہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ذ۔ ز۔ ض ظ۔ سے بنے ہوئے تمام الفاظ باقی رہیں اور ان کے درمیان تمیز و تفریق بھی قایم رہے اور ان چاروں حروف کی علاحدہ علاحدہ شکلیں مٹ کر صرف ایک شکل (Z) باقی رکھی جائے۔ زبانوں کی اصلی بنیاد تو صوتی اصول ہے اور حروف اس کی تحریری شکل ہیں۔ جب تک ایک زبان کے اصوات و مخارج کے ادا کرنے کے لئے حروف مہیا نہ کر دئے جائیں اُس زبان کا رسم الخط تبدیل کرنا دیدہ و دانستہ زبان کو پھانسی کے تختہ پر لٹکانا ہے کیونکہ اس حالت میں بعض نا قابل عبور دشواریاں لاحق ہو جائیں گی مثلاً قریب المخرج والے حروف کی کتابت جب کسی دوسرے رسم الخط میں کی جائے گی تو اکثر اصل مفہوم متعین نہ ہو سکے گا مثلاً عربی کے اصل اور عسل۔ صحو اور سہو۔ سحر اور صہر۔ مضی اور مذی۔ خطبہ اور ختنہ۔ زمن اور ضمن۔ حرب اور ہرب وغیرہ کے درمیان تمیز کرنے کی کوئی صورت نہیں رہتی اگر ان کو عربی رسم الخط کے بجائے کسی دوسرے رسم خط میں لکھ دیا جائے۔ اسی طرح انگریزی کے (Know (No (Two - Too) (Won - One) (Dear - Deer) (Weak - Week) (Lawyer - Liar) کو جب کسی دوسرے رسم خط میں لکھنا چاہیں تو تمیز نہ ہو سکے گی کہ کون سا لفظ مقصود ہے۔ اُردو چونکہ عربی۔ فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس میں ہر سہ زبانوں کے حروف اور الفاظ موجود ہیں اس لئے بہت سے الفاظ یہاں بھی ایسے ملتے ہیں جن کی کتابت اگر کسی دوسرے رسم خط میں کی جائے تو معنی میں التباس پیدا ہو جانا ضروری ہے (باز۔ بعض) (بود۔ بعد) (باد۔ بعد)۔ (صور۔ سور) (حل۔ ہل) (رزم۔ ضم) (ارض۔ عرض) (بسر۔ بصر) وغیرہ

رسم خط میں تبدیلی کے حامی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ایسے الفاظ کے معنی کا تعین جس طرح ہم روزانہ کی گفتگو اور تقریروں میں کرتے ہیں حالانکہ اس وقت کسی لفظ کے ہجے کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح تحریر میں بھی رسم الخط بدل جانے کے بعد ان کے معنی متعین کر لئے جایا کریں گے اور اس میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ یہ جواب اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ جن لوگوں نے کسی زبان کی تحصیل اس کے موجودہ رسم الخط میں کر لی ہے ان کو معنی میں التباس پیدا نہ ہوگا، کیونکہ وہ الفاظ کی موجودہ اشکال سے واقف ہیں اور سیاق عبارت سے ان کو لفظ اور اس کا مفہوم متعین کرنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی مگر رسم خط کی تبدیلی سے آیندہ زبان کی جو شکل ہو جائے گی اس میں ایسے الفاظ کے درمیان تفریق نہ ہو سکے گی اور بعض الفاظ تو لازمی طور پر بدل جائیں گے جنکی مثال ہم نے ع کے الفاظ میں اوپر پیش کی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آیندہ نسل جس زبان کی تحصیل کرے گی اس کی حالت موجودہ حالت سے بالکل مختلف ہوگی اور اُس نسل کے لئے معنی میں التباس پیدا ہونا کس حد تک ممکن ہے اس کو محسوس کرنا دشوار نہیں ہے۔

مصادر اور ان کے مشتقات کے اصول ہر زبان کی صرف میں موجود ہیں اور یہی اصول زبان کی تمام تر بنیاد ہوتے ہیں۔ ایک لفظ اپنے تمام مشتقات میں اپنے اصل مادہ کو کبھی بھی ضایع نہیں کرتا اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اِس لفظ کی اصل کیا ہے لیکن اکثر صورتوں (جن کی چند مثال ہم نے اوپر درج کی ہیں) الفاظ کی اصل ہی گم ہو جائے گی اور کسی طرح بھی یہ پتہ نہ چل سکے گا کہ یہ کون سا لفظ ہے۔ کہاں سے نکلا ہے اور پھر اس کی کیا کیا صورتیں بدلیں اور اس طرح تمام حروف کو یکسر بیکار کر دینا پڑے گا۔ نیز یہ کہ پھر تحقیق لغات کے لئے الفاظ کی اصلی وسعت کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی معیار باقی نہ رہ جائے گا۔ سید صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں ایک مثال پیش کی ہے کہ انگریزی کا (Mahgha) جب فارسی رسم خط میں لکھا جائے گا تو "ہائی" ہو جائے گا مگر

سید صاحب نے اس کو فراموش فرما دیا کہ انگریزی میں ایک دوسرا "ہاٹ" بھی موجود ہے جسکی ہجے ہے ([illegible]) اور اس کے معنی میں جلدی کی وجہ سے بھاگنا یا تیز چلنا اور لغات کی کتابوں میں دونوں الفاظ کے اصل ماخذ بتلائے گئے ہیں اور ان کی رعایت ان الفاظ کی موجودہ شکل اور ان کی تمام مشتقات دونوں میں باقی رکھی گئی ہے تاکہ لفظ کی اصل ضایع نہ ہونے پائے۔ اگر انگریزی زبان کو موجودہ فارسی رسم خط میں لکھنے لگیں تو یہ سب کچھ یکسر مفقود ہو جائے گا۔ یہی حال ہر زبان کی حرف کا ہے اور چونکہ اس سے ہر تعلیم یافتہ واقف ہے اس لئے اس کی مزید تفصیل بیجا طوالت ہوگی اس لئے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے

ایک زبان میں حروف و الفاظ کے تعین کے بعد سب سے اہم درجہ اس کے صرف و نحو کا ہوتا ہے اور اس میں اکثر موقعوں پر صرف حروف سے بعض کام لئے گئے ہیں جو کسی رسم الخط سے وابستہ و متعلق رہ سکتے ہیں۔ مثلاً عربی کا "ال" جس کی ایک مثال سید صاحب نے اپنے مضمون میں پیش بھی کی ہے کہ "بالکل" دوسرے رسم الخط میں جاکر "بلکل" ہو جائے گا۔ یہاں تک تو خیر کسی نہ کسی طرح برداشت کر بھی لیا جائے لیکن اُن مواقع پر کیا صورت ہوگی جب کسی اسم پر "ال" داخل کیا جاتا ہے اور وہ آواز نہیں دیتا مثلاً :-
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جب اس کو دوسرے رسم الخط میں لکھا جائے اور صرف حروف ملفوظی ہی کی کتابت کی جائے تو الرحمٰن الرحیم میں دونوں اسماء میں "ال" نہیں لکھا جائے گا اور نحوی اصول پر یہ بالکل غلط ہوگا۔ عربی میں "ال" کے استعمالات پانچ ہیں جو مختلف معنی کے فایدے دیتے ہیں۔ پھر "ک" مثالیہ ہے۔ واؤ۔ با۔ تا۔ قسمیہ ہے (واللہ اور باللہ اُردو میں بھی مستعمل ہے)۔ "ل" لئے اور واسطے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (لہٰذا اُردو میں بھی "اس لئے" کے معنی میں مروج ہے) "ف" پس کے معنی آتا ہے۔ فارسی میں یائے وحدانی تنکیر کا فایدہ دیتی ہے۔ اُردو میں "ب" ساتھ کے معنی میں آتی ہے جیسے بدرجہ مجبوری یا بمجبوری انگریزی میں Suffixes اور Prefixes کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔ صرف (a) سات معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے (afoot — abreast) یہ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی حرف کسی زبان کا بھی مجرد طور پر کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ ایک مخصوص اصول کے تحت دوسرے الفاظ سے ملکر ہی وہ معنی پیدا کرتا ہے جو ہم نے بیان کئے ہیں۔ ہم اس مختصر مضمون میں اشتقاق اور حروف کی اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے کیونکہ ان سے ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے اور اس موقع پر ان کی جانب صرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہوگا۔ ان اشارات سے ہمارا مقصد یہ اظہار کرنا ہے کہ حروف کو ابتداءً زبان سے کوئی حقیقی تعلق نہ تھا مگر ہر زبان کی ارتقائی حالت میں حروف سے بہت کام لیا گیا ہے اور اس نے مسئلہ کی صورت کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ سید صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں اس ارتقائی کیفیت کو بالکل نظر انداز فرما دیا ہے

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ محض اصولی ہے اور کسی ایک زبان سے اس کا تعلق نہیں ہے البتہ مثالیں صرف انہی زبانوں سے دی جا سکتی ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔ اس مضمون میں بھی یہی کہا گیا ہے اور اس تمام بحث سے دوسرے اہم نتایج کے ساتھ ایک قابل لحاظ نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ الفاظ اور اس کے ساتھ ہی قواعد زبان کو تبدیل کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اُس زبان کا جس قدر بھی لٹریچر آج تک جمع ہو چکا ہے اس کو یکقلم نیست و نابود کر دیا جائے یا کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ وہ بھی اُن زبانوں کے لٹریچر کی طرح ہو جائے گا جو ختم ہو چکیں اور صرف مخصوص علماء ہی ان کے ادب اور علمی کارناموں سے واقف ہیں کیا ایک زبان کا بہی خواہ اس کے تمام سرمایۂ علم و ادب کے لئے نیک خواہی کے طور پر یہ مشورہ دینے کی جرأت کر سکتا ہے ؟

علمی اصول پر بحث تو الگ رہی ہمارے اسلاف کے سامنے یہ مسئلہ دو مرتبہ اپنی عملی شکل میں پیدا ہوا اور انھوں نے دونوں بار اس کو نہایت خوبی سے حل کیا۔ پہلے مسلمان جب ایران میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ مذہب اور ایک دوسری زبان بھی لائے ایران نے اسلام قبول کیا اور مذہبی ضرورت سے عربی زبان کو سیکھا۔ چند ہی دن میں فارسی میں عربی کے الفاظ کثرت سے شامل ہوتے چلے گئے مگر ایران نے عربی الفاظ لئے تو اس کے ساتھ ہی وہ تمام عربی حروف بھی اپنا لئے جو فارسی میں نہ تھے تاکہ جن

الفاظ کو فارسی میں شامل کیا جا رہا ہے وہ اپنی اصلی حالت میں باقی اور قایم رہ سکیں۔ دوسری بار اُس وقت جب یہی مخلوط فارسی ہندوستان میں داخل ہوئی اور یہاں کی ملکی پراکرتوں اور سنسکرت سے سابقہ پڑا اور ان کے میل سے ایک نئی زبان کی تعمیر شروع ہوئی تو اُس عہد کے علماء نے صرف الفاظ ہی نہیں لئے بلکہ ہندی کے تمام حروف اس نئی زبان کے حروف تہجی میں شامل کردئے۔ ٹ ۔ ڈ ۔ ڑ کی علحدہ شکلیں وضع کیں اور جھا ۔ چھا وغیرہ کو مرکب حروف کی حیثیت میں اختیار کرلیا اور اس طرح ہندی کے جو الفاظ اس نئی زبان میں شامل ہوئے ان میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اور الفاظ اپنی اصلی حالت میں باقی رہے۔ جن علماء نے فارسی میں عربی حروف کو شامل کیا یا جنھوں نے اُردو میں ہندی حروف کو داخل کیا، ان کے سامنے یہی تمام امور تھے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ انھوں نے الفاظ اسطرح نہ لئے کہ اپنی زبان کے حروف تہجی علیٰ حالہ قایم رکھتے اور دوسری زبانوں کے الفاظ توڑ موڑ کر لیتے۔ حروف کی جو نوعیت اور حیثیت ایک زبان میں ہے جس کا بیان ہم نے سطور بالا میں اختصار سے کیا ہے ان علماء کے پیش نظر تھی اور اس کو انھوں نے ہر موقع پر تمام و کمال ملحوظ رکھا اس امر کو ان علماءِ ادب ولسانیات نے اُس زمانہ میں محسوس کرلیا تھا کہ ایک زبان کی بنیاد اصلی حروف کی تحریری شکل نہیں ہے اور حروف کے اسالیب صوتی کو اگر تبدیل کیا گیا تو زبان ہی فنا ہوجائے گی اسی وجہ سے انھوں نے ہندی حروف کی شکلیں بدل کر اُس رسم خط کے مطابق کرلیں جو ان کے استعمال میں تھا مگر اُس زبان کے حروف تہجی جن مخارج اور صوتی اسالیب کو ادا کرتے تھے ان کو علیٰ حالہ قایم اور باقی رکھا۔ اپنے اس عمل سے ان علماء نے ہمارے سامنے اس کی راہیں کشادہ کردی ہیں کہ اگر ہمیں اس طرح کے لسانی مسائل پیش آئیں تو ہم بھی ایسا ہی کریں۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کردینا بے محل نہ ہوگا کہ سب سے زیادہ مکمل رسم خط وہ سمجھا جائے گا جس میں سب سے زیادہ اسالیب ادا اور مخارج کے اظہار کی قدرت ہو اور اس اعتبار سے اُردو کا موجودہ رسم خط سب سے زیادہ مکمل سمجھنا چاہئے کیونکہ اس میں عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور انگریزی کے تمام حروف کو ادا کرنے کی قدرت۔ صلاحیت اور اہلیت موجود ہے۔

سید صاحب نے اپنے مضمون کی آخری سطور میں فرمایا ہے کہ کیا اُردو کا موجودہ رسم خط ہی باقی رہنا مناسب ہے یا اسکو بدل کر لاطینی یا دیوناگری رسم خط اس کے لئے موزوں ہوگا

سید صاحب کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز صاحب نے بالکل صحیح طور پر یہ سوال کیا ہے کہ رسم خط کی تبدیلی پر غور کرنے سے پہلے اس امر کا انکشاف ہونا ضروری ہے کہ کسی زبان کا رسم خط آخر کس وجہ سے تبدیل کیا جائے۔ اور جب تک وہ اسباب و وجوہ سامنے نہ آجائیں اس مسئلہ پر غور نہیں ہوسکتا۔ اُردو کا رسم خط تبدیل کرنے کے تفصیلی اسباب سید صاحب نے ظاہر نہیں فرمائے ہیں اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے مگر اپنے قیاس کی بنا پر ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے موجودہ عام لسانی رجحانات کے پیش نظر ہی سید صاحب نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہے اور چونکہ دیوناگری رسم خط ملک کی اکثریت کا پسندیدہ رسم خط ہے اس لئے سید صاحب نے اس کو اُردو کے لئے بھی تجویز فرمایا ہے۔ تمام اُصولی مباحث سے قطع نظر ہم سید صاحب سے بصد ادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ایک ملک میں ایک ہی زمانہ میں ایک ہی رسم الخط میں دو مختلف زبانیں پرورش پاتی رہیں ؟ اور دونوں کا علحدہ وجود میں بھی باقی رہے۔ ظاہر ہے کہ جس زبان کے مؤیدین کی تعداد زیادہ ہوگی صرف وہ زبان باقی رہے گی اور دوسری زبان اُسی میں ضم ہوکر خود فنا ہوجائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہوگا

افسر سیمابی اور فضا ابن فیضی

عرصہ سے جناب افسر سیمابی کو یہ شکایت تھی کہ فضا اعظمی، ان کے کلام سے سرقہ کرتے ہیں اور اس باب میں انکی برہمی ایک بار اس حد تک بڑھ گئی کہ انھوں نے مجھے یہ لکھا کہ اگر آیندہ فضا کی کوئی نظم شایع ہوئی تو وہ نگار کا مطالعہ بند کردیں گے، میں نے ان کو لکھا کہ یہ بات اصول کے خلاف ہے اس لئے میں تعمیل سے قاصر ہوں، لیکن آپ مضمون کے ذریعہ سے ضرور اپنی شکایات کا اظہار کرسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک مختصر سا مضمون لکھ کر بھیجا، ہر چند کہ تحریر کے لب و لہجہ کو دیکھتے ہوئے اس کی اشاعت کچھ مناسب نہ تھی لیکن ان کے مزید اصرار پر اس کو بجنسہٖ شایع کرنا پڑا اب رہا اصل مسئلہ کہ فضا صاحب کی طرف سے افسر صاحب کو جو شکایت پیدا ہوئی ہے وہ درست ہے یا نہیں، اس کے متعلق میں اُس وقت تک کچھ نہیں کہنا چاہتا جب تک خود فضا صاحب کو ایک بار جواب دینے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر افسر صاحب کا خیال صحیح ہو تو بھی ان کو برہم ہونے کی جگہ خوش ہونا چاہئے تھا کہ لوگ ان کے کلام کی تقلید کرتے ہیں اور اُن کے خیالات سے استفادہ کرتے ہیں

انگریزی کا یہ مشہور جملہ شاید اُن کی نگاہ سے نہیں گزرا کہ:-

Imitation is the sincerest form of flattery

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

اگر کوئی شخص میرا روپیہ چُراتا ہے تو وہ میرے نزدیک ایک حد تک درخور معافی ہے۔ لیکن اگر وہ میرے افکار پر غاصبانہ قبضہ کرتا ہے تو گویا میری شہرت اور نیک نامی کو ناجائز طور پر حاصل کرنے کی سعیِ مذموم کا مرتکب ہوتا ہے اُس کی انتہائی نرم سزا یہی ہوسکتی ہے کہ اُس پر پٹرول چھڑک کر دیا سلائی دکھادی جائے

میں توارد کا قایل ہوں مگر بسا اوقات یہ چیز اس قدر Negative قسم کی ہوتی ہے کہ بہ آسانی نظر نہیں آسکتی اس لئے کہ مماثلت اور مشابہت برائے نام ہوتی ہے شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ پورا شعر یا کوئی مصرع لڑ جائے

توارد اور سرقہ میں زمین آسمان کا فرق ہے توارد کو تو خیر گوارا کیا جاسکتا ہے مگر سرقہ قطعًا ناقابلِ برداشت چیز ہے، سرقہ کرنے والا گویا قانون و اخلاق کی تمام قوتوں کے خلاف ایک محاذ تعمیر کرتا ہے اس کا وجود تہذیب و انسانیت کے لئے ایک مستقل چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے مجھے شعر و ادب کے سلسلے میں بارہا ایک محکمۂ احتساب کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے اِس محکمے کو University of thought سمجھئے، اِس میں ہر اُس شاعر کا امتحان لیا جائے جس کی شاعرانہ پوزیشن مشکوک ہو، جو شاعر اس مکتب خیال کا سند یافتہ ہو اُسی کو شعر گوئی کا مستحق سمجھا جائے اور جو لوگ سرٹیفکٹ نہ ہونے کے باوصف شاعری سے باز نہ آئیں اُن کو تبدیلِ آب و ہوا کے لئے انڈمان بھیج دیا جائے۔ اگر کوئی غالب یا اقبال کی تقلید کرتا ہے تو یہ بات بذاتہٖ قابلِ اعتراض نہیں ہے بلکہ اس کے Intellectual ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس کارِ مشکل کے لئے غیر معمولی دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر بہ پردۂ تقلید وہ اِن کے افکار و تصورات کے خاکے اُڑاتا ہے یا بہ الفاظِ دیگر سرقہ کرتا ہے تو یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے

ناظرینِ "نگار" کو یاد ہوگا کہ نومبر ۵۰ء میں "سورج کی آواز" کے زیرِ عنوان میری ایک نظم شایع ہوئی تھی،

جناب فضا ابن فیضی نے اس کے متعدد مصرعے نہایت شرمناک طریقے پر چرائے اور اب بھی ان کی یہ ناپاک کوششیں جاری ہیں
میرا خیال ہے کہ فضا صاحب شعر کہتے وقت "نقل را عقل بائد" کے بجائے "نقل را چہ عقل" کو بد نظر رکھتے ہیں، اگر کوئی مجرم Red handed پکڑا جائے تو اُس کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، جناب فضا کی یہی کیفیت ہے کسی نے سچ کہا ہے :۔

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

غریب نے میرے اشعار کا سرقہ کیا بھی تو اتنے بھونڈے اور عامیانہ انداز میں کہ مجھے تو ان حضرت پر غصہ کے بجائے ہنسی آتی ہے، مثال امر کے طور پر چند مصرعے پیش کرتا ہوں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ شہرت ارزاں کا جنون اچھے بھلے آدمی سے کیسی کیسی حرکتیں کرواتا ہے:

تابہ کے شعلے رہیں گے برف زاروں میں اسیر	(سورج کی آواز)
برف زاروں میں قید برق تپاں	(اہرمن زار)
روشنی پر تیرگی کب تک چڑھائے گی غلاف	(سورج کی آواز)
آفتابوں پہ ظلمتوں کے غلاف	(اہرمن زار)
خانقاہوں میں نظر آئے ہیں کتنے بھیڑئے	(سورج کی آواز)
بھیڑئے معتکف مساجد میں	(اہرمن زار)
مجھ کو اس دُنیا میں قرنوں سے ہے انساں کی تلاش	(سورج کی آواز)
آدمی کی تلاش ہے مجھ کو	(اہرمن زار)
مَیں نے دیکھا ریگ زار کربلا کو برق پاش	(سورج کی آواز)
ریگ زاروں میں برق کے تودے	(اہرمن زار)
جام دینا میں کہاں تک زہر گھولا جائیگا،	(سورج کی آواز)
ابھی تو ساغر امرت میں زہر بھرنا ہے	(صبح نشور)
(ذرا یہ "ساغر امرت" ملاحظہ ہو)	
زلزلے جنتی رہے گی تابہ کے بوڑھی زمیں	(سورج کی آواز)
ابھی زمین کو جننا ہے زلزلے، سیلاب	(صبح نشور)

میری نظم "طوفان" کا ایک مصرع ہے :۔

کربلا انداز ہے پھر شور زار آب و گل

فضا صاحب کا ارشاد ہے :۔

دیک اُٹھے یہ سکوں زار آب و گل نہ شتاب

واہ رے شتاب !

اُن کی اس ستم ظریفی کی داد چارلی چپلن بھی نہیں دے سکتا کہ وہ "نگار" سے میرے اشعار کا چربہ کرتے ہیں اور "نگار" ہی میں شایع فرماتے ہیں

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔!

میں ان ساغر امرت صاحب سے حرف آخر کے طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آیندہ وہ مجھ پر مشق ناز نہ کریں ورنہ میں ایسی ترکیب اختیار کروں گا کہ اُنھیں پشیمان ہونا پڑے گا پھر قدر "شاعری" معلوم ہوگی !

آجکل کے نقاد

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

جب تنقید کی گرفت یا گرم بازاری زیادہ ہو جاتی ہے تو تصانیف بے جان نہیں تو نیم جان ضرور ہونے لگتی ہیں آجکل اُردو پر تنقید کا دورہ پڑ رہا ہے جہاں جائیے جس سے ملئے یا تو نقاد ہوگا یا نیتا۔ ایک ادب کا لاگو دوسرا آبرو کا! ہمارے نقاد کی سب سے بڑی اُلجھن یہ ہے کہ اُردو کے تمام لکھنے والے روس میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ایک ایک دو دو کر کے کیوں پیدا ہوئے، بیک وقت سارے کے سارے کیوں نہیں! اور اب جبکہ ان باتوں میں سے ایک بھی وقوع میں نہ آئی تو پھر یہ تمام شاعر اور ادیب عرض البلد ۴۸ پر کام کیوں نہیں آجاتے!

تعلیم دینے کے ہر زمانہ میں طریقے مروج رہے۔ پہلے تعلیم بذریعہ دراز دستی دیجاتی تھی۔ یہ زمانہ فاقہ مستی کا تھا۔ اس کے بعد تعلیم بذریعہ دست کاری ہوئی۔ یہ زمانہ تنگدستی کا تھا۔ اس کے بعد تعلیم بذریعہ چابکدستی ہونے لگی، یہ زمانہ چور بازاری کا تھا۔ آخر میں تعلیم بذریعہ زبان درازی دیجانے لگی اور یہ زمانہ آزادی کا ہے۔ موجودہ تنقید نگاری اس تعلیم کا نتیجہ ہے یا خود تعلیم اس تنقید کی پیداوار — کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے!

مذہب اپنے تاریک سے تاریک زمانہ میں بھی اس حد تک مضحکہ خیز یا بلائے جان نہ رہا ہوگا۔ جتنی تنقید آج بیسویں صدی کے وسط میں ہے۔ سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات یا قوت مردمی کے سلسلہ میں کوئی ایسا نظریہ دریافت نہ ہوا ہوگا جسے ہمارے نقادوں نے اُردو شاعری و ادب پر چسپاں نہ کیا ہو۔ جو نظریہ جتنے زیادہ فساد یا فضیحتے کا ہوگا، اتنی ہی شدت و شوق سے اُسے شعر و ادب پر چسپاں کرینگے جن انکشافات سے انسانوں کا تباہ کیا جانا آجکل بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہو، اُن سے شعر و ادب کو مسمار کرنے میں مضایقہ کیا!

ایک عرصہ سے دُنیا اضطراب و ہیجان میں مبتلا ہے۔ زندگی کی کشتی کچھ اس طرح ڈانوا ڈول ہے کہ ذہن و فکر کا توازن قایم نہیں رہا۔ ہر بد دلی بیزاری اور بد چلنی کا جواز سائنس فلسفہ یا سیاسیات کے نظریات میں مل جاتا ہے۔ لوگ سمجھنے بیٹھے ہیں کہ زندگی عبارت ہی ہے فسق و فساد سے۔ کچھ سمجھتے ہیں اور ایک حد تک صحیح سمجھتے ہیں کہ جس طرح شدید اشتعال یا مایوسی میں شدید جرائم کی سزا ہلکی یا معاف ہو جاتی ہے اسی طرح موجودہ بدحالی یا بدامنی میں شعر و ادب میں کیسی ہی بے راہ روی یا نالایقی کیوں نہ برتی جائے محاسبہ یا مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح کی حرکتوں کو سراہنے والے بھی کافی تعداد میں مل سکتے ہیں!

علوم اصول و نظریے دریافت کرتے ہیں، علوم ہی ان کی ردو بدل کرتے رہتے ہیں۔ علم کا کام ہی یہ ہے۔ تجربات و معلومات کے ذخیرہ میں اسی طرح اضافہ ہوتا آیا ہے لیکن کس نظریہ کو کہاں اور کب برسر کار لانا چاہئے اس طرف ہماری نظر کم جاتی ہے۔ فرائیڈ کا نظریہ اشتراکیت کے اصول آٹم بم کا انکشاف اپنی اپنی جگہ پر مسلم اور مبارک لیکن کسے کہاں اور کب کام میں لانا چاہئے یہ بھی کچھ کم اہم بات نہیں ہے

اگر شاعری اور انشا پردازی میں معنی محل مزاج اور موسیقی کے اعتبار سے مناسب الفاظ اور فقروں کا استعمال کیا جانا ضروری ہے یہی نہیں بلکہ کنایہ اور صراحت تک کی ناپ تول مقرر ہے تو پھر اور زیادہ ضروری ہے کہ زندگی جو سب سے بڑی شاعری اور انشا پردازی ہے

کے سلجھانے سنوارنے میں انتہائی احترام، احتیاط اور ایمانداری سے کام لیا جائے!

انسان پہلے عناصر کی دستبرد میں تھا جن سے بڑی حد تک سائنس نے اسے نجات دلائی۔ اب وہ سائنس کی دستبرد میں ہے بظاہر اس دستبرد سے بھی نجات پانے کی سبیل اسی کو کرنا پڑے گی۔ اسے سائنس کی انسانیت میں ڈھالنا پڑے گا۔ ادب کا رشتہ براہ راست انسانیت سے ہے اس لئے ادب اور سائنس میں توافق پیدا کرنا ہر ادیب اور سائنس داں کا فرض ہی نہیں فن بھی ہونا چاہئے!

نقاد کو یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ سائنس غیر شخصی ہوتی ہے اور شعر و ادب قطعاً شخصی و انفرادی۔ چنانچہ شعری صداقت اور سائنسی صداقت میں جو فرق ہے اس کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ حیوانی صداقت اور انسانی صداقت میں بھی فرق ہے ہمارے جنسی میلانات ایک حیوانی صداقت ہے۔ شرافت عفت وضعداری وغیرہ انسانی صداقتیں ہیں۔ فرائیڈ نے ایک حیوانی صداقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بالکل بجا کیا ہے، یہ نظریہ ایک طرح کی طبی تشخیص ہے اس نے ایک مرض کی طرف اشارہ کیا ہے "مبارک مرض" کر لیجئے۔ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس مرض سے ہم تمام انسانی فضیلتوں کو داغدار کرتے رہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو فرائیڈ کے نظریہ کی بنا پر لذت اٹھانے میں تامل نہ کریں گے لیکن مارکس کے نظریہ کے احترام میں کسی طرح کی سختی جھیلنے پر طیار نہ ہوں گے!

بڑا شاعر کسی نظام کا زائیدہ اور پروردہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود ایک نئے نظام کا مبلغ اور مبشر ہوتا ہے، میں شاعری کو نیشنلائز کرنے اور اس طرح شاعر کو حکومت کا آلۂ کار بنانے کی موافقت نہ کروں گا

میں اس کا قائل ہوں کہ شاعر کی ڈفلی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا!

اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ یا مخصوص عہد کا شاعر نہیں ہوتا۔ وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ اشتراکی نظام کا اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر ہوا وہ نظام آج سے ہزار برس پہلے تھا یا ہزار برس بعد آئے

حکومت شاعر کا آلۂ کار رہتی ہے شاعر حکومت کا آلۂ کار نہیں ہوتا۔ غالب حکومتوں نے مغلوب حکومتوں سے اپنی شرائط منوائی ہیں لیکن کوئی حکومت شاعر (یا) سے اپنی شرائط نہیں منوا پائی ہے۔ آج اگر اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اشتراکیت اپنی شرائط شاعر سے منوائے تو اسے شاعر جانیں تو میں یہی کہوں گا کہ اس قسم کی تحریک شاعری اور ادب کے منصب کے منافی ہے!

میرے ذہن میں اکثر یہ وسوسے گزرے ہیں کہ اردو تنقید کے جتنے نظرئے کتابوں میں اور نقاد بازاروں میں ہیں اردو میں اتنے شاعر اور لکھنے والے بھی ہیں یا نہیں یا آج کل جتنی دوائیں دریافت کی جا چکی ہیں اتنے امراض بھی دریافت کئے جا سکیں گے یا نہیں!

نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ شاعر اور ادیب نہیں ملتے تو یہ نقاد آپس ہی میں "مزاح المومنین" شروع کر دیتے ہیں

بعض نقاد ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جیسے گرہ باز کبوتر ہوتے ہیں، بیٹھے بیٹھے یک بیک چھتری سے اڑے فضا میں ایک آدھ چکر کاٹے دو چار گرہیں لگائیں اور پھر چھتری پر لوٹ آئے اور یا دخدا میں مصروف ہو گئے! کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دیکھ کر ہندوستان کی افسانوی بازی گری یاد آجاتی ہے یعنی رسی فضا میں پھینکی وہ کھڑی ہو گئی اس پہ چڑھ کر نظروں سے غائب تھوڑی دیر بعد پھر آموجود ہوئے!

اردو شعرا نے محبوب کے دہن اور کمر یا ہجر و وصال کی اقسام یا ترکیب استعمال پر اتنی موشگافی نہ کی ہوگی جتنی تنقید پر تنقید نگاروں نے حاشئے لکھے یا چڑھائے ہیں، بیدل اور مومن کی خیال بندی ان تنقیدی خیال بندیوں کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے

تنقید کی آجکل وہی گرم بازاری ہے جو آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے ادب لطیف یا ٹیگوریت کی تھی، جسے دیکھئے جہاں دیکھئے معاشقہ کی "تعلیم بالغاں" میں مصروف! ایک جملہ لکھا دس بارہ نقطے اس کے بعد ایک فقرہ پندرہ بیس نقطے پھر دو چار لفظ دو چار سکتے ایک آدھ جھٹکے بالآخر جاں بحق تسلیم! جیسے کوئی عاشق کسی دوسرے کے معشوق کو سکرات میں اپنی وصیت نامہ

کا مسودہ سنا رہا ہو!

ان تنقیدوں کو دیکھتے دیکھتے سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے مجھ پر وہی حالت طاری ہوتی ہے (جیگوند بواست آن) کسی اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ ایک صاحب گارڈ سے گفتگو کرنے لگے۔ گارڈ کے ایک دوست دور سے یہ سین دیکھ رہے تھے۔ دوست کی متغیر حالت دیکھ کر قریب پہونچے، گفتگو کرنے والے بزرگ جا چکے تھے، پوچھا خیریت تو ہے تم اس پاگل سے کیوں گفتگو کر رہے تھے گارڈ اس طرح چونکا جیسے اُس نے کوئی بڑی خوشی کی خبر سنی ہو لیکن یقین نہ آتا ہو، دوست نے بتایا کہ وہ شخص اس نواح کا معروف پاگل تھا اور معلوم نہیں کیوں اسٹیشن کی طرف آنکلا تھا۔ کئی بار پوچھنے اور تصدیق کرانے کے بعد کہ وہ شخص دراصل پاگل تھا، گارڈ نے بے اختیار ہو کر دوست کو گلے لگا لیا اور بولا دوست خدا تم کو جزائے خیر دے میں تو بڑے شدید خلجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں پاگل ہوں!

اُن تنقیدی مضامین کو پڑھ کر جو ہر روز کسی نہ کسی رسالہ یا اخبار میں نظر سے گزرتے ہیں مجھے ہمیشہ دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں پاگل تو نہیں ہوں! ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنی بد وقت ایک صاحب سے رجوع کی اُنھوں نے کچھ اس طرح باتیں کیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے دونوں پاگل ہو چکے تھے! (علیگڑھ میگزین اکبر نمبر)

نئی دُنیا کی پُرانی باتیں

شہر ورمونٹ میں کوئی عورت اتوار کو سیر گاہوں میں اس وقت تک نہیں جا سکتی، جب تک اس کا شوہر ۲ قدم پیچھے بندوق کندھے پر رکھے ساتھ نہ چل رہا ہو
یہ قانون اس زمانہ کی یادگار ہے جب یہاں کے سرخ باشندے سفید فام عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے

نیویارک میں کسی مرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے یا کسی اور کے عریاں بچہ کو کپڑے پہنائے ۔ یہ قانون اُس زمانہ کی یادگار ہے جب مردوں نے یہ احتجاج کیا تھا کہ عورتیں انھیں بچوں کو کپڑے پہنانے پر مجبور کرتی ہیں

شہر کولمبوس میں کسی بلی کو ۹ بجے رات کے بعد بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی بلی ایسی نظر آتی ہے تو پولیس اسے پکڑ کر بند کر دیتی ہے

شہر کیوست میں شام کو جس وقت گھڑی ۶ بجاتی ہے تو سب گھر والے احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں

رومفورڈ میں پارکوں کی بنچوں پر داڑھی، مونچھ یا سر کے بال چھوڑ جانا سخت ممنوع ہے

شہر ڈفورڈ میں پیدل چلنے والوں کے سامنے کوئی بکری آ جائے تو فوراً پکڑ لی جاتی ہے

ڈیٹرائٹ میں اگر کسی شخص کا کتا کسی ڈاکیہ پر حملہ کرتا ہے تو محکمۂ ڈاک اس کے خطوط وغیرہ اس کے مکان تک پہونچانے سے باز رہتا ہے

شہر بلوم فیلڈ (نیوجرسی) میں وہ بچے جو کالی کھانسی میں مبتلا ہیں گھر سے باہر نہیں نکل سکتے اور اگر نکلیں گے بھی تو قانوناً ان کو ایک تختی اپنے گلے میں لٹکا کر باہر آنا پڑے گا جس پر جلی حروف میں لکھا ہوگا کہ "مجھے کالی کھانسی ہے"

ماساچوسٹس میں مردوں کے لئے اُن دوکانوں میں جانا ممنوع ہے جہاں عورتیں اپنی آرائش کے لئے جایا کرتی ہیں۔ اگر کوئی مرد یہاں جاتا ہے اور عورتوں کی طرح اپنے بال آراستہ کرتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے

غزل :- علی اختر حیدر آبادی

(۱)

ہر سانس کے ساتھ اک نشتر بھی سینے میں اُتارا جاتا ہے
جو تیری نظر پر چڑھتا ہے بیدرد! وہ مارا جاتا ہے

فریاد سُنے تو یا نہ سُنے اس پر تو کسی کا زور نہیں
یہ دیکھ تجھے کس عالم میں کس دل سے پکارا جاتا ہے

کشتی ہے کنارے پر جبکی طوفاں کی حقیقت کیا جانیں
اندازۂ طوفاں ہوتا ہے جب دور کنارا جاتا ہے

اب یاد بھی تیری آتی ہے، چٹکی میں دبائے اک نشتر
ہم جسکے جلائے جیتے تھے، لے! وہ بھی سہارا جاتا ہے

انداز یہی ہیں گر اُن کے تقدیر کے بل کھلنے سے رہے
آئینہ پہ نظریں رہتی ہیں زلفوں کو سنوارا جاتا ہے

ہر رات کے سو پہلو ہی نہیں، ہر پہلو میں اک بات بھی ہے
سمجھے تو کوئی کس کس جانب اِک اُنکا اشارا جاتا ہے

سینے پہ محبت میں اختر ناوک بھی گوارا ہوتے ہیں
بازی ہی یہ ایسی ہے جس کو خود جان کے ہارا جاتا ہے

(۲)

دل ڈوب رہا ہے میں خوش ہوں تکمیل محبت ہوتی ہے
یہ موت حیات سرمد ہے، اس دور میں راحت ہوتی ہے

سوچو تو چمن میں کانٹے بھی، ہوتے ہیں امینِ رازِ چمن،
سمجھو تو زبانِ عبرت پر دُنیا کی حقیقت ہوتی ہے

اظہار جفا بھی مشکل ہے، انکار وفا بھی مشکل ہے
اُن سے تو امید لطف کہاں، کہئے تو شکایت ہوتی ہے

بیمار پہ کس کا دل نہ کُڑھا، اک آپ مگر ہنستے ہی رہے
ایسے بھی ہیں انساں دُنیا میں، ایسی بھی طبیعت ہوتی ہے

یہ سحر تمنا تھا یا رب! یا کھیل نگاہِ ساقی کا
ہر رندِ تہی ساغر سمجھا، اب مجھ پہ عنایت ہوتی ہے

کل جنمیں چھیڑے تھے ساز طرب، مئے جھوم رہی تھی مینا میں
اُن ہوش ربا میخانوں کو اب دیکھ کے عبرت ہوتی ہے

الزام جفا کس نے رکھا، اب رہنے بھی دیجے یہ قصہ
کرتے ہیں وفا کا ذکر تو آپ اور مجھ کو ندامت ہوتی ہے

آنسو جو نکلتے ہیں دل سے پلکوں پہ ستارے بنتے ہیں
کچھ کھیل نہیں ہے منزلِ غم، ملتی ہے جو قسمت ہوتی ہے

دل واقفِ رازِ غم ہو اگر فردوس ہے دُنیا بھی اختر
شعلے میں چراغ محفل کے، پروانوں کی جنت ہوتی ہے

جگناتھ آزاد :-

کبھی بلندیِ ذوقِ نظر تک آ پہونچی، کبھی حیاتِ غمِ بال و پر تک آ پہونچی
فغاں کہ ل کے بھی ہم تم اسے نہ روک سکے، شبِ وصال حدودِ سحر تک آ پہونچی،
نظر سے بڑھ کے زباں تک کہیں نہ آ جائے جہانِ دل کی کہانی نظر تک آ پہونچی
ابھی تو دل میں ہے خوابیدہ حسرتِ پرواز یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آ پہونچی
نظر کی بات تو کچھ آمد ہے مگر کیوں کر تری شبیہ دلِ بے خبر تک آ پہونچی

بھٹک رہی ہے ابھی تک تو آرزو دل کی
اگر کبھی یہ تری رہگذر تک آ پہونچی

عہدِ نو

(خطیبۂ ہند سیدہ اختر)

کل بھی تھیں جو ہستیں مجروحِ اوہام و گماں ! کشتۂ ابہام ہے دُنیائے انساں آج بھی !
کل بھی تھا چشمِ بصیرت پر حجابِ اقتدار ! حریت کی روح ہے مرہونِ زنداں آج بھی !
کل بھی اظہارِ صداقت جرم تھا اس دہر میں! کلمۂ اعلائے حق ہے وجہ عصیاں آج بھی !
کل بھی تھے جوشِ انا کے واسطے دار و رسن ! اہلِ حق کے واسطے ہے تیغِ براں آج بھی !
کل بھی تھا بدنام نظارہ ہر اک اہلِ نظر! جذبۂ دیدار ہے مجروحِ دوراں آج بھی !
کل بھی تھی سرمایہ داری اک بلائے زندگی ! خوگرِ آلام ہیں مزدور و دہقاں آج بھی !
فرقِ ظالم پر درخشاں کل بھی تھا تاجِ غرور ! جلوۂ فرعونیت ہے مست و رقصاں آج بھی !
کل بھی تھا پیرِ مغاں کو اپنے میخانے پہ ناز ! تمکنت کے ساتھ ہے پیرِ خمستاں آج بھی !
سینۂ گیتی سے کل بھی اُٹھ رہا تھا اک دھواں ذرہ ہائے دہر میں شعلہ بداماں آج بھی !
کل بھی تھیں سورج کی کرنیں مرگِ شبنم کا پیام لٹتی جاتی ہے متاعِ شبنمستاں آج بھی !

بھول بیٹھا آج کا انسان اگلا طرز و طور
اللہ اللہ خوب آیا ہے یہ عہدِ نو کا دور

مطبوعات موصولہ

دیوان فانی گورکھپوری گورکھپور کا سبزپوش خاندان تصوف کا بہت مشہور خانوادہ ہے اور اس مجموعہ میں اسی خاندان کے مشہور بزرگ سید شاہ شاہد علی سبزپوش کی غزلوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب موصوف خلیفہ ہیں مولانا شاہ آسی مرحوم کے جو نہایت مشہور و مقبول غزل گو شاعر بھی تھے، اور غالباً شاعری کا ذوق بھی ان کو اپنے پیر و مرشد ہی کی صحبت و محبت میں پیدا ہوا ہوگا، جو بعد کو ریاض اور وسیم کے قیام گورکھپور کی وجہ سے اور زیادہ شدید ہو گیا ہوگا

ابتداء میں جناب وسیم کے صاحبزادے انیم خیرآبادی نے ایک مفصل مقدمہ کے ذریعہ سے صاحب دیوان کے تمام حالات و سوانح اور ان کے شاعرانہ ذوق پر روشنی ڈالی ہے

کلام صاف و سلیس ہے اور دبستان لکھنؤ کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب ریاض و امیر کا طوطی بول رہا تھا اور اس اب میں وہ اپنے پیر و مرشد آسی مرحوم سے بالکل علحدہ نظر آتے ہیں

طباعت و کتابت معمولی قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات

خوابوں کے ویرانے جناب مسعود جاوید کے دس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہمارا سماج ان مظالم کی طرف سے کس قدر بے پرواہ ہے جو ارادی و غیر ارادی طور پر اس کی طرف سے روز دنیا میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس نظریہ کے پیش نظر اور لوگوں نے بھی فسانے لکھے ہیں، لیکن شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادب انشا کی دلکشی و بلندی کے لحاظ سے مشکل ہی سے کوئی دوسرا شخص جناب مسعود جاوید کا ہمسر ہو سکتا ہے

موجودہ عہد کا ادب لطیف خواہ کتنا ہی مفید و کارآمد کیوں نہ ہو، لیکن اس میں کلاسکل بننے کی اہلیت نہیں پائی جاتی مسعود جاوید کی انشا میں یہ اہلیت بہ وجہ احسن پائی جاتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آج نہیں تو کل اس حقیقت کو محسوس کیا جائے گا

یہ مجموعہ مکتبۂ دانش مزنگ لاہور نے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپے

چاندنی کے سائے یہ مجموعہ بھی جناب مسعود جاوید کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ صرف ان ادبی و افسانوی خطوط کے لئے وقف ہے جن کی وساطت سے فاضل مصنف نے زندگی کی بہت سی گتھیوں کو سلجھایا ہے اور نفسیات کے بڑے بڑے مشکل مسایل پر نہایت شگفتہ انداز میں بحث کی ہے۔ ادب و انشا کی وہ خصوصیت جو ان کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ان خطوط میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے

دوسرے حصہ میں چند ایسے افسانے ہیں جو انگریزی کا ترجمہ ہیں، پہلا افسانہ "اعادہ" ٹیگور کے ایک افسانہ کا ترجمہ ہے اور اس قدر کامیاب ترجمہ ہے کہ مشکل ہی سے اسے ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ بھی مکتبۂ دانش مزنگ نے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

یونانی دواسازی تالیف ہے جناب حکیم حاجی محمد یوسف صاحب حضروی کی جس میں پہلے انھوں نے طبی نقطۂ نظر سے دواسازی کے اصول کو پیش کیا ہے اور پھر عرقیات، سفوف، روغنیات، حبوب، شربت اور معجون وغیرہ طیار کرنے کے صحیح طریقے بتائے ہیں۔ کتاب چونکہ ایک ماہر فن کی لکھی ہوئی ہے اس لئے اسے مفید ہونا ہی چاہئے۔ قیمت دو روپیہ چار آنے ضخامت ۱۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ: خضروی دواخانہ ٹرسٹ۔ موتی مسجد، بندر روڈ کراچی

گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں

یہ کتاب مہاتما گاندھی مرحوم کے سکریٹری پیارے لال کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ہے

بادشاہ خاں اور خدائی خدمتگار یہ دونوں ایسے لفظ ہیں جو نہ ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ ان کو نظر انداز کرکے اس بات کا پتہ چل سکتا ہے کہ صوبۂ سرحد ایسے خطہ میں گاندھی جی کی تعلیم اہنسا کیوں مقبول ہوئی

بادشاہ خاں سرحدی گاندھی مشہور ہیں، لیکن لوگ انھیں ایسا کیوں کہتے ہیں اس کی صحیح وجہ اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب گاندھی جی کے سفر سرحد کا غایر مطالعہ کیا جائے

اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ مہاتما گاندھی کے دورۂ سرحد کا حال درج کیا ہے اور اس قدر دلکش انداز میں کہ فسانہ سے زیادہ دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے

ترجمہ کی خوبی کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ وہ ڈاکٹر عابد حسین کا کیا ہوا ہے متعدد تصاویر نے کتاب کو اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

کتابت، طباعت، کاغذ سب پسندیدہ ہے۔ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے، حجم ۲۵۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

ناشر:۔ مکتبۂ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

ہمارا راج

یہ کتاب مدن موہن گپت صاحب نے بچوں کے لئے بہت آسان زبان میں لکھی ہے، پہلے باب میں حکومت کے بڑے بڑے اصول، آزادی و مساوات کے حقوق اور مذہبی آزادی پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں انتخاب صدر کی پوزیشن، وزراء کونسل کی حیثیت اور قانون سازی سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے سیاسی نقشہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے

کتابت و طباعت بہت روشن ہے۔ قیمت ۱۰ر۔ ناشر مکتبۂ جامعہ۔ جامعہ نگر دہلی

پرانے خدا

مجموعہ ہے کرشن چندر کے دس افسانوں کا، جن میں پہلے افسانے کا عنوان "پرانے خدا" ہے۔ ابتدا میں عزیز احمد صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں کرشن چندر کی فسانہ نگاری پر عموماً اور اس مجموعہ کے افسانوں پر خصوصاً تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے

کرشن چندر ملک کے نہایت ممتاز فسانہ نگار ہیں اور دورِ جدید کے افسانہ نگاروں میں وہ گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں فکر و نظر کا ایک خاص ٹھہراؤ پایا جاتا ہے اور جو رومان کے مخصوص رنگ کے ساتھ مل کر بہت دلچسپ چیز نظر آتا ہے

اس مجموعہ کا یہ دوسرا اڈیشن ہے جسے مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر دہلی نے شایع کیا ہے

اسلام کے معاشی نظریے

تصنیف ہے ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب ام۔ اے کی جو جامعہ عثمانیہ میں کلچر و مذہب کے پروفیسر ہیں۔ اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ایام جاہلیت کے معاشی و معاشرتی نظام کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرا باب اسلام اور دیگر مذاہب کے معاشی اصول کا تقابلی مطالعہ ہے، تیسرے باب میں پیدائش دولت، تجارت، صنعت و حرفت، وسایل محنت، فراہمی روزگار کے مسایل پر اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے، چوتھا باب تقسیم دولت سے متعلق ہے، جس میں وراثت، تقسیم اراضی، لگان، معدنیات جاگیرات و عطیات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

ی جلد میں مسئلۂ اُجرت، سود، تقسیم منافع، حکومت کی آمدنی کی تقسیم، مبادلۂ زر، صرف دولت، زکوٰۃ، جزیہ اور قرض وغیرہ پر بالتفصیل خیال کیا گیا ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے جس قدر اہم ہے، اسی قدر یہ مکمل و جامع بھی ہے، معاشیات و معیشت، سیاست و نظم و نسق حکومت کا پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلامی نقطۂ نظر سے پیش نہ کیا گیا ہو اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے سیاسی و معاشی حیثیت سے دل اب سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر وضع کئے تھے، وہ آج بھی کم اہم نہیں ہیں۔

اس موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک تصنیف اس سے قبل شایع ہو چکی ہے، لیکن زیر نظر تصنیف میں اس سے زیادہ تفصیلاً م لیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے اس کی تصنیف میں جس محنت و کاوش اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے وہ معمولی دل و دماغ کا کام نہ تھا۔ اخیر میں ۳۶ صفحات کا اشاریہ یا انڈکس نے اس کتاب کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے، مصنف نے اخیر میں تب کی جو فہرست دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مختلف زبانوں کی تقریباً ۱۹۰ کتابوں کا مطالعہ کرکے اس کتاب کو تصنیف کیا ہے دونوں جلدوں کی ضخامت ۱۰۰۰ صفحات سے زیادہ ہے اور متوسط تقطیع پر نہایت عمدہ کاغذ اور طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع ہے۔ قیمت دس روپے آٹھ آنے (عـ۸) ہے جو کسی طرح زاید نہیں کہی جا سکتی۔

ستان کیفی مجموعہ ہے منشی چندر بھان کیفی مرحوم کی نظموں اور غزلوں کا جسے ان کے نواسہ گن بیر کشور ماتھر نے شایع کیا ہے۔ کیفی مرحوم، راسخ کے شاگرد تھے اور اس عہد میں شاعری کا جو رنگ رائج تھا اس کے وہ کامیاب شاعر تھے۔ ی صفائی، محاوروں کا صحیح استعمال، عہد وسطیٰ کی غزل گوئی کی بے تکلف ٹکنک، اور معروف و مانوس خیالات جو اس عہد لہو کی خصوصیات تھیں ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ شعراء کی خصوصیات تھیں ان کے بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اقتضائے وقت سے بے خبر نہ تھے اور اس سلسلہ میں بعض نظمیں بہت پاکیزہ ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو مسلم سے ہوئے کلچر کے بڑے حامی تھے۔ ایک نہایت ہی مختصر مثنوی ں نے جنگ حبش و اطالیہ پر لکھی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ مثنوی نگاری کو اپنا فن بنا لیتے تو بہت زیادہ ب ہوتے۔ طباعت و کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ: مکتبۂ شاہی ہند دہلی

ت و آہ مجموعہ ہے جگدیش بھٹناگر حیات بی اے کی غزلوں کا جو بیاض کی صورت میں ۴۸ صفحات پر شایع ہوا ہے۔ جناب حیات میں اردو ادب اور شاعری کا شوق وراثتاً منتقل ہوا ہے۔ ان کے پردادا رائے ہر سکھ رائے اخبار کوہ نور کے تھے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے لاہور میں شایع ہوتا تھا اور جس سے منشی نولکشور بھی وابستہ تھے اور مرزا ہرگوپال تفتہ بھی انکے ددھیالی ار تھے۔ انھیں خاندانی روایات کا اثر ہے کہ جناب حیات کے کلام میں ہم کو زبان و بیان کے لب و لہجہ، اور فارسی تراکیب کے استعمال اظ سے بڑی صفائی اور استواری نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

دل ایک روز ہو کے رہے گا جنوں طراز — شایستۂ مذاقِ تمنا اگر ہوا
بڑھ گئے خود ہی قدم دیر و حرم کے آگے — جادۂ شوق میں حایل حدِ منزل نہ ہوئی

م کی ترکیبیں ان کے کلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور جس روانی و سلاست کے ساتھ انھیں استعمال کیا گیا ہے اس سے پتہ ہے کہ حیات، مومن کے رنگ سے زیادہ متاثر ہیں۔ جناب حیات کی غزلگوئی میں قنوطی رنگ زیادہ جھلکتا ہے، جس کا سبب خود انھیں ن سے سنئے:۔ اتنا فطرت میں رچ گیا ہے غم — کہ مجھے خود بھی کچھ نہیں احساس

ہمیں امید ہے کہ جناب حیات کی یہ بیاض تغزل کا صحیح ذوق رکھنے والے حلقہ میں قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ : آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس
کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک میں اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کیلئے اکسیر صفت، جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اسکو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اسکے استعمال سے اٹھتے بیٹھتے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہو گی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دیگی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اسکے استعمال سے بفضل خدا مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۴۲ خوراک چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ مفت منگایئے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔
میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمایئے۔

پتہ :- **حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام**
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

من ویزداں جلد اول

کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اب یہ دس روپے میں ملے گی۔ من ویزداں جلد دوم کے ساتھ طلب کرنے پر دونوں پندرہ روپے میں علاوہ محصول مل سکیں گی۔

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۰ — شمار ۳

فہرست مضامین ستمبر ۸۱ء

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

حسرت نمبر ہوگا

"نگار" کے سالانہ چندہ میں اضافہ

یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ آیندہ سالنامہ حسرت نمبر ہوگا لیکن فی الحال یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کس نوعیت کا ہوگا ظاہر ہے کہ اس میں حسرت کے حالاتِ زندگی ان کی شاعری پر تبصرہ، ان کے کلام کا انتخاب ہونا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کیا ہوگا، اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ عہد حاضر کے تمام اہل نقد و ادب کے مضامین حاصل کئے جائیں اور ان کے کلام کا ایسا انتخاب پیش کیا جائے جس سے حسرت کی غزل گوئی کی انفرادیت پوری طرح واضح ہو سکے۔

سالنامہ کے حجم کے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ کاغذ کی گرانی و کمیابی کا خیال ہماری راہ میں حائل ہوگا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ:

سالنامہ حاصل کرنے والوں کو نگار کا چندہ آٹھ روپیہ ادا کرنا پڑے گا اور جن حضرات کا چندہ دسمبر ۸۱ء میں ختم نہیں ہوتا۔ سالنامہ ان کے نام بھی دو روپیہ چھ آنے میں بذریعہ وی۔ پی روانہ کیا جائے گا۔

جن صاحب کو دو روپیہ کا اضافہ منظور نہ ہو اور سالنامہ حاصل نہ کرنا چاہیں، وہ ازراہ کرم مطلع فرما دیں

پاکستان کے خریدار تمام رقوم ذیل کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی۔ ۲۲۲۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی

ملاحظات

پاکستان کا نعرۂ جہاد

اسلام کی مذہبی اصطلاحات میں سب سے زیادہ گمراہ کن چیز آجکل اصطلاح جہاد ہے، جس کا نام سنتے ہی جنگ، حرب، قتل و خونریزی کا مفہوم ذہن انسانی کے سامنے آجاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس غلط فہمی کا شکار صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ خود مسلمان بھی ہیں اور انھیں خبر نہیں کہ اس غلط فہمی سے ان کو کتنا نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے

لفظ جہاد کا مادہ جہد ہے جس کے لغوی معنی سعی و کوشش کے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ بہت وسیع المعنی لفظ ہے اس لئے اسلام نے اس کے مراتب واضح مقرر کرکے صحیح معنی میں اس کو ایک ایسے تمدنی اصول کی حیثیت دیدی ہے جس میں جد و جہد (Struggle) کا مفہوم تو اپنی پوری وسعت کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن مسابقت (Competition) سے اس کا کوئی تعلق نہیں (جو تمدن جدید کی بدترین لعنت ہے) تعلیمات اسلام شاہد ہیں کہ اس کا مقصود دنیاوی جاہ و ثروت کا حصول کبھی نہیں رہا بلکہ اس نے صرف تزکیۂ نفس، بلندی اخلاق اور علوئے کردار پر زور دیا ہے اور اسی کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے خواہ وہ دنیاوی ہو یا اخروی یا دونوں، اسی لئے جہاد یا سعی و عمل کے سلسلہ میں اسلام کی اولین ہدایت یہ ہے کہ اس کی ابتدا احتساب نفس سے ہونا چاہئے، جس کا دوسرا نام جہاد بالنفس ہے، یعنی سب سے پہلا جہاد وہ ہے جو خود اپنی ذات سے شروع ہونا چاہئے، اس کے بعد جہاد بالمال ہے یعنی اگر اپنے یا قوم کے اخلاق درست کرنے کے لئے مال صرف کرنے کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے، الغرض جہاد سے مراد جذبۂ ایثار و قربانی ہے حق و صداقت کی حمایت کے لئے، اخلاق و روحانیت کی ترویج کے لئے اور اسی کا دوسرا نام دینی یا مذہبی جہاد ہے

اس میں شک نہیں کہ اس جہاد میں جان کی قربانی اور حرب و قتال بھی شامل ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جہاد کے ابتدائی مراحل طے کئے بغیر جن کا تعلق انفرادی و اجتماعی دونوں طرح تزکیۂ نفس و اصلاح کردار سے ہے جنگ کی منزل تک پہونچنا ممکن ہے؟ اور اگر ان ابتدائی منازل کو ترک کرکے دفعتاً حرب و قتال کی راہ اختیار کی جائے تو کیا وہ مفید و نتیجہ خیز ہو سکتی ہے

یہ ہے وہ اصولی چیز جس کی روشنی میں پاکستان کے نعرۂ جہاد پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے قیام کو چار سال کا زمانہ گزر گیا اور اس دوران میں ہمیشہ یہی کہا گیا کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے اور اسلامی اصول ہی پر اس کی بنیاد قایم کی جائے گی۔ لیکن وہ اسلامی اصول کیا ہیں ان کی صراحت اس وقت تک نہیں ہوئی کیونکہ بدقسمتی سے ابھی تک وہاں کا کانسٹی ٹیوشن ہی مرتب نہیں ہو سکا ہے، لیکن جس حد تک ہمیں وہاں کے حالات کا علم حاصل ہے، ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کی عام و خاص کسی جماعت میں وہ صحیح اسلامی احساس ابتک پیدا نہیں ہوا ہے، جس کی ابتداء جہاد بالنفس، تزکیۂ اخلاق، علوئے کردار اور احتساب ذات سے ہوتی ہے۔ یہ احساس وہاں نہ انفرادی حیثیت سے کہیں پایا جاتا ہے نہ اجتماعی حیثیت سے، رہا آئین حکومت سو اس کا ذکر ہی فضول ہے کیونکہ وہ اس وقت تک ان محرمات شرعی اور ان مشاغل لہو و لعب کا بھی انسداد نہیں کر سکا، جو اسلام کی سنجیدہ و متین تعلیم کے یکسر منافی ہیں اور وہ اپنے دستور کار میں کوئی تبدیلی ایسی پیدا نہیں کر سکا کہ ہم اسے چند سال قبل کی افرنگی حکومت سے ممیز کر سکیں

الغرض جس حد تک صحیح داعیاتِ اسلام کا تعلق ہے، پاکستان کا نعرۂ جہاد (اگر واقعی اس سے مراد حرب و قتال ہے) بے محل سی بات ہے اور جب تک وہاں کی آبادی جہاد بالنفس اور احتساب نفس کی منزل سے گزر کر اپنے اخلاق میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ کرے، اس کو جہاد بالسیف کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے کیونکہ دوسروں کو فتح کرنے سے پہلے اپنے نفس کو فتح کرنا ضروری ہے

یہ تو ہوئی دینی و مذہبی حیثیت اس مسئلہ کی، اب آئیے دنیاوی مصالح و تدابیر کے نقطۂ نظر سے اس پر غور کریں۔ پاکستان کے نعرۂ جہاد کا مقصود اگر ساری دنیا سے کفر کی بیخ و بن اکھاڑ پھینکنا نہ ہو (جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے) بلکہ صرف سرزمین کشمیر ہی سے تعلق رکھتا ہو تو بھی اس کی نامناسبت بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ پاکستان اگر کشمیر کے لئے جنگ کرنا چاہتا ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو وہ مدافعت کرے گا یا جارحانہ قدم اٹھائے گا۔ مدافعت کا سوال تو اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہندوستان اس پر حملہ کرنے سے رہا، رہا جارحانہ اقدام سو اس کے عواقب پر ہم سے زیادہ پاکستان کو نظر رہنا چاہئے

کھلی ہوئی بات ہے کہ جس حد تک دولت، آبادی، فوج، اسلحہ اور ذرائع جنگ کا تعلق ہے، ہندوستان و پاکستان میں کوئی نسبت نہیں اور اگر ان دونوں ملکوں کو ان کے موجودہ حال پر برقرار رکھتے ہوئے لڑنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو جو نتیجہ ہو سکتا ہے، وہ پاکستان سے بھی پوشیدہ نہیں، اس لئے اگر باوجود اس تلخ حقیقت کے پاکستان نعرۂ جہاد بلند کرتا ہے اور اس نعرہ سے اس کی مراد کشمیر یا ہندوستان پر حملہ کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو اپنے سوا کسی اور پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ پھر یہ بھروسہ خدا کا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ خدا اور مسلمان کے درمیان یہ رسم عرصہ ہوا اٹھ چکی ہے، یقیناً خدا کے سوا کسی دوسرے کا بھروسہ ہوگا اور وہ دوسرا یا تو برطانیہ و امریکہ ہو سکتا ہے یا دوسری مسلم حکومتیں۔ سو آیئے سب سے پہلے مسلم حکومتوں پر اک نگاہ ڈال لیں۔ افغانستان و پاکستان کے تعلقات پہلے ہی سے خراب ہیں اس لئے اس سے مدد کی توقع تو درکنار، ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں وہ کس وقت موقع محل دیکھ کر خود پاکستان پر حملہ کردے اور اس کے لئے اس سے بہتر دوسرا موقع کون سا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں جنگ چھڑ جائے۔ ایران پٹرول کی نزاع کے سلسلہ میں اسوقت جس نازک دور سے گزر رہا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ رہ گئے عراق، حجاز و مصر وغیرہ سو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ فوج، اسلحہ یا روپیہ سے پاکستان کی مدد کریں گے خیالِ خام ہے، کیونکہ آجکل خود انکو اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل ہے۔ ترکی کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس کی پالیسی میں نعرۂ اسلام کا کوئی سوال ہی نہیں۔ وہ ہر مسئلہ کو قومی (ترکی) نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے۔ اس لئے اگر پاکستان جنگ کی ہمت کرسکتا ہے تو صرف برطانیہ و امریکہ کے بھروسہ پر اور یہ رشتۂ اعتماد جتنا نازک، بودا اور خطرناک ہے اس کا اظہار تحصیلِ حاصل ہے

کھلی ہوئی بات ہے کہ برطانیہ و امریکہ کو اگر پاکستان سے ہمدردی ہو سکتی ہے تو اس لئے نہیں کہ انھیں اسلام یا مسلمانوں کا بڑا خیال ہے بلکہ صرف اس بناء پر کہ اس طرح وہ اپنے سیاسی اغراض پورے کرسکتے ہیں اور وہ غرض صرف یہ ہے کہ اگر کسی وقت روس سے لڑائی چھڑ جائے جس کا ہر وقت امکان ہے تو وہ پاکستان کی سرزمین اور اس کے سمندر میں اپنی بری، بحری و فضائی قوت کے مرکز قایم کرسکیں۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ پاکستان سے اس قسم کا خفیہ معاہدہ ہو بھی چکا ہے لیکن اگر یہ غلط ہو تو بھی آخر کار نتیجہ یہی نکلے گا اور پاکستان کو بغیر چون و چرا امریکن بلاک کے یہ مطالبات پورے کرنا پڑیں گے ۔۔۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا حرج ہے۔ جب پاکستان تیسری عالمگیر جنگ میں امریکن بلاک کا ساتھ دینا طے کر چکا ہے تو ابھی سے یہ وعدہ کر لینا کہ ضرورت کے وقت وہ امریکن بلاک کو اپنے یہاں فوجی مرکز بنانے کی اجازت دیدیگا، کیا برا ہے جبکہ اس طرح کشمیر کے حصول میں (خواہ وہ یو، ان، او کی وساطت سے ہو یا جنگ کے ذریعہ سے) اس کو آسانی ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہ منطق صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں دو بہت بڑے مغالطے شامل ہیں۔ ایک یہ کہ امریکن بلاک کی طرف سے جو امداد پاکستان کو ملے گی اس کی نوعیت کیا ہوگی اور دوسرے یہ کہ کیا اس مدد کے بعد بھی پاکستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ بصورتِ جنگ، امریکن بلاک اپنی فوجیں تو پاکستان بھیجے گا نہیں کیونکہ اس صورت میں ہندوستان اپنے آپ کو کمیونسٹ بلاک میں شامل کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو جائیگی جس سے امریکن بلاک فی الحال بچنا چاہتا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ وہ یہ کرے گا کہ سامانِ جنگ دیتا رہے، لیکن محض اس قدر مدد سے پاکستان یہ لڑائی نہ جیت سکے گا، کیونکہ صرف ذخایر حرب کی فراہمی سے کچھ نہیں ہوتا جب تک سپاہ کی تعداد کافی نہ ہو، ذرایع نقل و حمل وافر نہ ہوں، اسلحہ سازی کے کارخانے خود ملک کے اندر نہ پائے جائیں، کوئلہ و پٹرول کے ذخایر موجود نہ ہوں اور پاکستان میں ان تمام باتوں کی کمی ہے۔ بصورتِ جنگ یہ ناممکن ہے کہ لڑائی صرف ایک ہی محاذ (کشمیر) میں محدود رہے، پاکستان کو کم از کم چار محاذ پر یکساں قوت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا، ایک کشمیر، دوسرا پنجاب، تیسرا مشرقی بنگال اور چوتھا سرحد راجستھان، اور اگر اسی زمانہ میں افغانستان نے پاکستان پر فوج کشی کردی یا قبایل کو بھڑکا کر فساد پر آمادہ کردیا جس کا قوی اندیشہ ہے تو ایک پانچواں محاذ اور بڑھ گیا اور ان پانچوں محاذ پر یکساں قوت کے ساتھ وہ کبھی جنگ نہیں کرسکتا۔ مشرقی بنگال اس قدر دور واقع ہے اور درمیان میں ہندوستان کا اتنا بڑا علاقہ حایل ہے کہ وہ آسانی سے وہاں کمک پہونچا ہی نہیں سکتا۔ تقریباً یہی حال راجستھان کے محاذ کا ہے کیونکہ یہ سیکڑوں میل کا میدانی محاذ ہے اور وہاں ہندوستانی فوجوں کو آگے بڑھنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ اب رہ گئے دو محاذ کشمیر اور پنجاب کے سو ان میں سے وہ کسی ایک محاذ پر اپنا مورچہ سنبھال سکتا ہے دونوں پر نہیں اور اگر ہم تسلیم کر لیں کہ وہ کشمیر یا پنجاب میں کسی ایک جگہ ہندوستان کی فوجوں کو پسپا کرسکتا ہے تو بھی اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ باقی تمام محاذوں پر اسکو دشمن کی فوجوں کیلئے جگہ چھوڑنی پڑیگی۔

ہوائی حملوں سے پاکستان و ہندوستان دونوں جگہ کے تمام بڑے بڑے شہر کھلے ہوئے غیر محفوظ ہیں، لیکن چونکہ پاکستان کو بہ مقابلہ ہندوستان کے زیادہ شہروں پر بمباری کرنی ہوگی اس لئے اس کو زیادہ فضائی قوت صرف کرنا پڑے گی اور ہندوستان اس سے نصف قوت میں کراچی، لاہور، پشاور و راولپنڈی

اور ڈھاکہ پر بمباری کر سکے گا

الغرض جس حد تک دونوں ملکوں کے فوجی و اقتصادی توازن کا تعلق ہے، بظاہر پاکستان کا پلہ ہلکا نظر آتا ہے، رہ گئے جذبات سو ممکن ہے پاکستان اس لحاظ سے زیادہ بڑھا ہوا ہو، لیکن جذبات کی بنا پر قربانیاں پیش کی جا سکتی ہیں، جانیں دی جا سکتی ہیں، جنگ نہیں جیتی جا سکتی، اس کے لئے حقائق کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے اور حقیقتوں کو جذبات سے کبھی نہیں مٹایا جا سکتا

اس سلسلہ میں گفتگو کا ایک اور پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ دو تین ہفتہ لڑائی جاری رہنے کے بعد سکیورٹی کونسل وہی قدم یہاں بھی اٹھائے گی جو اس نے کوریا میں اٹھایا ہے، لیکن اگر پاکستان نے یہ خیال قایم کیا ہے تو اس کی غلط فہمی ہے اور اگر اس کو اس بات کا یقین دلایا گیا ہے تو یکسر مکر و فریب ہے۔ کیونکہ اول تو ہندوستان کبھی کوئی جارحانہ اقدام کرے گا نہیں جس کی بنا پر اسے حملہ آور قرار دے کر سکیورٹی کونسل کو اس کے خلاف قدم اٹھانے کا بہانہ ہاتھ آئے (خاص کر ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان خود پاکستان کو کشمیر میں حملہ آور کہہ چکا ہے اور کوریا میں امریکہ کی ناکامی سب پر واضح ہو چکی ہے) اور اگر امریکن بلاک نے کسی نہ کسی پہلو سے سکیورٹی کونسل میں اس مسئلہ کو اٹھایا بھی تو کثرت رائے اس کے خلاف ہوگی، اقوام عالم کبھی اس بات پر راضی نہ ہوں گی کہ ہندوستان کے خلاف قدم اٹھا کر دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ میں مبتلا کیا جائے

بعض کا خیال ہے کہ پاکستان کا نعرۂ جہاد صرف اس کی دھونس ([illegible]) ہے یا پھر یہ کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے یہ سب کچھ اسلئے کیا ہے کہ ان کے خلاف جو پارٹیاں وہاں قایم ہو رہی ہیں ان کے خیال کو اندرونی سیاست سے ہٹا کر بیرونی سیاست کی طرف مبذول کر دیا جائے اور حکومت ان اندرونی خطروں سے محفوظ ہو جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ ان دونوں کا ردِ عمل بہت خراب ہوگا اور جہاد کی تمنا پوری نہ ہونے کے بعد خود حکومت کو پبلک کے جوش کا ہدف بننا پڑے گا اور نوابزادہ لیاقت علی خاں کی پوزیشن اور زیادہ نازک ہو جائے گی

بہرحال پاکستان کا نعرۂ جہاد عقل و مذہب تدبر و سیاست کسی نقطۂ نظر سے بھی قابل تحسین نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ اس سلسلہ میں جو مقالے اور نظمیں وہاں کے بعض اخباروں نے شایع کئے ہیں یا جو جو تقریریں وہاں کے بعض ذمہ دار حضرات نے کی ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ افسوسناک ہیں بلکہ پاکستان کے احساس کمتری کو بھی ظاہر کرتی ہیں

دوستی کی طرح لڑائی کی بھی ایک تہذیب ہوتی ہے اور کسی قوم کا اس تہذیب سے ہٹکر صرف مکا، گھونسہ، یا گالی گلوچ پر اتر آنا سنجیدگی و متانت کے خلاف ہے۔ لڑائی سے زیادہ سنجیدہ حقیقت کوئی نہیں اور جو قومیں اس میں چھچھورے پن سے کام لیتی ہیں وہ اگر کامیاب بھی ہو جائیں تو انھیں کبھی احترام و عزت کے ساتھ نہیں دیکھا جاتا۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ "جنگ کی حالت میں بھی اپنے دشمن کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ اگر کل وہ تمہارا دوست ہو جائے تو تمھیں اس سے شرمندہ نہ ہونا پڑے" اور یہاں تو ابھی جنگ بھی شروع نہیں ہوئی

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہی مسلمان جس کو اقبال نے عقاب و شاہین بننے کی تعلیم دی تھی آج "زاغ و زغن" کی طرح شور مچا رہا ہے اور اس وقار و بردباری کو بالکل کھو بیٹھا ہے جو مسلمان کی ہمیشہ خصوصیت خاصہ رہی ہے

کشمیر کا مسئلہ اس میں شک نہیں بہت نازک و پیچیدہ ہے، لیکن یہ خیال کرنا کہ اسے لڑائی سے طے کیا جا سکتا ہے، اتنی بڑی غلطی ہے کہ اسے خودکشی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا

تقسیم ہند کے بعد جو مظالم انسانیت پر ہوئے اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن یقین کیجئے کہ جنگ کے بعد جو مظالم اس سے ہزار گنا شدت کے ساتھ رونما ہوں گے اور آپ ان ہولناک مناظر کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے جن سے دوران جنگ میں دونوں ملکوں کو دو چار ہونا ہے۔ پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ کشمیر کے لئے جس کی آبادی ایک کروڑ بھی نہیں، ۸ کروڑ انسانوں کو مصائب میں مبتلا کیا جائے اور شہر کے شہر ویران کر دئے جائیں۔

یہ مسئلہ جس طرح ممکن ہو آپس ہی میں پوری صلح و آشتی کے ساتھ طے ہو جانا چاہئے اور اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ دونوں ملکوں کے لیڈر خصوصیت کے ساتھ جواہر لال نہرو اور نوابزادہ لیاقت علی خاں) برابر ایک دوسرے سے ملتے رہیں اور اپنے درمیان مفاہمت کی دیوار حایل نہ کریں، کیونکہ بالآخر ہندوستان و پاکستان کو مل کر رہنا ہے اور اتحاد ہی میں دونوں کی نجات ہے

ہندی اُردو نزاع

ہندوستان کے لسانی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی زمانہ میں سارے ہندوستان کی زبان ایک نہ تھی۔ یوں تو کچھ زبانوں نے کثرت میں وحدت کا کام کیا تھا اور ہندوستان کے بڑے حصے کی واحد ادبی زبان بن گئی تھیں۔ مگر ساتھ ہی دوسری مقامی زبانوں کا ارتقا بھی ہوتا رہا تھا اور جب رائج الوقت زبانیں پنڈتوں اور دوانوں کی ملکیت بن کر رہ گئیں اور جنتا سے اپنا ناتا توڑ لیا تو انہی مقاموں میں زبانوں نے عوام کا سہارا لیکر فروغ پایا۔ پہلے سنسکرت نے راج مکٹ پہنا اور بہت دنوں تک اسکی چمک دمک سے دوسری زبانیں ماند رہیں، مگر رفتہ رفتہ جب یہ "آکاش بانی" بن گئی تو دھرتی والوں نے بھی اس سے اپنا ناتا توڑ لیا۔ اور پھر بودھ دھرم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ پالی کو فروغ حاصل ہوا، اور اس کے پوتر بول ہندوستان کے باہر تک سنائی دینے لگے، مگر اس کے پیر بھی میدان سے بہت جلد اُکھڑ گئے اور پھر شورسینی پراکرت اور شورسینی آپ بھرنش نے سر اُٹھایا اور ۸۰۰ء و ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ دو آبہ کی شورسینی آپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی زبان بن گئی۔ اخیر میں یہ آپ بھرنش بھی کتابوں میں بند ہو کر رہ گئی۔ اور اس کی شاخوں میں برج بھاشا اور کھڑی بولی وغیرہ نے فروغ پایا۔ آج برج بھاشا نے دم توڑ دیا ہے اور کھڑی بولی کی دو شاخیں اُردو اور ہندی ہندوستان گیر ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں

اب یہ دہرانے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی کہ اُردو بدیسی زبان نہیں ہے اور ہر مذہب و ملت نے اس کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی ہے فاتح اور مفتوح کے اختلاط نے جہاں ایک نئے کلچر کو جنم دیا، وہاں ایک نئی زبان کا وجود میں آنا ضروری تھا۔ یہ نئی زبان اُردو تھی اس کے نئے پن کی نشانی اس کا فارسی رسم الخط اور فارسی و عربی الفاظ کا اضافہ تھا، رفتہ رفتہ یہ زبان ہر طبقہ میں مقبول ہوتی گئی اور ہر شخص نے بلا تفریق مذہب و ملت اس کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا اور اس طرح یہ زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان بن گئی۔ اور بقول ڈاکٹر تارا چند "اٹھارویں صدی میں ہندو اور مسلمان دونوں اُردو کو اپنی مشترک زبان سمجھنے لگے تھے"۔ مگر بدقسمتی سے اُردو کے سر سے یہ "مشترکہ" تاج بہت جلد ہی اُتر گیا اٹھارویں صدی کے اختتام اور اُنیسویں صدی کے اوایل ہی میں ایک نئی زبان ہندی کے نام سے جنم لینا شروع کرتی ہے۔ اس زبان کا ڈھانچہ بھی کھڑی بولی کا ہے۔ مگر کھڑی کی یہ جدید شکل خالص سنسکرت (تت سم) سے مدد لیتی ہے اور نہ صرف پراکرت، کول اور ڈراوڑی زبانوں کے ان الفاظ کو خارج کر رہی ہے جو عام فہم ہیں بلکہ سنسکرت کے ان الفاظ کو بھی قبول کرنے سے انکار کرتی ہے جو لسانی تبدیلیوں کے تحت اپنی شکل بدل چکے ہیں اور یہیں سے اُردو ہندی کشمکش کی ابتدا ہوتی ہے۔

عام طور پر اس جھگڑے کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے کی جاتی ہے اور ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے مگر اس کے علاوہ دوسرے محرکات بھی ہیں جو اس سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

اگر ہم غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں گے کہ اگر ڈاکٹر گلکرسٹ ایک نئی زبان کو وجود میں نہ لاتے تو بھی ایک زبان ضرور پیدا ہوتی جو یقیناً اُردو سے بہت مختلف ہوتی۔ یہ ممکن ہے اگر فورٹ ولیم کالج کی پشت پناہی نہ ہوتی تو یہ زبان بہت دیر میں فروغ پاتی مگر ایک مختلف زبان کا وجود میں آنا ناگزیر تھا، کیونکہ اختلاف رسم الخط ہی کی شکل میں ہوتا اس اختلاف کی بنیاد فرقہ وارانہ جذبات ہی ہوتے جو انگریزوں کی حکمت عمل کے تحت بہت جلد بھڑک اُٹھے تھے۔

یہ ایک عام بات ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ پاتی ہے تو مفتوح قوم کا ایک طبقہ حاکم قوم کی ریس کرنے لگتا ہے، مگر ساتھ ہی محکوم قوم کا ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو بالکل متاثر نہیں ہوتا ہے اور جب قومی شعور بیدار ہوتا ہے تو وہ لوگ بھی جو نقالی کرتے ہیں اس سے متنفر ہونے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ قومی شعار اختیار کرنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے غلبے کے زمانے میں بھی یہی ہوا حتیٰ کہ اکبر کے زمانہ میں بھی۔ جس نے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش بڑے خلوص سے کی تھی۔ جہاں ہندوؤں کا ایک طبقہ اُس کا ہم خیال تھا، وہاں چتوڑ کے رانا کے روپ میں ایک طبقہ اس کا مخالف بھی تھا ساتھ ہی فاتح قوم میں ایک طرح کا احساس برتری بھی ہوتا ہے۔ اور محکوم قوم جب حاکموں کے آداب اختیار کرنے لگتی ہے تو حاکموں کو ناگوار گزرتا ہے وہ کسی طرح یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے غلام کسی طور ان کی برابری کی کوشش کریں۔ اسی لئے جب اکبر نے عبدالرحیم خانخاناں کو ہفت ہزاری منصب عطا اور اس کے فوراً بعد مان سنگھ کو بھی یہی منصب عطا کیا تو مسلمان امیروں کو بڑا ناگوار گزرا اور یہی وہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے مسلمان اکبر کی ہندو مسلم رواداری کی کوششوں کو سراہ نہ سکے۔ بدایونی تو سرے سے اکبر کو مرتد ہی گردانتا ہے اور یہ اکبر کا ردعمل تھا جو اورنگ زیب کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اورنگ زیب کی اسلامی پالیسی سے خوش ہو کر لوگ اسے "زندہ پیر" ہی کیوں نہ کہتے ہوں مگر ہندوستان جیسے مخلوط ملک کے لئے اس کی پالیسی بالکل مناسب نہ تھی۔ اس کے ردعمل کے طور پر "ہندو قومیت" نے جنم لینا شروع کیا، جس کا اظہار جاٹوں، سکھوں، راجپوتوں اور مرہٹوں کی بغاوت کی شکل میں ہوتا ہے اور بقول ڈاکٹر عبدالحق "شیواجی کے زمانہ ہی میں مرہٹی سے فارسی الفاظ کا اخراج شروع ہو گیا تھا"۔ یہ رجحان اسی ردعمل کا مظہر ہے۔

اس نئی زبان کے وجود میں آنے کے ثبوت میں فورٹ ولیم کالج کے قبل کے نثری نمونے بہ آسانی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اکبر ہی کے عہد میں گنگ کوی نے ۱۵۷۰ء میں "چند چھند برنن کی مہما" کھڑی بولی ہندی میں لکھی، اس کا رسم الخط دیوناگری ہی تھا۔ جٹ مل نے "گورا بادل کی کتھا" ۱۶۸۰ میں تصنیف کی اور سدا سکھ کی "سکھ ساگر" اور انشاء اللہ خاں کی "رانی کیتکی" فورٹ ولیم سے کچھ ہی قبل لکھی گئی ہیں۔ اُردو والوں نے رانی کیتکی کو نہیں اپنایا (حالانکہ یہ فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی) اس سے بخوبی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آخر دو زبانیں کیوں وجود میں آئیں؟ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جس وقت مسلم شعراء اپنی ریختہ پر فارسی کی آب چڑھا رہے تھے اس وقت غیر مسلموں میں برج بھاشا کا بول بالا تھا۔ (نثر کا رواج تو واجبی ہی تھا ساری ادبی سرگرمی شاعری پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں تو کھڑی بولی کے اثرات نامدیو، کبیر اور نانک کے علاوہ اس دور کے بہت سے شعراء میں مل جاتے ہیں۔ مگر ان اثرات کی بنا پر ہم ان کا ناموں کو اُردو ادب میں شامل نہیں کر سکتے) اس لئے اُردو کے دور اول کے شعراء میں ہمیں کوئی غیر مسلم شاعر نہیں ملتا۔ اور یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ ریختہ کے مقابلہ میں ہندوؤں نے برج بھاشا ہی کو اختیار کیا، یہ بہت بعد کی بات ہے جب اس میں چکبست اور سرور جہاں آبادی پیدا ہوئے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے غیر مسلم باشندے سنسکرت کی محبت کو اپنے دل سے کبھی نہ نکال سکے، اگرچہ یہ زبان ایک خاص دور کے علاوہ ہندوستان کے کسی حصے میں کبھی مروج نہ رہی، مگر چونکہ یہ ان کے دور زریں کی یادگار تھی، یہ ان کا قومی سرمایہ تھا، اس میں ان کا مذہب تھا رشیوں اور پیغمبروں کے پوتر بول تھے اس لئے یہ زبان ہمیشہ ان کے لئے متاع بے بہا بنی رہی، ساتھ ہی سنسکرت زبان کا ادب بھی اعلیٰ درجہ کا تھا، اس کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوتے رہے ہیں اور اس کی مقبولیت کا ثبوت ہیں، اتنے ترقی یافتہ اور مالا مال زبان و ادب کو بھلا دینا تقریباً ناممکن تھا، مسلمانوں نے اپنی فارسی دانی کے آگے اس کو منہ نہ لگایا مگر یہاں کے باشندے اس سے کس طرح انحراف کر سکتے تھے۔ یہ سنسکرتی رجحان ہمیشہ دلوں میں موجود رہا اور جب کبھی موقع ملا تو بروئے کار آیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔ "مغلوں کے دوران قیام آگرہ میں ہندوستانی زبان میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہو رہا ہے جسے ہم "سنسکریت" کا نام دے سکتے ہیں۔ پراکرت اور آپ بھرنش کی سب سے بڑی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں سنسکریت سے عام انحراف ملتا ہے اس کے برخلاف جدید آریائی زبانیں جب ادبی شکل اختیار کرتی ہیں تو انھیں خواہ مخواہ سنسکرت کا سہارا لینا پڑتا ہے .... چنانچہ دکنی ادبیات میں سنسکرت کے الفاظ توڑ مروڑ کر دیسی شکل میں ملتے ہیں پرم - پیم (پریم) پرت (پریت)، دشٹی (درشٹی) ..... لیکن چونکہ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے چپکے ہوتی ہیں اس لئے

سنسکرتیت کے بڑھتے ہوئے رجحان سے مسلمانوں کو بھی مفر نہ تھا، اس کی شہادت ہمیں قدیم دکنی ادب سے ملتی ہے جہاں سنسکرت کے بے شمار الفاظ بلا تکلف نظم و نثر میں ملتے ہیں مثلاً میگھ، دوت، چرن، چنتا، درپن و درشن وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ اکبر جامہ کو سرت گاتی کہتا ہے، برقع کو چترگپت، جوتے کو چرن دھرن اور موبات کو کیس گہن، اسی رجحان کا اظہار محلات شاہی اور ہاتھیوں کے نام سے بھی ہوتا ہے قدیم اُردو کا ہتھی (ہاتھی) آگرہ جاکر سنسکرت کا گج ہوجاتا ہے اور محل کے بجائے شاہی محلات کے لئے بھون کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور آج بھی جب ایک صوبت نکلی ہے تو سنسکرت کے احیاء کی کوششیں بڑے شد و مد سے ہو رہی ہیں۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کے دلوں پر فارسی اپنا دھاک بٹھائے ہوئے تھی۔ جہاں اس کے جلو میں ایک اعلیٰ ادب تھا وہاں یہ ہندوستان کی سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ تہذیبی زبان بھی تھی۔ اس کے علاوہ اُردو کی پیدائش اور نشو و نما فارسی کی مرہونِ منت تھی۔ شیخ سعد اللہ گلشن نے ولی کو یہی مشورہ دیا تھا کہ جو کچھ فارسی کے دیوانوں میں بند پڑا ہے اس کو ریختہ میں منتقل کردو۔ اور ریختہ کے دور اول کے سبھی فنکاروں نے تقریباً یہی کیا ہے۔ شروع میں تو کھڑی بولی کے اثرات باقی رہے۔ مگر چونکہ یہ سب فن کار فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے لہذا ان کے ہاتھوں یہ خام زبان فارسی زیادہ اور ہندوستانی کم رہ گئی، انھوں نے شیراز کے انگور کھلائے اور مئے ارغواں کا چسکا لگایا بلبل ہزار داستان کے چہچہے سنائے، کوہ الوند و بے ستون و تختۂ گلاب کی سیر کرائی، دجلہ و فرات سیحوں و جیحوں میں غسل دیا اور اس کو فارسی لباس (رسم الخط) سے مزین کیا۔ اور اُردو زبان بالکل فارسی اثرات کے تحت آگئی، اور آج بھی یہ حقیقت ہے کہ بغیر فارسی کی خاصی قابلیت اور عربی کی واقفیت کے کوئی انسان اُردو دانی کا دعویٰ نہیں کرسکتا، لہذا بقول اقبال ورما سحر ہنگامی ۔

"قیاس یہی کہتا ہے کہ جب اُردو کا جنم ہی ان خصوصی نوعیت کے ساتھ ہوا تھا تو پھر اس نوعیت کا بتدریج ترقی پانا اور اس ترقی کے اعتبار سے ایک بالکل جداگانہ زبان کا بنتے جانا کوئی ان ہونی سی بات نہ تھی۔"

یہ تو وہ اثرات تھے جو غیر شعوری طور پر اپنا کام کر رہے تھے اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب آہستہ آہستہ اجنبی ہاتھوں کا گراں بار ستم بڑھتا گیا تو ہندوستانیوں نے اپنے اس تنزل اور ان کی اس ترقی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور انھیں اس بات کا پتہ چلا کہ اجنبیوں کے اس غلبے کی وجہ ان کا بالیدہ قومی شعور ہے۔ اس وقت ساری دنیا پر "Nationalism" کا جادو چل چکا تھا لہذا محکوموں نے بھی قومیت کا سہارا ڈھونڈھا اور چونکہ ہندوستان میں قومیت کے احیاء کا مطلب مذہب کا احیاء تھا لہذا مذہب کی اصلاح پر خاص طور پر زور دیا گیا، اور یہ ضروری ہوگیا کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ اپنی قومیت کی تعمیر کریں، اس کے علاوہ معاشرتی اصلاح کے میدان میں بھی مسلمان اور ہندو الگ الگ ہی رہے۔ کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں کے معاشرتی مسایل بھی الگ الگ تھے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مصلحین کا ایک خاص گروہ میدان میں آتا ہے جس میں راجہ رام موہن رائے کیشب چندر سین، راج نرائن بوس، ہرس مکرجی، رام گوپال گھوش اور راناڈے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ساتھ ہی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ - ۱۸۸۳) کی قیادت میں آریہ سماج کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ یہ تحریک بڑی ہی فرقہ پرست تحریک تھی۔ اس کا اصول ہی تھا "Go back to Vedas" بد قسمتی سے اس تحریک نے ہندوستان کو "قومی، معاشرتی اور مذہبی" طور پر متحد کرنے کا جو اصول سونچا وہ بڑا ہی خطرناک تھا۔ یہ اصول شدھی کی تحریک تھا (یعنی غیر ہندوؤں کو ہندو بنانا)۔ شومئی قسمت سے اس تحریک نے سب سے زیادہ اسلام پر حملے کئے اور مسلمانوں نے بھی "توحید کے تحفظ" کے لئے بڑی بڑی بادگیریاں دکھلائیں، پھر کیا تھا ہر طرف مناظرے ہونے لگے اور ان مذہبی مباحث نے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے میں بڑی مدد کی اور اس کی وجہ سے لسانی اختلافات کو بھی کافی تقویت پہنچی، اور رفتہ رفتہ ہندو قومیت اور مسلم قومیت نے اپنا راستہ بالکل الگ کرلیا۔ اور اس موقع پر سید احتشام حسین کی رائے قابل غور ہے وہ لکھتے ہیں

"... انیسویں صدی میں جب نئی قومیت نے جنم لیا اور اسے ایک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تو حالات اتنے بدل چکے تھے کہ اس نے برج بھاشا یا کسی اور جدید بولی کو اپنی زبان نہیں بنایا، بلکہ کھڑی بولی کو نئی ادبی ہندی کی بنیاد قرار دیا۔"

ان لسانی اختلافات کو مزید تقویت پہونچانے میں ہمارے سفید فام آقا بھی پیش پیش رہے ہیں۔ یہاں کے حالات کا سہارا لیکر وہ اپنے " Divide and Rule " والے مسلک کو پورے طور پر بروئے کار لائے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد سے قبل ہی انھوں نے افتراق کی صورتیں پیدا کر دی تھیں، ۱۷۸۱ء میں لارڈ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں مدرسہ عالیہ قایم کیا۔ جس میں عربی و فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی اور اسی زبان کی کتابیں شایع کی جاتی تھیں، ۱۷۹۱ء میں ریذیڈنٹ جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کی بنیاد قایم کی، جہاں سنسکرت کی سرپرستی کی گئی۔ اس طرح انھوں نے شروع ہی سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ ہندو اور مسلمانوں کی زبانیں بھی دو ہیں اور ان کے سرچشمے بھی دو ہیں، اور پھر تو ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد کے بعد یہ اختلافات ایک باقاعدہ شکل میں رونما ہوتے ہیں اور نئی ہندی آہستہ آہستہ پنپنے لگتی ہے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس دور میں اُردو نے اپنی نئی بہن کا خیر مقدم کیا، اس کا ثبوت اُردو کے دور صحافت سے بھی ملتا ہے ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ اندور سے ایک ہفتہ وار اخبار مالوہ اخبار کے نام سے شایع ہوتا ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے مطابق "یہ پہلا پرچہ تھا جس میں ناگری اور اُردو زبانیں مشترک کی گئیں"۔ سید ابو عاصم صاحب اُردو صحافت نگاری کے تیسرے دور (۱۸۶۶-۶۷) کی ایک خصوصیت یہ بتلاتے ہیں کہ اکثر اُردو اخباروں کے ہندی اڈیشن اور ہندی اخباروں کے اُردو اڈیشن نکلتے تھے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں ایک اخبار مظہر السرور نکلتا تھا جس میں دونوں رسم الخط جگہ پاتے تھے، گارساں دتاسی اپنے چودھویں خطبہ (۱۸۶۴) میں اودھ اخبار کے متعلق لکھتا ہے:۔ "اس کی ادارت شیو پرشاد کرتے ہیں۔۔۔۔ بعض مضامین دیوناگری رسم الخط میں ہیں"۔ تقریباً اسی زمانہ میں اُردو ہندی جھگڑے کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے الفاظ میں ۱۸۶۲ء میں بریلی سے ہندی کا پہلا اخبار ہفتہ وار "بریلی تت بودھنی پترکا جاری ہوا"۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی زبان سن شعور کو پہونچ رہی تھی اور اس قابل ہوتی جا رہی تھی کہ اُردو کے مقابل میں کھڑی کی جا سکے۔

تقریباً اسی زمانہ میں بنگال میں بنگلہ عدالتوں کی زبان قرار دیدی گئی اس واقعہ سے شمالی مغربی اضلاع والے بھی متاثر ہوئے اور ان کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندی ناگری رسم الخط میں عدالتوں کی زبان ہو۔ اور اس طرح اُردو ہندی کا جھگڑا مزید زور پکڑتا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اخباروں میں بحث کی ابتدا گورنمنٹ کی اس تجویز سے ہوتی ہے کہ ہندوستان کی عدالتوں میں کونسی زبان اور کن حروف میں رواج پانے کی مستحق ہے۔ اس زمانہ کی مختلف تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ پہلی باضابطہ کوشش ۱۸۶۷ء سے شروع ہوتی ہے جس کا تذکرہ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "۔۔۔۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے، غرضکہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نراین سنگھ کے مکان پر بنارس میں قایم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لئے کمیٹیاں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قایم کی گئیں۔۔۔۔ یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ ان ہی دنوں لفٹنٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے ان کو ایڈریس ایسی اُردو میں دیا گیا جسمیں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کئے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے حاکم کے لئے جو خفیف [illegible] آسان نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس طرح بنگال میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہے اسی طرح صوبۂ بہار میں بہاری زبان اور کیتھی حروف جاری کئے جائیں۔ چونکہ اس ایڈریس کے بہت ہی کم الفاظ سمجھے تھے انھوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا ہے یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی ہے چنانچہ انھوں نے چند روز کے بعد حکم دیدیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حروف اور ہندی زبان [illegible] اس واقعہ

ے شمال مغرب کے ہندوؤں کا حوصلہ بڑھا اور ان کی کوششیں زیادہ تیزی سے ہونے لگیں .... ۱۸۸۲ء میں جبکہ سر سید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اُردو کی مخالفت کا موقع پھر ملا۔ اور اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اُردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت شروع کی، دونوں صوبوں میں بے شمار انجمنوں اور سبھاؤں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر کمیشن میں بھیجے گئے۔ چنانچہ سر سید کے بعض مسلمان دوستوں نے پنجاب میں انجمن حمایت اُردو قایم کی اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجے اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء کو حضور سر انٹونی میکڈانلڈ لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گزرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اُردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اُسوقت کے سارے اخباروں میں اس مسئلہ کے متعلق بڑی گرما گرم بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ میرٹھ کے اخبار جلوۂ طور میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے وہ حسب خواہش تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ مظفر پور (بہار) کے وارث علی نے علیگڑھ اخبار میں پرجوش مقالہ سپرد قلم کیا تھا اور یہ ثابت کیا تھا کہ دراصل اُردو ہی اہل ہند کی زبان ہے۔ مشہور مستشرق گارساں دی تاسی اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے میں اس مسئلہ پر پوری وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "میں اب بھی ہندی کے مقابلے میں اُردو کی حمایت کر رہا ہوں اگرچہ میں اول الذکر کی اہمیت اور افادیت سے منکر نہیں۔ خوش قسمتی سے اہم شخصیتوں نے اس بحث پر میری تائید کی ہے۔ لفٹنٹ کرنل جے جیمبرس پروفیسر ہندوستانی جامعہ آکسفورڈ کا ایک خط میرے پیش نظر ہے۔ جسے میں نقل کرتا ہوں۔ 'مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ آپ اور بہت سے نامور ہندوستانی حضرات جدید ہندی کے مقابلہ میں اُردو کے رواج کے حامی ہیں۔ ہندی مجھے بالکل پسند نہیں۔ یہ سنسکرت ترکیبیں ہندوستان کے کسی ایسے حصہ میں رائج نہیں جہاں میں ۶۲ - ۶۴ ۱۸ء تک مقیم رہا..... دیوناگری رسم الخط اس میں کوئی شک نہیں کہ سنسکرت اور ٹھیٹھ ہندی کے لئے اچھی طرح موزوں ہے لیکن اجنبی الفاظ کو تحریر کرنے کے لئے بہت ناقص ہے۔ کیونکہ اس رسم الخط میں دوسرے حروف کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ المختصر میں یہ سمجھتا ہوں کہ فارسی رسم حروف ہندوستان میں عام استعمال کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ہندوستانی سپاہی انھیں فارسی حروف کو استعمال کرتے ہیں اور اگر نہیں کر سکتے تو دیوناگری نہیں بلکہ کیتھی کو استعمال کرتے ہیں اگر بنگالی ہوں تو مہاجنی کو اور پنجابی ہو تو گورمکھی کو، اگر وہ فارسی رسم الخط استعمال نہیں کر سکتے تو اس رسم الخط کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے مفاد کے مطابق ہو۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اُردو اور ہندوستانی ایک ہی ہے۔ آخر الذکر نام یورپینوں کا دیا ہوا ہے۔' بنگال میگزین بابت جنوری ۱۸۸۰ء میں اُردو کے متعلق بہت سی واہیات عبارتیں شایع ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں اُردو کے خلاف گمنام مصنف نے جہاں اُردو کا ذکر کیا ہے۔ اس سے وہ شاعرانہ زبان مراد لی ہے جو زیادہ تر ریختہ کہلاتی ہے جو ہندوستان کے کسی حصے میں رائج نہیں..... اچھے دلایل نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ان لوگوں پر بھی حملے کئے ہیں جو اس کے ہم خیال نہیں ہیں اور اسی طرح مشنریوں پر بھی..... بابو کاشی ناتھ نے صفائی سے کہا ہے کہ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے ان میں ان کو خوش کرنے کے لئے حکومت انگریزی نے اس رسم الخط کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس میں دشواریوں کا سامنا ہے کیونکہ بہت سے عربی و فارسی حروف ایسے ہیں جن کا بدل دیوناگری میں نہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر ایسے جملوں کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے جو ہندی الاصل نہیں۔ مگر ہمیشہ سے زبان کا جزو لاینفک رہے ہیں، بہت سے ہندوؤں کی خواہش ہے کہ انھیں متروک کر دیا جائے۔ چنانچہ ان میں ایک نے سررشتہ تعلیم پنجاب کو خط لکھا ہے کہ ہندو، عربی و فارسی الفاظ نہیں سمجھ سکتے۔ اور اپنے دعوی کی دلیل کے طور پر اس نے ایک اقتباس گرنتھ کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب اس نے ایک ہندو اسکول ماسٹر کو غلط سمجھاتے ہوئے سنا۔ لیکن یہ جملہ انتہا درجہ سہل ہے اور یہ 'جنگل میں [illegible] قطب [illegible] ایک گھوڑے سے گر کر مر گیا' اسکول ماسٹر غلط سمجھا اور اس نے پست خیال ہندو طلبہ کو [illegible]

مولانا پر ترجمہ کرکے دیدیا کہ ایک میدان میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے گرا اور مر گیا۔"

یہاں میں پھر دو طویل اقتباسات درج کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کیونکہ ان سے ہندو اور مسلمان کے نقطۂ نظر کا پورا اظہار ہوتا ہے اور یہ دو اقتباسات اس وقت کہ ہندو اور مسلمانوں کی پوری ذہنی نمایندگی کرتے ہیں۔ پہلا اقتباس اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ مورخہ یکم جولائی ۱۸۶۸ء کے مضمون "اردو اور ناگری کے موضوع پر بحث" سے لیا گیا ہے اور دوسرا بنارس گزٹ ۱۸۶۹ء کے ایک گمنام مصنف کے مضمون سے۔

"......یا اللہ یا اللہ لوگ بھی کیا مٹی اچھالتے ہیں کہ اردو کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور ناگری کو زندہ کریں۔ سرکار میں انھوں نے عرضیاں بھی بھیجی ہیں، اخبارات میں لمبے چوڑے مضامین لکھے ہیں اور کمیٹیاں قایم کی ہیں۔ ادیبوں کے اس کھیل میں صوبجات شمال مغربی کے اعلیٰ عہدہ دار سپہ سالار بن گئے ہیں۔ پھر بھی کون ہے جو خدا کے نام کو مٹا سکے۔ کیا ایسی زبان کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہے جو دو سو سال سے ہندوستان میں عام ہے۔ اور جو شمالی ہندوستان کے تمام باشندوں کے آب و گل میں سرایت کر چکی ہے...

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چند سرکاری رجسٹروں سے خارج کر دئے جانے پر اردو زبان ترک کر دی جائے گی۔ خدا نہ کرے۔ یہ زبان ہندوستانیوں کے لئے ایسی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ کون اسے مٹا سکتا ہے؟ بڑی حماقت ہوگی اگر ان ترکیبوں کو ترک کیا جائے جو لوگوں کی مادری زبان کا محاورہ بن گئی ہیں۔ سر جارج کیمبل بڑے فہیم آدمی ہیں مگر متلون المزاج۔ میری رائے میں تمام کوششیں جو انھوں نے کیں، درخواستیں جو بے وقوفوں اور احمقوں نے دستخط کر کرکے گورنمنٹ میں بھیجیں، شکایتیں جن سے انھوں نے جرائد کے صفحات سیاہ کئے سب بیکار اور لاحاصل ثابت ہوں گی۔ اردو کا استعمال روکنے اور ناگری کو رواج دینے سے پہلے اشیاء کی ماہیت بدلنی ہوگی۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش ایک خیالی حکم اور ناممکن العمل سی بات ہے اور اچھی خاصی حماقت ہے۔"

"......بالفعل ہندوستان میں اس بات پر بڑی دلیل ہو رہی ہے کہ ہندوستان کی عدالتوں میں کون زبان اور حروف جاری رکھنا واجب ہے۔ اس باب میں دو مختلف تجویزیں ہو رہی ہیں بعضوں کی یہ رائے ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان اور فارسی حروف ہونا مناسب ہے اور بہتوں کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان میں ہندی زبان اور ناگری حرفوں میں اس کی تحریر ہونی چاہئے...

واضح ہو کہ جس وقت سے مسلمان اس ملک میں آئے اور ان کی قوت و حکومت کو وسعت ہوئی تو انھوں نے ہندی حروف کو یکقلم اپنی سرکار سے دور رکھا بلکہ زبان بھی فارسی ہی قایم کی۔ جاننا چاہئے کہ یہ سب باتیں جب تک مسلمان اس ملک پر حاکم تھے جس طرح پر وہ اچھی قرار دی جا سکتی تھی... پر اب ہم کو وہ کام کرنا چاہئے جو زمانہ حال کے مطابق ہو۔ اردو زبان ہندوستان میں اگرچہ کم تاہم بیشتر عام میں جاری ہے لیکن یہ زبان نہ تو حاکم کی ہے اور نہ ہندوستان کی دیسی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ وضع تحریر اس کی فارسی ہے اور بہ سبب اس کے فارسی میں ایسے حروف بہت کم ہیں جن سے ہندی لفظوں کو ٹھیک ٹھیک لکھ سکیں، اس وجہ سے اسکے پڑھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اور ان کے لکھنے میں بڑی غلطی واقع ہوتی ہے...... اردو زبان کو فارسی سے مدد مل سکتی ہے اور چونکہ فارسی خود بھی ایک محتاج کم مایہ زبان ہے تو بقول اس کے کہ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے دوسروں کو کیا صحت بخشے گا اسلئے بدرجہ لاچاری عربی سے مدد لی جاتی ہے۔ اب اول تو ہم سے فارسی ہی غیر مانوس ہے دوم عربی کہ ہم سے بالکل غیر مخلوط ہے پس کسی طرح تسہیل کی صورت نہیں دکھائی دیتی...... حقیقت میں ہندی زبان ہمارے ملک میں بہ نسبت اردو کے کہیں زیادہ مروج ہے اگر اوسط نکالا جائے تو اغلب ہے کہ فی صدی بیس اردو کے خواہاں پائے جائیں گے اور فی صدی اسّی ہندی کے خواستگار پائے جائیں گے۔ عام دیہات کے رہنے والے شہر کے باشندوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں اور ان کی عام کارروائی ہندی زبان یعنی ناگری یا کیتھی میں ہوتی ہے اس زبان کو زیادہ تر سنسکرت سے مدد مل سکتی ہے اور چاہے ہم ہندی اس بات کو لوگ قبول نہ کریں لیکن ہم ٹھیک ٹھیک سمجھتے ہیں کہ ہندی درحقیقت بگڑی ہوئی سنسکرت ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندی میں سنسکرت کے لفظ سے اس کی [illegible]

اور علاوہ اس کے ہندی نہایت ہی پرمایہ زبان ہے۔۔ جس وقت سرکار نے یہ حکم دیا کہ اُردو زبان سرکاری کاموں میں مستعمل ہو تو اس وقت ہم نے تصور کیا تھا کہ رفتہ رفتہ ہماری ہندی زبان بھی ساتھ ہندی حرفوں کے جاری ہو جائے گی اور جس طرح کہ فارسی زبان اُٹھا دی گئی ہے حروف بھی باقی نہ رہیں گے۔ لیکن اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ جا بجا یہ تجویزیں ہو رہی ہیں کہ اُردو کی یونیورسٹی قائم ہو اور یہی زبان اور یہی وضع تحریر بالعموم جاری کیا جاوے تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حق میں لوگ کیا کر رہے ہیں اور کیا لوگوں کو کسی کی حق تلفی کرنے میں ترس نہیں آتا اور اس پر بھی افسوس کرنا چاہئے کہ بیشتر ہندو اس کی ترقی کو روک کر اُردو کی ترقی پر دل لگاتے ہیں۔"

اوپر کے دونوں اقتباسات پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں مضمون نگار حضرات علم السنہ سے قطعی نابلد ہیں۔ ان دونوں مضامین میں سطحی جذباتیت ہے اور فرقہ واریت کی رنگ آمیزی۔ عام طور پر اس سلسلے میں زیادہ مضامین ایسے لکھے گئے جنمیں دلیل کے بجائے حجت اور سنجیدگی کے بجائے جذباتیت کارفرما ہی اور اس حملہ ———— اور ———— جواب حملہ نے مسئلہ کو بجائے سلجھانے کے اور اُلجھا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس منافرت اور مخالفت کا اثر ان عام لوگوں پر بھی پڑے بغیر نہ رہا جو ایک گھریلو زبان رکھتے تھے اور زبان کی باریکیوں سے ناواقف تھے۔ لیکن محض زبانوں کے نام پر ان کے دلوں میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا ہوگئے اور وہ یہ بغیر سمجھے ہوئے کہ اُردو اور ہندی کیا ہے ایک دوسری زبان سے نفرت کرنے لگے۔

اگر ہم ہندوستان کی سیاسی حالت کا جایزہ لیں تو ہمیں اس میدان میں بھی افتراق اور نفاق ہی نظر آئیگا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس وقت سارے دیش بھگت بلا تفریق مذہب و ملت اس میں شامل ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۸۸۷ء میں سرسید کانگریس سے علیحدہ ہوگئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی تھا۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بلائی اور ۱۸۹۳ء میں انھوں نے Upper India Mohamedan Defence Association قایم کیا۔ اور اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں سیاسی مقاصد کے لئے بھی متحد نہ ہو سکے۔ ۱۹۰۱-۲ کے لگ بھگ سرکار برطانیہ نے جمال الدین افغانی کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ اور "پان اسلامی تحریک" کے سبز باغ میں مسلمانوں کو ایسا اُلجھایا کہ وہ مصر و ترکی و ایران کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ باضابطہ قایم ہوتی ہے اور دونوں دو دھاروں میں بٹ جاتے ہیں اور اس طرح لسانی اختلافات میں مزید شدت آجاتی ہے۔

۱۸۹۳ء میں ناگری پرچارنی سبھا کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس سبھا نے ہندی کی ترویج و ترقی کے لئے جان توڑ کوششیں کیں۔ بابو شیام سندر داس نے (جو اس وقت اس سبھا کے منتری تھے) سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور ساٹھ ہزار آدمیوں کے دستخط کے ساتھ ایک محضر تیار کرایا گیا اور بذریعہ مہاراج پرتاب نراین سنگھ راجہ اجودھیا، سر انٹونی میکڈانلڈ کے روبرو ۲ مارچ ۱۸۹۸ء کو یہ محضر نامہ پیش کیا گیا اور آخرکار گورنمنٹ کی طرف ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو یہ حکم جاری ہوا کہ عدالتی کاغذات ہر دو زبان میں جاری ہوں اور جو شخص چاہے وہ اپنی عرضی ناگری رسم الخط میں بھی دے سکتا ہے۔ اس طرح ہندی کو باضابطہ ایک Recognition مل جاتا ہے اور وہ اُردو کے دوش بدوش کھڑی کر دی جاتی ہے۔

بدقسمتی سے مسلمان فارسیت کے رجحان سے نجات نہ پا سکے۔ اور اس لئے غیر مسلموں کے لئے اپنی زبان کو سہل نہ بنا سکے۔ میر امن کے جواب میں رجب علی بیگ کا فسانۂ عجائب لکھنا اور زبان کو صاف و شستہ بنانے کی دھن میں ناسخ کا پراکرتی الفاظ کی تنسیخ کرنا فارسی پرستی کے رجحان کا مظہر ہے۔ اسی وجہ سے نظیر اکبرآبادی عرصے تک گمنام رہا اور ایک بازاری شاعر گردانا گیا۔ بیچارے ہندوستانیوں کی فارسی کو بھی قابل اعتنا نہ سمجھا۔ غالب، امیر خسرو کے علاوہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ اس کے علاوہ اُردو شعراء فارسی شعراء کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ اس کے بعد اپنے کو عرفی، خاقانی، حافظ، سعدی اور صائب کا ہم پلہ قرار دیتے

تھے۔ اس لئے جب بچارے غیر مسلموں نے فارسی کی طرف رجوع کیا تو "بوئے کچوری می آید" کہکر ان کا مذاق اڑایا گیا۔ بچارے دیا شنکر نسیم پر کیا کیا پھبتی۔ غرضکہ جب تحسین کے عوض تضحیک کی گئی تو آہستہ آہستہ وہ دل برداشتہ ہوتے چلے گئے۔

خدا بھلا کرے حالی اور ان کے ساتھیوں کا، جنھوں نے اردو کو فارسی کی غلامی سے آزاد کرایا اور جس کی وجہ سے ڈاکٹر عبدالحق یہ کہہ سکے کہ اگر کبھی بدقسمت ہندوستان کی کوئی مشترکہ زبان ہوسکی تو وہ حالی کے مناجات بیوہ کی ہوگی (گو کہ فارسی اب بھی اقبال کی شاعری، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کے افسانوں میں زندہ ہے اور حیدرآباد کے دارالترجمہ میں کچھ دنوں پہلے تک زندہ تھی) اور شکر ہے کہ اسی سادگی کے باعث اردو زبان ابھی تک زندہ ہے۔

جب مسلمان عام طور پر کانگریس سے علٰحدہ ہونے لگے تو مہاتما گاندھی مرحوم نے لسانی اختلاف کو دور کرنے کے لئے "ہندوستانی" کی مٹھائی دکھلائی اور دونوں گروہوں کو رام کرنا چاہا۔ مگر گاندھی جی کی "ہندی اتھوا ہندوستانی" والی تحریک اس لئے نہ چل سکی کہ اول تو وہ ماہر لسانیات نہ تھے، زبانوں کے بننے بگڑنے اور پھلنے پھولنے کے جو اصول ہیں اس سے انھیں واقفیت نہ تھی۔ اس کے علاوہ دونوں گروہوں کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ کسی کو خوش نہ کرسکے۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۱۹۳۶ء میں وہ اپنا ہندوستانی خطبہ پیش کرتے ہیں۔ "اس سبھا کا سبھاپتیتوا دینے کے کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پریرت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا۔ دوسرے میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں سے پریم۔ جو کچھ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے ..... اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری آپس میں کبھو دلیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی تیہا یوگیہ دوارا سیوا کیوں نہ کریں۔" مہاتما جی کا ہندوستان کی سب بھاشاؤں سے پریم تھا اس لئے ۱۸ ستمبر ۱۹۴۳ء کے ہریجن سیوک میں ہندوستان کی یوں تعریف کرتے ہیں۔ "ہندوستانی ہم اس زبان کو کہتے ہیں جسے اتر ہندوستان میں آدمیوں کا بہت بڑا طبقہ بولتا ہے اور ہم مانتے ہیں کہ جو شبد کارو بار میں استعمال ہوتے ہیں انھیں جن کو ہندوستان کے ذخیرہ میں جمع کرلینا چاہئے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اردو، ہندی دونوں کو اور ادب میں استعمال ہونے والی بھاشاؤں کو ان کی ترقی کے لئے پورا موقع ملنا چاہئے۔"

مگر گاندھی جی مرحوم کی ہندوستانی اکبر کے دین الٰہی کی طرح چند خاص لوگوں تک محدود ہوکر رہ گئی۔ کچھ دنوں تک لوگوں نے اس تحریک کے ذریعہ مشترکہ زبان کا خواب دیکھا تھا۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہا، کیونکہ غالباً پنڈت سندرلال جی کے علاوہ کوئی اس تحریک کو خلوص سے نہ اپنا سکا تھا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں لاہور ریزولیوشن پاس ہوا اور مسلم لیگ نے پاکستان کا دعویٰ کیا، آہستہ آہستہ دو قومی نظریہ زور پکڑتا گیا اور بالآخر ملک تقسیم ہوگیا، کہا جاسکتا ہے کہ اردو اور ہندی کے الگ الگ دو ملک بن گئے اور آج ہندوستان میں اردو کی غریب الوطنی اور بے کسی آنکھوں کے سامنے ہے۔

غالب اور ٹونک

والیانِ ٹونک نے ہمیشہ اہلِ کمال کو نوازا اور خاطر خواہ داد و دہش سے اُن کی ہمت افزائی کی۔ تاریخ ٹونک میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں اہلِ فضل و کمال کا تذکرہ موجود نہ ہو۔ لیکن نواب وزیر الدولہ صاحب کا دورِ حکومت خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو میرزا غالب جیسے اہلِ کمال کو بھی اپنی جانب متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔

چنانچہ سنہ ۱۸۶۲ء میں نجم الدولہ دبیر الملک حضرت میرزا اسد اللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ بزبان فارسی نواب وزیر الدولہ بالقاب کی خدمت میں ترقیم فرما کر بذریعہ عرضداشت بھیجا۔ پیشگاہِ حضور والا سے اس کے جواب اور صلہ میں کچھ تامل ہوا تو میرزائے موصوف نے پھر ایک قطعہ بطور عرضداشت بخدمت نواب وزیر الدولہ بہادر روانہ کیا۔ سرکار والا سے صلۂ قصیدہ حسب دلخواہ میرزائے موصوف کو عطا ہوا چنانچہ نقل قطعہ عرضداشت بجنسہ درج ذیل ہے:

قطعہ

گفتم بخرد بخلوتِ انس، کاے شمع و چراغ ہفت ایواں
آیا ز چہ رو بود کہ نواب ننوشت جواب نامہ ام ہاں
آں گونہ عریضۂ کہ دانی درویش نوشتہ سوئے سلطاں
آنگہ نہ قصیدۂ کہ گوئی از صفحہ دمیدہ سنبلستاں
ایں ہر دو رسید نیست پیدا زاں سو اثرے بہ ہیچ عنواں
رنجید مگر ز مدح نواب اے کاش نہ گشتمے ثنا خواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم از گفتۂ خویشتن پشیماں
عقلم بجواب گفت غالب زنہار مخور فریبِ شیطاں،
نواب بفکر ارمغاں ہست تا نامہ فرستدت بہ ساماں،
دانیا کہ بخاطرش گذشت است زود آں ہمہ جمع کرد نتواں،
زود ست کہ جمع نیز گردد دیر است کہ دادہ است فرماں
تا راہ رواں بجرد برگرد، آرند بکوشش فراواں
دیبا ز دمشق مخمل از روم الماس ز معدن و زر از کاں
قبل از دکن و زمرد از کوہ توسن ز عراق، دُر ز عماں
فیروزۂ نغز از نشاپور یاقوت گزیدہ از بدخشاں
ز بغداد شمشیر برندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر زربفت گراں بہا ز ایراں

باجملہ درنگ چوں ازیں بہت — پیرانہ وبال نیست بر آں
چوں پیر خرد بہ دلفریبی — گفت ایں ہمہ رازہائے پنہاں
گشتم بدم امید واری — مرہم بہ زخم یاس و حرماں
گفتم کہ چو بامن ایں کرم کرد — آں قبلہ و کعبہ گاہ اعیاں
ناچار بہ راہِ حق گزاری — تا کردہ شود تلافی آں
من نیز طلب کنم برایش — ایں مشکل اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیماں
از عالم غیب جام جمشید — از چشمۂ خضر آب حیواں
عمر ابد و نشاطِ دائم — نیروے دل و ثبات ایماں
توفیق جواب نامۂ خویش — تعجیل عطا و بذل احساں

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزائے موصوف کے تعلقات ریاست ٹونک سے خاصے تھے اور یہ رسم و راہ ایک مدت تک قایم رہی، نواب وزیرالدولہ کے انتقال کے بعد ایک خط جو میرزائے موصوف نے والیٔ رامپور کو یکشنبہ بتاریخ ۱۸ جون ۱۸۶۶ء کو لکھا تھا وہ خط نواب محمد علی خاں صاحب بہادر والیٔ ٹونک کو کسی ذریعہ سے مل گیا۔ اور وہی خط نواب صاحب کی ناراضگی کا باعث ہوکر تعلقات باہمی کی کشیدگی کا سبب ہوا۔ جس کی عبارت درج ذیل ہے :۔

عبارت خط

(۴۹) از مکاتیب غالب

"پیر و مرشد از راہِ خیرخواہی ایک امر عرض کرتا ہوں محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں رئیس ٹونک نے بعد مسند نشینی گورنمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو جزو "ملک و جنگ" لکھ کر دئے اور وہاں سے وہ ان کو عطا ہوئے حضور کے اجداد امجاد نے سلاطین بابریہ کا خطاب نہ قبول کیا مگر حضرت کے جد امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔

حضرت اگر مناسب جانیں تو اس خطاب کو معہ دو جزو "شمس الملک" و "بہرام جنگ" جناب ملکۂ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ اپنے واسطے لیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
دولت و عز و جاہ روز افزوں

ترقی دولت کا طالب
غالب
۱۸ جون ۱۸۶۶ء

نواب محمد علی خاں صاحب نے خط مذکورہ کی بعض عبارت اور نفس مطلب کو اپنی شان کے شایاں نہ خیال کرتے ہوئے میرزائے موصوف سے ترک تعلق کرلیا۔

ع۔م۔ تونکی

فن ڈرامانویسی

ڈراما کس طرح پیدا ہوتا ہے

انسان اپنے جذباتِ مسرت والم کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتا ہے، کبھی الفاظ سے، کبھی اشاروں سے، کبھی چہرہ کے آثار چڑھاؤ اور کبھی اعضاء کی جنبش و حرکت سے اپنی ناپسندگی
اظہار کبھی تو وہ اس طرح کرتا ہے کہ زبان سے کہدیتا ہے۔ یہ بات مجھے پسند نہیں۔ کبھی وہ صرف نفرت سے اپنا منھ دوسری طرف
پھیر لیتا ہے کبھی چہرہ پر شکنیں ڈال کر اس کا اظہار کرتا ہے اور کبھی کبھی جب وہ بیک وقت ان تمام ذرائع سے کام لیتا ہے اس میں زیادہ زور
پیدا ہو جاتا ہے اظہار جذبات کے ذریعہ بعض فطری ہوتے ہیں اور بعض اکتسابی۔ آواز ایک فطری چیز ہے مگر کسی خاص طریقہ سے
اس کا استعمال اکتسابی چیز ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی مختلف قسم کی آوازیں تو نکالنے لگتا ہے لیکن کوئی خاص زبان استعمال نہیں کرتا
جب وہ بڑا ہوتا ہے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو بولتے سنتا ہے تو ان کی نقل کرتا ہے اب اس نقل سے وہ چند الفاظ سیکھ لیتا ہے
اور پھر ان الفاظ کے معنی سمجھتا ہے مثلاً اس کو بھوک لگتی ہے تو وہ روتا نہیں ہے بلکہ بھوک بھوک چلاتا ہے۔ لیکن صرف کہدینے
سے اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ اعضاء کی جنبش، چہرہ کے اتار چڑھاؤ کی آواز و پستی سے بھی اپنے جذبات کا اظہار
کرتا ہے۔ کسی کا محض یہ کہدینا کہ میں بہت رنجیدہ ہوں وہ اثر پیدا نہیں کرتا جو چہرہ کے اتار چڑھاؤ اور اعضاء کی جنبش سے پیدا ہو سکتا
ہے۔ اس لئے اظہار رنج و مسرت کے لئے زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے، اگر زبان نہ ہو تو ہم اشاروں کے ذریعہ سے اپنے مطلب کا
اظہار کر سکتے ہیں بہرحال اگر زبان سے کوئی بات کہدیں اور اشاروں سے اس میں تاثر پیدا نہ کریں تو ہماری بات میں زور پیدا نہیں ہو سکتا
اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جب انسان سوسائٹی میں رہتا ہے تو وہ ضرور مختلف طریقوں سے دوسروں کے تاثرات کو بھی
محسوس کرتا ہے اور پھر دوسروں کے سامنے ان تاثرات کو پیش کرتا ہے اور جب وہ اس طرح دوسروں کی نقالی کرتا ہے تو ڈراما یا
ناٹک وجود میں آتا ہے۔ گویا ڈراما یا ناٹک انسان کے جذبۂ نقالی کا اظہار ہے۔ ارسطو انسان کو سوشل حیوان ہونے کے ساتھ ساتھ
نقال حیوان بھی قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نقالی انسان میں بچپن سے ودیعت کی جاتی ہے اور فطرتاً انسان نقالی سے خوشی محسوس
کرتا ہے۔

ڈراما، تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے اور جب تک انسان میں نقالی کا جذبہ موجود ہے ڈراما یا ناٹک بھی
موجود رہے گا۔ ڈراما چونکہ صرف دوسروں کے احساسات و جذبات کو منتقل کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے سوسائٹی کی تمدنی
معاشرتی پہلوؤں کو بھی پیش کرتا ہے اس لئے وہ دیگر صنف ادب سے اہمیت میں کسی طرح کم نہیں۔ ڈراما یا ناٹک کی اہمیت جو اسکو
دیگر اصناف ادب سے ممتاز کرتی ہے وہ اسکی عوام سے قربت ہے کیونکہ جب ڈراما اسٹیج کیا جاتا ہے تو اس کو دیکھنے والا کوئی مخصوص
طبقہ نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی کے ہر طبقہ کے افراد اس میں شامل ہوتے ہیں، ڈراما نگار ناول نویس یا افسانہ نگار کی طرح اپنی تخیل
کے مقصود کو محض الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا بلکہ اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ کرداروں اور مکالموں سے اپنے مقصد کو اس طرح
پیش کر دے کہ عوام کے سامنے وہ آئینہ ہو جائے اس لئے ڈراما کو پیش کرنے میں صرف مصنف ہی کی محنت کافی نہیں ہوتی بلکہ کرداروں کو
بھی محنت کرنا پڑتی ہے۔

ڈراما کے لوازم

(۱) اسٹیج :- شیکسپیر کے زمانہ میں عام طور پر اسٹیج تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا - (۱) پہلا یا سامنے کا اسٹیج جو کسی بھی کھلی ہوئی جگہ مثلاً سڑک، یا میدان وغیرہ کا کام دیتا تھا - (۲) دوسرا عقبی اسٹیج جس میں کچھ فرنیچر ہوتا تھا اور جو کسی محل - کمرہ یا کونسل ہال یا اسی قسم کے اندرونی مقامات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا - (۳) تیسرا یا بالائی اسٹیج جو آرام کرنے یا سنگھار کے کمرہ کا کام دیتا تھا - اس زمانہ میں اسٹیج کی اس سادگی کے باعث سین تبدیل کرنے میں آسانی ہوتی تھی ایک ہی سین میں ایکٹروں کی تبدیلی سے مقام تبدیل کر دیا جاتا تھا اور دیکھنے والے تصور میں سین تبدیل ہوتا محسوس کر لیتے تھے - موجودہ زمانہ کے اسٹیج کی پیچیدگیاں ناظرین کو بھی اُلجھن میں ڈال دیتی ہیں اور وہ بمشکل اپنی توجہ پلاٹ و کردار پر مرکوز کر سکتے ہیں -

(۲) ایکٹر :- اسٹیج ڈراما کے ساتھ ہمارے ذہن میں ایکٹر کا خیال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی اہمیت وہی ہے جو موسیقی میں آواز کی - موسیقار خواہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کی آواز میں رس اور کشش نہیں ہے تو وہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب منعطف نہیں کر سکتا - اسی طرح اگر ایکٹر جذبات و احساسات کو اسی طرح پیش نہیں کر سکتا جس طرح ڈراما نویس نے محسوس کیا ہے تو ڈراما کامیاب نہیں ہو سکتا، اداکاری خود ایک آرٹ ہے اور اداکار بہت بڑا آرٹسٹ، ایک اداکار کی انتہائی کامیابی یہ ہے کہ وہ جس کردار کی نقل کر رہا ہے خود اس سے اس قدر قریب ہو جائے کہ دیکھنے والوں کی ہمدردی و نفرت کے اس کی ذات سے وابستہ ہو جائے اداکار کا کام صرف مکالمے ادا کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ ان میں ان کی صحیح روح بھر دے - وہ سمجھ لے کہ کہاں اس کو اپنی آواز کم کرنا ہے کہاں زیادہ - کن الفاظ کو رک رک کر ادا کرتا ہے اور کن الفاظ کو تیزی سے - کس لفظ پر زور دینا ہے اور کس پر نہیں - ہم تو ہم روز کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو سپاٹ بولنے کے عادی ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ ان کے دلایل ٹھوس اور گفتگو مدلل ہوتی ہے اکثر اس شخص سے مقابلہ میں ناکامیاب ہو جاتے ہیں جو عام گفتگو اور بول چال میں الفاظ کے استعمال میں مہارت رکھتے ہیں ایک اداکار کا خاص فن اشاروں کے ذریعہ سے احساس و جذبات کا اظہار ہے - اگر وہ تاثرات کو اپنے چہرہ اور حرکت سے پیدا نہیں کر سکتا تو وہ کوئی خاص تاثر پیدا نہیں کر سکتا -

(۳) دیگر لوازم :- ڈراما کی طیاری صرف ایک اچھے اداکار اور مکالموں کو اچھی طرح ادا کر دینے پر ختم نہیں ہو جاتی - بلکہ اسٹیج پر اس ماحول کو پیش کرنا ہے جو وقت و زمانہ کے مطابق ہو - اگر اس میں قومی خصوصیت، کلچر، زبان اور مکان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو وہ محض بیکار ہے فرض کیجئے ہندوستان میں ایک ڈراما اسٹیج کیا جا رہا ہے جس میں باز بہادر اور روپ متی کی داستانِ محبت ہے - اب اگر باز بہادر ایک موجودہ جنٹلمین کی طرح منھ میں سگار دبائے، سر پر ہیٹ رکھے اور سوٹ بوٹ سے لیس ہو کر آتا ہے تو کوئی شخص اپنی ہنسی ضبط کر سکیگا اس لئے اسٹیج اور لباس کی طیاری میں زمانہ کے ماحول، تہذیب، معاشرت اور اس کے ساتھ ساتھ زبان اور قومی خصوصیات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے -

ناول اور ڈراما

تاریخی اعتبار سے ڈراما ناول سے قدیم تر چیز ہے اور ان کے اجزائے ترکیبی کو ایک سمجھنا بڑی غلطی ہوگی - انسان کی دلچسپی ہمیشہ سے انسانوں کے جذبات و احساسات سے رہی ہے اور انسان کی اس خواہش پر ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ جب ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ہمارے درمیان سوشل تعلقات قایم ہوتے ہیں تو بھی باوجود بے انتہا بے تکلفی کے اپنے کردار پر ایک نقاب ڈالے رہتے ہیں - اس نقاب کو الٹ کر دیکھنے کی ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے اور اس کی یہ خواہش کبھی داستان کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کبھی ڈراما کی صورت میں کبھی ناول کے روپ میں اور کبھی نظم کے انداز میں - ناول ایک مکمل ادبی صنعت ہے اور ڈراما مکمل طور پر صنف ادب نہیں - اس کے لئے اسٹیج کی ضرورت بھی ہوتی ہے اس لئے ڈراما جس قدر پابند ہے ناول اسی قدر آزاد ہے - اس لئے ڈراما انتہائی مشکل آرٹ ہے اور ناول اس کے مقابلہ میں آسان ہے - ڈراما لکھتے وقت اسٹیج کے متعلق پوری معلومات نہایت ضروری ہیں، ولیم ہنری ہڈسن لکھتا ہے کہ ناول ہر شخص لکھ سکتا ہے

جس کے پاس قلم دوات اور کاغذ ہے، لیکن ڈراما لکھنے کے لئے اور بہت کچھ چاہئے، ان دونوں میں سب سے اہم فرق تکنیک کا فرق ہے۔ ولیم ہنری ہڈسن لکھتا ہے کہ: "داستان یا ناول کی کہانی بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور ڈراما نقالی ہے جو حرکت و تقریر کے ذریعہ کی جاتی ہے" ناول ایسی صنف ادب ہے جو اپنے اندر ہر چیز کو محیط کر لیتی ہے اور ہر وہ چیز جو ناول نگار بیان کرنا چاہتا ہے، آسانی سے بیان کر دیتا ہے نیز اس کے ساتھ قاری کا ذہن خود بخود اس چیز پر غور کرتا اور محسوس کرتا چلا جاتا ہے جو ناول نگار نے محسوس کیا ہے۔ برخلاف اس کے ڈرامہ قاری کو ہزاروں الجھنوں میں پھنسا دیتا ہے اور اس لئے ہر شخص ڈرامہ میں وہی دلچسپی محسوس نہیں کر سکتا جو ناول میں ہوتی ہے حالانکہ موجودہ ڈرامہ میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ڈراما نویس ان معمولی معمولی جزئیات کو بھی بیان کر دے جو اسٹیج سے متعلق ہیں۔ وہ اگر کمرہ کا سین بیان کرتا ہے تو کمرہ کے فرنیچر اور اس کی آرائش سے لیکر معمولی معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ کرداروں کے کپڑوں کے رنگ ان کے پہننے کے طریقوں تک کو بیان کرتا ہے وہ کرداروں کی حرکات و سکنات، ان کا لب و لہجہ، چہرہ کے اُتار چڑھاؤ، آواز کی بلندی و پستی تک بتلاتا ہے اور بعض ڈرامہ نویس تو کرداروں کے تعارف کے وقت ان کے کیرکٹر تک پر ریمارک کر دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہر شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ڈرامہ پڑھتے وقت ان معمولی جزئیات پر ایسی ہی نظر رکھے گا۔ ڈراما اور ناول میں یہ ایک ایسا بین فرق ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ کر دیتا ہے۔

ڈراما کی بنیاد کسی فنکار سے یہ توقع رکھنا کہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر ایک ہی وقت میں روشنی ڈال سکے گا، صحیح نہیں۔ کیونکہ زندگی ہزاروں اختلافات سے بھری پڑی ہے۔ ڈراما نویس زندگی کے کسی ایک پہلو کو منتخب کر لیتا ہے، واقعات میں ایک ربط و تسلسل پیدا کرتا ہے اور پھر کرداروں کے ذریعہ ان کو پیش کرتا ہے۔ اگرچہ ڈراما نویس خود ان کے متعلق اپنی کوئی رائے نہیں دے سکتا مگر پھر بھی یہ کہہ دینا کہ مصنف خود کو اس سے علٰحدہ رکھتا ہے درست نہیں۔ خود ڈراما نویس کی ذات اور اس کے نظریے اکثر گوشوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ جب ڈراما نویس اس طرح زندگی کے کسی ایک پہلو یا سوسائٹی کی کسی خاص کمزوری کو منتخب کر لیتا ہے تو یہی اسکے ڈرامہ کا مواد ہوتا ہے۔ اب ڈراما نویس مجبور ہوتا ہے کہ وہ کرداروں کے مکالموں اور سین کی تبدیلیوں کو اپنے مواد سے وابستہ رکھے وہ کردار، ماحول اور کردار کی پوزیشن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ڈراما کی ماہیت اور مواد میں، چولی دامن کا ساتھ ہے ان دونوں کو آپس میں جوڑے رکھنے میں ڈرامہ نویس کو واقعات میں کافی کاٹ چھانٹ کرنا پڑتی ہے اور اب یہ اس کی صلاحیت پر موقوف ہے کہ وہ کس واقعہ کو ڈراما کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے اور کس کو نہیں اور کون کون واقعات کو اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اور کرداروں کے اُبھارنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

صرف واقعہ اور مواد ہی وہ چیزیں نہیں جن پر ڈراما کی بنیاد ہوتی ہے بلکہ اس کے علاوہ کشمکش (Conflict) ڈرامہ کا سب سے اہم جزو ہے۔ بلا کشمکش کے ڈراما وجود میں نہیں آ سکتا۔ کشمکش مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ کبھی دو انسانوں میں کشمکش ہوتی ہے، کبھی انسان اور سوسائٹی میں، کبھی حقائق اور جذبات میں، کبھی خود اپنی خواہشات کی، جو قصہ کے ذریعہ بیان کی جاتی ہیں۔ اس طریقہ سے ہر ڈراما کسی نہ کسی کشمکش سے شروع ہوتا ہے۔

ڈراما کا ڈھانچہ

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جب یہ کشمکش شروع ہو جاتی ہے تو وہ کن کن مراحل سے گزرتی ہے ——————

—————— اس کشمکش کے شروع ہونے کے لئے کسی خاص حادثہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر حالات و واقعات ہمارے نظروں کے سامنے آنے لگتے ہیں اور یہ واقعات مختلف مراحل سے گزرتے ہیں اور پھر اس حادثہ کا کوئی خاص نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ڈراما کو پانچ قدرتی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور انہی پانچ حصوں کے پیش نظر پرانے ڈرامے پانچ ایکٹ کے لکھے جاتے تھے۔ لیکن اب اس خیال میں صرف اتنی تبدیلی ہوئی ہے کہ ڈراما کو حسب ضرورت ایکٹوں میں تقسیم کر لئے جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ڈراما کے یہ پانچ حصے

ہم کو علیحدہ علیحدہ صاف نظر نہیں آتے۔ مگر وہ ہر ڈراما میں موجود ہوتے ہیں

پانچ قدرتی حصے مندرجۂ ذیل ہیں :-

(۱) تمہید واقعہ - (۲) اُلجھاؤ - (۳) نقطۂ عروج - (۴) سلجھاؤ - (۵) انجام (Conclusion) لیکن ان سب سے پہلے تمہید یا انکشاف ضروری ہے۔

(۱) تمہید یا انکشاف :- اس میں ناظر کو ان ضروری باتوں کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں جو ڈراما سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ڈراما میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے متعلق ڈراما نویس تو بہت کچھ جانتا ہے مگر ناظر نہیں۔ اسی طرح ڈراما میں سیکڑوں کردار یکے بعد دیگرے ناظروں کے سامنے آتے ہیں جن کے متعلق ڈراما نویس تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کون ہیں اور مختلف کرداروں کا آپس میں کیا رشتہ ہے مگر ناظر اس سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں اس لئے ان کا تعارف ڈراما نویس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے مختلف طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے کبھی تو اس قسم کے تعارف کو کسی ایک کردار کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے اور کبھی خود کلامی کے ذریعہ اکثر کردار اپنا تعارف کراتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے غیر موزوں اور غیر مناسب ہیں۔ اگر پہلا طریقہ ناظر کے لئے اکتا دینے والا ہوتا ہے تو دوسرا طریقہ قطعی غیر دلچسپ اور غیر قدرتی اس لئے ڈراما نویس عام طور پر اس کو مکالمات کے ذریعہ پیش کرتا ہے اور مکالمات کے درمیان میں ایسی دلچسپیاں پیدا کرتا جاتا ہے کہ ناظر اکتاتے نہیں بلکہ ان میں گہری دلچسپی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایک قادر ڈراما نویس کے فن کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ تعارف کو وقتاً فوقتاً اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ بالکل ڈرامہ کا جزو بن جائے، بہر حال اس سلسلہ میں جو چیز قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ انکشاف یا تعارف کا واضح، مختصر ڈرامائی اور پلاٹ سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی بناوٹ کی جھلک نظر نہ آئے۔

(۲) اُلجھاؤ یا کشمکش :- پردہ اُٹھتے ہی ڈراما کا پلاٹ شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ کشمکش جس پر ڈرامائی بنیاد رکھی گئی ہے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ عام طور پر کوئی پیچیدگی اور کشمکش آہستہ آہستہ کسی کردار کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اور تدریجی طور پر واضح اور صاف ہوتی چلی جاتی ہے جس سے مختلف کرداروں کے درمیان جدوجہد شروع ہو جاتی ہے اور اب وہ کیفیت جو ایک فرد سے متعلق تھی آہستہ آہستہ دوسروں پر اثر ڈالنے لگتی ہے یہ ضروری نہیں کہ یہ کشمکش یا پیچیدگی جو ایک کسی فرد کے اندر پیدا ہوئی ہے کسی ایک واقعہ کا ردِ عمل ہو بلکہ کبھی تو یہ پیچیدگی کسی ایک واقعہ سے متاثر ہو کر شروع ہوتی ہے اور کبھی متعدد واقعات کسی فرد میں ایک خاص کیفیت پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں مگر یہ بات ڈراما نویس کے ذہن میں ہمیشہ رہتی ہے کہ امر واقعہ کے اندرونی اور بیرونی حالات کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ ناظر کے سامنے دونوں پہلوؤں سے آئینہ کی طرح صاف اور روشن ہو جائیں۔ کبھی کبھی کسی ڈراما میں دو مختلف کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں اہم کہانی کی پیچیدگی تو فوراً ظاہر ہو جاتی ہے مگر دوسری کہانی کی پیچیدگی جو اس کے ساتھ حرکت کر رہی ہے دیر تک سامنے نہیں آتی۔ پیچیدگی یا کشمکش شروع ہونے کے بعد ڈراما کا سب سے اہم دور شروع ہوتا ہے جس میں کہانی، ماحول، اثرات اور پیچیدگیوں سے گزرتی ہوئی نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی ہے۔ یہی وہ دور ہوتا ہے جس سے کسی ڈراما نویس کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی طرح واقعات۔ حالات اور کرداروں کے اندرونی احساسات کا جایزہ لے رہا ہے۔ ایک ذہین اور فنکار ڈراما نویس غیر ضروری واقعات کو خواہ وہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں نظر انداز کر دیتا ہے اور ضروری واقعات کو بھی اختصار سے پیش کر کے اپنی فنکاری کا ثبوت دیتا ہے ڈراما کے اس حصہ میں اس بات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ واقعات میں ربط ہو اور کوئی غیر متعلق واقعہ پیش نہ کر دے یا کوئی ایسا واقعہ جو کردار کے مطابق نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کہانی برابر آگے بڑھتی رہے۔ اگر کہانی آگے نہیں بڑھتی تو پھر ڈراما نویس مکالموں میں کتنا ہی تعدد کیوں نہ پیدا کرے ڈراما غیر دلچسپ اور غیر موثر ہوگا، کہانی کے واقعات میں تسلسل ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ واقعات نتائج غیر حقیقی نہ معلوم ہوں

(۳) نقطۂ عروج :- چونکہ ڈراما کے واقعات کا سلسلہ لامتناہی نہیں۔ اس لئے جلد یا بدیر ایک ایسا مقام آجاتا ہے جہاں واقعات کے مطابق کہانی ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے جس کو ہم ڈراما کا نقطۂ عروج کہتے ہیں۔ ویسے تو ڈراما میں ایسے کئی مقام آتے ہیں کہ لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں کہ اب کیا ہوگا۔ لیکن ڈراما کا نقطۂ عروج وہی ہے جہاں سے کہانی ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوتی ہے جہاں سے ایک نیا موڑ

اختیار کرلیتی ہے ڈراما کو نقطۂ عروج تک پہونچانے اور اس کو ایک نیا موڑ دیتے وقت اس کا لحاظ ضروری ہے کہ جو موڑ کہانی میں پیدا ہوا ہے وہ غیر فطری تو نہیں، بعض مصنفین نقطۂ عروج کو فوراً نہیں لاتے بلکہ برابر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے نقطۂ عروج کو دور رکھا جائے۔ بہر حال نقطۂ عروج جلد آجائے یا بدیر۔ لیکن اس کو قدرتی اور منطقی ہونا ضروری ہے۔ ڈراما میں نقطۂ عروج نہایت اہم حصہ ہے کیونکہ ڈراما جس قدر نقطۂ عروج سے قریب ہوتا جاتا ہے، ڈراما نویس کی ذہانت و فنکاری کا امتحان سخت سے سخت ہوتا جاتا ہے۔ یوں تو ہر شخص پہلے ہی سے نتیجے کے متعلق اپنی رائے قایم کرلیتا ہے کہ ایسا ہوگا مگر پھر بھی اس کے ذہن میں ایک بے چینی ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد سب کچھ معلوم کرلے اسکی سانس رک جاتی ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے اور اپنے اس کردار کی قسمت کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا یہ کردار جلد از جلد کشمکش سے گزر جائے جس میں وہ مبتلا ہے۔ یہ حصہ ڈراما کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے اگر یہ ڈراما نویس کی خامکاری کے باعث کمزور رہ گیا تو پھر ڈراما کی دلچسپی اور اہمیت ختم ہوجاتی ہے، چونکہ یہ ڈراما کا سب سے دلچسپ حصہ ہے اس لئے عام طور پر ڈراما نویس اسکو دیر تک سامنے نہیں لاتے تاکہ لوگوں کی دلچسپی ختم نہ ہو۔

(۴) سلجھاؤ :- نقطۂ عروج گزر گیا اور ڈراما اب چوتھے دور میں داخل ہوتا ہے، جس کو سلجھاؤ کہتے ہیں۔ اگر ڈراما کامیڈی ہے تو پھر ہیرو اور ہیروئن کے سامنے سے وہ مشکلات علحدہ ہونا شروع ہوجاتی ہیں جن کے باعث انھیں الجھنوں، پیچیدگیوں اور کشمکش میں مبتلا ہونا پڑا تھا اور اگر ٹریجڈی ہے تو پھر وہ تمام عناصر ہٹنا شروع ہوجاتے ہیں جن کے باعث برائیاں ابھی تک اپنا اثر قایم نہیں کرسکی تھیں۔ اب وہ آزادی سے اپنا عمل کرنے لگتی ہیں۔ بہر حال ڈراما کا نتیجہ طربیہ ہو یا المیہ نقطۂ عروج تک پہونچنے سے پہلے ناظر یا قاری جس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا وہ دور ہونے لگتی ہے، لیکن اب ایک مشکل یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ کس طرح دلچسپی کو برقرار رکھا جائے۔ اسی لئے عام طور پر ڈراما نویس نقطۂ عروج تک کہانی کو پہونچانے میں دیر لگاتے ہیں اور نقطۂ عروج کے بعد بہت تیزی کے ساتھ نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اس مشکل مسئلہ سے آسانی سے گزر جائیں، المیہ ڈراموں میں تو یہ دلچسپی برقرار رہتی ہے مگر طربیہ ڈراموں میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے کچھ ایسے ایسے واقعات پیش کرنا پڑتے ہیں جس سے انجام تک پہونچنے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہوجائیں، اب چونکہ واقعات کا ایک نیا موڑ شروع ہوجاتا ہے اس لئے ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ اب واقعات میں تسلسل کی ضرورت نہیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اب تو ڈراما نویس کے آرٹ کا اور سخت امتحان شروع ہوجاتا ہے۔ اس حصہ کے ہر واقعہ کو تمام واقعات سے مربوط ہونا چاہئے۔

(۵) انجام :- چوتھے مرحلے سے گزرنے کے بعد ڈراما اب آخری مرحلہ یعنی اختتام یا انجام میں داخل ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے ڈرامے عام طور پر کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہونچاتے۔ نتیجہ کو اس طرح مبہم چھوڑ دینے کا منطقی سبب یہ ہے کہ زندگی بہت پیچیدہ اور ہزاروں تضاد کا مجموعہ ہے، ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اس لئے زندگی کے پیچیدہ واقعات کے متعلق کوئی آخری رائے دینا ممکن نہیں بلیکن ڈرامہ میں چونکہ زندگی کو ہم آرٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے اس میں انجام کو اس طرح مبہم چھوڑ دینا غلط ہے ڈراما طربیہ ہو یا المیہ، ڈراما نویس کے لئے یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ڈراما کے انجام کو ان حالات سے مربوط رکھے جو جد و جہد کے درمیان ظاہر ہوئے تھے اور نقطۂ عروج پر پہونچنے سے قبل جن کے متعلق ایک دھندلا سا تصور پیدا ہوگیا تھا۔ جس طرح واقعات اور ان کے نتائج کو غیر منطقی نہ ہونا چاہئے اسی طرح انجام بھی غیر منطقی نہ ہونا چاہئے۔ ڈراما کو المیہ سے بچانے کے لئے درمیان میں کسی ایسے واقعہ کو داخل کر دینا جو اس کے انجام کو تبدیل کردے، یوں تو غیر مستحسن ہے مگر ان مصنفین کو جو طربیہ ڈراما لکھتے ہیں اس قدر موقع ضرور دیا جاتا ہے کہ وہ انجام کو المیہ سے بچانے کے لئے کسی ایسے غیر متوقع واقعہ کے اظہار یا کسی کردار کو یکایک سامنے لاکر واقعات کے رخ بدل دیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ڈراما کی اخلاقی و جمالیاتی قدریں مجروح نہ ہوں۔

پلاٹ پلاٹ ڈراما کا بڑا اہم حصہ ہے جس کے بغیر کوئی ڈراما وجود میں نہیں آتا۔ اگر ہم ڈراما اور ناول کے پلاٹ کا مطالعہ کریں تو ہم کو دونوں کے اجزائے ترکیبی میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ مگر دونوں کو مختلف حالات میں کام کرنا پڑتا ہے ناول نگار کو آزادی ہوتی ہے کہ

وہ جس قدر چاہے اپنے مواد کو پھیلائے مگر ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا، ناول پڑھتے وقت قاری جس قدر چاہے وقت دے سکتا ہے مگر ڈراما نویس کو یہ آسانی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ جب کوئی شخص ڈراما کو دیکھنے بیٹھتا ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کو ایک مرتبہ ہی میں دیکھ لے۔ اس لئے ڈراما نویس کو ہر ہر مقام پر اختصار کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اس لئے وہ واقعات میں کاٹ چھانٹ اور غیر ضروری واقعات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ارسطو نے ڈراما نویس کو نصیحت کی ہے کہ اسے اپنے پلاٹ کی ترتیب میں کسی داستان کو کام میں نہیں لانا چاہئے کیونکہ داستانیں عام طور پر غیر ضروری اور غیر دلچسپ واقعات سے پر ہوتی ہیں۔ اس لئے ڈراما کے پلاٹ میں غیر ضروری واقعات خواہ وہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں، نظر انداز کر دینا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول نگار کے مقابلہ میں ڈراما نویس کو یہ آسانی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو ——— اسٹیج سیٹنگ کے ذریعہ ظاہر کر دیتا ہے اور ان تمام غیر ضروری تفصیل سے بچ جاتا ہے جو ناول نگار کے لئے ناگزیر ہیں۔

جب ہم پلاٹ کا ذکر کر رہے ہیں تو سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈراما نویس نے جو پلاٹ منتخب کیا ہے اور جو واقعات وہ پیش کر رہا ہے وہ زندگی سے کس قدر قریب ہیں وہ زندگی کی صحیح نمایندگی بھی کرتے ہیں یا نہیں وہ کچھ ایسے واقعات تو نہیں جو زندگی سے ہم آہنگ نہ ہوں ——— دوسری چیز پلاٹ کی ترتیب میں اخلاقی قدریں ہیں ایک ڈراما اسی وقت بڑا کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کی جڑیں ہماری روزانہ کی زندگی میں بہت گہری ہوں وہ ایسے لوگوں کی داستانیں نہ ہوں جو ما فوق الفطرت ہیں جو زندگی سے بہت دور ہیں اور جن کا عام زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کی داستانیں ہوں جو عام انسانوں کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو ہماری زندگیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ہم کو زندگی سے متاثر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ڈراما کو صرف انسانی زندگی کے اس حصہ کا نمایندہ سمجھ لیا جائے جس کو ٹریجڈی کہتے ہیں بلکہ ڈراما کا تعلق انسانی زندگی کے اس حصہ سے بھی ہے جس کو کامیڈی کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان جہاں اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں میں دلچسپی لیتا ہے وہیں اس کی زندگی کا انحصار روز کی ان چند خوشیوں پر بھی ہے جو اس کو حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے پلاٹ کے انتخاب میں خواہ زندگی کے روشن پہلو کو دیکھا جائے خواہ تاریک کو اسے زندگی سے علیحدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ قریب تر ہونا چاہئے کیونکہ ڈرامہ کے پلاٹ کی بڑائی اس کی حقیقی زندگی کی قدروں میں پوشیدہ ہے۔ پلاٹ اور واقعات منتخب کرتے وقت ڈرامہ نویس کا اولین فرض ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہے جن پر وہ بغیر جھجک کے رائے دے سکے۔ اس سے ایک فایدہ یہ بھی ہوگا کہ ایک ہی واقعہ پر مختلف ڈراما نویسوں کی رائیں دلچسپی کا سبب بن سکتی ہیں۔

۔۔۔۔۔۔ ہم پلاٹ کی دو قسمیں کر سکتے ہیں، مربوط و غیر مربوط۔ غیر مربوط پلاٹ میں تسلسل و ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ وہ واقعات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جن میں سے کچھ کا تعلق اصل واقعہ سے ہوتا ہے اور کچھ کا نہیں۔ ایسے پلاٹ غیر دلچسپ ہوتے ہیں اور دیکھنے والے جلد گھبرا اٹھتے ہیں۔ برخلاف اس کے مربوط پلاٹ میں واقعات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ تمام واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں ناظر یا قاری کو ڈرامہ کی غایت سمجھنے میں زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑتی بلکہ وہ آسانی سے اس مرکزی خیال کو پا لیتا ہے جس پر ڈرامہ کی بنیاد قایم ہو۔ اس طرح کے پلاٹ پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ واقعات کا یہ تسلسل غیر قدرتی چیز ہے۔ اس اعتراض کو کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی میں واقعات کا تسلسل کے ساتھ پیش آنا ناممکن نہیں ہے اور زندگی میں ایسے واقعات کا پیش کرنا کہ ان میں تسلسل اور ربط ہو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں پہلی چیز متوازیت (Parrallalism) اور دوسری تقابل (Contrast) ہے۔ متوازیت ڈراما کو زیادہ ذی اثر بنانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی جیسے واقعہ کو دہرایا جائے یعنی اگر کوئی واقعہ ڈرامے کے حصہ میں پیش آیا ہے تو بالکل ایسا ہی دوسرے حصہ میں دوسرے طریقے سے پیش کیا جائے۔ اس سے ڈرامائی قدریں بڑھ جاتی ہیں اور وہ تمام مختلف اجزا جن کے ذریعہ سے ڈراما کا پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے ایک وحدت میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈراما دو مختلف پلاٹوں سے ترتیب دیا جاتا ہے جن میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر جیسے ایک ہی واقعہ

ایک ہی خیال دونوں کہانیوں کا علحدہ علحدہ محرک بنتا ہے تو ہمیں ڈراما کی غایت سمجھنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی بلکہ متوازیت کی اس طرح کی مثالیں ہم کو شیکسپیر کے ڈراموں میں بہت ملتی ہیں - A Midsummer Night dream اس کی بڑی اچھی مثال ہے جس میں ڈراما نویس محبت کو ایک خلاف عقل جذبہ سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسا جذبہ جس میں لڑکیاں اپنے والدین کی حکم عدولی کرتی ہیں اور عشاق تباہی کی زندگی بسر کرتے ہیں اس میں شیکسپیر نے اپنے مرکزی خیال کو نمایاں کرنے کے لئے اصل پلاٹ کیساتھ Queen of Fairies کا قصہ شروع کر دیا اور متوازیت سے مدد لیتا ہے اور دونوں کہانیوں میں محبت کے اثرات بتلاتا ہے۔ ڈراما کے پلاٹ کی ترتیب میں تقابل بڑی اہم چیز ہے۔ کیونکہ انسان کو ہر ہر قدم پر ہزاروں اختلافات سے واسطہ پڑتا ہے ... اسی "کشمکش" پر دنیا کی رونق قایم ہے۔ ڈرامہ کے سلسلہ میں اس کو یوں سمجھئے کہ ڈراما یا تو طربیہ انداز میں شروع کیا جاتا ہے اور المیہ انداز میں ختم ہوتا ہے یا المیہ انداز میں شروع ہوتا ہے اور طربیہ طور پر انجام پذیر ہوتا ہے۔ اس سے تمہید سے نقطۂ عروج تک پہونچنے اور نقطۂ عروج سے انجام تک پہونچنے میں ایک نمایاں اختلاف نظر آتا ہے اور خاص طور پر المیہ ڈراموں میں یہ فرق بہت نمایاں ہوتا ہے ——————— ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی حالات کس طرح گزر رہے تھے اور کسی معمولی سی غلطی یا کسی کردار کی معمولی لغزش نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے اور اس طرح پلاٹ کے ان دو حصوں میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اختلاف سنجیدہ اور المیہ ڈراموں میں "کامک" کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے یعنی سنجیدہ پلاٹ کے ساتھ ایک دوسرا پلاٹ شروع کر دیا جاتا ہے جس میں قطعی سنجیدگی اور الم نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر ڈراما نویس متوازیت اور تقابل دونوں سے کام لیتا ہے یعنی پلاٹ جو صرف کامک کے لئے استعمال ہوتا ہے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کا مرکزی خیال اصل واقعہ ہم آہنگ بھی ہو اور ایسا معلوم ہو کہ دونوں واقعے ایک ہی اصل کے حصے ہیں مگر دونوں میں اس طرح اختلاف پیدا ہو جائے کہ ایک واقعہ کو سنجیدہ طور پر دیکھے تو اس پر سنجیدگی کا اثر ہو اور ویسے ہی دوسرے واقعہ کو دیکھے تو قہقہے لگائے۔ اس طرح نقطۂ اختلاف پیدا کر کے ڈرامہ نویس ناظر یا قاری کو ایک وقتی تسکین دینا چاہتا ہے کیونکہ مسلسل ایک ہی قسم کے المیہ اور سنجیدہ واقعات سے انسان دوچار ہوتا رہے تو گھبرا جاتا ہے۔ یہاں ایک اور تقابلی اختلاف کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا اسکو ڈراما کی اصطلاح میں ڈرامائی طنز کہتے ہیں یہ ایک ہی چیز کے دو مختلف روپ ہیں جو تقابل سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اسکی تشریح ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ جو بات اسٹیج پر کہی جاتی ہے ناظر یا قاری کا علم اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلاف یا تو موقع و محل کا ہو سکتا ہے یا واقعہ کا یا طنز کا لیکن اگر غور سے ڈراما کا مطالعہ کیا جائے تو عام طور پر تمام حالتیں ملی جلی ظاہر ہوتی ہیں اور علحدہ علحدہ ان کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر اس کو ہم اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں کہ کسی ڈراما میں کوئی سازش کی جا رہی ہے جس سے قاری بخوبی واقف ہے کہ اس کا علم اس شخص کو ہے جس کے متعلق سازش ہے مگر سازشی گروہ سمجھتا ہے کہ شخص متعلقہ اس سے واقف نہیں۔ اس قسم کے ڈرامائی طنز کی بڑی اچھی مثال شیکسپیر کے ڈرامے ہنری پنجم میں ملتی ہے۔ بعض ڈرامائی طنز اس طرح پیش کئے جاتے ہیں کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ہوگا لیکن انجام ویسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک مجرم کو گرفتار کیا جاتا ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے بے گناہ ہونے کا ثبوت پیش کرے گا مگر جب عدالت میں پیش ہوتا ہے تو مجرم جرم کا اقبال کر لیتا ہے۔ ڈرامائی طنز کا ایک طریقہ ایسے الفاظ کا استعمال بھی ہے جس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک بولنے والا اس کو کسی اور معنی میں بول رہا ہے اور سننے والا اسکے کچھ اور معنے سمجھ رہا ہے یا بولنے والا جو الفاظ بول رہا ہے وہ خود ان کے معنی سے واقف نہیں جن سے مخاطب واقف ہے۔

پلاٹ پر اس قدر بحث کرنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پلاٹ کی فنکارانہ دلچسپی اس بات سے متعلق ہے کہ قصہ کے بعض حصہ کو قاری یا ناظر سے اس وقت تک پوشیدہ رکھے جائیں جب تک کہ اصل بات کا انکشاف خود بخود نہ ہو جائے یا تمام واقعات کیرکٹر اور محرکات کا شروع ہی میں انکشاف کر دینا ضروری ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ تمام جزئیات ڈرامہ کے انکشاف سے پلاٹ کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ اصل دلچسپی خود پلاٹ کے اندر موجود ہوتی ہے اور بہت سی وہ باتیں جن سے ناظر یا قاری واقف ہوتا ہے خود ڈراما میں حصہ لینے والے بہت سے کردار اس سے واقف نہیں ہوتے اور اس طرح ناظر کو کرداروں کے عمل اور رد عمل سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب محرکات اور کرداروں کو پوشیدہ رکھنا بہت بھدا

آسٹ ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام جزئیات کو بیان کر دینا اور پھر پلاٹ کی دلچسپی برقرار رکھنا بہت بڑا آرٹ مانا جاتا ہے
پلاٹ کے ساتھ ساتھ اگر ہم ڈراما کے تین اہم عناصر اتحادِ زمان، اتحادِ مکان اور اتحادِ عمل پر غور کر لیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

سب سے پہلے ہم اتحادِ زمان پر غور کریں۔ اتحادِ زمان سے مراد وہ وقت ہے جس میں اس ڈرامہ کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے عام طور پر چوبیس گھنٹے کا وقت مقرر ہے۔ اس سے زیادہ وقت کی کہانی جو مہینوں اور ہفتوں کے دوران میں ختم ہو جائے بہت مشکل ہے اس لئے اتحادِ زمان کو ڈرامہ کو کوئی ایسا قانون سمجھ لینا کہ اس پر عمل ناگزیر ہے غلط ہے۔ اس کو صرف تھیوری تک تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اتحادِ زمان کے بعد اتحادِ مکان ہے۔ یعنی ڈراما کے واقعات کو جگہ کی قید لازمی ہے۔ یعنی جس شہر یا جس قصبہ کے واقعات کسی کہانی میں دہرائے جا رہے ہیں وہ اس قصبہ یا شہر سے باہر نہ نکلیں۔ اتحادِ مکان کے متعلق ارسطو بالکل خاموش ہے۔ جہاں وہ ڈراما کے متعلق وہ اپنی رائے دیتا ہے وہاں اتحادِ زمان کے متعلق تو لکھتا ہے کہ اس کو سورج کی ایک گردش پر ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن اتحادِ مکان کے متعلق اس کی کوئی رائے موجود نہیں۔ شکسپیر اکثر اپنے ڈراموں میں اتحادِ مکان پر دھیان نہیں دیتا۔ اس لئے ڈراما پر اتحادِ مکان کی قید لگانا مناسب نہیں معلوم ہوتی۔

ان دونوں اتحادوں کو دیکھ لینے کے بعد ہمیں اب اتحادِ عمل پر غور کرنا ہے۔ اتحادِ عمل سے مراد صرف ایک پلاٹ نہیں بلکہ مختلف پلاٹوں کا اتحاد مراد ہے کہ وہ سب ایک ہی پلاٹ کے مختلف اجزاء معلوم ہوں اور ان کا علٰحدہ علٰحدہ کوئی وجود نہ ہو۔

(باقی)

ابراہیم یوسف

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

برنارڈ شا کا یہ ڈرامہ MAN AND SUPERMAN اس کے بہت اہم اور مشہور ڈراموں میں سے ہے، نہ اس لئے کہ وہ ڈرامائی حیثیت سے اس کا شاہکار ہے بلکہ محض اس لئے کہ اس سے برنارڈ شا کا فلسفۂ حیات اور مابعد الطبیعیاتی زاویۂ نظر واضح ہوجاتا ہے۔

نیاز

منظر:—

.......سر بفلک کوہسار معاً پر خموشی و سکوت طاری ہے اور تاریکی بڑھتی جا رہی ہے آگ کے شعلے ایک بار پھر سفید راکھ میں دفن ہوچکے ہیں اور ان کی سرخی اب ختم ہوچکی ہے۔ ستاروں بھرے آسمان کے مقابل کوہستانی چوٹیوں کی تاریکی ناقابل عبور حد تک عمیق نظر آرہی تھی، لیکن اب ستارے غائب ہوچکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود آسمان کائنات کے حدود سے باہر دبے پاؤں کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ کوہسار کے بجائے اب صرف "لاشئے" ہے —— ہر جگہ اور ہمیشہ موجود رہنے والی "لاشئے" —— نہ آسمان —— نہ کوہستان —— نہ روشنی —— نہ آواز —— نہ زماں نہ مکان —— بلکہ ایک مطلق خلاء —— پھر یکایک کسی جگہ سے ایک کمزور سی زرد روشنی ابھرنی شروع ہوتی ہے، جس کے ساتھ ساتھ کسی آسیبی ساز پر ایک لامتناہی نغمہ نرم و مرتعش سروں میں بجنے لگتا ہے۔ فوراً ہی دو تین اور مخفی رباب اس نغمہ میں اپنی جھنکار شامل کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی زرد روشنی میں خلاء کے اندر ایک انسان ظاہر ہوتا ہے۔ ایک "غیر جسمانی" مگر مرئی انسان —— ایک مرد —— "لاشئے" پر متمکن !! —— موسیقی اس کے قریب سے ہوکر گزرتی ہے تو ایک ساعت کے لئے وہ اپنا سر اوپر اٹھاتا ہے لیکن اس کے بعد ہی ایک بوجھل ٹھنڈی سانس کے ساتھ وہ پھر اپنے سر کو انتہائی یاس کی کیفیت میں جھکا لیتا ہے۔ اپنی کوشش میں مایوس و ناکام ہوکر رباب پھر ایک بار اپنا نغمہ ناامیدی کے ساتھ دہراتا ہے اور آخر کار تیز ہوا کے طاغوتی ساز سے اٹھنے والی چیخوں میں یہ راگ دم توڑ دیتا ہے ....

کچھ دیر بعد ہی خلا میں ایک اور ہلکی سی زرد روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ اس مرتبہ اس میں بنفشئی جھلک نہیں بلکہ دھوئیں کی سی ناگوار زردی نمایاں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لامحدود حسرت و غم کا ایک گیت فضا میں پھیلنے لگتا ہے۔ یکایک اس زرد روشنی میں حرکت پیدا ہوتی ہے —— ایک ضعیف عورت ہے —— دانتوں سے محروم —— کمر جھکی ہوئی —— خلاء میں آوارہ —— وہ کسی مذہبی جماعت و مرتبہ کا امتیازی لبادہ پہنے ہوئے ہے۔ سست و مایوس انداز میں وہ اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی ہے —— بالکل اس طرح جیسے ایک شہد کی مکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی پرواز تیز ہوتی ہے اور اس ضعیفہ کی آوارگی بالکل نڈھال ہے۔ آخر کار اپنی اس آوارہ گردی میں وہ اچانک اسی چیز سے متصادم ہوجاتی ہے جس کی اس کو جستجو تھی —— یعنی ایک رفیق ! —— ایک تسکین آمیز آہ کے ساتھ یہ غریب بڑھیا اس مرد کا دامن

رفاقت مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے اور اُسے اپنی خشک و بے کیف آواز میں مخاطب کرتی ہے۔

ضعیفہ — معاف کیجئے۔ مجھے یہاں کی تنہائی پاگل کئے دیتی ہے۔ بڑا خوفناک ہے یہ مقام!

مرد — نو وارد ہیں آپ؟

ضعیفہ — ہاں۔ شاید میں آج ہی صبح مری ہوں۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر چکی ہوں۔ زندگی میں مجھے انتہائی مذہبی جوش نصیب تھا۔ میرے بستر مرگ کے چاروں طرف میرے خاندان کے افراد مغموم کھڑے تھے لیکن میں صرف صلیب پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے لیٹی تھی یکایک میرے سامنے تاریکی چھا گئی — اور جب ایک بار پھر روشنی ہوئی تو وہ یہی روشنی تھی جس کو میں اپنے ساتھ لئے ہوئے آوارہ پھر رہی ہوں لیکن نظر کچھ نہیں آتا۔ میں گھنٹوں سے اس دہشت ناک تنہائی میں سرگرداں ہوں۔

مرد — (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) اُف! آپ ابھی تک وقت کے احساس سے آزاد نہیں ہوئیں۔ یہاں ابدیت کی فضا میں یہ احساس جلد زایل ہو جاتا ہے

ضعیفہ — ہم ہیں کہاں؟

مرد — جہنم میں

ضعیفہ — (پندار کے ساتھ) جہنم! میں اور جہنم میں!! — ایسا کہنے کی جرأت تم کو کیونکر ہوئی؟

مرد — (غیر متاثر انداز میں) کیوں نہیں — محترمہ؟

ضعیفہ — تم نہیں جانتے کہ تم کس سے گفتگو کر رہے ہو۔ میں ایک شریف و معزز خاتون ہوں اور کلیسا کی ایک وفادار کنیز۔

مرد — مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

ضعیفہ — تو پھر میں جہنم میں کیسے ہو سکتی ہوں؟ ممکن ہے کہ یہ مقام وہ اعراف مطہر ہو جہاں روحانی حیثیت سے پوری طرح پاک و صاف ہونے کے لئے مجھے بھیجا گیا ہو — کیونکہ میں بالکل بے عیب و بیداغ زندگی نہیں بسر کر سکی اور کون ہے جو ایسا کر سکے؟ — لیکن جہنم! — اُف! — تم جھوٹ بول رہے ہو

مرد — یہ جہنم ہے محترمہ — جہنم! میں یقین دلاتا ہوں — جہنم — جہنم کا بہترین حصہ — یعنی بہت زیادہ ویران لیکن آپ تو شاید تنہائی پر محبت و معیت کو ترجیح دیں گی

ضعیفہ — لیکن میں تو پورے خلوص کے ساتھ توبہ و استغفار کر چکی ہوں۔ میں اعتراف گناہ بھی کر چکی ہوں ....

مرد — کس قدر؟

ضعیفہ — اپنے کردہ گناہوں سے کہیں زیادہ! — مجھے اعتراف گناہ سے محبت تھی

مرد — او ہو! لیکن حقیقت سے زیادہ اعتراف گناہ تو شاید اسی قدر معیوب ہے جتنا کہ حقیقت سے کم گناہوں کا اعتراف — بہر حال محترمہ اب اسے آپ غلط فہمی سمجھیں یا ادبی غلطی لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ بھی میری ہی طرح معتوب و مقہور ہیں۔ اور اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں کہ اپنی موجودہ حالت کو ہر ممکن صورت سے قابل قبول بنایا جائے

ضعیفہ — (غصہ کے ساتھ) اُف! میں اپنی زندگی میں زیادہ بدکار ہوتی تو بھی یہی انجام ہوتا! — میرے تمام نیک اعمال بیکار گئے! — یہ انصاف کا خون ہے

مرد — نہیں! آپ کو پوری طرح اور صاف صاف الفاظ میں بتا دیا گیا تھا کہ اعمال بد کے واسطے ترحم بے انصافی ہے اور اعمال نیک کے لئے انصاف بے ترحم! — یہاں ہمارے ساتھ بہت سے نیک انسان بھی موجود ہیں

ضعیفہ ۔ کیا تم ایک نیک انسان تھے ؟

مرد ۔ میں ایک قاتل تھا

ضعیفہ ۔ قاتل ! ۔ اف ! ۔ یہ آخر مجھے یہاں قاتلوں کے گروہ میں رہنے کے لئے کیوں بھیجا گیا ؟ ۔ میں اس قدر بدکار تو نہ تھی ۔ میں ایک نیک عورت تھی ۔ ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے ۔ میں اس غلطی کو کیسے اور کہاں دور کرا سکتی ہوں ؟

مرد ۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہاں غلطیاں درست بھی ہو سکتی ہیں یا نہیں ۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اگر یہاں کوئی غلطی سرزد ہو بھی جائے تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا ۔

ضعیفہ ۔ لیکن میں اس غلطی کی صحت کے لئے کسی سے درخواست کروں ؟

مرد ۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو ابلیس سے درخواست کرتا محترمہ ! ۔ وہ اس مقام کی رسم و راہ کو سمجھتا ہے ۔ میری سمجھ میں تو یہ جگہ آج تک نہیں آ سکی ۔

ضعیفہ ۔ ابلیس ! ۔ میں اور ابلیس سے کلام کروں !!

مرد ۔ محترمہ ! جہنم میں ابلیس ہی بہترین سوسائٹی کا راہنما ہے ۔

ضعیفہ ۔ بدمعاش ! میں خوب سمجھتی ہوں کہ میں جہنم میں نہیں ہوں ۔

مرد ۔ یہ آپ کیسے سمجھتی ہیں ؟

ضعیفہ ۔ یہ ایسے کہ یہاں مجھے کوئی تکلیف یا اذیت محسوس نہیں ہوتی ۔

مرد ۔ اوہو ! تب تو آپ کو یہاں بھیجنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ۔ آپ پر دانستہ عذاب نازل کیا گیا ہے ۔

ضعیفہ ۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو ؟

مرد ۔ اس لئے کہ جہنم ایک مقام ہے بدکار و بدنفس انسانوں کے لئے ۔ بدنفس لوگ یہاں بالکل راحت سے رہتے ہیں کیونکہ یہ جگہ بنائی ہی گئی ہے ان لوگوں کے واسطے ۔ آپ کہتی ہیں کہ آپ کو کوئی تکلیف یا اذیت محسوس نہیں ہو رہی ہے ۔ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ آپ بھی انھیں میں سے ایک ہیں جن کی بدولت جہنم زندہ ہے ۔

ضعیفہ ۔ کیا تمھیں کوئی اذیت و تکلیف محسوس نہیں ہوتی ؟

مرد ۔ میں بدنفس لوگوں میں سے نہیں ہوں محترمہ ! ۔ اس لئے جہنم میں مجھے کوفت ہوتی ہے ۔ ایسی کوفت جو بیان سے باہر ہے ۔ یقین سے ماوراء ۔

ضعیفہ ۔ تم بدنفس لوگوں میں سے نہیں ہو ! ۔ تم نے کہا تھا کہ تم ایک قاتل تھے ۔

مرد ۔ ہاں ۔ مگر وہ تو صرف ایک دست بدست جنگ کا واقعہ تھا ۔ میں نے اپنی تلوار ایک ایسے بوڑھے شخص کے جسم میں اتار دی تھی جو اپنی تلوار کو میرے جسم میں پیوست کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔

ضعیفہ ۔ اگر تم شریف انسان تھے تو تمھاری اس حرکت کو قتل نہیں کہا جا سکتا ۔

مرد ۔ بوڑھے شخص نے اسے قتل ہی تصور کیا کیونکہ بقول خود وہ اپنی لڑکی کی عصمت و آبرو کی حفاظت کے واسطے شمشیر بکف ہوا تھا ۔ اس داستان کو مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ اپنی حماقت سے میں اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ۔ میں نے اظہار جذبات کیا تو وہ چیخ اٹھی اور اس بوڑھے شخص نے اہانت آمیز الفاظ کے بعد مجھے قتل کر ڈالنا چاہا ۔

ضعیفہ ۔ تم بھی اپنے باقی تمام بھائیوں کے مانند تھے ۔ بوالہوس ۔ بدمست ۔ قاتل ۔ تمام ۔ سب کے سب !

مرد ۔ لیکن اس پر بھی ہم دونوں یہاں ایک ساتھ رکھے گئے ۔ محترمہ !

ضعیفہ — سُنو! میرا باپ بھی ایک ایسے ہی بدمعاش کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا جیسے کہ تم۔ بالکل ایسی ہی دست بدست جنگ میں — بالکل ایسے ہی مقصد کی خاطر — میں چیخ اُٹھی تھی۔ یہ میرا فرض تھا۔ میرا باپ میرے حملہ آور پہ جھپٹا۔ یہ اُس کی عزت و شرافت کا مطالبہ تھا — اور پھر وہ مردہ ہو کر گر پڑا۔ یہ عزت و شرافت کا انعام تھا۔ میں یہاں ہوں۔ جہنم میں — بقول تمہارے۔ یہ فرض کا انعام ہے۔ کیا بہشت میں انصاف ہوتا ہے؟

مرد — نہیں! — انصاف تو یہاں جہنم ہی میں ہوتا ہے — بہشت ایسی ناکارہ باتوں سے کہیں بلند ہے۔ جہنم میں ہر جگہ آپ کا خیر مقدم ہوگا محترمہ! — جہنم مسکن ہے عزت و شرافت۔ فرض۔ انصاف اور باقی "سات مہلک نیکیوں" کا — ان نیکیوں کے نام ہی سے کرۂ ارض پہ تمام بدکاریاں کی جاتی ہیں۔ پھر اگر ان کو اُن کا انعام جہنم میں نہیں تو اور کہاں ملنا چاہئے؟ کیا میں آپ کو بتا نہیں چکا کہ در حقیقت معتوب و مقہور وہی لوگ ہیں جو جہنم میں مسرور نہیں؟

ضعیفہ — تم یہاں مسرور ہو؟

مرد — (تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے) نہیں! — یہی وہ معمہ ہے جسے حل کرنے کے لئے میں یہاں ظلمتوں میں بیٹھا ہوا غور و فکر کیا کرتا ہوں۔ میں یہاں کیوں ہوں؟ — میں کہ جس نے ہر فرض سے انحراف کیا — عزت و شرافت کو قدموں کے نیچے کچل ڈالا — اور انصاف پہ قہقہے لگائے!

ضعیفہ — اس سے مجھے کیا کہ تم یہاں کیوں ہو۔ لیکن یہ میں — میں یہاں کیسے؟ — میں کہ جس نے نسائی عصمت و شرافت کے لئے اپنے تمام فطری رجحانات کو قربان کر ڈالا!

مرد — ذرا صبر فرمایئے۔ آپ یہاں پوری طرح مسرور و بے فکر رہیں گی۔ . . . .

ضعیفہ — مسرور! — یہاں! — اس جگہ جہاں میں کچھ بھی نہیں! — جہاں میرا کوئی وجود ہی نہیں!

مرد — نہیں۔ یہ بات ہرگز نہیں۔ آپ ایک معزز خاتون ہیں — اور معزز خواتین جہاں بھی ہوتی ہیں وہاں جہنم ضرور ہوتا ہے۔ متعجب یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں — آپ یہاں ہر وہ چیز موجود پائیں گی جس کی ایک معزز خاتون کو تمنا ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اس جگہ آپ کو وہ شیطان بھی ملیں گے جو محض غلامی کی محبت سے مجبور ہو کر آپ کی خدمت کریں گے اور اپنی خدمت و غلامی کو معزز بنانے کے لئے آپ کی اہمیت کو حقیقت سے زیادہ بلند کر کے پیش کریں گے۔ بہترین خدمت گار!۔

ضعیفہ — میرے خدمت گار شیطان ہوں گے!

مرد — کیا آپ کو کبھی ایسے خدمت گار ملتے ہیں جو شیطان نہیں تھے؟

ضعیفہ — کبھی نہیں — وہ شیطان تھے۔ مکمل شیطان — سب کے سب — مگر یہ تو صرف ایک استعارہ اور گفتگو کا ایک نہج ہے۔ میں سمجھی کہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ یہاں میرے خدمت گار واقعی حقیقی شیطان ہوں گے۔

مرد — آپ جس حد تک ایک حقیقی معزز خاتون ہو سکتی ہیں اس سے زیادہ حقیقی شیطان یہ خدمت گار نہ ہوں گے۔ یہاں کوئی شے بھی حقیقی نہیں۔ جہنم کے عذاب کا یہی ایک دہشت ناک پہلو ہے۔

ضعیفہ — اُف! یہاں سب کچھ دیوانگی ہی دیوانگی ہے — آگ اور نیش زن حشرات سے زیادہ اذیت ناک!

مرد — لیکن شاید آپ کو یہاں کچھ سامانِ تسکین مل جائے۔ اچھا یہ بتائے کہ جب آپ وقت کی قید سے نکل کر ابدیت میں تبدیل ہوئیں تو اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

ضعیفہ — یعنی تم یہ پوچھ رہے ہو کہ میں کس قدر بوڑھی تھی؟ — کیا میں کوئی صرف ماضی کی چیز ہوں کہ تم اس طرح استفسار کرتے ہو؟ میری عمر ۷۷ سال ہے۔

مرد — یہ پختہ عمر ہے محترمہ! — لیکن جہنم میں بڑھاپا ناقابل برداشت چیز ہے۔ اس میں حد سے زیادہ حقیقت ہوتی ہے۔ یہاں ہم "محبت" اور "حسن" کی پرستش کرتے ہیں۔ چونکہ ہماری روحیں معتوب و مقہور ہیں اس لئے ہم اپنے تلووں میں نشوونما پیدا کرتے ہیں ایک ۷۰ سال کی معزز خاتون کی حیثیت سے آپ جہنم میں کوئی دوست نہ پاسکیں گی۔

ضعیفہ — لیکن اپنی عمر کا میرے پاس علاج ہی کیا ہے؟

مرد — آپ یہ فراموش کر رہی ہیں کہ آپ اپنی عمر کو اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔ آپ کی عمر اب نہ ۷۷ سال ہے اور نہ ۷۰ سال۔ نہ ۷۱ سال ہے اور نہ ۷۲ سال!

ضعیفہ — واہیات!

مرد — غور کیجئے محترمہ — کیا میرے یہ الفاظ صحیح نہیں؟ — اور کیا یہ اس وقت بھی اسی قدر صحیح نہ تھے جبکہ آپ کرۂ ارض پر زندہ تھیں؟ — جب آپ ۷۰ سال کی عمر کو پہونچیں تو اپنی جھرّیوں اور سفید بالوں کے نیچے کیا آپ خود کو درحقیقت اس سے زیادہ بوڑھا محسوس کرتی تھیں جتنا کہ ۳۰ سال کی عمر میں؟

ضعیفہ — نہیں! — بلکہ اور زیادہ جوان! — ۳۰ برس کی عمر میں تو میں ایک بیوقوف عورت تھی۔ مگر خود کو جوان محسوس کرنے اور دوسروں کو بوڑھا نظر آنے سے فایدہ کیا؟

مرد — اب آپ سمجھیں محترمہ، کہ ظاہری شکل محض ایک سراب تھی۔ آپ کی جھرّیاں ٹھیک اسی طرح جھوٹ بولتی تھیں جس طرح بہت سی مردہ طبیعت سترہ سالہ احمق لڑکیوں کی نرم جلد اُن کی عمر کی بابت جھوٹ بولتی ہے۔ سُنئے! یہاں ہم جسم نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے کو ہم جسمانی شکل میں دیکھتے ضرور ہیں لیکن یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جب ہم زندہ تھے تو اس وقت ہم نے ایک دوسرے کا تصور کرنا اسی طرح سیکھا تھا — اور ہم اب تک اپنی شکلوں کا تصور اسی طرح کرتے ہیں کیونکہ کوئی اور بہتر طریقہ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن ہمیں یہاں یہ قدرت نصیب ہے کہ جو عمر چاہیں اختیار کرکے ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہوں۔ آپ اپنی قدیم شکلوں میں سے کسی ایک کا صرف ارادہ کرلیجئے۔ فوراً آپ کی صورت اسی قسم کی ہو جائے گی۔

ضعیفہ — ایسا ہونا ممکن نہیں۔

مرد — آزمایش کر دیکھئے۔

ضعیفہ — اچھا — سترہ سال!

مرد — ٹھہرئیے — اس سے پیشتر کہ آپ کسی خاص عمر کی تعیین کا فیصلہ کریں، بہتر یہ ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ ان معاملات کا یہاں سے گہرا تعلق ہے۔ بعض اوقات یہاں کے باشندوں کو "سترہ سال" کا شوق و جنون ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ جذبہ بہت دنوں تک قایم نہیں رہتا۔ آج کل یہاں کے فیشن میں انسانی عمر چالیس سال یا یوں کہئے کہ ۴۲ سال ہے۔ لیکن اس رواج میں بھی اب تغیر کے آثار نمایاں ہیں۔ اگر آپ ۲۷ سال کی عمر میں حسین تھیں تو میں مشورہ دوں گا کہ آزمایش کے لئے اسی کا انتخاب کیجئے اور جہنم میں ایک جدید فیشن قایم کر دیجئے۔

ضعیفہ — تمہارے ایک لفظ کا بھی مجھے یقین نہیں۔ بہرحال ۲۷ سال ہی سہی — (ایک تیز چمک! — بوڑھی عورت ایک نوجوان لڑکی میں تبدیل ہو جاتی ہے جو زرق برق لباس زیب تن کئے ہوئے ہے اور اس قدر خوبصورت ہے کہ اس کے گرد ہلکی نیلی روشنی کا حلقہ یکایک ماہتابی روشنی اختیار کرلیتا ہے ....)

مرد — سارہ!

سارہ — کیا؟ — تم مجھے جانتے ہو!

مرد — اور تم مجھے بھول گئیں !

سارہ — میں تمھارا چہرہ تو دیکھوں — (وہ اپنی نقاب اُٹھاتا ہے) — فرزان ! — عفریت ! — تم کہ جس نے میرے باپ کو قتل کیا !
تم یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہو۔

فرزان — ہیں ! میں تمھارا پیچھا نہیں کر رہا ہوں — اچھا اب مجھے اجازت دو (جانے لگتا ہے)

سارہ — (اُس کا بازو پکڑتے ہوئے) تم اس دہشت ناک مقام میں مجھے تنہا چھوڑ نہیں سکتے۔

فرزان — بشرطیکہ یہاں میرے قیام کو پیچھا کرنے سے تعبیر نہ کیا جائے

سارہ — (اُس کا بازو چھوڑتے ہوئے) تم خود ہی سوچ سکتے ہو کہ میں تمھاری موجودگی کو کس طرح برداشت کر سکتی ہوں — آہ میرا عزیز۔
عزیز باپ !

فرزان — اُس سے ملنا چاہتی ہو تم ؟

سارہ — میرا باپ اور یہاں !!!

فرزان — نہیں ! وہ جنت میں ہے۔

سارہ — یہی میں بھی سمجھتی تھی — آہ، میرا شریف باپ ! — وہ بلندیوں سے اس وقت ہمیں دیکھ رہا ہے — اپنی لڑکی کو اپنے قاتل کے ساتھ مصروفِ کلام دیکھ کر اُسے کیا کچھ اذیت محسوس ہوتی ہوگی !

فرزان — سنئے ! جب ہم اُس سے ملاقات کریں تو ......

سارہ — اُس سے ہم کیسے ملاقات کر سکتے ہیں ؟ — وہ جنت میں ہے۔

فرزان — گاہے گاہے از راہِ لطف وہ یہاں ہم لوگوں سے ملنے آجاتا ہے — جنت میں اُسے کوفت محسوس ہوتی ہے — ہاں سنو میں تمھیں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اگر تم اُس سے ملاقات کرو تو اس کے سامنے مجھے اس کا قاتل نہ کہنا — اس کے احساسات کو صدمہ پہونچیگا اور وہ برہم ہوگا ! اس کا خیال ہے کہ فنِ شمشیر زنی میں وہ مجھ سے کہیں بہتر تھا اور اگر اُس کے قدموں کو لغزش نہ ہو جاتی تو وہ مجھے ہلاک کر ڈالتا — یقیناً وہ صحیح کہتا ہے — میں ایک اچھا شمشیر زن نہ تھا — اُس کے اس خیال پر میں کبھی کوئی اعتراض نہیں کرتا — اس لئے اب ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں

سارہ — اگر ایک سپاہی کو اسلحۂ جنگ کے استعمال میں مہارت حاصل ہو تو اس کا اپنی اس ہنرمندی پر فخر و ناز کرنا ذلت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

فرزان — غالباً اب تمھیں اس سے ملنے کی خواہش نہ ہوگی۔

سارہ — ان الفاظ کی جرأت تم کیسے کر رہے ہو ؟

فرزان — یہاں عام طور پر لوگوں کے احساسات اسی نوعیت کے ہیں — شاید تمھیں یاد ہوگا کہ زمین پر ہم ہر شخص کی موت پر خواہ وہ محبوب ترین ہستی ہی کیوں نہ رہا ہو ہمیں رنج و افسوس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب قسم کا یہ اطمینان و سکون بھی محسوس ہوتا تھا کہ آخر ہمیں ہمیشہ کے لئے اس سے چھٹکارا مل گیا — یہ ضرور ہے کہ ہم اس کا اعتراف کبھی نہ کرتے تھے۔

سارہ — عفریت ! — غلط ! — قطعی غلط !

فرزان — (سکون کے ساتھ) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس احساس سے واقف ہو — واقعہ یہی ہے کہ تجہیز و تکفین کی رسوم ہمیشہ ایک جشن کی حیثیت رکھتی تھیں جو سیاہ لباس میں منایا جاتا تھا — خصوصاً ایک رشتہ دار کی تجہیز و تکفین — بہر حال اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی رشتے یہاں شاذ و نادر ہی قایم رکھے جاتے ہیں — تمھارا باپ بھی اس کا بخوبی طرح عادی ہو چکا ہے — اب وہ تم سے کسی محبت کی توقع نہیں کرے گا۔

سارہ - بدمعاش! — میں نے زندگی بھر اس کے ماتم میں سیاہ لباس پہنا ہے۔

فرزان - بیشک! — اس لئے کہ یہ تمھیں زیب دیتا تھا۔ لیکن زندگی بھر ماتم کرنا اور بات ہے اور پوری ابدیت تک سوگوار رہنا بالکل دوسری چیز ہے۔ علاوہ اس کے یہاں تو تم بھی اسی قدر مردہ ہو جتنا کہ وہ — کیا اس سے زیادہ مضحکہ خیز اور کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ ایک مردہ انسان دوسرے مردہ انسان کا ماتم کرے برہم ہونے کی ضرورت نہیں، عزیز سارہ! — اور نہ خائف ہونے کا موقع — جہنم میں لغویات کی کمی نہیں، (یہاں اس کے علاوہ بمشکل ہی کچھ اور مل سکے گا)۔ لیکن موت۔ عمر۔ اور انقلاب کی لغویت جہنم میں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں ہم سب مردہ ہیں اور سب کے سب جاوداں — یہاں کی رسم و راہ کو تم جلد سمجھ جاؤ گی۔

سارہ — اور کیا یہاں سب مرد مجھے "عزیز سارہ" کہہ کر خطاب کریں گے؟

فرزان - نہیں! یہ تو میری زبان کی لغزش تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

سارہ - (تقریباً محبت آمیز انداز میں) فرزان! کیا تمھیں اس وقت واقعی مجھ سے محبت تھی جبکہ تم نے میرے ساتھ اس قدر شرمناک سلوک کیا تھا؟

فرزان - (بیچینی سے) اُف! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ محبت کا افسانہ نہ چھیڑو۔ یہاں لوگوں کے لبوں پر محبت کے علاوہ اور کوئی تذکرہ ہی نہیں محبت کا حسن۔ محبت کی تقدیس و پاکیزگی۔ محبت کی روحانیت اور محبت کی نہ جانے کیا کیا بلا! — معاف کرنا۔ واقعی مجھے تو اس سے کوفت ہوتی ہے بے انتہا — یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس شے کے تذکرے وہ کرتے رہتے ہیں وہ دراصل ہے کیا شے! — میں جانتا ہوں — وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں محبت کی تکمیل حاصل ہو گئی ہے کیونکہ اب وہ کوئی جسم نہیں رکھتے — محض تصوری نفسانیت اور ہوا پرستی ہے یہ! — سراسر لغو!

سارہ - کیا موت بھی تمھاری روح کو آلائشوں سے پاک کرنے میں ناکام رہی فرزان؟ — کیا دُنیا کی عدالت کا وہ خوفناک انصاف بھی جس کی یادگار میرے باپ کا مجسمہ ہے تمھیں خوف و ادب نہیں سکھا سکا؟

فرزان - ہاں خوب یاد آیا۔ کہو اب تمھیں اطل کی وہ یادگار — وہ مجسمہ۔ کس حال میں ہے؟

سارہ - اس پر میری کثیر رقم صرف ہوئی تھی۔ خانقاہ کے مدرسے کے لڑکے اسے چین نہ لینے دیتے تھے۔ ان میں جو شریر تھے وہ اسے توڑتے پھوڑتے رہتے تھے اور جن کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا وہ اس پر اپنا نام لکھ ڈالتے تھے۔ دو سال کے عرصے میں اس مجسمہ کی تین ناکیں بدلوائی گئیں اور انگلیوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ آخر میں نے مجبوراً اسے اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ مجھے خوف ہے کہ اب تو دہشت ناک حد تک اُس کی صورت مسخ ہو گئی ہوگی۔ آہ میرا غریب باپ!

فرزان - خاموش! — سنو! — (یکایک کسی مخفی ساز سے دو بلند آوازیں پیدا ہوتی ہیں جو بتدریج مدھم ہوتی جا رہی ہیں ------) او ہو! یہ تو وہی نغمہ ہے جو موزارٹ نے مجسمہ کے متعلق بنایا تھا۔ یہ تمھارے باپ کی آمد کا اعلان ہے۔ بہتر یہ ہو کہ تم غائب ہو جاؤ اُس وقت تک کہ میں اُسے ملاقات کے لئے تیار کر لوں۔ (وہ غائب ہو جاتی ہے)

(غار کے اندر سے سفید سنگ مرمر کا ایک ذی حیات مجسمہ نمودار ہوتا ہے جس کو ایک شاندار عمر رسیدہ مرد کی شکل میں تراشا گیا ہے لیکن وہ دینی شان و شوکت کی طرح سے ایک انتہائی بے پروائی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اُس کے قدم بہت سبک ہیں اور اُس کے چہرے کی ہر ایک جھری سے "یوم تعطیل" کی سی مسرت ٹپک رہی ہے۔ اپنے متناسب جسم کو وہ جس انداز میں پیش کرتا ہے وہ سنگ تراشی کے ہاتھوں کا نتیجہ ہے۔ اُس کی مونچھوں کے سرے اوپر کی طرف مڑے ہوئے ہیں — بلکہ ادکا تیموں کی طرح — جس سے اُس کی شان و دبدبہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ فرزان کے ساتھ اس کے تعلقات انتہائی خوشگوار ہیں ....)

فرزان - آہا - دوست ! --- تم آگئے ! --- موزارٹ نے جو نغمہ تمہارے لئے لکھا ہے تم اسے کیوں نہیں سیکھ لیتے ؟

مجسمہ - بدقسمتی سے اُس نے یہ نغمہ بھاری آواز کے لئے لکھا ہے اور میری آواز باریک ہے --- خیر --- ہاں کہو تم نے توبہ کرلی یا نہیں ؟

فرزان - تمہارا خیال مجھ پر اس قدر غالب رہا کہ میں توبہ نہ کرسکا۔ اگر میں ایسا کرلیتا تو پھر تمہیں یہاں جنت سے آکر میرے ساتھ گفتگو کا موقع کیسے ملتا؟

مجسمہ - صحیح ہے۔ اپنے رویّہ پر اسی طرح قایم رہو دوست --- میری تمنا ہے کہ میں تمہیں قتل کرڈالتا --- اور یقیناً میں ایسا کرلیتا اگر ایک حادثہ واقع نہ ہوا ہوتا۔ پھر تو میں یہاں تمہاری جگہ آجاتا اور تمہیں زندہ رہنے کے لئے ایک مجسمہ اور معصوم و پاکیزہ شہرت ملتی۔ خیر جانے دو ان باتوں کو --- کہو کوئی تازہ خبر ؟

فرزان - ہاں --- تمہاری لڑکی مرگئی ہے -

مجسمہ - (حیرت سے) میری لڑکی ؟ --- (یاد کرتے ہوئے) ہاں ہاں --- وہی نا جس کی محبت میں تم پھنس گئے تھے - اب سمجھا میں --- ہاں تو اس کا نام کیا تھا ؟

فرزان - سارہ -

مجسمہ - یقیناً - سارہ ! --- بڑی خوبصورت تھی وہ بشرطیکہ میرا حافظہ غلطی نہ کرتا ہو۔ کیا تم نے اُس کے شوہر کو مطلع کردیا ہے ؟

فرزان - اپنے دوست فرارؔی کو ؟ --- نہیں --- سارہ کی آمد کے بعد میں نے اُسے اب تک نہیں دیکھا -

(سارہ غضب آلود انداز سے روشنی میں نمودار ہوتی ہے)

سارہ - کیا مطلب ہے اس کا ؟ --- فرارؔی یہاں اور تمہارا دوست ! --- اور تم ابّا جان میرا نام بھی بھول گئے ؟ تم یقیناً پتھر میں تبدیل ہوگئے ہو -

مجسمہ - عزیزہ ! - بہ نسبت زندہ جسمانی شکل کے اس مرمریں شکل میں میری اس قدر زیادہ تعریف و توصیف کی گئی کہ میں نے اسی صورت و شکل کو اختیار کرنا مناسب سمجھا - یہ تو تم بھی تسلیم کروگی کہ وہ سنگتراش اپنے عہد کا ماہر ترین انسان تھا -

سارہ - آہا ! --- یہ غرور و پندار ہے ! --- ایسی خود پرستی ! --- اور تم !

مجسمہ - آہ میری بیٹی ! تم زمین پر اتنی مدت تک زندہ رہیں کہ اس انسانی کمزوری کے حدود سے گزر گئیں - اب تمہاری عمر ضرور ۸۰ سال کی ہوگی۔ میرا رشتۂ حیات تو صرف ۶۴ سال کے سن میں (ایک حادثہ کی بنا پر) منقطع ہوگیا تھا - اس لحاظ سے اب میں سن و سال میں تم سے کہیں چھوٹا ہوں۔ علاوہ ازیں میری بچی ! یہاں آکر وہ شے جسے ہمارا آزاد منش دوست فرزانؔ " شاید پندارانہ دانش مندی کا ڈھونگ " قرار دیتا ہے بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ اب تم مجھے اپنا ہی سا ایک " ذی حیات شخص " سمجھو --- باپ نہیں -

سارہ - تم بھی اسی بدمعاش کی سی باتیں کرتے ہو -

مجسمہ - فرزانؔ بڑا مفکر ہے --- سارہ ! --- ایک بُرا شمشیر زن مگر ایک اچھا مفکر -

سارہ - (دہشت محسوس کرتے ہوئے) اب میں کچھ کچھ سمجھتی جارہی ہوں تم دونوں شیطان ہو میرا مذاق اڑاتے ہو۔ بہتر ہوتا کہ میں خدا سے دعا کرتی -

مجسمہ - (اُسے تسکین دیتے ہوئے) نہیں نہیں نہیں - میری بچی ! - دعا نہ کرو - اگر تم ایسا کروگی تو یہاں رہنے والوں کو جو ایک خاص فایدہ حاصل ہے اُسے ضایع کردوگی - یہاں پھاٹک پر یہ الفاظ تحریر ہیں کہ " اے اندر داخل ہونے والے ! ہر امید کو اپنے پیچھے چھوڑ جا " - ذرا سوچو کس قدر سکون و راحت کی چیز ہے یہ کیونکہ امید آخر ہے کیا ؟ --- اخلاقی ذمہ داری کی ایک شکل --- یہاں کوئی امید ہی نہیں اور اس لئے نہ کوئی فرض ہے اور نہ کوئی کام - یہاں دعا و عبادت سے کوئی فایدہ نہیں اور نہ اپنی حسب منشاء اعمال سے کوئی نقصان - مختصر یوں سمجھو کہ جہنم ایک ایسا مقام ہے جہاں تمہیں اپنی مسرت و تفریح کے حصول کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں - (فرزانؔ ایک گہری ٹھنڈی سانس لیتا ہے) تم ٹھنڈی سانس لیتے ہو دوست فرزانؔ ! لیکن اگر تم میری طرح جنت میں آباد ہوتے تو تم کو یہاں جو فوائد حاصل ہیں ان کا احساس کرسکتے --- (باقی)

مسعود جاوید

تکرار مضمون

ہم نے نگار اپریل - مئی - جون ۵۱ء میں اصولِ سرقہ کی بحث میں شاعر کی اُس نفسیاتی کیفیت سے گفتگو کی تھی کہ جب وہ کسی دوسرے شاعر کا ایسا مضمون سنتا ہے جو اس کے مذاقِ طبیعت کے مطابق ہو اسکی حالت کیا ہوتی ہے۔ آج ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر شاعر کے کلام میں دو اس کے مستقل نظریات کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں ان میں ترقی و تنزل کے بیشمار کیفیات موجود ہوتی ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے شعراء کے دواوین ردیف وار شایع ہوتے رہے ہیں اس لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کونسا شعر پہلے کہا گیا ہے اور کونسا بعد میں۔ ورنہ اس کی مثالیں بکثرت ملجاتیں جس مضمون کو خود ہی پہلے بہتر طریقہ پر ادا کر دیا گیا ہے بعد میں اُسی مضمون کا دوسرا شعر کہا گیا اور وہ پہلے کی نسبت کم تر ہے۔ ہم یہاں فانی کے کلام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے ہمارے اس خیال کی تصدیق ہوسکے گی۔ پہلی مثال :-

وہ بدگمان کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

دوسرا شعر ملاحظہ ہو :-

تونے کرم کیا تو بعنوانِ رنجِ زیست غم بھی مجھے دیا تو غمِ جاوداں نہ تھا

پہلے شعر میں ایک معقول بات معقول پیرایۂ بیان میں کہی گئی ہے اور شعر میں ندرت موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام رنج و غم وابستۂ حیات ہے اور زندگی خود محدود و مختصر ہے۔ اس لئے جو غم مجھے دیا گیا ہے وہ بھی عارضی ہے جاوداں نہیں۔ لہذا مجھے تو غمِ جاوداں نہ ملنے کا غم ہے اور وہ بدگمان سمجھتا ہے کہ مجھے "تابِ رنجِ زیست نہیں"۔ اس میں اپنی ہمت کی بلندی اور انسانی مجبوری کو پیش کیا ہے۔ دوسرے شعر میں خود اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ مجھے صرف "رنجِ زیست" ہے اور چونکہ زندگی عارضی ہے اس لئے یہ غم بھی غمِ جاوداں نہیں۔ اس شعر میں صرف انسانی مجبوری کو پیش کیا ہے۔ پہلا شعر باقیات میں ہے اور دوسرا عرفانیات میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا پہلے کہا گیا ہے اور دوسرا بعد میں۔

دوسری مثال - باقیات کا ایک شعر ہے :-

اپنے دیوانہ پہ اتمامِ کرم کر یارب درو دیوار دئے اب انھیں ویرانی دے

"اتمامِ کرم" کی تفصیل کتنی بلند ہے اور اس میں کیسی دلآویزی اور جاذبیت ہے۔ پھر اتمامِ کرم اور وہ بھی "اپنے دیوانہ پہ" کس قدر نازک و لطیف ہے۔ شعر میں کوئی لفظ زاید یا غیر ضروری نہیں ہے جس سے شعر میں غیر معمولی برجستگی پیدا ہوگئی ہے۔ فانی کے اس شعر کے ساتھ غالب کے اس شعر کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔ سرمایہ کرامت کن و آنگاہ بغارت بر برخرمنِ ما برقے برمزرعہ باراں شو

فانی کے دوسرے مصرعہ کی دعا غالب کے پہلا مصرعہ میں آگئی ہے اور دوسرے مصرعہ میں اندازِ دعا کو قایم رکھتے ہوئے غالب نے پہلے مصرعہ کی تفصیل بڑی خوبی سے کی ہے۔ اِس عالم کا نظام کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ قدرت کسی پر اتمامِ نعمت کبھی نہیں کرتی اور انسان جس قدر سامان راحت و آسایش فراہم کرتا جاتا ہے قدرت اس کو منہدم و برہم کردیا کرتی ہے۔ ایسی بات کو غالب نے ایک دوسرے شعر میں یوں ظاہر کیا ہے :-

خوشی کا کھیت پہ میرے اگر سودا ابر آوے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

لیکن اس کے باوجود انسانی ہمت کو ایک ایسا جوہرِ عمل عطا ہوا ہے کہ انسان اپنی طلب و کوشش میں کوتاہی نہیں کرتا اور عشق میں انسانی ہمت و جرأت بلند ہوجانے کے ساتھ نقصان برداشت کرنے کی قوت ترقی کرجاتی ہے۔ فانی اور غالب نے اپنے اپنے اشعار میں عشق کی اسی

بلند فطرت کو پیش کیا ہے فانی کے اس شعر کی بلندی کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کا دوسرا شعر دیکھنا چاہئے جو وجدانیات (کلام فانی کا آخری مجموعہ) میں ہے:

درد دیا کرم کیا اب اسے لا دوا بنا　　شیشۂ دل عطا کیا اب اسے پاش پاش کر

اس شعر میں "درد" اور "شیشۂ دل" پہلے شعر کے "در و دیوار" کے مقابل استعمال کئے گئے ہیں اور اسی طرح "لا دوا بنا" اور "پاش پاش کر" پہلے شعر کے "ویرانی دے" کے ہم معنی ہیں۔ لیکن پہلے شعر میں جو بات صرف ایک مصرعہ میں آگئی ہے یہاں پورا شعر اس کے لئے کہا گیا ہے اور پھر بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ اس شعر میں نہ نئی بات ہے نہ طرز بیان میں کوئی جدت ہے، علاوہ اس کے غیر ضروری طول کلام کے باعث شعر کی بندش میں سستی پیدا ہو گئی ہے۔ خان آرزو کا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے مطلع کہا تھا کہ:

سیہ چردی بدست آں نگار نازنیں دیدم　　بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے عنبریں دیدم

اتفاق سے کوئی ایرانی اُدھر آنکلا۔ خان موصوف نے اپنا مطلع اُسے سنایا اُس نے بہت تعریف کی اور آخر میں بولا کہ "خوب گفتی اما خیلے طول گفتی" پھر قدرے توقف کے بعد خان موصوف کو یہ مشورہ دیا کہ شعر کو اس طرح کر دو۔

سیہ چردی بدست آں نگارے　　بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

ظاہر ہے کہ اس اختصار کلام نے شعر میں کس قدر زور و اثر پیدا کر دیا۔ فانی کے شعر سے بھی اگر متذکرہ الفاظ کم کر دئے جائیں۔ تو شعر زور و اثر ہو جائے گا۔ خود کلام فانی میں اس اصول اختصار کی ایک عمدہ مثال موجود ہے۔ باقیات فانی کا ایک شعر ہے:۔

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ　　اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن طرز بیان ایسا عمدہ ہے کہ خواہ مخواہ ایک لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ جذبۂ خود پرستی کے خلاف یہ ایک عمدہ اور دلآویز طرز بیان ہے۔ پہلے مصرعہ میں "اچھا یقیں نہیں ہے تو" قایل کے اطمینان و یقین اور مضبوط و راسخ اعتقاد کو ظاہر کر رہا ہے یعنی مجھے تو اس پر پورا اعتماد و اعتقاد ہے اگر تجھے یقین نہیں ہے تو پھر تجربہ کر دیکھ۔ فانی کے اس شعر کا ماخذ غالباً حضرت امیر خسرو کا یہ شعر ہے:۔

ناخدا در کشتی ما گر نباشد گو مباش　　ما خدا داریم ما را ناخدا در کار نیست

لیکن حضرت امیر کے شعر میں خدا پر توکل کر لینے کی تلقین ہے اور فانی نے اس میں ایسی وسعت پیدا کر دی ہے کہ حضرت امیر کا کل مضمون بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ صرف دوسرے مصرعہ میں آگیا ہے۔ خسرو ناخدا کی غیر موجودگی میں خدا پر توکل کرتے ہیں۔ فانی ناخدا کی اس خود پرستی کو حقارت سے دیکھتے ہیں کہ وہ کشتی کے ڈوبنے اور تیرنے کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "ظالم" کتنا بلیغ ہے۔

فانی کا دوسرا شعر اسی مضمون کا وجدانیات میں ہے:۔

کشتی اعتبار توڑ کے دیکھ　　کہ خدا بھی ہے ناخدا ہی نہیں

جو مضمون پہلے شعر میں کہا گیا ہے بالکل وہی دوسرے میں ہے لیکن اختصار کی وجہ سے دوسرے شعر میں برجستگی زیادہ ہے۔

نظم و نثر کا فرق زیادہ تر زبان اور طرز بیان سے متعلق ہے۔ جن خیالات کو نثر میں بیان کیا جاتا ہے وہی نظم میں بھی ادا کئے جاتے ہیں لیکن شعر کی زبان نثر سے زیادہ شستہ و شایستہ اور طرز بیان زیادہ برجستہ ہوتا ہے اور اسی لئے اختصار کلام محاسن شعر میں شمار ہوتا ہے

تیسری مثال۔ باقیات کا ایک شعر ہے:۔

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے　　میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

محبوب کے سامنے رونے میں غم عشق کی ایک پوری داستان مضمر ہے اور عاشق مجبور کے اس گریۂ بیقرار پر محبوب کا تبسم ایک دوسرا افسانہ ہے جس میں عشق کی مجبوری اور حسن کا استغنا، دونوں موجود ہیں۔ میر تقی میر نے بھی اس خیال کا شعر کہا ہے:۔

مجھکو روتا دیکھ کر وہ ہنس دئے　　برق چمکی ابر باراں تھم گیا

میر نے اپنے رونے اور محبوب کے ہنسنے کی ایسی عمدہ تشبیہ نظم کر دی ہے کہ اس سے خود فلسفۂ غم عشق پر بھی لا فانی روشنی پڑتی ہے لیکن فانی

کے "فسانہ" میں جتنی گہرائی ہے وہ میر کے "برق و باراں" میں نہیں ہے اسی مضمون کو فانی نے دوسری جگہ یوں ظاہر کیا ہے :-

ان کے آگے جب یہ آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں   وہ حیا پرور نگاہیں مسکرا کر رہ گئیں ،

لیکن پہلے شعر میں یہ کل مضمون صرف دوسرے مصرعہ میں ادا ہو گیا ہے اور پہلے مصرعہ میں ایک دوسری ہی بات کہی گئی ہے جو بجائے خود نہایت لطیف ہے۔ ثانیاً شعر میں غیر ضروری طولِ کلام کے ساتھ صرف اظہارِ واقعہ کیا گیا ہے۔ طرزِ بیان کی دلکشی کے علاوہ اس شعر میں کوئی کیف بھی نہیں ہے۔

چوتھی مثال۔ باقیات کا ایک شعر ہے :-

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا ،   کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اجڑ گیا

شاعر اس بات کو جانتا ہے کہ وہ سیہ بخت و تیرہ نصیب ہے۔ یہ بات بھی اس کے پیشِ نظر ہے کہ بدبختوں کا اثرِ صحبت خوش نصیبوں کے لئے بھی اچھا نہیں۔ یہ بھی اس کو یقین ہے کہ دنیا میں تباہی اور بربادی جو کچھ بھی آتی ہے وہ گردشِ افلاک کی وجہ سے آتی ہے۔ یہ بھی اس پر روشن ہے کہ فلک اس کے ستانے کے لئے اس کے آشیانے کی بربادی کے درپے ہے وہ ان تمام امور کو اس انداز میں یکجا کر دیتا ہے کہ شکایت تو صرف آسمان سے ہے لیکن اس شکایت کے اندر اپنی کل روئدادِ درد و غم جمع کر دی ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا شعر عرفانیات میں ہے :

اس دلِ مایوس کی ویرانہ سازی کچھ نہ پوچھ   اس نے جب اور جو چمن تاکا بیاباں ہو گا

اس شعر میں شکایتِ آسماں کو کم کر دیا ہے جو نہایت ہی زوردار ٹکڑا تھا۔ اس کے کم ہو جانے سے شعر میں وہ لطف باقی نہ رہا۔ کیونکہ پہلے شعر میں یہ تمام مضمون کنایہ کے طور پر ادا ہوا ہے اور دوسرے میں وضاحت کے ساتھ اسکو مرزا غالب کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں کہ :

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روئے تو بود   چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

فانی کے دوسرے شعر میں سیدھا سادہ مضمون ہے نہ اس میں جدت ہے نہ طرفگی ــــ کلامِ فانی میں ہم کو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعد کا کہا ہوا شعر پہلے کہے ہوئے شعر سے بڑھ گیا ہے ــــ باقیات کا ایک شعر ہے :-

دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی   آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

"نگاہِ دوست" نے دل میں سما کے ایک آس پیدا کی اور امید ہی تمام اعمالِ انسانی کا مرکز ہے۔ اور کعبہ کی مرکزیت بھی مسلّم ہے۔ دوسرے نگاہِ یار نے قلب میں پاکی اور جلا پیدا کی اس کی وجہ سے بھی دل میں کعبہ کی سی طہارت پیدا ہو گئی۔ جب وہی نگاہ جو معمارِ کعبہ تھی پھر گئی تو یاس و نومیدی کی تاریکیاں دل پر مسلط ہو گئیں اور جو کعبہ بنایا تھا وہ منہدم ہو گیا۔ نگاہِ یار کی کرشمہ کاری پر ایسا ہی ایک شعر اور کہا ہے جو عرفانیات میں ہے۔

پھر اک نگہِ مست کہ بے کیف ہے عالم ،   میخانہ بیک گردشِ پیمانہ بنا دے

یہ شعر پہلے شعر سے کہیں بلند ہے ــــ باقیات کا ایک شعر ہے :-

تہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کے دیکھ   قطرہ قطرہ میں سمندر ہے نظر پیدا کر

سمندر کی حقیقت قطرہ میں پوشیدہ ہے، کیونکہ سمندر خود کوئی چیز نہیں ہے قطروں کے مجموعہ کا نام سمندر ہے اور اس طرح سمندر کی حقیقت ہر قطرہ میں مستور ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا شعر عرفانیات میں ہے :-

ذرہ میں ہے گم وسعتِ صد عالمِ صحرا   ذرہ کو سمجھ وسعتِ صحرا سے گزر جا

اس شعر میں مضمون زیادہ بلند ہو گیا ہے کہ صحرا کی وسعت اور پہنائی ہر ذرہ میں گم ہے وہ بھی ایک صحرا کی نہیں "صد وسعتِ صحرا"۔ دوسرے شعر میں پہلے کی نسبت وسعت زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے شعر میں کم سے کم الفاظ میں وہ تمام مضمون آ گیا ہے جو پہلے شعر میں ہے۔

اپنے مضامین میں خود ہی اضافہ کرنے کی اکثر مثالیں اسوقت بھی ہمارے سامنے موجود ہیں مگر ہم اُن اشعار کے متعلق یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ پست مضمون پہلے کہا گیا تھا اور بلند مضمون بعد میں۔ اس لئے ہم ان اشعار کو درج نہیں کرتے البتہ ایک مثال جگر مراد آبادی کے کلام سے پیش کرتے ہیں جسکے بارہ میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ شعر ہے :-

ترے جلووں میں گم ہوکر خودی سے بیخبر ہوکر — تمنا ہے کہ رہ جاؤں سراپا نظر ہوکر

یہ شعر عشق کے ایک ابتدائی مرحلہ سے متعلق ہے جبکہ حسن سے لگاؤ بدرجۂ اتم ہوتا ہے اور عاشق محبوب کے جلووں میں گم ہوجانے کی تمنا کرتا ہے اور اسکو خبر نہیں ہوتی کہ جمال محبوب خود اسکی ذات میں کیا کیا انقلابات پیدا کرنے کا باعث ہے۔ یہ شعر جس مقام کی تفسیر ہے وہ اہل نظر کے نزدیک ہوس سے قریب تر ہے۔ اس کے بعد ایک وقت آتا ہے جب خود عاشق کی ذات میں انقلابات واقع ہونے لگتے ہیں اور وہ جن جلووں کی تمنا کرتا تھا ان کی تاب اب اُس میں نہیں رہتی تو کہتا ہے کہ :۔

خود ہوئی گم ہمیں بھی کھو بیٹھی — نگہ باریاب نے مارا

اس مقام سے بھی جب عاشق آگے بڑھتا ہے تو ایک منزل آتی ہے جہاں عاشق کے خیالات کا انتشار بالکل رفع ہوکر کامل یکسوئی پیدا ہوجاتی ہے اُس مقام کی حالت یہ ہے کہ :۔ جگر وہ حسن یکسوئی کا منظر یاد ہے اب تک — نگاہوں کا سمٹنا اور ہجوم نور ہوجانا

جب یہ مرحلہ بھی طے ہوجاتا ہے تو ایک اور مقام آتا ہے جہاں خود عاشق کی ذات میں حسن محبوب کے جلوے پنہاں ہوکر رہ جاتے ہیں اور اس عالم میں جب اس کو دیدار محبوب میسر آتا ہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے :

ہجوم تجلی سے معمور ہوکر — نظر رہ گئی شعلۂ طور ہوکر

——— پہلا شعر جگر نے اپنی شاعری کے دور سوئم میں کہا ہے اور بعد کے تین شعر دور چہارم میں آخری شعر کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ اپنے ماقبل اشعار سے بعد میں کہا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک کے بعد دوسرے شعر میں ترقی ہی ہوتی چلی گئی ہے۔ جگر کے متذکرہ آخری دو شعروں کے ساتھ فانی کے اس شعر کو بھی یاد رکھنا چاہئے :۔

فضائے شوق کا وہ شعلہ زار نور ہوجانا — وہ اک اک ذرۂ دنیائے دل کا طور ہوجانا

ان مثالوں میں مضامین دونوں طرح کے موجود ہیں وہ بھی جن میں شاعر اپنے گزشتہ کلام سے ترقی کی ایک منزل آگے بڑھ گیا ہے اور وہ بھی جہاں اپنے ہی مضمون سابق کو دہراتے وقت وہاں تک بھی نہ پہونچ سکا جہاں تک پہلے پہونچا تھا غور کرنا چاہئے کہ ایک مستقل نظریہ شاعر کے سامنے ہے اسکے متعلق وہ بہترین اسلوب اور دلنشین طرز بیان، پرجوش طریقۂ تخاطب اور دلربایانہ کشش کے ساتھ اشعار کہہ جاتا ہے لیکن ایک وقت اس پر ایسا آتا ہے کہ اُسی نظریہ سے متعلق شعر کہتا ہے مگر یہ تمام صفات اس میں مفقود ہوتی ہیں۔ اس سے اس امر کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی جوش جو ہر تخلیقی آرٹ کا اصل مبداء ہوتا ہے خود اپنے اختیار کی چیز نہیں ہے کہ جب چاہا اس کو پیدا کر لیا۔ نیز یہ امر بھی فانی کی متذکرہ مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ شعر کہتے وقت قوت نقد کس حد تک ضعیف ہوجاتی ہے کیونکہ اگر شاعر کی یہ قوت ضعیف نہ ہوگئی ہوتی تو وہ کوشش کرتا کہ پہلے شعر سے اس کا دوسرا شعر بڑھ جائے یا کم از کم اسکے ہم رتبہ تو ہوجائے۔ اور اگر اس پر قدرت حاصل نہ ہوتی تو پھر اس شعر کو کلام سے خارج کر دیتا۔ اس تمام بحث سے اس امر کی شہادت فراہم ہوتی ہے کہ جن شعروں کو قائلین نے سرقہ قرار دیا ہے وہ دراصل پہلے شاعر کے مضمون میں اضافہ کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے اور اس میں بدنیتی کو بہت ہی کم دخل ہے الا ماشاءاللہ۔ اور قوت نقد کا ضعف اس ناکامی کو شاعر کی نظروں سے پوشیدہ کر دیتا ہے۔ قائلین اس کو سرقہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اگر شاعر کی نفسیات پر غور کر لیا جاتا تو یقیناً ان کو دوسرا ہی فیصلہ کرنا پڑتا۔ ہم حضرت کعب ابن زبیر کا نظریہ پہلے پیش کر چکے ہیں کہ :۔

ما ارانا نقول الا معارا — اَوْ معاداً من قولنا مکرورا

(ترجمہ) ہم جو کہتے ہیں وہ اگلوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی کہے ہوئے کو دہراتے ہیں

گویا شاعر صرف دو طرح کے شعر کہتے ہیں۔ اگلوں سے استفادہ۔ یا اپنے خیالات کا اعادہ۔ ہم شاعر کی انفرادیت پر شروع میں اظہار خیال کر چکے ہیں۔ یہ انفرادیت ہی اس کے تمام کلام کی اصل روح ہوتی ہے اور دوسروں سے استفادہ ہو یا اپنے ہی خیالات کا اعادہ اس انفرادیت کو تلاش کرنا ایک ناقد کا سب سے پہلا فرض ہے۔ اگر کسی کلام میں یہ چیز ناپید ہوجائے تو وہ سرقہ ہے اور اگر شاعر کو اپنی انفرادیت اور ذہنی کاوش بھی شعر میں موجود ہے تو اس کو سرقہ کہنا کوتاہ نظری کا ثبوت دیتا ہے ۔

محمد عزیز حسن مراد آبادی

رشید احمد صدیقی کا آرٹ

بورژوائی تہذیب کو اجتماعیت سے ہمیشہ خوف رہا ہے اس لئے کہ بورژوائی تہذیب میں انفرادیت ہی کے سہارے انسان اپنی طاقتوں اور قوتوں کو زندگی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ایک انسان سے دوسرے انسان کو چونکہ گہرا تعلق نہیں ہوتا اس لئے بورژوائی تہذیب کو زندگی ملتی رہتی ہے۔ بورژوائی سماج کی عمارت کو انفرادیت کی بنیاد پر کھڑی دیکھ کر وہ لوگ جو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ انفرادی قوت پر سنبھلی ہوئی ہے یہ نہیں جانتے کہ یہی انفرادیت ہے جس سے انسان کے تعلقات کبھی گہرے نہیں ہونے پاتے اور سماجی زندگی کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی انفرادیت ہے جس سے بورژوا نظام کے انسان کائنات کے اسرار نہایت ہی اجنبی اور غیر سماجی فرد کی حیثیت سے جان لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی انفرادیت ان کے نفس کو آزادی دیکر سماج کی "زنجیروں" سے انھیں دور کرتی ہے۔

جس فنکار کو سماجی تعلقات کے ساحل نظر آجاتے ہیں وہ بورژوائی سمندر میں زندگی کی کشتی چلانا پسند نہیں کرتا ——— اس لئے کہ سماجی تعلقات اسے آزادی بخش دیتے ہیں اور بورژوائی کے برعکس وہ انفرادیت کی سطح سے بلند ہوکر سماج سے وابستہ ہوجاتا ہے اور وہ اچھی طرح سمجھ جاتا ہے کہ سماج اور سماجی اور اجتماعی زندگی ہی انسان کو صحیح معنوں میں آزادی دیتی ہیں، وہ عوام کی جمہوریت کی حقیقت سمجھتا ہے اور سماجی حقیقت کی تخلیق اس طرح کرتا ہے کہ اس میں اس نظام زندگی کے خلاف آوازیں بلند ہوں جس میں سماجی زندگی کو حسن دینے کے کوئی انداز نہ پائے جاتے ہوں۔

رشید احمد صدیقی کے آرٹ میں وہی انفرادیت پائی جاتی ہے جس میں دنیا کو سمجھنے کی نہایت ہی غیر سماجی کوشش ہوتی ہے۔ ان کے فن میں سماجی شعور کی تصویر نہایت دھندلی ہے ان کے یہاں انسان دوستی کے جذبہ کا فقدان ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی طنز و مزاح میں زندگی پیدا نہیں ہوتی۔ خلوص اور انسان دوستی کے جذبے کے فقدان نے ان کی طنز سے اثر انگیزی کی ساری صلاحیتیں چھین لی ہیں، رشید احمد کے پاس حقیقت کا کوئی مادی تصور نہیں اس لئے جب وہ حقیقت سے قریب جاکر طنز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ناکام ہوجاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں بعض وقت مستقبل سے مایوسی کی ایسی تصویریں نظر آتی ہیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ "مرشد" میں جہاں مرشد آنے والے دور کا ذکر کرتا ہے وہاں نئی دنیا اور اشتراکیت سے بیزاری کے عناصر نمایاں ہیں۔

ان کے مضامین عموماً ان کی اپنی ذات اور اپنے ماحول (یعنی علیگڈھ کی فضا) سے تعلق رکھتے ہیں، بعض وقت ان کا ماحول مشرقی اور مغربی روایات کا ایک ایسا امتزاج بن جاتا ہے جس کی سطح نہایت ہی پُرخروش ہے اور تہہ بالکل ساکن! روزمرہ کے واقعات ان کا آرٹ ہے ان کا فن کبھی زندگی کی گہرائیوں سے دلچسپی نہیں لیتا۔ بنیادی اسباب پر بھی ان کی نگاہیں نہیں جاتی ہیں۔ ان کا فن کبھی زندگی کو آگے بڑھنے میں مدد نہیں کرتا، ان کا ماحول جس تہذیب کی نمایندگی کرتا ہے اس میں ذوقِ عمل کا فقدان ہے جس کی تلافی ہنگامہ گفتار سے کی جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اساطیری اور سیاسی حوالجات سے ان کا آرٹ غیر معمولی فایدے حاصل کرتا ہے اور اکثر محض چند الفاظ کے اشارے ناگفتنی کی ایک داستان پیش کردیتے ہیں اور اس طرح مجرب ہوتے بھی رشید صدیقی وہ سب کچھ بیان کرجاتے ہیں جنھیں تہذیب برداشت نہیں کرتی۔ یہاں وہ روسی ادب کے مشہور مزاحیہ نگار زوشینکو کے قریب ہوجاتے ہیں جس کی فحش باتوں میں مزاح تو پیدا ہوجاتا ہے طنز پیدا نہیں ہوتی —!

رشید احمد صدیقی کا فن زندگی کا سطحی ترجمان ہے اس لئے ان کی طنز مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں وہ صرف سطحی دلچسپی پیدا کرنا چاہتے ہیں

اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ــــــــ جب وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں سوراج، یونیورسٹی، جیل، تعزیرات ہند، پولس، بیوی کو ذہنی اور جسمانی فتنہ و فساد کے مرکزی ادارے سمجھنے لگتے ہیں، بیوی بچے کو انسان کے لئے بیڑیاں تصور کرتے ہیں اور بنگالی مولوی اور مارواڑی کو سکونِ سفر کے بدترین دشمن سمجھتے ہیں تو مزاح ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن خیالات میں مخصوص انداز کے قرار کی وجہ سے طنز پیدا نہیں ہوتی اور کہیں انسان کی بے حسی کی بے نقابی میں طنز کی لکیریں اُبھرتی بھی ہیں تو فوراً ٹوٹ جاتی ہیں اس لئے کہ انھیں انسان پر مطلق بھروسہ نہیں ہوتا

ایک وقت تھا کہ جب مرد شکار کے لئے جاتے تھے تو عورتیں باغبانی کیا کرتی تھیں، پھر مرد جب بھیڑ بکریوں کے مالک بنے تو عورتوں کو گھر کا کام سپرد کیا گیا اور وہ غلام بن گئیں۔ رفتہ رفتہ عورتوں کے سارے حقوق چھین لئے گئے، انھیں ناقص العقل کا خطاب دیا گیا اور اس کے بعد انھیں اپنے حقوق کے مطالبہ کا بھی حق نہ رہا۔ بورژوائی ذہنیت کے انسان آج بھی عورتوں کو اپنے ساتھ زندگی کے اُس میدان میں لانا نہیں چاہتے جہاں جدوجہد ہے اور جہاں انسان کے تعلقات اچھے بنتے ہیں وہ ابھی تک عورتوں کو ناقص العقل سمجھتے ہیں، ان کے حقوق کی وسعت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر وہ عورتوں کو ذلیل نہ سمجھیں تو وہ اپنے خدا کے نزدیک باغی سمجھے جاتے ہیں۔ رشید صدیقی کے عورت کا تصور نہایت ہی رجعت پسند ہے عورت کا مذاق اُڑاتے ہیں ضرور لیکن ساتھ ساتھ خود بھی اپنا مذاق اُڑانے لگتے ہیں۔ عورتوں کو فتنہ و فساد کی بنیاد سمجھتے ہیں، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی عورتوں کو دیکھ کر وہ بالکل اسی طرح چکرا جاتے ہیں جیسے وہ انگریزوں کی لائی ہوئی تہذیب کے ہر رخ کو خطرناک سمجھ کر چکراتے ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں :- "انگریز اور عورت دو بڑی ایسی چیزیں ہیں جن سے مرد معقول ڈرا کرتے ہیں، عورت سے محبت کرنا ہمیشہ ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبت کی آڑ یا زد میں سب کچھ ہوا۔ جیل، ہسپتال، فنونِ لطیفہ، مضمون نویسی، اکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانے قسم کی تمام چیزیں اسی کی منت کش ہیں"۔

دوسری جگہ دیکھئے :- "میں ڈاکٹر صاحب کے کمال فن کا اتنا ہی قایل ہوں جتنا ملیریا کے علاج میں کونین کا یا عورتوں کے ناقص العقل ہونے کا"

رشید صدیقی کے فن میں فوراً تضاد پیدا ہو جاتا ہے جب وہ اپنے ایک مضمون میں ایک وکیل کی بیوی کے کردار میں انسانیت دکھا کر زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ کردار زندگی کو گرنے سے سنبھال لیتا ہے۔ مصیبت کے طوفان میں مسکرانا سکھاتا ہے، جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔ ممکن ہے رشید صاحب نے اس کردار کو غیر شعوری طور پر تراش دیا ہو۔

عورت کو ذلیل سمجھنے کا خیال یقیناً سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پیداوار ہے ایسے دور میں جہاں عورتیں مردوں کے ہر قدم پر ساتھ ہیں، عورت کا ایسا تصور نہایت ہی رجعت پسند نظریہ ہے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کی ہوئی عورتوں پر طنز کے تیر چلائے جا سکتے ہیں لیکن ایسے مزاح سے کوئی فایدہ نہیں۔

رشید صاحب کا ایک مضمون ہے "لُر" اس مضمون میں غریبوں پر شفقت کرنے کا وہی جذبہ موجود ہے جو آج سرمایہ داروں کا ہے، جس پر انھیں بہت فخر ہے۔ غریبوں سے محبت کرنا کچھ اور شے ہے اور شفقت کرنا کچھ اور ــ اس مضمون میں وہ عیدو پر احسان کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ایک مِل کا مالک کسی خوبصورت مزدور لڑکی کو کچھ زیادہ مزدوری دلا دیتا ہے۔

رشید صدیقی نہ تو اُردو کے چیسٹرٹن ہیں اور نہ برنارڈ شا۔ اس لئے کہ ان کی ظرافت میں طنز کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ان کی ظرافت بھول کے لئے نہیں ہے، ان کے یہاں ایک تصویر ہٹتی نہیں کہ دوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ایسی تیزی اور سیمابیت طنز اور ظرافت دونوں کے لئے مضر ہے۔ ان کے یہاں بات میں بات پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک واقعہ تیزی سے دوسرے واقعہ پر چھاتا چلا جاتا ہے۔

ان کے یہاں انسان دشمنوں پر طنز کے کوڑے نہیں چلتے۔ ان کے پاس طنز کی ایسی سوئیاں ہیں جن سے وہ جہاں سے چاہتے ہیں خون کے چند قطرے گرا لیتے ہیں لیکن بعد کو وہ سوئیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ زیادہ کام کرنے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

اے پوپ (A - POPE) نے اپنی طویل نظم THERAPEDFTHELOCK میں جہاں عورتوں کی بیوقوفی کا مذاق اُڑایا ہے وہاں وہ خود بھی عریاں ہو گیا ہے۔ اس کی طنز سے اُس وقت زندگی چھن جاتی ہے جب وہ دنیا ایک بے رحم طنز بن جاتا ہے

وہ بے رحم کے لئے بے رحم نہیں بنتا، اس کے ماحول میں عورتوں نے فیشن ہی کو اپنی زندگی سمجھ رکھا تھا، کتے کے بچے کی موت پر عورتیں شوہر کی موت سے زیادہ غم منایا کرتی تھیں۔ پوپ نے اپنے ماحول کی اچھی عکاسی کی ہے، مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے ظرافت میں زندگی پیدا کر دی ہے لیکن چونکہ اس کے پاس حقیقت کا کوئی مادی تصور نہ تھا اس لئے وہ اپنی طنز میں تیزی اور بت شکنی پیدا نہ کر سکا۔ وہ بورژوا طبقہ کا ترجمان بن کر رہ گیا اس کی طنز میں کوئی تعمیری پہلو نمایاں نہ ہوا، اس کی آواز اونچے طبقے کی آواز بن کر رہ گئی، اس کی نظم پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بورژوا فنکار غیر شعوری طور پر اپنے نظام زندگی کو قایم رکھنا چاہتا ہے؛ طنز کے تیر صرف اس لئے چلاتا ہے کہ اس کے ذہن میں اپنے نظام کا جو خاکہ ہے اس سے الگ اس کے نظام کا کوئی خاکہ نہ بن سکے۔ وہ کسی عنصر کو ڈھلتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ رشید صدیقی کی طنز و ظرافت میں بھی تیزی اور بت شکنی پیدا نہ ہو سکی، اس لئے کہ ان کی طنز و ظرافت میں کہیں کوئی تعمیری پہلو نمایاں نہیں۔ یہاں بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس نظام زندگی کو ہمیشہ قایم دیکھنا چاہتے ہیں جس میں وہ سانس لیتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر اس کے لئے وہ اپنے ہر کردار کی بے عزتی بھی پسند کر سکتے ہیں۔ ان کے آرٹ میں ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بورژوائی دوسرے بورژوائی کو ڈانٹ رہا ہے اور لبوں پر مسکراہٹ بھی کھیل رہی ہے۔

رشید صدیقی کے انداز بیان سے کسی بھی نئے آہنگ کا پتہ نہیں چلتا۔ اندازِ بیان کنایوں، صنعتوں اور تشبیہوں کا مرہون منت ہے ان کے یہاں گفتگو کے ساتھ مناظر کے پہلو اس تیزی سے بدلتے رہتے ہیں کہ ربط و سلسلہ شکست و ریخت کے صدمہ سہنے کا عادی بن جاتا ہے وہ ایک سلسلہ قایم رکھ کر اتحاد و اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کے یہاں بات میں بات پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک بات پر دوسری بات اس طرح چھا جاتی ہے کہ پڑھنے والا گھبرا جاتا ہے۔

بعض وقت ان کی تحریر میں بڑی زندگی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ زندگی تھوڑے وقفہ کی زندگی ہوتی ہے۔ بعض مضامین میں متحدہ خیالات اور ظریفانہ تفصیلات کے ساتھ وزنی اور قابل قدر انجام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا ڈرامائی انداز بھی ان کے فن کو بعض وقت بڑی زندگی بخش دیتا ہے۔ دو مختلف عجیب و غریب عناصر ان کے یہاں جب ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو زندگی اُبل پڑتی ہے یونیورسٹی اور پولیس کے نزدیک تحقیقات ہی سب کچھ ہے، عورت اور ندی دونوں طاقت کو زندگی سمجھتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کے اکثر مضامین اردو ادب کی نہایت ہی اچھی مثالیں ہیں ——— رشید صدیقی کے مخصوص علامات اگرچہ فرسودہ علامات ہیں پھر بھی بعض وقت ان سے کچھ نہ کچھ زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ارہر کا کھیت، مدر انڈیا، حاجی بلغ العلیٰ اور مرشد وغیرہ ان کے مخصوص علامات ہیں۔

فنکار اپنی تخلیقات کو اپنی ذات تک محدود نہیں کر سکتا ہے، اس کی تخلیقات زندگی اور دنیا کے لئے نہ ہوئیں تو فنکار ملزم ہے؛ رشید احمد صدیقی کے فن سے ہماری امیدیں اب بھی وابستہ ہیں۔ ہم ان کے آرٹ سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کے اجتماعی شعور سے بھی مایوسی یقیناً بہت بڑی غلطی ہوگی۔

شکیل الرحمٰن شکیل

باب الاستفسار

مومن کے قصاید

(فضل الٰہی صاحب - کراچی)

غالباً یہ فخر نگار ہی کو حاصل ہے کہ اس زمانہ میں سب سے پہلے اسی نے مومن کی یاد کو تازہ کیا، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ لوگ اسے بالکل بھلا بیٹھے تھے اور دوسرے اساتذہ کے ساتھ مومن کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا تھا اس لئے یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی کہ نگار کے مومن نمبر کا دوسرا اڈیشن شایع ہوگیا ہے لیکن اس میں غالباً زیادہ تر مومن کے تغزل سے بحث کی گئی ہے اور اس کی قصیدہ گوئی کا ذکر تفصیل کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ بہتر تو یہ تھا کہ مومن نمبر کے دوسرے اڈیشن میں ایک مضمون اس موضوع پر بھی شامل کر دیا جاتا، تاکہ قصیدہ گوئی میں جو مرتبہ مومن کا ہے، وہ ظاہر ہو جاتا، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لئے میں اپنی ذاتی معلومات کے لئے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مومن کے قصاید کی تعداد کتنی ہے، وہ کس کس کی تعریف میں لکھے گئے ہیں، اور دوسرے ممتاز قصیدہ گو شعراء کے مقابلہ میں مومن کی حیثیت کیا ہے۔

(نگار) مومن نمبر میں یقیناً ایک مستقل مضمون مومن کی قصیدہ گوئی پر ہونا چاہئے تھا اور میں اس سے خالی الذہن نہ تھا، لیکن اس خیال کی تکمیل میں متعدد اسباب حایل تھے۔ ایک یہ کہ اس مضمون کے لئے کم از کم تین جزو کا اضافہ کرنا پڑتا اور بہ حالات موجودہ جبکہ کاغذ کی گرانی و کمیابی انتہائی حد تک پہونچ چکی ہے یہ اضافہ ممکن نہ تھا، دوسرے یہ کہ اس موضوع پر خود مجھی کو لکھنا پڑتا اور اس کے لئے جس اطمینان و سکون کی ضرورت ہے وہ فی الحال مجھے میسر نہیں، بہرحال اس فروگزاشت پر مجھے افسوس ہے اور اس کی تلافی ایک حد تک اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آپ کے استفسار کے جواب میں مختصراً اس موضوع پر کچھ عرض کر دوں۔

قصیدہ گوئی میں سودا اور ذوق کو خاص شہرت حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں نے متعدد قصاید لکھے اور اپنا پورا زورِ طبع ان پر صرف کر دیا غزل کی طرح اُردو میں قصیدہ گوئی بھی فارسی کی تقلید تھی اور چونکہ فارسی کی قصیدہ گوئی کا تعلق شاعری سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا اظہار فضل و کمال سے اس لئے اُردو میں بھی قصیدہ گوئی کا رنگ یہی رہا۔ تاریخی و علمی اصطلاحات، دقیق و مشکل الفاظ، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی، زورِ بیان، مبالغہ، و تعلی، قصیدہ گوئی وہ خصوصیات تھیں جو فارسی میں عام طور پر پائی جاتی تھیں اور جن کا تتبع اُردو میں بھی کیا گیا۔

فارسی قصیدہ گوئی کی تفصیل پر اظہار خیال کا محل نہیں، ورنہ میں شاید زیادہ تفصیل کے ساتھ ان خصوصیات پر روشنی ڈال سکتا۔ بہرحال ان تمام ذیلی مباحث سے ہٹ کر جس وقت ہم اُردو کی قصیدہ نگاری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو چار شاعروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سودا، ذوق، غالب اور مومن۔

غالب نے اُردو میں کوئی ایسا قصیدہ نہیں لکھا جس کا ذکر سودا اور ذوق کے قصاید کے ساتھ کیا جا سکے۔ اس نے اپنا سارا زورِ قلم فارسی قصیدہ نگاری میں صرف کر دیا اور بہت کامیاب ہوا۔ سودا ان خصوصیات کے لحاظ سے جو قصیدہ کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں، بڑا کامیاب قصیدہ گو تھا۔ ذوق کے قصاید گو زورِ بیان کے لحاظ سے سودا کے قصاید سے کمتر ہیں، لیکن روانی و پختگی کے لحاظ سے وہ سودا سے بڑھے

ہوئے ہیں۔ مومن کے یہاں ذوق و سودا دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے اور اگر مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنا کر زیادہ قصاید لکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سودا اور ذوق کے ساتھ ان کا نام بھی نہ لیا جاتا۔

مومن نے صرف نو قصیدے لکھے۔ ایک حمد میں، دوسرا نعت میں، چار خلفاء کرام کی منقبت میں، ایک حسنؑ کی شان میں۔ صرف دو قصیدے انھوں نے دُنیاوی حیثیت سے لکھے، ایک والی ٹونک کی مدح میں، دوسرا راجہ پٹیالہ کی تعریف میں، اور ان تمام قصاید میں انھوں نے سودا اور ذوق دونوں سے اپنی راہ علیحدہ اختیار کی۔

قصیدہ میں تشبیب خاص چیز ہے اور اس پر تمام شعراء نے اپنا پورا زور صرف کیا ہے، لیکن عرفی کی طرح یہ خصوصیت مومن ہی کو حاصل تھی کہ اکثر قصاید میں انھوں نے تشبیب کو اس کے صحیح معنے میں پیش کیا اور پورا رنگ تغزل اس میں بھر دیا۔

خلیفۂ ثانی کی منقبت میں جو قصیدہ ہے اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو اُس کی زلف کو دوں اپنا عقدۂ مشکل — تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

تم اور حسرتِ ناز، آہ کیا علاج کروں، — میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل،

چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوقِ رسائی و دور رہی منزل

خدا سے ڈر بت بیدرد، ہے یہ کیا انصاف — کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں ہیں۔ سودا اور ذوق کے قصاید میں ایسا رچا ہوا رنگ تغزل آپ کو نہ ملے گا۔

مومن نے بھی دوسرے شعراء کی طرح قصاید میں زمانہ کی شکایت، اس کی ناقدرشناسی اور اپنی ناکامی و نامرادی کا ذکر کیا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اسی متغزلانہ رنگ میں خلیفۂ ثالث کی منقبت میں تو انھوں نے غزل کی پوری واسوخت لکھ دی:

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار — چھوڑ دو دل آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

گر تمھیں صحبتِ اغیار سے پرہیز نہیں — ہم بھی کچھ چارۂ آزار کریں گے ناچار

وہ چلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع لقا — مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار

بے مروت مری نظروں میں ہیں انداز ترے — آجکل کچھ نگہ لطف ہے سوئے اغیار

آپ دیکھا نہ سنا اور سے، پر جھوٹ نہیں — تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

الغرض مومن کی یہ خصوصیت کہ وہ قصیدوں میں بھی غزل کی طرف آجاتے ہیں، ان کی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔

جیساکہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ قصاید میں زور بیان، مبالغہ، دقت آفرینی اور تلمیحات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جاتا تھا اور یہ وہ روایت تھی جس سے مومن بھی نہ بچ سکے اور چونکہ وہ عربی فارسی کے فاضل، طب و نجوم کے ماہر تھے اس لئے ایسی ایسی علمی اصطلاحیں استعمال کیں اور ایسی ایسی تلمیحات سے کام لیا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کی منقبت کے مطلع ثالث میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

صوفیوں نے ترے چہرہ کا جو عالم دیکھا — ہوئے قایل کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جب تک کسی کو صوفیوں کا یہ نظریہ معلوم نہ ہو کہ تجلی خداوندی کی تکرار نہیں ہو سکتی، مدعا یہ کہ صوفیوں کو تیرا چہرہ دیکھنے کے بعد ہی اس کی تصدیق ہوئی کہ تجلی کی تکرار ممکن نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ تو اپنے جمال میں بے مثل ہے لیکن اسے ظاہر کیا اس انداز سے!

اسی قصیدہ میں اصطلاحاتِ نجوم کا عالم دیکھئے:

ذروۂ اوج سے برجیس کی رجعت ہو جائے — ثور میں زہرہ کرے مہر کے قِراں سے انکار

تاکہ ہو جائے ہر آزار کا مصدر ایک ایک — تحت تحسین کو ہے دفع طبیعت پہ قرار

بندھے امید گر اک خوشۂ گندم کی مجھے — قہر تحویل سے ہو برج شرف کے بیزار

گر حصول زر مسکوک کی سمجھوں میں دلیل، ناخن شیر سے ہو سینۂ خورشید فگار
خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابح سعد قتل پر میرے کمر باندھے ہے شکل جبار
زیست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا بھول جائیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

ان اشعار میں مومن نے اپنی زبوں قسمت اور منحوس طالع کا ذکر کرتے ہوئے گویا اس شعر کی شرح کی ہے:-

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

ان اشعار میں ذروہ (بلندی)، برجیس، زہرہ، نحسین، تحویل، احترق، ذابح سعد، تربیع، تقابل، انظار، سب علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں[1]

رئیس پٹیالہ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی ابتدا بھی انھوں نے اسی قسم کے اشعار سے کی ہے:

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری
چشم ستارہ سحر یوں زحل سے سرمہ سا دشنۂ ترک چرخ سے تیز نگاہ مشتری

مومن نے فلسفہ کی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً:-

جب ستایا مجھے اس نے وہی اُلفت وہی دل یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہر معدوم

فلاسفہ کا اعتقاد ہے کہ جو شے معدوم ہو جائے وہ پھر وجود میں نہیں آسکتی، مومن کہتا ہے یہ خیال غلط ہے، کیونکہ جب کبھی محبوب نے مجھے ستایا، گئی ہوئی محبت پھر لوٹ آئی۔

ایک اور شعر: فکر الزام حکیم و متکلم ہو اسے، تو مجسم نظر آجائیں نقاط موہوم

نقطہ کو حکیم و متکلم فرضی و موہوم مانتے ہیں، مومن کہتے ہیں کہ اگر میرا ممدوح ان کے اس نظریہ کو باطل کرنے پر آئے تو نقطہ بھی جسم اختیار کر کے سامنے آجائے۔

نعتیہ قصیدہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ہے دشت بزم طرب کثرت نتائج سے نہ کیوں ہو شکل حماری کو ناز شکل عروس

شکل حماری اور شکل عروس، اقلیدس کی دو شکلیں ہیں، جن میں شکل عروس کثرت نتائج کے لحاظ سے زیادہ اہم چیز سمجھی جاتی ہے۔

اسی شکل عروس کا ذکر انھوں نے ایک اور جگہ بھی کیا ہے:-

گواہ عصمت مریم ہو کثرت اولاد عقیمہ مجھ سے سنے گر بیان شکل عروس

مومن کا یہ شعر بہت مشکل ہے، اس لئے اس کی توضیح کئے دیتا ہوں:-

شکل عروس اقلیدس کی ایک ایسی شکل ہے جس سے نتائج کثیر پیدا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں کسی عقیمہ (بانجھ عورت) کے سامنے شکل عروس کا بیان کر دوں تو اس کا بانجھ پن دور ہو جائے اور اس کی اولاد کی کثرت کو دیکھ کر لوگوں کو جناب مریم کی پاکدامنی کا یقین آجائے کیونکہ جب ایک عقیمہ کے اتنی اولاد پیدا ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوشیزہ کے بطن سے اولاد نہ ہو سکے۔

دیکھ کر تیزی تیغ کوہ شگاف، ٹوٹ جاتی ہے سرکشوں کی کمر
خط نصف النہار ہو محسوس گر فلک کو عدو بنائے سپر

خط نصف النہار فضائے آسمانی کا ایک فرضی خط ہے، لیکن مومن اپنے ممدوح سے کہتا ہے کہ اگر تیرا دشمن تیری تلوار کا وار بچانے کے لئے

---

[1] جن حضرات کو ان اشعار کی تشریح درکار ہو وہ مجھ سے علیحدہ دریافت کر سکتے ہیں۔ بسلسلۂ استفسار و جواب قلت گنجائش کی وجہ سے تشریح ممکن نہ تھی۔

آسمان کو سپر بنائے تو اس کا خط نصف النہار بھی باوجود فرضی و موہوم ہونیکے محسوس ہونے لگے اور ایسا معلوم ہو گویا آسمان کی ڈھال میں بال پڑ گیا ہے۔

طبی اصطلاحات ملاحظہ ہوں :

جو ہوں معالج مبطوں تو قابض ارواح　　　کرے دعائے رواج طریق جالینوس

درم ہو چارہ گر قبض تا بدست لئیم　　　کیا ہو مینے جو تجویز وزن مغز فلوس

مبطون اس مریض کو کہتے ہیں جسے معدہ کی شکایات رہتی ہوں۔ جالینوس یونان کا مشہور طبیب تھا جسے امراض معدہ کے علاج میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اور جس کی جوارش جالینوس بڑی مشہور چیز ہے۔ مومن کہتا ہے کہ اگر میں کسی مریض معدہ کا علاج کروں تو خود ملک الموت جان نکالنے کی جگہ جالینوس کے طریق علاج کی دعا کرنے لگیں۔

دوسرے شعر میں درم قبض اور فلوس سے ایہام کا کام لیا ہے۔ فلوس، املتاس کو کہتے ہیں، اور پیسوں کو بھی۔ اسی طرح درم طبی وزن بھی ہے اور سکہ کا نام بھی۔ قبض، اسہال کا ضد بھی ہے اور مٹھی بند کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں رفع قبض کے لئے ایک درم مغز فلوس تجویز کر دوں تو بخیل کا بخل بھی دور ہو جائے۔

چوسر کی اصطلاح دیکھئے:

نرد بازوں کو عہد میں تیرے　　　ششش جہت جیسے مہرۂ ششدر

مہرۂ ششدر چوسر میں اس مہرہ کو کہتے ہیں جو چھ خانوں میں سے کسی خانہ میں نہ چل سکے اور زچ ہو جائے۔

مومن کے یہاں تاریخی و مذہبی تلمیحات بھی بکثرت پائی جاتی ہیں (جن کی تفصیل کا موقع نہیں) اور اپنے اظہار فضل و کمال کے لئے ایسے ایسے دقیق الفاظ استعمال کئے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا انسان انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ نعتیہ قصیدہ کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں: ۔ مجوس (ابرہائی)، غموس (جھوٹی قسم) قربوس (زین کے سامنے کا حصہ) برطوس (ایک مخصوص دعائے جدائی) مطموس (مٹا ہوا) قصہ مختصر یہ کہ تمام اُن خصوصیات کے لحاظ سے جو ایک قصیدہ کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں، مومن کے قصیدے بھی کامیاب ہیں اور اگر ہم اس رنگ تغزل کو دیکھیں جو مومن کے قصائد میں پایا جاتا ہے، تو یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ اس باب میں مومن کی انفرادیت بہت نمایاں ہے۔

ایک قدیم کتب خانے کی بعض نادر کتابیں

غیاث اللغات (فارسی) مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۳ء۔ مجلد۔۔ چار روپیہ

مدارج النبوت (فارسی) از مولانا عبدالحق دہلوی مطبوعہ نولکشور ۱۹۰۳ء مجلد سات روپیہ

سواطع الالہام (عربی) از فیضی مطبوعہ نولکشور ۱۳۰۶ء مجلد سات روپیہ

حیواۃ الحیوان (ترجمہ اردو) ہر دو جلد مترجم عبدالقدیر دریابادی مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۳ھ ۔ مجلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

منتخب اللغات دارا شکوہی (فارسی) از مولوی عبدالرشید الحسینی ۔ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۵ء ۔ مجلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

شرح عجیبہ غریب قصائد عرفی (اردو) از عبدالمجید خاں ۔ مطبوعہ نولکشور چار روپیہ

علم جفر و شعبدہ جات (اردو) ۔ مجلد ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

آئینۂ نجوم (اردو) مجلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

(اردو) شمس الرمل و کشاف النجوم و انوار النجوم و کوکب الرمل و مفتاح الجفر سعہ

مصداق الرمل و انوار الرمل (فارسی) ۔ مجلد ۔۔۔۔۔ سات روپیہ

سرمایۂ عشرت معروف بہ قانون موسیقی از استاد صادق علی خاں (اردو) مجلد سات روپیہ

مراثی انیس ۔ مطبوعہ نولکشور ۔۔۔۔۔ چھ روپیہ

(فارسی) مجموعہ رسالجات ۔ از خواجہ میر درد دہلوی ۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

(فارسی) علم الکتاب ۔ از خواجہ میر درد دہلوی ۔ مطبع انصاری دہلی مجلد چھ روپیہ

(فارسی) مجموعہ یک صد رسالجات شاہ نعمت اللہ ولی مخطوطہ (قلمی) کتب خانہ شاہ عالم بادشاہ [illegible]

(فارسی) فرہنگ آنندراج ۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک سو بیس روپیہ

صید حرم

(پروفیسر شور علیگ)

بشہرے مردکے طاعت فروشے — مصلی در بغل، مصحف بدوشے
سکوتش گرچہ خود مہر دہن بود — خروش او خروشِ انجمن بود

نگاہش مرہمِ زخم مریداں — دمش کفارۂ خونِ شہیداں
دمادم خوردے سوگند از پیمبر — پیاپے سجدہ ہا کردے بداور

نظرہایش ہمہ تسبیح و تہلیل — نفسہایش ہمہ انفاس جبریل
بدل نشتر، بسینہ داشتے تیر — کہ یارب وارہاں از دست ایں پیر

کمانش را خدنگ از کشف و الہام — بشہر اندر کراماتِ دمش عام
الٰہی درد ما را کن تو درماں — الٰہی جانِ ایں فرتوت بستاں

کمندش بر حرم دامش بر افلاک — ملائک صیدِ یزداں بفتراک
خدا داند چہ کافر ماجرائی — برافروزد چراغِ پارسائی

بزہد از اہل کعبہ بردہ گوئے — دمے آبش نخوردے بے وضوئے
چہ اثر در ما بشکلِ آدمی ہاست — چہ عبرت عبرتِ نظارگی ہاست

بسیرت قدسیِ سجدہ طرازے — بصورت راہبِ گیسو درازے
ولیکن چوں دعایش بے اثر بود — شبش را آفتابے بے سحر بود!

نشانِ سجدۂ پیشانیِ او — گواہِ معرفت سامانیِ او
ہمی نالید و می پیچید و می گفت — مگر از ما خدائے ما بر آشفت

چہ ذرہ، ذرۂ خورشید بردوش — چہ قطرہ، قطرۂ عماں در آغوش
بگفتم ایں چہ فریاد و فغانست — بگفتا درد دردِ بے امانست

چہ عارف، عارفِ شب زندہ دارے — چہ موجے، موجۂ دجلہ شکارے
بگفتم آخرت از چیست ماتم — بگفتا کشتۂ آبِ حیاتم،

ولے با آں ہمہ عرفاں فروشی — باں دستارِ فضل و فقر کوشی
بگفتم گیسوانت برہم از چیست — بگفتا ماتمِ دلہا ز شادیست

اسیرِ دام بودش نازنینے، — بت توبہ شکن آہوئے چینے
بگفتم من بدردت بے خبر دم — بگفت از دامِ آدم زاد مردم

بصحرا مرغکے بشکستہ بالے — بخوں غلطیدۂ وحشی غزالے
بگفتم گل رخا آخر چہ خواہی — بگفتا کیفرے از بیگناہی

ہجوم یاس و آشفتہ نگارے — ہوائے تند و شمع رہگزارے
بگفتم ہرچہ خواہی از خدا خواہ — بگفتا دم مزن استغفر اللہ!

ہم از آہنگ خود افتادہ ناہید — ہم از انوار خود بے نور خورشید
زناں را غمگسار و یاورے نیست — زناں را درد گیتی داورے نیست

ز اشکِ پیہم و از زلفِ برہم — سراپایش تو گوئی نخلِ ماتم
ز سر تا پا چناں بودش سیہ پوش — تو گوئی شمعِ کعبہ گشت خاموش

چہ فریاد و فغاں آخر تواں کرد
خدا مُرد، و نبی مُرد، و وصی مُرد!!!

ابھی ابھی تو......!

(شہاب اشرف، ایم اے)

ابھی ابھی تو فضاؤں سے شعلہ بھڑکا تھا
جہانِ شوق کے ذرے کھنک اُٹھے تھے ابھی
ابھی ابھی تو تبسم کے پھول جھکے تھے،
ابھی ابھی تو اُٹھی تھیں وہ ملتفت نظریں
ابھی تو دوش سے ڈھلکا تھا گلفشاں آنچل
ابھی تو جاگ رہا تھا نگاہ کا جادو،
مچل رہی تھی ابھی دوش پر وہ زلف کی رات
ابھی تو راگنی انساں کے روپ میں تھی کھڑی
ابھی تو نرم تکلم کی پڑ رہی تھی پھوار
یہ کیسی برق سی لہرا کے ہو گئی روپوش

ابھی ابھی تو دل کائنات دھڑکا تھا،
خرامِ ناز سے نغمے چھلک اُٹھے تھے ابھی،
ابھی ابھی لبِ لعلیں سے غنچے ٹپکے تھے،
ابھی ابھی تو چنی تھیں حیات نے کرنیں
ابھی تو سانس کی لہروں پہ ڈولتے تھے کنول
ہوا میں سانس سی لینے لگے تھے جام و سبو
مہک رہی تھی ابھی کس قدر عروسِ حیات
ابھی تو لے میں پگھلتی تھی موتیوں کی لڑی
ابھی تو لیلیِ فطرت بجا رہی تھی ستار
نشاط و نور کے سیلاب ہو گئے خاموش

عروسِ شب نے کلیجہ پکڑ لیا اکدم،
اُتر گئیں جو کھنکتی تھیں چوڑیاں پیہم

نازش پرتابگڈھی:

تری راہ چھوڑ کے بڑھ گیا، ترے در سے ہو کے گزر گیا
کبھی تو نے مجھ پہ کئے ستم تو یقینِ لطف میں کھو گیا
نہ قرارِ دشمنِ جاں ملا نہ سکونِ مرگ نما ملا،
تمھیں آج دیکھ کے مہرباں سبھی جی ہی جی میں بہت ڈرا
جو خطا ہوئی تھی نیاز سے وہ بہ سہوِ وحشتِ دل ہوئی

تری یاد پہونچی ہے اب کہاں کہ تو ذہن ہی سے اتر گیا
کبھی تیرے لطف و کرم پہ بھی مرے دل میں وہم گزر گیا
غمِ عیش سے جو گزر گیا وہ قیامتوں سے گزر گیا،
مگر ایک یہ دلِ ناتواں کہ نہ جانے کس لئے ڈر گیا
جو غرورِ عشق میں کر گیا وہ گناہ حسن کے سر گیا

گھٹائیں :۔ (تنویر احمد علوی ایم۔اے)

آنچل سے فضا میں اُڑ رہے ہیں
دامن سے ہوا میں جُڑ رہے ہیں
جھونکوں میں شراب مل رہی ہے
یا بوئے شباب مل رہی ہے

گردوں پہ گھٹائیں گھر رہی ہیں
پریاں ہیں کہ اُڑتی پھر رہی ہیں
کلیوں کے سلام لا رہی ہیں
پھولوں کے پیام لا رہی ہیں

بادل میں ہوا میں رقص فرما
دنیا ہے شباب کا سا سپنا،
کوثر کی سی موج آ رہی ہے
زلفوں کی سی چھاؤں چھا رہی ہے

بوندوں کی قطار گر رہی ہے
پتوں پہ پھوار گر رہی ہے
پھولوں کو پسینہ آگیا ہے،
ساون کا مہینہ آگیا ہے

بجلی میں شباب کی سی اک رو
بدلی میں شراب کا سا پر تو
شعلہ سا لپک کے رہ گیا ہے
آنسو سا چھلک کے رہ گیا ہے

ظلمات میں چشمۂ صباحی،
بادل میں چھلکتی ہے صراحی
دیوانوں کے خواب ہیں گھٹائیں
کیا مست وخراب ہیں گھٹائیں،

حریم ناز میں عرض ونیاز :۔ (عندلیب میرٹھی)

واکر درِ نشاط، بہاراں کا واسطہ!
تجھ کو نسیمِ صبحِ گلستاں کا واسطہ!
پیغامِ برگ و بار سنا نخلِ شوق کو
بادِ مرادِ عالمِ امکاں کا واسطہ
صحنِ چمن میں ابر کو دے رخصتِ خرام
پژمردگیِ سنبل و ریحاں کا واسطہ،
غنچوں کو پھر عطا ہو نویدِ شگفتگی
آب و ہوائے ارضِ خیاباں کا واسطہ
زنبورِ نوبہار کو پھر نغمہ سنج کر
آہنگِ سازوچنگِ شبستاں کا واسطہ
پھر آرزو کے طائرِ وحشی کو کر رہا
فصل خروشِ مرغِ خوش الحاں کا واسطہ
عقل و خرد کے دام سے دے عشق کو نجات
ذوقِ جنونِ سلسلہ جنباں کا واسطہ
ہاں پھر ربابِ خاطرِ اندوہگیں کو چھیڑ
مضرابِ تارِ جنبشِ مژگاں کا واسطہ
پھر مشعلِ امید جلا طاقِ یاس میں
اشکوں کے اہتمامِ چراغاں کا واسطہ
فرمانِ اختصار شبِ ہجر کو ملے!
روئے حسیں کی صبحِ درخشاں کا واسطہ
کچھ چارہ سازیِ دلِ خوں گشتہ بھی تو ہو
تکمیلِ شوقِ تابشِ افشاں کا واسطہ!
پائے طلب کو بڑھنے دے سوئے درِ طرب
افسردگیِ خاطرِ ویراں کا واسطہ
پھر جامِ زندگی میں ہو صہبائے تلخ اور!
شیریں لبوں کے چشمۂ حیواں کا واسطہ
تیغِ جفائے ناز کو رکھ دے نیام میں
الطافِ بے نہایتِ پنہاں کا واسطہ!
کہہ بار ہا پھر انجمنِ رنگ و بو سے
اشعارِ عندلیبِ سخنداں کا واسطہ!

شبخون

(فضا ابن فیضی)

ہیں مسخ آدمیتِ کبریٰ کے خال و خد
ڈوبا ہوا ہے زہر میں نوشینۂ خرد
یہ زندگی کے بجھتے ہوئے خوشنما کنول
یہ آگ کی لپیٹ میں فردوس کے محل
ہے ذرہ ذرہ شعلہ گر و صاعقہ تراش
فطرت کے آئینے سرِ بازار پاش پاش
سلگی ہوئی بہار یہ جھلسی ہوئی نسیم
ماتم کناں سوادِ گل و شبنم و شمیم
دھندلے ضمیر حلقۂ اندیشہ تنگ و تار
کیا کیا لٹی ہے عصمتِ تقدیسِ روزگار
یہ الٰہی یہ ذہنوں میں دیوانگی کی رو
مدھم سی فکر و فرض کے روشن دیئے کی لو
شعلوں کا یہ شکوہ یہ آہن کا طمطراق
خشت و خزف کی زد پہ ہیں شیشے کے قصر و طاق

یہ جبن و جہل، جبر و جفا، جنگ و جانکنی
یہ زندگی کے لب پہ ہلاکت کی راگنی
یہ قافلے غبار کے کرنوں کے شہر میں
ظلمت کے یہ سفینے مہ و خور کی نہر میں
بلور کی زمیں پہ چٹانوں کی بارشیں
یہ خندۂ سحر سے لہو کی تراوشیں
معصوم لاشیں آتش و آہن کی دھوپ میں
ناسور مسکرائیں تبسم کے روپ میں
کذب کے طاق میں یہ مسِ خام کے دیئے
بیع ضمیر و عقل، زر و سیم کے لئے
شبنم کی ضو سے کتنے گلستاں ہیں شعلہ ناک
کیا کیا اڑائی مل کے شگوفوں نے سر پہ خاک
ہے کائنات اوڑھے ہوئے موت کا کفن
انسانیت پہ اُف یہ شبخونِ اہرمن

دل شاہجہاں پوری :-

بارہا ڈوب کے اُبھرا مرے دل سے نشتر
راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر
اور بھی تم نے بے قرار کیا

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحالِ زار
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

بہت لطیف اشارے تھے جیسے جانبِ دل
اسی نگاہ سے آغاز ہے فسانے کا

کیا کہیے اب مالِ محبت کی سرگزشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

رہنما کی کیا ضرورت عشق کامل چاہئے
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہیں کوئے دوست

اے حسن جو سزائے تمنا ہو، وہ قبول
لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھ کر

بیٹھا رہا جب کٹ کے چکیں کیا جانے کیا آیا خیال
ہم نے آہِ سرد کھینچی سوئے زنداں دیکھ کر

سرگزشت بے کسی نہ حادثاتِ ناتمام
ایک افسانہ ہے دنیا دوسرا افسانہ ہم

قدم قدم پہ [illegible]
[illegible]

مری تمنا وہ دائرہ ہے نہ جس کا اوّل نہ جس کا آخر
کہ جس مقام سے گزر چکا تھا انہیں مقاموں پہ آ رہا ہوں

اسے محبت کا راز سمجھو اگر نہ سمجھو جنون سمجھ لو
ابھی ابھی اشک بہہ رہے تھے ابھی ابھی مسکرا رہا ہوں

روز آ آ کر تسلی دل کو دے جاتا ہے کون
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ سمجھاتا ہے کون

ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے
کیا جانے کس خیال سے دامانِ آرزو

اسی سلسلے میں گزر گئے کئی دور منزلِ عشق کے
کبھی رہنما کی خبر نہیں کبھی رہنما کی تلاش ہے

وہ بارگاہِ حسن وہ عجز و نیازِ عشق
دیکھا تھا ایک خواب جو اب تک نظر میں ہے

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھکا تھا کسی نے اپنا دامن

سینہ مجروح ہے اے چارہ گر پیکاں نہ کھینچ
ناشناس رازیہ ٹکڑا تو میرے دل کا ہے

ہم کو ہنگام قتل آج خدا یاد آیا
دل سمجھتا تھا کہ ہے دشمنِ ایماں کوئی

صدائے شکست :- (نظیر صدیقی)

(۱)

یارب میرے دل کا ماجرا بھی سن لے — فرصت ہو تجھے تو یہ صدا بھی سُن لے
ساغر کی کھنک سے حال محفل تو سُنا — ٹوٹے ہوئے ساز کا گلا بھی سُن لے

(۲)

سُن لے یہ نوائے بینوا بھی سُن لے — ذروں سے جدائی کا گلا بھی سُن لے
ساغر کو زمیں پر پٹکنے والے — توڑا تو شکست کی صدا بھی سُن لے

(۳)

مضراب سے تیری حالت ساز سُنی — شیشے سے صدائے سنگ انداز سُنی
ٹوٹا جو اچانک مرا ساغر کل رات، — میں نے ترے قہقہے کی آواز سُنی

(۴)

سینے سے کلیجے کو نکالا تو نے — دیکھا میرے صبر کا تماشا تو نے
قصاب کی روح جس ترازو میں تُلے — شاعر کا بھی دل اسی میں تولا تو نے

(۵)

تو بن کے بشر کبھی جو اُترا ہوتا — انسان کی مصیبتوں کو سمجھا ہوتا
بچے کی نگاہ جس کا گہوارہ ہو — اس درد کو باپ بن کے دیکھا ہوتا

(۶)

بچہ ترا نزع میں سسکتا ہوتا، — کچھ تجھ سے بلک بلک کے مانگا ہوتا
اس وقت غرور کبریائی تیرا — تخلیق کی لعنتوں کو سمجھا ہوتا

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازران کمپنی

خاص حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ سال رواں کے حج کے لئے اپنے ایک اور جہاز کی روانگی کا اعلان کرتی ہے

جہاز کا کرایہ (مع خوراک) بمبئی / جدہ واپسی

درجہ اول .... ۵۱/۱۱ روپئے

عرشہ (ڈیک) .... ۴۱۵/- روپئے

ان کرایوں میں محصولات جدہ اور کشتی کا کرایہ جن کی مجموعی رقم (۸۰) روپے (۱۲) آنے ہوتی ہے، شامل نہیں۔
عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک بمبئی نہ آئیں۔ جب تک کمپنی انھیں آنے کے لئے نہ لکھے۔

اہم اطلاع

عازمین حج کے پاس "انٹرنیشنل فارم" پر ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے لگوانے کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے۔ ہیضے کے سرٹیفکٹ میں یہ درج ہونا ضروری ہے کہ عازم حج نے سات روز کے وقفہ سے دو انجکشن لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بمبئی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے، اسی طرح چیچک کے سرٹیفکٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل چیچک کا ٹیکہ لگوا لیا گیا ہے۔ یہ سرٹیفکٹ مقررہ "انٹرنیشنل فارموں" پر مقامی میونسپلٹی کے حفظان صحت کے حکام سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں
ہیضے کے سرٹیفکٹ ۶ ماہ تک اور چیچک کے سرٹیفکٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں
عازمین حج کو چاہئے کہ وہ ابھی سے ہیضے اور چیچک کے سرٹیفکٹ طیار رکھیں

نشستیں محفوظ کرائیے

جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جارہی ہیں۔ عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام ہمارے یہاں درج کرالیں تاکہ بعد میں سعادت حج سے محروم نہ ہونا پڑے، درخواست میں مندرجۂ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے:-
(۱) ہر ایک عازم حج کا پورا نام - (۲) والد یا شوہر کا نام - (۳) عمر - (۴) درخواست بھیجنے والے کا پورا پتہ خوشخط (۵) کس درجہ کا ٹکٹ چاہئے - (۶) کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کا نام وغیرہ درج کرانا بھی نہایت ضروری ہے خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں۔ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جن کے نام ہمارے ہاں درج ہوں گے ان کو ٹکٹ پہلے دئے جائیں گے۔

نشستیں محفوظ کرانے کے لئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ
مینیجنگ ایجنٹس:-
دی مغل لائن لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ فورٹ بمبئی

تار کا پتہ:- "MOGUL" BOMBAY,

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

ادب نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے. قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخییل اس کی نزاکتِ بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے. یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے. اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مادئین کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں. یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے:۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سمِ قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے: ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصولِ نقد فنونِ ادبیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

Regd. No. [illegible]

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن استقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد ولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے جو ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً بیس افسانے بہترین اہل قلم کے نتائج کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی مشہور عالم کتاب "اسلام کے مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی و سیاسی حالت اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ

جولائی ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے "۵۵ سال کے بعد" یہ کتاب نفسیات کی بہت مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتاتی ہے کہ زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر رنج و الم آپ کیلئے [illegible] (۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ راحت (۳) آپ کی [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

[illegible]

سالنامہ ۱۹۳۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)
چھ روپیہ بغیر سالنامہ

مومن نمبر دوسرا اڈیشن شایع ہوگیا
دو روپیہ علاوہ محصول

ایک غلطی کا ازالہ

ستمبر کے نگار میں ایک مقالہ "اُردو ہندی نزاع" کے عنوان سے شایع ہوا ہے اور مقالہ نگار کے نام کی جگہ غلطی سے م ـ ج درج ہوگیا ہے ـ اس مقالہ کے مصنف شہباز حسین صاحب ہیں۔ خریداران نگار بازراہ کرم اس کی تصحیح کرلیں ـ منیجر نگار

نگار (دہلی)

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

- 4 OCT 1951

اس دائرے میں سرخ نشان یا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا۔

جلد ۶۰ | فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۵۱ء | شمارہ ۴

خریداران نگار کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

۱ ـ نگار کا سالانہ چندہ معہ سالنامہ کے (جس میں جنوری، فروری کے پرچے شامل ہوں گے) آٹھ روپیہ کردیا گیا ہے ـ لیکن جو حضرات سالنامہ لینا نہ چاہیں گے اور سال میں صرف دس پرچوں پر قناعت کریں گے ان کے لئے چندہ بدستور وہی چھ روپیہ رہے گا

۲ ـ اگر آپ سالنامہ لینا نہیں چاہتے تو ازراہ کرم جلد از جلد مطلع فرمایئے، کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے سالنامہ کی کاپیاں زائد نہیں چھاپی جائیں گی

۳ ـ اگر آپ نے اطلاع نہیں دی تو سمجھا جائے گا کہ آپ سالنامہ لینا چاہتے ہیں اور وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہوتا ہے ـــ ورنہ دو روپیہ چھ آنے کا وی پی جائے گا

۴ ـ جو حضرات سالنامہ لینا پسند نہ فرمائیں گے اور اس کی اطلاع ہم کو دیدیں گے ان کی خدمت میں دسمبر ۱۹۵۱ء کے پرچے کے بعد مارچ ۱۹۵۲ء کا "نگار" بھیجا جائے گا

۵ ـ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دس مہینے کے سال کا چندہ چھ روپیہ ہے اور پورے بارہ مہینے کے سال کا چندہ آٹھ روپیہ ہے

۶ ـ آیندہ سالنامہ ۱۹۵۲ء حسرت نمبر ہوگا

۷ ـ پاکستان کے خریدار تمام رقوم ذیل کے کسی پتہ پر ارسال فرمائیں:-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ـ ۲۲۲ ـ پیر الٰہی بخش کالونی ـ کراچی ـ اور ملک محمد دین اینڈ سنز، پبلشرز، کشمیری بازار/ نگل روڈ ـ لاہور

ملاحظات

کانگرس دوراہے پر

الکشن کا زمانہ جس قدر قریب آتا جاتا ہے، انتخاب کی سرگرمیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں متعدد سیاسی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کانگرس، دوسری کسان پرجا پارٹی، تیسری ہندو مہاسبھا، چوتھی سوشلسٹ، راشٹریا سنگھ کا ذکر میں اس لئے نہیں کرتا کہ وہ دراصل ہندو مہاسبھا ہی کا Trade name ہے۔ صرف لیبل بدلا ہوا ہے ورنہ چیز وہی ہے ـــ کمیونسٹ جماعت بھی چنداں قابلِ لحاظ نہیں، کیونکہ ابھی اس کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ انتخاب کے مقابلہ میں سامنے آسکے اور اگر کسی کمیونسٹ نے یہ ہمت کی بھی تو اسے سوشلسٹ جماعت کی حمایت حاصل کرنا ہوگی

ہندو مہاسبھا ـــ ایک قدامت پرست مذہبی جماعت ہے جو ہندوستان میں صرف ہندو راج، ہندو مذہب اور قدیم ہندو کلچر دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ پاکستان کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتی اور تقسیم ہند کی غلطی کا ازالہ وہ اس طرح چاہتی ہے کہ پاکستان کو فتح کرکے پھر بھارت میں شامل کرلیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ ہندوستان کی ۴ کروڑ مسلم آبادی یا تو ہندو مذہب اختیار کرے (حالانکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ صرف ایک سوشل تنظیم ہے) یا یہاں سے باہر نکل جائے

یہ وہ جماعت ہے جس کے اکثر افراد ہمیشہ کانگرس کے دشمن اور حکومت برطانیہ کے دوست رہے ہیں انھوں نے اس سے قبل ملک کی آزادی کے لئے ایک پھانس کی خلش بھی کبھی گوارا نہیں کی اور ہمیشہ سرمایہ داری کا ساتھ دیا۔ اس لئے حیرت ہونا چاہئے کہ وہ جماعت جو اپنی قوتِ عمل یا فکر و مطالعہ کے لحاظ سے اتنی قدامت پرست، اس قدر رجعت پسند اور اس درجہ بے عمل رہی ہو، اس میں آج یہ جرأت کیوں پیدا ہوگئی کہ وہ کانگرس حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہے، پاکستان کو بھی فتح کرلینے کا ارادہ رکھتی ہے اور ۴ کروڑ مسلمانوں کو سرزمین ہند سے نکال کر یہاں خالص ہندو راج قایم کرنے پر بھی مصر ہے

اس میں شک نہیں ہندو مہاسبھا کی یہ ذہنیت ردّ عمل ہے برطانیہ کی اس منافقانہ حکمت عملی کا جو اس نے ہندوستان میں اختیار کی تھی اور جس کا تنہا مقصود ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دینا تھا، ہر چند یہ ذہنیت انگریزی راج ہی کے زمانہ میں کافی پختہ ہو چلی تھی، لیکن حکومت کے خوف سے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا جاسکتا تھا

جب ہندوستان آزاد ہوا، ملک دو حصّوں میں بٹ گیا اور انگریز یہاں سے چلا گیا تو یہ سالہا سال کی دبی ہوئی چنگاری دفعتاً بھڑک اُٹھی اور ہندوؤں کا جذبۂ انتقام مسلمانوں کے خلاف مختلف صورتوں سے رونما ہونے لگا

کانگرس یقیناً خالص سیاسی جماعت تھی اور مذہب سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اس کی یہ خصوصیت بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی اس کا ایک سبب تو وہی تھا جو ابھی عرض کیا گیا اور دوسرا یہ کہ کانگرس کے قیام کا جو مقصود تھا وہ ان کے نزدیک پورا ہوچکا تھا اور اب کسی مدعا کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کے لئے انھیں آسان ترین طریقہ یہی نظر آیا کہ ہندوستان کو خالص مذہبی حکومت میں تبدیل کردیا جائے

وہ تو کہئے کہ مہاتما گاندھی کے بعد نئی قومی حکومت کی باگ جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی، اور بین الاقوامی ساکھ پیدا کرنے کے لئے حکومت کا دستور لا مذہبی اُصول پر مرتب ہوا، ورنہ جس خطرہ سے اس وقت ملک دوچار ہے وہ پہلے ہی سامنے آجاتا

اس دوران میں ایک عام شکایت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ کانگرس اپنے اُصول سے ہٹ گئی ہے اور اس کے ارکان میں خود غرضی، نفس پرستی، مادی طمع اور بد دیانتی بہت پیدا ہوگئی ہے پھر چونکہ حکومت کانگرس پارٹی کی ہے اس لئے یہ الزام گویا براہ راست حکومت پر عاید ہوتا ہے اور وہی اس شکایت کے ازالہ کی ذمہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت نظم و نسق کی اس خرابی کو نظر انداز نہیں کرسکتی تھی اور وہ اول دن سے اس گتھی کے سلجھانے کی فکر میں ہے کہ حکومت پر کانگرس کا اقتدار قایم رکھتے ہوئے کیونکر ان خرابیوں کو دور کیا جاسکتا ہے اور ہر سال کانگرس کے اجلاس میں یہی سوال پیش ہوتا

اور چند بے معنی تجویزوں کے سوا کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ سال گزشتہ جب کرپلانی جی اور ٹنڈن جی کا مقابلہ تھا تو نہرو، کرپلانی جی کی موافقت میں تھے کیونکہ کرپلانی جی بہر حال ٹنڈن جی کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ آزاد خیال ہیں اور اس طرح یہ مقابلہ گویا رجعت پسند اور اصلاح پسند دو قوتوں کا مقابلہ تھا لیکن بدقسمتی سے رجعت پسند جماعت کو کامیابی ہوئی اور ٹنڈن جی کی صدارت نے اس گتھی میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ ٹنڈن جی گو ہمیشہ سے کانگریس کے آدمی رہے ہیں لیکن ان کی ذہنیت مہاسبھائی ہے اور گو انھوں نے اپنے دوران صدارت میں کوئی بات ایسی نہیں کی کہ حکومت سے کھلا ہوا تصادم ہو جاتا، پھر بھی ان کی صدارت کا جو عام اثر کانگریس پر پڑ رہا تھا وہ مہاسبھائی نوعیت کا تھا، اور جواہر لال نہرو ہائی کمانڈ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کا بوجھ اپنے ضمیر پر بری طرح محسوس کرنے لگے تھے

اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جواہر لال کے بعض ساتھی ان سے اور کانگریس سے جدا ہو کر اپنا محاذ علیحدہ قایم کرنے لگے اور کانگریس کا مستقبل زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔ جواہر لال کو چونکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اکثر ارکان سے جنھیں ٹنڈن جی نے منتخب کیا تھا اول ہی دن سے اختلاف تھا اور حالات زیادہ نازک ہوتے جا رہے تھے اس لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں تغیر و تبدل کا مطالبہ کریں اور بہ صورت عدم تبدیلی خود ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے استعفا دیدیں

جواہر لال نہرو کا یہ طرز عمل گویا ایک چیلنج تھا ٹنڈن جی کی پالیسی کے خلاف جس کے جواب میں ٹنڈن جی نے اس کو تو منظور نہیں کیا کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی ورکنگ کمیٹی میں کوئی تبدیلی کریں لیکن انھوں نے خود صدارت سے استعفا دیدیا

ٹنڈن جی کے اس طرز عمل کو بعض لوگ ان کے ایثار سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے کانگریس کی صدارت نہ چھوڑی تو جواہر لال ورکنگ کمیٹی سے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس واقعہ کا کانگریس کے اقتدار پر اتنا خراب اثر پڑے گا کہ آیندہ انتخاب میں مشکل ہی سے وہ یا کانگریس کا کوئی ممبر کامیاب ہو سکے گا

اس کو کانگریس کا ہر ہر فرد اچھی طرح جانتا ہے کہ جس حد تک عوام کا تعلق ہے وہ کانگریس اور جواہر لال نہرو میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور کانگریس کی جو کچھ ساکھ باقی ہے وہ صرف نہرو کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس لئے آیندہ انتخاب میں کانگریس کے کسی ممبر کا کامیاب ہو جانا اس حال میں کہ نہرو کی دلچسپی کانگریس سے ختم ہو چکی ہو ان کے نزدیک بھی ممکن نہ تھا۔ اور اسی لئے کانگریسیوں نے ٹنڈن جی کے استعفے اور ورکنگ کمیٹی کی نئی تعمیر و تشکیل کے تلخ گھونٹ کو برداشت کر لیا

نہرو کے صدر کانگریس ہونے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا وہ لوگ جو کانگریس کو چھوڑ چکے ہیں، پھر کانگریس میں شامل ہوں گے یا نہیں اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے رفیع احمد قدوائی اور کرپلانی کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھیں، چنانچہ حالات بتاتے ہیں کہ قدوائی تو غالباً جلد واپس آجائیں گے اور کرپلانی بھی غور و تامل کے بعد یہی راہ اختیار کریں گے، کیونکہ نہرو کے صدر کانگریس ہو جانے کے بعد پرجا پارٹی کی اہمیت تقریباً ختم ہو چکی ہے اور کرپلانی جی کو اپنے بمبئی کے دورہ میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پرجا پارٹی کو پبلک کی ہمدردی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ اب وہ کوئی نئی چیز ایسی پیش نہیں کر سکتی جو کانگریس کے مقاصد سے مختلف ہو۔ اور اس لئے وہ لوگ جن سے ہمدردی و اعانت کی توقع کی جاتی تھی وہ اگر کانگریس کی طرف نہ گئے تو سوشلسٹ جماعت میں شامل ہو جائیں گے

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نہرو کی صدارتِ کانگریس اور رفیع احمد قدوائی یا دوسرے منحرف ہو جانے والے ارکان کی واپسی سے یہ گتھی ہمیشہ کے لئے سلجھ جائے گی اور کانگریس حکومتوں کی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ہمیں اس میں شبہ ہے

اس سلسلہ میں رفیع احمد قدوائی کا یہ بیان بہت معنی خیز ہے کہ جب تک کانگریس حکومت کے ارکان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہو اور عملی حیثیت سے ان خرابیوں کا ازالہ نہ کیا جائے جنھوں نے کانگریس کو بدنام کر دیا ہے، محض صدارت کی تبدیلی یا ورکنگ کمیٹی کی جدید تشکیل مفید نہیں ہو سکتی

قدوائی صاحب کا یہ بیان کھلا ہوا اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ خرابیوں کا اصل تعلق صوبائی حکومتوں سے ہے اور جب تک ان میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جس کا ذکر نہرو جی نے بھی اپنی ۱۷ ستمبر کی تقریر میں کیا ہے۔ انھوں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ کانگریس پارٹی بازی کا شکار ہو گئی ہے اور ہماری طاقتیں غلط راستے پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ہمیں پارٹی بازی کی لعنت کو ختم کرنا ہوگا،

اسی کے ساتھ دوسری خرابیوں کو بھی جو کانگرس کو کمزور کر رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام کانگرس کمیٹیاں از سر نو اپنی تنظیم کریں تاکہ پارٹی بازی اور ہوشی پیدا ہی، ہو جائے۔ جو لوگ انصاف سے کام نہیں کر سکتے انھیں ذمہ دار عہدوں سے ہٹا دینا چاہئے اور آیندہ انتخاب میں صرف انھیں امیدواروں کو نامزد کرنا چاہئے جن کے متعلق یقین ہے کہ وہ پوری دیانت و امانت کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیں گے اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیتوں کے نمایندوں جو کانگرس اصول کے حامی ہیں انتخاب کے لئے نامزد کیا جائے

ہمارے وزیر اعظم نے وہ سب کچھ کہدیا ہے جو موجودہ حالات میں کانگرس کی اصلاح کے لئے کہنا چاہئے تھا لیکن ان کو کچھ اور تفصیل میں جا کر یہ بھی بات صاف کہدینا چاہئے تھا کہ کانگرس کمیٹیاں ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہیں جو صرف جیل جانے کی سند اپنے پاس رکھتے ہیں اور کوئی تنظیمی اہلیت یا اخلاقی بلندی نہیں رکھتے خصوصیت کے ساتھ ملازمتوں میں تو کانگرسی و غیر کانگرسی کو بھی نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ صرف کام کی اہلیت، کیرکٹر کی مضبوطی، انتظامی قابلیت، بے ریا بندازی کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ پچھلے چار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ وہی لوگ ناکارہ ثابت ہوئے جن پر محض کانگرسی ہونے کی وجہ سے اور صرف اس استحقاق پر کہ وہ ایک یا دو مرتبہ جیل جا چکے ہیں، بھروسہ کیا گیا تھا

یہ وقت جواہر لال نہرو کے لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا ہے اور ان کی ذراسی غلطی بارعایت سخت تباہ کن ثابت ہوگی۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے (اور ان سے زیادہ کون اس حقیقت کو جان سکتا ہے) کہ ٹنڈن جی کا استعفا اور ٹنڈن جی کے ساتھیوں کا خاموشی کے ساتھ ان کی صدارت کانگرس کو قبول کر لینا اس لئے نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنی رجعت پسندی کو ترک کر چکے ہیں یا صداقت کے ساتھ کانگرس کی تنظیم و اصلاح چاہتے ہیں بلکہ انکا مقصود صرف یہ ہے کہ وہ جواہر لال نہرو کی وساطت سے انتخاب میں کامیابی حاصل کر سکیں (جو بصورت دیگر ممکن نہیں)۔ اور جب وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر زیادہ قوت کے ساتھ مخالفت کریں

الغرض جواہر لال نہرو کو اس وقت ان برادران یوسف سے ہوشیار رہنے کی سخت ضرورت ہے اور انھیں چاہئے کہ سب سے پہلے وہ صوبوں کی کانگرس کمیٹیوں کو گندہ عناصر سے پاک کرائیں اور پھر اس بات کی کوشش کریں کہ کانگرس ٹکٹ پر وہی شخص انتخاب کے لئے کھڑا ہو جس کا کیرکٹر بیداغ ہے۔ ہم یہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں جو نہرو کے سامنے نہ ہو، لیکن ہم کو جس بات سے ڈر لگتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ نہایت سچے جذباتی قسم کے انسان ہیں اور ایسا انسان ہمیشہ ظاہری تملق اور تعلقات دیرینہ کے خیال سے متاثر ہو جایا کرتا ہے

پچھلے چار سال کے تجربہ نے جواہر لال نہرو کو اچھی طرح بتا دیا ہوگا کہ ملک کا دوست کون ہے اور دشمن کون، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس وقت کتنے سانپ تھے جو انھوں نے اپنی آستین میں پال رکھے تھے، اس لئے آیندہ انتخاب ان کے لئے آخری موقعہ ہے کہ وہ اپنے ان تجربات سے فایدہ اٹھائیں اور صحیح معنے میں ہندوستان کو ایک لامذہبی جمہوریت بننے کا موقعہ دیں۔

اس وقت جواہر لال نہرو کے مخالفین میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت مسٹر آجی کی ہے، جو نہرو کو ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے لوگوں کو نہرو کی ڈکٹیٹر شپ کا یقین دلا رہے ہیں۔ مسٹر آجی دراصل راشٹریا سیوک سنگھ کے عملی مجاہدین میں سے ہیں، اسلئے ان کا یہ طرز عمل خلاف توقع نہیں، لیکن خطرناک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خالص کانگرسی کہتے ہیں اور کانگرسی ہونے ہی کی حیثیت سے وہ نہرو اور نہرو حکومت پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے لوگ ان کے ظاہر و باطن میں تمیز نہ کر کے دھوکہ میں آجائیں۔ ایک بہت بڑی کمیٹی مشرقی پنجاب کی بھی ہے، جہاں زبردست اکثریت سچار گوا پارٹی کی ہے۔ اگر اس کو کانگرس ٹکٹ پر مقابلہ کرنے کا موقعہ مل گیا تو نتیجہ وہی ہوگا جو اس سے قبل ظاہر ہو چکا ہے اور اگر کانگرس کے خلاف ہو کر اس نے الکشن میں حصہ لیا تو کانگرس کو کامیابی کی وہاں بہت کم امید ہے۔ بہر حال نہرو اس وقت ایک بڑی کٹھن منزل سے گزر رہے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس منزل سے کامیاب گزرنے میں ہر حیثیت سے ان کا ساتھ دیں۔

ایک غلطی کی تصحیح

ستمبر کے نگار میں "صدائے شکست" کے عنوان سے جو نظم شایع ہوئی ہے وہ علامہ جمیل مظہری کی ہے، غلطی سے نظیر صدیقی کا نام درج ہو گیا۔ — مینجر نگار

وسط ایشیا کی کلچری ترقی

وسط ایشیا کا علاقہ پہلے توران کہلاتا تھا، پھر روسی ترکستان کہلایا اور آج اس کا نام سوویٹ مشرق ہے - یہ علاقہ افغانستان و ایران کے شمال میں چینی ترکستان سے لیکر بحر قزوین (کاسپیان) تک پھیلا ہوا ہے اور کازکستان، ترکمنیا، تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان کی پانچ آزاد و خود مختار جمہوریتوں پر مشتمل ہے جو سوویٹ وفاق میں شامل ہیں

چودھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور علم و فن کا تنہا مرکز تھا۔ فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی ایک تاجیک تھا فردوسی بھی تاجیک نژاد تھا، بوعلی سینا بخارا میں پیدا ہوا، مشہور عالم البیرونی خیوا کا باشندہ تھا۔ اسلامی تاریخ نے جو تین مدبرین سلطنت پیدا کئے ان میں جعفر برمکی اور نظام الملک طوسی کے علاوہ تیسرا ملا علی شیر نوائی بھی ازبک تھا اور خراسانی کی تیموری حکومت میں سلطان حسین کا وزیر مشیر تھا۔ خوارزم کی سلجوقی حکومت اسی علاقہ میں سرسبز ہوئی اور نظام الملک کا جوہر کمال بھی اسی سرزمین پر چمکا

خانوادۂ تیمور کے سائنسداں شہزادے رفیع بیگ نے سمرقند کی رصدگاہ میں بیٹھ کر فلکیات کے جو اصول وضع کئے وہ بیسویں صدی کے ماہرین ہیئت کے لئے بھی وجہ حیرت بنے ہوئے ہیں، الغ بیگ نے اپنی رصدگاہ کی جو عمارت بنوائی تھی، اُس وقت کی دنیا میں اس عمارت کا ثانی قسطنطنیہ کی تعمیر ایا صوفیا کے علاوہ دوسری عمارت نہ تھی

حافظ و خیام اور سعدی جتنے ایرانی تھے اتنے ہی تورانی بھی تھے۔ بلبل شیراز کو اپنے محبوب کے "خال ہندو" کے سامنے جب تحفہ پیش کرنا تھا تو اس کی نگہ انتخاب پر ایران کے اصفہان و شیراز نہیں چڑھے بلکہ توران کے سمرقند و بخارا ہی اس قابل نظر آئے۔ وسط ایشیا کی عظمت اور اس کے قدیم کلچر پر حافظ کا یہ شعر دلیل ہے

بلاشبہ اس زمانہ میں وسط ایشیا کی یہ مسلم قومیں تہذیب و تمدن کا مرکز تھیں اور دُنیا کو علم و فن کی روشنی پہونچا رہی تھیں، کون نہیں جانتا کہ تیموری و سلجوقی دربار علمی و کلچری ترقیوں کے لحاظ سے مشعل ہدایت تھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ خوارزم و خراسان اور سمرقند و بخارا ساری دنیا میں عروس البلاد کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے

امتداد وقت نے اس پورے علاقے کو زار روس کی نوآبادی بنا دیا، سارا ملک امیروں اور خانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا، اور یہ حکومتیں زار شاہی زمانہ میں رجواڑے بن کر رہ گئیں۔ باہر کی دنیا میں امیر بخارا اور خان خیوا کی ریاستوں کو تو لوگوں نے جانا، باقیوں کو تو کسی نے پہچانا تک نہیں

ساہوکاری نظام کی بدولت اور قومی حکمرانوں کی رجعت پرستی کے طفیل اس علاقہ کی یہ مختلف قومیں اقتصادی بدحالی کے گڑھے میں گر گئیں اور صدیوں تک کلچری تنزل میں مبتلا رہیں۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے وقت یہ تمام قومیں فلاکت و جہالت کے پاتال میں پہونچ چکی تھیں، جسم و جان میں علاقہ قائم رکھنا اتنا دشوار ہو گیا تھا کہ یہاں کے لوگ کسی دوسری طرف دھیان دے ہی نہ سکتے تھے۔ انقلاب کے وقت ان مختلف علاقوں کا تعلیمی اوسط ڈھائی فی صدی سے زیادہ نہ تھا۔ اس اوسط میں سے اگر امراء و عمال حکومت اور ملاؤں کو نکال دیجئے تو عوام سو فیصدی جاہل تھے

اقتصادی بدحالی، سیاسی بے بسی اور قومی حکومت کی فرض ناشناسی اس ایک مثال سے روشن ہو جاتی ہے کہ امیر عظیم اللہ خاں نے اپنے چھ سال کی حکمرانی میں اوسطاً ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی میں سے ایک مسجد، ایک مدرسہ، اور ایک پل بنوا کر ہمیشہ فخر جتایا کیا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ

قت کی بنا پر پانی دولت میں بدل گیا تھا جس پر تونگروں اور زمینداروں کا قبضہ تھا، اسی طرح جس طرح وہ زمینوں کے مالک بن گئے تھے۔ دولت مند لوگ پانی کے ذخیرے بیٹیوں کے جہیز میں دیئے لگے تھے

وسط ایشیا میں آج جو کلچری عمل یا ترقی ہو رہی ہے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زار شاہی زمانہ کی تاریخ بھی نظر میں ہو۔ روس کی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں ایک ریزولیوشن پاس کیا تھا جس سے ماضی قریب میں وسط ایشیا کی اقتصادی بد حالی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ریزولیوشن یہ تھا:- "زار شاہی میں روس کے دور افتادہ علاقے، خاص کر ترکستان، نو آبادی کی حیثیت رکھتے تھے، اور اس لئے زندہ باقی رکھے جاتے تھے کہ وہاں سے روسی کارخانوں کے لئے خام پیداوار جبراً حاصل کی جائے"

"ان پست ملکوں کی آبادی کے ترقی نہ کر سکنے کی اصل وجہ یہ پالیسی تھی؟ اور یہی سبب ہے کہ ان علاقوں میں صنعتی طبقہ پیدا نہ ہو سکا......"

اس ریزولیوشن کے ان تھوڑے سے لفظوں میں وسط ایشیا کے عوام کی حالت کا پورا مرقع نظر آجاتا ہے۔ روسی ترکستان کے مسلم عوام کو تعلیم و تعلم کی بس اتنی اجازت تھی کہ وہ عیسائی مشنریوں کے رسالے پڑھ سکیں، پادریوں کے وعظ سن لیں اور روسی قومیت کا پروپگنڈا قبول کر لیں، لیکن سوویٹ یونین قایم ہونے پر چالیس ایسی قومیں منظر عام پر آگئیں جن کی کوئی تحریری زبان نہ تھی، یعنی جو الفاظ بول لیتے تھے مگر لکھنے کے لئے حروف تہجی نہ رکھتے تھے

تہذیب و تمدن کے بام ترقی پر پہونچنے کے بعد ذلت و ادبار کے ایسے گڑھے میں گر جانے کی جو مثال وسط ایشیا پیش کرتا ہے، شاید دُنیا کا کوئی حصہ پیش نہیں کر سکتا

مگر اسی کے ساتھ ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ بھی تھی کہ وسط ایشیا کے یہ عوام ہر چند علم و ہنر سے محروم کر دئے گئے تھے لیکن انھوں نے (اور شاید غیر شعوری طور پر) اپنی پرانی کلچری روایات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ کلاسکی فارسی شاعری کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی حد تک ان لوگوں کی زندگی میں دخیل رہی اور چونکہ وسطی مشرق کا قدیم کلچر ایران و توران کے علاوہ افغانستان و قفقاز وغیرہ میں بھی مشترک تھا اس لئے یہ شہادت ملتی ہے کہ نظامی گنجوی کے کردار ترکمانیہ کے لوک گیتوں اور کہانیوں میں آج بھی زندہ ہیں

لوک گیت

پرانے کلچر کو یاد رکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان قوموں میں بے پڑھے لکھے شاعر پیدا ہوتے رہے (ہندوستان میں ایسے شاعروں کی مثال بھاٹ ہیں)۔ یہ بے پڑھے لکھے شاعر بالعموم بدیہہ گو ہوتے تھے، اور ان کی شاعری بھی بے لکھی رہتی تھی۔ ان کے کلام کی اشاعت کا طریقہ یہ تھا کہ وہ دیہاتوں میں گھومتے اور داستانیں سناتے پھرتے تھے۔ یہی ان کی معاش کا ذریعہ بھی تھا۔ ایسے شاعروں کا موضوع کلام قومی روایات تھیں اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں قومی کردار اور ان کی سورماؤں کے کارناموں کو نئی زندگی مل جاتی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی شاعری بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی اور اس ادارے کی اہمیت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ زار کی نو آبادیاتی پالیسی کا مقصد ان قوموں کو متحد نہ ہونے دینا اور آپس میں برسر عناد رکھنا تھا۔ یہ پالیسی سامراج کا چلتا ہوا داؤں ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ کامیابی کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے

زار کے ان علاقوں میں تعلیمی پالیسی کا منشاء یہ تھا کہ قومی اور مقامی زبانوں میں تعلیم نہیں دیجاتی تھی اور جہاں اور جتنی بھی تعلیم دیجاتی تھی وہ صرف روسی زبان میں دیجاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان قوموں کے مابین کلچری رشتہ قایم رہا اور ایک قوم کا ادب و کلچر (لوک گیت) دوسری قوم کو متاثر کرتے رہے۔ تاتار کی شاعری نے ترکمانیہ کے لوگوں پر اثر ڈالا، تاجیک ادب ترکمانیہ اور ازبکستان کو متاثر کرتا رہا، اور فارسی کی ہمزبانی کی وجہ سے تمام ترکستانی قوموں کا ادب ماورائے قفقاز بھی دخیل رہا اور اس طرح جو کلچری اثر ایک قوم سے دوسری قوم میں پہونچا تو ان میں جا بجا خیالات و تصورات کے اندر سے دوسرے خیال اور تصور پیدا ہوتے رہے، جو قصے کہانیاں کسی علاقے میں پہونچتیں تو ان سے نئی حکایتیں اور قصے وضع ہو جاتے تھے۔ یہ کہانیاں بالعموم شباہت و مقصد کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ شکل و صورت میں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوتی تھیں۔ مثلاً ملا نصیرالدین کا کردار قفقاز کے ترکی بولنے والے علاقہ میں پیدا ہوا مگر ازبکستان میں افاردی (یا افرمدی) بن گیا، ترکمانیہ میں الدر کوش اور کرغیزیا کے تاتاروں میں افندی شیخ ہو گئے

کہلایا (دوس خاص کے ادب میں بھی حاجی نصیر الدین کے کردار نے کئی ادب پارے پیدا کرادئے) اور قبل انقلاب کا روسی ادب بھی ان مختلف محکوم قوموں کے ادبی اثرات سے دامن نہ بچا سکا تھا۔ چنانچہ ٹالسٹائی کے فسانوں میں کاتالک اور حاجی مراد مشہور کردار ہیں)

ترکمانیہ کے کلاسکی ادب کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں، لیکن اس کا بے لکھا ادب (لوک گیت اور ساکھے) اتنا ہی پرانا ہے جتنا ازبکستان کا معیاری ادب ہے۔ سوویٹ حکومت قایم ہونے کے وقت ترکمانیہ کے کلاسکی شاعر مخدوم قلی کی رزمیہ داستانیں ترکمان قوم کے دلوں میں وطنیت اور جانبازی کے جذبہ کو اُبھار رہی تھیں اور ایک ایک ترکمان اس جذبہ سے معمور تھا۔ مخدوم قلی کے بعد اس کا بھانجا جلیلی مقبول اور محبوب عوام ہوکر اپنی قوم کا " لاڈلا مطرب" بنا۔ وردی قلیچ نہایت ہی مقبول شاعر ہے۔ یہ پیدائشی اندھا ہے یہ ایک بے (زمیندار) کے کھیت پر مزدوری کرتا تھا وردی کو بچپن ہی سے گانا سننے کا شوق اور حافظہ بلا کا تھا۔ جو گیت سنا یاد ہوگیا۔ اس طرح وہ خود بھی گانے لگا۔ " گاتے گاتے کلاونت ہو جاتا ہے" ہماری زبان میں ایک کہاوت ہے جو وردی پر پوری طرح پکی اُترتی ہے۔ پھر وہ گیت جوڑنے لگا اور اپنی جوانی ہی میں قوم کا محبوب شاعر بن گیا

وردی کی عوامی شاعری میں وسط ایشیا کے فن وصناعت کی تمام روایات محفوظ اور زندہ ہیں۔ لیکن اس نے ایک بدعت بھی کی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ کوئی نظم سنانے لگتا ہے تو پہلے ایک حکایت بیان کرتا ہے، یہ حکایت گویا اس نظم کا دیباچہ ہوتی ہے جس میں اس کی وجہ تسمیہ، شان نزول اور اخلاقی نتیجہ ہوتا ہے

وُردی نے جو زمانہ دیکھا اور جن حالات سے دوچار ہوا وہ ایسے سنگین وجانکاہ واقعات تھے جن کے سامنے بڑے بڑے مرد بھی قایم نہ رہ سکتے تھے، مگر وُردی کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی۔ اس نے دیہات کے افلاس اور جہالت کے اندھیرے میں آنکھیں کھولیں، شداید ومصائب برداشت کئے مگر اس کے مزاج وفطرت پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وُردی نے ان حالات کو ستم ظریفی سمجھا اور اسی طرح برتا بھی۔ اس کی عمر بھر کی شاعری میں کسی ایک موقع پر بھی شکست کا احساس یا ناامیدی کا اظہار نہیں ملتا۔ وہ حقیقتاً رجائی مسلک کا آدمی ہے۔ شاعر سلیمان وفراغ کی طرح اس کے کلام کی خصوصیت بھی طنز ومزاح ہے

انیسویں صدی میں ازبکستان میں بھی ترکمانیہ کی طرح تین بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ مقیمی، بلعاش اور محمودوف، اور عجیب اتفاق تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں دربار داری اور اس کی قصیدہ خوانی سے متنفر اور باغی رہا۔ درباری شعراء کے برخلاف ان تینوں نے محبان ملک وقوم کے لئے وطن کے گیت گائے یا پھر سامنتی آقاؤں کی ہوس کاریوں اور سفاکیوں کا پردہ چاک کیا

دنیا کے عوام الناس نے تاریخ کے ہر دور میں ظالم اور سفاک حکمرانوں اور آقاؤں سے نفرت کی ہے، ازبکستان کے عوام ان شاعروں کے طنز ومزاح کے اندر ظلم رانوں سے اپنی نفرت پہچان کر ان شعراء سے محبت کرنے لگے تھے۔ خیوا وخوقند کے خان اور امیر اور زار کے گماشتے ان ترقی پسند شاعروں پر جبر وتشدد کرتے تھے مگر کبھی بھی ان کی آواز کو خاموش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے

ازبکستان میں صدرالدین عینی کو لسان القوم الاولون کا مرتبہ حاصل ہے اور وہ ایک نہایت مقتدر ومحترم شاعر وادیب ہے۔ جب انقلاب ہوا تو عینی کی استادی مسلم ہو چکی تھی۔ شروع ہی سے عینی نے ترقی پسندی کو اپنا مسلک بنایا اور رجعتی طاقتوں کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا۔ اپنے عقیدے کی قیمت اس نے سزا وعقوبت اٹھا کر ادا کی اور جس وقت انقلاب شروع ہوا تو عینی آگے کی صف میں نظر آیا

وسط ایشیا میں انقلاب کے اثرات

ایشیا میں سوویٹ قوموں کی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انقلابی دور کے حالات مختصراً بیان کر دئے جائیں۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب کامیاب ہوا تو روسی حکومت نے تمام محکوم قوموں کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس لئے ہر قوم کو اپنے قومی مستبد حکمرانوں کے خلاف بھی بغاوت کرنا پڑی۔ اور جب ان تمام علاقوں میں خان اور امیر معزول وبرطرف کر دئے گئے، جب ان صدیوں سے مقید علاقے پر آزادی کامل کا سورج چمکا تو ترکستان میں اس کی سو فیصدی مسلم آبادی کے اندر نسلی

لے میں نہایت مختصر مضمون جداگانہ شائع ہوگا۔ — ل۔ احمد

اعتبار سے پانچ مختلف قومیں رہتا ہو کر پانچ جمہوریتیں وجود میں آگئیں۔ روس کی وفاقی جمہوریت نے ان نئی جمہوریتوں کی بڑی فراخدلی سے اور مخلصانہ امداد دی اس بے لوث انسانی سلوک کا پہلا اخلاقی نتیجہ یہ نکلا کہ کہاں تو زار شاہی سلوک کی بدولت یہ تمام قومیں روسیوں سے نفرت کرتی تھیں اب وہ ان سے پیار اور محبت کرنے لگیں اور باہمی رواداری اور بھائی چارہ کا رشتہ قایم ہو گیا۔ اسی اخوت اور مساوات کے برتاؤ کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۲ء میں یہ سب اور دوسری قومیں بھی برضا و رغبت سوویٹ وفاق میں شامل ہو گئیں۔ یہ تعلقات آج تک قایم ہیں اور مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا ایک بڑا ثبوت تو دوسری جنگ عظیم میں سوویٹ روس کی بے مثال فتحمندی ہے اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ عین حالتِ جنگ میں سوویٹ حکومت نے اپنی وفاقی جمہوریتوں کو اس بات کا مجاز کر دیا کہ وہ اپنی مخصوص قومی فوجیں بنائیں اور دنیا کی طاقتوں سے براہ راست سیاسی تعلقات قایم کریں۔ لیکن آج تک کسی وفاقی جمہوریت نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی" حالانکہ دوران جنگ میں ہٹلری جرمنی نے انتہائی کوشش کرلی کہ پرانے قوم پرست یوکرینیوں اور بیلو رشین میں کوئی تو ایسا مل جائے جسے ان فتحمند علاقوں میں حکومتوں کا سر دھرا بنایا جا سکے۔ یہی اصلی بھائی چارے کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟

سڈنی اور بیٹرس ویب کی ہستیاں عالم میں مشہور و معروف ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے سوویٹ روس کے کئی سفر کئے اور وہاں کے حالات پر کئی کتابیں لکھیں جو مطالعہ کی حیثیت سے غیر جانبدارانہ سند کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام "اشتراکی تہذیب" ہے۔ یہ دو لفظی جملہ اہم معنی کا حامل ہے، اشتراکی نظام سماجی یا طبقاتی فرق و اختلافات ہی کو نہیں مثلاً بلکہ رنگ و نسل کا امتیاز، آقا و غلام، اشراف و اجلاف، کالے اور گورے کا فرق ختم کرکے ایک نئے تمدن یا کلچر کو جنم دیتا ہے

اشتراکی تعمیر کے لئے لازم تھا کہ سماجی اور نسلی تقسیموں کو ختم کر کے کلچری اونچ نیچ کو بھی باقی نہ رکھا جائے۔ کوئی قوم دوسری قوم سے کلچر یا تہذیب میں بھی پیچھے نہ رہنے پائے۔ سوویٹ آئین میں رنگ و نسل کا فرق کرنا جرم قرار دیا گیا ہے اور قانون پر عمل درآمد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود اسٹالین کی ذات ہے جو ایک چھوٹی سی قوم جارجین کا ایک فرد اور ایشیائی ہونے کے باوجود پچاسوں کالی گوری قوموں کا، عیسائی، یہودی اور مسلم مذہبوں کے ماننے والوں کا محبوب رہبر اعظم بنا ہوا ہے

یہ سوچنا اور اس پر عمل کر کے دکھا دینا کہ پست قومیں ترقی کر کے ترقی یافتہ قوموں کے برابر ہو جائیں، اسٹالین کے دماغ کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ پنج سالہ صنعتی پروگراموں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جو علاقے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں وہاں کے لئے بجٹ میں زیادہ روپیہ رکھا جاتا ہے۔ پست قوموں کو ترقی یافتہ قوموں کے ہمدوش کر دینے کی یہ پالیسی بہت زیادہ حد تک کامیاب ہو چکی ہے

اس ذکر میں نوجوان ازبک ادیب، سلطان ازبک کے ڈرامہ "پرواز شاہین" کا حوالہ بے موقعہ نہ ہوگا۔ FRUNZE ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں روسی کمیونسٹ پارٹی کا نہایت ہر دلعزیز لیڈر تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے سرخ فوج کے ناظم و جرنیل کی حیثیت سے انقلاب کے باغیوں کی سرکوبی کر دی۔ سلطان کے اس ڈرامہ کا ہیرو یہی فرنزے ہے اور مصنف نے ڈرامہ میں وہ واقعات پیش کئے ہیں جو ڈرامہ دیکھنے والوں یا ان کے باپ اور بھائیوں کو پیش آئے تھے اس ڈرامے میں ایک منظر یہ بھی ہے کہ جرنیل فرنزے ایک سپاہی کو جس کا نام عمر ہے افسر بنا دیتا ہے۔ وہ سرخ سپاہی اپنے آپ کو افسری کے قابل نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ "میں ایک بے پڑھا لکھا ازبک ہوں" اس پر جرنیل فرنزے اس سپاہی کو حکایت سناتا ہے کہ شاہین [illegible] شروع میں اڑنے سے ڈرتا ہے اس کی ماں اپنے بچے کو پہاڑ کی بلندی پر سے دھکیل دیتی اور ساتھ ساتھ اڑتی چلی ہے۔ اس طرح روسی قوم اپنے پچھڑے ہوئے بھائیوں کو اڑنا سکھا رہی ہے

سوویٹ نظام کی یہ وہ پالیسی ہے جس نے بہت چھوٹی قوموں میں بھی نہایت اونچے درجے کے شاعر و فنکار پیدا کر دئے۔ LAKTINA [illegible] کی قوم تعداد میں کل [illegible] ہزار ہے۔ سلیمان اسٹالسکی اس قوم کا ایک ایسا شاعر ہے کہ گورکی نے بیسویں صدی کا ہومر کہا ہے اور جس کی نظمیں نہ صرف ساری سوویٹ قوموں میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں بلکہ اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ سلیمان کی نظموں کا ترجمہ [illegible] اور اسے [illegible] روشناس کرتا ہے۔ گورکی نے جب یہ کہا کہ "ادب کی قدر حقدار [illegible] وکمال کی بنا پر ہوتی ہے" تو [illegible] سلیمان کی شاعری تھی

سوویٹ قوموں کے [illegible] بھائی چارے کے ثبوت میں ایک اور شہادت اور دینا چاہتا ہوں۔ [illegible]

کہ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں جرمن فوجیں روس کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہوگئی تھیں۔ بہت سی آبادیاں تباہ و برباد ہوئیں اور ان کے باشندے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے تھے۔ لاکھوں بچے یتیم و خانماں برباد ہوگئے تھے۔ سوویٹ نظام قوم کے بچوں کو سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے۔ یوکرین اور بیلوروس کے ہزاروں سفید عیسائی بچے سوویٹ مشرق کے مسلمانوں کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ ہر گھر میں ایک بچہ کو گود لینا رواج پا جاتا ہے۔ جس دفتر سے بچے تقسیم کئے جاتے ہیں وہاں ایک عورت آتی اور اپنا حصہ مانگتی ہے۔ جواب ملتا ہے کہ بچے سب تقسیم ہوگئے۔ وہ عورت سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے کہ اب وہ اپنے شوہر کو کیا جواب دے گی جو کئی روز سے تقاضا کر رہا تھا کہ وہ جا کر ایک بچہ لے آئے۔ اس کا گھر نکو بنے گا۔ سارے گھروں میں بچے ہوں گے اور ان کا گھر شرمندہ و ذلیل ہوگا۔ عورت کی بدحالی کو دیکھ کر دفتر والے اسے یقین دلاتے ہیں کہ اب جو بچے آئیں تو سب سے پہلے اسے ایک "سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی" دیجائے گی۔ معلوم رہنا چاہئے کہ یہ عورت خود بھی نو بچوں کی ماں تھی

دوران جنگ میں ایک مصنف کا فسانہ شایع ہوکر بے حد مقبول ہوا جس کا عنوان ہی "قومی بھائی چارہ" تھا۔ اس فسانے میں تین ٹینکچیوں کا قصہ ہے جو ایک ہی ٹینک پر مامور تھے۔ یہ تینوں تین مختلف قوموں کے فرد تھے۔ مگر جب ڈیوٹی پر نہ ہوتے تب بھی ہر وقت اور ہر جگہ دیکھے جاتے تھے اور اس بنا پر ان کے ٹینک کا نام ہی "قومی بھائی چارہ" پڑ گیا تھا۔ اس لئے کہ انسانی محبت و رفاقت کی جو مثال ان تینوں کے عمل سے ملتی تھی وہی سوویٹ "قومی پالیسی" تھی

ان دو ایک مثالوں سے اس پالیسی کی اہمیت کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے

تعلیمی و کلچری ترقی

زار شاہی عہد میں یورپی روس کا علاقہ اور اس کی شہری آبادی تعلیم اور کلچر سے روشناس تھی۔ اس زمانے کا پورے ملک کا تعلیمی اوسط بائیس فیصدی تھا۔ لیکن سوویٹ حکومت کے اٹھارہ برسوں میں یہ اوسط بانوے فیصدی تک جا پہونچا تھا۔ نیچے دئے ہوئے اعداد و شمار کسی تفصیل کے محتاج نہیں ہیں:۔

۱۹۱۳ء میں	ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں جملہ طلباء کی تعداد	اٹھتر لاکھ تھی
۱۹۲۷ء میں	"	ایک کرور بارہ لاکھ ہوئی
۱۹۳۲ء میں	"	دو کرور اناسی لاکھ ہوگئی
۱۹۱۵ء میں	اعلیٰ تعلیم گاہوں میں طلباء کی جملہ تعداد	اڑتالیس ہزار تھی
۱۹۳۱ء میں	"	پانچ لاکھ تین ہزار ہوئی
۱۹۳۲ء میں	"	سات لاکھ اٹھتر ہزار ہوگئی

۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۵ء میں طلباء کی اس تعداد پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ زار شاہی عہد میں کتابوں کی اشاعت کا اوسط محض اعشاریہ سات تھا جو سوویٹ عہد میں بڑھ کر چار اعشاریہ ایک یعنے چھ گنا ہوگیا۔ یہ اطلاع کم دلچسپ نہ ہونا چاہئے کہ سوویٹ روس میں کتاب لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہے جو دنیا کے بہت زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی نہیں ہوتا اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کتاب شایع ہونے کے دو گھنٹے بعد بازار میں نہیں ملی ہے

اس ذیل میں کازکستان کی مثال کے پیش نظر باقی علاقوں کے متعلق قیاس قایم کیا جا سکے گا۔ انقلاب سے پہلے یہ علاقہ خانہ بدوشوں کا ملک تھا پچھلی چھے صدیوں میں کازکستان کے اندر جتنا ادب وجود میں آیا، سوویٹ عہد کے پندرہ برسوں میں اس سے پندرہ گنا ادب پیدا ہوگیا

یہ اعداد و شمار ۱۹۳۶ء تک کے ہیں۔ اس کے بعد کے برسوں میں جنگ کے چار سال چھوڑ کر ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز رہی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہت بڑی تباہی و بربادی ہوئی مگر جنگ کے پنج سالہ پروگرام میں تعمیر و ترقی بھی بہت زیادہ ہوئی ہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک کا پنج سالہ پروگرام چار ہی سال میں مکمل ہوگیا اور سوویٹ روس میں بعض چیزوں کی پیداوار بڑے سے بڑی پیداوار کرنے والے ملکوں کے برابر پہونچ گئی ہے

وسط ایشیا کی بعض قوموں کے پاس کسی قسم کا کلاسکی ادب نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ لوک گیتوں اور ساکھوں کی شکل میں تھا۔ یہ عام تجربے کی بات

ہے کہ آدمی کی ایک حس ناقص ہو جاتی ہے تو کوئی دوسری حس زیادہ سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے، چنانچہ ان قوموں میں تعلیم مطلق نہ تھی مگر ذہن و حافظہ غیر معمولی تھا۔ وسط ایشیا کی یونیورسٹی خاص کر اس کے شعبۂ لسانیات اور ان علاقوں کے ٹیچروں کے انسٹی ٹیوٹ نے پنج سالہ پروگراموں کی تکمیل میں زبردست کام کیا۔ نئی نسل اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے شعر و ادب اور تنقید و صحافت کے میدان میں آ گئی، اور ان نوجوان اہل قلم میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو دیہات کے رہنے والے تھے اور جو آج نامور شاعر و ادیب ہیں۔ آج چھوٹی سے چھوٹی سوویٹ قوم ایسی نہیں جس کی اپنی قومی زبان اپنا قومی ادب، اپنا قومی تھیٹر اور اپنا قومی پریس نہ ہو

سوویٹ قوموں کی کلچری ترقی کے اور اشتراکی کلچر کے ذکر میں اسٹالین کی ایک تقریر کے یہ فقرے خاص اہمیت رکھتے ہیں:-

"...... انقلاب نے ملک کے اندر زبانوں کی تعداد کو گھٹایا نہیں بلکہ بڑھا دیا ہے اور فی الحقیقت انقلاب ایک ایسی چیز ہے جو دریائے انسانیت کی تہ میں بھی موجیں دوڑا دیتا ہے۔ انقلاب نے بہت سی چھوٹی قوموں کو اُبھار کر سیاست کی بساط پر لا کھڑا کیا ہے، انھیں نئی زندگی دیکر ترقی کے راستے پر ڈال دیا ہے"

اسٹالین نے یہ تقریر ۱۹۲۵ء میں کی تھی۔ مگر اس کے بعد سچ مچ چھوٹی موٹی ایسی پچاس قومیں سامنے آ گئیں، پہلے جن کے وجود کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا۔ آج یہ سب قومیں سوویٹ یونین کے اندر خود مختار جمہوریتوں کی حیثیت سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان قوموں میں ایسی بھی تھیں جن کی کوئی تحریری زبان نہ تھی۔ چنانچہ ایسی قوموں کے لئے ان کی بولیوں کی مناسبت سے حروف ہجا وضع کئے گئے، قومی تعلیم عام ہوئی اور قومی پریس قایم کیا گیا تاکہ قومی ادب و کلچر کی تعمیر کے لئے معمار پیدا کئے جائیں

۱۹۳۴ء میں شہر روستوف میں تمام سوویٹ اہل قلم کی پہلی کانگریس ہوئی تھی جس کی صدارت گورکی نے کی تھی۔ اس کانگریس میں چھ سو نمایندے شریک ہوئے۔ ان میں اکثریت ایسے اہل قلم کی تھی جو چھوٹی قوموں کی نمایندگی کرتے تھے۔ اور یہ اکثریت پچاس مختلف زبانوں کے نمایندوں کی تھی۔ گورکی کے خطبۂ صدارت کے یہ فقرے آپ اپنی شرح کرتے ہیں:

"...... سوویٹ ادب سے مراد روس خاص کا ادب نہیں بلکہ وہ تمام ادب ہے جو یونین کے مختلف حصوں میں پیدا ہو رہا ہے ......

...... یاد رکھنا چاہئے کہ آج اس وقت سوویٹ یونین کے طول و عرض میں تمام محنت کش عوام ایک متدین زندگی کے لئے، آزادانہ تخلیق کیلئے سرگرم عمل ہیں ...."

وسط ایشیا کے اہل قلم پچھلے دس پندرہ برسوں میں وسط ایشیا کے اکثر اہل قلم کے ادبی کارنامے روسی و دیگر زبانوں میں منتقل ہو کر مشہور ہو چکے ہیں جن میں ازبکستانی شاعر غفور غلام، حامد علیم جان، شیخ زادہ اور الیغون، تاجیک شاعر و ادیب صدر الدین عینی، لاہوتی، عزیز اور ربیع، ترکمانی شاعر بردہ بابائیف، امان کلیلات اور نصرت علی سعید دف، کازاک شاعر اعظم جمبول زابر اور نرگنیا کا شاعر سلیمان سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کا کلام تقریباً ہر سوویٹ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے

اشتراکی تعمیر کے پروگرام میں جب ادب و کلچر پر توجہ کی گئی تو زندگی کے دوسرے کاموں کی طرح، بہت سے مشکل سوال سامنے آئے۔ شروع میں مختلف نسل کے لوگوں میں قومی تحریکیں ابھریں: اتحاد ترکیہ، اتحاد اسلامیہ، اتحاد سلافیہ وغیرہ لیکن بنیادی طور پر ایسی تحریکیں رجعتی تھیں اور REVIVALISM پر مبنی تھیں اس لئے زیادہ ٹھہر نہ سکیں اور جب یہ طوفانی دور گزر گیا جس میں پرانی نسل کے لوگ زیادہ پیش پیش تھے تو اصل اور حقیقی مسئلے سامنے آئے۔ اس وقت سوویٹ قوموں کی بین الاقوامی ترقی نے نئی راہیں تلاش کیں۔ اس وقت کے ادبی مسایل کی نوعیت بھی عجیب تھی۔ ایک سوال یہ تھا کہ زبان کے معیاری ادب اور اس کے لوک گیتوں کا تعلق کیا ہو؟ دوسرا سوال یہ اُٹھا کہ ادبی زبان کی ترقی کی حدیں کیا ہوں؟ یہ معمہ بھی حل طلب تھا کہ لکھنے اور پڑھنے والوں کے کلچری معیار میں فرق ہوتا ہے! چوتھی مشکل یہ نظر آئی کہ دوسری زبانیں روسی زبان کا تتبع کریں یا نہ کریں؟ اور کریں تو کس حد تک؟ یہ سوال بھی تھا کہ نیا ادب کلاسکی ادب کی روایات کا اتباع کس حد تک کرے؟ سوال تو اور بہت سے اُٹھے مگر حل سب ہو گئے

"سوویٹ ادب کا پیکر قومی اور اس کا وصف اشتراکی ہوگا!" یہ خصوصیت غالباً سوویٹ قوموں ہی کے ادب کو حاصل ہے کہ اس نظریے کی بدولت ان کے معیاری اور عوامی ادب میں فرق نہیں رہا۔ اور اس مقصد کے حاصل ہونے میں کسی خاص کوشش کو دخل نہ تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک سوویٹ نظام میں ایسے سازگار حالات پیدا نہ ہوسکے تھے جو معیاری ادب کی پیداوار کے لئے موافق فضا بنا سکتے، مگر عوامی شاعروں نے انقلابی موضوع پر گیت شروع کر دئے جو گاؤں گاؤں پہونچ گئے

ان "گشتی" شاعروں کو مختلف قوموں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ترکمانیہ میں آشک کہلاتے ہیں اور کازکستان میں اکین، تاتاریا میں بخشی کہے جاتے ہیں اور کہیں صرف شاعر۔ بہرحال سوویٹ عوام میں سوویٹ ادب کا بیج بونے والے یہ "گشتی" شاعر ہی تھے جو ہمیشہ گمنامی میں رہے۔ کبھی کسی نے نہ ان کا نام جانا نہ ان کے جوہر کو تسلیم کیا۔ لیکن سوویٹ نظام نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے۔ سوویٹ ادب کی بے مثال ترقی ہر قوم کے عوامی شاعروں کو منظرِ عام پر لے آئی ہے۔ بہت سے شاعر جو پہلے اس جماعت میں شامل تھے آج اساتذہ ادب کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا کلام کلاسک میں شمار ہوتا ہے جیسے جمبول زابر اور سلیمان، ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ اور ان کی زندگی کے متعلق ایک ایک بات بیس کروڑ انسانوں تک جا پہونچتی ہے

عوامی شعراء کا وصف

انقلاب اور انقلابی موضوعات کی جو اہمیت عوامی شاعروں کے سامنے تھی ظاہر ہے کہ دیہاتی عوام اس کو سمجھ سکتے تھے اس لئے ان عوامی شاعروں نے یہ کیا کہ عوام کو صرف وہ اتنی بات سنائے جو عوام آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ یہ کھلی حقیقت تھی کہ زار شاہی کے اندر کتنی خرابیاں تھیں اور سوویٹ نظام نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیسی کاری ضرب لگائی ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی پہچانتے تھے کہ رجعت پسند طبقہ اس نئے نظام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ چنانچہ ان شاعروں کے اس وقت کے مجموعۂ کلام سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان لوگوں نے اس وقت کے حالات کی رعایت ملحوظ رکھی اور دیہاتی عوام کو حقیقتیں سمجھانے میں احتیاط اور دانشمندی سے کام لیا۔ ان شاعروں نے نئے حالات کے نتیجے نکال کر اپنے سننے والوں کو تعلیم دی، اور ان کے خیالات کی نوعیت ایسی ہوتی تھی جو انسان فطرت کو حرکت میں لائے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ ماضی کی کراہتیں اور مستقبل کی برکتیں اس سادہ طریق پر پیش کیں کہ دیہاتی عوام کے ذہن نشین ہوگئیں

سوویٹ طاقت کے وجود میں آتے ہی وسط ایشیا کے کوہستانی علاقے ان گمنام شاعروں کے نغموں سے گونج اُٹھے تھے۔ آزاد شدہ انسانیت کا قصیدے، آزادی کے لیڈر لینن کی ثنا وصفت، نومولود جمہوریت کے لئے جہادِ حریت کے نعرے، رجعت پسندوں کو نیست و نابود کرنے پر سرخ فوج کا گیت، یہ تمام باتیں ان کی شاعری کا موضوع تھیں۔ ایسے شاعروں میں جمبول زابر، سلیمان، دردی قلیچ، آغ، تقباز اور فرح وغیرہ بہت سے ہیں جنھوں نے کشادہ آغوش انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا

اس طرح دیہادی عوام کے اندر نئی زندگی کا شعور اُبھرا اور اسے بیان کرنے میں معیاری ادب کو اس عوامی ادب یا لوک گیتوں سے بہت مسالا ملا۔ ایک طرف اسکول کی ریڈریں چھاپ کر بے پڑھے لکھے عوام میں پریس زبردست خدمت انجام دے رہا تھا تو دوسری طرف یہ عوامی شاعر تخلیقی کارنامے مرتب کر رہے تھے۔ سوویٹ واقعیت نگاری کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ کل کے بے پڑھے لکھے بھاٹ یا آج کے دیہاتی لڑکے، شعر و صحافت کی دنیا میں مردِ میدان بن گئے

اوپر ذکر آچکا ہے کہ سوویٹ نظام نے چالیس مختلف قوموں کے لئے مناسب حال حروفِ تہجی بہم پہونچائے۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنی آسانی سے لکھ دیا گیا، بلکہ ایک کارِ اہم تھا جس کی مختصر تفصیل جاننا فایدے سے خالی نہ ہوگا

جن قوموں کی کوئی تحریری زبان نہ تھی ان میں ایک زبردست مشکل یہ بھی تھی کہ ہر قوم مختلف و متعدد قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی، اور ان قبیلوں کی بولیاں بنیادی طور پر تو ایک تھیں مگر ہر قبیلے کی ایک خاص فرہنگ بھی تھی۔ گویا زبان کی شاخیں موجود تھیں مگر تنہ غائب تھا اور چونکہ کوئی قومی زبان موجود نہ تھی اس لئے ان تمام قبیلوں کی ایک قومی وحدت بنا دینے کا کام اتنا ہی مشکل ہوگیا تھا جتنا نقطے کے بغیر خط کھینچنا دشوار ہوتا ہے

لیکن سوویٹ لیڈروں کی مخلصانہ دل سوزی اور دیدہ ریزی نے اس اہم مشکل کو بھی حل کرلیا، ماہر مقرر کئے گئے اور انھوں نے ایک قوم کے تمام قبیلوں کی بولیوں کو اکٹھا کیا، اور پھر فضولیات کو چھانٹ کر ایک قومی زبان کی ایک لغت مرتب کرلی جس پر سے درسی کتابیں لکھی گئیں، اخبار جاری کئے گئے اور بالآخر ایک ادبی زبان بن کر ادبی سرمایہ وجود میں آنے لگا اور پھر قومی اتحاد از خود پیدا ہوگیا

وسط ایشیا کی جدید شاعری

سوویٹ رُوس کی تمام پچھڑی قوموں کی جدید شاعری اور کلچری ترقی میں قومی پریس سب سے زیادہ قابل تحسین ہے، جس نے درسی کتابیں اور بے شمار اخبار شایع کرکے جدید شاعری کو مقبول بنایا۔ ہر اخبار میں نظم کا حصہ ضروری ہوگیا تھا۔ اس وقت کی شاعری کا رنگ قدرتی طور پر طنزیہ اور مزاحیہ تھا اس لئے مقبول عوام ہوجانے میں آسانی بھی تھی۔ اس کے بعد ہی فیکٹریوں اور تعلیم گاہوں نے اپنے مختصر اخبار نکالنا شروع کردئے۔ اس طرح بھی شعر و سخن کو چمکنے کا بڑا موقعہ ملا۔ اور جب دیہاتوں میں اسکولوں کا جال پھیل گیا تو اسکول ٹیچروں نے ہر گاؤں سے مقامی اخبار نکالنے شروع کردئے۔ دیہات میں تعلیم عام ہوئی تو ہر شخص پڑھا لکھا بن گیا اور اس طرح بہت سے جوہر قابل پیدا ہوگئے جن میں سے بعض بعض مستند اہل قلم بن گئے۔ اس کی ایک مثال بوڑھا تاجیک ربیع ہے جس نے تعلیم بالغان کی اسکیم کے تحت پڑھنا لکھنا سیکھا۔ پھر ربیع نے مضمون نویسی شروع کی اور پہلا مضمون قدامت پرستی کے خلاف لکھا اور خود لے کر اسٹالین آباد پہونچا جو تاجکستان کا مستقر ہے۔ اخبار تاجکستان کے دفتر میں مضمون شایع ہونے کو دیا اور اس اخبار کا مستقل نامہ نگار بن گیا۔ آج ربیع کی تصانیف دوسری سوویٹ زبانوں میں ترجمہ ہو رہی ہیں

کلچر اور عوام

اول اول سوویٹ یونین کے اندر اور خاص طور سے وسط ایشیا کے ملکوں میں جو شعر و ادب پیدا ہوا اس میں ایک قسم کا تذبذب تھا، غیر قطعیت تھی۔ ہر چند اس سے پہلے زمانے میں روسی عوام ایسے ادب کی بھی آرزو کرنے کے مجاز نہ تھے، پُرانے زمانہ میں وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ انھیں ادب کی ضرورت ہے، ادب ان کے لئے پیدا ہونا چاہئے

تعلیم عام ہونے کے ساتھ اخباروں کی کثرت سوویٹ کلچر کی ترقی کی پہلی سیڑھی تھی، عوامی کلچر کی تیز ترقی کا دوسرا بڑا سبب اور ذریعہ تھیٹر بنا اور جتنی خدمت مستقل تھیٹروں نے کی اتنی ہی شوقیہ ڈراما کرنے والی ٹولیوں نے بھی کی۔ سول وار ابھی پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ شوقیہ ڈرامہ کرنے والوں کی ناٹک منڈلیاں دور افتادہ علاقوں میں پہونچنے لگ گئیں۔ شروع شروع میں یہ ناٹک منڈلیاں اخباروں میں چھپنے والے مضامین کو مکالموں کی شکل دیکر اسٹیج پر لے آتی تھیں، اور یہ ناٹک زیادہ تر دیہاتی میلوں اور ہاٹوں میں دکھائے جاتے تھے۔ آج ہر جمہوریت میں قومی تھیٹروں کی عالی شان عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ — دیہاتی میلوں میں ناٹک کے کھیل پہلے سے بھی مقبول تھے۔ لیکن انقلاب سے پہلے ان ناٹکوں کی نوعیت مذہبی ہوتی تھی وسط ایشیا کے عوام ایسے مذہبی ناٹکوں کو "ذکر" کہتے تھے، اور شمالی قفقاز والے "شمائی"۔ یہ ذکر یا شمائی مذہبی روایتوں سے اخذ کئے جاتے تھے۔ ہمارے یہاں کی رہس ان ناٹکوں سے ملتی جلتی چیز ہے — تیز کلچری ترقی کا تیسرا بڑا ذریعہ کھیل کود تھے۔ وسط ایشیا میں جتنے عوامی کھیل کھیلے جاتے تھے، سوویٹ کلچر کے مبلغوں نے ان کھیلوں سے بھی کام لیا اور کچھ اصلاح کرکے ان میں ناچ گانے کا اضافہ کرکے بہت دلچسپ و مفید بنا دیا۔ خیوا کے بازاروں اور تاش حوض کے دیہاتوں میں جتنے قصے کہانیاں مقبول عوام تھیں ان سب کو اسکیچوں اور ڈراما کی صورت دیدی گئی جنھیں دہقاں پسند کرسکتے تھے۔ بعد میں یہی ڈرامے مستقل تھیٹر کے وجود میں آنے کا سبب بن گئے۔ اکیلے ترکمانیہ کے اندر دس تھیٹر کمپنیوں کی ابتدا اسی طرح ہوئی تھی — تاشقند کا حمزہ تھیٹر جو ایک بلند پایہ شاعر و ڈراما نگار کے نام پر بنا ہے اور سوویٹ یونین کے نہایت مقتدر تھیٹروں میں سے ایک ہے، اس تھیٹر کی ابتدا بھی ایک ناٹک منڈلی سے ہوئی جس کا لیڈر حمزہ حکیم زادہ تھا یہ واقعہ ہے کہ ان منڈلیوں نے بہت سے نامور ڈراما نگار اور ایکٹر پیدا کئے۔ ایسے فن کاروں میں حمزہ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ حمزہ ایک ازبک ڈراما نویس شاعر اور موسیقار تھا۔ اس کے ادبی اور صناعتی کارنامے سوویٹ ادب کے کلاسک میں گنے جاتے ہیں۔ حمزہ پہلا غیر روسی فنکار تھا جسے یہ بلند مرتبہ حاصل ہوا۔ اس کی تصانیف بہت ہیں اور سب مقبول ہوئیں، مگر "بے اور دہقان" اور "طوفان" کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی۔ اس کے ڈرامے آج بھی کھیلے جاتے ہیں۔ وہ اگرچہ قبل انقلاب کا اہل قلم تھا مگر اس کے خیالات ہمیشہ ترقی پسندانہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شروع ہی سے عوام میں مقبول تھا۔ رجعت پسند جماعت نے حمزہ کو قتل کرادیا۔

(باقی)

لطیف الدین احمد

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

فرزان ــــ آج بہت خوش طبع نظر آتے ہو تم ـ آخر معاملہ کیا ہے ؟

مجسمہ ــــ میں نے ایک زبردست فیصلہ اور ایک انقلابی عزم کیا ہے میرے دوست ! ـ مگر پہلے یہ بتلاؤ کہ ہمارا دوست ابلیس کہاں ہے ۔ اس معاملہ میں مجھے اس سے مشورہ لینا ضروری ہے ـ اور بلاشبہ سارا بھی تو اس سے متعارف ہونا چاہتی ہو گی

سارہ ــــ تم میرے واسطے عذاب و عقوبت کی تیاریاں کر رہے ہو

فرزان ــــ یہ سب توہم پرستی ہے سارہ ! ـ یقین کرو ـ یاد رکھو ابلیس اس قدر "سیاہ فام" نہیں جتنا کہ دکھایا جاتا ہے

مجسمہ ــــ آؤ اُسے آواز دیں

(مجسمہ کے ہاتھ کی ایک حرکت پر موسیقی کی بلند آوازیں پھر لہرانے لگتی ہیں .... روشنی کا ایک سرخ حلقہ چمکنے لگتا ہے اور اس کے اندر سے ابلیس نمودار ہوتا ہے ۔ وہ سن رسیدہ معلوم ہوتا ہے اور اس کا سر قبل از وقت بالوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے ۔ ایک خفیف سی نیک طینتی، دوست پروری اور مہربانی کی جھلک کے باوجود اس کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اگر اس کے اقدامات کا مطمئن کن جواب نہ دیا جائے تو وہ برہم ہو جاتا ہے ۔ اُس کو دیکھ کر اس کی محنت و مشقت یا تحمل و رواداری کی قوتوں پر کچھ زیادہ اعتماد پیدا نہیں ہوتا اور وہ مجموعی طور پر ایک ناگوار حد تک خود غرض بنتی نظر آتا ہے ۔ لیکن وہ چالاک ہے اور چرب زبان ـ ان دو مردوں کی بہ نسبت اُسے اچھی تربیت کم ملی ہے اور اس عورت کے مقابلہ میں اس کے اندر زندگی کی قوتیں حد سے زیادہ کم ہیں)

ابلیس ــــ (خلوص کے ساتھ مجسمہ سے مخاطب ہو کر) کیا مجھے آج پھر اس عالی مرتبہ شخصیت کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے ؟ ـ (فرزان سے سرد مہری کے ساتھ) اپنے خادم کا سلام لو فرزان ـ (سارہ سے مہذب انداز میں) اجنبی خاتون ؟ ـ آداب عرض !

سارہ ــــ کیا تم ....

ابلیس ــــ (سر بخم ہو کر) جی ہاں ـ ابلیس ـ آپ کا خادم !

سارہ ــــ میں پاگل ہو جاؤں گی

ابلیس ــــ (جری لہجہ میں) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں محترمہ ـ آپ کرۂ ارض سے ہمارے پاس آئی ہیں ۔ وہ دنیا مذہب کے نام لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں کی غلام ہے ـ آپ ابھی تک اسی دنیا کی عصبیت اور خوف و دہشت میں مبتلا ہیں ۔ آپ نے وہاں لوگوں کو میری مذمت کرتے سُنا ہے لیکن یقین کیجئے کہ اس کے باوجود وہاں میرے دوست گروہ در گروہ موجود ہیں

سارہ ــــ ہاں ـ تم اُن کے دلوں پر حکومت کرتے ہو

ابلیس ــــ یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے محترمہ ـ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ غلطی پر ہیں ۔ یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا لیکن دنیا اس پر

میرا شکریہ ادا نہیں کرتی۔ اپنے دل میں وہ مجھ سے بدظن ہے اور نفرت کرتی ہے۔ اس کی تمام ہمدردیاں تو مصیبت و ذلت، افلاس و فلاکت اور جسم و قلب کی بھوک کے ساتھ ہیں۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ اپنی ہمدردی کو حصولِ مسرت کی طرف متوجہ کرے — محبت کی طرف — راحت و سکون کی طرف — حسن و جمال کی طرف ....

فرزان — (نفرت سے) معاف کرنا — میں جا رہا ہوں — تم جانتے ہو کہ میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا

ابلیس — (برہمی سے) ہاں — میں جانتا ہوں کہ تم میرے دوست نہیں ہو

مجسمہ — تمھیں کیا نقصان پہونچا رہا ہے یہ — فرزان؟ میرے خیال میں تو وہ خاصی معقول باتیں کر رہا تھا، جب تم نے بات کاٹ دی!

ابلیس — (مجسمہ کے ہاتھ کو گرمجوشی سے تھپکی دیتے ہوئے) شکریہ دوست! — شکریہ! — تم ہمیشہ میرے مفہوم کو اچھی طرح سمجھے ہو اور یہ ہمیشہ میری تحقیر کرتا رہا ہے اور مجھ سے پرہیز کرتا ہے

فرزان — میں نے تمھارے ساتھ ہمیشہ مکمل اخلاق کا برتاؤ کیا ہے

ابلیس — اخلاق! — اخلاق کیا چیز ہے؟ — میں اخلاق محض کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی قلبی محبت دو۔ حقیقی خلوص — محبت و مسرت کے احساسات میں میری شرکت کرو ....

فرزان — تم مجھے بدمزہ کر رہے ہو

ابلیس — یہ دیکھو! — (مجسمہ سے مخاطب ہو کر) تم سنتے ہو؟ — کیسی زبردست ستم ظریفی ہے تقدیر کی یہ سرد احساس والا خود غرض اور خود پرست شخص میری اقلیم میں بھیج دیا گیا اور تم جنت کے برفانی قصور میں پہونچا دئے گئے!

مجسمہ — میں یہ شکوہ نہیں کر سکتا۔ میں ایک ظاہر پرست منافق تھا اور میرے حق میں یہ انصاف صحیح ہے کہ مجھے جنت میں بھیج دیا گیا

ابلیس — تم ہمارے ساتھ شریک کیوں نہیں ہو جاتے اور اس خطہ کو خیرباد کیوں نہیں کہہ دیتے جو تمھارے انتہائی ہمدردانہ مزاج — تمھارے انتہائی محبت کیش دل اور تمھاری شدید تشنگیِ کیف و مسرت کے لحاظ سے بالکل غیر موزوں ہے؟

مجسمہ — میں نے آج ایسا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج سے میں صرف تیرا ہوں اے "فرزندِ صباح"! میں نے جنت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے

ابلیس — (مرمریں ہاتھوں کو ایک بار چھوتے ہوئے) اوہ! — کتنا بڑا اعزاز ہے یہ میرے لئے! — کیسی زبردست فتح ہے ہمارے مقاصد کی! — شکریہ! — شکریہ! — اور کیوں دوست کیا تم اس شخص کو یہ ترغیب نہیں دے سکتے کہ جو جگہ تم عالمِ بالا میں خالی چھوڑ آئے ہو اس کو یہ پُر کر دے؟

مجسمہ — (نفی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے) میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ایک ایسے شخص کو جو میرا دوست رہ چکا ہے یہ مشورہ دوں کہ وہ دیدہ و دانستہ اپنی زندگی کو بےکیف اور اذیت انگیز بنا لے

ابلیس — بالکل صحیح کہا تم نے — لیکن کیا تمھیں یقین ہے کہ اس شخص کو وہاں کوئی تکلیف ہوگی؟ اس میں شک نہیں کہ سب سے زیادہ تم ہی اس انسان سے واقف ہو — ابتدا میں تم ہی اس کو یہاں لائے تھے — اور ہم کو اس سے بڑی امیدیں تھیں — اس کا وجدان و ذوق ہمارے خطہ کے بہترین لوگوں سے بہتر تھا۔ یاد نہیں تمھیں یہ کیسے گایا کرتا تھا؟ (دھیرے دھیرے گنگنانے لگتا ہے)

(مجسمہ بھی نغمۂ ابلیس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر گنگنانے لگتا ہے)

ابلیس — ہاں بالکل اسی طرح — مگر اب یہ ہمیں اپنے نغمات سے محظوظ نہیں کرتا

فرزان — تمھیں اور اس کا شکوہ؟ — جہنم موسیقی کے دلدادوں سے لبریز ہے۔ موسیقی جہنمی لوگوں کی شراب ہے۔ کیا ایک گمراہ روح کو اس شراب سے پرہیز کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی؟

تم ایک بلند ترین و پاکیزہ ترین فنِ لطیف کے خلاف اہانت آمیز الفاظ ادا کرنے کی کافرانہ جرأت کر رہے ہو!

فرزان ـــــ (سرد نفرت سے) تمھارے الفاظ بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی نیم دیوانہ عورت کسی مغنی کی چاپلوسی کر رہی ہو

ابلیس ـــــ تمھاری باتیں مجھے برہم نہیں کر سکتیں ۔ مجھے تو تمھاری حالت پر ایک حقارت آمیز افسوس ہوتا ہے ۔ تمھارے پاس روح باقی نہیں اور پھر جن چیزوں سے تمھارا دامن خالی ہوتا جاتا ہے ان کا وقوف و شعور تمھیں نہیں ـــــ (مجسمہ سے مخاطب ہو کر) تم ایک فطری و پیدائشی مغنی ہو ۔ کیسا اچھا گاتے ہو تم ! ـــ موزارٹ اگر یہاں رہتا تو تمھیں سنکر مسرور ہوتا ۔ لیکن یہاں وہ گھبرا گیا اور جنت میں چلا گیا ۔ کیسی عجیب بات ہے کہ بعض خاصے سمجھدار لوگ جن کے متعلق خیال کیا جا سکتا تھا کہ یہاں ہر دلعزیز رہیں گے انجام کار یہاں ہماری سوسایٹی میں ناکام انسان ثابت ہوئے ـــ فرزان کی طرح

فرزان ـــــ سوسایٹی میں ایک ناکام انسان ثابت ہونے پر مجھے درحقیقت بہت افسوس ہے

ابلیس ـــــ یہ بات نہیں کہ ہم تمھاری ذکاوت و ذہانت کے مداح نہیں ۔ ہم اس کے معترف ہیں لیکن میں اس مسئلہ کو تمھارے نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا ۔ یہ جگہ تمھیں موافق نہیں آئی ۔ درحقیقت ہم یہ تو نہیں کہ سکتے کہ تمھارے پاس دل نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اپنی تمام قنوطیت اور نفرت کیشی کے پیچھے تم ایک محبت بھرا دل رکھتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فرزان ـــــ (کانپتے ہوئے) رہنے دو ۔ بس کرو

ابلیس ـــــ (برہمی سے) بہتر ـــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم میں کیف و مسرت کی اہلیت ہی نہیں ـــ ٹھیک ہے نا ؟

فرزان ـــــ یہ الفاظ بھی منافقت سے خالی نہیں لیکن پہلے سے کچھ کم ناقابل برداشت ـــ بہرحال اگر تم اجازت دو تو میں حسب معمول گوشۂ تنہائی میں پناہ لینا چاہتا ہوں

ابلیس ـــــ تم گوشۂ جنت میں کیوں پناہ نہیں لیتے ؟ ـــ وہ جگہ تمھارے لئے موزوں ہے ۔ (سارہ سے) کیا آپ بھی اسے یہ ترغیب نہیں دے سکتیں کہ اپنی بہبودی کی خاطر ذرا آب و ہوا تبدیل کرے ؟

سارہ ـــــ لیکن اگر وہ جنت میں جانا چاہے تو کیا ایسا ممکن ہے ؟

ابلیس ـــــ کیوں نہیں ! ـــ روک ہی کون سکتا ہے ؟

سارہ ـــــ کیا ہر شخص ـــ کیا میں بھی جنت میں جا سکتی ہوں ؟

ابلیس ـــــ (قدرے تنفر سے) یقیناً ـــ بشرطیکہ آپ کا ذوق اس نوعیت کا ہو

سارہ ـــــ پھر ہر شخص جنت میں کیوں نہیں چلا جاتا ؟

مجسمہ ـــــ (مسکراتے ہوئے) یہ راز میں بتا سکتا ہوں عزیزہ ـــ وجہ یہ ہے کہ جنت تمام کائنات میں سب سے زیادہ بےکیف جگہ ہے

ابلیس ـــــ ہمارے کپتان صاحب نے تو بالکل صاف الفاظ میں حقیقت کہہ ڈالی ۔ واقعہ یہ ہے کہ جنت کی زندگی بڑی صبر آزما چیز ہے ۔ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے وہاں سے نکال دیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں قیام کرنے پر کوئی چیز مجھے مائل ہی نہیں کر سکتی تھی ۔ سیدھی بات یہ ہے کہ میں نے خود ہی جنت کو چھوڑ دیا

مجسمہ ـــــ مجھے اس میں ذرا بھی تعجب نہیں ـــ ایک ابدی فردوسی زندگی کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا

ابلیس ـــــ نہیں ـــ کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو یہ زندگی موافق آتی ہے ۔ ہمیں انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے ۔ کپتان صاحب ـــ یہ معاملہ تو بالکل افتادِ طبع سے تعلق رکھتا ہے ۔ میں فردوسی قسم کے مزاج و ذوق کا قایل نہیں ۔ ایسا ذوق میری سمجھ ہی میں نہیں آتا ۔ لیکن کائنات کی تشکیل و تکمیل کے لئے تو ہر قسم کی چیزوں کی ضرورت ہے ۔ ذوق و طبع کی قسموں کا کوئی شمار نہیں ۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو جنت کو پسند کرتے ہیں ۔ میرا خیال ہے فرزان کو یہی پسند ہے

فرزان ـــــ لیکن ـــ صاف گوئی معاف ـــ اگر تم جنت میں جانا چاہتے تو کیا واقعی وہاں واپس جا سکتے تھے ؟ ـــ یا محض انگور کھٹے ہیں ؟

ابلیس —— واپس اور وہاں! — میں اکثر وہاں جاتا ہوں۔ کیا تم نے کتابوں میں ایسا نہیں پڑھا؟ کیا تمھارے پاس اس بات کی کوئی سند ہے کہ ہمارے خطے اور فردوسی طبقے کے درمیان کوئی حدِّ فاصل موجود ہے

سارہ —— لیکن درمیان میں ایک بڑی خلیج تو ضرور حایل ہے

ابلیس —— محترمہ! ایک استعارہ کا مفہوم کبھی حقیقی حیثیت سے نہ لینا چاہئے۔ یہ خلیج دراصل ملکوتی اور ابلیسی ذوق کے باہمی فرق کی خلیج ہے اس سے زیادہ ناقابلِ عبور خلیج اور کونسی ہو سکتی ہے؟ — آپ نے زمین کی سطح پر جو کچھ دیکھا ہے اس پر غور کیجئے۔ ایک فلسفی کے دارالتعلیم اور بٹیر بازوں کے حلقہ کے درمیان کیا کوئی مادی خلیج حایل ہے؟ — لیکن اس کے باوجود یہ بٹیر باز کبھی اس دارالتعلیم پر نہیں آتے۔ کیا آپ نے کبھی اس ملک کی سیر کی ہے جہاں میرے سب سے زیادہ متبعین ہیں؟ — یعنی انگلستان؟ — وہاں گھوڑ دوڑ کے وسیع میدان ہیں — اور بہت سے سرود خانے بھی ہیں جہاں لوگ ہمارے کپتان صاحب کے دوست موزارت کے تخلیق کردہ نغمات گاتے بجاتے ہیں۔ لوگ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں — گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں بھی اور سرود خانوں میں بھی — اس معاملہ میں انھیں روکنے والا کوئی قانون نہیں کیونکہ انگریز کہتے ہیں کہ وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتے — وہ ہر کام آزادی سے کر سکتے ہیں جس کی اجازت اُنھیں حکومت اور رائے عامہ دیتی ہے — اور پھر یہ بھی ہے کہ ایک گھوڑ دوڑ کے میدان کی بہ نسبت ایک معیاری سرود خانہ زیادہ بلند۔ زیادہ مہذب۔ زیادہ شاعرانہ۔ زیادہ ذہنی اور زیادہ شریفانہ مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑ دوڑ کے پرستار اپنا شغل چھوڑ کر سرود خانے میں گروہ در گروہ چلے آئیں؟ — نہیں! — اُنھیں وہاں اسی اضمحلال کبیدگی اور کوفت کی اذیت سہنی پڑے گی جو ہمارے دوست کپتان کو جنت میں برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان دونوں مقامات درمیان استعارہ کی ایک بڑی خلیج حایل ہے۔ اگر محض مادی خلیج ہوتی تو اسے یہ لوگ آسانی سے عبور کر سکتے تھے یا کم از کم اس مادی خلیج پر ان لوگوں کے واسطے ایک پُل تعمیر کیا جا سکتا تھا، لیکن ناپسندیدگی کی خلیج ناقابلِ عبور ہے اور ابدی

سارہ —— میں تو اسی وقت جنت میں جاتی ہوں

مجسمہ —— میری بچی! پہلے دو باتیں سن لو — میرے دوست ابلیس نے سرود خانے کی جو مثال پیش کی ہے مجھے ذرا سے پورا کرنے دو۔ انگلستان میں ہر سرود خانے کے اندر تمھیں ایسے پژمردہ تھکے ہوئے لوگوں کی قطاریں نظر آئیں گی جو وہاں اس لئے نہیں آئے کہ اُنھیں درحقیقت قدیم معیاری موسیقی مرغوب ہے بلکہ وہاں صرف اس لئے موجود ہیں کہ اُن کے خیال میں یہ موسیقی اُن کو مرغوب ہونا چاہئے۔ بالکل یہی حال جنت میں ہے۔ وہاں بہت سے لوگ شان و شوکت سے فروکش ہیں اس لئے نہیں کہ وہ مسرور ہیں بلکہ اس واسطے کہ اُن کے خیال میں بلند مرتبہ کا بھی تقاضہ ہے کہ وہ جنت میں رہیں۔ ایسے لوگ تقریباً سب کے سب انگریز ہیں

ابلیس —— ہاں۔ جنوبی ممالک کے لوگ تمھاری طرح جنت کو چھوڑ کر یہاں میرے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز جب انتہائی مصیبت میں ہوتا ہے تو اُسے اپنی حالت کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر ایک انگریز کو اپنی راحت میں خفیف سا خلل محسوس ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ نیکی کے راستہ پر ہے

مجسمہ —— مختصر یہ کہ اگر تم جنت کے فطری استحقاق اور طبعی موزونیت کے بغیر وہاں جاؤ گی تو وہاں تمھیں مسرت حاصل نہ ہو گی

سارہ —— اور کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ میں اس کے لئے فطری استحقاق و طبعی موزونیت نہیں رکھتی؟ — میرے اس حق پر کلیسا کے بڑے بڑے پیشواؤں نے بھی کبھی کوئی شک و شبہ نہیں کیا۔ میرا یہ فرض ہے کہ اس مقام سے فوراً چلی جاؤں

ابلیس —— (بے بسی سے) آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ لیکن مجھے آپ سے بہتر ذوق کی توقع تھی

سارہ —— آہا! — مجھے توقع ہے کہ میرے ساتھ تم بھی چلو گے — یہاں نہیں ٹھہر سکتے تم — لوگ کیا کہیں گے؟

مجسمہ —— لوگ! — واہ — بہترین لوگ تو اسی جگہ موجود ہیں — کلیسا کے پیشوا اور سب — جنت میں اس قدر کم لوگ جاتے ہیں اور یہاں

[illegible] ایک [illegible] اکثریت ہو جاتی ہے - [illegible] - دینی [illegible] آجکل کے [illegible]

ابلیس —— [illegible] — مجھے پہلے سے یہ علم تھا کہ میرے خلاف تحت وملامت کا جو ہنگامہ برپا ہے - اس میں انجام کار رائے عامہ کی بدولت مجھی کو فتح و کامرانی نصیب ہوگی - اپنے خمیر و فطرت کے لحاظ سے کائنات ایک باضابطہ جمہوریت ہے — اور اتنی بڑی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنانے کے بعد .... یہ ناممکن ہے کہ مجھے میرے واجب عہدے سے معزول رکھا جائے

فرزان —— میرے خیال میں بہتر یہ ہے سارہ کہ تم اسی جگہ قیام کرو

سارہ —— (رشک وحسد سے) تم نہیں چاہتے کہ میں تمھارے ساتھ جاؤں

فرزان —— یقیناً تم مجھ جیسے اوباش کے ساتھ جنت میں رہنا پسند نہ کروگی

سارہ —— روحیں سب یکساں ہیں - پھر تم تو توبہ بھی کر چکے ہو ؟

فرزان —— عزیز سارہ ! تم بے وقوف ہو - کیا تم سمجھتی ہو کہ جنت بھی کرۂ ارض کی طرح ہے جہاں لوگ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ "کردہ" افعال توبہ واستغفار کے ذریعہ "ناکردہ" بنائے جا سکتے ہیں — "گفتہ" کو معذرت کے ذریعہ سے "ناگفتہ" میں تبدیل کیا جا سکتا ہے - اور "حقیقت" کو متفقہ طور پر "جھوٹ" قرار دیکر مٹایا جا سکتا ہے ؟ ؟ — نہیں ! — جنت ایک مسکن ہے حقیقت کے آقاؤں کا — اور اسی لئے میں وہاں جا رہا ہوں

سارہ —— اس نصیحت کا شکریہ ! — لیکن میں تو مسرت کے حصول کے لئے جنت میں جا رہی ہوں - "حقیقت" کو تو میں کرۂ ارض پر کافی بھگت چکی ہوں

فرزان —— یہ بات ہے تو تمھیں یہیں قیام کرنا چاہئے کیونکہ جہنم مسکن ہے "عدم حقیقت" کا اور مسرت کے متلاشیوں کا - جنت اور کرۂ ارض دونوں سے پناہ حاصل کرنے کی جگہ یہی ہے، کیونکہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں جنت حقیقت کے آقاؤں کا مسکن ہے اور کرۂ ارض حقیقت کے غلاموں کا - زمین کی دنیا بچوں کی ایک پرورش گاہ ہے جہاں مرد اور عورت ہیرو اور ہیروئن یا اولیا و فاجر سب ملکر ایک کھیل کھیلتے ہیں - لیکن اُن کی اس خیالی دنیا سے جو "فردوس حمقا" سے تعبیر کی جا سکتی ہے اُن کے جسم اُن کو گھسیٹ کر کلیجی میں ڈھکیل دیتے ہیں — بھوک اور پیاس سردی و گرمی - کہولت وانحطاط - مرض و تکلیف — اور پھر سب کے بعد موت اُن کو حقیقت کا غلام بنا دیتی ہے - ہر روز تین چار بار کھانا کھانا اور ہضم کرنا ضروری ہے — ہر صدی میں تین بار ایک جدید نسل پیدا کرنا لازم ہے — مذہب و عقیدت - رومان و رنگینی — اور سائنس کے تمام طویل زمانے سمٹ کر مجبوراً صرف اس دعا میں جذب ہو جاتے ہیں کہ "اے معبود ! مجھے ایک تندرست حیوان بنا دے" — لیکن یہاں ہم گوشت و پوست کے اس ظلم و تشدد سے محفوظ ہیں کیونکہ یہاں آکر ہم کسی طرح بھی حیوان نہیں رہتے - یہاں تم ایک روح ہو ایک غیر انسانی مظہر — ایک تصور — ایک رسم — لافانی — لاعمر — اور مختصراً یہ کہ "لاجسم" — یہاں نہ سماجی مسایل ہیں — نہ سیاسی مسایل — نہ مذہبی مسایل — اور شاید سب سے زیادہ مسرور کن بات یہ ہے کہ یہاں "مسایلِ صحت" کا بھی کوئی وجود نہیں — یہاں ظاہری شکل و صورت کو حسن کہا جاتا ہے — جذبات کو محبت — احساسات کو زندگی — وجدان کو شجاعت — حوصلوں کو [illegible] — بالکل اسی طرح جیسے زمین کی دنیا میں کہا جاتا تھا - مگر فرق یہ ہے کہ یہاں تمھاری تردید و مخالفت کرنے والے ٹھوس حقایق موجود نہیں تمھاری ظاہرداریوں اور حقیقی ضروریات کے درمیان کوئی ستم ظریفانہ تضاد نہیں - کوئی طربیہ انسانی سوانگ نہیں — کچھ بھی نہیں صرف ایک ابدی رومان - ایک ہمہ گیر جذباتی ڈرامہ — جیسا کہ ہمارے ایک جرمن شاعر نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے "یہاں شاعرانہ جمال عین عقل ہے — اور ایک "ابدی نسائیت" ہمیں ہمیشہ بلندیوں کی طرف آگے — اور آگے — کھینچتی چلی جاتی ہے" کچھ اس طرح کہ [illegible] قدم بھی آگے نہیں بڑھتے — کیا تم ان تمام باتوں کے باوجود اس مقام کو چھوڑنا چاہتی ہو ؟

سارہ —— لیکن جہنم واقعی اس قدر حسین ہے تو جنت غالباً اس سے زیادہ شاندار ہوگی !

([illegible] مجسمہ اور فرزان سب کے سب [illegible] کرتے ہیں — کچھ دیر بعد [illegible] ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں)

فرزان — معافی چاہتا ہوں

ابلیس — نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تمہاری گفتگو میں دخل تو میں نے دیا تھا

مجسمہ — تم کچھ کہنے والے تھے

فرزان — آپ سب اصحاب کے بعد

ابلیس — (فرزان سے) تم نے میری مملکتِ جہنم کے اوصاف پر اس قدر فصیح و دلکش گفتگو کی ہے کہ میں اس دوسری آبادی یعنی جنت کے نقایص پر بھی ایسی ہی غیر جانبدارانہ روشنی ڈالنے کا کام تمہارے ہی سپرد کرتا ہوں

فرزان — میری تخیلی تصویر کے مطابق جنت ایک ایسا مقام ہے جہاں ہمیں کھیلنے اور نمایش کے سوانگ بھرنے کے بجائے زندہ رہنا اور کام کرنا ہوتا ہے۔ وہاں ہم اشیاء کی صورت کو نہیں بلکہ اصلیت کو دیکھتے ہیں۔ وہاں ظاہری شان و شوکت اور چمک دمک کے علاوہ کوئی اور چیز نظر انداز نہیں کی جاتی۔ اور وہاں استقلال اور خطر پسندی ہی میں ہماری عظمت و شوکت مضمر ہے۔ اگر یہاں جہنم میں اور سطح ارض پر ڈرامے کھیلے جاتے ہیں اور تمام دنیا کو ایک اسٹیج قرار دیا جاتا ہے تو جنت کی بابت ہم کم از کم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک منظر ہے بس پردہ۔ لیکن جنت کی کیفیت استعارہ کی مدد سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں ابھی کچھ دیر بعد وہاں چلا جاؤں گا کیونکہ مجھے امید ہے کہ وہاں پہونچ کر میں مسرت کے ذلیل و مضمحل کن فریب و دروغ سے محفوظ ہو جاؤں گا اور اپنی ابدیت کو غور و فکر کے مشغلہ میں صرف کر سکوں گا

مجسمہ — توبہ!

فرزان — کپتان صاحب! میں تمہاری نفرت کو مجرم نہیں سمجھتا۔ ایک اندھے آدمی کے واسطے نگار خانہ ایک بے کیف جگہ ہے۔ جس طرح تم حسن و مسرت جیسے سرابوں کے تصور سے لذت گیر ہوتے ہو اسی طرح میں بھی اس کے فکر و خیال سے کسب کیف کروں گا جو مجھے تمام چیزوں سے زیادہ دلکش و دلچسپ محسوس ہوتا ہے — یعنی "زندگی" — وہ قوت جو خود اپنی حقیقت پر غور و فکر کرنے کے لئے ہمیشہ بلند تر ذہنی و فکری قدرت کے حصول کی جد و جہد کرتی رہتی ہے۔ تمہارے خیال میں میرے اس دماغ کو کس لئے بنایا گیا ہے؟ — کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت کے لئے نہیں بلکہ جو کچھ میں کرتا ہوں اسے جاننے سمجھنے کے واسطے — تاکہ کہیں ایسا نہ ہو میں زندہ رہنے کی اندھی کوششوں میں خود کو ہلاک کر دوں

مجسمہ — اگر صرف میرا پاؤں نہ پھسلتا تو تم شمشیر زنی کی اندھی کوشش میں خود کو کبھی کا ہلاک کر چکے ہوتے میرے دوست!

فرزان — گستاخ مسخرے! صبح سے پیشتر ہی تیری ہنسی ایک دہشت ناک کوفت میں تبدیل ہو جائے گی

مجسمہ — ہا ہا — کیا تم بھول گئے کہ جب یہی الفاظ میں تمہیں دنیا میں اپنی سنگین چوکی پر کھڑا ہو کر سناتا تھا تو تم کس درجہ خایف ہو جاتے تھے۔ یہ الفاظ میرے ساز سے جدا ہو کر کچھ بے معنی محسوس ہوتے ہیں

فرزان — لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ نغمہ ساز کے ساتھ ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتا ہے

سارہ — اُف؟ — ان لغو مزاحیہ باتوں سے گفتگو میں خلل نہ ڈالو — ہاں فرزان یہ بتاؤ کہ کیا جنت میں فکر و غور کے علاوہ اور کچھ نہیں؟

فرزان — مجھے اس کے علاوہ جنت میں اور کسی مسرت کی تلاش نہیں — لیکن وہاں ایک اہم کام بھی ہے اور وہ یہ کہ "زندگی" کو اسی جد و جہد میں امداد دی جائے۔ ذرا غور کرو کہ "زندگی" اپنی لاعلمی اور بے بصری کے عالم میں کس کس طرح خود کو ضایع کرتی رہتی ہے۔ کس قدر دشواریاں خود اپنی راہ میں پیدا کر لیتی ہے اور خود اپنے وجود کو ہلاک کر دیتی ہے۔ زندگی کی یہ بے پناہ قوت محتاج ہے ایک دماغ کی تاکہ لاعلمی کے عالم میں یہ خود اپنی رفتار کی مزاحمت نہ کرنے لگے۔ شاعر کہتے ہیں "انسان کس قدر زبردست شاہکار ہے" — بیشک! — مگر اسی قدر ناکارہ بھی ہے وہ! — انسان زندگی کی قوتوں کا وہ اعلیٰ اور اعجاز انگیز نظام ہے جسے زندگی آج تک حاصل کر سکی ہے۔ زندہ چیزوں میں سب سے زیادہ شدید طور پر زندہ — ذی حیات منظم اجسام میں سب سے زیادہ صاحب قوت و شعور — لیکن ان تمام حقایق

کے باوجود کس قدر ناکارہ و پست ہے اس کا دماغ !! — اس کی حماقت کو ان حقایق نے کینہ و بیرحم بنا دیا ہے جو اس نے محنت و افلاس میں بے حجاب دیکھے ہیں — اس کی قوت تخئیل نے عزم کر لیا ہے کہ ان حقایق کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ بھوکوں مرجانا گوارا کرے گی۔ ان کو اپنی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے سراب در سراب پیدا کرتی چلی جائے گی — اور اس طرح خود کو ایک "اعلیٰ ذکاوت" کہہ کر پکارے گی ! — پھر لطف یہ ہے کہ یہ "حماقت" اور "قوت تخئیل" اپنے اپنے عیوب سے ایک دوسرے کو متہم کرتی ہیں — "حماقت" کہتی ہے کہ "تخئیل" حماقت ہے اور "تخئیل" کا دعویٰ ہے کہ "حماقت" جہل ہے — حالانکہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ "حماقت" تمام علم پر قابض ہو گئی ہے اور "تخئیل" تمام ذہانت پر۔

ابلیس — اور اس طرح ان دونوں نے ملکر ایک عجیب مضحکہ خیز صورت حالات پیدا کر دی ہے۔ جب میں فاسٹ کے اُس "خصوصی معاملہ" کے بند و بست میں مصروف تھا تو کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ انسان کی عقل و خرد نے اگر اب تک اس کے لئے کچھ کیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اسے وحشی درندوں سے زیادہ وحشی بنا دیا ہے۔ ایک شاندار صحت مند جسم ایک سو بیمار و مغرور فلسفیوں کے دماغوں کے برابر ہے

فرزان — یہ امر تم فراموش کر رہے ہو کہ بے دماغ جسمانی شان و شوکت کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ایسے بہت سے حیوانات جو دماغ کے علاوہ باقی ہر لحاظ سے انسان سے بے انتہا بڑے تھے عالم وجود میں آئے اور فنا ہو گئے — زمین پر اس قسم کے مہیب حیوانات رہ چکے ہیں جن کا ایک قدم بیس میل کا ہوتا تھا یا جن کے بادل جیسے پروں سے دن کی روشنی غائب ہو جاتی تھی — لیکن آج وہ سب کہاں ہیں ؟ — عجائب خانوں میں اُن کے چند آثار باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی اس قدر کمیاب و نامکمل کہ ان کی ایک چھوٹی سی ہڈی یا ایک دانت کی قیمت ایک ہزار سپاہیوں کی زندگی سے بھی زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ حیوانات زندہ تھے اور زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن دماغ سے محروم ہونے کے باعث وہ نہ سمجھ سکے کہ اس مقصد کی تکمیل کیسے کریں اور اس لئے خود کو تباہ کر دیا

ابلیس — اور کیا انسان اپنے دماغی پندار کے باوجود خود کو کچھ کم تباہ کر رہا ہے ؟ کیا تم نے حال ہی میں زمین کے نشیب و فراز میں گشت لگایا ہے ؟ — میں نے ایسا کیا ہے اور انسان کی تمام حیرتناک ایجادات کا معائنہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میں تمھیں بتاتا ہوں کہ زندگی کے سلسلہ میں انسان کچھ بھی ایجاد نہیں کرتا البتہ موت کے طریقے اختراع کرنے میں وہ خود فطرت سے آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنے کیمیاوی علوم اور مشینوں کے ذریعہ ایسا قتل عام کر ڈالتا ہے جو مہلک وبائیں اور قحط متحدہ طور پر بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے آج دنیا میں جو کسان ملتا ہے وہ آج بھی بالکل وہی کھاتا پیتا ہے جو دس ہزار سال پیشتر کے انسان کھاتے پیتے تھے۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے وہ ایک ہزار صدیوں میں بھی اتنا نہیں بدلا جتنا کہ ایک بلند مرتبہ خاتون کے لباس کی وضع دس بارہ ہفتوں میں بدل سکتی ہے۔ لیکن جب بھی انسان قتل و غارت کے لئے اُٹھتا ہے تو اپنے آبا و اجداد کے قدیم نیزہ و تیر اور تبر و کمان کو اپنے بہت پیچھے چھوڑ کر ایک ایسی مشین اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیتا ہے جو اس کی اُنگلی کے صرف ایک اشارہ پر تمام عنصری قوتوں کی مہلک بوچھار شروع کر دیتی ہے فنون امن سے انسان قطعی ناواقف ہے۔ میں نے اس کے سوتی کارخانے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ان کی مشینیں ایسی ہیں کہ اگر ایک کتے کو غذا کے بجائے روپیہ کی بھوک ہوتی تو وہ حریص کتا بھی ان کو ایجاد کر سکتا تھا۔ میں انسان کی بھدی ٹائپ کی مشینوں۔ شور کرنے والی گاڑیوں اور تھکا دینے والی سائیکلوں سے خوب واقف ہوں۔ ان سب کی حیثیت مشین گن اور سطح بحر کے نیچے چلنے والی تارپیڈو کشتی کے مقابلہ میں محض ایک کھلونے کی سی ہے۔ انسان کی صنعتی جد و جہد میں اس کی حرص و کاہلی کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں اُس کا دل تو اسلحہ میں ہے۔ "زندگی" کی وہ حیرتناک قوت جس پر تم کو اس حد تک غرور و ناز ہے دراصل "موت" کی قوت ہے — انسان اپنی طاقت کو تباہ کاری کے پیمانے سے ناپتا ہے — اس کا مذہب کیا ہے ؟ — مجھ سے نفرت کرنے کا ایک عذر لنگ ! — اس کا قانون کیا ہے ؟ — تمھیں تختۂ دار پر لٹکانے کا ایک بہانہ ! — اس کا اخلاق کیا ہے ؟ — جھوٹی تہذیب ! — پیدا کرنے کی محنت کے بغیر کھانے کا ایک بہانہ ! — اس کا فن مصوری کیا ہے ؟ — قتل و غارت گری کی تصاویر پر حریصانہ نظریں

ڈالنے کا ایک عذر ـــ اس کی سیاسیات کیا ہیں ؟ کسی جابر حکمراں کی پرستش صرف اس لئے کہ وہ ہلاک کر سکتا ہے ـــ یا پھر پارلیمنٹ کے ایوانوں میں ایک " جنگِ خروس " ! ـــ ابھی کچھ عرصہ ہوا میں نے اپنی ایک شام ان ــ کی ایک مشہور مجلس مقننہ میں بسر کی اور وزراء کو اعتراضات و سوالات کے جواب دیتے ہوئے سنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باورچی خانہ کی پتیلیاں ایک دوسرے کی سیاہی پر تقریریں کر رہی ہیں۔ جب میں وہاں سے واپس ہوا تو میں نے دروازے پر یہ قدیم مقولہ لکھ دیا ـــ " نہ سوال کروگے نہ جواب میں جھوٹ پاؤگے"۔ میں نے چند پیسوں میں ایک عام رسالہ خریدا اور اسے ایسے نوجوانوں کی تصاویر سے بھرا ہوا پایا جو ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک آدمی مر رہا تھا ـــ وہ لنڈن کے ایک کارخانہ کا مزدور تھا اور سات بچوں کا باپ ـــ اس نے ورثہ میں سترہ پونڈ چھوڑے ۔ اس کی بیوی نے یہ پوری رقم تجہیز و تکفین پر خرچ کر ڈالی اور اگلے دن اپنے بچوں کو ساتھ لیکر کارخانے پہونچ گئی ۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر سات پنس بھی صرف نہ کر سکی اور قانون نے اسے اس امر پر مجبور کیا کہ بچوں کی تعلیم خیرات و چندہ سے کی جائے ـــ لیکن " موت " کے لئے اس نے سب کچھ خرچ کر ڈالا ـــ موت کے تصور ہی سے انسانوں کی تخئیل جگمگا اٹھتی ہے اور انکی قوتوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں ۔ موت سے وہ محبت کرتے ہیں اور موت جتنی زیادہ بھیانک ہوتی ہے اتنا ہی وہ اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جہنم انکے فہم و ادراک سے بہت بلند ہے ۔ اس کا تصور وہ صرف ان دو انسانوں کے بیانات سے کرتے ہیں جو اپنی حماقت میں لاثانی گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک اطالوی تھا اور دوسرا انگریز ـــ اطالوی احمق نے جہنم کو ایک ایسا مقام بتلایا ہے جو کیچڑ۔ غلاظت ۔ آگ اور زہریلے سانپوں سے معمور ہے ـــ یعنی سراسر عقوبت و عذاب ـــ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انگریز نے میرے متعلق یہ بتلایا ہے کہ مجھے تیغ و تفنگ کے ذریعہ فردوس سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ آج تک ہر برطانوی باشندہ یہی یقین رکھتا ہے کہ یہ پورا احمقانہ افسانہ انجیل میں موجود ہے ۔ اُس نے میرے متعلق اور کیا کیا کہا یہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ ساری داستان ایک ایسی طویل نظم میں ہے جس کی وسعتوں کو نہ میں آج تک عبور کر سکا اور نہ میرے علاوہ کوئی اور ـــ بہر حال انسان کا شوق تباہکاری ہر جگہ اور زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے ۔ ادب کی اعلیٰ ترین شکل حزنیہ تمثیل قرار دی گئی ہے یعنی ایک ایسی تمثیل جس میں ہر ایک کردار قتل کر دیا جاتا ہے ۔ قدیم تاریخی حالات میں تم نے زلزلوں اور مہلک وباؤں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی اور تمھیں بتایا گیا ہوگا کہ یہ چیزیں خدا کی قدرت و جبروت کی مظہر اور انسان کی بے بضاعتی اور ہیچ ہونے کی دلیل ہیں ۔ آجکل تاریخی تصانیف لڑائیوں کی تصویریں کھینچتی ہیں ۔ جنگ میں انسانوں کی دو جماعتیں ایک دوسرے پر گولیوں اور پھٹنے والے گولوں کی بوچھار کرتی ہیں یہاں تک کہ ایک جماعت فرار اختیار کرتی ہے اور دوسری جماعت گھوڑے پر سوار ہو کر مفرورین کا تعاقب کرتی ہے اور اسی حالت میں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے ـــ اس کے بعد تاریخ بتاتی ہے کہ ان چیزوں سے سلطنتوں کی قدرت و جبروت اور مفتوحین کی بے بضاعتی ظاہر ہوتی ہے ۔ ایسی ہی لڑائیوں پر لوگ فرطِ مسرت سے دیوانہ وار سڑکوں پر چلاتے پھرتے ہیں اور اپنی حکومتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ کروروں روپیہ اس قتل و غارتگری پر صرف کیا جائے، حالانکہ انتہائی طاقتور وزراء کی بھی اتنی ہمت کبھی نہیں ہوتی کہ اس افلاس و بیماری کے رفع کرنے کے لئے ایک پیسہ بھی زیادہ خرچ کر دیں جس کے درمیان سے وہ خود روزانہ گزرتے رہتے ہیں۔ میں تمھیں ہزاروں مثالیں دے سکتا ہوں ۔ وہ سب اسی نتیجہ پر پہونچتی ہیں ـــ زمین پر جو طاقت حکمراں ہے وہ " زندگی " کی قوت نہیں بلکہ موت کی قوت ہے ـــ اور وہ باطنی ضرورت جس نے " زندگی " کو اس کوشش کی ہمت دلائی کہ خود کو انسانی مخلوق کی شکل میں منتظم کرلے کوئی بلند تر زندگی حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ تباہ کاری کا ایک زیادہ کارگر آلہ مطلوب تھا ـــ طاعون ۔ قحط ۔ زلزلہ ۔ طوفان ان سب کے اثرات عمل بہت منتشر اور تنگ تھے ـــ شیر اور گھڑیال کی بھوک بہت جلد فرو ہو جاتی تھی اور یہ جانور کافی سنگدل بھی نہ تھے ـــ ضرورت تو کسی ایسی چیز کی تھی جو ان سے زیادہ مستقل۔ زیادہ بے رحم اور زیادہ عقل و فراست سے تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو ـــ اور وہ چیز تھا " انسان " ! ـــ تباہ کاریوں کا موجد ـــ تختۂ دار اور " ماصی کی برقی کرسی " کا صناع ـــ تیغ و تفنگ اور مسموم گیس کا خالق ـــ خصوصاً انصاف ۔ فرض ۔ حب وطن اور اُن تمام عقاید کا بانی جن کے ذریعہ وہ لوگ بھی جن کو مہر و لطف کی ہوشمندی نصیب ہے انتہائی تباہ کار آلات سے زیادہ تباہ کار بن جانے پر مائل کئے جا سکتے ہیں۔

(باقی) مسعود جاوید

فنِ ڈراما نویسی

(بہ سلسلۂ ماسبق)

کردار نگاری

اب ہم ڈراما کے ایک اور اہم جزو کردار نگاری کا مطالعہ کریں گے۔ کیونکہ کردار نگاری ہی سے ایک ڈراما نویس اپنے ڈراما کو زندۂ جاوید بنا سکتا ہے۔ اور کردار نگاری ہی کے ذریعہ ڈراما کی افادی جمالیاتی اور فنکارانہ قدروں کا تعین کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز کردار نگاری میں یہ پیشِ نظر ہوتی ہے کہ ڈراما کے کردار کیا عام انسانوں سے مشابہ نہیں یا ما فوق البشر ہیں جن کا ہم نے اپنی روزانہ اور عام زندگی میں کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ ایسی ہستیاں جن سے کبھی ہمارا واسطہ اور تعلق نہ رہا ہو ہماری توجہ کو کبھی اپنی جانب منعطف نہیں کر سکتیں بلکہ اکثر ہمیں اکتا دینے والی ہوتے ہیں اس لئے ڈراما نویس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ڈرامہ کے کرداروں کے انتخاب میں ایسے لوگوں کو رکھے جو عام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈراما کے کرداروں کو ایسی جگہ سے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں جو ہمارے تجربات اور مشاہدات سے بالاتر ہوں۔ یہاں ایک چیز ہمیں ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ڈراما کی کردار نگاری اور ناول کی کردار نگاری میں فرق ہے۔ ناول نگار کو کردار نگاری میں جو آسانیاں حاصل ہیں وہ ڈراما نویس کو نہیں۔ ناول نگار اپنے کرداروں کو براہ راست پیش کرتا ہے۔ ان کے اوپر اپنی رائے دے سکتا ہے اور ان کے جذبات واحساسات کو بیان کر سکتا ہے لیکن ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا نہ تو وہ اپنے کرداروں پر کوئی رائے دے سکتا ہے اور نہ اپنے طور پر ناظر یا قاری کو ان کے متعلق کسی قسم کی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے عام طور پر کسی ناول کے کرداروں کے مقابلہ میں ڈراما کے کردار زیادہ کامیاب اور زندہ جاوید ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں نفسیات کا مطالعہ ادب کا ایک اہم جزو بن گیا ہے جو ناول نگار اور ڈراما نویس کے امتحان کی کسوٹی ہے۔ اس کسوٹی پر ناول نگار تو آسانی اور کامیابی سے گزر جاتا ہے مگر جس نے ڈراما نویس کے لئے یہ دقتیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ کس طرح ایک محدود دایرہ میں رہکر ان حالات اور جذبات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ پھر انسانی جذبات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کو فی الحال کسی سائنس کی مدد سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ کیونکہ ایک ہی واقعہ کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں اس سے ڈراما نویس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما نویس اس امتحان سے کامیابی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔ مگر ابھی ڈراما نویس کے ہاتھ میں پلاٹ اور پلاٹ میں متوازیت اور تقابل کا بڑا ہتھیار ہوتا ہے جس سے ایک واقعہ کے مختلف ردِ عمل کو ظاہر کیا جا سکتا ہے اور ان کے مختلف اثرات اور مختلف کرداروں کی نفسیات کو پیش کیا جا سکتا ہے ——— لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ڈراما نویس نے فطرتِ انسان کا گہرا مطالعہ کیا ہو وہ ان کے محرکات کو سمجھتا ہو جن سے انسانی جذبات حرکت پذیر ہوتے ہیں

جیسا کہ پلاٹ کی بحث میں ہم نے بتایا تھا کہ ڈراما کے لئے اختصار بہت ضروری ہے یہی اختصار کردار نگاری میں بھی لازمی ہے۔ ایک ناول نگار تو جس قدر چاہے اپنے کرداروں کو پھیلا سکتا ہے مگر ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا اور اختصار کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کو قدم قدم پر اختصار سے کام لینا پڑتا ہے ایک محدود دائرہ میں وہ اپنے کرداروں کی اندرونی و بیرونی کشمکش کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسکے سامنے کہانی کو آگے بڑھانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے ڈراما نویس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اختصار کا دامن نہ چھوڑے اور ممکن طریقے سے اختصار سے کام لے بعض ڈراما نویس یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے ڈرامے کو جس قدر پھیلائیں گے اسی قدر ان کے کردار نمایاں ہوں گے اور اس طرح مرکزی خیال کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی غلط ہے۔ کسی کردار اور پلاٹ کی بڑائی اس کے اختصار میں ہے نہ کہ اس کی طوالت میں۔

کردار نگاری میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ڈراما نویس اپنی توجہ اس خاص نکتہ اور کردار کی اس خاص خصوصیت پر مرکوز کر دے جس کو وہ خصوصیت کے ساتھ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس سے اختصار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وہ ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے بچ جائے گا جو اختصار کی راہ میں حائل ہیں پروفیسر ٹول میں لکھتے ہیں کہ "ڈرامہ میں ہیرو یا کسی خاص کردار کی اس خصوصیت کو نمایاں کرنا لازم ہے جو کہانی کے بہاؤ میں مدد دے، لیکن کسی کردار کو نمایاں کرنے کے لئے ایسے واقعات داخل نہیں کرنا چاہئے جو کردار کی شخصیت سے علٰحدہ ہیں، جو ڈرامہ پر براہ راست کسی پہلو سے اثر نہیں ڈالتے اور نہ کہانی جس مرکزی خیال پر گردش کر رہی ہے اس سے ان کا واسطہ اور تعلق ہے۔ اگر اس طرح کردار نگاری میں غیر ضروری خصوصیات کو اجاگر کیا گیا تو اس کو ہم ناواجب کردار نگاری کہیں گے۔

ڈراما میں اس کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ ڈراما نویس خود کو ڈراما کی شخصیتوں سے قطعی علٰحدہ رکھے۔ یہی چیز ڈراما اور ناول کی کردار نگاری میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ناول نگار خود کو کرداروں سے بے تعلق نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے احساسات و جذبات پر رائے دیتا ہے اور ان کی اندرونی کشمکش اور پوشیدہ محرکات کو بیان کرتا ہے ان کی اچھی اور بری خصوصیات پر اظہار خیال کرتا ہے مگر ڈراما نویس صرف ایک ناظر ہوتا ہے جو دور کھڑے ہو کر ان کا مطالعہ کرتا ہے اور کیمرہ کی طرح ہر اس چیز کو جو اس کے سامنے آتی ہے دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے اور خود بے تعلق رہتا ہے۔ اس سے ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ ڈراما نویس اپنے خیالات اور نظریات کو ڈراما کے ذریعہ پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ہر ڈرامہ میں مصنف کے نظریات اور رجحانات اکثر گوشوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں ـــــ ڈراما نویس کی کرداروں سے بے تعلقی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غایت اور مرکزی خیال سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور نظریات ڈراما ہی کے کرداروں کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی پلاٹ کے لئے کردار پیدا کئے جاتے ہیں، غلط ہے بلکہ کرداروں کی کشمکش، ان کے اندرونی جذبات اور بیرونی ماحول سے پلاٹ خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔ یہ پلاٹ نہیں ہوتا جو کرداروں کے احساسات و جذبات کا رخ بدل دیتا ہے بلکہ یہ کردار ہوتے ہیں جو پلاٹ کا رخ بدل دیتے ہیں۔ ٹھیکرے نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میں اپنے کرداروں کو کنٹرول نہیں کر سکتا میں ان کے ہاتھ میں ہوتا ہوں اور وہ جہاں چاہتے ہیں مجھے لیجاتے ہیں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ پلاٹ اور کرداروں کے تعلق میں پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ کرداروں کی ہے۔

مکالمے

ڈراما نویس ہر کردار کو مکالموں کے ذریعہ سے پیش کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ سے وہ کرداروں کی اندرونی کشمکش اور بیرونی مشکلات کا اظہار کرتا ہے۔ اس لئے مکالموں میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر وہ لفظ جو کسی کردار کے زبان سے نکلے اس کو کردار کی شخصیت اور فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور اس کے مکالموں کی بنیاد اسکے خیالات و جذبات پر ہونا چاہئے کیونکہ مکالموں میں ذراسی لغزش بھی کردار کو اس کے اصل منصب سے ہٹا سکتی ہے، جو مکالمے کسی ڈراما میں بولے جائیں وہ ایسے بکھرے ہوئے دانے نہ ہوں جن کے جمع کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو بلکہ ایسے دانے ہوں کہ جب وہ جمع کئے جائیں تو سب ملکر ایک وحدت میں منسلک کئے جا سکیں۔ اس سے اول تو اختصار کا مسئلہ حل ہو جائے گا دوسرے یہ کہ ہر کردار اپنے صحیح روپ میں نظر آنے لگے گا اور مرکزی خیال بھی نمایاں ہوگا۔

ڈراموں میں ہم کو اکثر ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو اکثر تنہا کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار بلند آواز سے کرتے ہیں اسے خود کلامی کہتے ہیں چونکہ ڈراما میں ناول کی طرح کسی چیز پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس مشکل کے پیش نظر ڈراما میں خود کلامی کا ذریعہ اختیار کیا گیا ہے، ہر چند یہ بات غیر فطری سی ہے مگر بعض اوقات حالات کے تحت اس کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ وہ بات جو کوئی شخص سوچ رہا ہے، اس کا اظہار ناظرین پر بھی ضروری ہوتا ہے تاہم جہاں تک ممکن ہو خود کلامی سے احتراز کرنا چاہئے۔ مکالموں کا فطری ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور برمحل ہونا بھی ضروری ہے۔ ان میں زبان پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی کردار ایسی زبان استعمال نہ کرے جو بناوٹی اور غیر فطری ہو۔

ڈراما کی اقسام

(ا) المیہ (Tragedy) ٹریجڈی ڈراما کی وہ قسم ہے جو سب سے زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے جس کا اختتام ناکامی پر ہوتا ہے اور جس میں سب سے اعلیٰ کردار عام طور پر اپنی کسی کمزوری کے باعث ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔

(ب) طربیہ (Comedy) ڈراما کی یہ قسم طربیہ انداز میں اختتام پذیر ہوتی ہے جس میں زندگی کو زیادہ سنجیدہ انداز میں پیش نہیں

کیا جاتا اور جس میں قہقہے ہوتے ہیں۔

(ج) المناک طربیہ (Tragic Comedy) یہ المیہ اور طربیہ ڈراموں کا ایک اتحاد ہوتا ہے جس کا اختتام عام طور پر طربیہ انداز میں ہوتا ہے۔

(د) تاریخی (Historical or chronicle Play) ایسے ڈراموں میں اہم اور نمایاں اشخاص کی زندگیوں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں اور ان اشخاص کے ساتھ چند ایسے کردار بھی شامل کر دئے جاتے ہیں جو صرف ذہنی تخلیق ہوتے ہیں۔

(ہ) سوانگ (Farce) یہ کامیڈی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس میں سوائے قہقہوں کے اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ قہقہے عام طور پر مبالغے اور مسخرے پن سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

(و) معجزاتی اور اخلاقی (Miracle & Morality) یہ ڈرامے عام طور پر گزشتہ زمانہ میں رائج تھے جس میں کسی پیغمبر یا کسی اولیا کی زندگی بیان کی جاتی تھی۔

(س) خیالی:- (Fantasy) اس میں ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے۔

ڈراما زندگی کی تنقید ہے

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈراما مرد اور عورتوں کی زندگی سے بحث کرتا ہے۔ ڈراما ان کے آپس کے تعلقات ان کے خیالات و محسوسات ان کے جذبات و محرکات۔ ان کی جد و جہد کی تفسیر ہے۔ زندگی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ فلسفی زندگی کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو کیا سمجھا ہے اور کیا محسوس کیا ہے اور زندگی کے متعلق ان کی کیا رائے ہے، اس پر ہزاروں کتابیں مختلف فلسفیوں کی موجود ہیں جن کو دیکھ کر ہم اس کے متعلق مختلف فلسفیوں کے خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ڈراما نگار بھی زندگی کے متعلق ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اکثر ڈراما نویس صرف زندگی کا مشاہدہ کرنے والے ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی کے متعلق سوچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اور اسی زاویۂ نگاہ سے اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ ہر ڈراما ایک خاص زمانہ اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ ایک ڈراما نویس کبھی اس ماحول اور اس زندگی کی عکاسی نہیں کرتا جس کا اس نے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ زندگی کے حقایق سے بحث کرتا ہے وہ صرف ان سچائیوں کو پیش کرتا ہے جن کا انکار نہیں۔

یہ خیال کرنا کہ ڈراما کی کہانی فرضی ہوتی ہے اس لئے اس کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں، غلط ہے، ادبی کہانیوں میں ہر چیز سچی ہوتی ہے۔ سوانح اور تاریخ کے۔ ڈراما نویس جو کہانی اپنے لئے منتخب کرتا ہے وہ آسمانی یا الہامی نہیں ہوتی، بلکہ ڈراما نویس کو اپنی کہانی اپنے ارد گرد کے چلتے پھرتے انسانوں میں ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے افراد کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ ان افراد میں اس کے اعزہ ہوتے ہیں۔ اس کے دوست ہوتے ہیں۔ اس کے افسر ہوتے ہیں۔ ماتحت ہوتے ہیں، دوکاندار ہوتے ہیں جن سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے گھر کے ملازم ہوتے ہیں اور ہر وہ شخص ہوتا ہے جس سے اس کا تعلق ہے اور پھر انھی کی زندگی کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی ایسا گوشہ مل جاتا ہے جس سے کوئی معمولی اور غیر اہم کہانی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی بظاہر معمولی نظر آتی ہے مگر ڈراما نویس کا ذہن معمولی واقعات سے بہت اہم اجزا تلاش کر لیتا ہے۔ ان واقعات میں تاریخی واقعات سے زیادہ سچائی ہوتی ہے کیونکہ تاریخ میں عام طور پر تعصب کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مگر ڈراما کی کہانی کے واقعات میں اس احتمال کی گنجائش نہیں، کیونکہ ڈراما نویس انہی سچے واقعات کو بیان کرتا ہے جس کا اس نے خود مطالعہ کیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ڈراما نویس ہمیشہ اپنے کرداروں کے چناؤ میں کسی ایسے کردار کی تلاش کرتا ہے جو آئڈیل ہوتا ہے؟۔ کیا ڈراما نویس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ایک آئڈیل کردار پیش کرے۔ اس کے جوابات مختلف ہیں۔ ایک ایسا شخص جو ہر چیز میں اخلاقی قدروں کو تلاش کرتا ہے اسکا جواب اثبات میں دے گا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اخلاقی قدروں کا معیار کیا ہے۔ کیا اخلاقی قدروں سے مراد وہ اصول ہیں جو فلسفیوں نے مقرر کئے ہیں اور کیا اخلاقی قدریں جو فلسفیوں نے مقرر کی ہیں ایسے مسلم الثبوت اصول ہیں جن سے انکار کی گنجائش نہیں۔ اور کیا وہ تمام اخلاقی قدریں جن کو فلسفیوں نے معیار اخلاق قرار دیا ہے کسی ایک فرد واحد میں مکمل طور پر مل سکتی ہیں؟ ان سب سوالات کا جواب اثبات میں ملنا مشکل ہے۔ ہر شخص میں

دھوتا ہے بلکہ خاموشی سے پردہ فلم یا اسٹیج پر یہ بتلا دیا جائے کہ دو مختلف اشخاص دو مختلف صابنوں سے اپنے کپڑے صاف کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص باوجود سخت محنت اور کوشش کے اپنے کپڑے صاف اور اجلے نہ کر سکا جبکہ دوسرا شخص جو اس مخصوص صابن سے اپنے کپڑے صاف کر رہا ہے انھیں اجلے اور صاف کرنے میں کامیاب ہوگیا تو دیکھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات اُتر جائے گی۔ یہی حال خیالات اور عقاید کا ہے۔ ڈراما خیالات اور عقاید کے پرچار کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اس کے ذریعہ جب خیالات اور عقاید پیش کئے جاتے ہیں تو وہ بہت زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں اس لئے اس دور میں ڈراموں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے زمانہ میں ڈرامہ صرف تفریح کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا اب وہ ایک اہم فرض انجام دینے لگا ہے۔ اس دور میں جبکہ عقاید کے اختلافات سے دوچار ہوتا ہے تو ڈرامہ میں تو اس کے ذہن کے لئے ایک محرک مل جاتا ہے اور پھر اس کے لئے جنسی دماغ کو ایک راستہ مل جاتا ہے جو اسے تاریکیوں میں نہیں بھٹکنے دیتا۔

ابراہیم یوسف

خریدارانِ "نگار" کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

۱۔ "نگار" کا سالانہ چندہ معہ سالنامہ کے (جس میں جنوری، فروری کے پرچے شامل ہوتے ہیں) آٹھ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن جو حضرات سالنامہ لینا نہ چاہیں گے اور سال میں صرف دس پرچوں پر قناعت کریں گے ان کے لئے چندہ بدستور چھ روپیہ رہے گا

۲۔ اگر آپ سالنامہ لینا نہیں چاہتے تو ازراہِ کرم جلد از جلد مطلع فرمایئے، کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے سالنامہ کی کاپیاں زاید نہیں چھاپی جائیں گی

۳۔ اگر آپ نے اطلاع نہیں دی تو سمجھا جائے گا کہ آپ سالنامہ لینا چاہتے ہیں اور وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہوتا ہے ـــــ ورنہ دو روپیہ چھ آنے کا وی، پی جائے گا

۴۔ جو حضرات سالنامہ لینا پسند نہ فرماویں گے اور اس کی اطلاع ہم کو دیدیں گے ان کی خدمت میں دسمبر ۱۹۵۱ء کے پرچے کے بعد مارچ ۱۹۵۲ء کا "نگار" بھیجا جائے گا

۵۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دس مہینے کے سال کا چندہ چھ روپیہ ہے اور پورے بارہ مہینے کے سال کا چندہ آٹھ روپیہ ہے۔

منیجر نگار

عشق

جمیل ایک یاقوت کبود کی طرح نیلگوں آسمان کے نیچے چمک رہی تھی اس کا چہرہ شکن سے بالکل صاف تھا۔ گویا وہ ایک خوبصورت عورت تھی ساکت و مطمئن جو سو رہی ہو اور کوئی دلکش خواب دیکھ رہی ہو

یہ دوشیزۂ صحرا تھی جس کے چاروں طرف خودرو پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا، گویا قدرت نے اس کے لئے حجلۂ گل آراستہ کیا ہے اور وہ اس کے اندر آرام سے سو رہی ہے

ہلکی ہلکی باد نسیم چل رہی تھی، گویا اسے نیند سے جگا رہی تھی تاکہ وہ درخت بلوط سے کچھ باتیں کرے جو خاموش جمیل کے اس خواب شیریں سے لطف اٹھا رہا تھا۔ آخر کار بلوط کے دل میں بھی ہیجان پیدا ہوا، جمیل کی طرف سر جھکا کر اپنا چہرہ اس کے بلوریں سینہ میں دیکھا اور کیفیت عشق اسکے اندر پیدا ہونے لگی

وہ سوچنے لگا کہ جمیل بھی عشق و محبت کے کتنے گہرے اور خوفناک راز اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور اس کے خوبصورت ساحل سے شیفتگان محبت نے کتنی قربانیاں پیش کی ہیں

زمانہ بہار کا تھا اور فضا بوئے محبت سے لبریز اس لئے بلوط میں بھی جمیل سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کا جذبہ قوی ہوگیا

جمیل کی عمر شاید ہزار سال سے بھی زیادہ تھی لیکن اس راز سے اس کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ بلوط کی عمر تین سو سال کی تھی اور صحرا کے تمام درخت اس سے واقف تھے

ان دونوں کی شناسائی گرمی کی ایک دوپہر سے شروع ہوئی تھی جب ایک طرف بلوط اپنا ٹھنڈا سایہ جمیل پر ڈال کر اس کو تمازت آفتاب سے بچا تھا اور دوسری طرف جمیل اپنے پانی سے اس کے ریشوں کی آبیاری کر رہی تھی

بلوط نے آہستہ آہستہ اپنا سر جھکایا اور بولا :- "اے جمیل، تیرا وجود بھی کتنا مبارک وجود ہے"

جمیل نے جواب دیا :- "نہیں بلوط تو زیادہ قابلِ تعریف ہے کیونکہ چڑیاں تیرے دامن میں گھونسلہ بناتی ہیں، اور تیری شاخوں پر بیٹھ کر چہچہے کرتی ہیں، مجھے یہ سعادت کہاں نصیب!

بلوط — "کیا تیری آغوش میں رنگین مچھلیاں پناہ نہیں لیتیں، یہ بھی تو خدائے محبت ہی کی بیٹیاں ہیں"

جمیل — "یہ صحیح ہے لیکن ان میں چڑیوں کا سا گرم خون کہاں، چڑیوں کے عشق میں جوش و خروش ہے اور مچھلیوں کا جذبۂ محبت سرد و خاموش۔ جو بہت جلد خستگی پیدا کر دیتا ہے"

بلوط — "مگر تیرے ساحل پر تو آدم زاد محبت کرنے والے آکر بیٹھتے ہیں، راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ کیسی کیسی خوبصورت لڑکیاں اپنے جسم کو برہنہ کر کے تیری آغوش میں کھیلتی ہیں۔ ان کا خون تو سرد نہیں؟"

جمیل — "لیکن یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ بھی میری ہی طرح عورت ہیں، مرد میرے پانی سے ڈرتے ہیں اور میری آغوش سے دور ہیں۔ علاوہ اس کے یہ لڑکیاں بہت بے ادب ہیں، میرے صاف و شفاف پانی کو مٹی سے گندہ کر دیتی ہیں، میری مچھلیوں کو پریشان اور میرے چہرے کو شکنوں سے بھر دیتی ہیں

جمیل و بلوط دونوں دفعتاً خاموش ہوگئے، کیونکہ ناگاہ انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان مرد ایک خوبصورت لڑکی کے کمر میں ہاتھ ڈالے ہو

خزاں چلا آرہا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو بلوط اور جمیل خاموشی سے دیکھتے رہے لیکن عورت زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکی، اسلئے جمیل بول اٹھی:
"یہ دونوں چار سال سے ہر موسم بہار میں یہاں آتے ہیں اور گھنٹوں تیرے تنہ کا سہارا لئے ہوئے راز و نیاز عشق میں مصروف رہتے ہیں"
بلوط بولا۔ "میں بھی ان دونوں کو پہچانتا ہوں، لیکن حیرت ہے کہ ان دونوں نے اب تک شادی نہیں کی"
جمیل ۔ "انسان عجیب مخلوق ہے، مرد سمجھتا ہے کہ شادی کے بعد آرزؤں کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ تم بھی تو مرد ہی ہو، تم کو تو ایسا نہ کہنا چاہئے"
یہ سنکر بلوط کو غصہ آیا لیکن اس نے ضبط کیا کیونکہ تین سو سال کے بعد اس کے لئے یہ پہلا موقعہ محبت کرنے کا تھا اور وہ اسکی فضا کو خراب کرنا نہ چاہتا تھا
یہ دونوں خاموشی سے اس جوڑے کا تماشہ دیکھنے لگے، کیونکہ تماشائے عشق بھی لطف سے خالی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوڑا اپنی جگہ سے اُٹھا تو جمیل نے بلوط سے کہا کہ:۔
"دیکھتے ہو ان کی بدتمیزی کہ کھانے کی خالی ٹوکری کس بدتمیزی کے ساتھ انھوں نے میرے سینہ پر کھینچ ماری"
بلوط ۔ "اور ادھر بھی تو دیکھو کہ میری پوست کو انھوں نے چاقو کی نوک سے زخمی کرکے کیا کیا۔ اور میری اذیت کی کوئی پروا نہ کی"
جمیل نے دیکھا کہ "دو دل تیر سے چھدے ہوئے" اس کے تنہ پر منقوش تھے اور اس کے نیچے دونوں کے نام درج تھے
جمیل یہ دیکھ کر خاموش ہوگئی اور پھر یہ سوچکر کہ غروب کا وقت ہے، بلوط کو عشق و محبت کی کچھ داستانیں سنانا چاہئے تاکہ اس کو نیند آجائے۔ یہ سوچ کر اس نے آواز بلند سے کہا:
"بلوط، کیا تم سو رہے ہو"
بلوط ۔ "نہیں میں سویا نہیں، بلکہ اس انسانی جوڑے کے انجام پر غور کر رہا ہوں"
جمیل ۔ "تمھیں کیوں اس کی فکر ہے"
بلوط ۔ "مجھے فکر اس لئے ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی لڑکیاں جب جوان ہونے کے بعد محبت کئے جانے کی خواہش اپنے اندر محسوس کرتی ہیں تو مردوں کی دلشکستگی کی بہت کم پروا کرتی ہیں"
جمیل ۔ "اس میں غلطی مردوں کی بھی ہے کہ وہ محبت کرتے ہی عورت کا سب کچھ اس سے فوراً چھین لینا چاہتے ہیں، خیر اس نوجوان کا ذکر چھوڑو۔ مجھے یاد ہے کہ جب ملکۂ الزبتھ انگلستان کی فرمانروا تھی اس کے ایک چاہنے والے کو نہایت تاریک و سرد قید خانہ میں بند کر دیا گیا"
بلوط ۔ "خوب کیا، کیونکہ ——"
جمیل ۔ "کیونکہ کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ سنو جو کچھ اس کے بعد ہوا پہلے اس کے دل میں خنجر پیوست کیا، پھر بھاری آہنی کڑے اس کے ہاتھ پاؤں میں باندھ دیئے گئے اور اس کی لاش معہ اس کے خنجر کے جو اس کے دل میں پوست تھا میرے اندر پھینکدی اور دس سال تک وہ خنجر مجھے دکھ پہونچاتا رہا، اس جوان کی ہڈیاں اب بھی میرے اندر موجود ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اسوقت انگلستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی"
بلوط ۔ "وہ کیونکر"
جمیل ۔ "اس طرح کہ یہ نوجوان الزبتھ کی تمام عشقبازیوں اور ہتھکنڈوں سے واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ الزبتھ کے جاسوسوں نے کس طرح اسپانیا کو جنگ پر مجبور کرکے اسے شکست سے دوچار کیا"
بلوط ۔ "چھوڑو ان قصوں کو، مجھے تاریخ سے دلچسپی نہیں، تم تو کچھ ایسی باتیں کرو جو موسم بہار میں دو محبت کرنے والے دلوں کو بھلی معلوم ہوں"
جمیل سمجھ گئی کہ اس وقت بلوط پر جذبۂ عشق غالب ہے اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ پھر بھی اسے اس محبت کی پائداری کا یقین نہ تھا

صبح کا وقت تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلوط نے بھی اپنی شاخوں کو بارش کے پانی سے دھو چکا تھا اور جمیل بھی ہوا کی مدد سے اپنی زلفوں میں پیچ و خم پیدا کر چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو لبھانے کے لئے آمادہ تھے۔

اسی وقت ایک نوجوان ایک خوبصورت لڑکی کو لئے ہوئے آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے پہونچا اور دونوں بلوط کے سایہ میں بیٹھ کر محبت کی سرگوشیوں میں مصروف ہوگئے۔ مرد انتہائی شیفتگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا اور لڑکی بھی حد درجہ خوشدلی کے ساتھ اس کے اعترافات محبت کو سن رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی اپنی جگہ سے اُٹھی، اپنے کپڑے اُتارے اور نہانے کا لباس پہن کر جھیل کے کنارے آئی اور پانی میں اُتر گئی

نوجوان نے پوچھا:۔ "پانی زیادہ سرد تو نہیں ہے"

جھیل نے یہ سوال سنکر بہت پیچ و تاب کھایا اور اپنے دل میں سوچا کہ "بہار اور سردی! کیا خوب، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ابھی تک اسرار عشق سے پوری طرح واقف نہیں ہے"۔ تاہم جھیل نے سورج کی کرن کی مدد سے اپنے پانی کی سردی کو دور کر لیا یہاں تک کہ جب لڑکی اس کے اندر داخل ہوئی تو وہ کافی گرم ہو چکا تھا

لڑکی نے اپنا قدم پانی میں رکھا تو بولی "پانی گرم ہے" اور آہستہ آہستہ کمر کمر پانی تک بڑھ گئی اور مسکرا کر نوجوان سے کہا کہ "تم بھی آجاؤ"۔ یہ کہکر لڑکی اور آگے بڑھی یہاں تک کہ جب پانی اس کے سینہ تک پہونچ گیا تو اس کا پاؤں دفعتاً پھسلا اور وہ چیخ اُٹھی کہ "مجھے بچاؤ میں ڈوب رہی ہوں"

نوجوان پیرنا نہیں جانتا تھا، لیکن بے اختیار اپنی محبوبہ کی مدد کے لئے پانی میں کود پڑا اور جب اپنی محبوبہ کے پاس پہونچا تو اس نے گردن میں ہاتھ ڈالدئے اور اسے بھی کھینچ کر پانی کی تہ تک لے گئی

یہ دیکھ کر بلوط کی رگ حمیت کو جنبش ہوئی اور جب آخری بار مرد پانی کی سطح سے اُبھرا تو اس نے اپنی شاخیں جھکا دیں جن کو پکڑ کر وہ نوجوان اوپر آگیا اور اپنی محبوبہ کو بھی باہر لے آیا

آفتاب ڈوبنے والا تھا اور یہ انسانی جوڑا ساحل سے اُٹھکر واپس چلا گیا اور بلوط و جھیل دونوں چاندنی رات میں تنہا رہ گئے

بلوط کی شاخ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک کر جھیل کی آغوش میں گرا

جھیل بولی:۔ "کیا تم رو رہے ہو"

بلوط۔ "اگر تو سنگدل نہ ہوتی تو تو بھی میری ہی طرح آنسو بہاتی۔ وہ کون ہے جو عشق کے ان دلدوز مناظر کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگا"

جھیل نے آسمان کی طرف نگاہ کی، اپنے صاف چہرہ کو چاند کے آئینہ میں دیکھا، مسکرائی اور اپنی زلفوں میں ہزار ہا شکنیں ڈالکر خاموش ہوگئی

ناگاہ اسی وقت شاخ بلوط پر ایک بلبل آیا اور چہکنے لگا۔ جھیل کا دل اس کا نغمہ سنکر بھر آیا اور بلوط سے بولی:۔ "تم مجھے سنگدل سمجھتے ہو اور اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ مجھ سے زیادہ رقیق القلب کوئی اور نہیں"

بلوط نے اپنا سر جھیل کی طرف جھکا دیا۔ چاند اور زیادہ چمک اُٹھا۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوگئی اور جھیل بولی کہ "میں خود ایک اشک سے زیادہ نہیں جو معلوم نہیں کس وقت ساکنان ملاء اعلیٰ کی آنکھوں سے ٹپکا تھا"

بلوط جھکا اور جھیل کو بوسہ دیکر خاموش ہوگیا

انیس اور امیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام

(شوکت بلگرامی)

انیس

یہ مشہور قصہ ہے کہ میر انیس مرحوم نے بچپن میں ایک بکری پالی تھی جس کو بہت چاہتے تھے جب وہ مری تو ان کو بہت ملال ہوا اور اُسکے مرنے پر یہ شعر کہا:

افسوس کہ دُنیا سے سفر کر گئی بکری　　　آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

سنا ہے کہ جب ان کے والد کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہونہار بیٹے کو بُلا کے مکرر اس شعر کو پڑھوایا، تعریف سے دل بڑھایا اور اس خوشی میں کہ صاحبزادہ نے پہلے پہل شعر کہا ہے اپنے بیگانوں میں مٹھائی تقسیم کی اور اس دھوم دھام سے انیس کی شاعری کی بسم اللہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس نئی روشنی کے زمانہ میں باتیں محبت کا چوچلا یا بچوں کے بہلانے کا طریقہ سمجھی جائیں یا بعض کوتہ نظر اس کو بزرگانِ قدیم کی سادہ دلی خیال کریں لیکن جن کو خدا نے چشمِ حقیقت نگر عطا کی ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ باتیں معمولی باتیں نہیں بلکہ وحشی دلوں کے تسخیر کی گھاتیں ہیں۔ کاش ہم سمجھتے کہ مناسب طبع تعلیم کیا چیز ہے۔ ایک کاواک لکیریں کھینچنے والا لڑکا ایک دیا سلائی کی ڈبیوں کو جوڑ کے مکان بنانے والا بچہ بہترین آرٹسٹ اور اعلیٰ ترین انجینیر ہو سکتا ہے اور اُس سے بہت کچھ منفعت حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کو طبع خداداد سے کام لینے کا موقع دیا جائے لیکن افسوس ہے ہم رجحان طبیعت کا مطلق خیال نہیں کرتے اور مختلف الالوان طبیعتوں کو مروجہ تعلیم یونیورسٹی کے سیاہ رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ۔ 'کار بوزینہ نیست نجاری' اس بیان سے غرض یہ ہے کہ میر انیس مرحوم شاعری کا خداداد جوہر اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کو اس کے اظہار کا پورا موقع ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دُنیائے شاعری میں انیس کا مثل نہیں نظر آتا۔ اس کو بھی رجحانِ طبیعت ہی کا کرشمہ کہنا چاہئے کہ میر انیس کی زبان سے پہلا شعر نکلا تو مرثیہ کا۔ یہ تو ابتدا کا حال تھا اب انتہا کا قصہ سُنئے۔ میر آغا حسین صاحب جو عمایدین دہلی میں ہیں اور آجکل حیدر آباد دکن میں تشریف رکھتے ہیں۔ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ حالت مرض الموت میں میر صاحب کی عیادت کو گیا تو معلوم ہوا کہ زنانخانہ میں تشریف رکھتے ہیں اطلاع کی تو پردہ کروا کے بلالیا اندر گیا تو دیکھا میر صاحب مرحوم لحاف سے منھ ڈھانپے لیٹے ہوئے ہیں اور میر نفیس مرحوم پہلو میں بیٹھے ہیں میں بھی انھیں کے پاس بیٹھ گیا اور پکار کے پوچھا کہ میر صاحب مزاج کیسا ہے۔ اس کے جواب میں لحاف کے اندر ہی سے میر صاحب نے فرمایا کہ کیا کہوں

ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی　　　ایک گھٹنے سے جوانی کے بڑھا یا کیا کیا کچھ

میں چونکہ ان کی خدمت میں گستاخ تھا اس لئے بے باکانہ عرض کیا کہ حضرت یہ تو آپ میر تقی مرحوم کی زبانی اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔ یہ سنکے میر صاحب نے منھ سے لحاف ہٹایا چند سکنڈ تک بغور میری طرف دیکھتے رہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فرمایا کہ ؎

اک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہو گئے　　　تو ہی اے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے

میر آغا حسین صاحب فرماتے تھے کہ آج تک وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے اور اُس نورانی صورت کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں جو پیوند خاک ہو گئی۔

راقم حروف نے ایک دفعہ بر سبیل تذکرہ یہ حکایت سید علی صاحب یونس سے (جو میر انیس مرحوم کے شاگرد اور ان کے خاص ملنے والوں میں ہیں) بیان کی تو انھوں نے اس کو سُن کے فرمایا کہ میں تم کو وہ شعر سناؤں جس کے بعد میر انیس مرحوم نے کوئی شعر نہیں کیا۔ یعنی انتقال کی صبح یا اس کے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میر صاحب جو سو کے اُٹھے تو میر مونس مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ شب کو ایک مطلع خیال میں آیا ہے اس کو لکھ لو ہمارے بعد خواہ اُس پر سلام کہنا، خواہ غزل (چونکہ میر مونس مرحوم میر صاحب ہمیشہ غزل گوئی سے منع کرتے تھے اس لئے غزل کہنے کا اشارہ اس غرض سے کیا کہ ہمارے بعد تم کو غزل گوئی سے کون روکے گا) اور اسکے بعد یہ مطلع جو حقیقتاً انکی شاعری کا مقطع تھا پڑھا ؎

سب عزیز و اقربا نا آشنا ہو جائیں گے　　∴　　قبر میں پیوند جتنے ہیں جدا ہو جائیں گے

اللہ اللہ وہ محبت کا پتلا، وہ وفا کا بندہ جس نے بچپن میں ایک بے زبان کی جدائی پر اظہار تاسف کیا تھا، آخری وقت کس حسرت و افسوس کے ساتھ دُنیا کی ناپائیدار محبت کا ذکر کر رہا ہے اور اپنے عزیز و احباب سے کس قدر بیگانہ اور ناامید ہو کے دُنیا سے جا رہا ہے۔ (اُردوئے معلیٰ ۱۹۱۱ء)

امیر ہر چیز کی ابتدا چونکہ بہت خفیف ہوتی ہے اس لئے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ باتیں منتہائے کمال کو پہونچ جاتی ہیں اسوقت ہماری آنکھیں ان ابتدائی خفیف باتوں کو ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔ جنھوں نے ان کو معراج کمال پر پہونچایا۔ اس کا خیال تو اکثر لوگ کرتے ہیں کہ:۔

" یہ بچپنا ہے تو اس کا شباب کیا ہوگا " لیکن ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جو عمر رفتہ کی یاد تازہ رکھیں اور اس سے سبق لیں۔ چونکہ میرا افسردہ اور مرا ہوا دل اسی لئے بنایا گیا ہے کہ گزرے ہوؤں کی یاد میں رویا کرے اور ان کے انجام کو سوچا کرے۔ اس لئے سوا اس کے اور کوئی مضمون مجھے ملتا ہی نہیں کہ ان کی باتیں کروں اور سر دھنوں۔ اس کے قبل اُردوئے معلیٰ کے کسی پرچے میں " انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام " نذر ناظرین کر چکا ہوں اور آج ایک دوسرے مسیحائے سخن یعنی حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کا ابتدائی اور انتہائی کلام سناتا ہوں

میرے جلیل القدر دوست حافظ جلیل حسن صاحب جلیل بیان فرماتے تھے کہ حضرت کو بچپن ہی سے شاعری کا چسکا تھا یہ خبر جب انکے والد ماجد کو پہونچی تو ایکدن شب کو جبکہ منشی صاحب مرحوم بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے ان کے والد ماجد نے پوچھا " میاں ہم نے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو ذرا ہم بھی سنیں کہ ہمارا امیر کیسے شعر کہتا ہے " یہ سنکر امیر مرحوم پہلے تو بہت انکار کرتے رہے مگر شفیق باپ کے محبت آمیز اصرار سے مجبور ہو کر عرض کیا کہ گھر میں سب لوگ کہا کرتے ہیں کہ برسات گزری جاتی ہے اور بارش نہیں ہوتی اسی مضمون کو کہا ہے اور اس تمہید کے بعد یہ شعر جو حضرت نے اسی زمانہ میں تصنیف فرمایا تھا عرض کیا کہ:۔

ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی
اس غم سے ہے یا رو مرے اشکوں کی روانی

یہ سن کے شفیق باپ نے تعریف سے دل بڑھایا کہ بھئی شعر تو بہت صاف ہے اور مضمون بھی سچا لیکن تمھارا سن ابھی اس مشغلہ کے لئے موزوں نہیں پہلے اچھی طرح پڑھ لکھ لو اُس کے بعد شعر کہنا۔ یہ روایت اس زمانہ کی ہے جب منشی صاحب پندرہ برس کے تھے ممکن ہے کہ اس کے قبل انھوں نے اور بھی شعر کہے ہوں، لیکن عموماً لوگوں کو جو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوا وہ اسی واقعہ سے اس لئے اگر ہم اس شعر کو امیر کا ابتدائی کلام کہیں تو بیجا نہیں یہ جو کہتے ہیں کہ بچے کے پاؤں پالنے میں معلوم ہوتے ہیں بالکل سچ ہے۔ اگر ہم اس شعر کی خوبی معلوم کرنا چاہیں تو اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اسی مضمون کو اسی بحر و قافیہ میں موزوں کر کے دیکھیں، میرا خیال ہے کہ اس امتحان کے بعد ہر شخص کو یہ کہنا پڑے گا کہ:۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیداست۔ پندرہ برس کے لڑکے کا خیال تو آپ سن چکے اب دیکھئے کہ بہتر برس کا مشاق سخن کیا کہتا ہے ۱۳۱۸ھ کا واقعہ ہے کہ جب امیر مرحوم نے حیدر آباد کا سفر کیا جو یقیناً ان کا سفر آخرت تھا تو راہ میں ایک مسدس اعلیحضرت حضور نظام کی مدح میں تصنیف فرمایا تھا جو چھپ چکا ہے اور وہ بھی ان کا آخر کلام سمجھا جا سکتا ہے لیکن حقیقتاً اس کے بعد بھی انھوں نے ایک غزل کے چند شعر کہے تھے جس کا مقطع جو حقیقت میں امیر مرحوم کی شاعری کا مقطع ہے ان کا انتہائی کلام ہے اور وہ یہ ہے کہ

شاعری میں امیر کی خاطر میر اپنی زبان چھوڑ گئے

افسوس ہے کہ تیر رہے نہ ان کی زبان، خالی باتیں رہ گئی ہیں، ہائے مجھے استاد مرحوم کا یہ کہنا کسی طرح نہیں بھولتا کہ:۔

ہے آج جو سرگزشت اپنی کل اس کی کہانیاں بنیں گی

(اُردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۱۱ء)

شہاب کی سرگزشت

باب المراسلۃ والمناظرہ

زبان اور رسم الخط

(فرمان فتحپوری)

پروفیسر احتشام صاحب کی یہ تحقیق کہ "زبان اور اُس کے رسم الخط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے" اور "کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھنے سے اس کی ہیئت و حقیقت پر اثر نہیں پڑتا" میرے نزدیک صداقت سے عاری ہے اور پروفیسر موصوف نے جو نتائج مرتب فرمائے ہیں اُن میں عجلت سے کام لیا گیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر اُن کی تحریر خود اُن کے دعووں کی تردید کرتی ہے

"زبان نام ہے مجموعۂ الفاظ کا اور الفاظ مرکب ہیں اصوات سے۔ اصوات نام ہے اُن تصاویر۔ خطوط۔ نقوش۔ علامات یا نشانات کا جو ارتقا کی منازل طے کر کے آج حروف کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں اور اُن کا مقصد ماسوائے اظہار معنی کچھ نہیں ہے۔ مدیر نگار نے احتشام صاحب کے مضمون پر تعارفی نوٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "رسم الخط نام ہے چند نقوش کا جو تلفظ کے ادا یا اظہار کے لئے فرض کر لئے گئے ہیں" اس تعریف میں ایک بڑی کمی ہے وہ یہ کہ رسم الخط کو تلفظ کے ساتھ اظہار معنی کا بھی وسیلہ نہیں قرار دیا گیا

زبان کے آغاز میں جب کوئی آواز کسی کے منہ سے نکلی ہوگی تو آواز دینے والے نے اپنے مقصود خیال کو سامع تک پہونچانے کے لئے شے مقصود بجنسہ پیش کی ہوگی یا مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے مشار الیہ کی تصویر یا اس سے مناسبت رکھنے والے خطوط و نقوش بنا دئے ہوں گے مرئی اور خارجی اشیا کے اظہار کیلئے جو آوازیں نکلی ہوں گی ان کے ابلاغ میں چنداں سہولت رہی ہوگی لیکن غیر مرئی اور داخلی کوائف کو سمجھانے کے لئے بڑی دشواریاں پیش آئی ہوں گی آج بھی ہم خارجی اثرات کو سمجھانے اور سمجھنے میں اتنی دقت محسوس نہیں کرتے جتنی امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ کو سمجھانے میں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف احساسات (مثلاً عشق۔ حسن۔ خوشی۔ غم۔ غصہ وغیرہ) کے معنی کا تعین ہو سکا اور نہ آج تک اُن کی جامع اور متفق الخیال تعریفیں مرتب ہو سکیں جب ہم اس مسئلہ کو عقل و فکر کے میزان پر تولتے ہیں تو صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احساسات (Feelings) و جذبات (Emotions) کے اظہار معنی کے لئے بھی کوئی نہ کوئی نقش یا تصویر ہی بنائی گئی ہوگی۔ اس طرح خارجی اور داخلی کوائف کے مطالب کا اظہار صرف نقوش یا حروف سے ممکن تھا جو آج بھی ادائے معنی کے لئے حروف استعمال کئے جاتے ہیں اور انھیں حروف کا دوسرا نام رسم الخط ہے۔ پروفیسر احتشام صاحب بھی زبان کے Origin تاریخ۔ ارتقاء و تعمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "الفاظ خیالوں ملفوظی۔ یا صوتی علامت کہے جا سکتے ہیں اور اُن کی تصویریں تحریری علامات۔ اس تحریری علامت کا مقصد کسی آواز یا آوازوں کے مجموعہ یا خیال کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ہے......... تصویری تحریر خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتدائی کوشش تھی...... لیکن جب انسانی ذہن استوار ہوا اور اس کی تحریری طاقت بڑھی تو اس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی...... اور خیال کیا جاتا ہے کہ حروف تہجی اُنھیں تصویری تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف کوئی نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور اُن کی ابتدائی شکل اس مفہوم یا معنی سے صوری مماثلت رکھتا ہے"۔ احتشام صاحب کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی میری طرح حروف یا رسم الخط کو ادائے تلفظ و معنی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان اور اس کے رسم الخط میں معنوی تعلق ہے نہ یہ کہ "اُن میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے" میں سمجھتا ہوں کہ احتشام صاحب نے دانستہ انجام کار کو نظر انداز کر دیا ہے اور خواہ مخواہ اس مسئلہ کی بحث کو طول پکڑنے کا موقع دیا ہے

اگر اصوات اور حروف کے ربط کو اس لئے نہیں تسلیم کیا جاتا کہ حروف مفروضہ ہیں اور اُن کے دیکھنے سے آواز کا پتہ نہیں چلتا تو میں یہ کہوں گا کہ حروف کی طرح معانی بھی مفروضہ ہیں اور کسی لفظ کو سنکر یا پڑھ کر ہم اس کے معنی تک نہیں پہونچ سکتے اور یہی وجہ ہے کہ ہر چیز و ہر کیفیت کے لئے کئی کئی آوازیں یا الفاظ وجود میں آئے۔ اگر کوئی لفظ اپنے مفہوم کو بلا شرکتِ نقش یا حرف دوسروں تک پہونچا سکتا تو مختلف زبانیں بھی وجود میں نہ آتیں لیکن لفظ کے معنی مفروضہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ لفظ اور معنی میں کوئی ربط نہیں یا کسی وقت معنی کو لفظ سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ کوشش کی جائے تو کیا غیر متعین یا بے معنی الفاظ کے مجموعہ پر بھی زبان کا اطلاق ہو سکے گا۔ اگر نہیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ رسم الخط اور زبان میں معنوی ربط ہے اور رسم الخط مفروضہ ہونے کے باوجود زبان سے جدا نہیں ہو سکتا یہ ضرور ہے کہ زبان یا اصوات کا آغاز رسم الخط سے پہلے ہوا لیکن یہ کہ "وہ ایک دوسرے کے پابند نہیں" یا اُن میں باطنی ربط نہیں حقیقت سے دور ہے

اگر حروف یا رسم الخط کا تعلق براہ راست تلفظ و معنی سے ہے تو پھر یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ "اگر کسی زبان کو کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھا جائے تو اُس کی اصلیت وحقیقت پر حرف نہ آئے گا۔ ہر خطۂ زمین کے باشندے اپنے گرد و پیش قدرتی حالت۔ آب ہوا۔ موسم۔ پیداوار اور معاشرہ سے متاثر ہوتے ہیں اور اُن کے اصوات پر بھی مقامی فضا کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر خطۂ زمین کے لوگوں کے اصوات یا الفاظ یا زبان جداگانہ ہے اور اُن کے اظہار مفہوم و ادائے تلفظ کے لئے جداگانہ نقوش یا حروف یا رسم الخط میں وضع کر لئے گئے ہیں۔ ورنہ تمام زبانوں کے حروف تہجی اصوات و اشکال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مماثل ہوتے۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے تو پھر ایک زبان کے حروف تہجی یا رسم الخط کو کسی دوسری زبان پر کس طرح منڈھا جا سکتا ہے

احتشام صاحب نے ایک ادنیٰ مثال یعنی (High) کو اُردو میں لکھ کر یہ کلیہ قایم کر لیا کہ ہر انگریزی لفظ کو اُردو رسم الخط میں لکھا جا سکتا ہے اور کہیں بھی تلفظ یا معنی میں التباس نہ ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ موصوف نے صرف لفظ "ہائی" کو بطور مثال کیوں پیش کیا اگر حرف H کی آواز سمجھانی مقصود تھی تو Head اور Hid یا Hell اور Hill کو اُردو رسم الخط میں لکھتے تاکہ انھیں پہلے ہی قدم پر دشواری کا احساس ہو جاتا

انگریزی میں مشابہ الصوت الفاظ کی کثرت ہے اور جب اُن کی ملفوظی وصوتی صورتیں اُردو رسم الخط میں بالکل یکساں ہو جائیں گی تو اُنکی تفہیم میں ضرور دقت ہوگی مثلاً Air اور Heir - I اور Eye - Birth اور Berth - Whole اور Hole - Dye اور Die - Foul اور Fowl - اور Loose - Lose، Liar اور Lawyer - for اور four - Son اور Sun اور Sea اور See وغیرہ کو اگر اُردو رسم الخط میں لکھا جائے تو دونوں لفظوں کی صورت اور تلفظ ایک دوسرے سے مماثل ہو جائے گا اور چونکہ انگریزی میں ہم آواز الفاظ کی بہتات ہے اس لئے مستثنیات کے اصول بھی کام نہ دیں گے مشابہ الصوت الفاظ سے قطع نظر اکثر مختلف الصوت الفاظ کا تلفظ ناممکن ہو جائے گی مثلاً Mean - Man اور Main کو اُردو میں صرف "مین" لکھا جائے گا اس طرح fair اور fear صرف "فیر" - Chair اور Cheer کو محض "چیر" لکھا جا سکیگا اور اس طرح امتیاز تلفظ میں بڑی دشواریاں حایل ہوں گی۔ اکثر الفاظ کا تلفظ اُردو رسم الخط میں ادا کرنا ناممکن ہوگا جیسے Pure اور Sure کو ترتیب سے "پور" اور "شور" لکھا جائے گا اور ان کو اُردو میں انگریزی کے دوسرے بامعنی لفظ Poor اور Shore تصور کیا جا سکتا ہے اس طرح Catch اور Badge، Batch اُردو رسم الخط میں "کیچ"، "بیج" اور "بیچ" ہو جائیں اور ان سے اُردو کے دوسرے بامعنی الفاظ مراد ہو سکتے ہیں۔ انگریزی زبان میں Vowel یعنی a، e، i، o اور u اگرچہ انفرادی آوازیں رکھتے ہیں—لیکن الفاظ میں اُن کی آوازیں مماثل ہو جاتی ہیں جیسے all - early - sir، ought اور ugly -- ظاہر ہے کہ ان کو اُردو میں الف یا ع سے لکھا جائے گا اور مفاہیم کو سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی C اور S کی آوازوں کو ث - س - ص میں ہر حرف ادا کر سکتا ہے اور C، q اور K کی آواز رکھنے والے الفاظ مثلاً Coal، calm، quota اور kite

نے اپنے مقالہ (نگار۔ اگست ۱۹۵۶ء) میں اس بحث کو آگے بڑھانے پر زور دیا ہے اور حروف کے متعلق ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ انسان نے جب بولنا سیکھا تو اول ادائے مطالب کے لئے مختلف الفاظ وضع کر لئے اور اُن سے کام لیتا رہا۔ عرصۂ دراز کے بعد جب مختلف معاشرتی ضروریات سے مجبور ہو کر فنِ تحریر ایجاد کرتا چاہا تو اس کو سب سے پہلے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو الفاظ وہ بولتا ہے ان کا تجزیہ کر کے معلوم کرے کہ وہ کتنی مختلف آوازوں سے مرکب ہیں اور اس طرح وہ آوازیں ہر زبان میں بیس اور تیس کے درمیان نکلیں (اس تعداد میں ایک دو زبانوں کے علاوہ کہیں تفاوت نہیں ہے) اُس نے اُن تمام آوازوں کی علیحدہ شکلیں وضع کر لیں اور اُن شکلوں کے علیحدہ نام بھی رکھ لئے۔ اس مسئلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ مختلف ملکوں کے رہنے والوں نے زبان سے نکلی ہوئی آوازوں میں بہت کچھ اختلاف پایا۔ جیسا کہ ہم مختصراً اپنے گزشتہ مقالہ میں ظاہر کر چکے ہیں۔ عرب اور فارس میں ہمیں ت ملتی ہے مگر اس کے بالکل ہی قریب دوسری آواز ہے ٹ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندوستان اور انگلستان میں ٹ ہے اور ت موجود نہیں۔ یہی حال د اور ڈ۔ ر اور ڑ کا ہے۔ لہجہ کی تعمیر احول، آب و ہوا، حلق و زبان کی ساخت، مشاغل زندگی، مذاق طبیعت اور رجحان طبعی سے مجموعی طور پر ہوتی ہے۔ اس میں انسان کے قصد و ارادہ کو مطلق دخل نہ تھا، زبان در اصل ہی کو ہم الفاظ کی بنیاد کہتے ہیں۔ ان میں تغیر یا کمی کرنا زبان کو بدل دینے کے مترادف ہے۔ انھیں آوازوں کو جو انسان کی زبان سے ادا ہوتی تھیں بعد کو مختلف اشکال (یعنی حروف) کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور اس طرح زبان اور رسم خط دونوں کی بنیاد ساتھ ساتھ پڑی۔

حروف کی ان تحریری شکلوں نے ایک طرف اُن تمام آوازوں کو مخصوص شکل عطا کر دی اور دوسری طرف اس کا موقع فراہم کر دیا کہ زبان ترقی کے مدارج طے کرے، ظاہر ہے کہ مختلف قوموں نے حروف کی مختلف شکلیں وضع کیں اور اگر اس میں نفسیات کا دخل بھی تسلیم کیا جا سکے تو یہ مختلف قوموں کے اختلاف مذاق و ذہنیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ابتدائی عربی رسم الخط میں حتیٰ کہ خط کوفی تک میں دوائر موجود نہیں ہیں۔ دوائر کی ابتدا خطِ نسخ سے ہوئی ہے۔ موجودہ انگریزی رسم خط اور بعض دیگر خطوط میں دوائر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حروف کی شکلیں اس طرح وضع کی گئیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جا سکیں۔ مثلاً عربی کے ب اور ا کو باہمی ترکیب دے کر لکھا جائے گا تو "با" ہوگا مگر عربی کے ب اور انگریزی a کو باہمی ترکیب دئے جانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح دیوناگری حروف کے ساتھ اور کسی زبان کے حروف نہیں ملائے جا سکتے۔ عرب میں سب سے پہلے حمیری رسم خط میں لکھی جاتی تھی۔ اس کے بعد خط کوفی اختیار کر لیا گیا اور تقریباً دوسری یا تیسری صدی ہجری میں خط نسخ وضع ہوا اور اس کے بعد جیسے جیسے قوم کا مذاق نکھرتا گیا مختلف اقسام کے خطوط وضع ہوتے گئے۔ نستعلیق۔ طغرا۔ شفیعہ۔ فردوسیہ۔ شکست وغیرہ وغیرہ۔ عرب کی تہذیبی اور معاشرتی ترقی کی مکمل تاریخ ہمارے سامنے ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسم خط کی ترقی میں قومی نفسیات کا کتنا دخل ہے۔ عرب کی سادہ مزاجی تقریباً بنو امیہ کے اخیر دور تک باقی رہی اور اس وقت تک عرب صرف اسلامی احکام و اوامر سے واقف تھے۔ ہارون رشید اور مامون اعظم کے عہد میں دیگر علوم و فنون بھی عربوں نے سیکھنے شروع کئے اور ایرانی قوم کے مسلمان ہو جانے کے بعد اُن سے میل جول کے باعث عرب قوم میں تکلفات اور نزاکتیں پیدا ہونا شروع ہوئیں اور قومی ذہنیت کے اس تغیر کا اثر رسم خط پر بھی ہوا اور خط نسخ ایجاد کیا گیا جس میں دوائر پیدا ہوئے اور اشکال حروف نستعلیق سے قریب تر ہو گئے۔ اس تمام بحث سے ہمارا مدعا یہ امر ظاہر کرنا ہے کہ ہر قوم کے رسم خط میں اُس قوم کی مخصوص ذہنیت اور انفرادی قومی نفسیات لازماً شامل ہوتی ہے اور زبان کی تعمیر بھی اسی قومی نفسیات کے تحت ہوتی ہے۔ جس طرح رسم خط ایک قوم کے نفسیاتی احوال اور مذاق و رجحان کا پروردہ ہوا کرتا ہے وہی حالت زبان کی بھی ہے اور ہم نے اپنے گزشتہ مقالہ (نگار۔ اگست ۱۹۵۶ء) میں اس امر کو واضح کیا تھا کہ ایک زبان کو صرف اُسی کے مخصوص رسم خط میں لکھا جانا ہے اور چونکہ زبان کی تعمیر میں قومی نفسیات شامل ہے اس لئے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسم خط میں بھی وہی نفسیات کارفرما ہوگی۔ عربی رسم خط میں مختصر نویسی کی صفت موجود ہے وہ غالباً دنیا کے کسی دوسرے رسم خط میں نہیں ہے، اس سے قومی نفسیات کا رسم خط میں دخل صاف ظاہر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ رسم خط اس قوم کی ذہنی خصوصیات اور قومی نفسیات سے وابستہ ہوتا ہے تو پھر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ رسم خط زبان کی ترقی میں بھی ممد و معاون ہوتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو لہجہ سے متعلق ہے وہ مختلف زبانوں کے مختلف حروف ہیں۔ عربی کا ثا جب انگریزی رسم خط میں لکھنے کی کوشش کی گئی تو حروف شیشا

ہے تو (Th) لکھتے ہیں۔ حالانکہ خود انگریزی زبان میں (Th) کا تلفظ دو طرح ہوتا ہے ایک (تھ) جیسے Think میں ہے۔ دوسرے ذال کی آواز دیتا ہے جیسے The میں۔ عربی میں اس کی جو آواز ہے اس کے لئے انگریزی میں مسلّم طور پر کوئی حرف موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ٹرکی کے سلطان عثمان کو انگریز مورخین نے Othman لکھا ہے۔ بعض معمولی وجہ کے مصنفین ثا کو S بھی کہتے ہیں جیسے Osman ہیں کوئی صحیح اطلاق ثا کا نظر نہیں آتا اس کی وجہ یہی ہے کہ انگریز قوم عربی کے حرف ثا کا صحیح تلفظ ادا کر ہی نہیں سکتی۔[1] اسی طرح عربی کا خا ہے جسکو انگریزی رسم خط میں Kh سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس Kh سے جو آواز اصولاً پیدا ہونا چاہئے وہ حرف "کھا" سے ادا ہوتی ہے۔ درۂ خیبر کو انگریز مورخین Khyber Pass کہتے ہیں اور گفتگو میں بھی بجائے "خیبر" کے "کھیبر پاس" کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر قوم تلفظ ہی کے اصول پر حروف وضع کرتی ہے اور حروف اُس قوم کی زبان کو اس کے اپنے اصلی احوال پر قایم رہنے اور ترقی دینے کا باعث ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر تلفظ زبان کی ترقی کا باعث ہے تو رسم خط کو بھی یقیناً ترقی کا باعث ہونا چاہئے۔

---

[1] بات یہ نہیں ہے بلکہ خود ترکی زبان میں عثمان کا تلفظ عثمان ہے اور انگریزی مصنفین انھیں کے تلفظ کے پیش نظر عثمان کو Othman لکھتے ہیں (نیاز)

ایک قدیم کتب خانہ کی بعض نادر کتابیں

غیاث اللغات مطبوعہ ۱۸۸۳ء (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

سواطع الالہام از فیضی (عربی) ۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

منتخب اللغات دارا شکوہی (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

علم جفر و شعبدہ جات (اُردو) ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

مثنوی یوسف زلیخا جامی (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ تین روپیہ

مصداق الرمل، انوار الرمل (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

مراثی انیس ۔۔۔۔۔۔ چھ روپیہ

نالۂ عندلیب (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

ترجمہ حدائق البلاغت (اُردو) ۔۔۔۔۔۔ تین روپیہ

علم الکتاب خواجہ درد (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ چھ روپیہ

طب کی اُردو کتابیں

ترجمہ کلیات نفیسی مکمل ۔۔۔۔۔۔ سولہ روپیہ

ترجمہ قانون بو علی سینا مکمل ۔۔۔۔۔۔ تیس روپیہ

گنج حکمت مکمل ۱۳ حصے ۔۔۔۔۔۔ دس روپیہ

مخزن المفردات ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

امراض چشم ۔۔۔۔۔۔ پانچ روپیہ

ترجمہ کلیات د معالجات ۔۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ

بحر محیط۔ حکیم اصغر حسین فرخ آبادی ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

تشریح کبیر حکیم محمد کبیر الدین دہلوی ۔۔۔۔۔۔ بارہ روپیہ

کتاب التنقیص مکمل ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

اسرار حکمت از حکیم محمد عبدالعزیز لاہوری ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

طب کی فارسی کتابیں

قرابادین کبیر مکمل حکیم ۔۔۔۔۔۔ سولہ روپیہ

مجربات فرنگی (از ہنری پرکیٹر) ۔۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ

مخزن الادویہ معہ تحفۃ المومنین از حکیم محمد حسین علوی شیرازی ۔۔۔۔۔۔ دس روپیہ

محیط اعظم مکمل از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ۔۔۔۔۔۔ پچیس روپیہ

اکسیر اعظم " " ۔۔۔۔۔۔ چھتیس روپیہ

مفرح القلوب۔ مفید الاحسام (علم جراحی) ۔۔۔۔۔۔ بارہ روپیہ

علاج الامراض از حکیم محمد شریف خاں دہلوی ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

مخزن اکسیر مکمل ۲ جلد از حکیم امام الدین پاک پٹن ۔۔۔۔۔۔ دس روپیہ

قرابادین اعظم از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ۔۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ

قرابادین قادری از حکیم محمد اکبر ارزانی ۔۔۔۔۔۔ بارہ روپیہ

باب الاستفسار

علم جفر

(جناب سید دل محمد فضا جالندھری ـ خانیوال، ملتان)

بعض اصحاب علم جفر کو امام جعفر صادق سے منسوب کرتے ہیں اور بعض حکماء کا خیال ہے کہ یہ علم حضرت دانیال کے ذریعہ دنیا میں پھیلا براہِ کرم نگار کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالئے اور اس کے فنی اصولوں پر بھی سیر حاصل بحث فرمائیے تاکہ حکم لگانے کا طریقہ معلوم ہوسکے

(نگار) علم جفر (جفر و نہیں) کے متعلق عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے موجد و مخترع امام جعفر صادق تھے، اور بعض نے دانیال نبی کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا ہے۔ دانیال کا ذکر عیسوی لٹریچر میں تو بیشک پایا جاتا ہے لیکن اسلامی لٹریچر میں بہت کم ـ اور اگر پایا بھی جاتا ہے تو انکی حیثیت ایسی نہیں کہ انھیں کوئی نبی تصور کیا جائے۔ طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دانیال ان قیدیوں میں سے ایک تھے جو بخت نصر کے زمانہ میں بیت المقدس گرفتار کرکے لائے گئے تھے اور چونکہ آدمی بہت ذی فہم تھے اس لئے رفتہ رفتہ وہ وزارت کے عہدہ تک پہونچ گئے

مسعودی نے مروج الذہب میں دو دانیال کا ذکر کیا ہے، پہلے اور بڑے دانیال کا زمانہ اس نے نوح اور ابراہیم کے درمیان کا زمانہ بتایا ہے اور انھیں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پیشین گوئیاں کرتے تھے اور انھیں پیشین گوئیوں کا مجموعہ کتاب الجفر کے نام سے انھوں نے مرتب کیا تھا۔ رہا امام جعفر صادق سے جفر کو علمی و فنی حیثیت سے منسوب کرنا، یہ بھی کوئی صحیح تاریخی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ اس ظن و قیاس کا سبب غالباً وہ روایت ہے جو شیعیت کے ابتدائی زمانہ میں رواج پاگئی تھیں

جب شیعیت کی سیاسی تحریک کو زیادہ مضبوط و پایدار بنانے کے لئے اس کو مذہبی رنگ دیا گیا تو اس سلسلہ میں منجملہ اور بہت سی روایات کے اس روایت کی بھی نشر و اشاعت کی گئی کہ خانوادۂ حضرت علیؑ کے تمام افراد کو جو خطا و عصیاں سے پاک ہیں علم لدنی حاصل ہے اور وہ تمام ان واقعات سے باخبر ہیں جو قیامت تک رونما ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک ایسی کتاب کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جس میں حضرت علیؑ نے قرآن کے پنہاں مگر صحیح مفہوم کو ظاہر کیا تھا۔ الغرض حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے متعلق شیعوں میں یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہوگیا تھا کہ وہ غیب کے حالات جانتے ہیں اور یہ سب کچھ کتابی شکل میں ایک کے بعد دوسرے کو منتقل ہوتا چلا آرہا ہے

تیسری صدی ہجری میں بشر بن المعتمر معتزلی نے ظاہر کیا کہ اس کتاب کو وہ جفر کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دمیری نے بھی اپنی کتاب الحیوان میں ابن قتیبہ کی کتاب ادب الکاتب کے حوالہ سے ظاہر کیا ہے کہ جفر ایک کتاب تھی جسے جعفر بن محمد صادق (چھٹے امام) نے مرتب کیا تھا اور جس میں قیامت تک کی تمام پیشین گوئیاں درج تھیں۔ اس کتاب کا نام جفر اس لئے قرار پایا کہ وہ بکری کے بچہ کی کھال پر لکھی گئی تھی (جفر عربی میں بکری کے بچہ کو کہتے ہیں) لیکن حیرت کی بات ہے کہ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں امام جعفر صادق کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ علم الکیمیا کے ذکر کے سلسلہ میں وہ جابر بن حیان کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی لیا ہے، لیکن جفر نامی کتاب کا کوئی ذکر نہیں کرتا

اصل قصہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں (جیسا کہ ابھی میں نے ظاہر کیا) شیعہ جماعت پیشین گوئیوں کی متعدد کتابوں کے وجود کی قایل تھی، جنھیں وہ

ا ہیم کہتے تھے۔ انھیں میں سے ایک کتاب جفر تھی، دوسری جامعہ اور تیسری مصحف فاطمہ
یہ عقیدہ کہ ائمہ معصومین غیب کے حالات سے واقف تھے مختلف طریقوں سے رائج کیا گیا۔ چنانچہ ایک شیعی مورخ لکھتا ہے کہ جب مامون الرشید نے امام
دسی رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا تو انھوں نے مامون کو لکھا کہ "جفر اور جامعہ کی رو سے یہ نامزدگی ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے"

اس سلسلہ میں موحدین کی روایت بھی سن لیجیے، وہ کہتے ہیں کہ ان کا مہدی، غزالی کا محبوب شاگرد تھا اور غزالی کے پاس جفر کی کتاب موجود تھی۔ یہ بھی
ا جاتا ہے کہ غزالی نے جفر ہی کی مدد سے ابن تومارت کے درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی کی تھی اور مرتے وقت یہ کتاب ابن تومارت ہی کو دیدی تھی۔ لیکن اس سلسلہ
ں ابن خلدون اور البیرونی کی رائیں زیادہ مستند معلوم ہوتی ہیں۔ بیرونی امام جعفر صادق کا بڑا مداح تھا، لیکن اس نے جفر کو ان سے کہیں منسوب نہیں کیا۔
بن خلدون لکھتا ہے کہ "جفر بھی ملاہیم کے سلسلہ میں ایک کتاب رہی ہوگی جسے امام جعفر صادق نے مرتب کیا ہوگا، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا"

ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون بن سعید الاجلی کے پاس، امام جعفر صادق کی ایک کتاب جفر کا ہونا بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت
ہیں ہے۔ البتہ عہد ہارون الرشید کے ایک منجم یعقوب بن اسحاق الکندی کی ایک کتاب جفر کا ذکر ضرور اس نے کیا ہے، جس میں علم نجوم کی رو سے کچھ پیشین گوئیاں
ا گئی تھیں لیکن یہ کتاب بعد کو ناپید ہو گئی

یہ تھی جفر کی تاریخی حیثیت جس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے یہ ملاہیم کے قسم کی پیشین گوئی کی کوئی کتاب رہی ہو جسے شیعی حضرات امام جعفر صادق
ے منسوب کرتے ہیں، لیکن اس کی فنی حیثیت پر اُس عہد کے کسی مورخ نے کچھ نہیں لکھا۔ بعد کو لوگوں نے بیشک علم الحروف اور حروف ابجد کے اعداد سے اس کا
علق قرار دیا اور رفتہ رفتہ جفر علم سیمیا کی ایک شاخ قرار پائی، گو ابن خلدون نے علم سیمیا کی بحث میں کہیں جفر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں،
بجد کے حروف یا اس کے اعداد سے نتائج کا استخراج یا مستقبل پر حکم لگانا، یہ بھی صرف اس عقیدہ کی بنا پر تھا کہ قرآن چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے
ربی حروف بھی بڑی متبرک چیز ہیں اور یہاں تک کہ ان کے اعداد کے پیش نظر پیشین گوئی بھی کی جاسکتی ہے۔ جفر و رمل دونوں تقریباً ایک ہی قسم کی چیزیں
ں اور ان کے ساقط الاعتبار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دونوں مٹتے جا رہے ہیں اور غالباً نصف صدی کے بعد ان کو لوگ بالکل بھول جائیں گے۔

"نگار" کے پُرانے متفرق پرچے

۳۱ء = جنوری (فراست التحریر) عہ ر - جولائی ۸ر - اگست ۸ر -
اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۸ر - دسمبر ۸ر -
۳۲ء = فروری ۱۲ر - مئی ۱۲ر - جولائی ۱۲ر - ستمبر ۱۲ر -
۳۷ء = جنوری، فروری (اصحاب کہف) عہ ر - مارچ ۸ر -
مئی ۱۲ر - جون ۸ر - جولائی ۱۲ر - اگست ۱۲ر -
۳۸ء = جنوری (تاریخ اسلامی ہند) عہ ر - فروری ۱۲ر
اپریل عہ ر - مئی تا دسمبر فی کاپی ۸ر -
۳۹ء = جنوری (مصحفی نمبر) عہ ر - فروری ۸ر - مارچ ۸ر -
اپریل ۸ر - اکتوبر ۸ر -
۴۰ء = فروری ۸ر - مارچ ۸ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - اگست ۸ر
ستمبر ۸ر - اکتوبر ۸ر - نومبر ۸ر - دسمبر ۸ر -
۴۱ء = جنوری تا دسمبر فی کاپی ۸ر -

۴۲ء = مارچ ۱۲ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۸ر
۴۵ء = اپریل ۱۲ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۲ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۱۲ر -
۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) عہ ر - اپریل تا اگست مسلسل فی کاپی ۸ر
ستمبر ۱۲ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر عہ ر
۴۷ء = جنوری (ماجد ولین نمبر) عہ ر - مارچ ۱۲ر -
اگست ۱۲ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۸ر - دسمبر عہ ر -
۴۸ء = جنوری، فروری (پاکستان نمبر) عہ ر - مارچ ۱۲ر - مئی ۱۲ر
جون ۸ر - جولائی ۸ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - نومبر ۱۲ر - دسمبر ۸ر
۴۹ء = جنوری، فروری (افسانہ نمبر) عہ ر - مارچ تا جولائی مسلسل فی کاپی ۸ر
۵۰ء = جنوری، فروری (تنقید نمبر) عہ ر - مارچ ۱۲ر - اپریل ۸ر - مئی ۱۲ر
جون ۸ر - جولائی ۸ر - اکتوبر عہ ر - نومبر عہ ر - دسمبر ۱۲ر

منیجر نگار - لکھنؤ

اقتباسات

آئس کریم کی قدامت

تاریخی نقطۂ نظر سے آئس کریم بڑی پرانی چیز ہے اور اب سے پانچ ہزار سال پہلے کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ نیرو اور سکندر اعظم سفر و حضر، صلح و جنگ ہر موقعہ پر اس کا استعمال کرتے تھے۔

عہد قدیم میں امراء و سلاطین کے لئے آئس کریم طیار کرنا آسان نہ تھا۔ سیکڑوں غلام برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر جاکر وہاں سے کملوں اور نمدوں میں لپیٹ کر برف کی سلیں لاتے تھے اور دودھ، شراب اور شہد کوزوں میں بھر کر برف کے اندر ان کو اتنا گھماتے تھے کہ وہ منجمد ہو جاتے تھے۔
چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب سکندر نے ہندوستان اور باختر پر تاخت کی تھی تو وہ التزاماً آئس کریم کھایا کرتا تھا

سقوط روم کے وقت تک وہاں اس کا استعمال امراء کے لئے مخصوص تھا اور قرون وسطی میں پادریوں نے اس کا استعمال ناجائز قرار دیدیا۔
سب سے پہلا وہ شخص جس نے اٹلی میں اس کو زیادہ رائج کیا سیاح مارکوپولو تھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ صنعت اس نے اہل چین سے سیکھی تھی
چین کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ولادت مسیح سے تین ہزار سال قبل وہاں اس کا رواج عام تھا اور جب مارکوپولو وہاں پہونچا تو اس نے دیکھا کہ یہ چیز عام طور پر بازاروں میں فروخت ہوتی ہے

مارکوپولو نے یہ صنعت صرف بادشاہوں کے باورچیوں کو سکھائی اور اس کو اتنا راز میں رکھا کہ اس کے دو سو سال بعد یوروپ میں اس کی یاد بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہوگئی یہاں تک کہ جب کیتھرائن کی شادی ہنری دوم کے ساتھ ہوئی تو اس کے جہیز میں آئس کریم بنانے کا نسخہ بھی دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنری دوم کو اس سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ وہ جاڑے گرمی ہر موسم میں اس کا استعمال کرتا تھا۔ اور اسی کے دربار سے یہ صنعت فرانس کے عوام تک پہونچی

انگلستان میں اس کے ایک صدی بعد اس کا رواج ہوا جس کی ابتدا شارل اول سے ہوتی ہے (جس کا سر پارلیمنٹ کے حکم سے قطع کیا گیا تھا) ایک دن اس نے اپنے اطالوی باورچی سے کہا کہ آج کوئی ایسی نئی چیز طیار کرو جو بہت لذیذ ہو۔ اس نے آئس کریم طیار کرکے پیش کی اور بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ اس سے حلف لیا کہ اس کا نسخہ کسی کو نہ بتلائے گا۔ لیکن جس وقت جلاد نے شارل کا سر قطع کیا اور لوگ جوق در جوق تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تو اطالوی باورچی نے اس کا نسخہ گراں قیمت پر فروخت کر دیا

اس وقت امریکہ میں اس کا رواج اتنا عام و ترقی یافتہ ہے کہ اگر اسے آئس کریم کھانے والوں کا ملک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کا سالانہ صرف وہاں ۲۳ کروڑ گرام سے کم نہیں ہے اور وہاں کی ہر یونیورسٹی میں اس صنعت کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دیجاتی ہے

وہاں آئس کریم بازاروں کے علاوہ دواخانوں میں بھی ملتی ہے اور ایک اچھے آئس کریم بنانے والے کی تنخواہ وہاں ۷۰۰ ڈالر ماہانہ سے کم نہیں ہوتی

امریکہ میں آئس کریم بنانے کے کارخانے دیکھنے کی چیز ہیں، بڑی بڑی عمارتیں جن کا درجۂ حرارت صفر سے بھی ۵ درجے کم ہوتا ہے، طیار کی جاتی ہیں اور یہاں کام کرنے والے سردی سے محفوظ رہنے کے لئے قطب شمالی کی رہنے والی قوموں کا سا لباس پہن کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ ان کو روزانہ ۸ چمچے مچھلی کا تیل بھی دیا جاتا ہے تاکہ ان کی صحت خراب نہ ہو

امریکہ میں تقریباً ۱۰۰ قسم کی آئس کریم طیار ہوتی ہے، اور تازہ ترین اختراع اس سلسلہ میں یہ کی گئی ہے کہ آئس کریم کے کونہ پہ انڈے کی زردی

سفید ی چھینٹ کر پھیلا دیتے اور پھر اس کو ایک گرم دیگ کے اندر رکھ کر فوراً نکال لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالائی سطح تو گرم ہوجاتی ہے لیکن اندر کی سطح کے نیچے جب جم جاتا ہے تو اسے وہی منجمد آتش کریم ملتی ہے

اہلِ ایران اور موسیقی

اس میں شک نہیں کہ فنِ موسیقی پر ایرانیوں نے بہت کچھ لکھا ہے اس نوع کے قدیم لٹریچر میں اسحاق موصلی (وفات ۲۳۵ھ) کی کتاب النغم والایقاع" اور سرخسی (۲۸۶ھ) کی کتاب" الموسیقی الکبیر" خاص شہرت رکھتی ہیں

ان کے بعد ابن خرداذبہ (وفات ۳۰۰ھ) نے ایک کتاب اسی فن پر لکھی جس کا نام "کتاب اللھو والملاہی تھا۔ مروج الذہب میں بھی ان تقریروں کا ذکر موجود ہے جو المعتمد خلیفۂ عباسی کے حضور میں ابن خرداذبہ فن موسیقی پر کیا کرتا تھا۔ ان کے بعد مشہور طبیب ابوبکر رازی (وفات ۳۱۳ھ) نے بھی ایک کتاب موسیقی پر لکھی تھی اور فارابی (وفات ۳۳۹ھ) کی کتاب الموسیقی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران نے اس فن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی جس کا ثبوت ابو عبداللہ خوارزمی کی کتاب مفاتیح العلوم سے بھی ملتا ہے

شیخ الرئیس بوعلی سینا (وفات ۴۲۸ھ) نے بھی کتاب" النجاۃ " فن موسیقی پر لکھی جو اب بھی بعض کتب خانوں میں پائی جاتی ہے

ابن سینا کے ایک شاگرد ابن زیلہ (وفات ۴۴۰ھ) کی "کتاب الکافی فی الموسیقی" کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے جس میں اس نے ایرانی و خراسانی موسیقی کا تفصیلی ذکر کیا ہے

فخرالدین رازی (وفات ۶۰۶ھ) نے بھی اصول فن موسیقی پر اپنی کتاب جامع العلوم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ رازی کے بعد ناصرالدین طوسی (وفات ۶۷۲ھ) نے عربی میں ایک رسالہ اس فن پر لکھا

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ایک بہت بڑا ماہر موسیقی صفی الدین عبدالمومن پیدا ہوا (وفات ۶۹۳ھ) اور اس نے دو کتابیں لکھیں ایک کتاب الادوار، دوسری رسالۃ الشرفیہ اس کی حیثیت ایک نایک کی سی تھی جس نے ایران کی قدیم موسیقی میں بہت کچھ اضافہ کیا اور موسیقی کا ایک مستقل اسکول اس کے نام سے قائم ہوگیا۔ اس کے بتائے ہوئے اصول موسیقی کی متعدد لوگوں نے تفسیر و تشریح کی جن میں شرح مولانا مبارک شاہ (وفات ۷۸۹ھ) بہت اہمیت رکھتی ہے۔ قطب الدین شیرازی (وفات ۷۱۰ھ) نے بھی اپنی کتاب درۃ التاج میں اسی اسکول کی موسیقی کو بیان کیا ہے۔ اور محمد محمود آملی نے بھی نفائس الفنون میں اس کا ذکر کیا ہے

اسی زمانہ میں عبدالقادر بن غیبی المراغی (وفات ۸۳۸ھ) ایک اور ماہر موسیقی پیدا ہوا جو دربار تیمور و شاہرخ سے وابستہ تھا۔ حاجی خلیفہ اور شرف الدین یزدی نے اسے اصول موسیقی کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا ہے، اس نے ایک کتاب فارسی میں جامع الالحان کے نام سے لکھی (۸۱۶ھ) جس کا قلمی نسخہ جامعہ آکسفورڈ کی لائبریری میں موجود ہے، اس کے علاوہ تین کتابیں مقاصد الالحان، شرح الادوار، کنزالالحان اور بھی لکھیں جن میں سے اول الذکر دو کتابیں تو محفوظ ہیں لیکن تیسری کا پتہ نہیں چلتا۔ ابن غیبی کے بعد اس کے لڑکے عبدالعزیز نے ایک کتاب نقادۃ الادوار اور اس کے پوتے نے مقاصد الادوار تصنیف کی

نویں ہجری کے بعد ایران میں کوئی بڑا نایک تو پیدا نہیں ہوا لیکن اوسط درجہ کے ماہرین دسویں اور گیارھویں ہجری میں بھی پائے جاتے تھے ان میں ایک ابوالوفا ابن سعید تھا جو اخیر عہد تیموریہ میں پایا جاتا تھا

اس زمانہ میں کچھ کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں بہجۃ الروح اور تعلیم النغمات کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ شمس الدین محمد سنجری کی درالنظیم، شیروانی کی فوائد الخاقانیہ، جلال الدین دوانی کی اخلاق جلالی، شہاب الدین عجمی کی علم الانغام اور احمد المسلم موصلی کی درالنقی فی فن الموسیقی بھی قابل ذکر ہیں۔

مراسلات

مخدومی! "نگار" کی گزشتہ اشاعت میں جناب افسر سیمابی کا مراسلہ میری نظر سے گزرا۔ مراسلہ کے صحیح مخاطب فضا صاحب ہیں۔ اور اصولاً انھیں کو اس کا جواب دینا چاہئے، لیکن نفس مضمون میں ایسی باتیں آگئی ہیں جن پر عمومیت کے ساتھ گفتگو کی جا سکتی ہے۔ مجھے فضا صاحب کی طرفداری مقصود نہیں لیکن افسر صاحب نے جس جرم کی سزا "پٹرول چھڑک کر دیا سلائی دکھانا" تجویز کی ہے، اسی جرم کے وہ خود بھی مرتکب ہوئے ہیں

تقلید، توارد، اور سرقہ معنوی اعتبار سے تین مختلف چیزیں ہیں لیکن کسی شعر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ شاعر ان تینوں میں سے کس چیز کا مرتکب ہوا ہے، دشوار امر ہے۔ کیونکہ اساتذہ کے دواوین میں بے شمار اشعار ایسے مل سکتے ہیں جن کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ لکھنے والے تقلید اور سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں یا توارد ہوگیا ہے۔ خصوصاً جذباتی اور داخلی شاعری میں جذبات اور احساسات بڑی حد تک یکسانیت کے حامل ہوتے ہیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ کسی استاد کے شعر کو سامنے رکھ کر مشقِ سخن کرنا مذموم نہیں تصور کیا جاتا تھا بشرطیکہ لکھنے والے نے اس مضمون سے کوئی نیا پہلو پیدا کیا ہو یا اسی مضمون کو اپنے رنگ میں احسن طور پر ادا کیا ہو۔ اس سلسلہ میں افسر صاحب کے مندرجہ ذیل بیان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں "اگر کوئی غالب یا اقبال کی تقلید کرتا ہے تو یہ بذاتہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں بلکہ اس کے Intellectual ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اگر بہ پردۂ تقلید وہ ان کے افکار و تصورات کا خاکہ اڑاتا ہے یا بالفاظ دیگر سرقہ کرتا ہے تو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔" یہ بیان کم از کم میرے لئے تو ناقابل فہم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو افسر صاحب تقلید یا سرقہ کے فرق کو نہیں سمجھتے یا ان کے ضمیر میں جو کانٹا ہے اس کی بنا پر وہ خود فریبی سے کام لے رہے ہیں۔ میں افسر صاحب سے بصد ادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ "اقبال اور غالب کی تقلید کرنے" اور ان کے "افکار و تصورات کا خاکہ اڑانے" کا وہ کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اگر اقبال کی تقلید سے ان کی مراد اقبال کے نظریات کی پیروی ہے تو یقیناً یہ ذہین ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اقبال کو نہ صرف سمجھنا بلکہ اس کی پیروی بھی کرنا بلا شک و شبہ بہت بڑی بات ہے لیکن یہ مدنظر رہے کہ نظریات تو مستعار لئے جا سکتے ہیں مگر طرز اور اسلوب پر ڈاکہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ "تقلید کے Intellectual ہونے کی دلیل" اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب کہنے کا اپنا ڈھنگ اور اپنا اسلوب ہو۔ اس کے بغیر اگر اقبال کے خیالات، اقبال ہی کی علامتوں اور اقبال ہی کے اسلوب میں بیان ہوں تو "سرقہ" میں تبدیل ہو جائے گا — بہترین مثال کے طور پر افسر صاحب کا بیشتر کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ — اس وقت نموناً صرف سات آٹھ مصرعے پیش کر رہا ہوں جو بغیر کسی کد و کاوش کے افسر صاحب کی صرف دو ایک نظموں سے گئے ہیں:-

(افسر) پھر ایں مشرقِ عظمیٰ کے فتنہ زاروں میں — کسی پہ فاش نہیں مرگ و زیست کا مفہوم

(اقبال) پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں — کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

(افسر) عنقا ہوئی اب مئے شبانہ — (اقبال) باقی ہے کہاں مئے شبانہ

(افسر) سکھا رہے ہیں وہ شیروں کو طرزِ روباہی — (اقبال) بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو

(افسر) وہ جس کو حق نے عطا کی ہے سوزِ جذبِ قلندرانہ — (اقبال) وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

افسر:- بدل گئیں جب غلامی سے زندگی کی تمام قدریں
اقبال:- کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

افسر:- کبھی سراغِ نگار ہستی نہ پا سکیگا رہینِ خانہ
اقبال:- اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں

اب مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر فضا صاحب اس جرم میں معتوب قرار دئے جا سکتے ہیں تو پھر افسر صاحب کیوں بری قرار دئے جائیں؟ میں اس مسئلہ کو آپ پر چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھے آپ کی ادبی دیانتداری پر کامل بھروسہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے مسایل میں ذاتی تعلقات اور مراسم سے قطعاً ہٹ کر فیصلہ کریں گے۔ مجھے حیرت ہے کہ اپنی کمزوری کے باوجود افسر صاحب نے اتنی جرأت کیسے کی؟ نفس مضمون سے قطع نظر تحریر کا انداز بھی افسر صاحب کے متعلق کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتا۔ افسر صاحب کا ابتدائی کلام (۴۵ و ۴۶ تک بھی) نوے فیصدی اقبال کا چربہ ہوتا تھا۔ اب بھی وہ اقبال کے چنگل سے نکل نہیں سکے ہیں، لیکن کم از کم اب ان کے کلام میں پختگی اور تھوڑی بہت انفرادیت ضرور آگئی ہے تاہم ان کا یہ مراسلہ ابھی ان کی ادبی اور ذہنی شعور کی ناپختگی ظاہر کرتا ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں آپ کے تاثرات کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمود ایاز (بنگلور)

(نگار) آپ کو معلوم ہو کہ افسر صاحب کا خط میں نے بادلِ ناخواستہ شایع کیا تھا اور قطع نظر اس سے کہ فضا صاحب پر جو الزام انھوں نے قایم کیا تھا وہ اپنی جگہ درست تھا یا نادرست، ان کی تحریر کا لب ولہجہ حد درجہ ناشایستہ و عامیانہ تھا۔
لیکن اس خیال سے کہ ان کو اپنے اس طرزِ عمل کی ناپسندیدگی کا علم میرے علاوہ دوسرے حضرات کی طرف سے بھی ہو جانا چاہئے میں نے اسے شایع کر دیا تھا

آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں اور فضا ابن فیض اعظمی کے متعلق میں کبھی یہ خیال قایم نہیں کر سکتا کہ انھوں نے افسر کے کلام سے سرقہ کیا ہے

فضا صاحب نے اس وقت تک مجھے جواب میں کچھ نہیں لکھا اور میں ان کی اس خاموش سنجیدگی کی قدر کرتا ہوں۔

نئی شاہراہ

(سیدہ اختر)

میری نگاہِ شوق میں "اک نئی شاہراہ" ہے ! اک نئی شاہراہ کیا ؟ اک نئی جلوہ گاہ ہے !
دیر و حرم جہاں نہیں، چشمکِ این و آں نہیں ! نغمۂ برہمن نہیں، غلغلۂ اذاں نہیں !
جس کا ہر ایک گام ہے منزلِ امن و آشتی جس میں بجز یقینِ عشق، وہم نہیں گماں نہیں !
جس میں رہینِ جستجو قافلۂ حیات ہے ! شام و سحر جہاں فقط تذکرۂ نجات ہے !
جس کے ہر اک نشیب میں جس کے ہر اک فراز میں اک نئی سرزمین ہے اک نئی کائنات ہے !
دیکھ وہ صاحبانِ دل محوِ خرامِ شوق ہیں ! تشنہ لبانِ جہد ہیں، بیخودِ جامِ شوق ہیں !
اُن کے پیام میں نہاں ایک نیا پیام ہے ! ایک شعورِ زیست ہے ایک صلائے عام ہے !
خطرۂ پیش و پس نہ کر آ" نئی شاہراہ" میں ! جلوے ہیں، تیرے منتظر منزلِ مہر و ماہ میں !

ٹیپو کے مزار پر !

(محمود ایاز بنگلوری)

تو نے جس خاک کے ذروں کو جہاں تاب کیا وہ زمیں آج بھی بے لعل و گہر ہے ساقی
تو نے جس شب کے اندھیروں میں اجالے ڈھونڈے وہ فضا آج بھی محرومِ سحر ہے ساقی
لیکن اس ظلمتِ پیہم سے گراں بار نہ ہو وہ ذرا دور پہ اک صبح کی تنویر بھی دیکھ
اس خانۂ تاریک سے کچھ اور پرے اپنے ہر خواب کی رنگینیٔ تعبیر بھی دیکھ

رزم ردولوی :-

محیطِ عشق میں کیا جانئے حالت ہوگیا دل کی،
سفینہ دیکھئے تہ کی خبر لائے کہ ساحل کی

اسیری میں نشیمن کا زمانہ یاد کیا کرتے
قفس پر بھی جو پڑ جاتی کوئی افتاد کیا کرتے

سکوت میں ہے سکوں، خامشی میں لذت ہے
یہ اضطراب مرے دل نے کیوں پسند کیا

ہمنفس یہ عالمِ گم گشتگی کے راز ہیں
پا گیا منزل کو میں یا پا گئی منزل مجھے

مری مجبوریوں کا نام رکھ لو دوسری دُنیا
یہ کوئی فاصلہ ہے جو قفس سے آشیاں تک ہے

ابھی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے کارواں اپنا
ابھی لپٹی ہوئی دامن سے گردِ کارواں تک ہے

جہانِ عشق میں بے اختیاریاں مت پوچھ
بس ایک جبر پہ کچھ اختیار باقی ہے

یہ لالہ زارِ مقتل، یہ ہوائے دامنِ قاتل
سکون سا مل رہا ہے نیند سی معلوم ہوتی ہے

موت بھی کیا سمجھ کے آئی ہے،
یہی دن تھے بہار آنے کے،

عجیب راز ہے دیدارِ دوست کا عالم
بہت ہے ایک گھڑی ساری زندگی کم ہے

اک وہ کہ دل میں آگئے پردے الٹ کے سب
اک ہم کہ چاک اپنا گریباں نہ ہو سکا،

ڈوبنے کے لئے کچھ کم تھا نہ دریا کا بہاؤ
کیوں یہ طوفاں اُٹھا اب پار اُترنا ہے ہمیں

شفقت کاظمی :-

تیری جدائیوں کو زمانہ ہوا مگر،
دل ہے کہ سر بہ زانوئے حسرت ہے آج تک

لب پہ آیا تو سہی شکوۂ بیداد مگر
تیری آزردہ نگاہی سے حیا بھی آئی

اس سے پہلے کہ مری روح سنے مژدۂ عیش
دل ترے دردِ محبت سے لگا بھی آئی

فرق آیا نہ تری خوئے جفا میں ظالم،
رنگ کیا کیا نہ بدلتی رہی دُنیا اپنا

کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

عزم :- (بشیر بدر)

ہاں مرے فرض سے مجھ کو مری محبوب نہ روک
ابھی دینا ہے نئی صبح کا پیغام مجھے

پونچھ لے سرمگیں آنکھوں سے چھلکتے آنسو
یہ ترے ساتھ نہ کر دیں کہیں بدنام مجھے

ایسے پاکیزہ عزائم پہ یہ ماتم کیسا
مسکراہٹ کی ضرورت ہے بہ ہر گام مجھے

میری محبوب کبھی آلام سے گھبراتی ہے
لوگ دینے نہ لگیں یہ کہیں الزام مجھے

ہر حسیں چہرہ ہے پژمردہ، نگاہیں غمناک
توڑنا ہے یہ طلسم غم آلام مجھے

اس طرف صبح مسرت ہے اُدھر شام الم
دور کرنا ہے یہ فرق سحر و شام مجھے

تا بکے جبہ و دستار خدائی کے نشان
توڑ دینا ہے فسوں خیزیٔ اصنام مجھے

ذہن انسانی کو پیہم جو ڈسے جاتے ہیں
ختم کرتے ہیں خداؤں کے وہ اوہام مجھے

اب مرے ذہن میں روشن ہے ارادوں کا چراغ
روک سکتا نہیں ظلمت کدۂ شام مجھے

ہاں مرے فرض سے مجھ کو مری محبوب نہ روک
ابھی دینا ہے نئی صبح کا پیغام مجھے

اکرم دھولیوی :-

آتی گئی بہار نکھرتا گیا چمن،
جب تک جنون شوق میں بالیدگی رہی

دل پریشاں ہو تو پھر راحت کہیں ملتی نہیں
عزم گلشن کیجئے یا قصد صحرا کیجئے

تمام حسرت و حرماں تمام سوز و گداز
یہی ہے اہل محبت کی داستان نیاز

جان دیدوں سختیٔ منزل سے گھبرا کر قبول
روئے ناکامی مگر مجھ سے نہ دیکھا جائے گا

وہاں خزاں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا
جہاں تمھارے لبوں پر ہنسی نہیں ہوتی

کلام سرور :-

یاد آتی ہے تو اس طرح کہ رو دیتا ہوں
بھول جاتا ہوں تو ایسا کہ محبت ہی نہیں

تیرا کہلا کے بھی محروم کرم ہوں ملے دوست
اس حقیقت پہ ندامت بھی ہے حیرت ہی نہیں

خوش بھی ہوں کبھی آنکھ بھی تر ہوتی ہے
ہائے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

میرے محبوب تری شان تغافل کے نثار
جیسے ہو جائے بہر حال سحر ہوتی ہے

وصل کیا وصل کا امکاں بھی تصدق اسپر
وہ شب غم جو ترے نام سے سر ہوتی ہے

مطبوعات موصولہ

نالۂ ناشاد مجموعہ ہے جناب رام پرشاد کھوسلا ناشاد کی غزلوں اور نظموں کا۔ ناشاد مرحوم کا وطن پنجاب تھا لیکن اپنے اکتسابات علمی کے لحاظ سے وہ سارے ہندوستان کے لئے باعث فخر تھے۔ ان کی ساری زندگی تعلیم وتعلم ہی میں بسر ہوئی اور آخر دم تک علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے، وہ انگریزی کے بہت بڑے ادیب تھے اور مورخ کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا ــ اخلاق کے لحاظ سے بھی ان کی سطح عام انسانوں سے بہت بلند تھی اور تصوف کی طرف مایل ہونے کی وجہ سے وہ مذہب کی تفریق کے قایل نہ تھے۔ دیانت و امانت، خلوص وصداقت ان کی زندگی کا وہ اصول تھا جس سے وہ کبھی نہیں ہٹے اور اخوت عامہ و انسانیت پرستی ان کا نصب العین تھا جس کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوگی، اس کا کلام بھی اسی قدر پاکیزہ ہوگا۔ اس مجموعہ کا پہلا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا ابتذال و سوقیت سے پاک ہونا ہے۔ دوسرے حصہ میں نظمیں ہیں اور مختلف عنوانات پر ہیں

ابتدا میں ڈاکٹر سید محمود کا نہایت بسیط مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ ناشاد کو ایک صوفی شاعر ہونا ثابت کیا ہے۔ اسکے بعد پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی نے ناشاد کی شاعری سے بحث کی ہے اور اس کی خصوصیات کو پوری طرح نمایاں کیا ہے

اس میں شک نہیں کہ ناشاد کے کلام میں بعض بڑی دلکش خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اقبال بک ڈپو پٹنہ نے اسے شایع کرکے زبان کی بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ قیمت چار روپیہ۔

تحقیق و تنقید مجموعہ ہے پروفیسر اختر اورینوی (پٹنہ کالج) کے پندرہ انتقادی مقالات کا۔ بعض میں مخصوص حضرات کے ادب پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور بعض میں فنی، اصولی و تاریخی بحث کی گئی ہے

تاریخی حیثیت سے "بولیوں کا سنگم" بڑا اہم مقالہ ہے اور فنی حیثیت سے بھی کئی مقالے بڑی کاوش و تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ فن اور ماحول۔ افسانہ میں حقیقت طرازی ۔ ڈراما فنی نقطۂ نظر سے، خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں

پروفیسر اختر اورینوی بڑے مشاق اور مشہور نقاد ہیں اور ان کے مضامین کو اہل نظر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

قیمت تین روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ شاد بک ڈپو۔ پٹنہ

تنقید جدید مجموعہ ہے پروفیسر اختر اورینوی کے آٹھ انتقادی مقالات کا جو اس سے قبل ملک کے مختلف رسایل میں شایع ہوکر کافی مقبول ہوچکے ہیں اس مجموعہ کا پہلا مقالہ ترقی پسند ادب پر ہے جس میں بہت سوچ سمجھ کر ترقی پسند ادب کے حال و مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا مقالہ "ادبیات عالم اور اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات" بھی اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں زیادہ تر اصولی بحث کی گئی ہے اور ازبس مفید و اہم ہے، چوتھا مقالہ "ادب میں روایات اور تبدیلیاں" بھی اس بحث سے تعلق رکھتا ہے اور اس طرح یہ تینوں مقالے مل کر "ترقی پسند ادب" پر بڑی جامع گفتگو ہوجاتے ہیں

نظیر اکبرآبادی اور غالب کے فن شاعری پر بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات شعر و شاعری کے متعلق کتنے سلجھے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ کی قیمت درج نہیں ہے۔ لیکن غالباً تین روپیہ ہوگی۔ ملنے کا پتہ: شاد بک ڈپو پٹنہ

کلیات اکبر جلد اول بزم اکبر کراچی کی عملی کوشش کا یہ پہلا نتیجہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اور اس میں اکبر کی شاعری کے مختلف ادوار قایم کرکے ان کے کلام کو مرتب کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں سترہ سال سے ۴۰ سال

کی عمر تک کا کلام ہے، دوسرے دور میں ۳۰ سے ۴۰ سال عمر تک کی غزلیں ہیں، تیسرے دور میں ۴۰ سے ۵۰ سال عمر تک کلام ہے۔ آخر میں انکی رباعیات اور قطعات وغیرہ دئے گئے ہیں

کتابت و طباعت میں کافی نفاست کا خیال رکھا گیا ہے اور کاغذ بھی بہت اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ جلد بھی نہایت خوبصورت و مضبوط ہے

قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ ملنے کا پتہ: بزم اکبر کراچی

اُردو جناب جگن ناتھ آزاد کی ایک طویل نظم ہے جو انھوں نے اُردو مجلس دہلی کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں ۱۹ ستمبر ۵۰ء کو پڑھی تھی۔

جناب آزاد نے ایک کامیاب شاعر ہونے کے لحاظ سے جو شہرت حاصل کی ہے، اس کی بنیاد چند در چند خصوصیات پر قایم ہے جن کا تعلق فن سے بھی ہے اور ان کی ذات سے بھی۔ فن کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ایسے پختہ کار شاعر ہیں کہ مشکل ہی سے دو چار ان کی صف میں آسکتے ہیں، لیکن جس حد تک انکی ذات یا ذاتی تاثرات کی بلندی کا تعلق ہے، وہ چار بھی ایسے نہ ملیں گے کہ آزاد کے نام کے ساتھ ان کا نام لیا جائے۔ آزاد کی شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم یکسر درمندانہ خلوص کا اظہار ہے اور اس اظہار میں وہ ان تمام سلیقوں سے کام لیتے ہیں اور جو قدیم و جدید اُردو ادب کے مطالعہ سے ان میں پیدا ہوا ہے

اس نظم میں انھوں نے جو کچھ اُردو زبان کے متعلق لکھا ہے وہ بحالات موجودہ ایک "شہر آشوب" کی صورت رکھتا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا خلوص اور ان کی درد مندی ظاہر ہے۔ قیمت ۲ ملنے کا پتہ: دہلی کتاب گھر دہلی

شانِ محفل مجموعہ ہے منشی رگھوناتھ سنگھ ماجر دہلوی کی غزلوں کا۔ ماجر صاحب اب سے ۳۰ سال قبل کے شاعر ہیں، جب دہلی کے ہندو مسلمان دونوں ایک ہی کلچر رکھتے تھے اور زندگی کے مسایل کو خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے

جناب ماجر ایک معزز کھتری خاندان کے فرد تھے اور اس عہد کے رواج کے مطابق فارسی کی تعلیم سے ناآشنا نہ تھے، اسی لئے ان کی زبان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک پڑھے لکھے شاعر کے کلام میں پائی جانا چاہئے

ان کے تغزل کی زبان وہی ہے جو دہلی کے اونچے معزز خاندانوں میں رائج تھی اور انداز بیان میں بھی وہی سلاست و صفائی پائی جاتی ہے جو ایک زباندان کے کلام میں ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ: کوی راج رگھنندن سنگھ ساحر کناری بازار دہلی

آزادی کے بعد ترجمہ ہے Howard Fast کی کتاب Freedom Road کا۔ ہاورڈ فاسٹ امریکہ کا بڑا مشہور ناول نگار ہے اور اس کی اکثر کتابوں کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اُردو میں غالباً یہ بالکل پہلی اور بڑی کامیاب کوشش ہے۔ اور فاسٹ باوصف امریکن ہونے کے، موجودہ امریکی ذہنیت کا سخت مخالف ہے اور وہ امریکہ کی جمہوریت کو جو اس کے نزدیک فاسستیت ہی کی دوسری صورت ہے، بہت بری نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی لئے حکومت نے اسے نظر بند کر دیا ہے۔ وہ امریکہ کے اس فلسفہ کا قایل نہیں کہ شایستگی و تہذیب نام ہے صرف ڈالر اور آٹم کا، بلکہ وہ تہذیب کی بنیاد اس جذبۂ انسانیت کو قرار دیتا ہے جو نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھے۔ ہاورڈ فاسٹ کا انداز بیان بہت عجیب ہے اور ترجمہ میں اس کا باقی رکھنا آسان نہ تھا، لیکن اس کے فاضل مترجم احسن علی خاں قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اصل کتاب کے طرز ادا کی خوبیوں کو قایم رکھتے ہوئے اس قدر سلیس و صاف ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ حجم ۴۰۳ صفحات۔ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی

خاورستان مجموعہ ہے جناب اختر سیابی احمد نگری کی نظموں کا جسے خود انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ اختر صاحب کے رنگ سخن کے متعلق کسی تفصیلی اظہار خیال کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کا کلام اکثر نگار میں شایع ہوتا رہتا ہے اور کافی پسند کیا جاتا ہے۔ اختر صاحب نے ابتدا ہی سے اقبال کے رنگ میں لکھنا شروع کیا اور اس وقت تک استقلال کے ساتھ اس پر قایم ہیں۔ شکوہ الفاظ، حسن تراکیب، بلندی خیال اور فنی رکھ رکھاؤ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی ۱۳۵ نظمیں ہیں اور ۸۰ پونڈ کے کاغذ پر نہایت دیدہ زیب طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہیں۔

قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ: اختر سیابی۔ جلیس منزل۔ احمد نگر

نگار کی پرانی مکمل جلدیں

سنہ ۳...ء	سنہ ۳۲ء	سنہ ۳۵ء	سنہ ۳۶ء
۱۵ عہ	۱۵ عہ	۱۵ عہ	۱۵ عہ
سنہ ۴...ء	سنہ ۴۷ء	سنہ ۵۰ء	
۱۰ عہ	۱۰ عہ	۱۰ عہ	منیجر نگار

تنقیدی اشارے

...سر آل احمد سرور - ریڈر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اُنیس تنقیدی ...ت کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ... پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ... تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات ... ۲ پونڈ۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول - منیجر نگار - لکھنؤ

جن بچوں کو
بڑا ہو کر اس دُنیا کا بوجھ اُٹھانا ہے
ان کی پرورش "نونہال" پر ہونی چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانیوالا
ان کا دِل پسند ٹانک
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

Hamdard

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس
کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

...ن عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان بوڑھے سب ...یں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس ...ں قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر قوی ...ہ کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات تصور فرمایئے ...تعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے ایک شیشی چھ سات سیر خون آپکے جسم میں اضافہ ...اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخسار ...لاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نسخہ نہیں ہے ...ردل اور یس العلاج اس کے استعمال سے بامراد ہوکر مثل پندرہ سولہ سال کے ...ن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے بعض اسکی ...تعریف نہیں کر سکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے

قیمت فی شیشی ۴ ۴ خوراک چار روپیہ (للعمر)

...- فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے میں اللہ کو ...حاضر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہیے

میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمایئے

حکیم ثابت علی شیخ زبان خوش کلام

(عالم تقدس مولانا ... روم صاحب)

محمود نگر ۳ لکھنؤ - یو - پی

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)
اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل، اس کی نزاکتِ بیان اس کی بلندیٔ مضمون اور اس کی انشاء حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔
قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔
(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
(۲) مادئین کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے:۔
قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا آخیر تک پڑھ لیتا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصولِ نقد فنونِ ادبیہ حقیقت نگاری
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے
کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ
کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم
اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام ماجدولین نمبر ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی
ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب
اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ
اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر
کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی
بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے نتائج
کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے
بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور
ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء
سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں
کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب
کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور
جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور
ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈسن کی مشہور عالم کتاب
"ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر،
عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی
زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی
بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔
سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم
حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور ان کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام "۵۵ سال کے بعد" یہ کتاب نفسیات عملی
پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت
تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کریں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر رنج و الم آپ کیلئے بے معنی ہو جائے گا
(۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا اضافہ ہوگا (۳) آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائیگا
(۴) انحطاط عمر اور ضعیفی کا موجودہ مفہوم آپ کیلئے باقی نہ رہے گا (۵) شاہراہ حیات پر
[illegible] معلوم ہو جائیگا جو اس وقت تک آپ کی آنکھوں سے اوجھل تھا قیمت [illegible]

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ
تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ
کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)
چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف وصحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۲،۶ صفحات، مجلد نو روپیہ لعہ۹ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات وجوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف۔ معجزہ وکرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب وعقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم وتاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علمِ غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں ورمقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی ومعاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی ونفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ورق نہ اُلٹئے پہلے اس خط کو پڑھ لیجئے

(اس پرچہ کے ساتھ ایک مطبوعہ کارڈ آپ کو ملے گا اسکی خانہ پُری کرکے بواپسی ڈاک بھیج دیجئے)

مکرمی — تسلیم

آپ کو معلوم ہے کہ کاغذ کی صد درجہ گرانی اور مصارف طباعت و اشاعت کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہم بادل ناخواستہ اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ نگار کے سالانہ چندہ میں (سالنامہ کے زیادہ ضخیم ہوجانے کی وجہ سے) دو روپیہ کا اضافہ کریں۔

اس اضافہ کے معنے یہ ہیں کہ آپ کو تقریباً پونے تین آنے ماہوار زیادہ ادا کرنے پڑیں گے اور یہ رقم غالباً اتنی نہیں کہ آپ اسے برداشت نہ کرسکیں، جبکہ آپ اس سے کہیں زیادہ روز اپنے مشاغل تفریح میں صرف کردیتے ہیں ---- لیکن اگر آپ نگار کی دیرینہ خدمات کے پیش نظر اتنا ایثار بھی گوارا نہیں کرسکتے تو کم از کم تین پیسہ کی قربانی گوارا فرماکر ایک کارڈ کے ذریعہ سے مطلع فرما دیجئے کہ آپ کو سالنامہ کی ضرورت نہیں ہے اور دو روپیہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں نامنظور ہے (آپ کارڈ بیرنگ بھی بھیج سکتے ہیں)

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے تو نامنظوری کی اطلاع نہ ملنے پر نگار کے سالنامہ کا وی پی آٹھ روپیہ چھ آنہ میں روانہ کیا جائے گا اور اگر دسمبر ۱۹۵۱ء کے بعد کسی اور مہینے میں آپ کا چندہ ختم ہوتا ہے تو دو روپیہ چھ آنہ کا وی پی روانہ ہوگا اور اس یقین کے ساتھ کہ آپ اسے واپس کرکے ہمارا نقصان پسند نہ فرمائیں گے۔

یقیناً یہ امر آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ اُردو اسوقت نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے اور ہر اس شخص سے جو اردو کی بقا چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ ایثار و قربانی چاہتی ہے، لیکن ہم تو آپ سے صرف دو روپیہ سال کی مدد چاہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے عوض میں دو روپیہ سے کہیں زیادہ قیمتی چیز آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

سالانہ چندہ یا سالنامہ کی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۶ر کی بچت ہوگی

پاکستان کے خریداروں کے نام وی پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا چندہ آٹھ روپیہ یا سالنامہ کی قیمت دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے کسی پتہ پر بھیجکر ہم کو اطلاع دیدیں۔

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی

۲۔ ملک محمد دین اینڈ سنز پبلشرز ۱۰ بل روڈ - لاہور

(نوٹ) آیندہ سالنامہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے پشت صفحہ کا اعلان ملاحظہ فرمائیے۔

منیجر

داہنی طرف صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۰ | فہرست مضامین نومبر سنہ ۵۱ء | شمارہ ۵

آئندہ سالنامہ

حسرت نمبر کی اہمیت

دنیائے تغزل میں حسرت موہانی کی انفرادیت کو ہر دبستان شاعری نے تسلیم کیا ہے اور انھیں رئیس المتغزلین کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو، لیکن ان کی شاعری کی وہ کیا خصوصیات ہیں جنھوں نے ہر شاعر و نقاد سے یہ خراج تحسین حاصل کیا، اس کا صحیح اندازہ آپ کو حسرت نمبر کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، جس کی تکمیل میں پاکستان و ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ادیب و نقاد حصہ لے رہے ہیں مثلاً: مرزا جعفر علی خاں اثر ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔ پروفیسر مجنوں ۔ پروفیسر فراق ۔ پروفیسر احتشام حسین ۔ پروفیسر سرور ۔ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۔ خلیل الرحمان اعظمی ۔ اڈیٹر نگار وغیرہ ۔

اس سالنامہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ کلام حسرت کا اتنا مکمل انتخاب اس میں شایع کیا جائے گا کہ کلیات حسرت کے مطالعہ سے آپ بالکل بے نیاز ہو جائیں گے ۔

اس سالنامہ کو معیاری چیز بنانے کے لئے ضخامت کا کوئی سوال سامنے نہ ہوگا اور غیر خریداران نگار کے لئے اس کی قیمت دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، ممکن ہے زیادہ ہو جائے ۔

مینجر

ملاحظات

نوابزادہ لیاقت علی خاں کی شہادت

یوں تو ہر انسان کا قتل اپنی جگہ افسوسناک ہوا کرتا ہے، لیکن کسی ایسے فرد کی ہلاکت جس کی ذات کسی قوم یا جماعت کی ملکیت ہو، قوم و جماعت کی ہلاکت ہے ؎

وَلَیسَ سَرِیرُ النَّعشِ مَا تَسمَعُونَہ
ولاکنہ اصلاب قوم تقصف

(یہ جو تم سُن رہے ہو تابوت کی چرچراہٹ نہیں ہے بلکہ قوم کی ریڑھ کی ہڈیاں چٹک رہی ہیں)

نوابزادہ مرحوم ۱۸۹۵ء میں بمقام کرنال پیدا ہوئے اور علیگڈھ، الہ آباد اور آکسفورڈ میں رہکر انھوں نے مدارج تعلیم طے کئے۔ ہندوستان کی تقسیم سے قبل بھی وہ ہمارے یہاں کلیدی مناصب پر فایز رہے اور تقسیم ہند کے بعد تو خیر وہ قاید اعظم کے دست راست تھے ہی۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان ایک جداگانہ سلطنت تو بن گئی تھی لیکن اس کی حیثیت ایک جامۂ تار تار سے زیادہ نہ تھی۔ اور مشکل سے باور کیا جا سکتا تھا کہ وہ آسانی سے منزل استقامت تک پہونچ سکے گی۔ مگر قاید اعظم کی ملک میں غیر معمولی جوش و ولولہ اور کیفیت عزم و یقین پیدا کر کے پاکستان کو ابتدائی منزل تعمیر کی دشوار گزار راہوں سے بہ آسانی گزار لے گئے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مجاہدانہ عزم میں بھی نوابزادہ مرحوم کی شخصیت بڑی عظیم شخصیت ثابت ہوئی۔ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ قاید اعظم اس جہان سے رخصت ہوگئے اور یہ پہلا زبردست صدمہ تھا جو پاکستان کی نوزائیدہ سلطنت کو پہونچا، لیکن نوابزادہ مرحوم کے وجود نے یہ صدمہ بھی ملک کو زیادہ محسوس نہ ہونے دیا اور انھوں نے ان تمام ذمہ داریوں کو جو قاید اعظم نے سنبھال رکھی تھیں اپنے مضبوط شانوں پر لے لیا اور حکومت کا وہ ڈھانچہ جو طیار ہو چکا تھا بگڑنے نہ پایا۔

یہ موقع نہیں کہ نوابزادہ مرحوم کی قایم کی ہوئی پالیسی پر رائے زنی کی جائے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم رکھنا ان کی انتہائی خواہش تھی اور اس خواہش کی تکمیل میں جو موانع پیش آتے تھے ان سے وہ خوش نہ ہوتے تھے اور قوم میں ذہنی اعتدال قایم رکھنے کا انھیں بڑا خیال تھا۔

نوابزادہ مرحوم کے واقعۂ شہادت کے اسباب کیا تھے، ان کا نہ ہمیں صحیح علم ہے، نہ ان کے معلوم کرنے کی ضرورت کیونکہ دُنیا میں اکثر بڑے بڑے کام کرنے والوں کا یہی حشر ہوا ہے اور اس انجام کے بعد جو ردّ عمل ملکوں میں ہوا کرتا ہے وہ ہمیشہ بُرا نہیں ہوا کرتا۔

نوابزادہ مرحوم کی جگہ خواجہ سر ناظم الدین کا انتخاب متعدد وجوہ کی بنا پر بہت مناسب انتخاب ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کی ہدایت و سرکردگی میں پاکستان امن و سکون کے قیام کو (جو اسلامی تعلیم کا تنہا نصب العین ہے) اولین سیاسی ضرورت قرار دے گا اور اپنی تمام ہمسایہ سلطنتوں سے اس کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔

ایک اور نیا خطرہ

مشرق وسطیٰ کی تاریخ بھی بڑی عجیب تاریخ ہے، ایک طرف وہاں اگر پیغمبروں نے جنم لیا تو دوسری طرف بڑی بڑی خونریزیاں بھی وہاں ہوئیں۔ پہلے اب کہ پیغمبر پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں، اگر وہاں خونریزیاں ہی خونریزیاں ہوں تو حیرت نہ کرنا چاہئے۔ مشرق وسطیٰ کی اہمیت زیادہ تر اس لئے ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک بڑی اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور مغرب جو اب تک مشرق پر اپنا اقتدار قایم رکھنے کی طرف سے مایوس نہیں ہوا ہے، اس پر اپنا تسلط ضروری سمجھتا ہے۔

گو مشرق وسطیٰ سے مراد صرف ایشیا کا وہ حصہ ہے جو بحر روم، خلیج فارس اور آبنائے باسفورس کے درمیان واقع ہے، لیکن چونکہ اسکے حدود ایک طرف ایران سے ملتی ہیں اور دوسری طرف مصر سے اس لئے مشرق وسطیٰ کے مسائل سے ایران و مصر کبھی بے تعلق نہیں رہ سکے، اور اسی بنا پر ایران میں پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کی تحریک اور مصر میں سوئز کے علاقہ سے انگریزوں کا تخلیہ، برطانیہ کے نزدیک مشرق وسطیٰ ہی کے مسئلۂ دفاع سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ابھی ایران کا جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ برطانیہ کو مصر سے الجھ جانا پڑا اور یہ آویزش حد درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ برطانیہ اس کو تو گوارا کرسکتا ہے کہ وہ ایران کے پٹرول سے ہاتھ دھوئے لیکن نہر سوئز سے اپنا اقتدار ہٹائے پر وہ شاید کبھی راضی نہ ہوگا۔

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے نہر سوئز کے علاقہ سے اپنی فوجیں ہٹالینے کو اصولاً تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ فلسطین کو وہ اپنا فوجی مستقر نہیں بناسکتا تو اپنی فوجیں وہاں رکھنے کے لئے ایک نئی توجیہ پیش کی کہ مشرق وسطیٰ کے امن و سکون کے لئے انگریزی فوجوں کا وہاں رہنا ضروری ہے۔ مصر کی موجودہ حکومت نحاس پاشا کے ہاتھ میں ہے اور قوم نے ان کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ وہ نہر سوئز کے مکمل تخلیہ اور مصر کے ساتھ سوڈان کے الحاق کے حامی تھے اور اب چونکہ حکومت مصر نے ان دونوں مطالبات کی توثیق کردی ہے، اس لئے مصر و برطانیہ کی کشیدگی کا جنگ کی صورت اختیار کرلینا بالکل قرین قیاس ہے۔

برطانیہ کی طرف سے مصر کے ان دونوں مطالبات کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ سوڈان کے مستقبل کا فیصلہ خود اہل سوڈان کے ہاتھ میں ہے اور سوئز کے علاقہ میں برطانوی فوجوں کا قیام اس لئے ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ کا دفاع تنہا مصر کے بس کی بات نہیں۔

برطانیہ کے اس طرز عمل کا ردعمل مصر میں یہ ہوا ہے کہ وہاں تمام ملک میں برطانیہ کے خلاف زبردست مظاہرے ہو رہے ہیں اور بعض جگہ یہ اس حد تک پہونچ گئے ہیں کہ برطانیہ کو اور مزید فوج طلب کرنا پڑی ہے۔

حفاظتی کونسل سے کوئی توقع رکھنا بیکار ہے کیونکہ وہ بالکل برطانیہ و امریکہ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے اگر یہ سوزش کم نہ ہوئی تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ و مصر کے درمیان لڑائی چھڑ جائے گی اور پھر یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور یہ آگ پھیل کر وادی نیل سے آگے اور کن کن ملکوں تک پہونچے گی۔

کانگرس کی ذہنی تبدیلی

جواہر لال نہرو نے جب سے صدارت کانگرس کی خدمت قبول کی ہے، کانگرس کی ذہنیت میں بہت نمایاں تبدیلی پیدا ہو چلی ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت مہاسبھا کے لیڈروں کی طرف سے جو جو تقریریں سننے میں آرہی ہیں، وہ ان کے احساس کمتری کے ثبوت میں بہ آسانی پیش کی جاسکتی ہیں۔

جواہر لال نہرو نے اس وقت تک سب سے زیادہ مخالفت فرقہ داری ذہنیت کی ہے اور انھوں نے صاف صاف کہدیا ہے کہ وہ اس مکروہ ذہنیت کو محو کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں مہاسبھا کے برہم ہونے کی کیا وجہ ہے، اور وہ کیوں اس ٹوپی کو اپنے سر منڈھ رہی ہے۔

اگر وہ کوئی فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعت نہیں ہے تو وہ اس نشانہ کا ہدف اپنے آپ کو کیوں قرار دے اور اگر واقعی اس کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہے تو اسے اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور یہ دعویٰ چھوڑ دینا چاہئے کہ اس کا پلیٹ فارم مسلمانوں کے لئے بھی کھلا ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ الکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو اور زیادہ آزاد خیال ثابت کرے، لیکن اس کی یہ کوشش بیکار ہوگی کیونکہ مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ مہاسبھا جس کی بنیاد ہی انسانیت کی تفریق اور متعصبانہ قدامت پرستی پر قائم ہے، کبھی مسلمانوں کی دوست نہیں ہوسکتی اور اس کے نزدیک آزاد حکومت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہندو قوم مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینے، ان کو زبردستی ہندو بنالینے اور ان کے معابد کو مندروں میں تبدیل کردینے کے لئے پوری طرح آزاد ہو اور اس سے کم پر وہ حکومت سے سمجھوتہ کرنے کے لئے طیار نہیں۔ پھر ہمیں حیرت مہاسبھا کے اس [illegible] پر نہیں بلکہ حکومت کے اس روادارانہ طرز عمل پر ہے جس نے اس جماعت کے وجود کو اس وقت تک برداشت کیا اور اس سے زیادہ تعجب ہوگا اگر آیندہ الکشن کے بعد نئی حکومت نے بھی یہ عنصر ہندوستان میں باقی رہنے دیا۔

وسط ایشیا کی کلچری ترقی

(بہ سلسلۂ ماسبق)

سوویٹ ادب و کلچر کی بین ملیت اس سے پہلے کہ مختلف سوویٹ قوموں کے ادب کی مدیان ایک بین ملی کا دھارا بن کر بہنے لگیں بعض اہم مرحلے طے ہونا بھی ضروری تھے۔ وفاقی جمہوریتوں میں اتحاد پیدا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ روسی زبان تھی۔ مختلف قوموں کی ایک وفاقی حکومت بننے کے لئے ایک بین ملی زبان کا ہونا ازبس ضروری تھا۔ اور یہ حقیقت دنیا بھر نے مان لی ہے کہ روسی ادب جمہوریت کی اسپرٹ سے مالا مال ہے

اپنی انشاء ادب میں گورکی نے صرف یہی نہیں کیا کہ انیسویں صدی کی تنقیدی واقعیت سے کام لیا بلکہ اس نے لوک گیتوں اور عوامی قصوں سے بھی بڑا کام لیا۔ عوام کی اس بے لکھی شاعری سے معیاری ادب پیدا کر کے ہی اس بات کی ضمانت ہو گیا کہ معیاری ادب اور عوامی ادب کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت آج سوویٹ کے ہر قومی ادب کی خصوصیت بن گئی ہے

یہ اشارہ اوپر کیا جا چکا ہے کہ روسی ادب میں غیر روسی کردار انقلاب سے پہلے بھی پیش کئے جا رہے تھے، لیکن اس وقت ایسا ہونا کسی غایت اور مقصد کی بنا پر نہ تھا۔ لیکن جب اشتراکیت نے تمام سوویٹ قوموں کے بھائی چارے کو ایک حقیقت بنا دیا تو ان تمام قوموں کے ادب میں موضوع اور تکنیک کے اندر از خود وحدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ پورا سوویٹ یونین کے اندر "قومی ایپک اور کلاسک" کا ایک جشن منایا گیا جس میں ہر علاقے کے لوگوں نے ایک قومی تہوار کی طرح دل کھول کر حصہ لیا۔ آج "ڈیوڈ ساسون" "زنگارہ" "فرہاد و شیریں" مجنوں اور خسرو محض فارسی یا ارمنی، محض ازبکی یا آذربیجانی نہیں، بلکہ پوری سوویٹ یونین کے قومی کردار بن گئے ہیں

وسط ایشیا کی قوموں کا کلچر دنیا کے کلچر سے الگ تھلگ نہیں رہا ہے۔ اس میں غیر ملکی جواہر بھی شامل کئے گئے ہیں۔ شیکسپیئر، مولیر، بلزاک، ڈکنس فلابیر، لانگ فیلو، مارک ٹوین اور بہت سے یورپی اہل قلم کی تصانیف سے دل کھول کر استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ازبکستان میں ابراہیم ہدایتوف[1] شیکسپیر کے کرداروں کی تعبیر میں یورپ کے ایکٹروں کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ وسط ایشیا کا ادب ان تمام جلیل القدر فنکاروں سے پوری طرح روشناس ہے، اور بالکل اس طرح جانتا ہے جس طرح وہ سعدی، حافظ اور نوائی سے واقف ہے یا جس طرح مقیمی، مخدوم قلی اور علیبی کو جانتا ہے یا جس طرح پشکن، دوستوئیفسکی، چیخوف اور گورکی سے روشناس ہے۔ — پشکن کے Eugene Onegin کا ترجمہ ایک کے قلم سے ہوا ہے اور "قفقاز کا قیدی" "بنت البحر" کے ترجمے جن میں "جپسی" اور "کپتان کی بیٹی" بھی ہیں۔ اسی طرح لارمانتوف، گوگول، چیخوف، شڈرین، استرافسکی اور گورکی کے مشہور ادب پارے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ تنقیدی ادب کے سلسلہ میں بیلینسکی اور دوبرولیوباف بھی منتقل کر لئے گئے ہیں

اسی کے ساتھ ساتھ اکثر غیر روسی سوویٹ شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے روسی اور دوسری سوویٹ زبانوں میں برابر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں گورکی انسٹی ٹیوٹ کا ذکر بہت ضروری ہے جو محض اس غرض کے لئے قائم کیا گیا ہے کہ عام طور پر دنیا کی زبانوں کے ادب پارے اور خاص طور پر سوویٹ زبانوں کے ادبی کارنامے سوویٹ زبانوں میں منتقل ہوتے رہیں۔ اس طرح ۴۵ سوویٹ زبانوں کا ادب باہم منتقل ہوتا رہتا ہے۔

---

[1] ابراہیم ہدایتوف پر میرا ایک مضمون رسالہ آجکل میں بسلسلہ "وسط ایشیا کے چند فنکار" شایع ہو چکا ہے

در غیر ملکی ادبی کارنامے تمام سوویٹ زبانوں میں ترجمے ہو کر ان کو متمول بناتے رہتے ہیں

کلچری ترقی کے ذیل میں ایک اور اہم کام یہ انجام پا رہا ہے کہ تمام سوویٹ قوموں کے قومی ایپک روسی زبان میں منتقل کر لئے گئے ہیں۔ نظامی گنجوی پر بے حد ریسرچ کی گئی اور اس کا کلیات مبسوط مقدمے کے ساتھ شایع کیا گیا ہے، نظامی کی آٹھ سو سال کی یادگار حال میں پوری سوویٹ یونین میں منائی گئی ہے۔ اسی طرح ملا علی شیر نوائی پر ریسرچ کر کے اس کے کلام کے نفیس ایڈیشن نکلے اور پانصد سالہ برسی بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔

مختلف سوویٹ قوموں کے ادب کے ذیل میں یہ کہنا شاید صحیح نہ ہوگا کہ ایک ادب کے کردار دوسرے ادب میں لے لئے جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان تمام زبانوں کے ادب میں جو کردار تخلیق پاتا ہے وہ بین الملی سوویٹ کردار ہوتا ہے اور اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہر سوویٹ قوم کے ادب کی غایت اور اس کے فن کاروں کی تخئیل بھی بین الملی چیز بن گئی ہے۔ حاجی نصیر الدین اور پرنس اینگو۔ اسی طرح بین الملی ادبی کردار ہیں جس طرح بعض خالص مشرقی کردار روسی ادب کے کردار بن گئے ہیں (ایسے بعض کرداروں کے نام پہلے دئے جا چکے ہیں) الحاصل سوویٹ روس میں ایک مشترک ولیت اور ایک مشترک کلچر وجود میں آگیا ہے

ترکمان، کازاک اور تاجیک زبانوں میں جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، کوئی کلاسک ادب موجود نہ تھا۔ یعنی ان زبانوں میں نثری ادب مفقود تھا۔ چنانچہ تعلیم عام ہو کر ان قوموں میں انشا پرداز اور اہل قلم پیدا ہوئے تو انھوں نے گورکی کی تصانیف کو اپنا کلاسک قرار دیا اور وہی ان کے لئے مشعل ہدایت بنا۔ اس بنا پر گورکی کو اگر وسط ایشیا کے نئے ادب کا بابا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ البتہ یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ چونکہ ان قوموں کے اہل قلم نے گورکی کا اتباع کیا اس لئے ان کا ادب "قومی اسپرٹ" سے لازماً بیگانہ ہوگا۔ کازاک مصنف مثابت مقنع نے خود نوشت سوانح عمری لکھی تو گورکی کا:۔ میرا بچپن۔ اور "دنیا کے اندر" اس کے سامنے تھیں۔ کازاک زبان میں اسے پہلے کوئی کتاب واقعیت نگاری کے اصول پر لکھی ہی نہیں گئی تھی

الغرض، یہ ایک امٹ حقیقت ہے کہ سوویٹ قوموں کے اہل قلم کو انسانیت پرستی، وطنی دوستی اور واقعیت نگاری کی جو تعلیم روسی ادب کے فطرت اور پیروی سے ملی وہ کسی اور ذریعہ سے نہ مل سکتی تھی۔ سب سے بڑا فائدہ ان قوموں کو یہ پہونچا کہ وہ محدود قسم کی قوم پرستی اور روایتی قیود بند سے چھٹکارا پا گئیں، تعصب اور تنگ نظری کی بلا سے بچ گئیں اور واقعیتی صناعت ادب کی وسیع اور روشن شاہراہ پر قدم زن ہو سکیں

جس طرح سوویٹ اقویت سافتری ادب کا سہرا گورکی کے سر ہے اس طرح شعری ادب کی رہبری کا فخر مایاکوفسکی کو حاصل ہے۔ ان قوموں کے ادب میں مایاکوفسکی کی شعری روایات نے زندگی کی قوت بخشی۔ وسط ایشیا کے جدید شاعروں نے مایاکوفسکی کے اتباع میں عروض کی اکثر پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اس لئے قدامت پرستوں نے اتنی سخت مخالفت کی کہ کچھ دیر کے لئے تو شعر و ادب کی ترقی رک گئی، لکیر کے فقیر قصیدہ گو شاعر فی الجملہ سماج کے اندر اثر رکھتے تھے اور ان کی مخالفت کارگر تھی۔ لیکن نئی نسل کے شاعر بھی اسی سختی سے اڑے رہے — مایاکوفسکی کی روایات شعری نے ان کے بازوؤں کو قوی تر بنا دیا تھا اس لئے وہ کامیاب ہو کر رہے

خصوصیت کے ساتھ مایاکوفسکی کا اثر غفور غلام، شیخ زادہ اور ملکسون وغیرہ کے کلام میں زیادہ ملتا ہے۔ لیکن ان شاعروں نے مایاکوفسکی کا اتباع محض کورانہ تقلید کی صورت میں نہیں کیا بلکہ اپنے قومی جمالیاتی احساس کو مایاکوفسکی کے رنگ میں بیان کیا ان شعراء کے کلام میں آزاد شدہ قوم کی وطنی آرزوئیں اور رفعت انسانی کے ولولے میں قومی اتحاد پر زور اور پر تاثیر طریقے پر پیش ہوا ہے

غفور غلام ازبکستان کا بے حد محبوب شاعر ہے، اور اپنے شاعر سے اس قدر محبت کرنا ازبک عوام کے کلچر کی حد بھی بتا دیتا ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ایک واقعہ کافی سے زیادہ ثبوت ہے:۔

دہلی کی طرح تاشقند بھی دو حصوں پر منقسم ہے۔ نیا تاشقند اور پرانا تاشقند۔ غفور پرانے شہر میں رہتا ہے۔ نئے تاشقند میں اس کی ملاقات ایک روسی شاعر سے ہوتی ہے۔ جب رخصت ہوتے ہیں تو غفور اس روسی شاعر کو اپنے گھر کا پتا بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ "پرانے شہر میں پہونچ کر کسی سے بھی پوچھ لینا، وہ تمھیں میرے گھر پہونچا دے گا۔" تاشقند دس لاکھ کی آبادی کا شہر ہے، لیکن پھر بھی تاشقند کا ہر شہری غفور کا مکان جانتا ہے اور پوچھنے والے کو غفور کے گھر تک پہونچا دینے پر مکلف بھی ہے۔ اس ایک واقعہ سے ایک شاعر کی بے مثال مقبولیت اور ایک قوم کی ادب پرستی اور کلچری بلندی،

دونوں ثابت ہو جاتی ہیں

قومی پیکر ادب اور اس کا اشتراکی وصف

اشتراکی حقیقت نگاری اختیار کرنے کے ساتھ ادب میں نئے اصناف داخل ہونے لازمی تھے اور وسط ایشیا کی مختلف قوموں کے ادب کا شکل و صورت کے اعتبار سے "قومی" ہونا اور وصف و نوعیت کے اعتبار سے "اشتراکی" ہونا اب ایک واقعہ اور حقیقت بن گیا ہے ۔ اسٹالین کے اس نظریے کی مزید تشریح یہ ہے کہ سارے فن کاروں کی کوشش یہ رہتی ہے کہ قومی کلاسیکی ادب کی بہترین روایات کے خزانے جن کو قومی فطانت نے صدیوں میں جمع کیا تھا، نئے عہد کے ترقی پسند خیالات کے ساتھ سموئے جائیں۔ اس کوشش کا ماحصل یہ ہے کہ تمام سوویٹ قوموں کا ادب صناعتی ترقی کی اس منزل میں ہے جہاں سے وہ بین قومی یگانگت و اتحاد کا ضامن بن گیا ہے

وسط ایشیا کی پرانی تہذیب بالکل ایرانی رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لئے شاعری کا پرواز بھی ایرانی تھا۔ ہندوستانی شاعری کی طرح ردیف قافیہ وہاں بھی لازمی چیز تھا۔ لیکن اب نئے پیکر اختیار کئے گئے ہیں اور قافیے کی پابندی باعتبار صورت رہ گئی ہے۔ لیکن ان جدتوں یا بدعتوں کے باوجود ہر قوم کا ادب شدت کے ساتھ "قومی" ہے اور مشرقی رنگ و انداز جوں کا توں قایم ہے۔ خیالات و تصورات، اوزان و اصناف، رموز و استعارات سب کچھ مشرقی ہے۔ طویل نظموں کے بیچ بیچ میں حکایتیں اور غزلیں اسی طرح دیجاتی ہیں جیسے مثنوی مولانا روم میں ہیں، اور یہ مشرقی رنگ ہر اعتبار اور ہر جہت سے مقامی اور قومی ہے اور اجنبیت دیکھنے کو نہیں ہے۔ آخر مضمون میں تین غزلیں جو اصل زبان میں میری نظر سے گزری ہیں شامل کی جارہی ہیں۔ ان کو پڑھ کر ان تمام باتوں کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے

وسط ایشیا کی اقتصادی حالت

کسی قوم کی کلچری ترقی کو سمجھنے کے لئے اس کے اقتصادیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ کلچری ترقی کے معنے ہیں کہ معیار زندگی اونچا ہو، اور زندگی کا معیار اونچا ہونا اقتصادی بحالی پر منحصر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کلچری ترقی کے معنے ہی اقتصادی ترقی کے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد تمام تر مادی حقیقت، یعنے اقتصادیات پر قایم ہے، اس کی نظر میں کلچر اور اقتصاد کی ترقی لازم و ملزوم ہے۔ چنانچہ وسط ایشیا کی قوموں نے اگر کلچری ترقی کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں صنعتی ترقی بھی اسی تیزی کے ساتھ ہوئی ہے

وسط ایشیا کے علاقوں میں زار شاہی زمانہ میں کوئی کارخانہ اور فیکٹری نہ تھی۔ سائبیرین ریلوے کی وجہ سے دو چار ورکشاپ قایم کئے گئے تھے جنمیں مشکل سے دو چار ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سوویٹ یونین کی پالیسی یہ ہے کہ پچھڑے علاقے تیز ترقی کریں تاکہ کلچری اعتبار سے ترقی یافتہ علاقوں کے برابر ہو جائیں۔ اس لئے جتنی نئی انڈسٹری قایم ہوئی اس کا بڑا حصہ روس کے ایشیائی علاقوں ہی میں قایم کیا گیا۔ بین اقوامی حالات کا بھی تقاضا یہ تھا کہ سوویٹ انڈسٹری جہاں تک ہو سکے وسیع علاقے میں پھیلا دی جائے۔ کیونکہ جنگ کی حالت میں تنگ کارخانے آسانی سے برباد کئے جا سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ سوویٹ طاقت کو فوجی اعتبار سے اپنے دونوں پہلو سنبھالنا ضروری تھے۔ مشرق میں جاپان کا خطرہ اور مغرب میں جرمنی حملہ کا اندیشہ۔ اس بنا پر سرخ فوج دو جداگانہ حصوں میں منظم کی گئی۔ اور ہر حصہ کے لئے پوری جنگی صنعت اسی علاقے میں قایم کرنا ضروری ہو گیا تاکہ فوجی سپلائی اور رسد رسانی کے انتظامات فوج کے ہر حصہ کے لئے علیحدہ علیحدہ رہیں ـــــ لہذا مشرقی سرخ فوج کی ضرورت کی ساری جنگی انڈسٹری اسی علاقہ میں قایم ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں مغربی روس کی انڈسٹری کو بھی مشرقی علاقے میں منتقل کرنا پڑا تھا۔ پھر ساری سوویٹ یونین کے لئے روئی کی سپلائی وسط ایشیا کا علاقہ فراہم کرتا ہے۔ اس لئے کپڑے کی ساری صنعت اور ان خام پیداواروں کی صنعتیں جو اس علاقے میں پیدا ہوتی ہیں، اس علاقہ میں قایم ہوئیں۔ کاشت کو اتنی ترقی دی گئی ہے کہ ریگستان مرغزار بن گیا ہے۔ ایک بڑی نہر نکال کر فرہاد کے نام پر ایک بجلی پیدا کرنے کا زبردست اسٹیشن بنایا گیا ہے اور فی الواقعہ بے ستون کو کاٹ کر یہ نہر نکالی گئی ہے۔ اس ذکر میں یہ مکالمہ یقیناً دلچسپ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں اکیلے ازبکستان کی صنعتی پیداوار اس سال کی افغانستان، ایران اور ترکی کی مجموعی پیداوار سے زیادہ تھی، حالانکہ ازبکستان کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے اور ان تینوں ملکوں کی ساڑھے چار کروڑ ــ یہ حقیقت ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہئے کہ سوویٹ یونین کے ایک علاقے میں جو حالات نظر آئیں گے وہی کم و بیش دوسرے علاقوں میں بھی دکھائی

دیں گے۔ ظاہر ہے کہ صنعتی پیداوار سائنسی ترقی کی محتاج ہے، اور سائنس نے جتنی ترقی سوویٹ روس میں کی ہے، اس کے بیان کے لئے ایک مبسوط کتاب بھی کافی نہ ہوگی

زمانہ جنگ کا ادب کثیر الملی سوویٹ کلچر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا کہ نازی جرمنی نے حملہ کر دیا۔ بہت سے اہلِ فن اور صناعوں نے مطالعہ کے کمروں کو مورچے کی خندقوں سے بدل لیا۔ اکثر لکھنے والے پہلی مرتبہ اخباری نامہ نگاروں کی حیثیت سے جنگی محاذوں پر پہونچے اور جو اہلِ قلم ادبی محاذ پر ہی رہے انھوں نے اسٹالین کی جولائی ۱۹۴۱ء والی اپیل کی تعمیل میں وطنی جہاد کا وعظ اور ناپاک دشمن سے تنفر کی تلقین شروع کر دی۔ نثر نگار، واقعاتی اسکیچوں اور "رپورتاج" کی شکل میں سرخ فوج کے امٹ کارنامے بیان کرنے لگے، مورچے کے پیچھے جو مرد، عورت، بوڑھے بچے جنگی خدمات میں لگے تھے ان کو زندۂ جاوید بنانے لگے۔ اُس وقت کے سوویٹ ادب میں بلکہ تمام وسطی ایشیا کے ادب میں دشمن دشمنی، رسد کی روزافزوں تنظیم اور میدانِ جنگ پر جانبازی اور سورمائی کے زندہ مرقعے نظر آتے ہیں۔ کثیر الملی سوویٹ شہریوں کا غیر محدود حوصلہ اور وطنی محبت کے وہ مناظر سامنے آتے ہیں، جہاں شکست مکروہ ہوتی اور موت عزیز ہو جاتی ہے

ایک نہایت معمولی اور چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس کی تہ میں بہت بڑی اہمیت چھپی ہوئی ہے۔ ایک سرخ سپاہی اپنی خندق سے دشمن کے بڑھتے ہوئے ٹینک پر ہاتھ سے گولا پھینکتا ہے، وہ نشانہ اتنا غلط ٹھہرتا ہے کہ پھینکنے والے کو ذلت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے ساتھی سمجھے ہوں گے کہ مجھ پر خوف غالب ہو گیا تھا جب ہی تو نشانہ اتنا غلط پڑا! اب اس سرخ سپاہی نے اپنے اوپر لازم کر لیا کہ کوئی ایسا عمل کرے کہ ساتھیوں نے اسے ڈرپوک سمجھ بھی لیا ہو تو اس کا ازالہ ہو جائے۔ چنانچہ دشمن کا جو دوسرا ٹینک اس کی سیدھ میں آرہا ہے، وہ سپاہی اس پر گولا نہیں پھینکتا اور بڑھتا آنے دیتا ہے۔ وہ ٹینک بڑھتا آتا ہے یہاں تک کہ اس خندق کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ مگر وہ سرخ سپاہی اب بھی اس پر گولا پھینک کر تباہ نہیں کرتا۔ جب وہ ٹینک اس کے اوپر سے گزر کر کچھ فاصلے پر پہونچتا ہے تو یہ سپاہی خندق سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا اور پھر گولا مار کر اس ٹینک کو تباہ کر دیتا ہے اس واقعہ کی اہمیت اس سپاہی کے عمل میں نہیں بلکہ اس کے احساس میں ہے

دورانِ جنگ کے سوویٹ ادب میں ایسے بے شمار کردار تخلیق ہوئے جس سے یہ ادب پہلے سے روشناس نہ تھا۔ عبداللہ قہار نے "نجکا عرزی" کی سوانح عمری لکھی جو ایک فوجی آدمی تھا۔ اس سوانح عمری کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے داخلی کردار کے سلسلہ میں یہ بتاتا ہے کہ اس ہیرو کے سرفروشانہ اور جانبازانہ کارناموں کے اندر کونسی اسپرٹ کام کر رہی تھی، اس کی اصل و بنیاد کیا تھی۔

جنگ سے پہلے سوویٹ قوموں کے ادب میں جس لازوال قومی بھائی چارے کا اظہار ہو رہا تھا، وہ جنگ کے زمانہ میں زیادہ گہرا اور زیادہ مخلصانہ ہو گیا تھا۔ ہر قوم کے ادب نے صرف اپنی قوم ہی کے ہیرو اور کردار پیدا نہیں کئے، بلکہ دوسری سوویٹ قوموں کے ہیرو بھی تخلیق کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرخ فوج کے ہیرو تخلیق کرنے کے عمل نے تمام قوموں کے ادب کی ندیوں کو ایک بڑے دریا کا دھارا بنا دیا۔ ازبک شاعر شہزادہ فاتح درندوں کے ہاتھوں یورپی قوموں کی تباہی دیکھتا ہے تو تڑپ کر چیخنے لگتا ہے:-

"جو صناعتی اور کلچری جواہر صدیوں میں جمع ہوئے تھے وہ آناً فاناً خاک سیاہ کر دئے گئے اور ان ایوانوں میں اُلّو بول رہا ہے! یورپ! آتش زدہ جنگل یورپ! لشکر زدہ زراعت یورپ! آج یورپ کی زمین زمین نہیں، ٹینکوں کے غار ہیں اور بس! آج یورپ کی ہوا زہریلی ہے اور زہر خوردہ لاشوں سے پٹا پڑا ہے! آج یورپ کے شہروں کے انبار اوجاڑ اور مکان بے سقف و در ہیں! مکانوں کے تہ خانوں میں انسانی کھوپڑیوں کے خزانے بھرے ہیں! آج یورپ کی دوشیزہ اپنے محبوب کے دیدار سے محروم ہے! آج یورپ کے بچے اپنے مردہ ماں باپ کے انتظار میں بلک رہے ہیں! یورپ! یورپ!"— اس پوری نظم میں بین قومیت اور انسانیت پرستی کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ فرانس، پولینڈ، آسٹریا، اور چیکوسلواکیا کے محب وطن شاعر اپنے وطن کی تباہی کا نوحہ اس نظم سے بہتر کیا لکھتے؟

کلچری نمائشیں سوویٹ آئین نے رنگ و نسل کا فرق جرم قرار دیدیا اور کلچری برابری کے لئے سوویٹ حکومت نے بجٹ ایسے بنائے اور انڈسٹری کو اس طرح مرتب کیا کہ آئین اور پالیسی پوری طرح کامیاب ہوں۔ مگر ان تحفظات کو بھی کافی نہیں سمجھا گیا۔

——— الغرض ہر وفاقی جمہوریہ نے اپنے جوہر قابل بھیج کر اس جشن رنگ و رامش کو کامیاب بنایا تھا

ترکمان موسیقی طرازوں اور سنگیت کاروں نے اعلیٰ پائے کی تخلیقیں کی ہیں۔ قلیاں کا ریرا "آبادان" اور اپیدے سنی کوٹ کا پیرا "شاہ سنم و غریب" اور قلیاں اور دیگر ترکمان کلاکاروں کی مشترک کوشش کا نتیجہ "سلام استالین" کی عالیشان نمائشیں ہو چکی ہیں

سوویٹ مصنفین کی یونین

ماسکو میں پوری سوویٹ یونین کے شاعروں اور اہل قلم کی یونین کا ایک مرکز ہے جس کی شاخیں تمام وفاقی جمہوریتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ماسکو کا مرکز یا تو دعوت نامے بھیج کر وفاقی جمہوریتوں کے ادیبوں کو بلاتا اور اس جمہوریہ کے نام سے "ایک شام" منعقد کی جاتی ہے یا سوویٹ اور غیر سوویٹ مصنف جب ماسکو آتے ہیں تو ان کے اعزاز میں "شام" کے یہ اجتماع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس ادبی کلب اور مرکز کی یہ "شامیں" کثرت سے منعقد ہوتی اور اب ایک مستقل ادارہ بن گئی اور قومی بھائی چارے کی پالیسی کا عملی پہلو ہیں

چنانچہ ۱۹۴۹ء کی سردیوں میں ماسکو کی سڑکوں پر تا مرطوب رنگ کی صورتیں عام دیکھی جا رہی تھیں، کیونکہ سوویٹ مصنفین کے کلب نے روشن منظر ازبکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو مہمان بلایا تھا۔ چنانچہ اس "شام" پلیٹ فارم پر بیت سے بیلو روسی، یوکرینی، روسی، لیتھونیا اور دیگر قومیتوں کے ادیب و شاعر بیٹھے تھے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا

سب سے پہلے حمید عالم جان، ازبک مصنفین کی یونین کے سکریٹری نے تقریر کی اور مشہور ازبک مورخ شرف الدین علی یزدی قدیم شاعر کاشغری، سیاکی لطفی اور علی شیر نوائی کے حوالوں سے بتایا کہ مشرقی ادب میں ازبک ادب کس قدر زیادہ متمول ہے اور یہ کہ زمانۂ تاریخ میں اس نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے اور آج کس طرح اپنی قومی و کلاسکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سوویٹ ادب کے بڑھتے دھارے میں مل کر بہ رہا ہے۔ اس نے اس حقیقت پر خوشی ظاہر کی کہ موجودہ ازبک شعراء اور ادیبوں کے نام جیسے غفور غلام، شیخزادہ، ایلغون اور آقائے شعراء اختر و ایبک سوویٹ یونین کے بچے بچے کو معلوم ہیں

حمید کی تقریر کے بعد ازبک شاعروں نے اپنی نظمیں اور ان کا روسی ترجمہ سنایا۔ یہ ادبی پروگرام نوائی کی مثنوی "فرہاد و شیریں" کے چند شعر اور پھر ازبک ایپک "روشن" کا کچھ حصہ سنانے پر ختم ہوا۔ اس پرانے ایپک کے اشعار جو سنائے گئے ان میں بازار کا بیان تھا اور ادبی اظہار کی قدرت، تخیل کے تمول، بیان کی شگفتگی اور نازک مزاجی رنگ کا نمونہ ہیں۔ بازار کا یہ بیان دنیا کے ادب پاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے

اس شام کا باقی پروگرام رقص و موسیقی اور نغمہ طرازی پر مشتمل تھا۔ ازبک رقص ہندوستانی ناچ کی طرح زیادہ تر ہاتھوں کے حرکات اور چہرے کے آثار چڑھاؤ یا اوپر کے حصۂ جسم کی حرکات پر مشتمل ہے۔ رقاصہ کے بازوؤں اور کلائیوں کی حرکات میں ایک وقت اگر سانپ کی لہریں چال نظر آتی ہے تو کبھی شہپروں کے آمادۂ پرواز ہونے کا نقشہ پیش ہو جاتا ہے۔ کسی وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کپڑے پر بخیہ کیا جا رہا ہے تو دوسرے وقت روئی کے کاتنے کی کیفیت سامنے آ جاتی ہے۔ رقص کرنے والی کے خد و خال بہت زیادہ معنی آفرینی ہوتے ہیں ——— ازبک رقص کا کمال یہ ہے کہ رقاصہ کے چہرے کے نقوش کبھی خم محراب کی شعریت کا اشارہ کرتے ہیں اور کبھی نشۂ شباب کا جادو محسوس ہونے لگتے ہیں

شان و جمال کی تصویر، رقاصہ مکرم ترغون بائیفا نے جب اپنے سفید ریشمی کرتے کی دراز آستین کو دانتوں میں دبا کر بساط رقص پر [illegible] کیا تو لوگ وقت کا شمار بھول گئے۔ انداز رقص میں اس کے مسکرا دینے سے تماشائیوں کو زندگی کی لطافتیں یاد آ گئیں۔ اور جب اس نے ناچتے ناچتے پاؤں کے پنجے پر پھیرکیاں لیں تو لوگوں کو چکر آنے لگے تھے

حلیمہ نصیروفا، سوویٹ یونین کے "صناع عوام" کے معزز خطاب سے سرفراز ہے، اور مشہور ہے کہ وہ عورت کے نہیں بلکہ بلبل کے گلے سے گاتی ہے۔ گانے میں اس کی آواز کھنکنے لگتی ہے۔ ایک نقاد نے لکھا ہے کہ وہ جب گاتی ہے تو کانچ کی طرح ٹانک معلوم ہوتی ہے اور اس کے گانے میں ایک غیر معمولی جوش اور بے تکلفی ہے ——— حلیمہ نہ صرف سوویٹ یونین کی متعدد زبانیں جانتی ہے بلکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی گاتی ہے اور اس کا یہ گانا خود ان زبانوں کے بولنے اور گانے والوں کی طرح مکمل ہوتا ہے۔ جتنی وہ باکمال گانے والی ہے اتنی ہی شوخ و طرار بھی ہے۔ [illegible] نمائش فن کر کے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے

اس کلچری اجتماع میں جمیل زاہد بھی شریک تھا۔ سوویٹ یونین کے گوشے گوشے میں جس کا احترام کیا جاتا ہے
"کلچری جشنوں" کی تفصیلات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے

وسط ایشیا کے علمی ادارے

سوویٹ روس کے جامعہ کی شاخیں ہر وفاقی جمہوریت کے مرکز میں قایم ہیں جہاں ہر شعبے کی تحقیق و تلاش برابر ہوتی رہتی ہے۔ اس پورے علاقے کی علمی و کلچری حرکت و عمل اندازہ کرنے کے لئے صرف ازبکستان کا ذکر کافی ہوگا ——— اس لئے کہ سوویٹ یونین میں جو کام ایک علاقے میں ہو رہا ہے وہ باقی حصوں میں اسی پیمانے پر جاری رہتا ہے۔ ازبکستان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز ڈاکٹر یا جان نیاز محمودوف کی ہستی ہے۔ اپنی معروفیت کے اعتبار سے نیاز محمودوف ازبکستان کے "زبان و خیال" کے انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقاتی کام کرتا اور پہلا ماہر لسانیات ہے۔ قومی لحاظ سے وہ تاجیک نسل سے ہے جہاں انقلاب سے پہلے کوئی تحریری زبان بھی نہ تھی۔ نیاز محمودوف نے اسی تاجیک زبان کے صرف و نحو مرتب کئے ہیں۔ وہ خود ایک غریب موچی کا لڑکا ہے اور اگر اس کا باپ بہت بڑا دولتمند بھی ہوتا تب بھی نیاز محمودوف کو وہ نہ بنا سکتا جو اسے سوویٹ نظام نے بنا دیا ہے

۱۹۵۶ء میں میرا ایک مضمون علیگڈھ کے رسالۂ مصنف میں "ازبکستان میں علمی سرگرمیاں" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں میں نے وہاں کے متعدد علمی و کلچری اداروں کے حالات بہم پہونچائے ہیں۔ اس لئے اس جگہ صرف ان کا حوالہ کافی سمجھتا ہوں۔ سوویٹ یونین کے ادارۂ شرقیات کی تاشقندی شاخ نے نظامی گنجوی کے فن و کلام پر پوری تحقیق و تدقیق کر کے اس کا کلیات ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ اصل اور روسی ترجمے کی صورت میں شایع کیا ہے۔ تاشقند میں ایک اور ادارہ "لسانی تحقیق" کے لئے مخصوص ہے۔ اس ادارے نے ملا علی شیر نوائی کے علم و فضل اور شعر و ادب پر تحقیق کی ہے، اس کی ایک سوانح عمری مرتب کی ہے اور اس کے کلیات کا ترجمہ روسی زبان میں کرایا ہے۔ تاشقندی شاخ جامعہ علوم نے ایک مشرقی مخطوطات کا کتب خانہ بھی فراہم کیا ہے جس میں پچھتر ہزار قلمی نسخے ہیں اور دنیا میں اس قسم کا سب سے زیادہ عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ قلمی نسخوں کے علاوہ پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں ایسی ہیں جو قلمی مسودوں سے بھی زیادہ نادر ہیں۔ وہاں ایک اور ادارہ ہے جو سوویٹ یونین کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ازبکستانی کمیٹی کہلاتا ہے۔ اس ادارے نے بہت سی اہم تاریخی تحقیقات مکمل کی ہیں جن میں گور امیر یعنی امیر تیمور کے مقبرہ اور شہزادۂ الغ بیگ کی رصدگاہ، اکثر مقبروں اور مساجد کا کھوج لگایا، مرمت کرائی یا تعمیر ثانی کی ہے۔ قاری نیازوف جو اس ادارے کا صدر بھی ہے، رصدگاہ الغ بیگ اور اس کی زیچ پر سند مانا جاتا ہے۔ ایک اور ادارہ "انسٹی ٹیوٹ آف میٹریل کلچر" کے نام سے قایم ہے جس نے حال ہی میں دریائے سیر کے کنارے شہر خوارزم کے پانچ ہزار سال پرانے تمدن کے آثار نکالے ہیں اور کام جاری ہے

اسی طرح دوسری جمہوریتوں میں بھی یہ تمام کام ہو رہے ہیں۔ ترکمانیہ میں شیخ جمال الحق والدین کا مزار از سر نو تعمیر کرایا گیا مگر بالکل پرانے نقشے پر۔ یہ مقبرہ شیخ کے لڑکے محمد نے ۱۶۵۰ء کے قریب تعمیر کرایا تھا اور ماہرین کے خیال میں ایک نہایت اہم تعمیری نمونہ ہے۔ مرو میں سلطان سنجر کا مقبرہ بھی ایک قدیم عمارت ہے جس کی صناعی بے مثال سمجھی جاتی ہے۔ ایک اور عمارت طائرہ بیگ خانم کا مقبرہ ہے۔ اسے امیر تیمور کی بیگم بتایا جاتا ہے ان سب کی مرمت یا تعمیر ثانی ہوئی ہے۔ تشتر آباد، سرائے اور مارتی کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ یہاں ایک قدیم شہر کے آثار نکالے جا رہے ہیں جس کے متعلق خیال ہے کہ گیارھویں صدی میں آباد تھا

۱۹۵۴ء کے مجلہ ہندوستانی میں میرا ایک اور مضمون شایع ہوا تھا جس کا عنوان ہے "وسط ایشیا کی قوموں کا سوویٹ ادب" ——— ——— طوالت کے خیال سے مزید نمونے شامل نہیں کر رہا ہوں مگر آخر میں تین شاعروں کی غزلیں اصل زبان میں دیتا ہوں جو ایک ہی ردیف قافئے میں کہی گئی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان غزلوں میں طرز و تکنیک اور "قومی پیکر و اشتراکی وصف" کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ لاہوتی (ابوالقاسم) اصلاً ایرانی ہے اور اپنے ترقی پسندانہ فکر و خیال کی بنا پر ترک وطن پر مجبور ہوا۔ تاجکستانی وطنیت اختیار کی اور اب یہاں کا قومی شاعر ہے

نوشیم بہ شادمانی آن دم شراب سرخ — کز شرق انقلاب دمد آفتاب سرخ

نازم بہ آن زمان کہ بہ نیروے تیکت (درانتی) و داس (ہتوڑا) — دہقان نہد بہ گردن سلطان طناب سرخ

قرباں آں مے کہ زخونِ تونگراں
دربادۂ انقلاب شود چو حباب سرخ

درخونِ شیخ و شحنہ وشہ واجب است غسل
در شرعِ انقلاب بہ نقشِ کتاب سرخ

مرد آں بود کہ رقص نماید بخونِ خویش
در بزمِ انقلاب بہ آہنگِ رباب سرخ

عینی :- در آتشِ ستم جگرم شد کباب سرخ
از خونِ مستبد قدحے دہ شراب سرخ

بر انقلاب روئے مرا سرخ مے کند
از انقلاب سرخ و در آفتاب سرخ

عینی بیک غزل نتواں شرحِ حال کرد
باید بہ انقلاب نوشتن کتاب سرخ

فطرت :- آفاق را گرفتہ سراسر سحاب سرخ
گویا زمانہ بستہ بہ گردن طناب سرخ

در خاک و خوں فتادنِ بنیانِ جور و ظلم
تفسیر آیتے ست ز ام الکتاب سرخ

اے چشمِ غیر خوردہ ببیں انقلاب را
صد بحرِ خوں بروں جہد از ایں حباب سرخ

اصحابِ ثروت ایکہ جہاں را بخوں زدید
حاضر شوید اینک بہ یوم الحساب سرخ

ہرگز مگو کہ شیخ شود اہلِ انقلاب
باور مکن کہ ہست بعالم غراب سرخ

ممنونِ دستِ ساقیِ کوثر نمی شوم
از خونِ ظالماں تو دہد گر شراب سرخ

فطرت مخور فریبِ سیہ طینتانِ زہد
ہر چند بستہ اند بعارض نقاب سرخ

لطیف الدین احمد

"نگار" کے پرانے متفرق پرچے

سنہ ۳۱ء = جنوری (فراست التحریر) عار - جولائی ۸ر - اگست ۸ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۸ر - دسمبر ۸ر -

سنہ ۳۲ء = فروری ۱۲ر - مئی ۱۲ر - جولائی ۱۲ر - ستمبر ۱۲ر -

سنہ ۳۷ء = جنوری، فروری (اصحاب کہف) عہ ر - مارچ ۸ر - مئی ۱۲ر - جون ۸ر - جولائی ۱۲ر - اگست ۱۲ر -

سنہ ۳۸ء = جنوری (تاریخ اسلامی ہند) عہ ر — فروری ۱۲ر - اپریل عہ ر - مئی تا دسمبر فی کاپی ۸ر

سنہ ۳۹ء = جنوری (مصحفی نمبر) عار - فروری ۸ر - مارچ ۸ر - اپریل ۸ر - اکتوبر ۸ر -

سنہ ۴۰ء = فروری ۸ر - مارچ ۸ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۸ر - نومبر ۸ر - دسمبر ۸ر - جون تا دسمبر فی کاپی ۸ر

سنہ ۴۴ء = مارچ ۱۲ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر

سنہ ۴۵ء = اپریل ۱۲ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۱۲ر -

سنہ ۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) عہ - اپریل تا اگست مسلسل فی کاپی ستمبر ۱۲ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر عہ ر

سنہ ۴۷ء = جنوری (اصغر و جلیل نمبر) عار - مارچ ۱۲ر - اگست ۱۲ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۸ر - دسمبر عہ ر

سنہ ۴۸ء = جنوری فروری (پاکستان نمبر) ے ر - مارچ ۱۲ر - مئی ۱۲ر - جون ۸ر - جولائی ۸ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - نومبر ۱۲ر - دسمبر

سنہ ۴۹ء = جنوری فروری (افسانہ نمبر) عہ - مارچ تا جولائی مسلسل فی کاپی

سنہ ۵۰ء = جنوری، فروری (تنقید نمبر) عار - مارچ ۱۲ر - اپریل - مئی ۸ر - جون ۸ر - جولائی ۸ر - اکتوبر ۸ر - نو - دسمبر ۱۲ر

منیجر نگار لکھنؤ

انسان و انسانِ اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

(بسلسلۂ ماسبق)

فرزان ـــ توبہ! ـــ وہی پرانے قصے! ـــ بد طینت دوست! تمہاری فطرت کا ایک کمزور پہلو ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ تم بہت جلد فریب کھا جاتے ہو۔ تم انسان کو خود اسی کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ تم نے اس کی بابت جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ اسے اپنی سب سے بڑی تعریف سمجھے گا۔ اُسے خود کو بہادر و بد سمجھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ـــ وہ صرف بزدل ہے۔ اُسے تم ظالم۔ بے رحم۔ قاتل۔ قزاق۔ تہذیب پسند کہہ کر پکارو تو وہ تمہاری پرستش کرے گا اور اپنی رگوں میں قدیم "بحری سلاطین" کا خون رواں دواں محسوس کر کے نشۂ غرور سے جھومنے لگے گا۔ اُسے "بزدل" کہو تو وہ غصہ سے دیوانہ ہو جائے گا اور اس نیش زن حقیقت کو مٹانے کے لئے موت سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ انسان اپنے فعل و عمل کی صرف ایک خاص وجہ کے علاوہ ہر ایک وجہ پیش کر دیتا ہے ـــ اپنے جرائم کے لئے صرف ایک خاص عذر کے علاوہ ہر ایک عذر ظاہر کر دیتا ہے ـــ اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے صرف ایک چیز کے علاوہ ہر چیز کا معترف ہو جاتا ہے ـــ وہ چیز ہے اس کی بزدلی! ـــ ہاں یہی۔ اس کی تمام تہذیب اس کی اسی بزدلی اور حقیر و پست اطاعت پسندی پر قائم ہے۔ وہ اسے اپنی شرافت کہتا ہے۔ گدھا اور بیل بھی ایک خاص حد سے آگے محکومیت گوارا نہیں کر سکتا، لیکن انسان لامتناہی طور پر خود کو ذلیل کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کی بد طینتی خود اس کے ستانے والوں کی نظر میں اس قدر نفرت انگیز ہو جاتی ہے کہ وہ خود ہی اس کی اصلاح پر مجبور ہو جاتے ہیں

ابلیس ـــ بالکل صحیح! ـــ یہ ہے وہ مخلوق جس کے اندر تم وہ شے دیکھتے ہو جسے تمہارے الفاظ میں "قوتِ حیات" کہنا چاہئے!

فرزان بیشک! ـــ کیونکہ ابھی اس مسئلہ کا انتہائی حیرتناک پہلو تو میں نے بیان ہی نہیں کیا

ابلیس ـــ وہ کیا ہے؟

فرزان ـــ یہی کہ اس بزدل مخلوق میں سے ہر ایک کو صرف اس کے دماغ میں ایک خیال پیدا کر کے بہادر و شجاع بنایا جا سکتا ہے

مجسمہ ـــ یہ بالکل لغو ہے۔ ایک تجربہ کار سپاہی کی حیثیت سے میں بزدلی کا اعتراف کرتا ہوں ـــ یہ عیب اسی قدر عام ہے جتنی کہ سمندری بیماری اور اسی قدر غیر اہم بھی ـــ لیکن یہ انسان کے دماغ میں خیال پیدا کرنے والی بات بالکل لغو و مہمل ہے۔ میدان جنگ میں نبرد آزمائی کرنے کے لئے تمہیں صرف تھوڑے سے گرم خون اور اس پختہ یقین و علم کی ضرورت ہے کہ شکست فتح سے زیادہ خطرناک ہے

فرزان ـــ یہی وجہ ہے شاید کہ جنگ اکثر بے کار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن انسان اُس وقت تک درحقیقت خوف پر غالب نہیں آتا جب تک وہ یہ تصور نہ کرے کہ وہ ایک عالمگیر مقصد کی کامیابی کے لئے جنگ کر رہا ہے ـــ یعنی ایک خاص ذہنیت و خیال کی خاطر لڑ رہا ہے ـــ صلیبی جنگ کا سپاہی بحری قزاق سے زیادہ بہادر کیوں تھا؟ ـــ صرف اس لئے کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ صلیب کے لئے لڑتا تھا۔ وہ کونسی قوت تھی جس نے صلیبی سپاہی کا مقابلہ اتنی ہی شجاعت کے ساتھ کیا جتنی کہ وہ خود رکھتا تھا؟ ـــ یہ قوت اُن انسانوں کی طاقت تھی جو اپنے واسطے نہیں بلکہ اسلام کی خاطر مصروفِ پیکار تھے۔ گو ہم ہم خود اپنے جان و مال کے لئے لڑ رہے تھے لیکن اُنھوں نے ہم سے تیونس چھین لیا۔

اس کے بعد جب خود ہم نے بھی اُس عظیم حریتِ خیال و اعتقاد کی خاطر نبرد آزمائی کی جسے "کیتھولک کلیسا" یا ایک آزاد مذہبیت تعبیر کرنا چاہئے تو ہم نے اُن کو پھر افریقہ کی طرف دھکیل دیا!

ابلیس — (طنزیہ) کیا فرمایا؟ — آپ اور ایک کیتھولک! — ایک عابد! — مُبارکباد قبول فرمائیے!

مجسمہ — (سنجیدگی سے) دیکھو! — ایک سپاہی کی حیثیت سے میں کلیسا کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔

فرزان — خوف نہ کیجئے کپتان صاحب! — یہ آزاد مذہبیت کا خیال و اعتقاد خود اسلام۔ صلیب اور اُن نا اہل طفلانہ و غیر مہذب سورماؤں کے بعد بھی زندہ رہے گا جن کی جماعت کو تم فوج کے نام سے یاد کرتے ہو۔

مجسمہ — دیکھو فرزان تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ تمھیں اس سدیدہ دہنی کا مزہ چکھاؤں

فرزان — ہاں بشرطیکہ میں اپنی تلوار سے اپنی حفاظت نہ کرسکوں۔ ہر وہ خیال جس کے لئے انسان اپنی زندگی قربان کرے گا صرف ایک آزاد عالمگیر خیال ہی ہوگا۔ جب اسپین کے باشندے کو آخر کار یہ علم ہوگا کہ اس میں ایک بدوی عرب سے برتر کوئی شے نہیں اور اُس کا پیغمبر بھی محمد سے بلند تر کوئی امتیاز نہیں رکھتا تو وہ بیدار ہوگا — پہلے سے کہیں زیادہ آزاد و عالمگیر ذہنیت لئے ہوئے۔ — اور جس غلیظ کوچے میں وہ فاقوں مر رہا ہے اُسی میں ایک عالمگیر آزادی و مساوات کے لئے اپنی زندگی کی قربانی پیش کردے گا

مجسمہ — بالکل لغو!

فرزان — جس چیز کو تم لغو کہہ رہے ہو صرف یہی ایک وہ شے ہے جس کی خاطر انسان تکمیل انسانیت کے لئے مریں گے اور اس کے لئے اپنی تمام آزادی بخوشی نثار کر دیں گے

ابلیس — بے شک! — یعنی وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہمیشہ تراشتے رہیں گے

فرزان — اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ — درحقیقت اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ موت نہیں بلکہ موت کا خوف ہے۔ ہمیں ذلیل و پست کرنے والی شے دراصل ہلاک کرنا یا ہلاک ہونا نہیں بلکہ ذلیل طور پر زندہ رہنا اور ذلت کی مزدوری و انعام قبول کرنا ہے۔ ایک زندہ غلام یا آقا سے بہتر دس مردہ انسان ہیں۔ ابھی انسان پھر بیدار ہوگا — باپ بیٹے کے خلاف اور بھائی بھائی کے خلاف بغاوت کرے گا — اور یہ سب ایک دوسرے کو انسدادِ غلامی کی خاطر ہلاک کرنا شروع کریں گے

ابلیس — اور آخر کار یہی آزادی و مساوات جس کے لئے تم قصیدہ خوانی کرتے ہو آزاد سفید فام عیسائیوں کو مزدوری کے بازار میں اُن سیاہ کافر غلاموں سے بھی کہیں ارزاں کر دے گی جو چوراہوں پر نیلام کے ذریعہ فروخت ہوتے ہیں

فرزان — ڈرو نہیں! — سفید فام مزدور کی بھی باری آکر رہے گی۔ لیکن اس وقت میں ان سراپا تنکلوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں جو عظیم و بلند خیالات اختیار کرلیتے ہیں۔ میں تمھارے سامنے اس حقیقت کی مثالیں پیش کر رہا ہوں کہ یہ پست جانور جو انسان کہلاتا ہے اور جو اپنے ذاتی خود غرضانہ معاملات میں سراپا ایک بزدل حیوان ہے، ایک بلند و عالمگیر خیال کی خاطر ایک مثالی ہیرو کی طرح جنگ آزما ہو سکتا ہے ایک پُرامن شہری کی حیثیت میں انسان ذلیل و پست ہو سکتا ہے لیکن ایک عقیدے کے پرجوش پرستار کی شکل میں وہ بڑا خطرناک ہے اُسے صرف اس حالت میں غلام بنایا جا سکتا ہے جبکہ وہ روحانی طور پر اس قدر ضعیف ہو کہ عقلی استدلال کو سن سکے۔ میں آپ سب کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر آپ انسان کے سامنے اُس کام کا ایک جزو پیش کر دیں جسے وہ آجکل خدائی کا کام کہتا ہے اور جسے وہ مستقبل میں اور بہت سے جدید ناموں سے منسوب کرے گا تو آپ اُسے اس کام کے اُن تمام نتائج کی طرف سے قطعی بے خوف بنا سکتے ہیں جو اُس کی ذات کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں

سارہ — ہاں ہاں — وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے لگے گا اور ان سے جنگ کرنے کے لئے اپنی شریک زندگی کو تنہا چھوڑ دے گا۔

مجسمہ — بہت خوب میری بیٹی! — تم اس کی گفتگو کو اپنی فطری عقل پر حاوی نہ ہونے دینا۔

ابلیس — افسوس کپتان صاحب! — اب جبکہ ہماری گفتگو کا سلسلہ "عورت" کے عنوان تک پہونچ گیا ہے یہ شخص اور بھی زیادہ تقریر و مباحثہ کرے گا۔ بایں ہمہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے لئے ایک یہی عنوان انتہائی دلچسپ چیز ہے

فرزان — معزز خاتون! — ایک عورت کے لئے مرد کی تمام ذمہ داریاں اور فرائض صرف اس ایک کام سے شروع اور اسی پہ ختم ہو جاتے ہیں کہ وہ اس عورت کے بچوں کے واسطے روٹی مہیا کردے۔ عورت کے نزدیک، مرد کا وجود صرف اس ایک مقصد کا ذریعہ ہے کہ بچے پیدا ہوں اور پرورش پائیں۔

سارہ — کیا ایک عورت کی ذہنیت کی بابت یہی خیال ہے تمھارا؟ — میں اسے انسانیت کی ذلت اور تنفر انگیز حیوانیت کہتی ہوں۔

فرزان — معاف کرنا سارہ! — میں نے عورت کی پوری ذہنیت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ مرد کو ایک جداگانہ جنس کی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میرے ان الفاظ میں انسانیت کی ذلت اس سے زیادہ ہرگز نہیں جتنی کہ خود اپنے متعلق عورت کے اس زاویۂ نظر میں کہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت "ماں" ہونا ہے۔ جنسی لحاظ سے عورت ایک ذریعہ ہے جسے فطرت اپنے بلند ترین کارنامہ کی بقا کے لئے استعمال کرتی ہے۔ جنسی لحاظ سے مرد ایک ذریعہ ہے جسے عورت فطرت کے ارشاد کو انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ بجا لانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ وہ جبلّی طور پر یہ جانتی ہے کہ سلسلۂ ارتقاء کی دور دراز گزشتہ منزلوں میں خود اسی نے مرد کو ایجاد کیا — جنسی تنوع عطا کیا — اور تخلیق کیا تاکہ ایک "جنسی عمل" کے ذریعہ جو مخلوق پیدا کی جا سکتی ہے اس سے بہتر کوئی شے پیدا کی جا سکے۔ جب تک مرد اس مقصد کی تکمیل کرتا رہتا ہے جس کے لئے عورت نے اسے بنایا ہے اُس وقت تک مرد کو آزادی ہے کہ وہ اپنے خوابوں۔ اپنی حماقتوں اپنے خیالات اور اپنے شجاعانہ مشاغل میں مصروف رہے بشرطیکہ ان سب مشاغل کا مرکز عورت۔ ماں۔ خاندان اور گھربار کی پرستش رہے — لیکن کس قدر عجلت آمیز اور خطرناک امر تھا ایک ایسے جداگانہ حیوان کو تخلیق کرنا جس کا واحد مقصد آفرینش عورت نے یہ قرار دیا کہ خود اسے بچے عطا کرے! — کیونکہ ذرا دیکھئے اور سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا — سب سے اول تو یہ کہ مرد نے عورت کے ذریعہ اپنی تعداد بڑھالی ہے یہاں تک کہ اب مرد بھی اسی قدر ہیں جتنی کہ عورتیں — اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت اپنے مقصد کے لئے اس زبردست قوت کا صرف ایک حقیر چیز ہی استعمال کر سکتی ہے جو اس نے مرد کے اندر اس کو عمل پرورش کی زبردست مشقت سے محفوظ کر کے رکھ چھوڑی تھی۔ یہ زاید از کار قوت مرد کے دماغ اور اعصاب کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ وہ اس قدر قوی ہو گیا ہے کہ عورت جسمانی لحاظ سے اُسی پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ دماغی لحاظ سے وہ اس قدر توانا اور تخیل پسند ہو چکا ہے کہ صرف اپنے ہی جیسے دوسرے انسان پیدا کرنے پر قناعت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے تہذیب و تمدن کو پیدا کیا — لیکن عورت سے استصواب رائے کے بغیر ہی — اس تہذیب کی بنیاد ہی اس نے اس حقیقت پر رکھدی کہ عورت خانگی خدمت کے لئے ہے۔

سارہ — دیگر امور سے قطع نظر یہ چیز بلا شبہ ایک حقیقت ہے

ابلیس — ہاں! — اور یہ تہذیب! — یہ کیا بلا ہے؟

فرزان — تمھاری پست و فرسودہ زہرافشانیوں کا ایک خوبصورت عنوان! — درحقیقت تہذیب نام ہے مرد کی اس کوشش کا جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ مرد صرف عورت کے مقصد کا ایک ذریعہ نہ رہے بلکہ اس سے بلند تر کوئی مقام حاصل کر سکے۔ زندگی نے صرف اپنی بقا و قیام ہی کے لئے نہیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی شکل حاصل کرنے اور خود اپنے اسرار کے متعلق کمل سے کمل علم پر دسترس پانے کے لئے آج تک جو مسلسل و طویل کوشش جاری کر رکھی ہے اس کا انجام ہنوز مشکوک نظر آتا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ زندگی اور موت وانحطاط کی قوتوں کے درمیان جو معرکہ آرائی قایم ہے وہ کس طرح ختم ہوگی۔ اس جنگ کے تمام محاربات محض اصلاحات اور حقیقی عسکری محاربات کی طرح الفاظ سے جنہیں فتح و کامیابی کو سپہ سالاروں کی اہمیت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

مجسمہ — یہ مجھ پر ایک طنز ہے — خیر کوئی مضایقہ نہیں — ہاں فرمائیے۔

فرزان — ۔ ۔ ۔ ہے ایک ایسی قوت پر جو تم سے کہیں بلند ہے کپتان صاحب ! — بہر حال یہ تو تم نے بھی اپنے پیشے میں تجربہ کیا ہوگا کہ ایک بیوقوف سپہ سالار بھی محاربات میں کامیاب ہو سکتا ہے بشرطیکہ غنیم کا سپہ سالار اس سے کسی قدر زیادہ بیوقوف ہو

مجسمہ — (بہت سنجیدگی سے) بالکل صحیح فرزان — بالکل صحیح — بعض گدھے حیرتناک طور پر خوش قسمت ہوتے ہیں

فرزان — اچھا تو سنو — "قوت حیات" بیوقوف ہے لیکن اس قدر بیوقوف نہیں جتنی کہ موت و انحطاط کی قوتیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ قوتیں ہمیشہ سے اس کی خادم بھی ہیں — یہی وجہ ہے کہ "زندگی" جیت جاتی ہے۔ ہم اپنی ملکیت میں وہ سب کچھ رکھتے ہیں جسے قوت تولیدی افراط مہیا کر سکتی ہے اور حرص محض قایم و باقی رکھ سکتی ہے۔ تہذیب خودکشی بھی شکل اختیار کیوں نہ کرے یہ یقینی ہے کہ دنیا میں بہترین تفنگ اور تر ۱۹ ترین تفنگ بردار کا وجود باقی ہی رہے گا۔

ابلیس — بالکل درست ! — یعنی دنیا میں "زندگی" کا نہیں بلکہ موت کا موثر ترین ذریعہ باقی رہے گا تم اپنی گفتگو میں پیچ در پیچ راستوں پر ہوتے ہوئے اپنی کج بحثی اور پہلو تہی کی ہزار کوششوں کے باوجود آخرکار خود اسی نتیجہ پر پہونچے جو میں اخذ کرتا ہوں — اور پھر تمھاری تقریروں کا یہ طول !

فرزان — خوب ! — طویل تقریریں پہلے کس نے شروع کیں ؟ — بہرحال اگر میری گفتگو تمھاری فہم کو ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہوتی ہے تو تمھیں اختیار ہے کہ ہم سے رخصت ہو جاؤ اور حسن و محبت یا اسی نوعیت کے اپنے دیگر مضحکہ خیز محبوب مشاغل کی تلاش کرو

ابلیس — (بہت آزردہ ہو کر) یہ الفاظ دیانت و انصاف کے مظہر نہیں فرزان — اور آداب مجلس کے بھی بالکل خلاف ہیں۔ فہم و خرد کی دنیا میں مجھے بھی ایک جگہ حاصل ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے اور کون پرکھ سکتا ہے۔ میں بڑی دیانت سے تمھارے ساتھ بحث کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ کامیابی کے ساتھ تمھارے دلایل کو قطع کر رہا ہوں — اگر تم چاہو تو آؤ ایک گھنٹہ اور یہی سلسلہ جاری رہے

فرزان — بہت مناسب ! — آؤ۔

مجسمہ — مجھے ذرا بھی امید نہیں کہ تم کسی خاص فیصلہ پر پہونچ سکو گے فرزان — بایں ہمہ چونکہ یہاں اس دنیا میں ہمیں تضییع اوقات کے بجائے "تضییع ابدیت" کرنا ہے اس لئے تم دونوں اپنی بحث کو ضرور جاری رکھو

فرزان — (کسی قدر تنک کر) مرمریں سر والے قدیم شاہکار ! — میرا نقطۂ گفتگو تمھاری فہم سے ایک قدم آگے ہے۔ کیا تم سب کو میرے اس نظریہ سے اتفاق ہے کہ "زندگی" ایک ایسی قوت ہے جس نے خود کو منظم کرنے کے لئے بے شمار تجربات کئے ہیں یعنی انسان اور قدیم عفریت نما ہاتھی، چوہا اور قدیم دیو ہیکل نباتاتی کیڑے — مکھیاں اور پسو اور پادریان کلیسا — یہ سب کے سب اسی "قوت عام" کو ادنی سے اعلی افراد کی شکل میں ترتیب دینے کی کم و بیش کامیاب کوششیں ہیں — اور ان تمام کوششوں کا آخری مقصد اور منتہی یہ ہے کہ کسی طرح ایک ایسا وجود ترتیب دیا جائے جو سب کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہو — جسے سب کچھ علم ہو — جس سے کوئی سہو و خطا ممکن نہ ہو اور جسے ان سب خصوصیات کے ساتھ ساتھ خود اپنے وجود کا کامل و حقیقی علم حاصل ہو — یعنی مختصراً یوں کہو کہ ایک دیوتا ! — کیا تمھیں میرے اس نظریہ سے اتفاق ہے ؟

ابلیس — میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بحث کی خاطر۔

مجسمہ — میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بحث سے بچنے کے لئے۔

سارہ — جہاں تک رہنمایان کلیسا کا تعلق ہے میں تمھارے ان الفاظ سے شدید مخالفت کرتی ہوں۔ میں تم سے درخواست کروں گی کہ ان بزرگ ہستیوں کو اس موجودہ بحث میں کھینچ کر نہ لائے

فرزان — ان کا نام تو میں نے سارہ محض اس لئے اس ضمن میں لیا ہے کیونکہ مجھے الفاظ میں صوتی یکسانیت کی رعایت مطلوب تھی — اور آیندہ میں ان کی طرف کوئی اشارہ نہ کروں گا — اب تو اب جبکہ سارہ کے اس مختصر اعتراض سے قطع نظر تم سب میرے نظریے سے یہاں تک متفق ہو چکے ہو تو میں ایک قدم اور آگے اٹھاتا ہوں۔ کیا تمھیں اب اس کے بعد یہ تسلیم نہیں کہ "زندگی" نے دیوتا تخلیق کرنے کی جدوجہد میں جس قدر کامیابی [illegible]

بنائیں اُن میں اپنی کامیابی کو ناپنے کے لئے حسن ظاہری یا جسمانی تکمیل کو پیمانہ نہیں بنایا کیونکہ جیسا کہ بہت عرصہ ہوا ہمارے دوست ارسطو فانیز نے ظاہر کیا ہے حسن و جسمانی تکمیل کے لحاظ سے پرندے بہت ہی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُن کی قوتِ پرواز ۔۔ اُن کے خوبصورت پر و بال ۔۔ اور پھر اُن کی معصومانہ محبت و آشیاں سازی کی وہ شعریت ۔۔ ان تمام خصوصیات نے اُن کو ظاہری حُسن و جمال اور جسمانی تکمیل دونوں لحاظ سے مخلوق میں اس درجہ غیر معمولی حد تک برتری دیدی ہے کہ اگر "زندگی" کا آخری مطمح نظر واقعی حسن و محبت ہی ہوتا تو یہ ناقابل یقین ہے کہ ان خوبصورت طیور کو تخلیق کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے راستے پر جد و جہد شروع کرتی اور اُس کے بعد سے ہاتھی اور ہیبت ناک بندر کی تخلیق میں عرق ریزی کرتی جس کی اولاد ہم سب ہیں

سارہ ۔۔ ارسطو فانیز کافر تھا اور مجھے ڈر ہے فرزان کہ تم اس سے کچھ بہتر نہیں ہو

ابلیس ۔۔ تو ان تمام امور سے تم یہی نتیجہ اخذ کرتے ہو نا کہ "زندگی" بھدی اور بدہیبت مخلوق کی آفرینش چاہتی تھی ؟

فرزان ۔۔ نہیں ! ۔۔ کج فہم ابلیس ۔۔ ہزار بار نہیں ۔۔ زندگی "دماغ" کی آفرینش چاہتی تھی ۔۔ دماغ ! ۔۔ زندگی کی محبوب شے !۔ اور ایک ایسا آلہ جس کی مدد سے زندگی صرف شعور ذات ہی نہیں بلکہ تفہیم ذات بھی کر سکے

جستمہ ۔۔ یہ تو مابعد الطبیعیات ہے فرزان ! ۔۔ کس کمبخت شیطان نے کہا ہے کہ تم ۔۔۔۔ (ابلیس سے) توبہ معاف کیجئے !

ابلیس ۔۔ معافی کی ضرورت نہیں۔ لوگ جب کسی فقرہ پر زور دینے کے لئے میرا نام استعمال کرتے ہیں تو میں ہمیشہ اسے اپنے لئے باعث اعزاز و تحسین تصور کرتا ہوں۔ میرا نام تمہاری خدمت کے لئے ہمہ وقت حاضر ہے کپتان صاحب۔

جستمہ ۔۔ شکریہ ! ۔ بڑی عنایت ہے تمہاری ۔ گفتگو کی اپنی قدیم فوجی عادت سے میں جنت میں بھی کبھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ میں فرزان سے جو سوال کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ زندگی کو ایک "دماغ" کے حصول کے لئے خود کو پریشان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟۔ زندگی خود کو سمجھنا ہی کیوں چاہتی ہے ؟ ۔۔ صرف خود سے لذت اندوز ہونے پر قناعت کیوں نہیں کرتی ؟

فرزان ۔۔ اگر "دماغ" نہ ہو تو ہم محض لاعلمی کی کیفیت ہی میں حظ اندوز ہو سکتے ہیں ۔۔ اور یہ لاعلمی سارے کیف و حظ کو تباہ کر دیتی ہے

جستمہ ۔۔ صحیح۔ بالکل صحیح ۔۔ لیکن میرے خیال میں صرف اس قدر دماغ کافی ہے کہ ہمیں یہ علم ہو سکے کہ ہم مسرور و محظوظ ہو رہے ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھنا چاہتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ہماری تفریح و مسرت اپنے متعلق فکر و غور کو برداشت نہیں کر سکتی

فرزان ۔۔ یہی وجہ ہے کہ فہم و خرد اس درجہ نامقبول ہے۔ لیکن انسان کے پس پردہ زندگی کی جو قوت کارفرما ہے اس کے لئے فہم و خرد ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ گمراہ ہو کر موت کی دنیا میں پہونچ جاتی ہے۔ جس طرح زندگی نے قرنوں کی جد و جہد کے بعد آنکھ جیسے حیرتناک جسمانی آلہ کو ارتقاء عطا کیا تاکہ ذیحیات جسم دیکھ سکے کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور اس کی امداد یا ایذا کے لئے کیا چیز اس کی طرف آ رہی ہے اور اس طرح اُن ہزاروں خطرات سے خود کو محفوظ رکھ سکے جو اس سے پیشتر اس کو ہلاک کر ڈالتے تھے بالکل اسی طرح "زندگی" آج ایک ذہنی و دماغی آنکھ کو ارتقاء عطا کر رہی ہے جو کہ مادی دُنیا کو نہیں بلکہ "زندگی" کے مقصد کو دیکھ سکے گی اور اس طرح ہر فرد انسانی کو اس قابل بنادے گی کہ وہ اس مقصد کے لئے کارفرما ہو جائے اور اس کی راہ میں ان کوتاہ نظر ذاتی مقاصد کی دیواریں حایل نہ کرے جو کہ آجکل حایل نظر آ رہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف ایک ہی قسم کا انسان ایسا ہے جو ہمیشہ مسرور رہا ہے اور جو مختلف مفادوں اور خود فریبیوں کے تمام اختلافات کے درمیان ایک عالمگیر نگاہ توقیر و اعزاز سے دیکھا گیا ہے

جستمہ ۔۔ تمہارا مطلب فوجی انسان سے ہے۔

فرزان ۔۔ کپتان صاحب ! میرا مطلب فوجی انسان نہیں۔ فوجی انسان کو قریب آتا دیکھکر دُنیا اپنی روٹی کو مقفل اور اپنی عورتوں کو غائب و مفرور کر دیتی ہے۔ نہیں ! ۔ میری تحسین کا موضوع "شجاع انسان اور اس کے اسلحہ" نہیں بلکہ میرا مرکز نظر و سخن ہے فلسفی انسان ۔۔ وہ انسان جس کا غور و فکر دنیا کے باطنی ارادہ و مقصد کو بے نقاب کرتا ہے ۔۔ جس کی قوت اختراع و ایجاد اس مقصد کی تکمیل کے ذرائع

تلاش و مہیا کرتی ہے — اور جس کا فضل و عمل ان دریافت شدہ ذرایع سے اس اہم مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اس انسان کے علاوہ اور باقی تمام اقسام کے انسانوں سے میں قطعی اکتا چکا ہوں — باقی سب کے سب ناکام ہیں۔ مایوس کن اور مضحک حد تک ناکام — جب میں کرۂ ارض پر موجود تھا تو تمام قسم کے ماہرین علوم و فنون میری تاک میں لگے رہتے تھے تاکہ میرے وجود میں کوئی ایسا نقص یا بیمار جزو دریافت کر سکیں جس کو وہ اپنا تختۂ مشق بنائیں۔ علم الادویہ کے ماہرین مجھے اس فکر و غور پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنے جسم کی حفاظت کے لئے کیا کرنا ضروری ہے اور محض قیاسی امراض کے لئے نیم حکیمانہ قسم کی دوائیں پیش کرتے تھے۔ میں اُن کو جواب دیتا تھا کہ میں خلل دماغ میں مبتلا نہیں ہوں۔ وہ مجھے جاہل و احمق قرار دیتے اور چلے جاتے تھے۔ مذہبیات کے علماء مجھے اس غور و فکر پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنی روح کی حفاظت کے لئے کیا کرنا ضروری ہے — لیکن میں ذہنی اختلال سے روحانی طور پر بھی اسی قدر دور تھا جتنا کہ جسمانی اعتبار سے اور اس لئے اس مشورہ پر بھی کوئی کوئی توجہ نہیں دیتا تھا — اس لئے یہ لوگ مجھے کافر و بیدین قرار دیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد سیاست داں آتے تھے اور کہتے تھے کہ فطرت کے تمام کارخانے میں صرف ایک ہی مقصد کارفرما ہے اور وہ یہ کہ سیاست کا ماہر کسی طرح پارلیمنٹ میں پہونچ جائے۔ میں اپنے سیاسی دوست کو جواب دیتا تھا کہ مجھے اس کے پارلیمنٹ میں پہونچنے یا نہ پہونچنے کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ سن کر وہ مجھے مردود سیاست قرار دیتا اور چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد رومانوی انسان آیا — فنون لطیفہ کا ماہر — اپنے محبت انگیز نغمات و تصاویر اور نظمیں لئے ہوئے — یہ وہ شخص تھا جس کی معیت میں مجھے کئی سال تک بڑی مسرت اور بڑا فایدہ حاصل ہوا کیونکہ اُس کی خاطر میں نے اپنے حواس کو ارتقاء و تربیت دی۔ اُس کے نغمات نے میرے کانوں کو سننے کا ایک بہتر طریقہ، اس کی تصاویر نے میری آنکھوں کو دیکھنے کا ایک بہتر سلیقہ اور اُس کی نظموں نے میرے دل کو محسوس کرنے کا ایک گہرا انداز عطا کیا — لیکن اس شخص نے مجھے انجام کار عورت کی پرستش میں مبتلا کر دیا

سارہ — فرزان!

فرزان — ہاں — مجھے یقین ہو گیا کہ عورت کی آواز ہی میں نغمہ کی تمام موسیقیت پنہاں ہے — اس کے حسن صورت ہی میں بہار کی تمام رعنائیاں اور اس کی روح میں نظم و شعریت کے تمام جذبات مخفی ہیں۔

سارہ — اور غالباً یہ چیز تمہارے لئے بڑی مایوس کن ثابت ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر تم نے ان تمام خوبیوں کو عورت کی طرف منسوب کیا تو کیا اس میں کوئی عورت کا قصور تھا؟

فرزان — ہاں ایک حد تک! — کیونکہ ایک حیرتناک جبلی چالاکی کے ساتھ وہ خود خاموش رہی اور مجھے اس امر کی اجازت دیدی کہ میں اُسے اسی طرح محاسن سے متصف کرتا رہوں اور اُس کی بابت خود اپنی قیاس آرائیوں اور خیالات و احساسات کو غلطی سے اُس کی فطرت کے حقائق سمجھتا رہوں۔ میرا دوست یعنی "رومانوی انسان" خود اس قدر مفلس اور ڈرپوک شخص تھا کہ جو عورتیں حسن و جمال اور تہذیب و اخلاق میں اس کے بلند ترین معیار کے لحاظ سے مکمل ثابت ہوئی تھیں وہ ان کے نزدیک پہونچنے سے محروم تھا اور اس لئے وہ صرف اپنے خوابوں کا یقین اپنے ساتھ لئے ہوئے اپنی قبر میں جا کر سو گیا۔ لیکن فطرت اور حالات مجھ پر زیادہ مہربان تھے۔ میں اعلیٰ خاندان سے متعلق ایک امیر دولت مند انسان تھا اور اگر کبھی میری شخصیت عورتوں کو مسرور کرنے میں ناکام ثابت ہوتی تھی تو میری زبان اُن کی قصیدہ خوانی کر کے اس کمی کو پورا کر دیتی تھی حالانکہ عام طور پر میں نے ان دونوں امور میں خود کو خوش قسمت پایا ہے۔

مجسمہ — بڑے خودنما ہو تم!

فرزان — بالکل صحیح — لیکن میری خودنمائی بھی مسرور کن تھی — مجھے تجربہ ہوا کہ جب کوئی عورت میری ذات میں ایک جاذبیت و دلکشی محسوس کرنے لگتی تو وہ مجھے اس خیال پر یقین کرنے کے لئے پوری آزادی دیتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جب میرا اظہار محبت منظور کر لیا جاتا تو کبھی بھی یہ نہیں کہتی تھی کہ — "میں مسرور ہوں — میری محبت مطمئن ہے" — وہ ہمیشہ سب سے پہلا سوال یہ کرتی تھی کہ "آخرکار تمام بندشیں اور رکاوٹیں دور ہو گئیں" — اور اس کے بعد وہ دریافت کرتی کہ — "اب پھر کب آؤ گے؟"

سارہ — بالکل یہی بات مرد کہتے ہیں۔

فرزان — میرا دعویٰ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ لیکن عورتیں سب کی سب یہی کہتی ہیں۔ ان کے دو جملوں سے میں ہمیشہ خائف و سراسیمہ ہو کر رہ گیا ہوں کیونکہ ان دونوں میں سے پہلا جملہ کا مفہوم تو یہ ہے کہ اس تمام معاشقہ سے عورت کا حقیقی مقصد اور اصلی جذبہ صرف یہ تھا کہ میری شخصیت کی چہار دیواریوں کو منہدم کر کے میرے وجود پر قابض ہو جائے ——— اور دوسرے جملہ کا مطلب اعلانیہ طور پر یہ ہے کہ اب آیندہ وہ مجھے اپنی ایک مقبوضہ و مملوکہ شے تصور کرتی ہے اور میرے تمام اوقات کو اپنے لئے وقف سمجھتی ہے

ابلیس — یہی وہ مقام ہے جہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تمہارے پہلو میں دل نہیں ہے۔

مجسمہ — (اپنا سر ہلاتے ہوئے) عورتوں کے ادا کردہ الفاظ تم کو دہرانے نہیں چاہئیے۔

سارہ — (سختی سے) وہ الفاظ تمہارے لئے مقدس امانت ہیں۔

مجسمہ — بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ عورتیں ایسا کہتی ضرور ہیں۔ بندشوں اور قیود کی تو مجھے کبھی زیادہ پروا نہیں رہی لیکن ہاں یہ دوسری بات کسی حد تک حیرت و صدمہ کی چیز ہے..........

فرزان — اور اس کے بعد یہ عورت جو قبل ازیں کافی مسرور اور کاہل رہ چکی ہے یکایک فکرمند اور مجھ پر حد سے زیادہ متوجہ ہو جاتی تھی — اب اس کا ایک مستقل شغل یہ ہو جاتا تھا کہ میرے خلاف سازشیں اور چال بازیاں کرتی رہے ——— میرا تعاقب کرے ——— مجھے سخت نگرانی میں رکھے ——— میری خاطر اپنی کمین گاہ میں بیٹھی رہے اور اس طرح اپنے شکار کو بالکل "یقینی و محفوظ" بنانے کے لئے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دے ——— اور یہ شکار کون تھا؟ — میں! ——— لیکن یقیناً یہ چیز ہرگز وہ نہ تھی جس کی خاطر میں نے یہ جھگڑا مول لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بالکل مناسب اور بالکل فطری قرار دیا جائے، لیکن مجھے جس موسیقی، مصوری اور شعریت کی تلاش تھی اور ایک حسین عورت کی شکل میں جس مجسمۂ مسرت کی جستجو تھی اس محبت میں اس کا کوئی وجود نہ تھا ——— اسی لئے میں اس سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگ گیا ——— مجھے اکثر اس سے فرار ہونا پڑا ——— واقعہ تو یہ ہے کہ میں اس طرح فرار ہونے میں کافی مشہور ہو گیا۔

سارہ — تمہارا مفہوم بدنام ہونے سے ہے۔

فرزان — میں تمہارے پاس سے نہیں بھاگا۔ کیا تم دوسری عورتوں سے فرار ہونے پر مجھے ملزم تصور کرتی ہو؟

سارہ — کس قدر لغو باتیں کرتے ہو! — تم اسوقت ایک ۵۰ سال کی معمر عورت سے گفتگو کر رہے ہو۔ اگر تمہیں موقع مل جاتا ——— یا یوں کہو کہ اگر میں تمہیں ایسا موقع دیدیتی تو تم یقیناً مجھے بھی چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مجھ سے گریز اختیار کرنا تمہارے لئے اس قدر سہل ثابت نہ ہوتا جتنا کہ شاید چند دوسری ہستیوں کے سلسلہ میں ہوا ہوگا۔ اگر مرد اپنے گھر اور اپنے فرائض کے ساتھ وفادار نہیں رہتے تو ضروری ہے کہ ان کو بہ جبر اس پر آمادہ کیا جائے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم سب مرد یہی چاہتے ہو کہ موسیقی و مصوری و شعریت کے خوبصورت مجسموں سے شادی کرو ——— لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم یہ حسین مجسمے نہیں پا سکتے کیونکہ دنیا میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر محض گوشت و پوست سے بنی ہوئی عورتیں تمہارے نزدیک قابل پسند نہیں تو پھر تمہیں ان کے بغیر ہی زندگی گزارنا ہوگی۔ عورتوں کو محض گوشت و پوست سے بنا ہوئے شوہروں پر قناعت کرنا ہوتی ہے اور تمہیں گوشت و پوست سے بنی ہوئی عورتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ (ابلیس کچھ متذبذب نظر آتا ہے اور مجسمہ ناگوار انداز میں منہ بناتا ہے) میں دیکھتی ہوں کہ تم میں سے کسی کو بھی یہ چیز پسند نہیں ——— لیکن بایں ہمہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس لئے اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو بجبر و اکراہ اسے قبول کرنا ہی ہوگا۔

فرزان — عزیز خاتون! تم نے رومان کے خلاف میرے تمام دلایل و خیالات کو چند جملوں میں ادا کر دیا ہے۔ بالکل یہی وجوہ ہیں جن کے تحت میں نے اس رومانی الشان سے بھی آخر کار کنارہ کشی اختیار کی جو اپنے مسحور و محاقت زدہ اور فریب خوردہ حواس کو اپنی فنی و جمالیت پسند فطرت سے تعبیر کرتا تھا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی بدولت میں اپنی آنکھوں اور کانوں کا استعمال سیکھ گیا لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ ایک فلسفۂ حیات کے اعتبار سے اس کی تمام پرستش حُسن و نسائیت اور تلاش مسرت ایک پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ مگر اس نے مجھے ایک کٹر لاتراشی اذیت پرست

قرار دیا اور چلا گیا۔

سارہ — اس سے معلوم ہوا کہ عورت نے اپنے تمام نقایص و معایب کے باوجود تمہیں کچھ سکھلایا بھی ضرور۔

فرزان — عورت نے میرے لئے اس سے کہیں زیادہ کام کیا۔ اس نے دیگر تمام تعلیمات کا مفہوم بھی مجھے سمجھایا۔ آہ! میرے دوستو۔ نہ پوچھو کہ جب پہلے پہل حجابات و قیود اُٹھے تو کس قدر حیرتناک روشنی میری عقل و فہم پر طلوع ہوئی! میں تو طیار کیا گیا تھا مسحور ہونے کے لئے۔ مست و مخمور ہوجانے کے لئے اور محبت کے نوجوان خواب کے تمام طلسمات میں جذب ہوجانے کے لئے۔ لیکن اُف! جب درمیانی بندشیں اور رکاوٹیں ہٹ گئیں تو میں نے دیکھا کہ میری قوت ادراک و فہم اس قدر واضح و تیز اور میرا شعور تنقید اس درجہ اور بے لاگ حساس ہوگیا تھا کہ اس سے پہلے کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ میری محبوبہ کی ذات کا ہر ایک عیب اُس کے انتہائی حاسد رقیب کو بھی اس درجہ وضاحت کے ساتھ نظر نہ آسکتا تھا جتنا کہ مجھے — وہ مجھے بیوقوف نہیں بنا سکی — میں نے اس کو قبول کیا پورے ہوش و حواس کے ساتھ — اس آپریشن کے وقت میں کلوروفارم کے زیرِ اثر نہ تھا!

سارہ — لیکن تم نے اسے قبول تو کیا!

فرزان — یہ ایک الہام تھا۔ اس ساعت سے پیشتر میں نے کبھی اپنے اس شعور و احساس کو ضایع نہ ہونے دیا تھا کہ اپنا مالک میں خود ہوں — اور کبھی کوئی قدم ایسا نہ اُٹھایا تھا جس کا میری عقل و خرد نے جایزہ لیکر مناسب قرار نہ دیدیا ہو۔ میرا یہ عقیدہ ہوچکا تھا کہ میں ایک خالص استدلالی مخلوق ہوں۔ ایک مفکر! احمق فلسفی کا ہمنوا ہوکر میں بھی کہتا تھا کہ "میں زندہ ہوں اور اس لئے سوچتا ہوں"۔ نیز یہ کہ "میں اور زیادہ سوچوں گا اور اس لئے اور زیادہ زندہ رہ سکوں گا"

مجسمہ — یہ الفاظ تو انتہائی غیر مادی اور مابعد الطبیعیات کی دنیا سے متعلق معلوم ہوتے ہیں فرزان — اگر تم ٹھوس اور مادی حدود میں رہو اور اپنے دریافت کردہ حقایق کو عورتوں کی بابت دلچسپ و رنگین حکایات کی صورت میں بیان کرو تو تمہاری گفتگو کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔

فرزان — لیکن اب مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ جب میں "عورت" کے بے پناہ قرب میں اس کے بالکل بالمقابل استادہ تھا تو میرے صاف و روشن اور تنقیدی دماغ کا ہر ایک ریشہ مجھے متنبہ کرتا تھا کہ میں اُسے نظر انداز کردوں اور خود کو بچالوں۔ میں "عورت" کی طرف آگے بڑھنا چاہتا تھا تو میرے اخلاق چلا اُٹھتے کہ — "ہرگز نہیں" — میرا ضمیر پکارتا تھا "ہرگز نہیں" — میرا جذبۂ شجاعت اور خود عورت کے لئے میرا احساس ترحم مجھے روکتا تھا کہ "ہرگز نہیں"۔ میری سلامتی کے لئے میری مصلحت اندیشی کہتی تھی کہ "ہرگز نہیں"۔ میری سماعت کو ہزاروں نغموں کی مشق حاصل تھی اور میری بصارت کو ہزاروں تصویروں کی — ان دونوں نے عورت کی آواز، عورت کی شکل و صورت اور عورت کے رنگ و رعنائی کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے میرے سامنے ڈالدئے اور ان منتشر اجزاء میں مجھے صاف نظر آگیا کہ اب سے تیس سال کے بعد اس عورت کی شکل و صورت کیسی ہوجائے گی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہنستے ہوئے بوڑھے منہ کے اندر ایک مردہ دانت پر سونے کی چمک نمایاں ہے — میں نے محسوس کیا کہ اس کے بوڑھے رگ و ریشہ کے کیمیاوی اجزاء سے عجیب قسم کی بو آرہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اپنے حسین رومانوی خوابوں میں فردوس کے دلفریب میدانوں کے درمیان ایک ایسی مخلوق کے پہلو بہ پہلو محو خرام تھا جو موت اور بڑھاپا دونوں سے آزاد نظر آتی تھی اور جس کی تخلیق خود حسن سے ہوئی تھی۔ لیکن اب زندگی کے اس اہم موقع پر وہ تمام خواب مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ مجھے وہ سارے خواب اب تک یاد ضرور تھے اور میں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد بھی کرتا تھا، لیکن اب وہ سب کے سب انتہائی بے بنیاد و مہمل اختراعات نظر آتے تھے۔ میری قوت تمیز و فیصلہ کسی طرح اپنی صحت کو قربان کرنا نہیں چاہتی تھی اور میرا دماغ اب بھی ہر معاملہ میں "ہرگز نہیں" کی صدا بلند کرتا تھا — اور پھر ٹھیک اس وقت جبکہ میں اس عورت سے معذرت کے ساتھ گریز اختیار کرنا چاہتا تھا "زندگی" نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور اسی عورت کی آغوش میں مجھے اس طرح پھینکدیا جیسے کوئی ملاح مچھلی کے ایک ناکارہ ٹکڑے کو ایک بحری طائر کے منہ میں پھینک دے۔

(باقی)

مسعود جاوید (بی-اے)

ہماری ادبی تاریخیں

ادھر کچھ دنوں سے اُردو کے سمجھدار پڑھے لکھے طبقے میں بڑے شد و مد کے ساتھ یہ بات زیر بحث ہے کہ ابھی تک اُردو ادب کی کوئی صحیح اور مکمل تاریخ لکھی گئی ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی ادبی تاریخ کو تاریخ مانا جائے تو وہ کونسی تاریخ ہو سکتی ہے۔ اور اگر جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ صحیح تاریخیں نہیں ہیں تو اُردو ادب کی تاریخ کس طریقہ پر لکھی جائے۔ یہاں نہ ہمیں اُردو کی ادبی تاریخوں کی تاریخ بیان کرنا ہے نہ اس کے ارتقا سے بحث کرنا ہمارا مقصد ہے۔ نہ ہم کسی خاص تاریخ پر اپنا خیال ظاہر کریں گے بلکہ چند باتیں ذہن میں ہیں جو ہمارے نزدیک تاریخ کے لئے ضروری ہیں اور جس سے اُردو کی ادبی تاریخیں بالکل عاری ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی غیر ضروری باتیں ہیں جو غلطی سے ہمیشہ تاریخ سمجھ کر ادبی تاریخوں میں ٹھونس دی گئی ہیں اور جو اس بات کا بالکل صاف ثبوت ہیں کہ ہمارے مورخین کے ذہن میں تاریخ اور ادبی تاریخ کا مفہوم صاف اور واضح نہیں ہے اس کی متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ مگر سب سے بڑی وجہ ہماری سمجھ میں' ہماری تحقیق و تنقیح کی کمی اور نامکمل تذکروں کی مثالیں ہیں جن پر ہماری تاریخی اساس قایم ہے۔

تاریخ انسان کے مادی عمل و حرکت کا مرقع ہے۔ تاریخ ادب، ادبی افکار، عمل و حرکت کا مجموعہ ہے جو مادی ہوگا اور جسے قید زمان و مکان سے آزاد ہونا چاہیئے۔ تاریخ صرف ماضی ہی کی نہیں ہو سکتی۔ تاریخ ادب میں ادبی افکار کی شرط اس لئے ہے کہ افکار فلسفیانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ سیاسی بھی اور تجرباتی بھی .... اور ظاہر ہے کہ اگر ان خیالات میں ادبی جھلک نہ پیدا ہوئی تو وہ ادبی تاریخ کے ٹکڑے نہیں بن سکتے۔ ادبی تاریخ فلسفیانہ، سیاسی عمرانی روحانی ہو سکتی ہے مگر فلسفہ۔ سیاست۔ عمرانیات ادبی تاریخ ہرگز نہیں بن سکتیں۔ تاریخ کے ساتھ مادہ کی قید اس لئے ہے کہ بغیر مادہ کے کوئی حرکی عمل ظہور میں نہیں آسکتا اور تاریخ صرف خیالی کبھی نہیں ہو سکتی

اُردو ادب کی تاریخ زیادہ تر خیالی اور بیشتر روایتی ہے۔ اُردو کی تاریخ نے تذکروں کی فضا میں آنکھ کھولی جہاں زیادہ تر سنے سنائے واقعات اور قیاس سے کام لیا جاتا تھا۔ تحقیق و تدقیق کا شعور نہ تو پیدا ہوا تھا اور نہ لوگ اتنی زحمت گوارا کرنا پسند کرتے تھے۔ ہم صحیح طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُردو میں تذکرہ نویسی کا خیال کیونکر پیدا ہوا مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ فارسی تاریخیں اور کچھ تذکرے پیش نظر رہے ہوں گے۔ مگر کہیں کہیں اس قیاس سے انحراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ فارسی تذکرے زیادہ تر شہنشاہ وقت کے اوصاف کے حامل ہوا کرتے تھے اور شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ محض اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس سے بادشاہ کی علم دوستی اور ذوق پر روشنی پڑتی تھی[1] صرف شعرا اور ادیبوں کے ماحول، ان کے ذہن و شعور کا اظہار ہرگز مد نظر نہ ہوتا۔ اس لئے ہم اُردو کے تذکروں کو ایک درمیانی چیز تصور کرتے ہیں۔

کچھ مکمل اور مربوط تذکرہ جو اُردو کے شعرا کا ملتا ہے وہ میر کا نکات الشعرا ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا ہے[2]۔ نکات الشعراء سے لیکر شمیم سخن، تذکرہ صفا بدایونی تک ۹۹ تذکروں کو الٹ جائیے مگر کہیں بھی سرسری سوانح حیات، کلام کی معمولی خصوصیات یا پھر زندگی کے کچھ بد اخلاق چٹکلوں کے علاوہ آپ کو کچھ نظر نہ آئے گا اور ان واقعات و خصوصیات میں ذاتی بغض و عناد یا پسند کا بیشتر حصہ شامل ہوگا۔ نکات کا ایک اقتباس مظہر جانجاناں کے متعلق ہم پیش کرتے ہیں:۔

---

[1] صرف تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور لباب الالباب کو اس صف سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ سنجری دربار کے نقشے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ قابوس نامہ نوشیرواں سکندر اور ادھر ادھر کے واقعات سے متعلق ہے۔ اس میں شاعروں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ رشید الدین وطواط کی حدائق السحر میں مثالیں دیتے وقت اور بعض دوسرے فارسی کتابوں میں کہیں کہیں شاعر کے کلام پر کچھ روشنی پڑ جاتی ہے۔ [2] خان آرزو کو سب سے پہلا تذکرہ نگار کہا جاتا ہے۔ مگر چونکہ تذکرہ نایاب ہے اس لئے ہم ان کو پہلا تذکرہ نگار ماننے سے قاصر ہیں۔

"مظہر تخلص۔ مرولیت مقدس ومطہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال۔ شہرۂ عالم۔ بے نظیر۔ معزز۔ کرم اصلش از اکبر آباد است۔ پدر او مرزا جان نام داشت و از فرط شفقت مرزا جان جاناں می گفت۔ بندہ بہ خدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ۔ اکثر اوقات در یاد الہٰی صرف می کند۔۔۔۔ مختصر شعر فارسی او یہ نقر نقیر مولف آمدہ است۔ از کلیم و سلیم پائے کمی نہ دارد۔ اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ اوست لیکن گاہے متوجہ این فن حاصل می شود"

اقتباس اُردو کی تاریخی طرز فکر پر کافی روشنی ڈالتا ہے اور یہ بات بھی واضح کرتا ہے کہ ہمارے موجودہ مورخین آج تک فن تاریخ نگاری میں کہاں تک ترقی کر سکے ہیں آج ں جب ہم اُردو ادب کی تاریخوں کے اوراق اُلٹتے ہیں تو کم وبیش یہی ترتیب اور ایسے ہی واقعات ملتے ہیں جس میں کسی قسم کی کمی زیادتی کرنا گویا گناہ خیال کیا جاتا ہو سب سے بڑا اضافہ جو اُردو ادب کے مورخین نے تذکروں کے بعد کیا، وہ اُردو کی پیدائش کی تفتیش اور اس کی تفصیلی بحث ہے۔ تاریخ کا بیشتر حصہ ں قضیہ کے فیصل کرنے پر صرف کیا جاتا ہے کہ آیا اُردو دکن سے نکلی یا پنجاب سے اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ ردو قدح آج تک یہ معاملہ طے نہ ہو سکا۔ باوجود خود دلایل کے لوگ قطعی رائے دینے سے آج تک گھبراتے ہیں۔ اور کیوں نہ گھبرائیں اس لئے کہ تحقیق خام ہے۔ نتیجے کے طور پر ہر مورخ جب تاریخ لکھنا شروع کرتا ہے تو اسکا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس اکھاڑے میں کود ے اور کافی وقت اور کتاب کا کافی حصہ اس پر برباد کرے۔

ہم نے یہ بات متعدد بار کہی ہے کہ اُردو میں تاریخ لکھنے کا رواج بالکل روایتی ہے۔ عموماً ہمارے مورخ ادیب کے متعلق ذاتی تحقیقات وتجربات کو کم کام بں لاتے ہیں۔ چند افسانے، واقعات اور تفریحی جملے جو ان سے پہلے کے تذکروں یا تاریخ نا کتابوں میں لکھ دئے گئے ہیں، ان کا دہرایا جانا ان کے لئے فرض ہو جاتا ہو غالب اس لئے بڑا شاعر ہے کہ لوگ کہتے ہیں یا فلاں تاریخ یا تذکرہ کا بیان ہے۔ غالب اس لئے مشکل پسند ہے کہ آغا جان عیش نے کہہ دیا:۔

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب اس لئے فلسفی ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف یا عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھ دیا۔ ہمارے مورخین خود کوئی رائے دینے سے گھبراتے ہیں اور یہ کوشش نہیں کرتے کہ شاعر یا ادیب کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس کے تخیل کی گہرائیوں میں اُتریں۔ اس کی آواز کے وزن کو خود سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی نہ ہو سکا۔ اُردو ادب کے مورخین اور نقادوں کو ایک لفظ "بقول" ایسا بھایا ہے کہ وہ اس سے الگ ہونا کسی حالت میں بھی پسند نہیں کرتے جہاں کسی کے متعلق کوئی رائے دینی ہوئی لکھ دیا "بقول فلاں آپ کا کلام ایسا ہے"۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ ایک بیسویں صدی کے مشہور ادبی مورخ اپنی "تاریخ ادب اُردو" میں سودا کے متعلق کہتے ہیں:۔

"میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں خود سودا کے زمانہ میں یہی خیال ارباب فن کا تھا، چنانچہ حکیم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بپائے میر تقی نہ رسیدہ۔ اما حق آنست کہ ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است۔ مرزا دریائیست بے کراں و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میر را بر مرزا برتری است و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری"۔

گویا سکسینہ صاحب، سودا اور میر کے حالات زندگی وکلام سے خود کوئی رائے قایم نہیں کر سکے۔ اور جو رائے قایم کرتے ہیں وہ یہ ہے "میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں[1]"۔ اور ظاہر ہے کہ یہ رائے اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ کہا جائے "میر میر ہیں اور سودا سودا ہے[2]"۔ پھر سکسینہ صاحب قاسم کے بیان کے بعد ایک دوسری روایت شروع کر دیتے ہیں:۔

"اسی طرح ایک مشہور صاحب دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان وتصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر ومرزا کی شاعری کے فرق کا نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا کہ "دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام 'آہ' ہے اور مرزا کا کلام 'واہ' ہے"۔

---

[1] اور لطف یہ ہے کہ یہ رائے بھی ان کی رائے نہیں ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۱۴۳ "کہتے ہیں کہ مرزا قصیدہ گوئی کے بادشاہ ہیں، مگر غزل میں میر تقی کے برابر سوز وگداز نہیں"۔ حکیم قدرت قاسم کا اقتباس بھی آب حیات ہی سے لیا گیا ہے۔ [2] یہ خیالات تو سکسینہ صاحب نے لائے ہی تھے۔ الفاظ عسکری صاحب کا ترجمے نے بہت کچھ بڑھا دئے۔

ور پھر اپنی رائے دیتے ہیں

"حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے اُستاد تھے"

اب ذرا آبِ حیات ملاحظہ ہو:

"ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے انھیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمایئے۔ انھوں نے کہا دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے اور مرزا صاحب کا "واہ" ہے" (آبِ حیات ص۱۹۴)

اُردو ادب کی ایک تاریخ کا تضحیکی نمونہ آپ کے سامنے پیش ہوا۔ مگر اس کا الزام صرف سکسینہ صاحب ہی پر نہیں ہے، سبھی تاریخیں اس کا شکار ہیں[1]۔ طوالت کے ڈر سے ہم اور اقتباسات نہیں پیش کر رہے ہیں ورنہ گلِ رعنا، سیر المصنفین وغیرہ میں بھی یہی چیزیں بعینہ اسی طریقے سے ملتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ صرف میر و سودا ہی کے ساتھ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر شاعر کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ چند رٹے ہوئے جملے ہوتے ہیں جو اُردو ادب کا مورخ اور طالب علم ہر شاعر کی تعریف بس صرف کر دیا کرتا ہے۔ آپ کسی بھی شاعر کے کلام پر رائیں اور تنقیدیں ملاحظہ فرمایئے آپ کو یہ جملے ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ملیں گے۔ آپ کسی بھی تاریخ کو اٹھا لیں اور میر و سودا کا بیان پڑھنا شروع کر دیں، آپ کو یہ جملہ ضرور ملے گا "میر کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ" ظاہر ہے کہ ایک بالغ ذہن اس جملے کو پڑھ کر اور چیزیں بھی جاننا چاہے گا مگر کہیں اس کا جواب مشکل ہی سے ملے گا کہ آخر میر کے کلام میں 'آہ' کیوں ہے اور مرزا کے کلام میں 'واہ' کس لئے وہ کون سی شعوری یا غیر شعوری تحریک تھی جس نے میر کو رونا سکھا دیا اور وہ کون سا اثر تھا جس نے سودا کے قلم سے "لکھنا ہوں میں اک شیخ بریلی کی حکایت" جیسے مضحک قصے پیدا کئے۔ اس کا جواب آپ کو تاریخ کے اوراق مشکل ہی سے دے پائیں گے۔

آبِ حیات اور آزاد کا دور وہ دور تھا جس میں بہت سی باتیں پردۂ خفا میں تھیں۔ بہت سے خیالات و واقعات تجربہ گاہوں میں پڑے تھے۔ نہ علم نفسیات نے اتنی ترقی کی تھی اور نہ تنقید کا کوئی سائنٹفک طریقہ معلوم تھا۔ تحقیقی ذرایع اور شعور دونوں کی کمی تھی، انحطاطی عناصر پورے طور پر اپنا کام کر رہے تھے۔ ذہنی اُلجھنیں اور فراریت زلفِ پیچاں ہی کو جائے امن بنائے ہوئے تھیں ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ان روکھے پھیکے اور خشک موضوعات کی سمت کون متوجہ ہوتا۔ کسے اتنا دماغ تھا کہ وہ تذکروں پر جراحی عمل کام میں لاتا اور روایات و قصص کو تحقیق کی کسوٹی پر کستا۔ اگر آزاد نے لطیفے، چٹکلے اور بعض بے بنیاد نقلوں کا سہارا لیا تو ان کی غلطی قابلِ عفو ہو سکتی ہے جبکہ آج اتنی آسانیوں اور اتنے ذرایع کے باوجود مورخین یہی لکیریں پیٹتے چلے آتے ہیں۔ تاہم آبِ حیات نے ایسی ایسی باتیں بتائیں جن سے اس زمانہ کا ماحول، وقت کی رفتار، طرزِ تحریر، سوسائٹی وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے اور جسے آج بھی ہماری موجودہ تاریخیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم کچھ اقتباسات، آبِ حیات اور موجودہ تاریخوں سے پیش کرتے ہیں۔ آبِ حیات کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ اُردو شاعری کے چوتھے دور کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:-

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہلِ مشاعرہ آن پہونچے۔ یہ کچھ لوگ ہیں ؟ "ان کا آنا غضب کا آنا ہے"۔ ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہونگے جن کی شوخی اور طراری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں گے اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان سے دوسرے مکان کو سجائیں گے ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرّے سجائیں گے۔ کبھی انھیں کو پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گل بازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملے گا۔ ایسے ایسے قدرداں ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول بکے گا"

اب اسی دور پر ایک جدید اُردو تاریخ کی تمہید ملاحظہ ہو:

انشاؔ اور مصحفیؔ کا زمانہ

اس دور کی ترقیاں — شعراء کے طبقات کی ترتیب کوئی چیز فرضی نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعرا ایک دور

---

[1] گلِ رعنا مصنفہ عبدالحی میں ہو بہو صفحہ پر پانچ چھ مرتبہ "بقول آزاد بقول آزاد" ملے گا۔

کے ماقبل کے دور کے بعض شعراء کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے شاعر دور ماقبل میں نوجوان اور نو آموز تھے اور اس وقت انھوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دور ماقبل کے شاعر کہن سال اور مشاق مشہور ہو چکے تھے اس کے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اس دور میں بہ مقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لے لی۔ اس معاملہ میں زبان اُردو انشا کی بہت احسان مند ہے جنھوں نے اس کی توسیع اور ترقی کے لئے بہت سے نئے تجارب اختیار کئے مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے۔"

(تاریخ ادب اُردو مصنفہ رام بابو سکسینہ)

یہ دونوں اقتباسات ملاحظہ کیجئے اور اس دور کی خصوصیات پر کس کے یہاں زیادہ روشنی پڑتی ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ مواد اور ساخت کا فرق خاص طور سے قابل توجہ ہے۔

عموماً ہمارے مورخین نے تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جو بہت کچھ سوانح حیات سے متعلق ہوا کرتا ہے جس میں کہیں کہیں سیرت نگاری کی بہت دھندلی جھلک نظر آتی ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں شاعر کے کلام پر رائیں ہوا کرتی ہیں جن کا بیشتر حصہ قصیدہ ہوتا ہے۔ سوانح حیات کا ایک بڑا حصہ جیسا کہ ابھی اوپر کہا جا چکا ہے روایتی ہوا کرتا ہے جو دوسروں سے مستعار ہوتا ہے ———— اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے ہم مورخین کو تھوڑی رعایت دے سکتے ہیں اس لئے کہ مواد کی فراہمی میں بعض اوقات ایسی دقتیں ضرور پیش آتی ہیں مگر جہاں سے سیرت نگاری کی سرحد شروع ہوتی ہو وہاں ہم مورخ کو قطعی معاف نہیں کر سکتے۔ شخصیت کی پرکھ میں یکسانیت کا ہونا کچھ عجیب ضرور ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کے متعلق جو رائے میں قایم کروں ٹھیک وہی رائے آپ کی بھی ہو۔

تاریخ کے اس حصہ کو اور خاص طور سے پوری تاریخ کو جو چیز نامکمل بنائے ہے وہ ہمارا اخلاقی نظام ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدروں میں تبدیلی سے ہماری ناواقفیت۔ ہمارا اخلاقی نظام بھی اور چیزوں کی طرح پرتروائی ہے جس کا معیار صرف چند چیزوں پر ہے۔ آدمی کو باعصمت ہونا چاہئے۔ آدمی میں سنجیدگی ہونی چاہئے۔ اُسے صرف ثواب کمانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ گناہ کا خیال آتے ہی گویا انسان آدھا گناہ کر لیتا ہے۔ سچ بولو۔ جھوٹ سے پرہیز کرو۔ ہر وہ چیز جسے ہم تیری سمجھیں تیری ہے۔ بڑوں کا کہنا ماننا چاہئے عام اس سے کہ وہ غلط کہتے ہیں یا صحیح۔ یا پھر وہ چیزیں جو انسانی اخلاقیات کا بلند ترین معیار قرار دی گئی ہیں۔ گویا انسان کو فرشتہ ہونا چاہئے۔ دوسری بات جو ہمارے ذہن میں ہے وہ یہ کہ ہر اچھا آدمی بالکل اچھا ہے اور ہر بُرا آدمی بالکل بُرا۔ نہ اچھے آدمی میں کوئی بُرائی آسکتی ہے نہ بُرے آدمی میں کوئی اچھائی ہو سکتی ہے۔ زندگی کی قدریں جیسی بن گئیں ویسے ہی قایم ہیں۔ اس نظریہ سے بظاہر تو کوئی نقصان نظر نہیں آتا مگر غور کیا جائے تو ایک بڑی حد تک یہ نظریات ادیب کی فکر اور اس کی شخصیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہم اسی وجہ سے نہیں سمجھ پاتے کہ وہ سعدی جس نے گلستان اور بوستان میں ایسے بہترین اخلاقی نکات پیش کئے ہیں اُسی سعدی نے اپنی اخلاقی تعلیم میں ایک باب (باب پنجم گلستاں) ایسا کیسے لکھ دیا جسے لوگ آج مخرب اخلاق سمجھتے ہیں یا میر نے :

تمرش رو بہت ہے وہ زرگر پسر	پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم
میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب	اُسے عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

یا شاہ آبرو نے :

یاں تلک خوش ہوں امارد سے کہ یا رب کریم	کاش دے حور کے بدلے بھی تو غلماں مجھ کو
زاہد ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی سے	جہاں جاویں وہاں اک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں

جیسے اشعار کس ذہنی تحریک کے تحت میں لکھے۔ جب ہم ان چیزوں کو دیکھ کر تاریخ پر ایک تجسس آمیز نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں اس کی وجہ کہیں نظر نہیں آتی اور اگر کہیں کچھ ملا تو ایسی مبہم عبارت میں کہ وہ غزل کا شعر بن جاتا ہے جس کا اطلاق معشوق حقیقی و مجازی۔ سیاست۔ حقیقت۔ طریقت سب پر ہو سکتا ہے ———— پردہ پوشی کچھ تو اس لئے ہوتی ہے کہ ہم نے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور زیادہ تر اس لئے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" چنانچہ ہم یہ جاننے کی

کوشش نہیں کرتے کہ عصمت اور خوبصورت جنسیاتی معروں میں کیوں چکر لگایا کرتے ہیں کس لئے داغ کے یہاں عریانیت ہے اور کیوں جرأت کے یہاں لذتیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کونسا سامنا ہے جو درد کو صوفیانہ مسایل سے دلچسپی لینے پر مجبور کرتا ہے اور وہ کونسی چیز ہے جو نظیر اکبر آبادی سے جاڑے کا شباب دیکھ کر کہلواتی ہے

جب ایسی سردی ہو اے دل تب روز مزے کی گھاتیں ہوں
کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
معشوق گلے سے لپٹا ہو، اور کہنی، چٹکی، لاتیں ہوں
کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہمارے مورخین کی یہ زبردست غلطی ہے کہ وہ فن کار کے عیوب پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی ادیب کی وہ ذہنی یا عصبی تحریک جسے مخرب اخلاق یا گناہ سمجھا جاتا ہے، اس پر کونسی ایسی روشنی ڈالی جائے کہ ابہامات اور گتھیاں جنہیں بعض اوقات ہم سمجھنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ہمارے سامنے آئینے کی طرح روشن ہو جائیں۔ ادیب میں انفرادیت کا جزو کم اور اس کی زندگی کی الجھنوں یا خوشگوار لمحوں کا بڑا حصہ ہوا کرتا ہے اور یہی چیز کبھی کبھی انفرادیت نظر آنے لگتی ہے۔

یہ ایک بورژوائی ذہنیت رہی ہے کہ آرٹ کو ہم نے یا تو انفرادی جانا یا روایتی۔ درانحالیکہ آرٹ نتیجہ ہے آرٹسٹ کی انفرادیت اور اس کے گرد و پیش کے ماحول سے تصادم کا اور یہی وہ ٹکریں ہیں جو آرٹسٹ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ آرٹ کو محض آرٹ کے لئے خلق نہ کرے بلکہ عینیت پرستی سے پیچھا چھڑا کر ایک عام انسان اور اس کے زندہ رہنے کی جد و جہد جو زندگی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُسے آرٹ کے ساتھ پیش کرے۔ ہمارے قدیم فنکار اس میں شک نہیں بڑی حد تک فن برائے فن کے حامی رہے مگر ہمیں ان کی تخلیق پر نظر ڈالتے وقت ان کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ خواہ انھوں نے ایسا شعوری طور پر کیا یا غیر شعوری طور پر، مگر اس میں ان کے ماحول اور ان کی کشمکشوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے روایت سے خوب کام لیا جس سے ہمیں ان کی زندگی کے سمجھنے میں سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کے افکار ان کی زندگی پر قطعیت کے ساتھ کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ وہ یکسانیت کے رنگ میں اتنے گہرے رنگے ہوئے ہیں کہ آپ کلام سے ہرگز پتہ نہیں لگا سکتے کہ کسے واقعی عشق تھا اور کون محض رسم نباہ رہا ہے سب کے جذبات اور حسیات میں یکسانیت ملے گی، وصل و وصال ایک ہی طریقہ پر ہوگا۔ ہجر میں سب کو ایک ہی طرح کی دشواریاں پیش آئیں گی سب کا معشوق بے وفا ہوگا۔ وعدہ شکن ہوگا۔ سب کا سراپا ایک ہوگا۔ سب خوبصورتی کا مثالی نمونہ ہوں گے۔ یہ ایسی دقتیں ہیں جن کی بنا پر ہمارے مورخین جو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی صحیح طور پر شاعر کو نہیں سمجھ پاتے مگر کچھ یہ بھی ہے کہ ہمارے مورخین زیادہ تر ایک ہی لکیر کو پیٹتے آئے ہیں اور وہ "لکیر فن" ہے۔

تاریخوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مورخین[1] کے سامنے کسی شاعر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت صرف ایک ہی چیز پیش نظر رہتی ہے اور وہ یہ کہ فنکار نے کہاں تک فن کی تکمیل کی ہے اور فنی اصولوں کو اس نے کہاں تک نبھایا ہے۔ کہاں اضافت کی غلطیاں ہیں۔ کہاں حروف گرتے ہیں، کہاں شترگربگی پیدا ہوتی ہے، مصرعہ کا مرتبہ کیا ہے۔ کون کون سی رعایتیں ہیں۔ کہاں سلاست ہے۔ کہاں روانی ہے۔ واردات قلبی کا بیان مکمل اور جامع ہے یا نہیں۔ یہ چند چیزیں ہیں جنہیں ہمارے مورخین اور رجعت پسند نقاد منتروں کی طرح دہرایا کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ ذہنیتیں چاہتی ہیں کہ ہر ادیب۔ ہر فن کار کا وہی نقطۂ نظر ہی ہو جو اب تک شاعروں اور ادیبوں کا ہوتا آیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر دوسرے دور کا ادیب یا شاعر اپنے پہلے دور کے ادیب یا شاعر کی طرح کیوں سوچے یا اس کے نظریات بھی وہی کیوں رہیں۔ کروچے (C R O C E) کا کہنا ہے کہ آرٹ الہام ہے اور الہام انفرادیت اور انفرادیت دہرائی نہیں جا سکتی۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر کس طرح ایک انفرادی خصوصیت جو آپ کو پسند ہے اور جو پچھلی صدی میں موجود تھی۔ آج کے فن کار سے بھی آپ اس کے طالب ہوں۔ ہم تنقید کرتے وقت گویا مادے کے حرکی ہونے اور زمانہ کی رفتار کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ گویا ہم چاہتے ہیں کہ آرٹ جس طرح بھی عالم یا شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے اسی طرح قایم رہے اور اگر بڑھے تو انھیں اصولوں پر اور اس طرح ہم ہمیشہ عمر رفتہ کو آواز دیتے رہیں۔ ہمارے مورخین اس سے قطعاً غرض نہیں رکھتے کہ فن کار کہاں تک اپنی سماجی ضرورتیں اور دقتیں پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے اور کہاں اس نے چشم پوشی کی ہے اور

---

[1] عموماً مورخ ہی ہمارے نقاد بھی ہوتے ہیں۔

ایک چشم پوشی کسی جبر کے باعث ہوتی ہے یا ادیب کی ذہنیت ہی میں فرسودگی اور خوشامد کا انداز آگیا ہے۔ یا اُسے ان ضرورتوں سے انکار ہے یا وہ آرٹ کو محض خود غرضی بنانا چاہتا ہے۔ کہاں اس نے ضمیر فروشی کی ہے اور کہاں اس سے ضمیر فروشی کرائی گئی ہے۔ ایک مورخ ان سب باتوں کو واضح طور پر پیش نہیں کر رہا ہے تو وہ مورخ تو ہے مگر ادب کا مورخ ہرگز نہیں۔

”خطائے بزرگاں گرفتن خطاست“ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہمارے مورخین کا ایک اور رجحان ہے جسے ”عطائے خرداں“ شخصیت یا ہیرو پرستی کہہ لیجئے۔ ہمارے مورخ اس کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور اسی سے ایک اور شاخ پھوٹتی ہے وہ ہے شخصیت دشمنی۔ مورخ کسی سے یا تو بے انتہا متاثر ہوتا ہے یہاں تک کہ اُسے اس فن کار میں کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی اور اگر کوئی کمی ہے تو اُسے بھی خوبی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یا پھر کسی فن کار سے مفت میں دشمنی مول لے لی جاتی ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی خوبیوں کو بھی اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ خرابی معلوم ہوں۔ اس کی بین مثال ’آب حیات‘ میں ذوق و غالب کا تذکرہ۔ موازنہ انیس و دبیر اور یادگار غالب (گو یہ دونوں کتابیں تاریخیں تو نہیں مگر واقعات ان میں تاریخی حیثیت ہی سے بیان کئے گئے ہیں) ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ہیرو پرستی کا شکار ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ جو تاریخیں ان کے بعد مرتب ہوئیں وہ بھی ان سے متاثر ہیں اور اسی طرح کے بے سر و پیر واقعات اور غیر تحقیقی قصوں کا ایک ذخیرہ ان میں بھی موجود ہے۔

تاریخ۔ خصوصاً ادب کی تاریخ صرف واقعات کا مجموعہ ہرگز نہیں بن سکتی۔ مورخ کو انسان کے ارتقائی مدارج اور ارتقائی جد و جہد کو اچھے اور واضح طریقے سے سمجھنا بہت ضروری ہے جو مورخ کو واقعات کے ساتھ ملا کر ایک صحیح شکل کے مرتب کرنے میں ممد ثابت ہو اور اگر وہ انسان کے اجتماعی، اقتصادی، اور ثقافتی ارتقاء سے بہ خوبی واقف نہیں ہے تو وہ ہرگز ایک مورخ نہیں بن سکتا۔ علمی طریقے سے انسان کی ترقی مادی ہی ہو سکتی ہے چاہے وہ اقتصادیات میں ہو چاہے کلچر میں۔ اور یہی ایک ایسی ترقی ہو گی جس کی منزل ایک معلوم منزل ہو گی۔ تصور پرستی نہ تو ترقی ہو سکتی ہے اور نہ انسانی جماعت اس سے مستفید ہو سکے گی۔ ہمارے مورخ زیادہ تر اسی کمزوری کا شکار ہیں۔ ان کے نظریات بھی زیادہ تر عینی ہیں۔ نہ وہ مادہ کی گوناگوں صلاحیتوں سے واقف ہیں اور نہ اس کے کرشمے کو انسانی ترقی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کا میلان بہت کچھ تصور پرستی کی طرف ہے جس میں ترقی کے صرف چند محدود اصول مل سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عینی اصول عمل کے میدان میں بالکل بے کار ثابت ہوں گے۔ نتیجے کے طور پر مورخین یا تو ان کے موافق رائے دیتے ہیں جنہوں نے تصور پرستی سے کام لیا ہے اور جسے تخئیل کی بلندی کہا جاتا ہے یا پھر ان کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کریں گے جو تصور کی چوٹیوں پر نہیں پہونچ پاتے اس لئے کہ وہ عمل کے میدان میں چل رہے ہیں۔

آج جدید ادب کا ترقی پسند حصہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا حامل ہے اور بعض ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جن سے ابھی لوگ واقف بھی نہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ لوگ جس طرز پر یہ بیانات چاہتے ہیں، ہمارا طرز اظہار اس سے الگ ہے۔ آپ فن چاہتے ہیں اور صرف فن۔ اور آج وہ آرٹ جسے پروپیگنڈا کہا جاتا ہے۔ اس میں احساس کی تلخی اتنی اُبھری ہوئی ہے کہ بعض اوقات ہمارے مورخین اور رجعت پرست نقادوں کے نزدیک فن کا خون ہو جاتا ہے اور جس کا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ جد و جہد میں کیسے رکھ رکھاؤ کا خیال رہ جاتا ہے۔ یہ لوگ شاید اس نقطے سے واقف نہیں کہ انقلابی دور کا آرٹسٹ صرف آرٹسٹ نہیں رہ سکتا۔ اُسے ملہم۔ مفکر۔ سیاست داں۔ سبھی کچھ ہونا پڑتا ہے۔ انقلابی دور کا یہ خاصہ ہوا کرتا ہے اس کے علاوہ زندگی حرکی ہے اور انقلاب ایک زبردست حرکت۔ آرٹسٹ ایک مقام پر جامد ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اُسے یا تو آگے بڑھنا ہو گا یا پیچھے ہٹنا ہو گا۔ بین بین چلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سید محمد عقیل

اسد اللہ خاں تمام ہوا !

ایک سوانحی تمثیل

غالب کی زندگی اپنے آغاز و انجام اور درمیانی واقعات کی ترتیب و ارتقا کے لحاظ سے ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے ۔ دنیائے شعر میں تو مرزا غالب خلاقِ معانی
ر فنکار تھے ہی، لیکن اُن کی شخصی زندگی کے مرقع کو بھی رنگ اور روشنی اور سائے کی آمیزش نے ایک مستقل فنی کارنامہ بنا دیا ہے ۔ غالب کی زندگی کا پورا ڈراما
نیل کی ذرا سی کوشش سے ہم پر خود بخود منکشف ہو جاتا ہے ۔ یہ ڈراما سلطنتوں کے ہبوط و زوال، عظیم الشان اخلاقی و دینی قوتوں کی پیکار اور مشرق و مغرب کی
بصلہ کن آویزش کے پس منظر پر نمودار ہوتا ہے ۔ غالب کے سوانح حیات کا قاری صرف یہ کرتا ہے کہ نصف صدی کے واقعات کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اپنے فنی شعور کے
ایرے کے اندر لے آتا ہے اور پھر یہ حیرت انگیز ڈراما خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے ۔

مرزا غالب نے اکہتر برس کی عمر پائی ۔ اُن کا زمانۂ حیات مسلمانانِ ہند کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا ۔ جنوب سے مرہٹوں، مغرب سے سکھوں، مشرق
ے انگریزوں نے مغلوں کی سیاسی طاقت پر پے در پے حملے کئے لیکن مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا ایک ننھا سا نقطہ پھر بھی ہندوستان کے قلب میں روشن رہا
ں روشن نقطے کا نام تھا دلّی ۔ اُنیسویں صدی کی دلّی میں اہلِ کمال کا ایک ایسا مجمع نظر آتا ہے، جس سے اکبری اور شاہجہانی عہد کے علم و فضل کی یاد تازہ
ہو جاتی ہے ۔ اہلِ کمال کی اس جماعت پر نظر ڈالئے تو بزرگوں میں شاہ عبد العزیز اور شاہ اسمٰعیل، مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ
ب مصطفٰے خاں شیفتہ اور مولوی امام بخش صہبائی، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن اور نوجوانوں میں سید احمد خاں اور حالی، ذکاء اللہ اور
ر احمد کے پائے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں ۔

اِسی دلّی میں سنہ ۱۸۲۸ء کے موسمِ گرما کا ذکر ہے کہ ایک دن سہ پہر کے وقت مرزا اسد اللہ خاں غالب کے مکان کے باہر ۔۔۔۔۔۔۔۔

خوش الحان فقیر :- کنکر چُن چُن محل بنایا مورکھ کہے گھر میرا ہے
نا گھر میرا، نا گھر تیرا، چڑیا رین بسیرا ہے
نا گھر میرا، نا گھر تیرا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (آواز دور ہوتی جاتی ہے)

(گھر کے اندر بیگم غالب تخت پر بیٹھی ہیں ۔ صحن میں بیری کے درخت سے طوطے کا پنجرا ٹنگا ہے)

م غالب ۔ ودا ! اے ودا ! ذرا اُٹھیو جلدی سے ۔ لیجیو ۔ یہ اَدھنّا دروازے تک جا کر بچارے کو دے آئیو ۔ (ودا جاتی ہے) ۔۔۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ
تاسف آمیز لہجے میں آہستہ) چڑیا رین بسیرا ! چڑیا کے بھاگ پھر اچھے کہ اپنے گھونسلے میں تو بیٹھی ہے اور میں، نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی ! ۔۔۔ غریب کے
سر پر بھی اپنا جھونپڑا ہوتا ہے، لیکن میرے لئے دلّی میں کرائے کے مکانوں کے سوا اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا ۔ ابا جان نے آنکھیں کیا بند کیں، میرے
نصیب سو گئے ۔ چار سال سے چولہا اُٹھائے گھر گھر پھرتی ہوں ۔ اب برسوں کے رکھے ہوئے، زربفت اور کمخواب کے جوڑے بھی ایک ایک کر کے
بکنے لگے ۔ یہ کلکتے کا سفر مجھے تو بہت مہنگا پڑا ۔ کیا کیا امیدیں لے کر مرزا صاحب روانہ ہوئے تھے، اور پھر کس حال میں واپس ہوئے ! اب چھ مہینے بعد
بھی کبھی کوئی ٹھیک خبر کلکتے سے نہیں آئی ۔ (ذرا بلند آواز سے) ودا ! مدار خاں سے کہیو مرزا صاحب سے پوچھے کہ ٹھنڈائی دیوان خانے میں بھیج دیں گے
۔۔۔۔۔ کیا کہا ؟ ۔ آ رہے ہیں ؟ تو بس ٹھیک ہے ۔۔ (طوطا بولتا ہے)

ہو۔ اب میاں مٹھو کو تھوڑی سی چوری دے دو۔ (مرزا غالب آتے ہیں)

غالب ــــ چڑیا رین بسیرا۔ آپ نے بھی یہ وعظ سُنا ؟ لیکن زندگی کتنی ہی بے ثبات ہو اس کا یہ مرتبہ تو دیکھیے کہ اس پر وعظ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (طوطا بولتا ہے) کہو میاں مٹھو! اب کیا فریاد ہے! آج چوری نہیں ملی؟ اے میاں خوش رہو۔ نہ تمھارے بچے، نہ جورو، چوری کھاؤ اور مزے کرو۔ یہی زندگی ہے

بیگم ــــ اِن باتوں سے کیا فایدہ ؟ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری اپنی زندگی کیسی ہے ؟

غالب ــــ اچھی اور بُری اور اچھی !

بیگم ــــ اب یہ پہیلیاں بھلا کون بوجھے ؟

غالب ــــ بات تو صاف کہتا ہوں۔ سب سے پہلے اچھی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شروع میں برسوں تک زندگی خوب گزری۔ پھر بُری اس لئے کہ پچھلے چار پانچ برس سے ہم لوگ چکر میں ہیں اور پھر دوبارہ اچھی اس لئے کہ مقدمے کا فیصلہ ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بیگم ــــ میں تو پانچ سال سے انھیں امیدوں پر جی رہی ہوں !

غالب ــــ تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ بھی ہو، سرکار انگریزی نے پچیس برس پہلے ہم دونوں بھائیوں کے لئے دس ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر کی شمس الدین خاں نواب ہیں تو فیروز پور جھرکہ کے ہیں، میرے سرکاری وظیفہ کے نواب نہیں ہیں۔ نہ اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے اس دس ہزار کو ڈیڑھ سو کون بنا سکتا ہے؟ سرکاری شقے کسی کی جعل سازی سے بدل نہیں جاتے۔ یہ رقم مل کر رہے گی، بلکہ اگر انصاف ہوا تو اب تک جس قدر کم رقم ملتی رہی ہے۔ اُس کی واصلات ابتدا سے آج تک دلوائی جائے گی۔

بیگم ــــ (زہر خند سے) انصاف! میں نے صرف اس کا نام سُنا ہے۔ انصاف کرنے والے حاکم بدلتے ہیں۔ معزول ہوتے ہیں، مرتے ہیں مگر انصاف نہیں ہوتا۔

غالب ــــ انصاف ہوگا !

بیگم ــــ نہیں ہوگا! ایسے انصاف کو میں کیا کروں جس کے انتظار میں ایک بھائی پاگل ہو گیا اور دوسرا ــــ

غالب ــــ اور دوسرا !

بیگم ــــ اور دوسرا لٹ گیا۔ چکی کے دو پاٹوں تلے پس کر رہ گیا۔

غالب ــــ میرا بس وہ یا کچھ! ایسا آسان نہیں ہے۔ چکی کے پاٹ البتہ گھس گئے ہیں۔ ابھی اور گھسیں گے۔

(باہر کے دروازے پر دستک ــ دار خاں ملازم آتا ہے)

دار خاں ــــ سرکار! مولانا فضل حق صاحب کا آدمی یہ رقعہ چھوڑ گیا ہے۔

غالب ــــ مولانا کو آ کر خود یہاں آنا تھا ــــ خیر لاؤ۔ رقعہ ــــ (رقعہ کھولتے ہوئے) اچھا! کروڑی مل مہاجن کو میرے خلاف ڈگری مل گئی۔ ہوں! کروڑی مل بھی کیا کرے کلکتہ جانے سے پہلے اُس سے قرضہ لیا تھا۔ اب کروڑی مل اور دیوانی عدالت کا پیادہ میری تلاش میں منڈلا رہے ہیں۔

بیگم ــــ اب کیا ہوگا ؟

غالب ــــ ہوگا کیا: گھر میں بیٹھوں گا۔ (طوطا بولتا ہے) میاں مٹھو سے باتیں کروں گا۔ آپ کی نماز میں حارج ہوں گا۔ دستور کے مطابق شرفا کو دیوانی عدالت کے ڈگری دار گھر کے اندر تو گرفتار کر نہیں سکتے، اور دن کے وقت میں باہر نکلنے سے رہا (ذرا ہنس کر) دو نوں وقت ملتے جب چراغ میں بتی پڑتی ہے میں بھی چمگادڑوں کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے نکلا کروں گا، اور باہر کا کام دھندا کر آیا کروں گا ــــ دار خاں! دیکھو مرزا کی گلی جاؤ ــ جو چھینٹ میں نے آج فرغل کے لئے خریدی تھی وہ عزیزالنسا خانم میری بھتیجی کو دے آؤ (بیگم سے ذرا دبے لہجے میں) وہ بچی نئے کپڑے کو ترس گئی ہے ــــ اور دیکھو! یوسف بیگ خاں کا حال پوچھنا اور کہ آنا کہ میں آج حکیم صاحب کو نہیں لا سکوں گا۔ ہاں کل مغرب کے بعد انھیں ساتھ لے آؤں گا (دار خاں جاتا ہے) بیچارا یوسف! ہمارے لڑکپن میں لوگ کہا کرتے تھے کہ دونوں بھائیوں میں وہی کماؤ ہوگا۔ کیا جوان تھا جیسے لوہے کی لاٹھ۔ اور جب حیدر آباد سے اپنے رسالے کو چھوڑ کر آیا تو دیکھ کر دل کانپ جاتا تھا ــــ جھنجھٹ، مجذوب، ٹوٹی ہوئی کمان کی طرح بے حال! اگر اس کو

حال ٹھیک ہوتا تو میں اس مقدمے کے لئے شاید آسی کو کلکتہ بھیجتا۔

بیگم — اُف کلکتہ کے نام سے میرے سینے میں ایک تیر لگتا ہے۔ اس کلکتہ کی امید نے ہمیں ویران کر دیا۔ ورنہ لکھنؤ کے دربار سے کچھ نہ کچھ مل گیا ہوتا۔

غالب — (ذرا تلخی سے) تمھیں لکھنؤ کے دربار کا حال کیا معلوم؟ روشن الدولہ کے ہاتھ دو چار ہزار کے عوض اپنی آبرو بیچ ڈالتا؟ وہ اگر نائب السلطنت تھا، تو میں بھی خاندانی شریف تھا۔ وہ میری تعظیم دینے پر کیوں آمادہ نہ ہوا؟ کیا اُس کے لئے یہ کافی نہ تھا کہ میں نے اُس کی مدح میں ایک نثر طیار کی؟ اس کے ساتھ یہ شرط کیوں لگائی گئی۔ کہ گداگروں کی طرح نذر بھی پیش کرتا؟ میں نے فوراً کہا کہ میں ایسی حضوری سے معافی چاہتا ہوں۔

بیگم — اچھا ہمارا مقدر!

غالب — جو کچھ مقدر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ ہم اگر شکوہ کریں بھی تو کیا حاصل؟

بیگم — ہاں تمھارے لئے سب کچھ آسان ہے۔ اور نہیں تو شعر لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لی۔

غالب — آپ کے آنسوؤں سے بھی تو دل کی بھڑاس خوب نکل جاتی ہے!

بیگم — (دردناک آواز میں) تو کیوں نہ روؤں! باپ مر گیا۔ بھائی سے تمھاری اَن بن ہو گئی۔ مکان بک گیا۔ گھر میں جو زیور یا کپڑا تھا وہ بھی یہ جاگیر کا مقدمہ کھا گیا۔ اب تمھارے پیچھے عدالت کے پیادے قید کرنے کو پھرتے ہیں — بچے تھے...... (بھرائی ہوئی آواز میں) وہ مر کر مجھے جس سنّاٹے میں چھوڑ گئے میرا ہی دل جانتا ہے (سسکیاں لے کر روتے ہوئے) کیسے پیارے بچے تھے جیسے چاند کے ٹکڑے، ابھی تتلانا ہی شروع کیا تھا کہ اللہ کو پیارے ہو گئے (روتے ہوئے) ایک ایک کر کے سب گئے پہلا... اور دوسرا، پھر تیسرا بھی... چوتھا بھی۔ (مختصر وقفہ)

غالب — (آہستہ سے) وہ اگیا زین العابدین خاں آج اِدھر نہیں آیا؟ میں نے صبح اُس سے کہا تو تھا کہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اپنی خالہ کے پاس ہو جایا کرو... بڑا نیک بخت لڑکا ہے کسی کام کی وجہ سے رُک گیا ہوگا۔ دیکھو صبح اُن کے ہاں جانا اور کہنا میاں بھول کیوں گئے؟ تمھاری خالہ تنہائی میں کڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں آؤ گے، کچھ میں تمھیں پڑھا دوں گا۔ کچھ تمھاری خالہ تم سے باتیں کریں گی، اِن کا جی بہل جائے گا..... اور بیگم اب جلد ہی ہمارے دن پھریں گے۔ میرے کاغذات گورنر جنرل کے سامنے عنقریب پیش ہوں گے۔ انگریز سکریٹری میرا دوست ہے۔

بیگم — ہاں مگر سال بھر پہلے وہ بھی تو تمھارا دوست تھا۔ دلّی کا انگریز ایجنٹ.......

غالب — کولبرک؟

بیگم — جو معزول ہو گیا۔ خیر پھر تم نے دل کو یوں تسلی دی کہ اس کی جگہ دوسرا انگریز دوست آ گیا۔

غالب — ہاں ہاں فریزر۔

بیگم — لیکن فریزر چھ ہفتے کے اندر بدل گیا اور اس کی جگہ نیا ریزیڈنٹ آیا جو تمھارا نہیں، شمس الدین خاں کا دوست ہے۔

غالب — تو کیا ہوا پھر ویسے ہی اتفاق تو پیش نہیں آئیں گے۔ نہ ہاکنز کی روداد پر آخری فیصلہ ہو جائے گا۔ کلکتہ میں لاٹ صاحب کا سکریٹری اسٹرلنگ صاحب میرا مخلص اور بہی خواہ ہے۔ کیا خوب آدمی ہے۔ پہلی ملاقات پر شریفوں کی طرح اُٹھ کر مجھے تعظیم دی۔ اپنے ہاتھ سے عطر اور الائچی پیش کی اور بعد میں بھی بہت تکریم سے پیش آ رہا۔ میرے کاغذات اُسی کے ہاتھ سے نکلیں گے۔ پھر ابھی چند سال وہ اپنی جگہ سے ٹل بھی نہیں سکتا۔ اس لئے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسٹرلنگ کلکتے میں ہے تو سب ٹھیک ہے۔ (باہر کے دروازے پر دستک)

بیگم — یا الٰہی خیر! اب یہ کون آیا؟

غالب — کوئی نہیں، دارغاں واپس آیا ہوگا۔ (دارغاں آتا ہے)

دارغاں — سرکار صدر الصدور صاحب کا آدمی میرے ساتھ ہی پہونچا اور یہ پرچہ دے گیا۔

غالب — آج سب دوستوں کی طرف سے ایک ایک رقعہ ضرور آئے گا۔ لاؤ دیکھیں کیا کہتے ہیں مفتی صدر الدین خاں صاحب (کاغذ کھولتے ہیں)

بیگم — خدایا کوئی خیر کی خبر ہو!

غالب — کلکتہ سے ..... خبر آئی ہے ..... اسٹرلنگ صاحب ۲۳ مئی کو مرگئے — ہائے جواں مرگ!

یہ مرزا غالب کی زندگی کا ایک رُخ تھا۔ لیکن اس ذاتی اور خانگی پریشانی کے علاوہ اُن کی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی تھے۔ ان پہلوؤں کا تعلق اُن کے روشن ضمیر دوستوں کی صحبت اور اُن کی بڑھتی ہوئی شاعرانہ شہرت سے تھا۔ لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل نے مقدمہ کا فیصلہ اُن کے خلاف کیا۔ کچھ پرانی پریشانیوں میں کمی ہوئی، کچھ نئی پریشانیوں کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح اور بارہ سال گزر گئے۔ اس زمانہ میں ایک صبح کا ذکر ہے کہ مولانا فضلِ حق خیر آبادی مرزا غالب کے مکان پر پہونچے۔

مولانا — ارے بھئی مرزا، اب اُٹھو اور خدا کا نام لو۔ مردِ خدا یہ بھلا سونے کا وقت ہے؟ میں دو گھڑی تم سے بات کرنے آیا تھا اور تم ہو کہ شرابیوں کی طرح صبح کے وقت غافل پڑے ہو۔

غالب — یہ جو آپ نے مجھے شرابی سے تشبیہ دی، اِسے اصطلاح میں تشبیہ تام کہتے ہیں۔

مولانا — اب آپ علم معانی پر اپنا درس رہنے دیجئے اور ذرا اُٹھ کر ہاتھ منھ دھو لیجئے۔

غالب — بھئی مولانا، مجھے اتنی مہلت تو دو کہ تمھاری تشریف آوری پر ذرا خوش ہو لوں۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ قلعۂ معلّٰی سے چوبدار نے آکر خبر دی کہ جہاں پناہ نے یاد فرمایا ہے سو اسی خواب کی تعبیر تمھاری ملاقات ہے ؎

جہانے مختصر خواہم کہ در وے ہمیں جائے من و جائے تو باشد

کلّو آفتابے میں پانی لاؤ۔ ذرا منھ بھی دھو لیں اور باتیں بھی کرتے جائیں۔ اور دیکھو مولانا کے لئے شربت بھی لاؤ۔ مولانا، یہ پیشگاہِ حضور میں طلبی کا خواب کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کبھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں۔ میاں ابراہیم خاقانیِ ہند حسب معمول اس پہ جز بز ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ سلامت کو اس طرف توجہ ضرور ہو گئی ہے۔ خیر یہ قصہ تو پھر سناؤں گا۔ آپ کہئے کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔

مولانا — بھئی پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، یہ غیر مقلدین کا فتنہ کسی طرح فرو ہونے نہیں آتا۔

غالب — میں تو آپ کے مقلدین میں سے ہوں۔ یوں کہ منھ دھوئے بغیر دین کی بات نہیں کرتا۔ لیجئے یہ شربت نوش فرمایئے اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

مولانا — مرزا، اِس پیالے میں سے دو ایک گھونٹ پہلے تم پیو!

غالب — یہ کیوں؟

مولانا — اس لئے کہ تمھاری زبان کا اثر میری زبان میں آجائے۔

غالب — مولانا، اگر ایک رندِ گنہگار کو یوں کانٹوں میں گھسیٹو گے تو میں اُٹھ کر تمھارے قدموں کو چھو لوں گا۔ میرے لئے یہ سعادت کم نہیں کہ میں اور تم ایک ہی سال پیدا ہوئے اور تم نے جوانی سے لیکر اس عمر تک جس طرح میری رہنمائی کی ہے ------

مولانا — تو بھئی مرزا! اُس رہنمائی کے بدلے اب کچھ میری رہنمائی کرو۔ وہی مسئلہ امتناعِ نظیرِ خاتم النّبیین ...... اس پر اپنا اور وہابی جماعت کا اختلاف مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تم میرا یہ عقیدہ جانتے ہو کہ خاتم النّبیین کا مثل ممتنع بالذّات ہے یعنی جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسی طرح خاتم النّبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کو اصرار ہے کہ خاتم النّبیین کا مثل ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذّات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اسلئے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ اس لئے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مرزا تم ذرا غور کرو کہ کیا یہ بالواسطہ ختم نبوت سے انکار نہیں ہے؟

غالب — ہے، مگر مولانا اگر خدا لگتی سنو تو میں یہ کہوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ذاتِ باری کی قدرتِ کاملہ سے انکار ہے، شاہ اسمٰعیل کے پیرو اس پر چراغ پا نہ ہوں تو کیوں؟

مولانا — ارے میاں! یہ کیا کفر بکنے لگے ہو؟ کون خدا کی قدرت کاملہ کا منکر ہے۔ تمھارے نزدیک تو اللہ تعالےٰ کی قدرت کا اظہار صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے قوانین کو خود ہی توڑے، حالانکہ اس طرح اُس کی قدرت محدود ہو جاتی ہے۔ میرے رسالۂ "تحقیق الفتویٰ" میں

یہ ذکر موجود ہے۔ ان جن کی طبیعت معقول کے بجائے غیر معقول کی طرف راغب ہو، اس کا راستہ مجھ سے جدا ہے۔ (ذرا ٹھہر کر) تو میں آج اسلئے تمھارے پاس آیا تھا کہ تم سے ایک مبسوط اور مدلل مثنوی لکھنے کو کہوں جس سے نظیر خاتم النبیین کا امتناع ثابت ہو۔ کاش مجھے بھی بیان پر وہی قدرت حاصل ہوتی جو تمھیں ہے تو میں یہ خدمت انجام دیتا۔

غالب — مولانا! یہ معاملہ نازک ہے اور شعر و حجت کو جمع کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل ناگزیر ہے۔ میں اس باب میں ضرور فکر کروں گا۔ اب کہو تو مصطفیٰ خاں کے ہاں چلیں۔ وہاں آج صدر الصدور صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ شاید مومن خاں بھی ہوں

مولانا — تو آؤ چلیں، میری پالکی باہر موجود ہے۔

غالب — بس میں ذرا کان میں دوا ڈال لوں۔

مولانا — کیوں خیریت تو ہے؟

غالب — کچھ دنوں سے اونچا سننے لگا ہوں۔ اس سے گھبراتا ہوں ——— حکیم صاحب نے مسہل پلا کر تنقیہ کیا۔ اس کے بعد ہفتہ بھر عرق اتار ترش اور روغن گل مساوی ملا کر چند قطرے نیم گرم — کان میں ٹپکاتا رہا۔ کل سے آب برگِ شفتالو نیم گرم ٹپکا رہا ہوں۔ ابھی تک کچھ افاقہ نہیں ہوا

مولانا — یہ تشویش کی بات ہے۔ تمھاری تمام دُنیا تو بس یہی چشم و گوش کی دُنیا ہے۔

غالب — کئی برس ہوئے، میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یوں ہے:۔

لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ وہ جنتِ نگاہ یہ فردوسِ گوش ہے

اب اِس فردوسِ گوش سے نکلنے کا تصور مجھے اُسی طرح مضطرب کر دیتا ہے جس طرح آدمِ اول کو فردوسِ بریں سے نکلنے کا خیال۔۔۔۔ لیجئے دوا تو کان میں پڑ گئی آیئے اب چلیں۔

اِس طرح یہ دونوں ہم عمر، ہم مذاق، ہم علم دوست باتیں کرتے ہوئے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان تک پہونچے نواب صاحب کے دیوان خانہ میں مجلس احباب جمی ہوئی تھی۔ گانا ہو رہا تھا اور ایک غزل ابھی ختم ہوئی تھی۔ مرزا غالب اور مولانا فضل حق کو سازوں کی موسیقی کے ساتھ صرف آخری لفظ "ایسی" کی گونج سنائی دیتی ہے۔

شیفتہ — (دونوں دوستوں کو آتے دیکھ کر) آیئے مرزا صاحب، آیئے مولانا، تشریف لایئے۔ میری آنکھیں تو دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور مولانا صدر الدین خاں آزردہ بھی کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ مفتی صاحب! یہ لیجئے آخر آ ہی پہونچے مرزا نوشہ۔

آزردہ — اور مرزا نوشہ کے مرنا شہ بالا بھی تو ساتھ ہیں۔ بہت خوب، خوش آمدید!

شیفتہ — افسوس صرف اتنا ہے کہ آپ مفتی صاحب کی ایک مرصع غزل سے محروم رہے۔ مفتی صاحب کم گو ہیں اور نغز گو۔ کاش آپ آجاتے اور سنتے۔

غالب — تو آپ میری موجودگی کو عدم موجودگی سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں۔ مجھے وقت کی ندائی متصور نہ فرمایئے کہ ابھی ہوں اور ابھی نہیں ہوں۔ (ہنس کر) ؎
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

مولانا — مفتی صاحب یہ بڑا ظلم ہوگا اگر ہم محروم رہ گئے۔

آزردہ — صاحب غزل مختصر ہے اور اس میں بھی کام کے شعر بس دو ہیں۔ آپ کو اصرار ہے تو میں خود ہی سنائے دیتا ہوں۔

مولانا — ارشاد۔

آزردہ — ؎ کیا خاک جئے جس کی شب ایسی، سحر ایسی کھڑا وہ بلا، زلفِ سیہ، خام وہ کافر

("واہ واہ، مرحبا، کیا شعر ہے" کا شور۔ آزردہ دوسرا شعر پڑھنے سے پہلے یہ مصرعہ دہراتے ہیں۔ ؎ کیا خاک جئے جس کی شب ایسی سحر ایسی۔ اور پھر یہ شعر پڑھتے ہیں) ؎ یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی (پھر داد کا شور)

مولانا — کیا اچھوتا انداز ہے! اور پھر یہ زمین! مفتی صاحب یہ زمین کہاں سے پائی؟

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دُکھ کہ کسی کو نہ ملا — کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

اس طرح مرزا غالبؔ کی زندگی کے پندرہ سال اور گزر گئے اس عرصہ میں مرزا فضا صاحب مانے ہوئے بزرگانِ ادب میں شمار ہونے لگے۔ ایک خاندانی صدمہ اس عرصہ میں اُنھیں پہونچا۔ زین العابدین خاں عارفؔ جوان ہوئے، شاعر بنے اور مر گئے۔ ان کا چھوٹا بچہ حسین علی خاں اب مرزا صاحب گھر میں رہتا تھا، اور مرزا صاحب اُسے اپنے بیٹے کے مانند عزیز رکھتے تھے۔ شعر و سخن، نغمہ و سرود، محبت دوستی کی یہ فضا آخر کار ۱۸۵۷ء میں ایکدم برہم ہوئی۔ پہلے مئی میں انگریز قتل ہوئے۔ لیکن پھر ستمبر میں انگریزوں کی فتح مند فوج دلّی میں داخل ہوئی اور دلّی کے مسلمانوں نے وہ مصیبتیں دیکھیں جن سے چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ ہو گئی۔

ستمبر ۱۸۵۷ء میں مرزا غالبؔ اپنے مکان میں بیٹھے ہیں۔ حسین علی خاں بھی موجود ہیں۔

غالب ــــ بیٹا! بیٹا حسین علی خاں! حکیم صاحب نہیں آئے؟ ــــ بہرا پن تو جان کا روگ بن گیا!

حسین علی خاں ـ (آواز بلند کرکے) دادا حضرت! شہر میں بلوہ ہو رہا ہے۔

غالب ــــ بلوہ؟ .... ابھی تک۔

حسین علی خاں ـ (چیخ کر) آپ سُن نہیں رہے ہیں۔ ہماری گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں؟

غالب ــــ ہاں کچھ شور سا سنائی تو دیتا ہے ..... ہائے دلّی، کیا تو اس طرح سسک سسک کر مرے گی؟ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جا (پھر ذرا دھیمی آواز میں) اودھ کی سلطنت مجھ پر مہربان ہوئی۔ میری قضا نے اُسے دو برس میں ختم کر دیا۔ دلّی کی سلطنت کچھ زیادہ سخت جان تھی۔ سات برس تک مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ....

حسین علی خاں ـ (پھر چلا کر) سنئے۔ بادشاہ سلامت کو گوروں نے پکڑ لیا!

غالب ــــ (اسی لہجے میں) اچھا یہ شمع بھی بجھ گئی!

حسین علی خاں ـ (چیخ کر) اور سنئے۔ میر نیکش اور مولانا صہبائی قتل ہو گئے۔

غالب ــــ (سرد آہ بھر کر) اللہ! ــــ اللہ! (ہجوم کا شور، گولی چلنے کی آواز)

حسین علی خاں ـ کلو کہتا ہے مولانا فضلِ حق کو گورے پکڑ کر لے گئے!

غالب ــــ (بے تابانہ) ہائے!

حسین علی خاں ـ اور نواب مصطفٰے خاں اور مفتی صاحب کو بھی!

غالب ــــ اچھا ہے، اچھا ہے! میں بھی اب کفن پہن کر زندگی کے دن گزار دوں گا۔ جاؤ کلو سے کہو، میرے کپڑے لائے، میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں وہ حوالات میں میرے منتظر ہیں۔ (ہجوم کی چیخ پکار)

حسین علی خاں ـ (کانپتی ہوئی آواز میں) سرس کی گلی سے آدمی آیا ہے ..... دادا یوسف بیگ خاں کو گوروں نے مار ڈالا۔

غالب ــــ مر گیا! یوسف مر گیا! اُف ــــ اُف! میرا بھائی ..... (قہقہہ لگا کر) دیوانے کو گولی مار دی! اُف ..... (کانپتی ہوئی آواز میں، بیٹا لوگ یوسف کو مجنوں کہتے تھے۔ آج میں مجنونوں سے بدتر ہوں ــــ حسین علی خاں ــــ دادا حضرت خدا کے .... (حسین علی خاں کی آواز گولیوں کی باڑھ میں گم ہو جاتی ہے)

حسین علی خاں ـ دادا حضرت! حکیم صاحب تشریف لا رہے ہیں! ــــ **غالب** ــــ اب کیا فایدہ! ــ میرے سننے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے۔

(الحمراء) (پروفیسر) حمید احمد خاں

عہدِ حاضر میں حجری دور کا انسان

آسٹریلیا کی شمالی اطراف کی آبادی اب بھی "حجری دور" سے گزر رہی ہے۔ یہ آج بھی پتھر گھس کر اپنے اوزار بناتے ہیں اور دو لکڑیاں آپس میں رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں۔ مکانوں کی تعمیر میں یہ پرندوں سے زیادہ نہیں ہیں اور بارش سے بچنے کے لئے درختوں کی چھال، گھاس، اور جنگلی لکڑیوں سے کسی نہ کسی طرح اپنے گھونسلے طیار کر لیتے ہیں۔ یہ آج بھی قدیم طرز کے شکار اور جنگلی پھل پھول پر اوقات بسر کرتے ہیں۔ اس ملک میں کوئلہ، تانبا، چاندی، ٹین، لوہا، سب کچھ ہے لیکن ان کے لئے بالکل بیکار ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یوں تو یہ لوگ سونے کو روند کر چلتے ہیں لیکن ان کی غربت کی کوئی حد و انتہا نہیں —— انھوں نے زمین کو بھی جوتنے بونے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ ان میں کبھی خوردنی اشیا پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جو کچھ بھی اچانک ہاتھ لگ گیا یا قسمت سے سامنے آگیا اسی پر زندگی بسر کرتے رہے اور آج بھی وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ المختصر انسان کی شکل و صورت اور جسم و حرکت رکھتے ہوئے بھی یہ لوگ آج تک جانوروں ہی کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں

اس ملک کے باشندوں یا ان کی فطرت سمجھنے کے لئے ان جانوروں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جن کے ساتھ یہ ہزاروں صدی سے رہتے چلے آئے ہیں۔ جو جانور آج کے مہذب ملکوں میں ہزاروں صدی قبل پائے جاتے تھے وہ آسٹریلیا میں آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے عجائب گھروں میں ازمنۂ قدیمہ کے جن جانوروں کے صرف ڈھانچے ملتے ہیں وہ آسٹریلیا میں آج بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں

اس ملک کے جانوروں میں سب سے پہلے کنگارو سامنے آتا ہے اس کے اگلے پاؤں بہت چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن پچھلے پاؤں نہایت مضبوط ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ جانور خطرناک نہیں لیکن چھیڑنے یا پیچھا کرنے پر اپنی حفاظت کے لئے اڑ جاتا ہے اور انسان کی جان تک لے لیتا ہے

زہریلے سانپ اور رکمڑوں کے علاوہ اس ملک میں ایک قسم کی زہریلی چیونٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ سفید رنگ کی ہوتی ہیں اور زمین کے نیچے رہتی ہیں۔ ان کا دل کا دل باہر نکلتا ہے اور جو بھی لکڑی سامنے پڑ جاتی ہے اسے چبا ڈالتا ہے۔ ایک اور قسم کی چیونٹیاں ہوتی ہیں جو حملہ بھی کرتی ہیں۔ لیکن آسٹریلیا کے قدیم باشندے سب سے زیادہ اپنے یہاں کوّوں کو مارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کوئی بھیڑ بچہ دیتی ہے یا گرمی سے پریشان ہو کر تھک جاتی ہے تو کوّے اس کا گوشت نوچنے کے لئے اس پر حملہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھیڑ کی آنکھ تک نوچ کر لے جاتے ہیں اور اس جانور کو گھل گھل کر مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص جنگل میں راستہ بھول کر پیاس سے بیتاب ہو کر گر پڑتا ہے تو کوّے اس کی آنکھ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ اسی لئے یہاں کے باشندے کوّوں کو مارنے کے لئے دن دن بھر اس کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں

یہاں کے جنگلوں میں کچھ ایسے بھی پرندے رہتے ہیں جو انسان کے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں ان میں ایک "کوکابورا" ہے اس کی بولی ٹھیک انسان کی ہنسی جیسی ہوتی ہے۔ یہ سانپوں کے مارنے میں بڑا تیز ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندے اسے "مقدس" تصور کرتے ہیں۔ آسٹریلیا کے پرانے بسنے والوں کے خیالات اور معاشرتی زندگی پر انھیں جانوروں کا زیادہ اثر پڑا ہے

جب سے موجودہ دنیا کو آسٹریلیا کی دولت کا پتہ لگا ہے بہت سے یوروپین وہاں بس گئے ہیں اور ان کا اثر پرانے باشندوں پر پڑا ہے۔ لیکن بہت کم

"کارپینٹیریا" کی خلیج کے جنوبی مغربی حصے میں قریب قریب ایک لاکھ سے زاید اب بھی قدیم باشندے پائے جاتے ہیں جو بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جہاں یہ قومیں سکونت پذیر ہیں وہاں سال کے زیادہ حصے میں پانی اور اشیائے خوردنی کی بڑی قلت رہتی ہے اور اسی وجہ سے آبادی

بڑھنے نہیں پاتی ۔ بیس سے لیکر سو آدمیوں تک کی آبادی ایک جگہ پر رہتی ہے لیکن خاص خاص موقعوں پر اس آبادی میں وقتی اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے ۔

ان کی رسمیں بھی عجیب وغریب ہیں اور ان رسوم کو ادا کرتے وقت یہ لوگ اپنے ملک کے جانوروں اور پرندوں کی سی بولی بولتے ہیں ۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ان کے آباواجداد کا جسم پورے انسان کا جسم نہیں تھا ۔ اور ان کو پورا بنانے کا فخر جانوروں کے اندر رہنے والے فرشتوں کو حاصل ہے ۔ کافی مقدار میں غذا میسر نہ آنے کے باعث ان "حجری دور" میں رہنے والوں کے ہاں بعض عجیب رسمیں برتی جاتی ہیں ۔ مثلاً قوم کا نمایندہ بننے کے لئے آزمایش کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ آزمایش نہایت خطرناک ہوتی ہے ۔ بچے جب بڑوں کو مدد پہونچانے کے لایق ہوجاتے ہیں تو ان پر کھانے پینے کی چیزوں کی پابندیاں عاید کردیجاتی ہیں ۔ انھیں ایک خاص قسم کی لذیذ چربی کھانے سے روک دیا جاتا ہے ۔ جب اس قسم کی چربی دستیاب ہوتی ہے تو سب سے پہلے بوڑھوں کو دیجاتی ہے اور جو شخص اس قانون سے انحراف کرتا ہے اسے سخت سزا ملتی ہے ۔ اور جادو کے اثر سے اندھے، لولے اور لنگڑے ہونے کا خوف بھی دلایا جاتا ہے ۔ اسے یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ ممنوعہ حرکات کا مرتکب ہونے سے داڑھی جو بزرگی کی نشانی ہے، ظاہر نہ ہوگی ۔ اس قسم کے سخت قوانین اور رسوم کا مقصد یہ ہے کہ بوڑھوں کو ذائقہ دار چیزیں ہمیشہ ملتی رہیں ۔ جو شخص کسی خدمت سے علٰحدہ کیا جاتا ہے اسے معزول ہونے سے قبل طرح طرح کی اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے، اُن عقوبتوں میں اس کا زندہ بھونا جانا بھی ہے ۔ کندے کی آگ پر دو پانچ منٹ تک چت لٹایا جاتا ہے آنچ دھیرے دھیرے تیز کردیجاتی ہے ۔ پھر پانچ منٹ تک وہ پیٹ لٹایا جاتا ہے ۔ شخص مذکور کو برابر کروٹ بدلتے رہنا پڑتا ہے تاکہ اس کے جسم کا ہر حصہ جل سکے ۔ اس آزمایش کے ختم ہونے کے بعد وہ شخص رسم ادا کرنے والے بوڑھوں سے پوشیدہ باتیں سیکھنے کا مستحق ہوجاتا ہے ۔ بوڑھے اس موقع پر اپنے آپ کو قوم کے آباواجداد کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسی لئے ان کے جسم پر خاص قسم کی نقاشی بھی ہوتی ہے ۔ اپنے جسم پر سانپ کی تصویر بنانا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اسی کو یہ لوگ آدمی کو پیدا کرنے والی "مقدس ہستی" سمجھتے ہیں

اس کے علاوہ زبان شگافی اور مُوتراشی کا رواج بھی ہے ۔ قوم کے کسی شخص کی وفات پر گرم پتھر سے سینے کو داغنے کی رسم بھی پائی جاتی ہے ۔ مرد اپنے بالوں کے بدلے عورتوں کے بال کاٹ کر اپنی بانہوں پر باندھے پھرتے ہیں ۔ دانت تڑوانے کا رواج اب مردوں سے اُٹھ گیا ہے لیکن عورتوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے ۔ چھڑی سے مار مار کر پہلے ان کے دانت ہلا دئے جاتے ہیں اور پھر پتھر کی مدد سے اُکھاڑے جاتے ہیں ۔ اس عمل کے بعد عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ بہت خوبصورت ہوگئی ہیں

طرح طرح کی عقوبتیں برداشت کرنے کے باعث یہاں کی عورتوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے پچیس سال کے اندر ہی ان میں پیری کے تمام آثار نمایاں ہوجاتے ہیں ۔ یہاں سے زیادہ اذیت برداشت کرنے والی عورتیں دنیا کے اور کسی ملک میں شاید ہی ملیں ۔ کھانے کی تمام اچھی چیزوں سے عورتوں کو اجتناب کرنا پڑتا ہے، رسوم ادا کرتے وقت بھی کھانے پینے کی عمدہ چیزیں ان سے الگ کردی جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ مردوں کے ہاتھوں اور بھی طرح طرح کے ظلم ہوتے رہتے ہیں ۔ کسی قبیلہ کے چار آدمی اگر تھوڑے عرصہ میں مرجاتے ہیں تو سب عورتوں کو ایک سال تک گونگا رہنا پڑتا ہے ۔ وہ ایک لفظ نہیں بول سکتیں ۔ سال کے آخر میں وہ مرد کا ہاتھ دانت سے کاٹتی ہیں اور اسے کھانا دیتی ہیں ۔ اس کے بعد انھیں اس قید سے نجات ملتی ہے ۔ اگر کوئی عورت تکلیف برداشت کرنے کے ڈر سے بھاگنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس وقت وہ ایک خاص طرح کی آواز سنتی ہے جسے اس کی قوم کے تمام افراد "توانیکا دیو" کی آواز مانتے ہیں ۔ اس آواز کا مفہوم وہ یہ سمجھتی ہے کہ دیو مذکور اس کو نہ بھاگنے کی تلقین کررہا ہے ۔ بڑی ہوجانے پر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوجاتی ہے کہ وہ آواز ایک کھوکھلی لکڑی سے نکلتی ہے تاہم سماج کے قانون کے مطابق وہ اس راز کو کسی پر افشا نہیں کرسکتی ۔

کھانے کی چیزیں کثیر مقدار میں نہ ملنے کے باعث جب انھیں کوئی بیماری ہوجاتی ہے تو وہ اسے سحر کا نتیجہ جانتی ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ یہ جادو دشمن نے زہریلی ہڈی کی شکل میں ان پر کیا ہے ۔ علاج کے لئے مریض لیٹ جاتا ہے اور جادو جھاڑنے والے کچھ دیر اسے غور سے دیکھتے ہیں اس کے بعد مریض کے جسم پر لیٹ کر اس کی مالش کرتے ہیں اور دانت سے کاٹ کاٹ کر زہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

فطری موت پر بھی ان کو یقین نہیں ہے ۔ اس لئے اس سلسلہ میں وہ عجیب وغریب رسمیں ادا کرتے ہیں ۔ جس وقت کوئی شخص نزع کی حالت میں ہوتا ہے اسی وقت سے ماتم شروع ہوجاتا ہے ۔ لوگ روتے چلاتے اور بے ہوش ہونے لگتے ہیں ۔ عورتیں اپنی ران کو زخمی کردیتی ہیں اور کبھی کبھی یہ

زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں۔ ایک شخص کے مرتے ہی عورت مرد سب چھڑی لاٹھی ہاتھ میں لیکر ایک دوسرے کو مارتے ہوئے جلوس بنا کر نکلتے ہیں۔ اس موقع پر ایک دوسرے کے حملے سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لئے لوگوں کا جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔ تین روز کے بعد لوگ کسی کھوہ کے پاس جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کسی جانور یا پرندے کا نقش قدم ہے یا نہیں۔ اگر کوئی نشان انھیں مل جاتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اُس دشمن کا پتہ لگا لیتے ہیں جس کے سحر سے اس کا انتقال ہوا ہے اور اس سے وہ انتقام لیتے ہیں۔ اگر درخت کی کھوہ میں انھیں کوئی نشان نہیں ملتا تو وہ لاش کو ایک سال تک وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ سال کے ختم ہونے پر لاش کی ہڈیاں نکالی جاتی ہیں۔ اس موقع پر سب سے کم عمر نوجوان پتھر کے کلہاڑے سے اس کے ڈھانچہ کو توڑتا ہے اور ہاتھ کی ایک ہڈی کو چھوڑ کر باقی تمام ہڈیوں کو درخت کی چھال میں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

آسٹریلیا میں کچھ قومیں ایسی بھی ہیں جو مُردوں کا گوشت کھانا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ سمجھتی ہیں کہ مرنے والا پھر انہیں کی قوم میں جنم لے گا۔ کچھ قومیں ایسی ہیں جو درخت کے کھوہ سے ہڈی نکال کر اسے سفید چیونٹیوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ صرف ہاتھ کی ہڈی پاس رکھ لی جاتی ہے۔ قوم کا سردار اس ہڈی کو کھال میں لپیٹ کر کسی درخت کے کھوہ میں رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد لوگ شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور شکار کا گوشت پتے میں لپیٹ کر مرحوم کے ہاتھ کی ہڈی کے ساتھ جو الگ لپٹی جاتی ہے۔ مرحوم کے باپ کو دیدی جاتی ہے۔ اس موقع پر تمام عورتیں جمع ہو کر روتی چلاتی ہیں۔ مرنے والے کا باپ سب سے زیادہ معمر عورت کو ہڈی رکھنے کو دیتا ہے۔ باقی عورتیں کھانے کے لئے سانپ پکانے لگتی ہیں۔ اور مرنے والے کا بھائی بوڑھی عورت سے ہڈی لے کر کسی گڑھے میں دفن کر دیتا ہے۔

یہ لوگ ان رسوم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ رسوم ہی ان کی دلبستگی کے بہترین سامان ہیں اگر ان کو اُٹھا دیا جائے تو ان کی زندگی بے لطف ہو جائے

عورتیں کھانے کے لئے سانپ، چھپکلیاں، یا گھانس کے بیج جمع کرتی رہتی ہیں۔ سارا کام یہاں عورتوں کو کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کو فراغت ہی رہتی ہے۔ انھیں جب اور کوئی رسم و رواج ادا نہ کرنا ہوا تو کسی خاص جگہ پر اکٹھے ہو کر پرندوں کے پر سے اپنے آپ کو سجاتے اور رقص کرتے ہیں اس رقص کو وہ "کوروبوری" کہتے ہیں۔ اس جشن میں وہ بچوں اور عورتوں کو شریک نہیں کرتے۔

نظیر صدیقی

ادب الکاتب و الشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

ادنیٰ تغیر کے ساتھ

جس طرح گانے میں آواز اور جسمانی حسن میں اعضا کا تناسب ضروری ہے اسی طرح شعر و ادب میں تناسب الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے گو اس کا تعلق زیادہ تر ذوق و وجدان سے ہے اور اس کا کوئی عام اُصول مقرر نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر ہم الفاظ یا تراکیب کے حسن و قبح کو پہچان سکیں، تاہم اہلِ فن نے کچھ اصول منضبط کر دئے ہیں مثلاً :۔

(۱) کلام کو تنافر سے پاک ہونا چاہئے ۔ اس سے مراد ایسے حروف کا اجتماع ہے جو قریب المخرج ہیں جیسے یہ جملہ حیدر آباد میں مشہور ہے :۔ (کیا بٹ لی تپلی بتی) چونکہ اس جملہ میں ب ، پ ، ٹ اور ت سب قریب المخرج ہیں اس لئے ان کا اجتماع مناسب نہیں

(۲) دو لفظوں کی ترکیب سے اگر کوئی ایسا مکروہ معنی پیدا کرنے والا لفظ بن سکتا ہو یا جس میں ذم کا پہلو نکلے ۔ تو اہلِ لکھنؤ نے اسے قابلِ ترک قرار دیا ہے ۔ مثلاً ایک صاحب کا مصرع ہے :

منھ تمھارا ہے اور میری نظر دونوں ساتھ ـــــ یا ـــــ منھ تو دیکھو آئینہ کا یہ صفائی لا سکے

پہلے مصرعہ میں " موت مارا " اور دوسرے میں " موتو اور دیکھو " کا تلفظ ہوتا ہے یا مثلاً ایک مصرع ہے :۔ " سب ترے ناز ہیں گو زندہ ہی کرنے والے " ـــــ اس مصرع کا لکھنؤ میں یہ نتیجہ ہوا کہ جناب مرزا اوج نے کلیہ بنا لیا کہ گو کے بعد ایسا لفظ ہی نہ آنے پائے جس کی ابتدا ز سے ہو ۔

شیخ ناسخ کے شاگرد سید علی حسن اشک مرحوم منصب داروں میں تھے اور صاحب دیوان تھے ۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں ان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا :۔ " دست و پا دیں گے گواہی مری روزِ محشر " ـــــ لوگوں نے مصرع بار بار پڑھوایا اور آجتک اس کا ذکر چلا جاتا ہے ۔

قدیم زمانہ کا ذکر ہے کہ ملول تازہ وارد لکھنؤ کے مشاعرہ میں شریک ہوئے ۔ مقطع یہ تھا :۔

یہ آرزو ہے کہ شمشیر ناز سے کٹ دن　　　کوئی ملول کی اُس رہ گزار پر مارے

سامعین کو تاب ضبط نہ رہی ہر شخص کہتا تھا دوسرا مصرعہ پھر فرمائیے ۔ دوسرے مصرعہ سے حد درجہ قبیح معنی پیدا ہوتے ہیں ۔

(۳) الفاظ مضحک و رکیک کے علاوہ یوں بھی کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے مقصود کے علاوہ کچھ اور معنی پیدا ہو سکتے ہوں بُرا ہے، کیونکہ اس سے سننے والے کو دھوکہ ہو جاتا ہے ۔ مثلاً میں نے ایک مطلع کہا :۔

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف　　　کہ مجھ کو چھوڑ کے بسمل چلا ہرن کی طرف

ساتھ ہی خیال ہوا کہ اس کو یوں بھی لکھ سکتے اور پڑھ سکتے ہیں :۔ " چلا ہے رن کی طرف " ۔ اس لئے یہ مصرع بدل کر یوں کر دیا :۔ " چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے ہرن کی طرف " ـــــ ایک مرثیہ کا مصرع ہے :۔ " تمام شہر ہے شایق علی کے پیاروں کا "

...میں دھوکا ہوتا ہے کہ شاید شایق علی کسی خاص شخص کا نام ہے - میر مومن مرحوم کی غزل کا مطلع ہے :-

کیا خبر لائی صبا موسم گل لانے کی بوتلیں سرخ ہیں ساقی ترے میخانے کی

...نے میں گل کا لام دوسرے لام سے مل جاتا ہے اور بُرا معلوم ہوتا ہے یا یہ مصرع :- "چمن میں گل، گلوں میں بو ہے جب تک" --- پڑھنے ... گلگلوں ہو جاتا ہے -

شیخ ناسخ نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانہ میں جو وصیت کی تھی اس میں اس امر کی بھی ہدایت کی تھی کہ کسی لفظ کے آخر سے الف، واؤ، ی کا ...تکلف گرا دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا اور برجستگی کلام کے منافی ہے - لیکن شیخ کی اس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا - شیخ کا تنبیہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی ...میں ایسا نہیں دیکھا گیا کہ مسکینی و میری میں سے ی کو گرا دیں یا گفتگو و شست و شو میں سے واؤ اور دریا و گویا میں الف ساقط ہونے دیں -

...الف مقصورہ کو وہ لوگ کبھی الف سمجھتے ہیں کبھی ی اور محمد تقی خاں سپہر نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ الف مقصورہ کو ی کی طرح بھی نظم کر سکتے ... - آزاد مرحوم آب حیات میں خواجہ آتش پر حلوۂ بے دود کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں - یہ اعتراض ان کا غلط ہے - حلوہ میں ہ نہیں ہے ...ف مقصورہ ہے' اور حلوائے بے دود اور حلویٔ بے دود دونوں طرح لکھنا صحیح ہے - ہائے مختفی کو فارسی والے کبھی گراتے ہیں اور کبھی نہیں گراتے ... غالب مرحوم، مژہ کی ہ کا گرانا لازم سمجھتے ہیں مثلاً :- " دل میں چھیری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہ ہو" - مجھے یہ نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے - دوسی کا مصرع ہے :- " مژہ تیرگی بُردہ از پرّ زاغ" - اس میں مژہ کی بندش اچھی معلوم ہوتی ہے -

جلال مرحوم نے ایک دفعہ اپنی کچھ غزلیں مجھے سنائیں یہ کہہ کر کہ اس میں کوئی حرف دبنے نہیں پایا ہے - میں نے ان غزلوں کو سنکر کہا کہ شیخ کا ...مقصود یہ نہیں ہے کہ میں، سے، کو، کے میں بھی ی اور واؤ نہ گرے، فارسی والے کبھی دو اور تو اور چو کا واؤ گراتے ہیں - بلکہ غرض یہ ہے کہ جن حروف ...گرنا جن الفاظ میں گراں معلوم ہو انھیں نہ گرانا چاہیے، کہنے لگے میں نے تو التزام کیا کہ کوئی حرف نہ گرے اور اس میں زیادہ بندش کی صفائی معلوم ...تی ہے، میں نے کہا جب نہیں اور ہیں اور میں کا نون آپ نہ بچا سکے تو التزام کہاں رہا، اس پر وہ ہنسنے لگے -

فارسی والے آخر کلمہ سے الف نہیں گراتے لیکن ابتدائی کلمہ کے الف کو بے تکلف گرا دیتے ہیں، اُردو میں بھی باتفاق اسے جایز سمجھتے ہیں مگر ...بعض جگہ سلاست کلام کے منافی معلوم ہوتا ہے - مثلاً ایک مصرع ہے :-

لکھوں شرح اس کی تو ہو جائے کتاب عبرت --- یا جیسے --- ہوئے ہیں حاکم شرع آج ساقیِ کوثر

پہلے مصرعہ میں " شرح اس کی" - " شراس کی" ہو گیا اور دوسرے مصرعہ میں " شرع آج" " شرآج" پڑھا جاتا ہے -

---

اُردو میں عربی فارسی کے جو الفاظ پائے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں :-

ایک وہ جن میں اہل ہند نے لفظی و معنوی کوئی تغیر نہیں کیا جیسے الم و رقم وغیرہ ایسے الفاظ بے تامل استعمال کئے جا سکتے ہیں -

دوسرے وہ الفاظ جن میں لفظی تغیر ہو گیا ہے جیسے حلَقہ کو حلْقہ اور حرَفت کو حرْفت بول یا دیوانہ کو دوانہ، بیگانہ کو بیانہ، المضاف والمضاف، لیموں کو نیبو کہہ دیا کرتے ہیں یا جیسے موسم و موکب و موقف و موضع و موقع و مولد و مورد وغیرہ اور سیّد و جیّد و میّت و نیّر وغیرہ میں حرف آخر کے ماقبل فتحہ دیا کرتے ہیں حالانکہ صحیح یہ ہے کہ کسرہ پڑھیں یا جیسے حیص بیص کو ایک صاحب اسے ایس بیس سمجھے اور لیس کے ساتھ اسے قافیہ کر دیا - اس قسم کے الفاظ کا صحیح استعمال لازم ہے - اسی طرح خون و جنون و زمین و آسمان وغیرہ بہ اعلان نون ہندی الفاظ ہیں، اس لئے ایسے الفاظ کی ترکیب فارسی میں لا کر اعلان نون کا باقی رکھنا غلطی ہے - کیونکہ اہل فارس کی زبان میں اعلان نون نہیں ہے اس غلطی سے بھی شعرا احتراز کرتے ہیں تاکہ ترکیب میں ہندی و فارسی الفاظ کا خلط ملط نہ ہو جائے، لیکن مع - سوا اور بعض یہ تین لفظ اس قدر زبان پر چڑھے ہوتے ہیں کہ ان الفاظ کو بے تکلف ہندی لفظوں کی طرف مضاف کر دیتے ہیں اور یہ آفت معتبر لوگوں کے کلام میں بھی موجود ہے مثلاً :

" سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے" - مع تین رقوم جواہر - بعض لوگ وغیرہ - یہ عامیانہ محاورہ ہے اور لطف یہ ہے کہ مضاف الیہ میں

کبھی کبھی "تک" کے بعد بھی لگادیتے ہیں مثلاً "سوائے تم لوگوں کے میرا کون ہے" ۔ "مع لڑکے بالوں کے روانہ ہوا" ۔ اسی طرح لفظ بعض اشخاص میں کسرۂ اضافی سے غفلت کرتے ہیں مگر جو لوگ لکھے پڑھے ہیں وہ اس سے احتراز کرتے ہیں ۔

تیسرے وہ الفاظ عربی و فارسی کے ہیں جن میں معنوی تغیر ہوگیا ہے، یعنی اہلِ زبان اس لفظ کو کسی اور معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اہلِ ہند کسی اور معنی میں مثلاً محرم کا لفظ اُردو میں (انگیا) چھوٹے کپڑوں کے معنی میں مستعمل ہے اور عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس سے پردہ نہ کیا جائے یا تردد کا لفظ عربی میں آمد و رفت کے معنی میں ہے اور اُردو میں فکر و تشویش کے معنی میں بولتے ہیں یا جیسے لفظ نم کہ فارسی میں تری کے معنی میں ہے اور اُردو میں تر کے معنی میں بولتے ہیں یا جیسے لفظ خفت اُردو میں شرمندگی کے معنوں پر مستعمل ہے ۔ اس قسم کے الفاظ کا تفحص کرنا چاہئے اور ان کو ہندی سمجھنا چاہئے ۔ انھیں فارسی - عربی کا لفظ سمجھ کر ترکیب اضافی سے بچنا چاہئے یعنی جس طرح کپڑۂ رنگین کہنا صحیح نہیں ۔ اسی طرح محرمِ رنگین اور چشمِ نم کہنا بھی ناجایز ہے کیونکہ کسرۂ اضافی یا توصیفی فارسی الفاظ کے لئے مخصوص ہے اس قسم کی غلطیوں سے بچنا بہت مشکل امر ہے میں نے مرزا بیدل کے کلام میں دیکھا ہے ۔ " فارغ از جوشِ غبار است زمینے کہ نم است " ۔ اور فیضی سا شخص بھی دھوکا کھا گیا، اگر کوئی کہے کہ بیدل و فیضی جو کچھ کہہ جایئں وہ غلط نہیں ہو سکتا، تو اہلِ فن اس کو نہیں مانیں گے ۔ اہلِ زبان کبھی چشمِ نم نہیں کہتے جب کہیں گے نم چشم کہیں گے

ان تینوں قسموں کے علاوہ ایسے لفظ بھی اُردو میں بہت سے بولے جاتے ہیں کہ ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے ان کا اشتقاق کر لیا ہے اور اہلِ زبان اس اشتقاق سے بے خبر ہیں مثلاً تموز تو فارسی لفظ ہے اس سے ہندیوں نے تمازت مصدر عربی بنالیا ۔ اسی طرح علالت، بخالت، ذہانت، لیاقت، شموت، ملت، یگانگت وغیرہ ہندیوں نے قیاس سے مصدر بنائے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال اکثر تو ناجایز ہے لیکن اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے جیسے بادشاہت وغیرہ تو اسے ہندی لفظ سمجھنا چاہئے کسرۂ اضافی یا توصیفی یا کسی اور ترکیب عربی و فارسی کے ساتھ اس کو استعمال کرنا درست نہیں مثلاً جس طرح بپارہ وجاہت بلطف فارسی کہنا جایز نہیں اسی طرح امارت و بادشاہت کہنا بھی نادرست ہے ۔

بعض الفاظ میں یائے مصدری زیادہ کی جاتی ہے حالانکہ وہ سب الفاظ خود معنی مصدری رکھتے ہیں یہ بھی ہندیوں کا تصرف ہے جیسے انتظامی، تغافلی، طغیانی، غلطی، صفائی، ادائی، اجرائی وغیرہ ۔ بعض الفاظ میں علامت جمع زیادہ کر دیتے ہیں حالانکہ وہ سب الفاظ خود جمع ہیں جیسے اغیاروں، کفاروں، ارواحوں، آثاروں، اعمالوں ۔ یا یہ کہ فارسی یا ہندی الفاظ میں علامت جمع عربی کی لگادی جیسے جاگیرات، دیہات، باغات، جہازات، بہتات وغیرہ اسی طرح لوازمات و احکامات کو بھی سمجھ لیجئے ۔ یا اسی طرح اسم صفت بہت سے ہیں جو ہندیوں نے تراشے ہیں ۔ جیسے حرفتی، صنعتی، بیشگی، گھمنڈی، جوشیلا، شوقین، سمجھدار، وضعدار، طرحدار، تابعدار وغیرہ ۔ اس قسم کے الفاظ کا تفحص کرنا اہلِ قلم کو ضرور ہے ورنہ خطا سے نہیں بچ سکتے ۔ ابوالفضل سا علامہ اور لکھے ۔ " از عمر احتیاطی روزگار کم فطرت " ۔ یہاں میں نے یہ تاویل کرلی کہ احتیاطی میں یائے مصدری کاتب نے بڑھادی ہوگی ۔ لیکن " مسرۃ الصدر و مغفرۃ القدر " میں کیا تاویل ہو سکتی ہے یا عند الخواہش و علمک ناقصک و محبت ناقصک، و مخدوم الانامی و اعتضاد الکرامی و مخلصان اعتضادی و مخلصان استظہاری و قبلہ گاہی وغیرہ میں شوخی قلم کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں تعجب ہے کہ قدرتی، فطرتی، عادتی کہنا تو غلط یا ہندی سمجھا جائے اور کم قدرتی و بلند فطرتی و خوش عادتی فارسی صحیح ہوجائے ۔ مثلاً :-

ایں گرم الفتی تو تا برطرف شود　　آہم بروئے آئینہ بہ کلف شود

بعض الفاظ اُردو میں ایسے زبان زد ہیں کہ ان کا کچھ پتہ نہیں لگتا کہ کس زبان کے ہیں اور اصل ان کی کیا ہے ۔ جیسے الغاروں، زرغل، الماغوچی، لقات، مرزئی، مزمہ وغیرہ یہ سب الفاظ عامیانہ سمجھے جاتے ہیں اور اہلِ ادب ان سے بھی احتراز کرتے ہیں ۔

اکثر الفاظ انگریزی کے اُردو میں ملتے چلے جاتے ہیں اہلِ ادب ان کے استعمال سے بھی احتراز کرتے ہیں ۔ بلکہ عربی و فارسی کے سوا جن جن زبانوں کے الفاظ اُردو میں ملکر اصل سے متجاوز ہو گئے ہیں ان کا صحیح کرکے استعمال کرنا ہرگز درست نہیں سمجھتے مثلاً بوتل، نمبر، لالٹین، بسکٹ وغیرہ کو اب ہندی ہی سمجھنا چاہئے ۔ اسی طرح سنسکرت اور بھاکا کے بہت سے الفاظ اُردو میں آکر بدل گئے ہیں ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو خاص طبقہ والوں کی اصطلاح ہیں مثلاً کبوتر بازوں نے گھاگھ کا لفظ یا تخلص تا کبوتر کے لئے وضع کیا ہے، اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص بڑے گھاگھ ہیں یا یہ

پیاس سے نکلنا رہا ہے تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس شخص یا بچہ کو کبوتر قرار دیکر ایسا کہا گیا ہے، اسی طرح ایک مثال یہ ہے: "فلاں عورت کڑکڑا رہی ہے" یا اسے مرغی سمجھ کر ایسا کہا یا "میری ان کی دو دو چونچیں ہوگئیں"۔ مرغبازوں کی زبان ہے اسی طرح شیخی بگھارنا۔ جھاڑو پھیر دینا یا ورچینوں کی اصطلاح ہے۔ کہتے ہیں "اس کو تو کوڑی مل گئی" یہ کسانوں کی اصطلاح ہے یا رتی چڑھ گئی جوہریوں کا محاورہ ہے۔ اسی طرح گاڑھی چھننا اور پیالے چھوٹنا بھنگ پینے والے اور جواری بولتے ہیں یا مثلاً شے دینا اور پیچ پڑجانا اور پیٹا توڑنا کنکوے کے مصطلحات سے ہے، نوج (نعوذ باللہ کی بگڑی ہوئی صورت) وغیرہ عورتوں کی زبان ہے یہ سب محاورات ایسے ہیں کہ اہل زبان بھی جب تک ان کی اصل سے واقف نہ ہوں محل استعمال میں غلطی کرتے ہیں۔

ہر زبان میں بعض الفاظ محل مدح کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور بعض انھیں کے ہم معنی مقام ذم میں مستعمل ہیں مثلاً توانا اور ٹانٹھا اور مشنڈا اور دبنگا یا چھریرا اور لقات، اسی لئے آسمان شکوہ و سپہر مرتبت کہنا صحیح ہے اور چرخ شکوہ یا چرخ مرتبت کہنا غلط۔ اس کے علاوہ اہل قلم کو اس بات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض الفاظ کا استعمال کہیں حسن پیدا کرتا ہے اور کہیں وہ حسن پیدا نہیں ہوتا۔ ادیب وہی ہے جو الفاظ کے محل استعمال کو اچھی طرح جانتا ہو اور ہر ہر مقام میں جو نازک فرق ہے اسے پہچانتا ہو۔ مرزا دبیر کی زبان کہیں محاورۂ لکھنؤ سے الگ تھوڑی ہے بلکہ ہر لفظ اور ہر محاورہ ان کا اردو کے لئے سند ہے لیکن میر انیس کی زبان اور ہی کچھ ہے۔

اردو کے بعض الفاظ لکھنؤ کے اکثر غزل گویوں نے ترک کردئے ہیں، ان لوگوں میں رشک و بحر و اسیر و انس ہیں اور متبعین میں عشق و جلال و امیر و منیر و قدر بلگرامی ہیں۔ متروکات میں کہیں تو تخفیف لفظ کو انھوں نے منشاء ترک قرار دیا ہے مثلاً تک میں بہ نسبت تلک کے تخفیف ہے اور دکھلانا، بتلانا اور بٹھلانا کے مقابلہ میں دکھانے، بتانے، بٹھانے میں اختصار ہے۔ ہووے کے بدلے ہو کہنا بہتر ہے۔ ہیگا میں گا، ادھر کو اور کدھر کو میں کو بیکار ہے۔ کہیں انھوں نے قیاس نحوی کو بھی دخل دیدیا ہے، مثلاً آنکر کہنا غلط سمجھتے ہیں آکر چاہئے بعضوں سے غلط ہے سب سے کہنا چاہئے۔

کہیں خلاف فصاحت ہونے کو سبب قرار دیا شلاً مرا، ترا قابل ترک ہے میرا، تیرا کہنا چاہئے۔ لیجے، دیجے، کیجے کی جگہ لیجئے، دیجئے، کیجئے کہنا اچھا ہے، گر کے بدلے اگر اور سدا کے مقام پر ہمیشہ اور پر، اوپر کی جگہ لیکن، گر کی جگہ یاں، واں کے محل پر یہاں، وہاں، تئیں کی جگہ کو کہنا چاہئے۔ ان سب باتوں پر انیس و دبیر و مونس و انس و وحید و نفیس وغیرہ اور بعض غزل گویوں نے بھی اعتنا نہیں کی، ان کے شاگردوں میں البتہ اس کی پابندی رہی اور بعض شعرائے دہلی مثلاً مرزا داغ وغیرہ کے دھوکے میں آکر ان باتوں کے پابند ہوگئے، ان متروکات میں جہاں جہاں تخفیف لفظ و قیاس نحوی کو انھوں نے منشاء ترک ٹھہرایا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ رہا یہ کہ جن الفاظ میں انھوں نے خلاف فصاحت ہونے کو سبب ترک خیال کیا ہے اس پر عمل کرنا البتہ بہتر ہے۔ ہاں ایسے الفاظ کا استعمال جو زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں کسی قدر غیر فصیح ہونے کے باوجود برا نہیں پر کو اگر جرأت نے ترک کر دیا ہوتا تو یہ شعر کاہیکو سننے میں آتا:

گو دل سے زباں تک ہیں ہزاروں ہی گلے، پر — کچھ منھ سے نکلتا ہی نہیں وقت ملے پر

البتہ نثر میں اس کی پابندی نہ کرنا ستم ہے۔ اسی طرح تئیں کو بالکل چھوڑ دینا بھی مشکل ہے۔ ایک شخص سے کسی نے کہا کہ تئیں کا لفظ نہ بولا کیجئے انھوں نے جواب دیا کہ اگر مجھے یہ کہنا منظور ہو کہ "اپنے تئیں میں بیوقوف سمجھتا ہوں" تو کیا اس کے بدلے میں یہ کہوں کہ "آپ کو میں بیوقوف سمجھتا ہوں"

(نوٹ) اس مضمون کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہے گا۔ اس کی دوسری قسط آیندہ ماہ دسمبر میں شایع ہوگی اور باقی قسطوں کا سلسلہ سالنامہ کی اشاعت کے بعد مارچ ۱۹۵۲ء سے پھر شروع ہوگا

(اڈیٹر)

باب الاستفسار

مذاہب عالم اور خدا کا تصور

(ام - امام، موتیہاری)

مکرمی - سلام مسنون!

مجھے مذاہب عالم کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہے اور اس کے لئے سارے ہندو پاکستان میں اگر کسی پر نظر پڑتی ہے تو وہ آپ ہیں اور مجھے امید ہے کہ علم کے اس سمندر میں جہاں چڑھتی ہوئی موجیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں وہاں اترتی ہوئی لہریں ایک پیاسے کو اس کی پیاس بجھانے کا بھی موقع عنایت کریں گی!

تاریخ کے لحاظ سے مذاہب عالم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جو اپنی دوکان بڑھا چکے ہیں اور دوسرے وہ جو اب بھی کشت و خون کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے میرے خیال میں آریہ، مصری اور یونانی قومیں ثقافتی اعتبار سے آج بھی اپنی انفرادیت کا دعویٰ کر سکتی ہیں مگر کیا مذہبی طور پر بھی ایسا ممکن ہے؟ — میرا مطلب ہے کیا ان میں خدا اور اس کی پرستش کے لحاظ سے بھی یگانگت پائی جاتی ہے؟ — اگر ہاں تو کسی اور نہیں تو کیا بُعد ہے؟

آریہ قوم سے میری مراد ان دڑاوڑوں (Dravidians) سے ہے جن کی تہذیب ایشیا میں اگر ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی سرزمین سے سر اُٹھا رہی ہے تو یوروپ میں میسوپوٹامیہ کے ٹیلوں سے (جیسا کہ خیال ہے) اسی طرح مصری تمدن سے فراعنۂ مصر کا تمدن مراد ہے اور یونانی ثقافت سے وہ ثقافتی دور جب ڈیانا (Diana) کے مندر بنانے کے جذبے نے وہاں والوں میں کروٹ لی تھی!

اب رہے موجودہ دور کے مذاہب تو ان کی رو سے ساری دُنیا کی آبادی مندرجۂ ذیل قوموں پر مشتمل ہے:

۱۔ قدیم باشندے (Aborigines)
   ۱- گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے اسکیمو
   ۲- امریکہ کے سرخ ہندی
   ۳- آسٹریلیا کے قدیم باشندے
   ۴- افریقہ " " "
   ۵- ایشیا " " "
   ۶- یورپ " " "

۲۔ اسرائیلی (یہودی)

۳۔ زرتشت

۴۔ اہل ہنود

۵۔ جین

۶۔ بودھ

۷۔ نصرانی

۸۔ مسلمان

۹۔ سکھ

۱۰۔ بالشوکس

کیا میں کسی اور مذہب کا نام گنوانا تو نہیں بھول گیا؟ — اور اگر بھول گیا ہوں تو کیا آپ میری رہنمائی کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟ — اب ان مذاہب کے متعلق جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ان میں انفرادی طور پر خدا کا تخیل (Conception) کیا ہے، اس کی پرستش (یا خوشنودی) کے کیا طریقے ہیں اور قدامت کے لحاظ سے ان کی تقسیم ہوگی؟

کیا یہ سوالات آپ کے قیمتی وقت کے شایانِ شان ہیں ؟ — یا پیاسے کو شبنم ہی ملے گی ؟ — اگر کچھ کتابیں ایسی ہوں جن سے ان مضامین پر سیر حاصل معلومات بہم پہونچ سکیں تو میں شاید اپنی مدد آپ کر سکوں مگر قیمتی کتابوں کا کفیل مجھ جیسا طالبعلم شاید نہ ہوسکے ! پھر بھی اگر گراں خاطر نہ ہو اور آپ ان کے نام ارسال فرما دیں تو میں کتب خانوں کی خاک بھی چھان لوں !

اب سب کی طرح میں بھی جواب جلد ارسال فرمانے کی گزارش کیسے کروں جب یہی پتہ نہیں کہ آیا یہ خط آپ کے لئے جواب کے قابل بھی ہے !

(نگار) آپ کے سوال کے دو حصے ہیں ایک تو یہ کہ پرانے زمانہ کی قوموں میں خدا کا تصور اور اُس کی پرستش کے طریقے کیا تھے اور دوسرا یہ کہ موجودہ اقوام میں اب اس کے کیا معنی ہیں ۔

پرانے زمانہ میں وادی سندھ (ہڑپا اور موہنجوداڑو وغیرہ) میسوپوٹامیا، مصر اور کریٹ میں قریب قریب یکساں تمدن پایا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ "شیو اور شکتی" کی پوجا کرتے تھے یعنی وہ نیچر کی پیدا اور پرورش کرنے والی قوتوں کا تصور، مرد عورت کی شکل میں کرتے تھے ۔ عورت کو وہ "مہاماتا" مانتے تھے جس کے بُت اس طرح بنائے جاتے کہ وہ اپنے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے ہے ۔ ایسے بُت ہر جگہ ملتے ہیں ۔

یہ دیوی بابل والوں میں اشتر کہلاتی تھی جس کا خاوند تمّوز دیوتا تھا۔ مصر والوں میں یہی جوڑا آئسس (دیوی) اور اوسیرس کہلاتا تھا، اسی طرح مختلف مقامات پر ان دیوی دیوتاؤں کے مختلف نام تھے ۔ جنھیں خوش کرنے کے لئے قربانیاں کی جاتی تھیں اور نذریں چڑھائی جاتی تھیں ۔

اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ خدا ایک قوت ہے جس کے تین کام ہیں ۔ پیدا کرنا، پالنا اور مارنا ۔ ان تین قوتوں کا تصور تین انسانوں کی شکل میں کیا گیا جن کے نام مختلف اقوام میں یہ تھے :-

	میسوپوٹامیا	ہندوستان	یونان	روم
پیدا کرنے والا	انو	برہما	زیئس	جوپیٹر
پالنے والا	ای آ	وشنو	پوزیڈان	نیپچون
مارنے والا	بعل	مہیش (یا شیو)	ہیڈس	پلوٹو

میسوپوٹامیا کے لوگ اپنے تینوں دیوتاؤں کو ایک ہی مرتبہ کا مانتے تھے ، لیکن یونان اور روم میں زیئس اور جیوپیٹر ہی سب کچھ تھے ۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں آفریدگار دیوتا غائب ہوگیا وشنو اور مہیش (شیو) رہ گئے اور ان میں بھی شیو کے ماننے والوں کی اکثریت ہے ۔

پھر ان دیوتاؤں پر ان کی شکتیوں (بیویوں) کا اضافہ کیا گیا اور ان کے بچوں وغیرہ کا ہونا بھی ظاہر کیا گیا ۔ اس طرح ان دیوی دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے مظاہر فطرت جیسے چاند، سورج اور دریا وغیرہ کے دیوتاؤں نے مل کر ہر قوم میں دیوتاؤں کی ایک خاصی فوج طیار کر دی ۔ چنانچہ مصر والوں میں تو اتنے دیوی دیوتا تھے کہ ہمارے لئے اُن میں مذکورہ تری مورتی (برہما ۔ وشنو اور مہیش) کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہوگیا ہے ۔ اور یہی حال ہندوؤں میں ہوا ۔ فی الحال پڑھے لکھے ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک ہی ہو جو مختلف قوتوں سے متصف ہے اور چونکہ انسان کسی مجرد قوت کا تصور نہیں کر سکتا لہٰذا ان قوتوں کے اعتبار سے خدا کو مختلف صورتوں میں دکھایا جاتا ہے جنھیں اردپ ایشور کے مختلف روپ سمجھنا چاہئے ۔

یہودیوں میں جیسا کہ اُن کی مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے خدا کائنات سے الگ تھلگ ایک قوت ہے جس کا تصور انسان کی شکل میں کیا جاتا ہے ۔ اُسے بائبل میں کہیں تو آدم سے باتیں کرتے دکھایا ہے اور کہیں کُلکشت کرتے ۔ وہ ایک ظالم بادشاہ کی طرح ہے جو انسان کو ذرا ذرا سی بات میں جہنم کی دھمکی دیتا ہے ۔ قریب قریب یہی تصور عیسائیوں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے ۔

خدا کا سب سے اعلیٰ تصور ہندوؤں کے اُس فلسفہ میں پایا جاتا ہے جسے "ویدانت" کہتے ہیں ۔ اس مذہب کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ خدا مخلوق سے الگ نہیں ۔ وہ ہر چیز میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز اس میں ہے ۔ اگر وہ ایک سمندر ہے تو ہم اس کے قطرے ہیں ۔ انسان کی آتما جب اچھے کرموں سے

انتہائی پاک ہو جائے گی تو پرم آتما میں مل جائے گی اور جب تک آتما، پرم آتما میں نہ ملے گی اُسے بار بار پیدا ہونا پڑے گا۔ اگر بُرے کرم کرے گی تو حیوانوں میں اگر اچھے تو انسانوں میں اُسے پرم آتما تک پہونچنے میں بہت سے جسمانی اور روحانی مدارج طے کرنا پڑیں گے۔ اور جب وہ پرم آتما میں مل جائیگی تو اُسے "نروان" (نجات) حاصل ہو جائے گا ۔۔ اس کو مسئلہ "آواگون" کہتے ہیں۔ اور یہی عقیدہ بدھ مذہب کے ماننے والوں کا ہے

تناسخ کے ماننے والوں میں خدا کا تصور بہت دلچسپ ہے یعنی ان کے یہاں خدا "پرم آنند" یعنی خوشی محض ہے۔ وہ دُنیا کو پیدا کرکے الگ تھلگ ایک سُرور کی حالت میں پڑا ہوا ہے اُسے دُنیا کے جھمیلوں سے کوئی مطلب نہیں۔ اُس نے کائنات کو بنا کر مشین کی طرح چلا دیا ہے اور خود آرام کر رہا ہے گویا اس تصور کے مطابق خدا پر انسان کی الحاح وزاری کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ حمد وثنا کا۔ بالفاظ دیگر اس مذہب کے ماننے والوں کے نزدیک انسان مختار ہے اور اپنے افعال کا خود ہی ذمہ دار۔

ہندوؤں کا فلسفہ "ویدانت" مسلمانوں کے تصوف کا ماخذ ہے اور اُس کی تعلیمات کسی حد تک چینیوں کے اُس مذہب سے ملتی ہیں جسے "طاؤ ازم" کہتے ہیں جس کی تعلیم یہ ہے کہ "خود انکاری پر عمل کرو اور طاؤ میں وصل اور جذب ہو جاؤ۔ کیونکہ طاؤ ہی دائمی اور غیر فانی راستہ ہے ایسا ہو کر تمام چیزوں اور ہستیوں کو چلنا پڑتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ تمام چیزوں کا سبب اور نتیجہ ہے۔ تمام چیزیں اُس سے پیدا ہوئیں اور اُسی کی مطیع رہتی ہیں اور اُس کی طرف آخرکار مراجعت کرتی ہیں۔ وہ سب چیزوں کا سرچشمہ ہے۔" اس کے بعد اہل فارس کو دیکھئے ایران کی مسلم آبادی کو چھوڑ کر وہاں ایک طبقہ "آتش پرست" لوگوں کا ہے۔ یہی لوگ ہندوستان میں پارسی کہلاتے ہیں۔ ان کا پیغمبر زردشت یا زوراسٹر ہے جس کا زمانہ ۶۰۰ سال قبل مسیح خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دو خدا کے قایل ہیں اور ساری کائنات کو دو قوتوں کے تابع سمجھتے ہیں۔ خیر اور شر یا نور و تاریکی نیک اور نورانی قوت کا نام "یزداں" اور "اہورا ماز دا" ہے اور بد اور تاریک قوت کا نام "اہرمن"۔ ان میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ آخر میں نیکی بدی پر غالب آئے گی ۔۔ آخر میں ہم نیم مہذب اقوام کا ذکر کریں گے جن میں ایشیا اور یورپ کی کچھ قومیں۔ وسطی اور جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا۔ نیوزلینڈ۔ ملانیشیا۔ مکرونیشیا۔ پالی نیشیا اور شمالی اور جنوبی امریکہ کے پُرانے باشندے شامل ہیں۔ انکے علاوہ اسکیمو قوم کے لوگ جو بحر آرکٹک کے نیچے کے حصہ میں آباد ہیں ۔۔ ان اقوام میں بہت کم ایسی ہیں جن میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ عموماً وہ دنیا کو نیک اور بد روحوں کا تابع سمجھتی ہیں۔ انسان کے ہر درد اور دکھ کا باعث یہی بد روحیں ہیں جنھیں جادو منتر کے ذریعہ زیر کیا جاتا ہے اور نیک روحوں کی تعریف کرکے بد روحوں کو مغلوب کرنے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ اس مذہب کا اصطلاحی نام "شاماں پرستی" ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مذہب ہے جسے "ٹوٹم ازم" کہتے ہیں۔ یعنی لوگ اپنے آبا و اجداد کا رشتہ شجر، حجر اور حیوانوں سے جوڑتے ہیں جس قبیلہ کا جو "ٹوٹم" ہوتا ہے اُس کی وہ حفاظت کرتا ہے اور اگر مارنے ہی کی ضرورت پڑ جائے تو پہلے اپنی مجبوریوں کا اظہار نہایت ہی موثر الفاظ میں کیا جاتا ہے ۔۔ یہ آپ کے سوال کا مختصر جواب ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے آپ کو "تاریخ مذاہب" "تاریخ امم قدیمہ" "علم الاقوام" وغیرہ کی کتابیں دیکھنا چاہیئں۔

چند کتابوں کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) (ا)
(اا) اردو ترجمہ "نیا و پرانا عہدنامہ" مطبوعہ گریٹ برٹین ۳۵ء
(۲) "من و یزداں" مصنفہ نیاز فتحپوری
(۳) "مذہب" " "
(۴) Chaldia by Zenaide Ragozine
(۵) Assyria " " "
(۶) Assyria by A. H. Sayce
Missionary Travels - Dr. Livingstone
(۷) The ancient Maya by Sylvanus Griswold Morley
(۸) Short History of the World by H. G. Wells
(۹) The great monarchies of the ancient Eastern world by
(۱۰) George Rawlinson

کائنات کی عظمت

پروفیسر اینشٹین مشہور ماہر ریاضی داں نے کائنات کی وسعت کا اندازہ یہ کیا ہے کہ اس کا قطر ۴۸ ارب نوری سال کی مسافت رکھتا ہے۔
الفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ روشنی جس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے، ۴۸ ارب سال میں اس قطر کو طے کر سکتی ہے۔
یہ ہے صرف قطر کی وسعت کا اندازہ، لیکن اگر کائنات کے محیط یا پورے دایرہ کو طے کرنا ہو تو روشنی ۵۰ لاکھ ملین (یعنی ۵۰ سنکھ) سال میں ے طے کر سکے گی۔

آفتاب کا درجۂ حرارت ۵ کروڑ ہے اور اندازہ کیا گیا ہے کہ آفتاب کی قوتِ حرارت و نور ۲۵ کروڑ ٹن فی منٹ کے حساب سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

چاند کا قطر صرف ۲۱۶۳ میل ہے۔ وہ اپنا دورہ زمین کے گرد ۲۷ دن، ۷ گھنٹے ۴۳ منٹ اور ۱۱ء۵ سکنڈ میں ختم کرتا ہے یعنی بحساب ۴۳ میل فی سکنڈ۔

زمین کا قطر ایک قطب سے دوسرے قطب تک ۷۹۲۶ء۲۸ میل ہے اور آفتاب کے گرد اس کا دائرۂ طواف ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کا ہے جسے وہ ۱۸½ میل فی سکنڈ کی رفتار سے ۳۶۵ دن، ۶ گھنٹے، ۹ منٹ اور ۹ سکنڈ میں طے کرتی ہے۔

کہکشاں کے قطر کا اندازہ اینشٹین نے ۲ لاکھ ۵۰ ہزار نوری سال کیا ہے۔ اڈنگٹن کے بیان کے مطابق کہکشاں مجموعہ ہے ۳ کھرب تاروں کا جس میں بے شمار نظام شمسی پائے جاتے ہیں اور جن کے آفتاب ہمارے آفتاب سے کہیں زیادہ بڑے ہیں لیکن باوجود اس عظمت کے کہکشاں خود مع اپنے نظامہائے شمسی اور سیاروں کے اپنے محور پر گردش کرتی رہتی ہے اور اس کی ایک گردش ۳ کروڑ سال میں پوری ہوتی ہے۔
لیکن کہکشاں بھی صرف ایک ہی نہیں ہے۔ ۱۰۰ انچ والی دوربین سے دیکھنے کے بعد پتہ چلا ہے کہ ۲۰ لاکھ کہکشائیں اور ہیں جن کا فاصلہ ہم سے ۲۰ لاکھ نوری سال ہے۔

ہمارے کرۂ زمین کی عمر ۲ ارب سال ہے اور اس میں آثار حیات پیدا ہونے کا زمانہ اب سے ۳۰ کروڑ سال پہلے ہوا تھا لیکن آدمی کی پیدایش اب سے صرف ۳ لاکھ سال پہلے ہوئی ہے۔

قفس و نشیمن

اب آ گئے کھیل مقدر کا - آب و دانہ کا
قفس میں خواب تو دیکھا ہے آشیانے کا

یہ انقلاب پسندی بھی جزوِ فطرت تھی
قفس کا ہو کے رہا میں نہ آشیانے کا

قفس میں لا کے اسے صیّاد رکھ دے سارے گلشن کو
جوابِ آشیاں تو ہو سکے گا پھر بھی مشکل سے

آسماں کو میرے خالی آشیاں سے کیا غرض
جس جگہ میں ہوں وہاں بجلی گرانا چاہئے

تھی یہی فصل کہ جب اپنا نشیمن اُجڑا
بڑھ گئی وحشتِ دل اور بہار آنے سے

آشیاں کا ایک اِک تنکا ابھی تو یاد ہے
بھولتا جاؤں گا جو جو دِن گزرتے جائیں گے

قفس صیّاد رکھ تو دے ہوائے صحنِ گلشن میں
اجل آئے کہ نیند آئے اسیروں کے مقدر سے

بلا سے قید کر صیاد یہ عقدہ تو حل ہو گا
چمن میں آشیاں سے ہم تھے یا تھا آشیاں ہم سے

چمن کی زمزمہ سنجی چمن کے ساتھ تھی نیرؔ
قفس ہے اب قفس میں بیٹھ کر آہ و فغاں کریں

اور تو کیا کہیں ہم پر جو قفس میں گزری
آ گیا موسمِ گل یہ بھی سُنا کانوں سے

آشیانے کی کشش کیا روکتی،
آنے والا زیرِ دام آ ہی گیا،

چمن والوں کو یاد آیا تھا میں بھی موسمِ گل میں؟
بتا اے نو گرفتارِ قفس کچھ ذکر تھا میرا؟

کیوں سناتا ہے نشیمن کی کہانی، صیاد!
قید میں ٹوٹ چکے ہیں پرِ پرواز - نہ چھیڑ،

خبر بہار کی آئے گی اور پھر آئے گی
قفس نصیب کہیں ایک سال ہو جائے

پڑے ہیں جو منتشر وہ تنکے اُٹھا اُٹھا کر سجا رہا ہوں
خبر کرے کوئی بجلیوں کو کہ پھر نشیمن بنا رہا ہوں

قیدِ قفس میں ذکرِ نشیمن کروں گا میں
کھلتی نہیں زبان کہ تازہ ہے غم ابھی

چمن تو چھوٹا قفس میں آئے اسی کو اللہ راس لائے
وہاں نشیمن بنا چکے ہم، یہاں نشیمن بنا رہے ہیں

ابھی کے دِن ہوئے اُجڑے ہوئے میرے نشیمن کو
ابھی پہچانتا ہے مجھ کو ہر پتّہ گلستاں کا

نیر اکبر آبادی

نیساںؔ اکبرآبادی :-

موجیں یہ تبسم کی تیرے ہونٹوں پہ جو کھیلا کرتی ہیں
اس دل کے فسردہ عالم میں اک حشر سا برپا کرتی ہیں

کچھ حسن میں تو بھی یکتا ہے تسلیم کیا میں نے لیکن
کچھ میری نگاہیں بھی تیرے جلووں کو سنوارا کرتی ہیں

طوفاں میں کشتی آئی بھی اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
اب کیا ہے جو ساحل پر لہریں اٹھ اٹھ کے نظارا کرتی ہیں

بیتاب ہے دل جنکی خاطر میں جن کو ترستا رہتا ہوں
مجھ سے بھی چھپا کر میری طرف وہ نظریں دیکھا کرتی ہیں

نیساںؔ یہ کہاں سے دل میں تم اک درد بسا کر لائے ہو
تنہائی میں ٹیسیں اٹھ اٹھ کر یہ کس کو پکارا کرتی ہیں

مشیرؔ جھنجھانوی

محبت میں سحرائے دل برائے نام آتی ہے،
یہ وہ منزل ہے جس منزل میں اکثر شام آتی ہے

نہ جانے کیوں دلِ غم آشنا کو دیکھ لیتا ہوں،
جہاں کانوں میں آوازِ شکستِ جام آتی ہے

محبت نے ہر اک سے بے تعلق کر دیا مجھ کو
تمھاری یاد بھی اب تو برائے نام آتی ہے

نہ جانے کون سی منزل میں اب تم جلوہ فرما ہو
نظر رہ رہ کے اٹھتی ہے مگر ناکام آتی ہے

بدل سکتا ہوں اس کا رخ مگر یہ سوچکر چپ ہوں
تمھارا نام لیکر گردشِ ایام آتی ہے

رُباعیات

(صفیہ شمیم ملیح آبادی)

اے سینۂ گردوں کے شرارو ٹھہرو
ڈھلتی ہوئی رات کے سہارو ٹھہرو
آنکھوں سے ابھی تو بہ رہے ہیں آنسو،
اے ڈوبتے غمناک ستارو ٹھہرو

ہر لحنِ طرب خیزہے ماتم گویا،
ہر پھول ہے اک دیدۂ پرنم گویا
گلشن میں بہار ابکی آئی کیسی
جنت میں بھڑک اٹھا جہنم گویا

تقدیر گہر جاگ اٹھی ہے گویا
تنویر قمر جاگ اٹھی ہے گویا
مکھڑے کی یہ سرخیاں، تبسم کی یہ ضو
جنت میں سحر جاگ اٹھی ہے گویا

نگار کی پُرانی مکمل جلدیں

سنہ ۳۱ء	سنہ ۳۲ء	سنہ ۳۵ء	سنہ ۳۶ء
۱۵ عہ	۱۵ عہ	۱۵ عہ	۱۵ عہ
سنہ ۳۷ء	سنہ ۴۷ء	سنہ ۵۰ء	
۱۵ عہ	۱۰ عہ	۱۰ عہ	منیجر نگار

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور انکے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے۔ جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اسقدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپکے جسم میں اضافہ کر دے گی اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا انہی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اسکے استعمال سے بامراد بنکر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ مجبو تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی تجربہ کرکے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دُنیا بھر میں نہیں ہے

قیمت فی شیشی ۳۲ خوراک چار روپیہ (للعہ)

نوٹ:- فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نقالوں سے ہوشیار رہئے

میری ۴۲ سالہ شہرت پر بھروسہ فرمائیے

پتہ:- حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام

(عالم مثنوی مولانا کے ردم صاحب)

محمود نگر ۳ لکھنؤ یو۔ پی

جن بچوں کو

بڑا ہو کر دُنیا میں اپنی آواز بلند کرنی ہے

اُن کی پرورش نونہال پر ہوں چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا

ان کا دل پسند ٹانک

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

Hamdard

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پاؤنڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مادئین کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشاط بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح د خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ۔ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مؤرخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

Regd. No. A 466

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام ماجد ولین نمبر ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجیڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

جولائی ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے ۵۵ سال کے بعد۔ یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر رنج و الم آپ کیلئے بے معنی ہو جائے گا (۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا (۳) آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائیگا (۴) انحطاط عمر اور ضعیفی کا موجودہ مفہوم قطعی باقی نہ رہے گا۔ (۵) شاہراہ حیات پر چلنے کا وہ طریقہ آپکو معلوم ہو جائیگا جو اسوقت تک آپکی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ قیمت [illegible]

سالنامہ ۱۹۲۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۹۹۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)
چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

"مومن نمبر" دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا

تصانیفِ نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ" و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔
ضخامت ۷۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے: اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح، خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ آبِ حیات۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ
ضخامت ۴۲۲ صفحات کا غذ سفید مجلد قیمت علاوہ محصول پانچروپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں و مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔
قیمت پانچروپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ منضبط کئے گئے ہیں کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی اور کن کن علماء نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے [illegible]
قیمت [illegible] علاوہ محصول

بالکل آخری اطلاع

نومبر کے نگار میں ایک مطبوعہ کارڈ رکھ دیا گیا تھا تاکہ خریدارانِ نگار اس کی خانہ پُری کر کے واپس کر دیں لیکن سب نے اس طرف ا
نہیں کی - اگر آپ کو اپنے پرچہ میں مطبوعہ کارڈ ملے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ آپ کی اطلاع ہم کو نہیں ملی (پاکستان کے خریداروں کے نام کارڈ علیحدہ روانہ کئے گئے ہیں
اب آپ کو تکلیف فرما کر تین پیسہ کا صرف گوارا کر کے کارڈ کے ذریعہ سے اطلاع دیدینا چاہئے (کارڈ اب بیرنگ نہیں جا سکتا، تلف کر دیا جاتا ہے۔

اگر آپ نے اب بھی کوئی اطلاع نہیں دی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو دو روپیہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں منظور ہے اور آپ کے نا
سالنامہ آٹھ روپے چھ آنے میں ذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے - ورنہ دو روپیہ چھ آنے میں۔

اگر آپ نے اپنی نامنظوری کی اطلاع دیدی تو سالنامہ تو آپ کے پاس نہ بھیجا جائے گا لیکن اس کے بعد ختم میعاد پر حسب معمول و
چھ روپیہ چھ آنے کا وی پی کیا جائے گا۔

اگر آپ سالانہ چندہ یا سالنامہ کی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تو ۵ / مصارف رجسٹری بھی ضرور شامل کر دیجئے۔ ورنہ سالنامہ
گم ہو جانے کا اندیشہ ہے -

پاکستان کے خریداروں کے نام وی پی نہیں جا سکتا اس لئے وہ اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپیہ پانچ آنے یا سالنامہ کی قیمت دو روپیہ
پانچ آنے (۵ / زاید مصارف رجسٹری ہیں) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرما کر ہم کو اطلاع دیں :-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

حسرت نمبر ہوگا

جو صرف آٹھ روپیہ سالانہ چندہ ادا کرنے والوں کو مل سکے گا

یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ آیندہ سالنامہ "حسرت نمبر" ہوگا لیکن فی الحال یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کس نوعیت کا ہوگا ظاہر ہے کہ اس
حسرت کے حالات زندگی، انکی شاعری پر تبصرہ، ان کے کلام کا انتخاب ہونا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کیا ہوگا، اس کی تفصیل نہ پوچھئے -
کوشش کی جا رہی ہے کہ عہدِ حاضر کے تمام اکابر نقد و ادب کے مضامین حاصل کئے جائیں اور ان کے کلام کا ایسا انتخاب پیش کیا
جس سے حسرت کی غزل گوئی کی انفرادیت پوری طرح واضح ہو سکے۔

قیمت فی کاپی غیر خریداران نگار سے دو روپیہ (عہ/) — ایجنٹوں سے ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/) فی کاپی -

منیجر نگار

سالنامہ جنوری ۵۲ء
دوسرے ہفتہ میں شایع ہوجائے گا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۶	فہرست مضامین دسمبر ۵۱ء	جلد ۶۰

پہلے اسے پڑھ لیجئے

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس بات کی کہ آپ کا چندہ دسمبر ۵۱ء میں ختم ہوگیا اور اب آیندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے جس میں سالنامہ بھی شامل ہوگا، جنوری، فروری کا مشترک پرچہ ذریعہ وی، پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ کیا جائے گا، اور آپ کو معہ فیس منی آرڈر چھ روپیہ آٹھ آنے ادا کرنے کے بعد ملے گا۔

اس لئے اگر آپ سالنامہ نہیں چاہتے تو از راہ کرم بواپسی ڈاک مطلع فرمائیے اور ہمیں چھ آنے کے نقصان سے بچائیے۔

اب رجسٹری کے مصارف بھی بڑھ گئے ہیں اور ایک آنہ وی پی ٹیکس بھی زیادہ دینا پڑتا ہے۔

اگر آپ نے سالنامہ لینا پسند نہ کیا تو مارچ ۵۲ء کا پرچہ حسب دستور چھ روپیہ چھ آنے میں وی پی کیا جائے گا۔

اگر آپ آٹھ روپیہ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجیں تو پانچ آنے مصارف رجسٹری بھی ضرور اس میں شامل کر دیں۔ تاکہ سالنامہ آپ کو محفوظاً پہونچ سکے۔ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو تین آنے کی بچت ہوگی۔

پاکستان کے خریدار اپنا سالانہ چندہ (اگر ان کا چندہ دسمبر ۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے) آٹھ روپیہ چھ آنے یا اگر چندہ دسمبر ۵۱ء کے بعد کسی مہینے میں ختم ہو رہا ہے تو صرف سالنامہ کی قیمت دو روپیہ پانچ آنے ذریعہ منی آرڈر کراچی کے پتہ سے روانہ فرمائیں۔ منیجر

ملاحظات

از ماست کہ بر ماست آج نہ صرف ہندوستان بلکہ تقریباً ساری دُنیا اقتصادی دشواریوں میں مبتلا ہے اور اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آتی البتہ جب وہ ماضی کی خوشحالیوں کو یاد کرتا ہے تو اپنے آپ کو تسکین یا فریبِ تسکین دینے کے لئے یہ بھی سمجھتا ہے کہ ممکن ہے آیندہ پھر وہی دورِ فراغت لوٹ آئے اور زندگی کی اس کشمکش سے نجات مل جائے لیکن وہ اس حقیقت سے واقف نہیں اور اس کا ناواقف رہنا ہی بہتر ہے کہ جو زمانہ گزر گیا وہ لوٹ کر واپس آنے والا نہیں اور جو زمانہ آنے والا ہے وہ حال سے زیادہ ہولناک ثابت ہوگا۔

جس وقت آپ صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ دُنیا جہاں کل تھی وہیں آج بھی ہے، حالانکہ وہ روز ایک نئے ہنگامہ سے دوچار ہوتی ہے۔

کل رات کو جس وقت آپ بسترِ خواب پر گئے تھے، اس وقت آپ اس حقیقت سے بالکل بےخبر تھے کہ صبح آپ جس وقت ناشتہ کرنے بیٹھیں گے تو دنیا میں آپکے ساتھ ۵۵۰۰۰ ناشتہ کرنے والوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔ اسی طرح آج کے بعد جب کل صبح ہوگی تو بھی آپ کو اس کا علم نہ ہوگا کہ اس میں ۵۵۰۰۰ کا اضافہ اور ہوگیا ہے اور یہ اضافہ روزانہ اسی طرح ہوتا رہے گا، خواہ انسان مرے یا جئے۔ دُنیا کی آبادی میں روزانہ ۵۵۰۰۰ کے اضافہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر سال ۲ کروڑ ۵۰ ہزار آدمیوں کا اور ہر بیسویں سال ہندوستان یا چین کے برابر پورے ایک ملک کا اضافہ دُنیا میں ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ زمین جس سے غذا حاصل کی جاتی ہے اس میں ایک انچ کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ "سرد اعصابی جنگ" جس نے ساری دنیا کو لرزہ براندام کر رکھا ہے اور یہ ہے وہ تلخ حقیقت جو ہر منٹ انسان کو فقر و فاقہ سے قریب تر کرتی جا رہی ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ انسان دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے بندوق، توپ اور آٹم بم تو طیار کر رہا ہے لیکن گھر کے اس سب سے بڑے دشمن سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی کو بھی نہیں سوجھتی۔

یورپ میں سب سے بڑا، طاقتور، ذی شعور اور ہوشمند ملک انگریزوں کا ہے، لیکن وہ بھی آج تک اتنی غذا پیدا نہیں کر سکا جو اس کی ضروریات کیلئے کافی ہو۔ لیکن خیر جنگ سے قبل تو صورت کچھ اور تھی اور وہاں کا انسان آج بھی اس زمانہ کو یاد کر رہا ہے جب کناڈا کے گیہوں، نیوزیلینڈ کے مکھن، ڈنمارک کے گوشت، ہالینڈ کے انڈا، برازیل کے قہوہ، مشرقِ بعید کی شکر، ورجینیا کے تماکو اور سویڈن کی دیاسلائی سے وہ اپنی تمام ضروریات آسانی سے پوری کر سکتا تھا اور گو سوائے اُس الوداعی بوسہ کے جو گھر سے رخصت ہوتے وقت اسے بیوی سے مل جاتا تھا، کوئی ایک چیز بھی گھر کی نہ تھی، تاہم وہ خوش تھا کہ یہ چیزیں مہیا تو ہو جاتی تھیں، وہ ان کو آسانی سے خرید تو سکتا تھا، لیکن اب کہ ہر ملک اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہے اسے یہ آسانیاں بھی حاصل نہیں اور پریشان ہے کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔

ایشیا میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ غریب و محتاج ملک ہندوستان ہے اور اس کے پڑوسیوں میں سے کوئی ملک ایسا نہیں جو اسکی ضروریات کو پورا کر سکے۔ برما میں چاول کی پیداوار زیادہ ہے اور اس نے اس کی فراہمی کا وعدہ بھی کیا ہے، لیکن اول تو صرف چاول ہماری غذائی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اور دوسرے یہ کہ برما کے لئے بھی اب ایفاء عہد مشکل ہو گیا ہے۔ پاکستان میں غلہ کی پیداوار یقیناً اس کی ضروریات سے زیادہ ہے، لیکن اول تو وہ اتنی نہیں کہ اپنے ذخایر محفوظ رکھتے ہوئے بھی ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور اگر اس کا امکان ہو تو شرح تبادلہ کی ناہمواری کی وجہ سے وہاں کا غلہ ہندوستان بہت گراں پڑتا ہے، چین کی پیداوار بھی اچھی ہے، لیکن کوریا کی جنگ کی وجہ سے وہ بھی فی الحال ہندوستان کی کوئی قابلِ ذکر مدد نہیں کر سکتا روس بھی ہندوستان کو غلہ بھیج سکتا ہے لیکن نہ صرف ذرایع نقل و حمل کی دشواری بلکہ سیاسی اسباب کی بنا پر بھی ہندوستان اس سے فایدہ نہیں اٹھا سکتا اس لئے اب صرف دو ملک امریکہ اور کناڈا رہ جاتے ہیں جن کی مدد سے ہندوستان اپنے فقر و فاقہ کی مصیبت میں کمی پیدا کر سکتا ہے۔ (آسٹریلیا کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کی امداد کا دایرہ بہت محدود ہے) لیکن اس کی امداد کی جو اخلاقی قیمت ہندوستان کو ادا کرنا پڑے گی وہ شاید فقر و فاقہ کی مصیبت سے

زیادہ المناک ثابت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ امریکہ ہو یا کناڈا، ان میں سے کسی کو ہمارے ساتھ اس لئے ہمدردی نہیں ہو سکتی کہ یہ انسانیت کا تقاضہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ آہستہ آہستہ یہاں اپنا اقتدار قایم کرکے روس کے خلاف وہ اپنا ایک نیا محاذ طیار کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ مسٹر جنالڈ جارج کیول نے جو کناڈا کی طرف سے کولمبو پلان کے ایڈمنسٹریٹر ہیں اپنی ایک تقریر میں صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ "اگر مغرب کی جمہوری حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ ایشیا کا وہ حصّہ جو ابھی ماسکو کے اثر سے محفوظ ہے، آیندہ بھی محفوظ رہے، تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ خود اپنے اثرات ایشیا میں قایم کریں"۔

کناڈا نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ ایک کروڑ ڈالر کا گیہوں ہندوستان کو تحفتاً پیش کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اس خیال سے کہ ہندوستان سے فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت کو ملک کی ترقی اور منصوبہ بندیوں کی تکمیل میں صرف کرے گا اور اس طرح اسکی رعایا کناڈا اور امریکہ کے ان احسانات کے اعتراف میں روسی اثرات کو قبول نہ کرے گی۔ لیکن جمہوری حکومتوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اب بھی افتادہ زمین اتنی ہے کہ اگر اس میں کاشت کی جائے تو پیداوار دوچند ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بہت سی چھپی ہوئی دولتیں معدنیات کی صورت میں بھی یہاں پائی جاتی ہیں اور صنعتی ترقی کے لئے بھی یہاں خام پیداوار کی کمی نہیں لیکن باوجود اس کے یہ بات ہندوستان کے بس کی نہیں کہ وہ اپنی ترقی کے کسی منصوبہ کو کامیاب بنا سکے، کیونکہ اس کے لئے روپیہ سے زیادہ عزم و ارادہ، اخلاق کی بلندی، فرض شناسی اور راعی و رعایا کے باہمی تعاون کی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے ان میں سے کوئی چیز یہاں نہیں پائی جاتی۔

مسٹر منشی وزیر غذائیات نے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد ہندوستان کو غلّہ کی پیداوار کی طرف کفیل بالذات بنا دیں گے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا انھوں نے سب سے پہلے "غلّہ پیدا کرو" کی اسکیم ملک کے سامنے پیش کی، جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو "درخت اُگاؤ" کی تحریک شروع کی اور اب وہ صرف "دل مضبوط رکھو" کی تلقین فرما رہے ہیں، اور وہ بھی غالباً اس اطمینان پر کہ اشتراکیت و جمہوریت کی کشمکش کی بدولت غلہ کی رشوت کسی نہ کسی طرف سے مل ہی جائیگی۔

کس قدر شرم و افسوس کی بات ہے کہ چین ربع صدی تک جنگ کی مصیبت میں مبتلا رہنے کے بعد جب آزاد ہوتا ہے تو صرف دو سال کے اندر اتنا غلہ پیدا کر لیتا ہے کہ اپنی ۴۰ کروڑ کی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کی برآمد کر سکتا ہے اور ہندوستان جو ایک صدی سے براہ راست کسی جنگ میں مبتلا نہیں ہوا، آزاد ہونے کے چار سال بعد بھی اس قابل نہ ہوا کہ وہ اپنی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے غیر ممالک کے رحم و کرم کا محتاج نہ رہے۔ ہندوستان کے پاس دولت کی کمی نہیں، زمین کی کمی نہیں، خام پیداوار کی کمی نہیں، معدنیات کی کمی نہیں، لیکن اس تمام افراط کے مقابلہ میں بے غرض کام کرنے والوں اور فرض شناس انسانوں کی کمی اتنی بڑی تفریط ہے کہ ہم اپنے ذرایع خوشحالی میں کسی ایک سے بھی فایدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ پھر ایسا نہیں کہ حکومت اس حقیقت سے بے خبر ہو، لیکن اس کا علاج اس کے پاس کوئی نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق غلّہ سے نہیں بلکہ انسان پیدا کرنے سے ہے اور وہ ملک جس کے اکابر بھی اب بھی ہزاروں سال کی مردہ تہذیب کو زندہ کرنا ترقی سمجھتے ہوں، اب کیا کبھی بھی انسان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے تقسیم کے بعد جتنی بھی غلطیاں کی ہوں، لیکن اس کی سب سے بڑی غلطی جس کو زمانہ کبھی معاف نہیں کر سکتا، یہ تھی کہ اس نے آزادی و سیاست دونوں کو ایک چیز سمجھا حالانکہ آزادی حاصل کرنے سے پہلے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ اس آزادی کو قایم رکھنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔۔ حکومت نام نہ صرف آئین سازی کا ہے نہ ارکان پارلیمنٹ کا، بلکہ ان افراد و عمال کا جو حکومت کے قانون اور حکومت کی پالیسی کو چلاتے ہیں اور ایسے افراد دفعتاً پیدا نہیں ہوتے بلکہ سالہا سال کے تجربہ کے بعد آہستہ آہستہ اس منزل تک پہونچتے ہیں۔ کسی ملک کا انتظام یا ایڈمنسٹریشن بچوں کا کھیل نہیں، یہ ایک مستقل فن ہے اور اس کے لئے خاص تربیت یافتہ دماغوں اور معیاری اخلاق رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن حصول آزادی کے بعد ہماری حکومت نے بدقسمتی سے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اس نے سمجھ لیا کہ ہر وہ شخص جو جیل جا سکتا ہے وہ ملک کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔۔ برطانوی قوم جیسی کچھ بھی ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انتظام اور ایڈمنسٹریشن اس کا حصہ تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں کی مدد سے اس نے ہندوستان ایسے بڑے ملک کے نظم و نسق کو اس نہج سے چلایا کہ جب تک اس نے چاہا ملک آزاد نہیں ہو سکا اور اب کہ وہ نہیں ہے ہم کو حکومت کی ایک ایک چول ڈھیلی نظر آرہی ہے۔۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ حصول آزادی کے بعد انگریز افسروں کو یہاں سے نہ جانے دیا جاتا، گورنر سے لیکر کلکٹر تک بالکل نظم و نسق کا وہی ڈھانچہ باقی رکھا جاتا جو پہلے پایا جاتا تھا اور جب ان سے آٹھ دس سال میں ایڈمنسٹریشن سیکھ لیا جاتا تو انکو آہستہ آہستہ یہاں سے جانے دیا جاتا، لیکن حکومت نے نہ صرف یہ کیا کہ انگریز افسروں کو فوراً رخصت کر دیا (حالانکہ اب انگریزی حکومت سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا) بلکہ مسلمانوں کو بھی کلیدی مناصب سے ہٹا دیا (حالانکہ انگریز کے بعد سب سے بہتر ایڈمنسٹریٹر وہی تھے) اور اس طرح اس [illegible] S.O. کو بھی ختم کر دیا جو حکومت کو خود اسی کے دوستوں سے بچانے کے لئے ازبس ضروری تھا۔

انسان وانسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصّہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مجسّمہ — تم یہ سب کچھ سوچے ہوئے بغیر ہی اتنی خوبی کے ساتھ اس منزل پر پہونچ سکتے تھے فرزان — تم بھی دُنیا کے دوسرے عقلمند انسانوں کی طرح ہو — تمھیں ضرورت سے زیادہ دماغ مل گیا ہے

ابلیس — اور کیا اس تجربہ نے تمھیں پہلے سے زیادہ مسرور نہیں بنا دیا فرزان صاحب؟

فرزان — مسرور؟ — نہیں — البتہ زیادہ عقلمند! — یہ وہ سب سے پہلا لمحہ تھا جس نے مجھے خود مجھسے اور میرے ذریعہ دنیا سے متعارف کرایا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ناقابل مزاحمت و بے پناہ "قوت حیات" پر شرایط و قیود عاید کرنے کی کوشش کسقدر بے مصرف ہے یعنی ہوشمندی و مصلحت کوشی - محتاط انتخاب - نیکی - عزت - پاکیزگی و عصمت وغیرہ کی تعلیم دینا کس قدر....

سارہ — فرزان! — پاکیزگی و عصمت کے خلاف لب کشائی میری اہانت ہے

فرزان — میں تمھاری پاکیزگی و عصمت کے خلاف کچھ نہیں کہتا محترمہ — کیونکہ اس نے ایک شوہر اور ایک درجن بچوں کی شکل اختیار کرلی ہے — اگر تم ایک انتہائی گمراہ و بے یار و مددگار عورت ہوتیں تو بھی اس سے زیادہ اور کیا کرسکتی تھیں؟

سارہ — میں یہ کرسکتی تھی فرزان کہ میرے ایک درجن شوہر ہوتے اور بچہ کوئی بھی نہ ہوتا — یہ تھا وہ جو میں کرسکتی تھی! — اور یاد رکھئے میری صرف ایک یہی حرکت اُس دُنیا میں جس کی آبادی میں میری وجہ سے اضافہ ہوا زمین و آسمان کا فرق پیدا کرسکتی تھی

مجسّمہ — شاباش سارہ! — اب تم فرزان بالکل چاروں شانے چت ہوگئے۔

فرزان — بالکل نہیں — کیونکہ اگرچہ یہ فرق حقیقی و بنیادی فرق ہے (مجھے تسلیم ہے کہ محترمہ سارہ بالکل سیدھی اصلی مسئلہ پر پہونچ گئی ہیں) لیکن یہ فرق درحقیقت محبت و پاکیزگی یا عصمت یا وفا شعاری کا فرق نہیں ہے، کیونکہ ایک درجن مختلف شوہروں سے پیدا ہونے والے ایک درجن بچے کرۂ ارض کی آبادی میں اس سے کہیں زیادہ بہتر اضافہ کرسکتے تھے۔ فرض کیجئے کہ میرا دوست اور تمھارا شوہر فرازی تمھاری تیس سال کی عمر سے پیشتر مرجاتا - اس وقت تم کبھی ایک بیوہ بن کر نہ رہ سکتیں کیونکہ تم بہت خوبصورت تھیں - فرض کیجئے کہ فرازی کا جانشین تمھاری چالیس سال کی عمر سے پیشتر مرجاتا ——————

—————— اس وقت بھی تم حسن و کشش کے لحاظ سے بے پناہ ہوتیں اور یہ حقیقت ہے کہ جو عورت دوسری مرتبہ شادی کرتی ہے وہ بشرط آزادی تیسری مرتبہ بھی شادی ضرور کرتی ہے - ایک اعلیٰ و معزز خاتون سے ایک درجن جایز بچوں کا تین مختلف شوہروں سے پیدا ہونا ناممکن نہیں اور نہ رائے عامہ اسے معیوب قرار دیتی ہے - یہ بالکل اور بے شبہ صحیح ہے کہ ایسی معزز خاتون اُس غریب لڑکی سے کہیں زیادہ قانون و روایت کی فرماں بردار ہوسکتی ہے - جس کو ہم صرف ایک ناجایز بچہ پیدا کرنے کے جرم میں اپنی بیرحم ٹھوکروں سے سماج کی غلاظت میں ڈھکیل دیتے ہیں — لیکن کیا تم یہ کہنے کی جرأت کرسکتی ہو کہ وہ معزز خاتون اس گنہگار لڑکی سے کچھ کم خواہش پرست اور نفس پرور ہے؟

سارہ ۔۔۔ وہ معزز خاتون اس کمسن مجرمہ سے زیادہ نیک و راستباز ہے ۔ بس میرے لئے اتنا ہی سمجھنا کافی ہے ۔

فرزان ۔۔۔ اگر یہ بات ہے تو کیا نیکی و راستبازی صرف شادی شدہ انسانوں کی اجارہ داری کے علاوہ اور کچھ بھی ہو سکتی ہے ؟ حقائق کو اپنے سامنے رکھو عزیز سارہ ! ۔۔۔ "قوتِ حیات" اگر شادی کا کوئی احترام کرتی ہے تو صرف اس لئے کہ یہ شادی کا طریقہ خود اس نے ہی زیادہ سے زیادہ بچے حاصل کرنے اور ان کی بہترین نگہداشت کا سامان مہیا کرنے کے لئے ایجاد کیا ہے ۔ عزت، عصمت و پاکیزگی اور تمہارے دیگر تمام اخلاقی اختراعات کی پروا "قوتِ حیات" کو ذرا بھی نہیں ۔ تمام انسانی رسوم میں شادی سب سے زیادہ نفس پرور و بداخلاق رسم ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سارہ ۔۔۔ فرزان !

مجسمہ ۔۔۔ (احتجاج کے طور پر) واقعی !

فرزان ۔۔۔ (پورے استحکام سے) میں کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ نفس پرور و بداخلاق رسم ! ۔۔۔ یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے ۔۔۔ اور جب عورت ایک شوہر کی تلاش میں نکلتی ہے تو وہ شکار کرنے والے درندوں میں سب سے زیادہ ضمیر فراموش حیوان ہوتی ہے ۔ شادی کو اخلاق و پاکیزگی کے ساتھ ربط دینے سے انسانی ضمیر کی جس قدر تباہی واقع ہوئی ہے وہ انسان کی کسی بھی دوسری غلطی سے نہیں ہو سکی ۔ ذرا تحمل سے کام لو سارہ ! ۔۔۔ متعجب و برہم ہونے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ تم اس حقیقت کو ہم سب سے زیادہ جانتی ہو کہ شادی مرد کو پھنسانے کے لئے ایک جال ہے جس کے نیچے مصنوعی حسن و خوبی اور فریب انگیز بلند نظریات کے دانے بکھیر دئے گئے ہیں ۔ جب تمہاری نیک و خدارسیدہ ماں نے فہمائشوں اور سزاؤں کے ذریعہ تمہیں اس بات پر مجبور کیا کہ تم سازِ پردہ پانچ چھ نغمے بجانا سیکھ جاؤ جن سے اُس کو بھی اسی قدر نفرت تھی جس قدر کہ خود تمہیں تو کیا اس کے پیشِ نظر اس کے علاوہ اور کوئی مقصد تھا کہ تم سے محبت کرنے والوں کو اس یقین کے فریب میں مبتلا کر دیا جائے کہ تمہارے شوہر کو اپنے مکان میں ایک ایسی عورت بہشتی نصیب ہوگی جو اس کی چہار دیواری کو موسیقی سے لبریز کر دے گی یا کم از کم طعام کے بعد اُسے نغمات کے ذریعہ لوریاں دیکر سلا دے گی ؟ ۔۔۔ تم نے میرے دوست فراسی سے شادی کی ۔۔۔ لیکن جب مذہب نے تمہیں دو سے ایک کر دیا تو کیا اس ساعت کے بعد بھی تم نے کبھی ساز کو اُٹھانے کی کوشش کی ؟

سارہ ۔۔۔ تم بیوقوف ہو فرزان ۔ ایک نوجوان شادی شدہ عورت کو سازِ موسیقی کے سامنے بیٹھے رہنے کے علاوہ اور بہت سے فروری مشاغل ہوتے ہیں ۔۔۔ اور اس طرح اُسے ساز کو بجانے کی مشق و عادت نہیں رہتی

فرزان ۔۔۔ اگر وہ موسیقی سے محبت کرتی ہے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ ہرگز نہیں ۔۔۔ باور کرو وہ تو جال کے ان خوبصورت دانوں کو صرف اس لئے اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیتی ہے کیونکہ اب پرندہ جال میں پھنس چکا ہے

سارہ ۔۔۔ (تلخی سے) اور مرد تو غالباً اپنے پرندے کو جال میں پھنسانے کے بعد کبھی اپنی نقاب اُٹھاتے ہی نہیں ! ۔۔۔ شوہر تو گویا کبھی لاپروا خود غرض اور بیرحم ہوتا ہی نہیں ! ۔۔۔ کبھی بھی نہیں !

فرزان ۔۔۔ مرد و عورت اس طرح ایک دوسرے کو جواباً ملزم و مجرم قرار دیتے ہیں تو ذرا سوچو سارہ کہ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے ؟ ۔۔۔ صرف یہی کہ ہیرو بھی اسی قدر فریب کار و جعلی ہے جس قدر کہ ہیروئن

سارہ ۔۔۔ یہ سب لغو ہے ۔ بیشتر شادیاں مکمل طور پر راحت انگیز ثابت ہوتی ہیں

فرزان ۔۔۔ "کمل طور پر" کا فقرہ بہت بڑا فقرہ ہے سارہ ۔ تمہارا مفہوم یہ ہے کہ سمجھدار لوگ ایک دوسرے کی معیت کو زیادہ سے زیادہ گوارا بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگر مجھے قید خانہ میں بھیج دیا جائے اور میرے نزدیک والے سنگین مجرم کے ساتھ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو اس لاعلاج صورتِ حال کو مجھے مجبوراً قبول کرنا پڑے گا اور اپنے رفیق کی معیت کو زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک

گوارا بنانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی رفاقت متعدد موقعوں پر بہت زیادہ محبت انگیز صورت اختیار کرلیتی ہے اور اکثر و بیشتر کم از کم ایک ہلکی سی دوستی کی شان پیدا ہو جاتی ہے — لیکن یہ چیز قیدی کی زنجیروں کو قابلِ تمنا اور قیدخانے کو ایک مسرت کدہ نہیں بنا سکتی۔ جو لوگ شادی کی برکات اور اس کے پیمانِ وفاداری کی بابت قصیدہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں وہی لوگ دوسری طرف یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر یہ زنجیر توڑ دی جائے اور قیدیوں کو انتخاب کی آزادی مل جائے تو سماج کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے۔ لیکن ایک استدلال کو ہر دو جانب سے اپنی ہی موافقت میں موڑا نہیں جا سکتا۔ اگر قیدی مسرور ہے تو زنجیروں میں جکڑا کیوں جائے؟ — اگر مسرور نہیں ہے تو یہ ظاہر کیوں کرے کہ مسرور ہے؟

سارہ — واقعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میں ایک مرتبہ پھر اپنی سن رسیدگی سے فائدہ اُٹھا کر تمھیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ شادی دُنیا کو آباد کرتی ہے اور نفس پروری و عیاشی ایسا نہیں کرتی۔

فرزان — لیکن اگر کوئی زمانہ ایسا آ گیا کہ تمھارا یہ نظریہ صحیح نہ رہا تب؟ — کیا تم کو علم نہیں کہ ارادہ خالق ہے تدبیر کا مرد آج جو کچھ درحقیقت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ کوئی طریقہ آخرکار دریافت کرے گا۔ جہاں تک تم نیکوکار خواتین اور تمھاری ہم خیال دیگر ہستیوں کا تعلق ہے یقیناً تم سب نے اپنی بہترین کوششیں اس بات پر صرف کر دی ہیں کہ مرد کے دماغ کو کلی طور پر اس چیز کی طرف مائل کر دیں کہ شریفانہ و باعزت محبت ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور اس شریفانہ و باعزت محبت کا مفہوم صرف یہ سمجھا جائے کہ مرد حسین و شائستہ اور نازک و محبت کیش عورتوں ہی کے تصرف میں دنیا کا تمام رومان، حسن اور سامانِ مسرت تلاش کرے۔ تم نے دوسری طرف عورتوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے شباب، صحت، اعضاء کی تناسب شکل و صورت اور نفاست کو باقی تمام اُمور پر ترجیح دیں — لیکن ذرا یہ بتلاؤ کہ حواس و جذبات کی اس خوبصورت جنت میں روتے ہوئے بچوں اور خانہ داری کی اُلجھنوں کا مقام کونسا ہے؟ — کیا اس تمام تضاد کا بالکل ناگزیر اختتام و نتیجہ یہ نہیں ہے کہ انسانی ارادہ و خواہش انسانی دماغ سے بالآخر یہ استدعا کرے کہ "میرے واسطے کوئی ایک ایسا ذریعہ تخلیق کر دے جس کی مدد سے مجھے محبت، حسن و جمال، رومان، اور احساسات و جذبات تو ضرور نصیب ہو جائیں لیکن ان کے تمام فطری طفیلات یعنی سزائیں، اخراجات، پریشانیاں، امتحانات، امراض، موت کی تکلیفیں اور خطرات، ملازمین، نرس اور ڈاکٹر دل اور مدرسوں کے اُستادوں وغیرہ کے جھمیلوں سے نجات مل جائے۔"

ابلیس — انسان کی یہ خواہش یہاں میری سلطنت میں پوری طرح تسکین پاتی ہے فرزان!

فرزان — ہاں۔ مگر موت کی قیمت کے بدلے! — مرد اس چیز کو اس قیمت پر لینا نہیں چاہتا — اس کی خواہش تو یہ ہے کہ تمھارے جہنم کی رومانوی مسرتوں سے اُس وقت کسب کیف کرے جبکہ وہ کرۂ ارض پر موجود ہے۔ بہرحال اس کے ذرائع دریافت کر لئے جائیں گے۔ اگر ارادہ صادق ہے تو دماغ جواب نہیں دے گا۔ وہ دن قریب ہے جبکہ ہر مردم شماری پر دُنیا کی بڑی بڑی اقوام اپنی تعداد کو کم ہوتا ہوا دیکھیں گی — مختصر دیہاتی مکان اپنی قیمت میں ایک عالیشان خاندانی عمارت سے بڑھ جائے گا — انسانی نسل کی فنا میں تھوڑی سی تاخیر و تعویق پیدا کرنے کے لئے بدکارانہ حد تک لاپروا مفلس لوگ اور احمقانہ حد تک نیکوکار دولتمند انسان انسانی نسل کو پستی میں دھکیلنے پر آمادہ ہو جائیں گے — لیکن وہ تمام لوگ جو جری و عاقبت اندیش، کفایت شعارانہ قسم کے خودغرض و عالی حوصلہ تخئیل پرست و شاعرانہ فطرت — دولت و راحتِ مادی کے پرستار اور کامیابی و فنون و محبّت کے پجاری کہلاتے ہیں سب کے سب ضبط و تخریبِ تولید کی تدبیروں سے "قوتِ حیات" کی مخالفت کریں گے۔

مجسمہ — تمھارے یہ سب الفاظ بہت سلیس و خوبصورت ہیں میرے نوجوان دوست — لیکن اگر تم دُنیا میں اتنے عرصہ تک زندہ رہتے جتنی مدت کہ سارہ کو یا مجھے نصیب ہوئی ہے تو تمھیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی کہ جو لوگ افلاس، اولاد، اور دیگر تمام خاندانی پریشانیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور زندگی سے حظ اندوزی کے لئے اپنے اوقات وقف کر دیتے ہیں وہ اپنے دماغوں کو در اصل کھو لیتے۔ بدصورتی

ضعف و نامردی اور موت کے خوف کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک بے اولاد مزدور اپنی بیوی کی کاہلی اور دلچسپی و تفریح کے متعلق مطالبات سے جس قدر اذیت و عقوبت پاتا ہے اُتنی اُسے بیس بچے بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اور پھر اُس کی بیوی کی حالت خود اُس سے بھی زیادہ اذیت انگیز ہوتی ہے۔ فطری پندار اور تحسین پسندی کا انسانی حصہ مجھے بھی ملا ہے۔ جب میں نوجوان تھا تو عورتیں میری تعریف کرتی تھیں اور اب جبکہ میں ایک مجسمہ ہوں تو فن کار ناقدین میری تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اگر مجھے ان مسرتوں کی کیچڑ میں لوٹنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام کرنے کو نہ ملتا تو میں خود کو ذبح کر ڈالتا۔ جب میں نے سارہ کی ماں سے شادی کی یا غالباً زیادہ صحیح طور پر یوں کہئے کہ جب میں نے کوشش مزاحمت ترک کردی اور سارہ کی ماں کو یہ موقعہ دیدیا کہ وہ مجھ سے شادی کرے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنے بستر پر کانٹے بچھا رہا ہوں اور یہ شادی مجھ جیسے نوجوان اور ہنوز غیر مفتوح افسر کے لئے شکست و گرفتاری کی حیثیت رکھتی ہے۔

سارہ — (ناگواری و برہمی سے) ابّا!

مجسمہ — میری عزیز بچی مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں صدمہ پہونچایا۔ لیکن چونکہ فرزان نے اس بحث و گفتگو سے تکلف و نفاست کے تمام حجاب ہٹادئے ہیں اس لئے میں نے بھی بالکل ٹھوس حقیقت کو بیان کرنا مناسب سمجھا

سارہ — اُف! — تو غالباً ان کانٹوں میں ایک میں بھی تھی

مجسمہ — ہرگز نہیں — تم اکثر میرے لئے ایک گلاب ثابت ہوئیں۔ تم جانتی ہو کہ تمھاری پریشانیوں کا زیادہ حصہ تو تمھاری ماں نے برداشت کیا۔

فرزان — تو کیا میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کپتان صاحب کہ جب یہ بات ہے تو تم فردوس کو چھوڑ کر یہاں ان مسرتوں کی کیچڑ میں لوٹنے کے لئے کیوں آئے ہو جو بقول تمھارے ایک مرتبہ تمھیں خودکشی پر آمادہ کرچکی ہیں؟

مجسمہ — (متاثر ہوکر) یقیناً — یہ بالکل صحیح ہے

ابلیس — (خوف زدہ ہوکر) کیا! — دیکھو تم اپنے وعدے کو فراموش کر رہے ہو! — (فرزان سے) اور تمھاری یہ تمام فلسفہ طرازی درحقیقت صرف اپنے مذہب کی تبلیغ کا ایک پردہ تھی! — (مجسمہ سے) کیا تم اتنی جلد اُس ہیبت ناک کوفت و بے کیفی کو بھول گئے جس سے میں تمھیں یہاں پناہ دے رہا ہوں؟ (فرزان سے) اور تم نے اب تک جو کچھ انسان کی ضبط و قطع نسل اور فنائے نسل کے بارے میں جو دلایل پیش کئے ہیں کیا اُن سب کا اس سے بہتر کوئی اور نتیجہ نکلتا ہے کہ فن اور محبت کی اُن مسرتوں سے پوری طرح کیف حاصل کیا جائے جن کی مدد سے بقول تمھارے خود تمھارے حواس کو شائستگی۔ بلندی اور ارتقا نصیب ہوا ہے؟

فرزان — میں نے انسانی نسل کی فنا کے متعلق کوئی ثبوت و دلیل پیش نہیں کی۔ زندگی خواہ اندھے کیڑے مکوڑوں کی شکل اختیار کرے یا کوئی اور شکل جس میں وہ خود کو اب تک منظم کرسکی ہے لیکن یقیناً زندگی کسی حالت میں بھی خود اپنی فنا کا ارادہ و خواہش نہیں کرسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی گفتگو کو پوری طرح ختم نہیں کرنے پایا تھا کہ حضور نے میرا قطع کلام کردیا۔

مجسمہ — مجھے تو ڈر یہ ہے دوست کہ شاید تم کبھی بھی یہ گفتگو ختم نہ کرسکو گے۔ تم خود اپنی گفتگو سننے کے بہت زیادہ شایق ہو

فرزان — صحیح — لیکن اب کہ تم اس قدر برداشت کرچکے ہو اگر اختتام تک تحمل کرو تو اچھا ہے۔ اس سے بہت پیشتر کہ نسل کو بند کردینے کا یہ جذبہ ایک صاف و واضح امکان مستقبل کی شکل اختیار کرے اس کا ردِعمل شروع ہوجائے گا۔ نسل پیدا کرنے کا زبردست مرکزی مقصد کہ تولیدِ نسل کے تجربات کو ارتقاء و ترقی دیتے دیتے آخر کار ایک مافوق الانسان ہستی پیدا کی جائے — ہاں یہ مقصد جو آج تک محبت۔ رُمان۔ باطل شرم و حیا اور جھوٹی نفاست و شائستگی کے مسموم بادلوں کے پیچھے پوشیدہ ہے اس پردہ کو چاک کرکے سورج کی پوری روشنی میں نمودار ہوجائے گا اور اس کے بعد اس اہم مقصد کو ذاتی خواہشات کی تسکین۔ نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے خواب مسرت کے ناممکن الحصول یا معمر لوگوں کی تجارتی شادی و رفاقت کی ضرورت کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا جاسکے گا۔ معابد میں نکاح و عقد کے

مذہبی فقرات میں صاف و صریح الفاظ کو ناشایستہ سمجھ کر مختصر یا محذوف نہیں کیا جائے گا۔ ایک سنجیدہ نفاست۔ سنجیدہ ارادہ و عزم اور شادی کے حقیقی مقصد کے ذمہ دارانہ اعلان کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا اور قبول کیا جائے گا اور تمام رومانوی عہد و پیمان اور "رفاقت تا مرگ" قسم کے تمام خوبصورت وعدوں کو قطعی ناقابل برداشت مہملات قرار دیکر شادی کی رسوم سے خارج کر دیا جائے گا میری جنس کے افراد کو انصاف کی نظر سے دیکھو سارہ اور یہ تسلیم کرو کہ مرد نے ہمیشہ یہی اعتراف کیا ہے کہ جنسی تعلق ایک ذاتی یا دوستانہ تعلق بالکل نہیں ہے

سارہ —— ذاتی یا دوستانہ تعلق نہیں! —— تو پھر اور کونسا تعلق اس سے زیادہ ذاتی۔ اس سے زیادہ پاکیزہ اور اس سے زیادہ مقدس ہو سکتا ہے؟

فرزان —— اگر تم چاہو تو سارہ اس تعلق کو تم پاکیزہ و مقدس کہہ سکتی ہو لیکن ذاتی طور پر یا دوستانہ تعلق ہرگز نہیں۔ خدا سے تمہارا تعلق پاکیزہ و مقدس ہے —— کیا تم اس تعلق کو ذاتی دوستانہ کہنے کی جرأت کر سکتی ہو؟ جنسی تعلق میں جانبین بالکل مجبور آلۂ کار ہیں اُس کائناتی تخلیقی قوت کے جو تمام ذاتی ملحوظات پر حاوی ہو جاتی ہے اور تمام ذاتی تعلقات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جنسی تعلق میں متحد ہونے والا انسانی جوڑا ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہو۔ مختلف مادری زبانیں بولتا ہو —— نسل و رنگ میں مختلف ہو —— عمر و مزاج میں مختلف ہو —— اور ان کے درمیان کوئی رشتہ بھی موجود نہ ہو سوائے اس مقصد تولید کے جس کی خاطر "قوتِ حیات" نے اُن کو صرف ایک تبادلۂ نگاہ کے بعد ایک دوسرے کی آغوش میں گرا دیا ہے۔ کیا یہ اسی چیز کو تسلیم کرنے کا ثبوت نہیں ہے کہ ہم والدین کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ عورت سے مشورہ حاصل کئے بغیر ہی شادی کر دیں؟ —— کیا تم نے خود اکثر انگریز قوم کی اس بدکاری و بداخلاقی پر نفرت کا اظہار نہیں کیا کہ اس قوم کے شریف مرد عورتیں ایک دوسرے سے متعارف ہو کر بالکل دیہاتی لوگوں کی طرح عشق و محبت کا کھیل کھیلتے ہیں؟ —— لیکن ایک دیہاتی جوڑا باہم منسوب ہونے سے پیشتر ایک دوسرے کے متعلق کتنی واقفیت رکھتا ہے؟ —— میرا خیال ہے کہ تم جس قدر حقیر واقفیت پر ایک مرد سے محبت و شادی کر سکتی ہو اتنی واقفیت پر تم اُسے اپنا قانونی وکیل یا طبی مشیر بھی بنانا پسند نہ کرو گی!

سارہ —— ٹھیک ہے فرزانؔ —— ہم عیاش مرد کے فلسفہ سے پوری طرح واقف ہیں۔ عورت کے لئے اس کی روش کے کیا نتائج ہوں گے اس کو مرد ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے —— اور تم بھی

فرزان —— نتائج! —— ہاں بیشک نتائج کے مدنظر مرد پر عورت کی خوفناک و زبردست گرفت کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یقیناً تم اس وابستگی و تعلق کو قلبی و جذباتی نہیں کہہ سکتیں —— ورنہ ایک پولس کے سپاہی کا جو تعلق اس کے قیدی سے ہوتا ہے اُسے بھی جذباتی کہا جائے گا۔

سارہ —— اگرچہ تمہاری نظر میں محبت تمام انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ معمولی و خفیف تعلق کا نام ہے لیکن حقیقتاً تمہیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ شادی ایک ضروری چیز ہے

فرزان —— تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمام انسانی تعلقات میں یہ سب سے بڑا تعلق ہے! —— اتنا اہم و عظیم تعلق کہ اس میں ذاتی جذبات کو کوئی جگہ نہیں پا سکتے۔ اگر تمہارے والد اپنے وطن کے کسی دشمن کو صرف اس لئے ہلاک نہ کرتے کہ اُنہیں ذاتی طور پر اُس سے کوئی نفرت نہیں ہے تو کیا وہ اپنے وطن کی خدمت کر سکتے تھے؟ اگر کوئی عورت کسی مرد سے صرف اس لئے شادی کرنے سے انکار کر دے کہ اُسے ذاتی طور پر اس مرد سے کوئی محبت نہیں تو کیا وہ اپنے وطن کی خدمت کر سکتی ہے؟ —— یقیناً نہیں —— ایک شریف و معزز عورت کا شادی کرنا اور ایک شریف و معزز مرد کا جنگ کے لئے تلوار اُٹھانا یہ دونوں کام ایسے ہیں جو ذاتی مقاصد کے تحت نہیں کئے جاتے بلکہ سیاسی و خاندانی اغراض کے تحت ہوتے ہیں

مجسمہ —— (متاثر ہو کر) بڑی پر مغز دلیل ہے یہ فرزانؔ۔ مجھے اس نکتہ پر غور کرنا چاہئے۔ درحقیقت تمہارا دماغ جدید خیالات و اہم نظریات سے لبریز ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ نکتہ کس طرح آیا؟

فرزان —— میں نے اسے تجربہ سے سیکھا ہے۔ جب میں کرۂ ارض پر تھا اور عورتوں کے سامنے اپنے وہ خیالات و جذبات پیش کرتا تھا جو عام طور پر

معیوب قرار دئے جانے کے باوجود اس قدر عجیب تھے کہ ان کی وجہ سے میں ایک نہایت دلچسپ افسانوی ہیرو میں تبدیل ہو گیا تھا تو اس وقت اکثر و بیشتر میرے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا تھا وہ یہ ہے۔ عورت کہتی تھی کہ وہ میرے اقدامات کا تحمل کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ اقدامات شریفانہ و باعزت ہوں۔ اس "شریفانہ و باعزت اقدامات" کی شرط کا مفہوم تحقیق کرنے پر مجھے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میں اس عورت کی ملکیت میں بشرط موجودگی حصہ دار بنوں اور اگر اُس کے اخراجات کا کوئی ذریعہ نہیں تو اس کا کفیل ہونا برداشت کروں ۔۔ علاوہ ازیں اُس کی مستقل معیت ۔ صلاح و مشورہ اور باہمی گفتگو کو اپنی زندگی کے آخری دن تک ایک قابل تماشے سمجھتا رہوں اور یہ زبردست قسم کھاؤں کہ میں ہمیشہ ان چیزوں سے مسحور رہوں گا ۔۔ اور سب سے زیادہ اہم یہ عہد کروں کہ میں اس عورت کی خاطر دنیا کی باقی تمام عورتوں کو پس پشت ڈال دوں گا۔ ان شرائط پر اگر مجھے اعتراض تھا تو اس لئے نہیں کہ یہ شرطیں حد سے زیادہ سخت اور غیر انسانی و بیرحمانہ تھیں بلکہ اس لئے کہ ان شرائط کا تعلق موجودہ مقصد سے ذرا سا بھی نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ ہر ایک عورت کو پوری بیباکی کے ساتھ یہی جواب دیا کہ مجھے تو ان چیزوں کا کبھی خواب و خیال بھی نہیں تھا۔ نیز یہ کہ اگر اس خاتون کا کردار اور عقل و ذہانت میرے برابر یا مجھ سے برتر ہیں تو اس کی گفت و شنید ضرور مجھے پست اور صلاح و مشورہ مجھے گمراہ کر دے گا ۔۔ علاوہ ازیں یہ کہ بالکل ممکن ہے کہ اس کی مستقل معیت میرے لئے ناقابل برداشت حد تک ایک بار بن جائے۔ میں کہتا تھا کہ جب میں اپنے جذبات کے تغیر کی بابت ایک ہفتہ پیشتر کوئی یقین نہیں دلا سکتا تو زندگی کے اختتام تک کی ضمانت کیسے کر سکتا ہوں۔ رہا دُنیا کی دوسری عورتوں کے متعلق تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی دُنیا کی نصف آبادی سے تمام فطری و بے تکلف تعلقات کو قطع کر دوں۔ یہ چیز اگر میں نے اختیار کی تو اس سے میری ذہنیت تنگ و محدود ہو کر راہ راست سے دور ہٹ جائے گی یا پھر مجھے خفیہ و پوشیدہ عشق بازی کے عذاب میں گرفتار کر دے گی۔ اتنا کہنے کے بعد میں عورت سے آخر میں یہ صاف صاف طور پر کہہ دیتا تھا کہ میری محبت اور اظہار آرزو کو ان تمام معاملات سے ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ تو اُس خالص سادہ جذبہ کا اظہار ہیں جو کہ فطری طور پر ایک مرد کی جنسی سرخت ایک عورت کی جنسی سرشت کی طرف محسوس کرتی ہے۔

سارہ ۔۔ تمہارا مقصد یہ ہے کہ یہ ایک غیر اخلاقی جذبہ تھا؟

فرزان ۔۔ محترمہ : خود فطرت بھی وہی کچھ ہے جسے تم لفظ "غیر اخلاقی" سے تعبیر کرتی ہو۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے لیکن میں بالکل معذور ہوں فطرت ایک دلاّل ہے ۔۔ وقت غارتگر ہے اور موت ایک قاتل ۔ میں نے ہمیشہ ان حقایق کی متابعت کی کوشش کی ہے اور ان کے احساس و اعتراف کے تحت رسوم اور ادارے تخلیق کرنے چاہیئے۔ لیکن تم نے ہمیشہ ان تینوں شیطانوں کے مطالبات کو تسکین دینے کو ترجیح دی اور ان کی عصمت و پاکیزگی۔ ان کی ہوشمندی اور ان کی محبت انگیز فطرت کا اعلان کیا ۔۔ اور ان جھوٹی خوشامدی باتوں پر اپنی رسوم و روایات کی بنیاد ڈالی ۔۔ پھر اگر اب یہ رسوم و روایات مطمئن کن طور پر کارفرما نظر نہیں آتیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات ہے ؟

مجسمہ ۔۔ عورتیں کیا کہا کرتی تھیں فرزان ؟

فرزان ۔۔ دیکھو بھئی رازداری دونوں طرف سے برابر ہونا چاہیئے۔ پہلے تم یہ بتلاؤ کہ تم عورتوں سے کیا کہتے تھے ؟

مجسمہ ۔۔ میں ! ۔۔ میں تو قسم کھا کر یہ کہتا تھا کہ جب تک جسم میں روح ہے وفادار رہوں گا اور اگر میری محبت کو قبول نہ کیا گیا تو میں مر جاؤں گا نیز یہ کہ میری نظر میں دنیا کی کوئی عورت وہ حیثیت حاصل نہ کر سکے گی جتنی کہ اُسے حاصل ہے ۔۔۔۔۔

سارہ ۔۔ اُسے ؟ ۔۔ کس کو ؟

مجسمہ ۔۔ اُس عورت کو جو اس وقت میری مخاطب ہوتی تھی خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ میرے پاس چند خاص جملے تھے جو میں ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ اُس وقت بھی جبکہ میرا سن و سال اسّی برس کا ہوگا میری محبوبہ کے سر کا ایک سفید بال میرے جسم میں ابھی

کہیں زیادہ شدید کپکپی پیدا کرے گا جتنی کہ کسی انتہائی حسین و نوجوان عورت کی خوبصورت زلفیں کر سکتی ہیں۔ دوسرا جملہ یہ تھا کہ میں اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور عورت میرے بچوں کی ماں بنے

فرزان — (نفرت سے) یہ بدکاری و منافقت!

مجسمہ — (مضبوطی سے) ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں اس وقت ان تمام خیالات پر اپنی روح کے پورے خلوص کے ساتھ یقین رکھتا تھا۔ تمہارے برعکس میں اپنے پہلو میں ایک دل رکھتا تھا۔ اور میرا یہی خلوص تھا جس نے مجھے کامیاب بنایا

فرزان — خلوص! — ایک صاف و صریح اور طوفانی و پرجوش جھوٹ کو باور کر لینے کی حد تک احمق بن جانا — یہ ہے وہ چیز جسے تم خلوص کہتے ہو! — ایک عورت کے لئے اپنی حرص و ہوس سے اس حد تک مغلوب ہو جانا کہ تم اسے فریب دینے کے شوق میں خود ہی فریب کا شکار ہو جاؤ — تم کہتے ہو یہ خلوص ہے!

مجسمہ — لعنت تمہاری اس کج بحثی پر! — میں تو ایک عاشق تھا — وکیل نہیں — اور عورتیں اسی لئے مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ خدا ان کو اس کا اجر دے!

فرزان — یہ خیال بھی تمہارے ذہن میں عورتوں ہی نے پیدا کیا۔ تم کیا کہو گے اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اگرچہ میں عورتوں کے معاملات میں ایک انتہائی بے حس وکیل ثابت ہو رہا تھا لیکن خود عورتوں نے ہی مجھے خود کو ایسا خیال کرنے پر مائل کیا؟۔ مجھے بھی جذباتی مغلوبیت و حماقت کے ایسے لمحات اپنی زندگی میں نصیب ہوئے ہیں جبکہ میں لغو و مہمل الفاظ کے دریا بہاتا تھا اور ان پر یقین کرتا تھا۔ بعض مرتبہ خوبصورت الفاظ کے ذریعہ عورتوں کو مسرور کرنے کی خواہش میرے دل میں اس قدر قوت کے ساتھ جذباتی سیلاب کو ابھارتی تھی کہ میں قطعی بے خوف اور لاپروا ہو کر انھیں اپنی زبان سے ادا کر جاتا تھا۔ اس کے برخلاف بعض اوقات میں خود اپنے جذبات و یقین کی مخالفت ایک ایسی شیطانی بے حسی کے ساتھ کرتا تھا جو دوسروں کی آنکھوں میں آنسو کھینچ لاتی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بےرحم بنکر عورتوں سے فرار ہونا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ مہربان بن کر — جب عورت کی جبلت مجھے شکار کے لئے چن لیتی تھی تو اس کے بعد عمر بھر کی غلامی یا پھر فرار کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہوتا تھا

سارہ — تم خود میرے اور میرے باپ کے سامنے یہ باطل دعویٰ کرنے کی جرأت کرتے ہو کہ تم ہر ایک عورت کے لئے بے پناہ کشش رکھتے تھے۔

فرزان — کیا میں باطل دعویٰ یا خود ستائی کر رہا ہوں؟ — میرا خیال تو یہ ہے کہ میری شکل و صورت انتہائی قابل رحم حد تک حسن و دلکشی سے محروم ہے۔ علاوہ ازیں میرے الفاظ یہ ہیں کہ — "جب عورت کی جبلت مجھے اپنے شکار کے لئے چن لیتی تھی" — لیکن ہمیشہ ایسا نہ ہوتا تھا — اور اگر کبھی ایسا ہوتا تھا تو خدا کی پناہ — نہ پوچھو کہ مجھے کتنے شدید پاکبازانہ قہر و غضب کا ہدف بنایا جاتا تھا! اور مجھے ایک بدسرشت اغوا کار قرار دیکر کتنی زبردست مخالفت و عتاب کی بارش مجھ پر ہوتی تھی

سارہ — لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو صرف اپنے باپ کو آواز دی تھی

فرزان — ہاں۔ لیکن جب وہ آیا تو تیغ بکف اور اس بات پر آمادہ کہ مجروح عزت و اخلاق کا انتقام لینے کے لئے مجھے قتل کر ڈالے

مجسمہ — قتل! — یہ تم کیا کہتے ہو؟ — میں نے تمہیں ہلاک کیا یا تم نے مجھے؟

فرزان — ہم دونوں میں کون بہتر و مشاق تیغ زن تھا؟

مجسمہ — میں تھا

فرزان — یقیناً تم تھے — لیکن اُن ہزاروں بدکارانہ افسانہائے محبت کے ہیرو ہونے کے باوجود جو تم ابھی بیان کر رہے تھے تمہیں چنانچہ جرأت ہو گئی کہ ایک مجروح عزت و اخلاق کا انتقام لینے والے انسان کی حیثیت سے خود کو دُنیا کے سامنے پیش کرو اور میرے لئے موت کا فتویٰ صادر کر دو۔ صرف ایک اتفاقی امر نے میری جان بچا دی ورنہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہوتا

مجسمہ۔ دُنیا کی نظر میں مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا فرزان۔ کرۂ ارض پر یہ معاملات اسی طرح طے ہوتے ہیں۔ میں کوئی سماجی مصلح نہیں تھا۔ میں تو ہمیشہ وہی کرتا تھا جس کی توقع سماج میں ایک شریف انسان سے کی جاتی ہے

فرزان — یہ چیز مجھ پر تمھارے حملہ کو جایز بنا سکتی ہے لیکن تم نے بعدہٗ ایک مجسمہ کی حیثیت سے جو نفرت انگیز منافقت اختیار کی اس کا جواز نہیں بن سکتی۔

مجسمہ — یہ سب کچھ میرے جنت میں جانے کی وجہ سے ہوا

ابلیس — یہ بات میں اب تک سمجھنے سے قاصر ہوں فرزان کہ تمھاری اور کپتان صاحب کی ارضی زندگی کے یہ تمام واقعات اُس فطرۂ زندگی کی تحقیر و تردید کیسے کرتے ہیں جو کہ میں رکھتا ہوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہاں جہنم میں تمھیں وہ سب کچھ نصیب ہے جس کی تمھیں تلاش تھی اور وہ تمام چیزیں یہاں معدوم ہیں جن سے تم احتراز کرتے تھے

فرزان — اسکے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ یہاں مجھے ہر وہ شے نصیب ہے جو دُنیا میں مایوس کن ثابت ہوئی اور اس میں وہ تمام اجزاء موجود ہیں جن کو میں پیشتر ہی آزمایش و تجربہ کرکے ناکافی و ناکمل پا چکا ہوں۔ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ جب تک مجھے کسی ایسے وجود کے تصور کی اہلیت نصیب ہے جو خود مجھسے بہتر و اعلیٰ ہو اُس وقت تک مجھے اگر واقعی سکون و راحت مل سکتی ہے تو صرف اس چیز میں کہ میں اس تخئیلی وجود کو زندگی عطا کرنے کی کوشش کرتا رہوں یا اس کے واسطے راستہ صاف کرتا رہوں۔ یہی میری زندگی کا قانون ہے۔ یہی میرے اندر زندگی کی وہ مسلسل جدوجہد ہے جو وہ ایک بلند تر نظام۔ ایک وسیع تر عمیق تر اور شدید تر شعور نفسی اور ایک واضح تر ادراک خودی کے حصول کے لئے ہمیشہ سے کرتی آئی ہے — یہ اسی مقصد کی بلندی و فوقیت تھی جس نے میرے نزدیک محبّت کو محض ایک لمحی نشاط — فنون لطیفہ کو محض تربیت صلاحیت کے ذرایع اور مذہب کو محض ایک عذر تساہل و تعطّل میں تبدیل کردیا کیونکہ مذہب نے ایک ایسے خدا کا تصور مجھے عطا کیا جو دُنیا کو دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ دنیا اچھی ہے حالانکہ میری جبلت میری آنکھوں کے ذریعہ اسی دنیا کو دیکھتی تھی اور محسوس کرتی تھی کہ دنیا میں اصلاح کی گنجایش باقی ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ خود اپنی ذاتی مسرت۔ ذاتی صحت اور ذاتی دولت کے حصول کی جدوجہد میں مجھے کبھی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ مجھے جس شے نے "عورت" کے حوالہ کر دیا وہ عورت کی محبت نہ تھی بلکہ وہ خود میری خستگی و پژمردگی تھی۔ عالم طفولیت میں اگر میں کسی پتھر سے ٹکرا کر اپنے سر کو مجروح کرلیتا تھا تو میں قریب ترین عورت کے پاس دوڑتا ہوا جاتا تھا اور اس کے دامن پر سر رکھ کر اپنی تکلیف کو اپنی آہ و بکا پر صرف کر دیتا تھا۔ جب میں پختہ سن و سال کو پہونچا اور میری روح آن بیدردیوں اور حماقتوں سے ٹکرا کر مجروح ہوگئی جن کے خلاف میں جدوجہد کر رہا تھا تو میں نے بالکل وہی پھر ایک بار کیا جو کہ بچپن کے زمانہ میں کرچکا تھا۔ پھر اس میں شک نہیں کہ میں نے اس طرح اپنی آرام و راحت۔ تفریحات۔ اوقات فرصت اور جدوجہد کے بعد اس شدید ترین خستگی و افتادگی میں کافی لطف و کیف حاصل کیا لیکن درحقیقت میں مغربی تہذیب کے اس تمام سامان نشاط و تفریح سے بہتر اس اطالوی شاعر کے جہنم کو سمجھتا ہوں جسے تم بیوقوف قرار دے چکے ہو اور یہی وہ شے ہے جس نے تمھارے اس موجودہ جہنم کو۔۔ اس ابدی نشاط کدہ کو میرے واسطے اس قدر مہلک و تباہ کن بنا دیا ہے۔ یہی وہ جبلت ہے جس کے فقدان نے تمھیں اس عجیب عفریت کی شکل دیدی جسے ابلیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تم نے لوگوں کو ان کے ان حقیقی مقاصد سے جو کسی نہ کسی حد تک خود میرے مقصد حیات کے مانند تھے بڑی کامیابی کے ساتھ منحرف کرکے خود اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور تمھاری یہی وہ کامیابی ہے جس نے تمھیں "ترغیب دہندہ" کا لقب عطا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ارادہ و مقصد کے مطابق عمل کرنے کے بجائے تمھارے ارادہ و مقصد کے لئے کار فرما ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہو کہ تمھارے فقدان مقصد کے ساتھ بہتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سب لوگ بےچین و بےآرام — مضطرب و بدمزہ اور مصیبت زدہ ہیں اور اُن کی زندگی یکسر باطل اور تصنع آمیز ہے

ابلیس ــــ (مجروح احساس کے ساتھ) فرزانؔ صاحب ــــ آپ میرے دوستوں کے ساتھ بد اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں!

فرزان (اظہار نفرت کے ساتھ) میں اُن کے یا تمہارے ساتھ اخلاق کا برتاؤ کیوں کروں؟ دروغ و کذب کے اس محل میں جو دروغ کہلاتا ہو میری زبان سے نکلنے والی ایک یا دو سچی باتیں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہونچائیں گی۔ تمھارے دوستوں سے زیادہ بیوقوف کتے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ تمھارے دوست حسین و دلکش نہیں بلکہ محض مزین و مرصع ہیں ـــ وہ پاک و صاف نہیں بلکہ سطحی طور پر صاف بنے ہوئے ہیں ـــ وہ شاندار و پُر سطوت نہیں بلکہ محض خوش قطع لباس میں ملبوس ہیں ــــ وہ تعلیم یافتہ نہیں بلکہ محض تعلیمی اداروں میں سے گزرنے والے راہرو ہیں ــــ وہ مذہبی انسان نہیں بلکہ مذہبی نشستوں کے مالک ہیں ــــ وہ پاکیزہ اخلاق کے حامل نہیں بلکہ صرف روایت پرست ہیں ــــ وہ نیک سرشت نہیں بلکہ محض بزدل ہیں ــــ وہ تو بد سرشت بھی نہیں بلکہ محض "کمزور" ہیں ــــ وہ فن کار نہیں بلکہ صرف ہوس پرست ہیں ــــ وہ خوش حال نہیں بلکہ صرف دولتمند ہیں ــــ وہ وفادار نہیں بلکہ محض غلامی پسند ہیں ــــ فرض شناس نہیں بلکہ محض ایک بھیڑ کی طرح مطیع ــــ فلاح عام کے جذبہ کے مالک نہیں بلکہ صرف وطن پرست ــــ جری و باہمت نہیں بلکہ محض افتراق پسند ــــ صاحب عزم و استقلال نہیں بلکہ صرف ضدی ــــ بارعب و پُر وقار نہیں بلکہ صرف جابر ــــ اپنے جذبات و خواہشات پر قادر نہیں بلکہ کند و بیمار جذبات کے مالک ــــ غیرت مند نہیں بلکہ صرف مغرور ــــ مہربان و ہمدرد نہیں بلکہ محض جذباتی ــــ ملنسار نہیں بلکہ محض جانوروں کی طرح گروہ پسند ــــ دوسروں کے جذبات کے پاسدار نہیں بلکہ محض شائستہ ــــ ذہین نہیں بلکہ صرف خود رائے ــــ ترقی پسند نہیں بلکہ صرف ذاتی ترقی کے تلاشی و خود غرض ــــ قوتِ تخئیل و تصور کے مالک نہیں بلکہ محض اوہام پرست ــــ انصاف پسند نہیں بلکہ محض انتقام پسند ــــ فیاض نہیں بلکہ صرف چاپلوس ــــ نظم و قواعد کے پیرو کار نہیں بلکہ محض خوف زدہ ــــ اور صداقت تو اُن میں ہے ہی نہیں ــــ ان میں سے ہر ایک شخص جھوٹا ہے جس کے رگ و ریشہ میں جھوٹ سرایت کر چکا ہے

مجسمہ ــــ تمھارے الفاظ کی روانی تو بڑی حیرتناک ہے فرزانؔ! ــــ کاش میں بھی اپنے سپاہیوں سے اسی طرح باتیں کر سکتا!

ابلیس ــــ لیکن یہ صرف باتیں ہی ہیں ــــ یہی سب کچھ پہلے بھی کہا جا چکا ہے لیکن کیا کبھی اس نے کوئی انقلاب پیدا کیا؟ کیا دُنیا نے کبھی ان باتوں پر توجہ دی؟

فرزان ــــ بیشک یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ لیکن سوچو کہ آخر یہ صرف باتیں ہی کیوں ہیں؟ ــــ صرف اس لئے میرے دوست کہ حسن و جمال۔ پاکیزگی عزت و شرافت۔ مذہب۔ اخلاقیات۔ فن۔ حبِ وطن۔ شجاعت اور اسی نوعیت کی باقی سب چیزیں محض الفاظ ہیں جن کو ہم یا تم ایک دستانہ کی طرح جب چاہیں سیدھا اُلٹا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں حقیقت ہوتیں تو جو الزامات میں نے تم پر عاید کئے ہیں اُن کا تم کو اعتراف کرنا پڑتا ــــ لیکن میرے ابلیس دوست یہ تمھارے وقار و عزت کی خوش قسمتی ہے کہ یہ چیزیں حقایق نہیں ہیں۔ بقول تمھارے یہ سب محض الفاظ ہیں جن کے ذریعہ وحشی لوگوں کو بیوقوف بنا کر تہذیب اختیار کرنے پر مایل کیا جا سکتا ہے اور مہذب مفلسوں کو فریب دیکر غارت گری و غلامی پر صابر و شاکر رکھا جا سکتا ہے۔ حکمراں طبقہ کا یہی سربستہ و نسلی راز ہے۔ ہم لوگ جو ایک ایسے ہی طبقے سے متعلق ہیں اگر خود اپنی مصیبت زدہ زندگی کے لئے زیادہ قوت و عشرت کے حصول کی جد و جہد کے بجائے ساری دُنیا کو زیادہ زندگی دینے کی کوشش کرتے تو یہی راز ہم کو ایک بلند مرتبہ عظیم قوم بنا دیتا۔ اب چونکہ میں خود ایک بلند مرتبہ و عالی طبقہ کا فرد ہونے کی وجہ سے اس راز سے واقف ہوں اس لئے ذرا تصور کرو کہ اخلاقی رنگ کاریوں کے متعلق تمھاری یہ منافقانہ و لامتناہی تقریریں میرے لئے کس درجہ مضحکہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں اور ان کے لئے تمھاری اپنی زندگی کی قربانیاں کس قدر غلیظ حد تک تباہ کن ــــ اگر تم اپنے اخلاقی کھیل پر صرف اتنا یقین و ایمان رکھتے کہ اسے دیانت کے ساتھ کھیل سکتے تو اس حالت میں بھی اس کا تماشا دلچسپ ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم ایسا بھی نہیں کرتے۔ تم ہر قدم پر دھوکہ دیتے ہو اور جب تمھارا حریف اس فریب کاری میں تم پر سبقت لیجاتا ہے

تو تم کھیل کو درہم برہم کر دیتے ہو اور اسے قتل کرنے کی کوشش کرتے ہو

یس —— کرۂ ارض پر ممکن ہے کہ ان باتوں میں کچھ صداقت ہو کیونکہ وہاں لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں اور میرے مذہب حُسن و محبت کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے ـــ لیکن یہاں - - - - - -

زان —— ہاں، ہاں - میں خوب واقف ہوں - یہاں محبت اور حُسن کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں —— اُف ! — یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی تماشائی ایک رسمی ڈرامہ کے صرف پہلے ایکٹ کو ہی ابداً آباد تک دیکھتا رہے اور ڈرامہ کی پیچیدگیاں کبھی شروع نہ ہوں !—— اوہام پرستانہ دہشت و خوف کے بد ترین لمحات میں بھی مجھے کبھی یہ تصور نہیں آیا کہ جہنم اس درجہ خوفناک مقام ہو سکتا ہے - یہاں میری زندگی ایک مشاطہ کی طرح حُسن کے مسلسل فکر و خیال میں اور ریشمی زلفوں سے کھیلتے ہوئے گزرتی ہے - میں ایک شیرینی فروش کے ملازم کی طرح مسلسل طور پر ایک شیریں فضا میں سانس لیتا ہوں ــ کپتان صاحب ! کیا جنت میں کچھ حسین عورتیں ہیں ؟

تمہ —— کوئی نہیں ــ قطعی نہیں —— سب کی سب بدہیبت و بدقطع ہیں - درجنوں عورتوں کو دیکھ جائیے تو ان کے پاس چند پیسوں کے زیورات نہ ملیں گے ــ اُنھیں زیادہ صحیح طور پر پچاس سالہ مرد قرار دیا جا سکتا ہے !

زان —— میں وہاں جانے کے لئے بیتاب ہوں - کیا وہاں لفظ "حسن" کبھی سننے میں آتا ہے —— اور کیا وہاں کچھ فن کار لوگ موجود ہیں ؟

بتمہ — یقین کرو کہ اگر ایک بہترین مجسمہ جنت کے باشندوں کے قریب سے ٹہلتا ہوا بھی گزر جائے تو اس وقت بھی وہ لوگ اس کی تعریف نہیں کریں گے

زان —— تو میں جاتا ہوں

بلیس —— فرزان - کیا میں بے تکلفی سے کچھ کہوں ؟

رزان —— تو کیا اس سے پیشتر تم بے تکلفی سے بہت کچھ نہیں کہہ چکے ؟

بلیس —— جو کچھ میں نے کہا وہ بے شک بے تکلفی سے کہا تھا لیکن اب میں کچھ اور آگے کہنا چاہتا ہوں اور تمھارے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ انسان ہر چیز سے اُکتا جاتا ہے - وہ جنت سے بھی اسی طرح گھبرا جاتا ہے جس طرح کہ دوزخ سے - اور انسان کی تمام تاریخ ان ہی دو انتہاؤں کے درمیان مسلسل تغیر و تبدل کی روداد ہے - ہر ایک زمانہ گھڑی کے پنڈولم کی ایک حرکت ہے - اور ہر ایک نسل انسانی صرف یہ دیکھ کر کہ دنیا بھی ہمہ وقت حرکت میں ہے یہ خیال کرتی ہے کہ دُنیا آگے بڑھ رہی ہے - لیکن جب تم اس قدر عمر کو پہونچو گے جتنی کہ میں رکھتا ہوں —— جب تم جنت سے ہزاروں مرتبہ اسی قدر اُکتا چکو گے جتنا کہ میں یا کپتان صاحب بھگت چکے ہیں —— اور جب تم ہزاروں مرتبہ جہنم سے بھی اسی قدر اُکتا جاؤ گے جیسے کہ اب نظر آتے ہو تو اس وقت تم اس فریب خیال میں مبتلا نہ ہو سکو گے کہ جنت سے جہنم کی طرف انسان کی ہر ایک زقند ایک نجات اور جہنم سے جنت کی طرف ہر انسانی سعی و حرکت ایک ارتقائی اقدام ہے - جس جگہ تمھیں اب اصلاح - ترقی - صعودی رجحان کی تکمیل و تسکین اور انسان کی وہ مسلسل جد و جہد نظر آتی ہے جو وہ خود اپنی مردہ زندگیوں کے زینے پر بلند تر مقامات تک چڑھ جانے کے لئے کرتا آیا ہے اُس جگہ تمھیں اگر کوئی شے ملے گی تو صرف ایک لامحدود فریب خیال و نظر - تمھیں اُسوقت اس قول کی تصدیق ہو جائے گی کہ دُنیا میں کوئی شے نئی نہیں - - - - - - - -

فرزان —— (بالکل بے تاب ہو کر) بخدا تمھارے یہ الفاظ تو اُس منافقانہ تقریر سے بھی خراب ہیں جو تم نے حُسن و محبت کی شان میں کی ہے - بڑے چالاک ہو تم !—— اگر انسان ہر چیز سے سیر ہو کر اُکتا جاتا ہے تو کیا محض اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان ایک کیڑے سے برتر نہیں یا ایک کتا ایک بھیڑئے سے بہتر نہیں ؟ — کیا انسان ایک کیڑے سے برتر نہیں یا ایک کتا ایک بھیڑئے سے بہتر نہیں ؟ - کیا انسان محض اس وجہ سے غذا کھانا ترک کر دے کہ وہ اپنی بھوک کو تسکین دینے کی کوشش میں اس بھوک کو تباہ کر لیتا ہے ؟ اگر ایک کھیت غیر مزروعہ پڑا ہوا ہے تو کیا اس کی مخفی قوت بالکل بے عمل رہتی ہے ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے کپتان صاحب یہاں اپنی جہنمی قوت

کو صرف کریں اور آیندہ مبارک فردوسی کے زمانے کے لئے فردوسی قوت اُن کے اندر مجتمع نہ ہو جائے ؟ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہماری عظیم "قوتِ حیات" نے اپنے مقصد کے لئے گھڑی کے موجود والی پنڈولم کی تدبیر اختیار کی ہے اور یہ کرۂ ارض اس پنڈولم میں لٹکا ہوا وزنی گولا ہے "قوتِ حیات" اس طرح ایک زبردست پنڈولم کی طرح کرۂ ارض کو لئے ہوئے ایک حد سے دوسری حد تک بار بار حرکت کرتی رہی ہے۔ اس پنڈولم کی ہر ایک حرکت کی تاریخ ہم انسانوں کو جو کہ اس تاریخی تمثیل کے اداکار ہیں بالکل نئی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخ اس پنڈولم کی سابقہ حرکت کی پُرانی تاریخ ہے جو اب دہرائی جا رہی ہے ــــ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جس طرح کسی سرکس کا بازیگر ایک گیند کو بار بار اُچھال کر دبوچ لیتا ہے اسی طرح وقت کی ناقابلِ قیاس لانہایت وسعتوں میں سورج ہزاروں مرتبہ زمین کو پھینکتا رہا اور پھر دبوچتا رہا ہے اور ہمارے طول طویل زمانے اس پھینکنے اور دبوچنے کے درمیان واقع ہونے والے محض لمحات ہیں۔ لیکن کیا اس عفریتانہ نظام کے پس پشت کوئی مقصد کارفرما نہیں ؟

ابلیس ــــ کوئی بھی مقصد نہیں میرے دوست ــــ تم سوچتے ہو کہ چونکہ تم ایک مقصد رکھتے ہو اس لئے فطرت کا بھی کوئی مقصد ضرور ہوگا ــــ حالانکہ یہ سوچنا تو ایسا ہی ہوگا جیسے تم یہ کہو کہ چونکہ تم ہاتھ پاؤں میں اُنگلیاں رکھتے ہو اس لئے فطرت کو بھی ایسی ہی اُنگلیاں حاصل ہونی ضروری ہیں۔

فرزان ــــ لیکن اگر ان اُنگلیوں کا کوئی مقصد نہ ہوتا تو یہ کبھی مجھے نہ ملتیں ــــ اور میرے دوست میں فطرت کا بالکل ایسا ہی ایک حصہ ہوں جیسا کہ میری اُنگلی میرا ایک حصہ ہے۔ اگر میری اُنگلیاں ایک ایسا آلہ ہیں جس کے ذریعہ میں شمشیر و رباب کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہوں تو یقیناً میرا دماغ ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ قدرت خود اپنی ذات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ میرے کتے کا دماغ صرف میرے کتے کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے لیکن میرا دماغ ایک ایسے علم کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے جو ذاتی طور پر میرے واسطے کچھ کرنے کے بجائے میرے جسم کو میرے لئے تکلیف دہ بنا دیتا ہے اور انحطاط و موت کو میرے واسطے ایک تباہی کی شکل دیتا ہے ــــ اگر میرا مقصد میری ذات سے ماورا نہ ہوتا تو میں ایک فلسفی کے بجائے ایک کسان بننے کو ترجیح دیتا ــــ کیونکہ ــــ کسان اتنی ہی مدت زندہ رہتا ہے جتنا کہ ایک فلسفی ــــ بلکہ یوں کہو کہ وہ فلسفی سے زیادہ ہی عمر پاتا ہے ــــ زیادہ کھاتا ہے ــــ بہتر نیند سوتا ہے اور اپنی شریک حیات کے آغوشِ محبت سے کسبِ کیف و مسرت کرنے میں اس کا دماغ فلسفی کی طرح شکوک و شبہات سے منغص نہیں ہوتا۔ فلسفی اس قدر مختلف کیوں ہے ؟ ۔ صرف اس لئے کہ وہ "قوتِ حیات" کی گرفت میں ہے ! ــــ یہ "قوتِ حیات" اس سے کہتی ہے "میں زندہ رہنے کے صرف ارادہ کے ذریعہ اور قلیل ترین دشواری کے راستوں کو اختیار کرکے غیر شعوری طور پر ہزاروں حیرتناک کارنامے کر چکی ہوں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ خود اپنی حقیقت اور اپنی منزلِ مقصود کو معلوم کروں اور اپنا راستہ انتخاب کروں۔ اسی مقصد کے لئے میں نے ایک خاص دماغ تخلیق کیا ہے ــــ ایک فلسفی کا دماغ ــــ تاکہ یہ فلسفی میرے لئے اس عرفانِ ذات پر اسی طرح گرفت حاصل کرے جیسے کہ ایک کسان میرے واسطے اپنے ہل کو گرفت میں لے لیتا ہے ــــ اور یہ وہ کام ہے اے فلسفی جس کے لئے تجھے جد و جہد کرنا ہی ہوگی اُس وقت تک کہ تو مر جائے ! ــــ تیری موت کے بعد اس کام کو جاری رکھنے کے لئے میں ایک اور دماغ اور ایک اور فلسفی بناؤں گی"۔

ابلیس ــــ لیکن اس عرفان و علم سے فایدہ ہی کیا ؟

فرزان ــــ فایدہ یہ ہے کہ قلیل ترین دشواری کی سمت جھکنے کے بجائے کثیر ترین مفاد کے راستے کو انتخاب کرنے کی اہلیت نصیب ہو جائے کیا ایک جہاز کا اپنی مقررہ و متعین منزل کی طرف رواں ہونا ایک اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے لکڑی کے تختے سے بہتر نہیں ہے ؟ ۔ فلسفی فطرت کے جہاز کا رہنما ہے ــــ اور یہی وہ فرق ہے جو مجھ میں اور تم میں حایل ہے ــــ دوزخ میں رہنا لکڑی کے تختے کی طرح بھٹکنا ہے۔ اور جنت میں رہنا ایک جہاز کی طرح خود راستہ پیدا کرنا"۔

ابلیس ـــ لیکن یہ راستہ اغلب یہ ہے کہ جہاز کو چٹانوں کی طرف لیجائے گا۔

فرزان ـــ چٹانوں کی طرف یا سمندر کی تہہ میں کونسا جہاز زیادہ ترجاتا ہے ؟ ـــ بھٹکنے والا جہاز یا وہ جہاز جس پر ایک رہنما موجود ہے ؟

ابلیس ـــ اچھا اچھا ! ـــ آپ اپنے راستہ پر بڑھے چلے جائیے فرزان صاحب ! ـــ میں تو اپنی ذات پر خود اپنا اختیار قایم رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں اور کسی غلط کار کائناتی قوت کا آلہ کار بننا پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ حُسن لگا ہوں کی مسرت ہے۔ موسیقی سماعت کا سرور ہے۔ محبّت احساس کی جنت ہے اور یہ تمام چیزیں ہمارے خیالات و الفاظ کے واسطے ایک دلچسپ مواد مہیا کرتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان احساسات۔ ان جذبات اور ان مشاغل میں منہمک ہونے سے ہی ایک ہستی پاکیزہ مذاق اور شستہ و مہذب کہلا سکتی ہے۔ کرۂ ارض پر معابد کے اندر مجھے لوگ خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہیں میں جانتا ہوں کہ اعلیٰ سوسائٹی کے اندر تمام دنیا میں "شہزادۂ ظلمت" کو ایک شریف و معزز شخصیت سمجھا جاتا ہے ـــ اور میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ رہا تمھاری اس "قوت حیات" کی بابت جسے تم بےپناہ اور ناقابل مزاحمت خیال کرتے ہو تو واقعہ یہ ہے کہ میرے خیال میں ہر ایک معمولی کردار کے انسان کے لئے یہ قوت دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل مزاحمت چیز ہے۔ لیکن اگر تم ایسے ہی پست مذاق اور سریع الاعتقاد ہو جیسا کہ دنیا کے تمام مصلحین ہوتے ہیں تو اس صورت میں یہ "قوت حیات" پہلے تو تمھیں کسی مذہب کے حدود میں ڈھکیلتی ہوئی لیجائے گی جہاں تم شیرخوار بچّوں کی روح کو ٹھیسے بچانے کے لئے اُن پر مقدس پانی چھڑکو گے ـــ اس کے بعد یہ قوت تمھیں مذہب کی طرف سے ہانکتی ہوئی سائنس کی طرف لیجائے گی جہاں تم شیرخوار بچّوں کو مقدس پانی کے چھینٹوں سے دور کھینچ کر لیجاؤ گے اور اُن کے جسم میں ٹیکہ کی شکل میں بیماری کے جراثیم صرف اس لئے داخل کرو گے کہ یہ بیماری اُن کو محض اتفاقیہ نہ لگ جائے ـــ اس کے بعد تم سیاسیات میں داخل ہو گے جہاں تم بداخلاق عاملین کے آلۂ کار اور بلند حوصلہ فریب کار کھوکھلی شخصیتوں کے دست راست بن جاؤ گے ـــ اور اس سب کا انجام ہو گا مایوسی اور اپاہج بڑھاپا ـــ مفلوج قوت اور شکستہ امیدیں ـــ شدید پشیمانی و افسوس دنیا کی بدترین اور احمق ترین بربادی و قربانی پر ـــ یعنی اہلیت خطا اور زندگی کی بربادی و قربانی ! ـــ یا مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "عمدہ شے" پر قابو پانے سے پہلے "عمدہ تر شے" کے تعاقب میں دوڑ جانے والے احمق کو جو سزا ملنی چاہئے وہ تمھارا حصہ ہو گی۔

فرزان ـــ لیکن کم از کم میں کوفت سے تو محفوظ رہوں گا۔ "قوت حیات" کی خدمت کرنے میں اس قدر فایدہ تو بہرحال ہوتا ہی ہے ـــ اس لئے الوداع ابلیس صاحب !

ابلیس ـــ (نرمی سے) الوداع فرزان ! ـــ مجھے اکثر وہ دلچسپ گفتگو یاد آیا کرے گی جو تم عام امور کی بابت کرتے رہے ہو۔ میری تمنا ہے کہ تم ہر ایک مسرت سے بہرور ہو سکو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے جنّت کچھ لوگوں کو راس بھی آجاتی ہے۔ لیکن اگر کبھی تمھاری لئے تبدیل ہو جائے تو اسے یاد رکھو کہ تائب مغرورین کے لئے یہاں دوزخ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت بھی تمھیں اپنے اندر ایسی چیزوں کا احساس ہو جیسے گرمی قلب۔ پرخلوص بے اختیار محبّت۔ معصوم خطا اندوزی۔ اور گرم دھڑکتی ہوئی اور سانس لیتی ہوئی حقیقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فرزان ـــ یعنی مختصر یہ کہ گوشت و پوست ! ـــ ان تمام الفاظ کے بجائے صرف گوشت و پوست کیوں نہ کہا جائے " واقعہ ہے کہ ہم ان دونوں عامیانہ گندی چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ؟

ابلیس ـــ (غصہ سے) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تمھیں واپسی کی دعوت جو دے رہا ہوں اُسے تم واپس میرے منھ پر پھینکنا چاہتے ہو ؟

فرزان ـــ ہرگز نہیں ـــ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر ابلیس محض ایک قنوطی شخصیت کا مالک یا ایک سائنٹفک ہو تو میں اُس سے بہت کچھ استفادہ کے لئے طیار ہوں مگر ایک جذباتی ابلیس کا وجود میری سمجھ میں نہیں آتا ـــ کپتان صاحب ! آپ دوزخ و جنّت کی سرحد کا راستہ جانتے ہیں۔ براہ کرم میری رہنمائی کیجئے۔

مجسمہ ـــ دوزخ و جنت کی سرحد! ـــ یہ سرحد تو صرف وہ فرق ہے جو دنیا کے متعلق دو زاویہ ہائے نظر کے درمیان پایا جاتا ہے ـ اگر تم درحقیقت وہاں جانا چاہتے ہو تو کوئی بھی راستہ تمھیں سرحد کے پار لیجا سکتا ہے

فرزان ـــ بہت خوب! (سارہ کو سلام کرتے ہوئے) محترمہ! ـــ آپ کا خادم......

سارہ ـــ لیکن میں تو تمھارے ساتھ جاؤں گی

فرزان ـــ جنت کے لئے میں صرف اپنا راستہ پاسکتا ہوں سارہ! ـــ تمھارا نہیں ـ (غائب ہو جاتا ہے)

سارہ ـــ اُف! ـ کس قدر پریشان کن ہے یہ معاملہ!

مجسمہ ـــ (فرزان کی سمت پکارتے ہوئے) سفر مبارک فرزان! ـ (وداعی سلام کے طور پر ساز کی ایک زبردست جھنکار پیدا کرتا ہے جسکے جواب میں دور سے پہلے جیسا روحانی نغمہ بہتا آتا ہے) ـــ آہ! ـــ وہ جارہا ہے فرزان!! (اپنے ہونٹوں سے ایک طویل سانس باہر نکالتے ہوئے) کیسی دلکش باتیں کرتا ہے وہ! ـــ جنت کے لوگ اس کی گفتگو کو کبھی نہ سمجھ سکیں گے

ابلیس ـــ (مایوسی سے) ـ اُس کا جانا ہماری ایک سیاسی شکست ہے ـ میں ان "پرستاران حیات" کو روک نہیں سکتا ـ وہ سب کے سب یہاں سے چلے ہی جاتے ہیں آخرکار! ـــ فرزان کا چلا جانا ہمارا سب سے بڑا نقصان ہے ـ تقریباً ایسا ہی نقصان اُسوقت ہوا تھا جبکہ وہ دلنوازی مصور یہاں سے فرار ہوگیا تھا ـ وہ بھی عجیب مصور تھا ـ اُسے ستر سال کی ایک چڑیل ضعیفہ کی تصویر بنانے میں بھی ایسا ہی لطف ملتا تھا جیسا کہ ایک بیس سالہ ملکہ حسن کی!

مجسمہ ـــ ہاں مجھے یاد ہے ـ وہ جنت میں آیا تھا ـــ اس کا نام ریمبرانٹ تھا ـ

ابلیس ـــ ہاں ریمبرانٹ! ـــ ان لوگوں میں کچھ عجیب ایک غیر فطری رنگ پایا جاتا ہے ـ ان کے اعتقادات کی داستان کو کبھی نہ سننا کپتان صاحب! وہ بڑی خطرناک ہے! ـــ فوق الانسانی انسانوں کے مشاغل سے خبردار رہئے! ـــ یہ مشاغل خالص انسان سے ایک ذہنی نفرت کرنے کا سبق پڑھاتے ہیں ـ ایک معمولی خالص انسان کے نزدیک گھوڑے ـ کتے ـ اور بلیاں محض حیوانات کی قسمیں ہیں جو اخلاقی دُنیا کے احاطے سے خارج ہیں ـ لیکن ایک "فوق الانسانی انسان" کے نزدیک مرد اور عورتیں بھی محض حیوانات کی قسمیں ہیں اور یہ بھی اخلاقی دنیا کے احاطہ سے خارج ہیں ـ یہی فرزان اپنی دُنیا میں عورتوں پر مہربان تھا اور مردوں سے خوش اطواری سے پیش آتا تھا لیکن اس کی یہ مہربانی بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ تمھاری یہ لڑکی سارہ اپنی پالتو بلیوں اور کتوں کے لئے روا رکھتی ہے ـــ یہ مہربانی تو ضرور ہے لیکن اس سے خالص انسانی روح کی خصوصیات کی تردید ہوتی ہے ـ

مجسمہ ـــ مگر یہ "فوق الانسانی انسان" آخر کیا بلا ہے؟

ابلیس ـــ یہ "قوت حیات" کے دیوانوں کی تازہ ترین اُپج ہے ـ کیا جنت میں نوواردوں کے درمیان تمھیں پولینڈ کا وہ جرمن نسل پاگل باشندہ نہیں ملا؟ ـــ اس کا کیا نام تھا؟ ـــ ہاں ـــ نطشے!

مجسمہ ـــ میں نے کبھی اس کا نام نہیں سُنا ـ

ابلیس ـــ اپنے ہوش و حواس کی بحالی سے پیشتر وہ سب سے پہلے اسی جگہ آیا تھا ـ مجھے اس کی ذات سے کچھ توقعات تھیں لیکن وہ "قوت حیات" کا ایک راسخ پرستار تھا ـ اگرچہ "فوق البشر انسان" اسی قدر قدیم چیز ہے جتنا کہ پرامتھیس لیکن یہ نطشے ہی تھا جس نے اس گڑے مردے کو اکھاڑ کر کھڑا کر دیا اور اب یہ بیسویں صدی جب دُنیا سے ـ گوشت و پوست سے اور مجھ کمترین خادم سے اُکتا جائے گی تو قدیم محبوب حماقتوں میں سے جدید ترین حماقت و خبط کے پیچھے دوڑنا شروع کر دے گی ـ

مجسمہ ـــ "فوق البشر انسان" ایک اچھا نعرہ ہے ـــ اور ایک اچھا نعرہ نصف جنگی فتح کے مساوی ہوتا ہے ـ میں اس نطشے سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں ـ

ابلیس — بدقسمتی ہے کہ اُس کی ملاقات یہاں ویگنر سے ہوگئی اور ویگنر سے اُس کا جھگڑا ہوگیا

مجسّمہ — ایسا ہوا تو بالکل ٹھیک ہی ہوا۔ میں خود بھی موزارٹ کو پسند کرتا ہوں

ابلیس — نہیں — یہ جھگڑا موسیقی سے متعلق نہ تھا۔ ایکبار ویگنر کسی طرح بہک کر "قوت حیات" کی پرستش میں مبتلا ہوگیا اور اس نے ایک "فوق البشر انسان" ایجاد کر ڈالا جو سیگفریڈ کہلاتا تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد ہی ویگنر کو ہوش آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نطشے اور ویگنر کی ملاقات یہاں ہوئی تو نطشے نے ویگنر کو مرتد قرار دیکر تحقیر کی۔ ویگنر نے جواباً ایک مختصر رسالہ لکھا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نطشے ایک یہودی تھا۔ اس تمام جھگڑے کا انجام یہ ہوا کہ نطشے طیش میں آکر جنّت میں چلا گیا — پھر اس کا چلا جانا بہتر ہی ہوا — خس کم جہاں پاک — اچھا محترم دوست! آیئے اب ہم دونوں بعجلت قصر طاغوت میں پہونچ جائیں تاکہ وہاں ایک شاندار ضیافت موسیقی کے ذریعہ آپ کی آمد کی تقریب منائی جائے

مجسّمہ — بسر و چشم! — بڑے مہربان ہیں آپ!

ابلیس — اس راستے سے آیئے کپتان صاحب! — ہمیں قدیم وروایتی تختہ گور پر بیٹھ کر نیچے جانا ہوگا۔ (ابلیس تختہ گور پر آجاتا ہے)

مجسّمہ — خوب! — (متفکرانہ انداز میں) بہرحال یہ "فوق البشر انسان" ایک عمدہ تصور ضرور ہے۔ اس میں ایک مجسّمہ کا حسن و وقار پایا جاتا ہے۔ (وہ ابلیس کے قریب خود بھی تختہ پر آجاتا ہے۔ تختہ آہستہ آہستہ نیچے اُترنا شروع ہوتا ہے۔ نیچے جہنّم کے غار سے سُرخ روشنی نمودار ہوتی ہے) — اوہو! — اس چیز نے تو مجھے پرانا زمانہ یاد دلادیا!

ابلیس — اور مجھے بھی!

سارہ — ٹھہرئیے! — (تختہ رک جاتا ہے)

ابلیس — محترمہ! آپ اس راستے سے نہیں آسکتیں۔ اس مقصد کے لئے آپ کو پہلے ایک "دیوی" میں تبدیل ہونا پڑے گا۔ لیکن آپ ہم سے بھی پہلے ہی اس قصر میں پہونچ جائیں گی

سارہ — تمہیں روکنے سے میرا یہ مقصد تھا۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ "فوق البشر انسان" مجھے کہاں مل سکتا ہے؟

ابلیس — وہ تو ابھی پیدا نہیں ہوا محترمہ!

مجسّمہ — اور نہ کبھی پیدا ہوگا غالباً — آیئے اب آگے بڑھیں — اس سرخ آگ کے اثر سے مجھے چھینکیں آنے لگیں گی — (وہ دونوں نشیب میں اُتر جاتے ہیں)

سارہ — وہ ابھی پیدا نہیں ہوا!! — تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام ابھی مکمل نہیں ہوا — (اپنے اوپر دو مرتبہ صلیب کا نشان بناتے ہوئے) میں "حیات مابعد" پر ایمان رکھتی ہوں — (کائنات کو مخاطب کرکے چلّاتے ہوئے) — مجھے ایک "باپ" کی ضرورت ہے! — "فوق البشر انسان" پیدا کرنے کے لئے ایک باپ!!

(وہ خلا میں غائب ہوجاتی ہے — اور ایک بار پھر وہاں کچھ باقی نہیں رہتا۔ حیات کے تمام آثار و مظاہر غیر معیّنہ مدت کے لئے معطّل ہوکر رہ جاتے ہیں — اور پھر موہوم و مبہم طور پر ایک زندہ انسانی آواز نہ جانے کہاں سے اُڑ کر سماعت تک پہونچتی ہے۔ نظر کو ایک استعجاب کے ساتھ کوہسار کی ایک اونچی برجی ایک روشن ترپس منظر پر اُبھرتی محسوس ہوتی ہے۔ آسمان دور سے ہٹ کر قریب واپس آجاتا ہے اور اچانک ہمیں یاد آجاتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔)

مسعود جاوید (بی۔ اے)

آزاد فنکار

آرٹ اور ثقافت کی آزادی کے متعلق اتنے متضاد نظریات اور تصورات پیش کئے گئے ہیں کہ ان مسایل سے متعلق جو بحثیں کی جاتی ہیں وہ جلد ہی سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور ان کا مقصد محض یہ رہ جاتا ہے کہ کسی خاص سیاسی نظرئے کی تائید میں دوسرے تمام سیاسی نظریات کی تنقیص کی جائے اس لئے یہ ضرورت سمجھی گئی کہ آزاد فنکار کی خصوصیات واضح کر دی جائیں۔

وہ کیا چیز ہے جو ایک فنکار کو آرٹ کی خدمت پر اُبھارتی ہے وہ اس کی انانیت ہے، اس کے نظامِ فکری کا ایک فطری زور ہے، اس کی عظیم انفرادیت کا ایک پر جوش اثبات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ کے تمام آزاد شہپارے اپنی خالق کی عظیم شخصیت کا حسین پرتو ہوتے ہیں، پس اگر اسکی انانیت آزاد ہے، اسے پھیلنے پھولنے اور اپنے وجود کا اثبات کرنے کے مواقع میسر ہیں تو اس کا آرٹ بھی آزاد ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظامِ کائنات کو انسانوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ وہ تو بڑا ہی بے درد اور ظالم ہے اس کو شخصیت کے ارتقا سے نہ صرف یہ کہ کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ اس کا سختی سے مزاحم بھی ہوتا ہے۔ شوپنہار اور عمر خیام اس کے آگے سپر ڈالنے ہی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں، کائنات کا زبردست ہاتھ انھیں اُٹھا کر پھینک دے، کچل دے، دبا دے، انھیں کوئی شکوہ نہیں، دن اور رات سے بنی ہوئی شطرنج بچھی ہوئی ہے اور کوئی نامعلوم اور زبردست ہاتھ انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلاتا رہتا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں اس سے مقابلہ کرنا بے سود ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، نظامِ کائنات کو مفتوح کیا جا سکتا ہے، انسان عظیم تر ہے، خواہ کتنی ہی مدت صرف ہو لیکن انسان اسے مغلوب کر کے رہے گا۔ نطشے اسے مغلوب کرنے والی قوت کو جو انسان کے اندر خوابیدہ پڑی رہتی ہے، زورِ زندگی کا نام دیتا ہے۔ یہ زورِ زندگی آزاد فنکاروں کی انانیت کی ارتقائی شکل کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے ایک فنکار اپنی انانیت اور اپنی عظیم انفرادیت کے اظہار پر مجبور ہوتا ہے، یہی اسے آزاد شہپاروں کی تخلیق پر اُبھارتا ہے اور اس طرح کائناتِ مجمل (فنکار کی شخصیت) کائناتِ مفصل سے برسرِ پیکار ہوتی ہے، اور مسلسل کوشش کرتی رہتی ہے کہ اسے محکوم کرلے۔

ایک فنکار کی انانیت جو کبھی پتھروں کو احساس بخشتی ہے، کبھی تصویر کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی شعرِ رنگین کا جامہ پہنتی ہے، کبھی آتشیں تقریر کی صورت میں اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے، کبھی نغمہ فسوں خیز کی خالق ہوتی ہے، ارتقا کے مختلف مدارج نظامِ کائنات اسے تھپکیاں دیکر سلانے کی کوشش کرتا ہے، سیاسی نظریات اس پر زریں کپڑے کی تہیں لپیٹ کر اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارا آزادی کش ماحول اسے کچلنے کی فکر میں لگا رہتا ہے لیکن ان تمام بندشوں اور رکاوٹوں کے باوجود فضائے بسیط میں ایک بے اختیار چیخ بلند ہوتی ہے جو نظامِ کائنات کو ہلا ڈالتی ہے، جو صرف حال پر ہی محیط نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کا بڑا حصہ بھی اس کے اختیار میں آجاتا ہے اور اسی بے اختیارانہ چیخ کو آزاد شہپارے کا نام دیا جاتا ہے۔

آزاد فنکار کی فطری صلاحیتوں کو اُبھرنے سے روکنے والے عناصر میں سب سے پہلے مذہب کی باری آتی ہے۔ مذہب اپنے بلند مفہوم میں، انفرادیت کے اظہار پر کوئی قابلِ اعتراض پابندی نہیں لگاتا۔ اس کی پابندی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ آرٹ کا نمونہ خدا کی حاکمیت سے انکار کا مدعی نہ ہو۔ یہاں تک آزاد فنکار کی شخصیت کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، بلکہ ایک حد تک خدا کی ربوبیت کا صحیح تصورات دوسری زنجیروں میں مقید ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن آج کل جب کہ مذہب رسوم اور خود ساختہ فروعی عقاید کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے، اظہارِ جذبات پر مذہب کے علم بردار بڑی بندشیں لگاتے ہیں۔ ہماری تہذیب اور معاشرت نے کچھ ایسا رجحان اختیار کر لیا ہے، گویا وہ خدائی احکام کی طرح قایم و دایم ہیں، نہ ان میں زیادتی کی گنجایش ہے نہ کمی کی، مروجہ طرزِ معاشرت اور موجودہ تہذیب اپنے خلاف کوئی آواز نہیں سن سکتی،

حالانکہ وہ تہذیب کو زیادہ مکمل اور زیادہ شاندار بنانے کے لئے بلند کی جاتی ہے۔ بہت سے فنکار اسی معاشرتی احتساب کی وجہ سے بہت دھیمے سروں میں الاپتے ہیں ان کے نغمات میں وہ گونج نہیں پیدا ہو پاتی جو آفاق کی پہنائیوں میں پھیل جائے۔

موجودہ سیاسی نظام، جو اقتصادی بنیادوں پر قایم ہونے کی وجہ سے دو خاص گروہوں میں منقسم ہے (یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت انفرادیت کی نمود کو مختلف ڈھنگوں سے روکتا ہے۔ ان ممالک میں جہاں سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے، طرح طرح کی احتسابی قوتیں موجود ہیں جن میں سے کچھ بلا واسطہ کام کرتی ہیں کچھ بالواسطہ۔ تمام ذرایع پیداوار سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے وہی ادیب پنپ سکتا ہے جو بورژوا قدروں کے گیت گائے۔ الغرض معاشرت کے سارے شعبوں میں بورژوائی رجحانات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنکار ان رجحانات کی ترجمانی نہیں کرتا تو لوگ ایک ناگوار تاثر کے ساتھ اس کی تصنیفات کا مطالعہ بند کر دیتے ہیں۔ سرمایہ دار لوگوں کے دماغوں کو سلانے کی خاطر ایسی تصنیفات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو زندگی کے متعلق خوبصورت جھوٹ پیش کریں۔ ادیب اور مصور ایسے ناول اور راگ تصنیف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کی بازار میں مانگ ہو تاکہ اس طرح اپنی مالی حالت درست کر سکیں بصورت دیگر وہ ایسے چھچھورے افسانے اور اشعار، ایسے عامیانہ گیت اور ایسے آزاد آرٹ سے معرا اصنام کی تخلیق کبھی نہ کرتے اس کے علاوہ ایسے ممالک میں براہ راست سنسرشپ کا طریقہ ہوتا ہے اگر کوئی فنکار ایسی تخلیق کرتا ہے جس سے اس کی پرجوش انانیت گردوپیش میں ایسی گونج پیدا کر دے جو سوتے ہوئے عوام کی انفرادیت کو جگا دے تو اس کی تخلیق ضبط کر دی جاتی ہے اور پھر اس کے لئے جیل کے دروازے یا فاقوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

اشتراکی نظام کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ وہ تو ایک پل صراط ہے جو تلوار سے تیز تر تو نہیں، مگر بال سے باریک ضرور ہے۔ اگر کوئی ماضی کے کھنڈروں کی طرف نظرِ محبت ڈالتا ہے تو اس پر رجعت پرستی کا لیبل چپکا دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ اس کے اجداد کی عظمت کے نشان ہیں۔ میں نے ہیلو بزوداکی نظم "کریملین کا انسان" پڑھی۔ ذہنی مرعوبیت اور فکری غلامی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ پتہ نہیں پشکن کو روسیوں نے رجعت پسند کیوں نہیں کہا۔ اس کی آزاد زندگی تو اس سے بھی "بدتر" خطاب کی مستحق تھی۔ اس کے علاوہ طبقاتی تعصب، جو اس نظام کی خصوصیتوں میں سے ایک ہے، ایک فنکار کے آزاد میلانات کو سختی سے کچل دیتا ہے۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک فنکار کی انانیت مختلف ارتقائی مدارج رکھتی ہے۔ چنانچہ مذکورۂ بالا زنجیریں فنکار کو ایسا مقید کر دیتی ہیں کہ مجال دم زدن نہیں رہتی، کسی کو خوابیدہ کر دیتی ہیں۔ پھر کسی فنکار کی انانیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنا اظہار دھیمے سروں میں کرتی ہے، کبھی اس کی لے اتنی بلند اور گونجنے والی ہوتی ہے کہ عوام کی خوابیدہ انانیت جاگنے لگتی ہے۔ ماحول کی مشکلات ان پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ آزاد فنکار یا تو نتائج سے بے پروا ہو کر ان بندشوں کو توڑ دینے کی کوشش کرتا ہے، یا انھیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ موزرٹ نے جونہی آزاد راگ تصنیف کرنے شروع کئے، اس کی آمدنی ختم ہو گئی، وہ سردی کے دنوں میں اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اپنے نفس کو آسودہ کرے، بلکہ اس لئے کہ اپنے جسم میں کام کرنے کے لئے گرمی پیدا کرے اور مصائب کی اسی حالت میں اس نے اپنے مشہور ترین شاہکار تخلیق کئے۔ ۱۸۰۹ء میں جب موت کے فرشتے ہیڈن کے سر پر منڈلا رہے تھے، فرانسیسیوں نے ویانا پر بمباری کی، اس کے نوکر ڈر گئے اور ان کی روحوں پر اضمحلال چھا گیا مگر ہیڈن کی روح جادۂ سکون سے نہ ہٹی۔ موت سے کچھ دیر پہلے اس نے کہا کہ اسے پیانو کے پاس پہونچا دیا جائے، اس کی زرد انگلیاں پیانو پر تیزی سے چلنے لگیں، ایک دھیما سا افسردہ راگ نکلا اور اس نے اپنا شاہکار "آسٹریائی نغمۂ عبادت" بجایا، وہ بجاتا رہا تاکہ اس کی انانیت کی چیخ جنگ کے دھماکوں پر غالب آجائے۔ پھر ایسا نہ ہوا، تین مرتبہ اس نغمے کے بجنے کے بعد موت نے اسے سیاہ پردوں میں چھپا دیا۔ ویانا کے ایک دوسرے کونے میں بیتھوون اپنے کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھا تھا، تاکہ اس کا ذوقِ لطیف بھدی آوازیں سن سن کر مردہ نہ ہو جائے لیکن وہ بہرا ہو گیا اور اس طرح وہ خود اپنے ہی نغمے نہ سن سکا۔ یہ دونوں جنگ کی ہولناکیوں کو نظر انداز کرتے رہے اور ایسی شکست کھائی جس پر ہزار فتحیں قربان ہیں۔ انھوں نے اپنی عظیم انفرادیت کو دبنے نہ دیا اور آخری وقت تک آزاد آرٹ کی تخلیق کرتے رہے، پھر جب وینس کی حکومت نے مشہور مصور، سنگتراش ورزگر آندریا زیل ورکشیو کو فلورنس سے بلوایا تاکہ وہ ایک مشہور جنرل کالیانی کی یادگار قایم کرے اور جب وہ وینس

گیا اور اس نے پتھر سے ایک گھوڑا تراشا تو اسے پتہ چلا کہ وینس کی حکومت بقیہ کام وانیتیو سے کرانا چاہتی ہے وراکشو کی روح میں شدید نفرت کا ایک طوفان اُٹھا۔ اس نے اپنے تخلیق کردہ گھوڑے کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے، اور فلورنس چلا گیا۔ اسے فرمان بھیجا گیا کہ وہ وینس میں قدم نہ رکھے ورنہ وہ موت کا سزاوار ہوگا۔ لیکن فنکار سیاسی نظاموں کے قہر کا ہمیشہ مذاق اُڑا سکتے ہیں، ان میں وہ زندہ رہ زندگی اپنی پوری قوت پر ہوتا ہے جس سے سیاستداں قطعی ناواقف ہیں، وراکشو اس فرمان کے تحکمانہ انداز پر خندہ زن ہوا اس نے جواباً لکھ بھیجا کہ وہ خود بھی وہاں ہرگز نہیں جائے گا کیونکہ وینس کی حکومت اتنی طاقت نہیں رکھتی کہ اگر اس کا سر کاٹ دیا جائے تو وہ اسے جسم سے جوڑ دے جب کہ وہ اپنے گھوڑے کا سر کسی وقت بھی جوڑ سکتا ہے۔ اسے واپس بلا لیا گیا۔ الیندرولیو ہاروی کی مدد سے ایک شاہکار وجود میں آیا جس کے متعلق رسکن کا خیال تھا کہ وہ زمین کے سینے پر سب سے ارفع یادگار ہے۔ کالیانی ایک انداز تفاخر کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہے، اس کا جسم فولادی ساخت کا معلوم ہوتا ہے اور چہرے سے دبدبہ اور احساس برتری ٹپکتا ہے۔ گھوڑا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے قدم بھاری ہیں لیکن جن میں طاقت بھی شامل ہے ....

اس طرح اس نے اپنی تخلیقی قوتوں کے سرچشمے کو خشک ہونے سے بچایا۔ ٹنٹوریٹو کے شاہکار، پال ورونیز کی "ولیمہ کی دعوت" معاشرتی احتساب کے باوجود تخلیق کئے گئے۔ لیونارڈو کی تصویر "آخری دعوت" میکائیل انیجلو کی "تخلیق آدم" "تین تقدیریں" اور "مقدس خاندان" مروجہ اقتصادی بدحالی کے باوجود عالم وجود میں آئیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی نے آرٹ کے آزاد نمونے ایسے زمانہ اور ایسے ماحول میں پیش کئے جو اپنے خلاف ہلکا سا نقش بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

شعر کی دنیا میں سیفو کے غزلیات آزاد آرٹ میں ایک نمایاں درجہ رکھتی ہیں حالانکہ اس کے لئے بھی فضا ساز گار نہ تھی۔ اقبال، جو زندگی کی قوت کے زبردست مبلغ تھے، آپ کو معلوم ہی ہے کہ کیسی فضا میں پیدا ہوئے تھے، ان کے وہ اشعار جو [illegible] کے پابند نہیں اور آفاقی کیفیات چھپائے ہوئے ہیں آزاد فنکاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ جبران خلیل جبران نے آزادی کا ایسا بلند تصور پیش کیا ہے جو شخصیت کے ارتقا میں مددگار ثابت ہو۔ ہے اس کا فلسفۂ حیات تمام تر ایجابی ہے، اس میں کوئی سلبی رجحان نہیں۔ آزاد ہواؤں کی طرح، فلک بوس پہاڑوں کی طرح، مسرور دبے پروا چشموں کی طرح اس کے اشعار حرکت و استقلال کی تعلیم دیتے ہیں۔ نذرالاسلام کے نغمات آتشیں اپنے اندر طوفان کا جوش، سمندروں کا خروش، آندھی کا شور اور بادلوں کی گرج رکھتے ہیں۔ وہ انسان کی انانیت کو اُبھارنے کے لئے اس کی روح کو مطلقاً آزاد چھوڑنے کی تبلیغ کرتا ہے، کلبی فلسفۂ زندگی کو وہ حیات جاوداں کے لئے سخت مضر سمجھتا ہے۔

روسو اور والٹیر کے مقالات ان کی پرجوش انانیت کا اثبات کرتے ہیں۔ یہ مقالات جو ایک مستقل اور آزاد فلسفۂ حیات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں، انقلاب فرانس کے محرک ثابت ہو چکے ہیں۔ اناطول فرانس، آندرے ژید اور [illegible] ایسی شخصیتوں کے مالک ہیں جو زمانہ سے متاثر ہونا تو کجا الٹا اسے پلٹ چکی ہیں۔ ان ادیبوں کا آرٹ ایسا لافانی اور دلپذیر ہے کہ اگر [illegible] اشاعت کی جائے تو ایک نیا نظام حیات وجود میں آجائے جو حیات انسان کو جاوداں، پیہم دواں، ہردم رواں بنادے اور [illegible] گونگے، بہرے اور بے درد نظام کائنات کو مغلوب کرلے۔

سسرو کی آتش بیانی سے عوام کے محکوم ضمیر کانپ کانپ جاتے تھے۔ ایڈمنڈ برک، صہبائی، اور ابن غزال نے بہت کافی حد تک عوام کی خوابیدہ خودی کو بیدار کیا۔ ابوالکلام کی ابتدائی تحریریں اور چند تقریریں، آزاد آرٹ کی منزل کی طرف بڑھنے کی تسلی بخش کوشش ہیں۔ ابوالکلام سیاست کی گھاٹیوں میں پھنس گئے اور آزاد آرٹ کی طرف بڑھنا چھوڑ دیا ورنہ آج تک وہ اپنا نقش مستقبل کے سینے پر ہر جما چکے۔ پیرمِلوِٹی نے سچ کہا ہے کہ:-

"ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں صرف ایک راز کھوتا ہے (اس وجہ سے کہ ایک سے زیادہ راز اس کے سینے میں ہوتا ہی نہیں) جو لوگ اپنی بات کو طول دینے پر مصر اور بضد ہیں انھوں نے ایسی بلندیوں تک پہونچنا چاہا ہے، جہاں تک پہونچنے سے پہلے وہ گر پڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ناکامی پر مجھے افسوس ہے لیکن زیادہ افسوس ہے ان پر جن کی زبانیں گنگ ہیں اور جنھوں نے کچھ نہیں کہا

(حالانکہ اگر ان کی انانیت بھی جاگتی ہوتی تو ایک عظیم راز کے انکشاف کے روپ میں زور شور سے اُچھلتی ہوئی باہر نکلتی ہے۔)"

فرق صرف اتنا ہے کہ بہت سے فنکار غیر متعلق راہیں اختیار کر لیتے ہیں اور بہتوں کی چیخیں ایک ہی مقصد کے لئے بلند ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کے فنکاروں کی انانیت پر جوش نہیں ہوتی بلکہ رینگنے والی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی کہی ہوئی سب باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی آدمی ایک ہی فنکار سے منسوب کردہ مختلف اور متصادم نظریات کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ ہاں دوسری صورت میں جبکہ فنکار اپنی کہی ہوئی ایک ہی بات کی تشریح کرتا ہے، تو اس کے نقوش زیادہ گہرے ہوتے جاتے ہیں اور ایسے ہی فنکاروں کو قبولیت عوام اور شہرت دوام نصیب ہوتی ہے۔

ان آزاد فنکاروں کو چھوڑ کر جن کی انفرادیت گرد و پیش کی پابندیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے، آزاد فنکار کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام قایم کرنے کے لئے جد و جہد کی جائے جس میں پابندیاں نہ ہوں تاکہ ایسے فنکار بھی آزادانہ تخلیق کے عمل کو انجام دے سکیں جن کی انانیت زیادہ پر جوش نہیں ہے۔

جلیل عابدی

ایک قدیم کتب خانہ کی بعض نادر کتابیں

غیاث اللغات مطبوعہ ۱۸۷۱ع (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

سواطع الالہام از فیضی (عربی) ۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

منتخب اللغات دارا شکوہی (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

علم جفر و شعبدہ جات (اُردو) ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

مثنوی یوسف زلیخا جامی (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ تین روپیہ

مصداق الرمل، انوار الرمل (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ سات روپیہ

مراثی انیس ۔۔۔۔۔۔ چھ روپیہ

نالۂ عندلیب (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

ترجمہ حدائق البلاغت (اُردو) ۔۔۔۔۔۔ تین روپیہ

علم الکتاب خواجہ درد (فارسی) ۔۔۔۔۔۔ چھ روپیہ

طب کی اُردو کتابیں

ترجمہ کلیات نفیسی مکمل ۔۔۔۔۔۔ سولہ روپیہ

ترجمہ قانون بوعلی سینا مکمل ۔۔۔۔۔۔ تیس روپیہ

گنج حکمت مکمل ۱۲ حصے ۔۔۔۔۔۔ دس روپیہ

مخزن المفردات ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

امراض چشم ۔۔۔۔۔۔ پانچ روپیہ

ترجمہ کلیات و معالجات ۔۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ

بحر محیط ۔ حکیم اصغر حسین فرخ آبادی ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

تشریح کبیر ۔ حکیم محمد کبیر الدین دہلوی ۔۔۔۔۔۔ بارہ روپیہ

کتاب التشخیص مکمل ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

اسرار حکمت ۔ از حکیم محمد عبد العزیز لاہوری ۔۔۔۔۔۔ چار روپیہ

طب کی فارسی کتابیں

قرابادین کبیر مکمل ۔۔۔۔۔۔ سولہ روپیہ

مجربات فرنگی (از ہنری بریکٹ) ۔۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ

مخزن الادویہ مع تحفۃ المومنین ۔ از حکیم محمد حسین علوی شیرازی ۔۔ دس روپیہ

محیط اعظم مکمل ۔ از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ۔۔۔۔۔۔ پچیس روپیہ

اکسیر اعظم " " ۔۔۔۔۔۔ پینتیس روپیہ

مفرح القلوب ۔ مفید الاحسام (علم جراحی) ۔۔۔۔۔۔ بارہ روپیہ

علاج الامراض از حکیم محمد شریف خاں دہلوی ۔۔۔۔۔۔ آٹھ روپیہ

مخزن اکسیر مکمل ۲ جلد از حکیم امام الدین پاک پٹن ۔۔۔۔۔۔ دس روپیہ

قرابادین اعظم ۔ از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ۔۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ

قرابادین قادری ۔ از حکیم محمد اکبر ارزانی ۔۔۔۔۔۔ بارہ روپیہ

وسط ایشیا کی جدید شاعری کے نمونے

دماغوں پر صدیوں سے تالے پڑے ہوئے تھے لیکن انقلاب کے ہتوڑے نے دفعتاً وہ تالے توڑ دئے اور ایک تاجیک دہقان منور شاہ زندگی پر ان لفظوں میں تنقید کرنے لگا :-

" جنگ ہو رہی تھی اور میں قلعہ کی دیوار کے نیچے کی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ گرمی سخت تھی اور غبار چھایا ہوا تھا۔ میرے پاؤں میں سکت نہ رہی تھی کہ دھان کے کھیتوں میں گھس جاؤں جہاں اگرچہ لاشیں سڑ رہی تھیں مگر ایک گھوڑے سوار سے چھپنا بھی چاہتا تھا "

" شکستہ حجرے سے میرے بوڑھے استاد برآمد ہوئے جنھوں نے مجھے پچیس سال پڑھایا تھا۔ علم و فضل کی پوٹ، ملا صاحب فرماتے ہیں :-

' میری بات پر دھیان دو ! میرے لفظ یاد رکھنا ! "

" میں نے جواب دیا : ' ملا صاحب ! مجھے آپ کی پہلی سب باتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تھا تاج ہمیشہ سلامت رہے گا۔ مگر وہ تاج ریزہ ریزہ ہوگیا آپ نے کہا تھا تخت کو شکست نہیں ہوگی مگر وہ تخت پاش پاش ہوگیا ! آپ کا فرمان تھا کہ بادشاہ کا خون حرام ہے ! مگر وہ خون میری تلوار پر جما ہوا ہے ! آپ کا ارشاد تھا کہ قرآن کا حکم اٹل ہے، عورتیں پردے میں رہیں گی۔ مگر عورتوں نے برقعے جلا ڈالے ! آپ فرماتے تھے کہ اسلام کا بول بالا ہوگا اور مسجدیں آباد رہیں گی مگر مسجدیں تو اب برائے نام آباد ہیں ! آپ کا کہنا تھا کہ خان و ملا بے اور سوداگر ہمارے ملک کے آقا ہیں، مگر آج وہ سب معدوم ہیں ! استاذی ! آپ کی ساری پیشین گوئیاں جن کے خیال سے بھی متلی ہوتی ہے کیا ہوئیں ! "

ایک دوسرا ازبکستانی دہقان شاعر لینن پر اپنی نظم میں کہتا ہے :-

" جڑ میں پانی پہونچتا رہے تو سفیدار کے درخت پہاڑ سی سے بھی اونچے نکل جاتے ہیں ؛ ریگستان کی ساری ریت اور پامیر کے ٹیلے بھی سمندر کو نہیں پاٹ سکتے۔

" ہولناک جرم کرکے یا بڑی خیرات کرکے آدمی لوگوں کو اپنا نام یاد کرا دے سکتا ہے، کریہہ جرائم کو دیکھ کر دُنیا اکثر لرز گئی ہے، لیکن نیک عمل انسان چند ہی ہوتے ہیں !

" پامیر کی چوٹیاں زمیں دوز ہو جائیں، ساری دُنیا سمندر بن جائے، اور پھر پامیر سے دس گنا اونچے پہاڑ کھڑے ہو جائیں، مگر زمانہ کی آہنی رفتار نہیں رُک سکتی !

" انسان اپنے بزرگوں کو بھلا دے سکتا ہے، اپنی مادری زبان کو بھی فراموش کر دے سکتا ہے لیکن وہ لینن کا نام فراموش نہیں کر سکتا ! سب سے بڑے انسان کا نام بھلایا نہیں جا سکتا ! کیا لینن نے جنگ کو فوراً نہیں روک دیا ؟ کیا اس نے ہمارے آنسو نہیں پونچھے ؟ کیا اس نے اپنی روح کی کرنوں سے ہمارے دلوں کو نہیں گرمایا ؟ اور کیا اس نے انسانیت کی جونک یعنی زمیندار دل کو فنا نہیں کر دیا ؟

" ہم نہیں جانتے کہ لینن میں یہ بے پناہ طاقت کہاں سے آئی، ہماری کمزور نظریں اس عظیم شخصیت کی روح کو نہیں دیکھ سکتیں، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ دُنیا نے اس سے زیادہ بڑے دل و دماغ کا انسان پیدا نہیں کیا !

" ہم جی رہے ہیں، اس لئے جیتے ہیں کہ اس عظیم الشان ہیرو کی ذات سے حقیر سی مناسبت پیدا کرلیں ! "

شاعر سلیمانی، اصلاح و تعمیر کے دور میں رجعت پرست عناصر کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے :-

ایک جماعت ــــ ہم مورچے پر جا رہے ہیں، جنگی مورچے پر، برقعہ و بیادر کے خلاف جنگ کرنے جا رہے ہیں ! ہماری سرحد پر بسنے والا مشرق سُن لے !

ہم اپنی بہنوں اور بچیوں کی زندگی اور آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں !

دوسری جماعت ۔ مگر جبتی تو دنیا کے چھور تک جاکر بھی برطانوی جھنڈا اُٹھا لیتے ہیں ! اور ہمارے بھائیوں کو قتل کر کے خون کی ندیاں بہاتے ہیں

ان آنکھوں کو موند دیتے ہیں جو ان کی کمینگی کی شاہد ہیں !

پہلی جماعت ۔ چینؔ[1] ! ہندوستان ! ہم تمہیں آزادی دلانے کو لڑ رہے ہیں !

دوسری جماعت ۔ لیکن چین و ہند تو سامراج کے لئے پلاؤ کی قاب ہے !

پہلی جماعت ۔ اب ہمارے یہاں امیر و ملّا اور بے کے لئے ٹھکانا نہیں رہا ! جس خدا کے خدمت گار ایسے ہوں اُس خدا کی ضرورت ہم کو نہیں ہے !

دوسری جماعت ۔ ملّا و امیر نے تو زمین کے پورے کُرے کا بوجھ غریب کی خمیدہ کمر پر لاد دیا تھا ؟ ہندو کسان کے بچّے کا بلکنا بھلا دیا ہے !

پہلی جماعت ۔ ہم ہمارے انسانوں کے لئے نئی دُنیا کا دروازہ کھول رہے ہیں !

دوسری جماعت ۔ تم ہماری گردنوں پر اپنا جوا لادے رکھنا اور گوری گورے کا تماشا دکھانا چاہتا ہے !

دونوں جماعتیں مل کر ۔ وہ راہ سامنے ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے ! ہم کہتے کہ نیک و بد کو پہچانو اور رخ کرو !

تاجکستانی شاعر لاہوتی کا شمار صرف سوویٹ یونین ہی میں نہیں بلکہ ساری دُنیا کے چوٹی کے بلند پایہ شاعروں میں سے کیا جاتا ہے ۔ سوویٹ یونین میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے دور دراز کے دیہاتی علاقے بھی اسے مدعو کرتے اور اس کے لئے آنکھیں بچھاتے ہیں۔ لاہوتی اپنی ایک نظم میں بادشاہ سے مکالمہ کرتا ہے:

شاہ نے کہا : دو حقیقتوں کی جنگ منشائے ربانی ہے : تم روٹی کے لئے فضول لڑتے ہو ۔ دنیا میں امیری و غریبی، تونگری و محتاجی، دونوں ضروری ہیں ! مقدر پر شکر واجب ہے ! ۔ دُنیا کے فاتحو، تم نے دُنیا کو خون کے غسل دیئے ! ۔ دُنیا کے غریبو تم نے دنیا کو روٹی کھلائی، شاباش !

" میں نے بادشاہ کو جواب دیا ، احمق و کاذب بوڑھے، تیری باتیں قابل نفرت ہیں ۔ ہر چیز دہقان و مزدور کے ہاتھ پیدا کرتے ہیں، انکی مشقت مقدس ہے ! ۔ تیری گندی بکواس، تیرے ظلموں کی یہ دوکان، ہر زنجیروں کا یہ کارخانہ اور ناپاکی کی یہ کھال، تیرا سب کچھ چٹخنی بندوقوں کے گیت میں فنا ہو جائے گا ! اور یہ بندوقیں کسان و مزدور کے ہاتھوں میں ہوں گی ۔ وقت آگیا ہے اور ہمارے بازو طاقتور ہیں ! ۔ تمھاری خاک سے ایک بنافات بات کا سماج، ایک نئی دُنیا پیدا ہوگی ."

لاہوتی کی ایک دوسری نظم وسط ایشیا کی نئی اسپرٹ کی آئینہ دار ہے، جس کی صنف و ہیکر بھی جدید ہے ۔ اس ہیکر کو سوویٹ ادب میں " رپورتاج " کا نام دیا گیا ہے ۔

سینٹرل کمیونسٹ پارٹی کے آرگن، اخبار پراودا کو لاہوتی نے ایک رپورٹ نظم میں بھیجی تھی : ۔

" تاجکستان میں لینن کا مسلک روز افزوں پھیلتا جا رہا ہے ۔ آدمی سب بدل گئے ہیں، ہر شخص اشتراکیت کا محل کھڑا کرنے میں لگا ہوا ہے !

خود بھی غلام زمیندار، کل تک جن لوگوں کو پاؤں تلے روندتا تھا، وہ عوام آج اشتراکیت کا محل چن رہے ہیں ! وہ عوام جو مُلّا کے جال اور پھندے میں پھنسے ہوئے تھے، حیرت ہے کہ کارنامے کر کے دکھا رہے ہیں !

حلیمہ کل تک بادل کی کڑاک سے آنکھیں میچ لیتی اور بتی کی طرح کانپنے لگتی تھی، وہی حلیمہ آج علم و سائنس پر آقائی کر رہی ہے ! فطرت کی قوتیں اس کی لونڈیاں بن گئی ہیں اور اس کی نرم و نازک انگلیاں ریڈیو سیٹ طیار کر رہی ہیں ۔

ترسون بھی حلیمہ سے پیچھے نہیں، لکڑی کے دقیانوسی ہل کو چھوڑ کر اب ترسون ٹریکٹر چلا رہا ہے، اس کے دماغ میں چہل پیدا ہو گئی وہ ہر وقت اپج کی لینے لگا ہے ۔ نئی نئی باتیں نکالتا ہے !

---

[1] ان اشاروں سے پتا چلتا ہے کہ سوویٹ مشرق میں باقی ایشیا کی آزادی کے لئے کتنی تڑپ ہے ۔ اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام دوسرے مذہب والوں سے لڑنا نہیں سکھاتا ۔ نیز اشتراکیت سچے انسانی بھائی چارہ کی تعلیم دیتی ہے ۔

جن پگڈنڈیوں پر کل تک اونٹ اور خچر اونگھتے چلتے تھے، ان راستوں پر آج کارگزاریوں کے طوفان امنڈ رہے اور موٹریں اور ٹرک دوڑتے پھر رہے ہیں! نیچے ٹرک ہیں اور اوپر ہوائی جہاز!

بیکار ریگستان کی طرح کی بیکار باتیں اب سب مفقود ہیں، اب نہ وہ مشرقی غنودگی ہے نہ سست رفتاری! اب وقت کا ہر لمحہ کام کا ہے اور تکمیل و استحکام کا دور دورہ ہے!

سست قدم بیل کے پیچھے گنگنا تا جانے والا، آنکھیں موندھ کر ہانسیا چلانے والا، اور اونگھتے اونگھتے بوائی کرنے والا، ترسوَن آج غائب ہے تو تعجب کیوں ہو! آج کا ترسوَن نہ مغموم ہے اور نہ اونگھتا ہے، مشین کا موٹر اسے ہر وقت خوش اور چوکنا رکھتا ہے!

سستی اور بے دلی پُرانی باتیں ہیں، آج ہماری نظر دور تک دیکھتی ہے، ہم مستقبل کا پیغام سُن رہے ہیں! آج ہمارے بولوں میں جان ہے، ہمارے گیت زندہ جاوید ہیں!

کامریڈ پرافرا، شاعر کی ان باتوں کو بادہوائی نہ سمجھو، یہ حقیقی زندگی کی رپورٹ ہے! شاعر اپنی اشتراکیت کو گواہ کرکے کہتا ہے کہ اب ہمارا دہقان "میرا کھیت" نہیں کہتا اب تو ہر چیز "ہماری" ہوگئی ہے! اسی طرح جیسے ہوا "ہماری" ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔

آج مذہبی تہوار روزہ (عید) ہے۔ پُرانے زمانے میں آج کے دن گھر اور کھیت سونے ہوجاتے اور مسجدیں بھر جاتی تھیں۔ لیکن آج "روزہ" کا کسی کو خیال بھی نہیں ہے، اب ہمارے لوگ غلام ماضی کی یاد بھی کرنا نہیں چاہتے۔

آج ہمارے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں "برگیڈ" اور "شاک ورکرس" کے لفظ بولے جاتے ہیں۔

بانو زندگی میں گھوڑے پر صرف اس دن سوار ہوئی جس دن شادی کے بعد گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ آج کی بانو روزمرہ بس پر سوار ہوکر اسکول جاتی ہے۔

کامریڈ، آپ ہمارے کسی آدمی سے بھی پوچھئے کہ تمہارا لیڈر کون ہے؟ تو دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اُنگلی اُٹھا دے گا۔ اس کی تصویر کی طرف جس سے ہمیں محبت ہے اور ہم جس کا احترام کرتے ہیں۔

علی قیم بابائیف، کرغیز شاعر کسی مستی کے عالم میں وطنی ترانہ الاپتا ہے:۔

"منحوس دشمن پر ہماری فتح و ظفر کا طوفان پھٹ پڑا ہے! میں اُس لمحے کی عزت کرتا ہوں! اس طوفان نے ہماری بیڑیاں کاٹ دیں، غلاموں کو آزاد کیا کہ وہ جنگی علم بلند کریں! میں اُس پُرعظمت دن کا خیر مقدم کرتا ہوں ——— اوایل اکتوبر کے دن کا!

سرزمین وطن، میں دن رات تیری حفاظت کرنے کا عہد کرتا ہوں!"

ادین صابر وفا، ازبک شاعرہ، وطن کی سب سے بیش قیمت پیداوار، کپاس کا قصیدہ پڑھتی ہے:۔

"آزاد دہقانو! تمہارا دل نہیں دھڑکتا کہ اب تمہاری وادیاں اور کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوں گی؟ یہ ایک دلپذیر خواب کے پروں پر اُڑنا نہیں، اب تم موسم بہار کے سینے پر مشقت کیا کروگے! اب ہل اور پھاوڑے سے نہیں، اب تمہاری زراعت بڑی بڑی مشینیں کریں گی! دہقانو! آج تم مسرت کے آقا ہو اور تمہارا عزم و ارادہ دنیا کی صورت بدل دے گا! ٹریکٹر تمہارا دوست ہے اور تم خود اپنے آقا! آراضی مطلقاً تمہاری اپنی ہے! اب تمہارے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں!"

علی بے، ترکمان شاعر جب سرزمین وطن پر نہریں جاری دیکھتا ہے تو فخر و مسرت سے چیخ اُٹھتا ہے:۔

"کون لایا، ہمارے ریگستان میں یہ مسرور اور گاتی ہوئی نہریں کون لایا؟ ——— پیانج (ندی) کے طوفانی دھارے کو کس نے سدھایا؟ ——— ہمارے مفلوک اور دکھی دہقانوں کے لئے یہ راحت و مسرت کون لایا؟ ——— اکتوبر کے رہنے والے لائے! شاہوں سے بھری آزادی دلانے والے لائے! ——— مارکس اور لینن والے ——— بولشویک لائے!"

ایک نامعلوم تاجیک شاعر نئے اور پُرانے، سامنت شاہی اور سماج واد ——— یورپ و ایشیا کا معرکہ اس طرح نقش کرتا ہے:۔

"میں نہ ملا بننا چاہتا ہوں نہ بے (زمیندار) اور تاجر، میں نہ احمق اور اندھا درویش بننا چاہتا ہوں نہ ریشم میں ملبوس تاجر زادہ!
میں اپنے چہرے پر رنگ و روغن چڑھانا نہیں چاہتا، میں نہ ناؤ کا مالک بننا چاہتا ہوں نہ امیر و تحصیلدار!
میں نہ بوڑھے بوڑھیوں کا طبیب بننا چاہتا ہوں نہ بازار میں ایک دوا ساز کا مالک، میں یا تو ڈاکٹر بنوں گا یا لائبریرین اور یا ٹیچر!
میں وہ بننا چاہتا ہوں جو لینن کا منظور ہیں، لوگوں کے ذہن و خیال کے اندر تخم ریزی کر سکے جس طرح دہقان زمین میں تخم بوتا ہے!
میں عوام کا کیسا بننا چاہتا ہوں!"

ایک تاجیک لوک گیت میں شاعر قومی کردار کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"ہم تاجیک جو کچھ دیکھتے ہیں اسی کا گیت گاتے ہیں —— ہمارے سامنے گھوڑا آتا ہے تو اس کا گیت بنا لیتے ہیں ——
اور ہمارے گیت شیریں کلام شاعروں کے بنائے ہوئے ہیں —— ایسے گیت جو زمانہ کی چادر کی کروٹ پر چلتے اور رکتے ہیں! ——
پرانے شاعر نسوانی حسن و جمال اور گل و بلبل کے گیت گاتے تھے —— ہمارے آج کے شاعر نئی زندگی اور آزادی کے ترانے گاتے ہیں!
حسین مستقبل کا، مشین اور ہوائی جہاز کے گیت! — اور وہ سب سے زیادہ لینن کا گیت گاتے ہیں، کیونکہ نہ ہوتا تو کوئی گیت گایا ہی نہ جاتا!
وہی خانوں اور امیروں کے قصیدے بجے جاتے! — ہمارے شاعروں کو لینن نے یہ حق دیا کہ وہ جس کا چاہیں گیت گائیں! اور وہ سب لینن کا گیت گانے لگے!"

سہیلی بھی ایک تاجیک شاعر ہے اور حیات نو کا قصیدہ خواں! کہتا ہے:۔

"تم ایک شہر دیکھو گے، نوشہ کے لباس کی طرح جگمگاتا ہوا شہر! —— اور کتخدائی کا شادیانہ بھی سنو گے!
سنو! ہوائی جہاز کا پنکھا گھن گھنا رہا ہے! وہ دیکھو، موٹر کس زنّاٹے کے ساتھ جا رہی ہے! یہ ہر سو گرد اور دھوئیں کے بادل اڑاتی ریل
فراٹے بھرتی جا رہی ہے!"

اسی نظم میں آگے چل کر سہیلی بجلی کی روشنی اور ٹریکٹر کی غزلخوانی کرتا ہے:۔

"دن ڈھلتے سنو کہ دہقان کی جھونپڑی سے کس گیت کی آواز آ رہی ہے، وہ گا رہا ہے:— وہ دیکھو، آسمان پر آزادی کا سورج چمک رہا ہے!
نہروں کا آزاد پانی ہماری وادی میں مسرت کا ترانہ گنگناتا جا رہا ہے! سوویٹ شہری گاتے پھر رہے ہیں —— ہر طرف گانے بکھر رہے ہیں!"

اور آگے چل کر سہیلی سوال کرتا ہے:۔

"سن رہے ہو تم، آزاد تاجکستان کی پرمسرت آواز! —— تاجکستان! تیری شان و عظمت کا، تیری خوشیوں کا زمانہ آ گیا! —— ہاں، میرے
کہستانی تاجکستان، تیری مسرتوں کی ساعت آ گئی!"

بردی قدبابائیف، ترکمان شاعر، انقلاب کی سترھویں سالگرہ پر اپنے دوستوں کو مبارکباد دیتا ہے:۔

"آج میں چٹکتی کلیوں کھلتے پھولوں کا گیت گاتا ہوں، کہ پرانی دنیا دفن ہو چکی ہے!
میرے ہاتھ میں یہ سرخ گلاب نہیں، نومولود بچے ہیں!
ہم نے اپنے وطن کی زمین کو خانوں اور امیروں کا خون پلایا ہے، اور اس خشک سالی کے بعد جو آج مدفون ہے، یہ تازہ گلاب پھوٹے ہیں!
آسمان پر سورج بھی نیا نکلا ہے، نئی زندگی کا سورج! جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے! ایک دو .... دس گیارہ .... سولہ سترہ،
ایک کے بعد دوسرا گزرتے ہوئے پورے سترہ سال گزر گئے! اور جہد و کوشش کا دھارا تیز تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ میرے محبوب وطن ترکمانیہ۔
سوویٹ ترکمانیہ، میں زندگی مسرت کا پھول بن کر کھلنے لگی!
لے! وطن عزیز، زندگی کے اس شگفتہ پھول کو لے لے! اور اس کی خوشبو سے ہر دن کو مسرت انگیز کا معطر دن بنا لے!"

لطیف الدین احمد

ادب الکاتب والشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

ادنیٰ تغیر کے ساتھ

شاعر و ادیب کو دہلی اور لکھنؤ کے اختلافات سے بھی مطلع ہونا چاہئیے تاکہ جس زبان کا تتبع کرتا ہو اس سے علٰحدہ نہ ہو جائے۔ ان دونوں شہروں کے لہجہ میں تو بڑا اختلاف ہو گیا ہے لیکن الفاظ و محاورات میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ جن باتوں میں اختلاف ہے اسکا استیعاب کسی نے نہیں کیا۔ مجھے جو الفاظ معلوم ہیں لکھتا ہوں۔ اکثر یہ اختلاف مرزا داغ مرحوم اور اہلِ دہلی کے بعض دوسرے احباب سے معلوم ہوئے مثلاً ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ میں ہمارے یہاں بولتے ہیں دلی میں ہمارے ہاں کہتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔ یہ سُن کر میں نے اس بات کا تفحص کیا تو معلوم ہوا کہ دہلی میں بھی محاورہ ہمارے یہاں اور ہمارے ہاں دونوں ہیں۔ میر کا دیوان جو کلکتہ میں چھپا ہے اور قرنوں کا چھپا ہوا ہے اس میں جا بجا ہمارے یاں اور ان کے یاں موجود ہے، میں نے میر نفیس مرحوم سے پوچھا تو انھوں نے کہا ہم تو جب کہیں گے ہمارے یہاں کہیں گے۔ صبا کہتے ہیں:۔

"لیلۃ القدر ہے بندہ کے یہاں آج کی رات"

اسی طرح مرزا داغ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ زیور گھڑنا دہلی کا محاورہ ہے، اہلِ لکھنؤ نے اس میں تصرف کر دیا اور گڑھنا کہنے لگے۔ لیکن تفحص سے معلوم ہوا کہ اصل لفظ گڑھنا ہی ہے اور پہلے دہلی کا محاورہ یہی تھا۔ قدرت اللہ شوق سنبھلی نے ۱۱۸۹ھ میں طبقات الشعرا تصنیف کی ہے۔ تصنیف کے بائیس برس بعد کا لکھا ہوا نسخہ یعنی ۱۲۱۰ھ کا موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ نسخہ سو برس سے زیادہ کا لکھا ہوا ہے اس میں امیر خسرو دہلوی کے دو شعر درج ہیں اور دونوں شعروں میں گڑھنے کا لفظ آیا ہے:۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا ۔۔۔ کچھ گڑھیے سنواریے پکارا

نقدِ دلِ من گرفت و بشکست ۔۔۔ آخر نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

انیس مرحوم سے میں نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ میر محمد حسین آزاد، مالا کی جمع مالائیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا کہ مالا، دلی کی زبان پر مونث ہے لیکن میر حسن کی مثنوی میں یہ شعر موجود ہے:۔

وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے ۔۔۔ رہیں دل جہاں سر پٹکتے ہوئے

میں نے یہ شعر انھیں سُنایا اور انھوں نے بہت تعجب کیا۔ ایک دفعہ ان مرحوم سے میں نے پوچھا کہ لکھنؤ کی زبان کے کچھ الفاظ ایسے بتائیے جو دلی میں نہ بولے جاتے ہوں اور اہلِ دہلی ان لفظوں کو مکروہ سمجھتے ہوں، کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ یہ محاورہ لکھنؤ کا کہ "یہ کام مجھے کھلتا ہے"۔ مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ حسن اتفاق سے مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ابن الوقت ایک صاحب دیکھتے تھے وہ میرے پاس لے آئے اور پوچھنے لگے کہ اکھرتا کیا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں، اسے دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ کھلنے کی جگہ پر دلی میں اکھرتا کہتے ہیں۔

ایک نقل اور مجھے یاد آئی انیس مرحوم کی فرمایش سے میں کچھ شعر پڑھ رہا تھا صحبت بے تکلف تھی میں نے پڑھا:۔

لگا دے تیر کے پر مجھ کو بیقراری دل ۔۔۔ کہ منہ کے بھل میں گروں جا کے اپنی منزل پر

کہنے لگے دلی میں منہ کے بل کہیں گے میں نے کہا کہ لکھنؤ میں تو سب منہ کے بھل کہتے ہیں اس پر انھوں نے کہا کہ میرا گمان ہے کہ میر انیس نے کبھی نہ کہا ہوگا۔

میر انیس کی رباعی کا یہ مصرع میں نے پڑھا ع "گر پاؤں تھکے تو سر کے بھل جاؤں گا"

مرزا داغ مرحوم تذکرۂ آبِ حیات کو کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ مصنف نے بھی تو بڑی ناانصافی کی کہ ذوق کے ضمن میں بھی داغ کا ذکر نہیں کیا آزاد کے اس فقرہ پر نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ اہلِ لکھنؤ کھانے کا ہو تو تمباکو کہتے ہیں اور پینے کا ہو تو تماکو بولتے ہیں۔ میں نے کہا صاحب وہ تو بڑے محقق معلوم ہوتے ہیں وہ تو اندھیاری رات کا بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دلی کی زبان میں گھوڑے ہی کی اندھیاری کو اندھیاری کہتے ہیں، اندھیاری رات کہنا خلاف محاورہ اُردو ہے مرزا داغ مرحوم نے کہا یہ تو ٹھیک لکھا ہے۔ میں اسی زمانہ میں سودا کا دیوان پڑھ رہا تھا، کوتوال کی ہجو تک جب مقام درس پہونچا تو یہ شعر دیکھنے میں آیا:-

ہوئی کب تک بچا خبر داری چور جاتے رہے کہ اندھیاری

پھر جو ملاقات ہوئی تو یہ شعر میں نے انھیں سنایا اور یہ ثابت کر دیا کہ اندھیاری رات دلی کی زبان ہے۔ گو اب نہ بولتے ہوں یا لکھنؤ کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہو۔

یادش بخیر آغا شاعر دہلوی بڑے خوش فکر و صاحب دیوان مرزا داغ مرحوم کے افصح تلامذہ میں ہیں۔ ایک دفعہ مجھے راہ میں ٹھہرا کر کہنے لگے کہ یہ مصرع کیسا ہے:- "ہونٹ سل جاتے ہیں جب سامنے تو ہوتا ہے"۔ میں نے کہا ہم تو یوں کہیں گے:- "ہونٹ سی جاتے ہیں جب سامنے تو ہوتا ہے" یہ سنکر کچھ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ استاد نے بھی یہی بنا دیا ہے۔ میں نے کہا آپ نے ان سے کیوں نہ کہا کہ سِل جانا، دُھل جانا دلی کا محاورہ ہے اور سی جانا، دھو جانا لکھنؤ کی زبان ہے، ہم کیوں لکھنؤ کی زبان کا تتبع کریں۔ ہنسکر کہنے لگے میں نے یہی کہا تھا مگر استاد برہم ہو گئے اور فرمایا کہ ہم نے بھی استاد ذوق سے ایک دفعہ ایسی ہی بحث کی تھی تو انھوں نے ایک تھپیڑ مارا، جو لوگ تحقیق زبان اُردو کا شوق رکھتے ہیں ان کو استاد شاگرد کی یہ اصلاح و بحث نظر غور سے دیکھنا چاہئے۔

مرزا داغ مرحوم کہتے تھے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا سانس اور فکر کا لفظ مذکر ہی بولتے سنا مگر استاد ذوق نے جب سانس کو نظم کیا مونث نظم کیا بلکہ بادشاہ کی غزلوں میں بھی اُسے مونث کر دیا اور فرماتے تھے کہ میر کی زبان پر بھی یہ لفظ مونث ہی تھا اور مرزا غالب نے مجھے ہدایت کی ہے کہ فکر کو بھی مونث ہی نظم کیا کرو۔

نون غنہ زیادہ کرتے ہیں ———— جیسے کونپل۔ جھونٹ۔ سینکڑوں۔ تھونلا (یعنی درخت کا تھالا) موا ہنڈھنا وغیرہ مگر لکھنؤ کے لہجہ میں ان الفاظ میں نونِ غنہ لفظوں میں تو بولتے ہیں مثلاً بوچھار آئی، کروڑوں بونمیاں ٹرگئیں میں نے میر مہدی مجروح مرحوم کے کلام میں کواڑ کا قافیہ بوچھاڑ دیکھا ہے۔ ———— دلی میں جھرمٹ کا قافیہ کروٹ لاتے ہیں۔ لکھنؤ میں جھرمٹ کا لفظ بضم میم بولتے ہیں۔ انیتس کو وہ لوگ بہ تشدید تا اور لکھنؤ میں بتخفیف تا بولتے ہیں۔ کھینچنا وہ لوگ یئے مجہول کے ساتھ بولتے ہیں، اور لکھنؤ میں بفتحہ کاف ———— کچھ الفاظ دلی کی زبان کے ایسے بھی ہیں کہ لکھنؤ میں بولے نہیں جاتے مثلاً گھمنڈی بھرٹ ہو گیا۔ یا گھمنڈ کرتا ہے۔ مکڑی جالا پورتی ہے۔ اور ٹوپی اوڑھنا۔ اسی طرح ہتھیار سجنے کو ہتھیار سجانا۔ ٹلیک نکل جانا۔ پترے کھولنا۔ رونگٹے ہو جانا۔ بڑکنا۔ اوڑسنا۔ چبھنے سے چبھن اور دکھنے سے دکھن اور ہولے ہولے یعنی آہستہ آہستہ لکھنؤ میں کوئی نہیں بولتا مجروح کہتے ہیں:-

رشک اعدا کا گھن مرے دل کو ہولے ہی ہولے کھائے جاتا ہے

مرزا قادر بخش صابر شاہزادہ دہلوی کے کلام میں بل جانا، صدقے ہو جانے کے معنی پر میں نے دیکھا۔ شعرائے دہلی تیوری اور ڈیوڑھی وغیرہ میں ی کو وزن میں داخل کرتے ہیں اور اہل لکھنؤ کے لہجہ میں ی کو معدود سمجھتے ہیں۔ مجروح دہلوی نے پیاسے کی ی کو بھی وزن شعر میں داخل کر لیا ہے

یہاں ہیں آب خنجر کے پیاسے بجھے کیا تشنگی آب بقا سے

یہ سب تو لفظی اختلاف تھے ایک بڑا نحوی اختلاف بھی دونوں زبانوں میں ہے یعنی حرف نے کو دلی میں حرف اضافت کے معنی میں بولتے ہیں جس زمانہ میں دیوان غالب کی شرح میں لکھ رہا تھا اس بات پر جبھی مجھے تنبہ ہوا لیکن میں سمجھا کہ اس طرح کا نے حال میں پیدا ہو گیا ہے اور اہل پنجاب

کی صحبت کا اثر ہے مگر ابو ظفر بادشاہ کے دیوان میں ، جابجا یہی (نے) دیکھنے میں آیا اور اس سے پتہ لگا کہ مدت سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ یہ پنجاب کا محاورہ بادشاہ کی زبان پر بھی چڑھا ہوا تھا ؎

ہم نے ہے خوب اس کی طرز ناز پہچانی ہوئی　　چال پہچانی ہوئی آواز پہچانی ہوئی

لیکے دل کو جان تو چھوڑے اگر امکان کیا　　خوب ہی ہم نے تجھے ہے دلستاں دیکھا ہوا

مگر دہلی کو اس امر سے سبق لینا چاہئے کہ وہاں کے تمام شعرا ممنون ۔ ذوق ۔ مومن ۔ غالب نے کیوں اس محاورے سے احتراز کیا اور ان کے بعد اصغر علی خاں نسیم ، مرزا قادر بخش صابر ۔ میر مہدی مجروح ۔ نواب مرزا داغ نے کہیں بھی اس طرح سے نے کو استعمال نہیں کیا۔

سالک دہلوی ، مرزا نوشہ کے ممتاز شاگردوں میں تھے ۔ حیدرآباد میں ، مرحوم ہوگئے۔ اکثر ان کا کلام میں نے سنا ہے ۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس طرح (ہنے) کا استعمال انھوں نے کیا ہو۔ یہ تو سب لوگ ، اہلِ فن اور اہلِ زبان ہیں ۔ ان لوگوں کا اس لفظ کو استعمال نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محاورہ پنجاب کا ہے ۔ اس کے علاوہ حضرت ظفر کی ایک غزل کا ردیف و قافیہ ہے ۔ کہا جھوٹے موٹ ۔ وفا جھوٹے موٹ یہ دہلی کا خاص محاورہ ہے اور لکھنؤ میں جھوٹ موٹ کہتے ہیں ۔ پَر کا مخفف ۔ لکھنؤ میں پہ ہے ۔ دہلی کے لہجہ میں پَے ہے ۔ خواجہ وزیر لکھنوی کہتے ہیں : " لوٹا ہے دن دہاڑے یہ اندھیر ہو گیا " دہلی میں دن دہاڑے کہیں گے ۔ لکھنؤ کا زردہ ، میٹھے چاول اور دہلی کا زردہ کھانے کا تمباکو ۔ لکھنؤ میں کہیں گے زمین گھومتی ہے لیکن دلی میں گھومنے کا لفظ ہی نہیں بولتے ۔[1] چند الفاظ اختلافات دہلی و لکھنؤ کے متعلق اور یاد آگئے مثلاً اہلِ لکھنؤ ربڑی کو رابڑی ۔ کن پیڑ کو کرل ۔ سناؤنی کو سنافی لاکھنے کو ناگھنا ۔ ناک سنکنے کو ناک چھنکنا ۔ جولاہی کو جولاہن ۔ سناری کو سنارن کہتے ہیں اور یہ بیان ان کا بہت درست ہے ۔ لیکن ایک رسالہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اہلِ لکھنؤ انگیٹھی کو برسی ۔ دھوبی کو برٹھیا ۔ چھوکرے کو بردا ۔ بگولے کو بونڈلا ۔ تمباکو کو بھساکو ۔ گھارنے کو دھنگارنا ۔ کہاری کو کہارن ۔ لنگوٹیا یار کو لنگوٹیل یار ۔ بانس کو بہٹر کہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے ۔ لکھنؤ کی زبان کے یہ الفاظ نہیں ہیں ۔ بیگن کے بھرتے کو دھنگانا یعنی دھوئیں کی بو اس میں پیدا کرنا ——————— لکھنؤ میں کوئی نہیں کہتا ۔ بونڈلے کی ہوا بولتے ہیں ، لیکن بگولا یا بولا اور چیز ہے ۔

ہی کا استعمال اہلِ دہلی اس طرح بھی کرتے ہیں کہ حروفِ معنویہ کے بعد اُسے لے آتے ہیں ۔ مثلاً ہم نے ہی لکھا ۔ تم نے ہی پڑھا ۔ اس نے ہی سُنا اہلِ لکھنؤ ہمیشہ ہی کو مقدم کرکے کہتے ہیں ۔ جیسے ہمیں نے لکھا ۔ تمھیں نے سنا ۔ اسی نے پڑھا یا مثلاً وہ کہیں گے دل کی دل میں ہی رہی ۔ اور یہ کہیں گے دل کی دل ہی میں رہی ۔ مومن خاں صاحب کہتے ہیں ؎

کج دار و مریز کب تلک یوں　　ساقی مجھے دے شراب گلگوں

لکھنؤ میں یوں ، دوں ، کیوں ، جوں یہ سب الفاظ بواؤ مجہول بولے جاتے ہیں ۔ دہلی میں میں اپنے آپ کو بولتے ہیں ۔ لکھنؤ میں اپنے کو یا اپنے تئیں کہیں گے ۔ بیرنے اور تیرنے میں بھی کسی قدر اختلاف ہے تذکیر و تانیث کے رسالے جو لوگوں نے لکھے ہیں اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدہا لفظوں میں دہلی و لکھنؤ کے محاورے میں اختلاف ہے مگر ایسا نہیں ہے اختلاف محاورہ اس لفظ میں مسلم ہے جو لفظ محاورۂ عام میں داخل ہو ۔ جیسے سانس اور فکر کی تذکیر و تانیث میں دونوں شہروں میں اختلاف ہے یا جو لفظ محاورۂ خاص میں داخل ہو ۔ جیسے عارض و گیسو کی تذکیر اور شمشیر و سناں کی تانیث شعرا کے محاورہ میں داخل ہوگئی ہے ایسے الفاظ میں بھی اگر دہلی و لکھنؤ میں اختلاف ہو تو البتہ اسے بھی اختلاف کہیں گے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ محاورۂ عام میں داخل نہیں ہیں ۔ اہلِ شہر ان الفاظ کو بولتے نہیں ہیں ۔ لیکن سمجھتے تو ہیں ۔ اس کے سوا جتنے الفاظ ہوں ان میں دہلی و لکھنؤ کا اختلاف قابلِ اعتبار نہیں نہ اسے اختلاف محاورہ کہہ سکتے ہیں ۔ بھلا نامانوس و غیر مشہور الفاظ میں محاورہ

---

[1] ہم لوگ اوکڑو بیٹھنا ، وہ اوکڑوں بیٹھنا بنون غنہ بولتے ہیں ۔ ہم پینگ لینا بیائے مجہول بولتے ہیں وہ لوگ پینگ یائے معروف کے ساتھ کہتے ہیں ، ہم ترنگ کہتے ہیں وہ ترنگ بولتے ہیں ۔

کیا دخل ہے جو جس طرح چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ ایسے الفاظ میں کسی کو دہلی و لکھنؤ کی تقلید کرنا کچھ ضرور نہیں۔ اہلِ لکھنؤ اور اہلِ دہلی خود ایک دوسرے کے ساتھ لفظوں میں اختلافِ عظیم رکھتے ہیں اور یہ اختلاف آپس میں تو کیونکر آ سکتے۔ مدار محاورہ پر ہے۔

لفظ طرز، لکھنؤ و دہلی میں کسی زمانہ میں مونث تھا اور اب بعض شعرا جو اپنے اساتذہ کی تقلید کو محاورۂ حال پر مقدم سمجھتے ہیں وہ مونث نظم کئے جاتے ہیں ورنہ دونوں جگہ کے محاورے میں مذکر ہے۔ میں نے اکثر اہلِ دہلی کی تقریر و تحریر میں مثل سر سید احمد خاں مرحوم کے اس لفظ کو بتذکیر دیکھا۔[1] بلکہ اگلے زمانہ میں بھی یہ لفظ دہلی میں بتذکیر مستعمل ہوا ہے۔ شاہ عالم بادشاہ آفتاب دہلی کا یہ مطلع صفیر بلگرامی نے رشحات میں لکھا ہے :-

جب سامنے مرے وہ پریزاد آگیا ، دیوانگی کا طرز مجھے یاد آگیا ،

لفظ مخلوق لوگوں میں اسم مونث مشہور ہو گیا ہے لیکن لکھنؤ کے محاورہ میں یہ لفظ بحکم صفت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں آسمان خدا کا مخلوق ہے اور زمین خدا کی مخلوق ہے۔ لفظ نظیر کو لوگ عموماً مونث بولتے ہیں لیکن اہلِ لکھنؤ ذوی العقول کے مقابل میں مذکر بولتے ہیں۔ کہتے ہیں اس عورت کا نظیر نہیں میرے شفیق مکرم حکیم میر ضامن علی مرحوم جلال نے مجھ سے کچھ اشعار پڑھنے کی فرمایش کی۔ اس زمانہ میں منجھلے حضور مرشد زادہ مرشد آباد مشاعرے کیا کرتے تھے۔ انھیں کی طرح میں کچھ شعر میں نے بھی کہکر بھیجدئے تھے۔ وہی اشعار مجھے یاد آگئے۔ پڑھنے لگا۔ اور باصرار میں نے کہا کہ اگر کوئی شعر ٹوکنے کے قابل ہو تو ضرور کہہ دیجئے گا۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو اعتراض سے بُرا مان جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے اس شعر پر :

سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو رنگیں کر دیا ایڑیاں رگڑیں تو صیقل ہو گئی زنجیر میں

جنابِ جلال صاحب نے کہا کہ صیقل مذکر ہے اور یہ فرمانا ان کا بعض اساتذہ کی تقلید کے لحاظ سے تھا ورنہ لفظ صیقل دہلی و لکھنؤ میں اب مونث بولا جاتا ہے۔

تذکیر و تانیث الفاظ سے بحث کرنا اہلِ لغت کا کام ہے۔ لیکن میں اس مسئلہ میں بعض امور کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ صفت تذکیر و تانیث میں موصوف کے تابع ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمیز و ظروف و بعض متعلقات فعل تذکیر و تانیث سے معرّا ہوتے ہیں۔ مثلاً " تو نے اچھا کام کیا " اس جملہ میں اچھا صفت ہے اور کام موصوف۔ کام کے مذکر ہونے کی وجہ سے اچھا بھی اس مقام پر مذکر ہے۔ اگر یہ کہیں کہ " تو نے اچھا کیا "، تو اچھا مذکر ہے نہ مونث ہے۔ اس سبب سے کہ اچھا اب صفت نہیں ہے، مثل اس کے کہ " تو نے جھوٹھ کہا " " میں سچ بولا " " وہ خوب پڑھا " ان جملوں سے جھوٹھ سچ وغیرہ کا مذکر ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر یوں کہیں کہ سب جھوٹھ سچ کھل گیا تو اس سے جھوٹھ سچ کا مذکر ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ یہاں تمیز فعل نہیں۔ بلکہ فاعل ہے۔ مثل اسی کے ہے، اگر یہ کہیں کہ زید ایک دن آیا، اس جملہ میں دن تذکیر و تانیث سے معرّا ہے۔ اس سبب سے کہ ظرفِ فعل ہے۔ تیسرے یہ کہ اُردو میں بعض اسماء جزوِ فعل ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں ان اسماء کو تذکیر و تانیث سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ مثلاً میں نے سبق یاد کیا۔ اس مثال میں یاد کا لفظ تذکیر و تانیث معرّا ہے۔ اُردو کی نحو میں یہ بحث اہم مسایل سے ہے۔ گلکرسٹ کے سوا کسی نے ادھر توجہ نہیں کی۔ چوتھے یہ کہ افعال ناقصہ کی خبر اور افعال مقلوب کا دوسرا مفعول یہ دونوں تذکیر و تانیث سے معرّا ہوتے ہیں۔ مثلاً اشک گوہر ہو گیا۔ اشک گوہر کر دیا۔ اشک کو گوہر سمجھنا۔ ان فقروں سے گوہر کی تذکیر و تانیث نہیں ثابت ہو سکتی۔ پانچویں یہ کہ مضاف الیہ کے بعد اگر مضاف ہو تو حروف معنویہ کے الحاق سے مضاف کی تانیث میں کچھ تغیر نہیں ہوتا یعنی (کی) جو علامت تانیث مضاف ہے اس کا باقی رکھنا ضرور ہے۔ مثلاً :-

نورِ نظر کی آنکھوں میں سرمہ دیا۔ لیکن اگر ترکیب اضافی مقلوب ہو جائے۔ جیسے میر انیس کے اس مصرع میں ہے :-

" سرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نورِ نظر کے۔ اس صورت میں (کی) کی جگہ کے کہنا بھی درست ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اس مصرعہ میں سے اگر (آنکھوں میں) حذف کر دیں تو یہ فقرہ باقی رہ جائے گا (سرمہ دیا کبھی نورِ نظر کے) اور اب (کے) کہنا واجب ہو جائے گا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں اس کے کنگھی کی اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ سر میں یا بالوں میں اسی طرح کہتے ہیں اس کے گدگدی کی یا اس کے چٹکی لی اور یہ مقصود ہوتا ہے کہ بغل میں

---

[1] داغ کہتے ہیں :- طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں

یا گردن میں۔ غرض کہ ضابطہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی اپنی اصل پر ہو تو علامت تانیث مضاف یعنی کی کہنا واجب ہے اور حذف و تقدیر مضاف کی صورت میں (کے) کہنا واجب ہے۔ اور قلب ترکیب کی حالت میں دونوں طرح جایز ہے۔ انیس کے اس مصرع کو:۔

میدان میں تھا حشر بپا چال سے اسکے

اور آتش کے اس شعر کو ؎

معرفت میں اس خدائے پاک کے　　اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

صفیر بلگرامی نے اس بات کی سند میں لکھا ہے کہ چال اور معرفت مذکر ہے۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میری رائے میں ان مصرعوں میں کی اور کے دونوں کہہ سکتے ہیں۔ شاعر نے ضرورت شعر کے سبب سے کے اختیار کیا اور اسی قیاس پر برق کا یہ مصرعہ ا۔
" داڑھی میں لال بال تھے اس بدنہاد کے"۔ اور میر کا یہ مصرعہ " آنکھوں میں ہیں حقیر جس تس کے"۔ غلط نہیں ہو سکتا۔ کلکتہ میں ایک صاحب کی غزل میرے پاس اصلاح کو آئی اس میں یہ مصرعہ تھا اور یہی زمین تھی:۔ " پھینکی کمند آہ طرف آسمان کے"۔ میں نے دیکھا کہ یہاں کی کہیں تو محاورہ کا خون ہوتا ہے یونہیں رہنے دیا۔ اب چاہے کوئی غلط سمجھے لیکن لفظ طرف میں محاورہ یہی ہے کہ اصل ترکیب باقی ہو تو کی کہیں کے اور قلب ترکیب کی صورت میں کے کہتے ہیں۔ بہار عشق:۔ " جان پر بن رہی ہمارے ہے ؛ مر رہا تو جگت کے مارے ہے"۔

بلا ضرورت ہر زبان کا لفظ لے لینا بھی نہیں درست البتہ فارسی کا میل اُردو میں حسن رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جو الفاظ عربیہ فارسی میں غلط ہو کر مخلوط ہو گئے ہیں ان کی تصحیح کرنا بھی نہ چاہئے اور بلا واسطہ الفاظ عربیہ کا لینا تو بہت ثقیل ہے۔ لیکن فارسی زبان کے اسماء و صفات ہی اُردو میں کچھ اچھے معلوم ہوتے ہیں مصادر و روابط سے فصحا کراہیت کرتے ہیں۔ یہ نہ چاہئے کہ "در عین انتظار آپ کا خط پہونچا اور خیریت آپ کی درگاہ خدا سے نیک درکار ہے"۔ بہت سے الفاظ جو بمنزلہ روابط کلام ہیں۔ فارسی خوانوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اور بعض عربی کے الفاظ بھی اسی قسم کے اہل مکتب نے فارسی پڑھنے کی بدولت زبان میں داخل کر لئے ہیں۔ وہ سب کے سب کسی قدر فصاحت سے گرے تو ہوتے ہیں مثلاً چونکہ از بسکہ بدرستی کہ بتحقیق کہ حال آنکہ باوجودیکہ باوصفیکہ چنانچہ جزیں نیست ہر آئینہ ماقبل مابعد دبیش ازیں علاوہ بریں دربیش کار در اصل درحقیقت برخلاف برعکس، برمحل، بہ نسبت بموجب بدولت ہنوز نیس۔ لہذا لابد لاریب فی الحال بالفعل بالکل فیہا حتی الوسع حتی المقدور بالمشافہہ بالمواجہہ فقط یعنی وغیرہ۔ جس زمانے میں میر انیس مرحوم حیدر آباد میں تھے۔ انھیں دنوں کا ذکر ہے کہ ایک صاحب ان کے کلام کو کلام میر پر ترجیح دینے لگے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ میر استاد کامل تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے اور ان کے کلام کا میں نے مقابلہ کر کے دیکھا آپ ہی کا کلام تفوق رکھتا ہے۔ میر صاحب کو تعجب ہوا کہ مرثیہ اور غزل کا کس طرح مقابلہ ہو سکتا ہے یہ اور راہ ہے وہ اور کوچہ ہے۔ ان بزرگ نے میر کا ایک مطلع پڑھا:۔

اس زلف پہ محو ہو گئے ہم　　یعنی سر شام سو گئے ہم

اور کہا کہ اس مطلع میں اس زلف اور یعنی کو ملاحظہ کیجئے اور اسی زمین میں آپ کا مطلع بھی مجھے یاد ہے اس کی صفائی کو دیکھئے:۔

ایک آہ میں سرد ہو گئے ہم　　ٹھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

یہ سُن کر میر انیس مسکرانے لگے۔

فارسی و عربی کے بعض الفاظ اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ اور غلط ہی بولنا چاہئے بھی۔ ان کا صحیح کر کے بولنا ہندیوں کی زبان پر ثقیل ہے۔ جیسے عیادت و عیال و عیاں بکسر عین ہے۔ مگر بولتے بفتحہ ہیں۔ ایک نقل میں نے سنی ہے کہ میر حکیم ضامن علی مرحوم جلال سے نواب کلب علی خاں مرحوم والی رامپور نے پوچھا کہ آپ عیاں کو عیاں کہیں گے انھوں نے جواب دیا کہ عیاں تو ہم کبھی نہ کہیں گے۔ لفظ رفو میں ف کو ساکن پڑھنا چاہئے لیکن فارسی و ہندی کے لہجہ میں اس کا تلفظ مشکل تھا۔ رفو بضم فا مستعمل ہو گیا۔ اسی طرح ناگوار و گوارا میں کاف مضموم ہے لیکن اُردو میں بفتح کاف ہی مستعمل ہے، لفظ رعشہ اور لفظ عیادت کو اکثر اہل لغت بکسر اول صحیح سمجھتے ہیں۔ لیکن اُردو میں بفتح اول ہی بولنا چاہئے۔ لفظ مطلع بکسر لام اور لفظ موقع بکسر قاف صحیح ہے لیکن اُردو میں اس کی تصحیح ممکن نہیں جمع سے التباس ہو جاتا ہے۔ عوض علی خاں، میر انیس کے ایک شاگرد تھے

وں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے عمود کو بواوِ معروف پڑھا تو میر صاحب نے منع کیا اور کہا عمود کہو بواوِ مجہول اور نورِ چشم کے لفظ میں کسرۂ اضافی کے ھنے کو بھی میر صاحب منع کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ اضافت اُردو میں بُری معلوم ہوتی ہے۔

بعض الفاظ عربی الاصل اُردو میں اس طرح مل گئے ہیں کہ اُن کا بدل نہیں ہو سکتا اور پھر اصل معنی بھی اُن میں باقی نہیں رہے، جیسے واسطے۔ ج۔ معارف وغیرہ ممکن ہی نہیں کہ ان کی تصحیح کی جائے۔ البتہ یہ غلط سمجھا جائے گا کہ تقریباً کے محل پر قریباً، اندازاً لکھا جائے یا حال کے محل پر ظ موجودہ۔ ایسے محاورے غلط ہیں دوسرے یہ کہ بعض لوگوں کے نکالے ہوئے یہ الفاظ محاورۂ عام نہیں ہیں بلکہ وہ محاورۂ ام ہیں۔ محاورۂ عام کی تصحیح البتہ مخلِ فصاحت ہے جیسے لایعقل و لاابالی بلا لحاظ ضمیر متکلم و غائب بولتے ہیں۔ اس طرح لفظ یعنی ہے کہ اس میں میر غائب کا لحاظ مطلق نہیں کرتے۔

بعض الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل اُن کی کچھ اور تھی لیکن دہلی و لکھنؤ کے لوگوں نے تصرف بیجا کیا ہے مثلاً جھکولے کو ہچکولا کہنا دونوں شہروں کا محاورہ ہے مگر میرے خیال میں جھکولا ہی فصیح ہے اور قدیم اُردو یہی ہے قدمائے شعرا کے کلام میں یہ لفظ موجود ہے۔ اسی طرح لفظ چیدہ میں تصرف کر کے دہلی، لکھنؤ کے لوگوں نے چنندہ کہنا شروع کیا۔ اور یہ بھی عامیانہ محاورہ ہے، جھلک میں اہلِ لکھنؤ نے تصرف کر کے جھلکی بنا دیا۔ شاہزادہ میرزا آسمان جاہ مرحوم کا ایک شعر مجھے یاد آیا ؎

سرک جاتے ہیں اک جھلکی دکھا کر کہ رہ جائے پھڑک کر دل کسی کا

اور اہلِ دہلی نے تصرف کر کے جھلکا بنایا مرزا داغ مرحوم کہتے ہیں مصرعہ "اپنے کوٹھے سے جو کل اس نے دکھایا جھلکا"۔ بعض الفاظ دلی میں اپنے اصل پر ہیں اور اہلِ لکھنؤ نے تصرف کیا مثلاً دھکیلنا دال ابجد سے دلی کی زبان ہے اور ڈھکیلنا دال ہندی سے لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ اسی طرح کھُردرا کو مخفف کر کے اہلِ لکھنؤ کھدرا کہتے ہیں مگر مجھے کھُردرا ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں اور محاورے میں مفرد بولے جاتے ہیں جیسے ارواح، اوقات، اولاد، بعض الفاظ مفرد ہیں اور محاورے میں جمع بولے جاتے ہیں مثلاً "اس کے کیا معنی" جو خالص زبانیں دنیا میں ہیں ان میں اہلِ دیہہ کا محاورہ مستند سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اہلِ شہر کی زبان غیر قوموں کے خلط سے محفوظ نہیں رہتی۔ ابتدائے اسلام میں جب عربی کی زبان بگڑنے لگی تو اہلِ بادیہ و اعراب سے زبان کو مطابقت دیا کرتے تھے لیکن اُردو مخلوط زبان ہے۔ اس کا معاملہ برعکس ہے اہلِ شہر کی اُردو گاؤں والوں سے اچھی سمجھی جائے گی، تعجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے تھوڑی دور باہر جایئے تو آنکھیں کہنے کے بدلے آنکھیں بفتح کاف اور گلا گھونٹنے کو گھونٹنا بواوِ مجہول اور جاگنے کو جگنا بولتے ہیں۔ یہی حال دہلی کے گاؤں والوں کا ہے۔ آٹے کو آتا۔ روٹی کو روٹی بتشدید پانی کو پانڑیں بولتے ہیں۔

تازگی لفظ کا ہر اہلِ قلم کو خیال ہوتا ہے اور بیشک لفظ تازہ مضمون تازہ کے برابر بلکہ بہتر ہے لفظ کے انتخاب کرنے کا امتیاز خداداد بات ہے کوئی لفظ خوبصورت ہوتا ہے کوئی بھونڈا پھر صرف کرنے کا سلیقہ بھی فطری قابلیت ہے بعض لفظ اصل میں اچھا ہے لیکن کسی ایسے محل پر صرف ہوا کہ خوبصورت ہو گیا یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپ نے لفظ کو تازہ سمجھ کر صرف کیا اور سننے والے کو وہ لفظ غریب و وحشی معلوم ہوا۔ میرانیسؔ، شاہزادہ علی اکبر کی اذان کا ذکر فرماتے ہیں ع "وہ لوذعی کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے"۔ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ یہاں لوذعی کا لفظ غریب ہے اور بیمحل بھی صرف ہوا ہے۔ مثنوی شقشقیہ میں جہاں ملاؤں اور قاریوں پر آوازے کسے ہیں ایک شعر میں الفاظ غریب کو عمداً میں نے بھر دیا ہے ؎ آپ عریف ہیں غشمشم ہیں آپ غطریف ہیں غطمطم ہیں

محل ہجو میں ان الفاظ کا استعمال غالباً بیجا تو نہیں ہوا۔ اس سبب سے کہ یہاں اس کی نقل کرنا منظور ہے میر علی اوسط مرحوم کہتے ہیں:۔

"رشک کو اقرار ہے رائے زرینِ یار کا!" اس مصرع میں لفظ زریں تازہ نہیں ہے بلکہ غریب ہے اور پھر اپنے محل سے بھی الگ ہے اگر حضرت واعظ یا جناب شیخ یا ناصح مشفق کی رائے زریں کا اقرار ہوتا تو شاید اس قدر بیجا نہ معلوم ہوتا۔ دیکھو ایک لفظ کے بے محل ہونے سے سارا شعر کیسا بے مزہ اور سست ہو گیا۔ سرسید احمد خاں کے ایک مضمون میں ہے "جانوروں کی چھاتیاں" اس لفظ کو وہ بے محل استعمال کر گئے۔ چھاتیاں انسان

فانی بدایونی

(تقابلی مطالعہ)

فانی کی زندگی مرقعِ یاس وحرماں تھی۔ کبھی غمِ معاش ہے تو کبھی مرگِ پدر کا رنج۔ کبھی والدہ کی مفارقت کا الم ہے تو کبھی لڑکوں کی طرف سے مایوسی، لڑکی جو ان کو بہت عزیز تھی وہ بھی جاتی رہی اور آخر میں بیوی کے سانحہ ارتحال نے فانی کے لئے احساسِ غم ہی کو اصل زندگی بنادیا۔ فانی موت اور زندگی کے درمیان ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے رہے، موت نے جب آنکھیں دکھائیں تو حیات کی طرف پلٹے اور جب حیات نے پریشان کیا تو موت کو آواز دی۔ فانی کی یہی زندگی تھی

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل　　موت کو مناؤگے جان سے خفا ہو کر

فانی کا ہر شعر ان کے رازِ دروں کا ترجمان ہے۔ اور غزل کی تینوں شرطیں (سادگی، اصلیت اور جوش) ان کے ہر شعر میں موجود ہے

میر اور فانی میر اور فانی کی زندگیاں ہر معاملہ میں کچھ اس قدر مشترک ہیں کہ ان کا انفکاک مشکل ہو گیا ہے۔ میر کو ساکنانِ اکبرآباد کی بے مہریوں کی شکایت تھی تو فانی اہلِ وطن کے عناد کے شاکی تھے۔ میر اگر تنگیِ معاش سے تنگ آکر دلی گئے تو فانی کو حیدرآباد جانا پڑا۔ میر کو جس طرح لکھنؤ کے قیام میں امن وسکون میسر نہیں آیا اسی طرح فانی کو حیدرآباد کی اقامت گزینی سے آرام اور راحت نصیب نہیں ہوئی۔ میر میں اگر خودی اور خودداری تھی تو فانی بھی اس معاملہ میں کچھ پیچھے نہیں تھے۔ دونوں کو حفظِ وضع کا خیال۔ دونوں ناکام اور دونوں کو تنگیِ معاش کی شکایت۔ اس لئے دونوں کے کلام میں بھی مماثلت ہونا چاہئے۔

میر کے یہاں آہ وفغاں، مجبوری وبےکسی، ناکامی ونامرادی، بےثباتیِ عالم اور ناپائداریِ دنیا، عشق کی ستم انگیزی اور فقر وقناعت ان کی غزل کی نمایاں خصوصیات ہیں اور وہ انھیں کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کلیجہ پکڑ کے رہ جاتے ہیں۔ کبھی وہ زبان اور طرزِ ادا کی سادگی سے یہ کام لیتے ہیں اور کبھی نشتر نما فقروں میں یہ بات کہہ دیتے ہیں مثلاً:۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے
فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

فانی کی طبیعت بھی اسی سوز وگداز، یاس وحرماں اور درد وکرب کا مجموعہ تھی۔ مگر فانی اسی غم کو غمِ جاوداں جانتے ہیں، جذبات کی تیزی اور احساسات کی شدت میں وہ میر صاحب سے بہت نزدیک ہیں۔ مثلاً:۔

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو　　اُن کے آگے جو بار بار آیا
کس سے اب درد کی دوا چاہوں　　درد اٹھتا ہے لے کے تیرا نام
آس ہوتی تو اس سہارے پر　　صبر ممکن نہ تھا مگر کرتے
جب پرسشِ حال وہ کرتے ہیں کیا جانئے کیا ہو جاتا ہے　　کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے
دل کو کس دن قرار آیا تھا　　تم کسے بے قرار کرکے چلے

اور قسمت سے سوا ہو گیا — درد جگر ! یہ تجھے کیا ہو گیا

اب بھی ترا وعدہ وفا ہو نہ ہو / موت کا وعدہ تو وفا ہو گیا

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا / زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی نے جو غزلیں بحرِ متقارب میں کہی ہیں بالکل میر کے رنگ کی ہیں اور بعض وقت فانی پر میر کا رنگ اتنا چھا جاتا ہے کہ وہ میر صاحب کے زمانے کے الفاظ و فقرات کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً:

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے، آکے جگا تو جاتے ہیں / ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے، جاگتے ہی سو جاتے ہیں

کیا چھپاتے کسی سے حال اپنا / جی ہی جب ہو گیا نڈھال اپنا

دل کا اجڑنا سہل ہے، بسنا سہل نہیں ظالم / بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں / جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

باوجود اس کے فانی، میر نہیں، سوا سو برس کی زبان اور میر کے سوز و گداز نے مل کر فانی کے کلام میں جو دلآویزی اور دلکشی پیدا کر دی ہے وہ کہنے کی نہیں محسوس کرنے کی چیز ہے — میر صاحب کی طرح فانی رنج و غم سے گھبراتے نہیں۔ بلکہ اس میں ان کو سکون نصیب ہوتا ہے:-

غم مجسم نظر آیا تو ہم انساں سمجھے / برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے

میر صاحب جبر کے قایل ہیں مگر فانی کا عقیدہ جبر و اختیار کے درمیان ہے:-

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل / غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

گلشنِ تصویر میں تھے طائرِ تصویر ہم / کیا کہیں، کیونکر رہے، مجبور بھی آزاد بھی

میر کے اسلوب بیان میں حسرت، سوز و گداز، اثر، دلکشی اور روانی پائی جاتی ہے مگر فانی کے یہاں یہ چیزیں نسبتاً کم ہیں، میر کے کلام میں فلسفہ و حکمت کا دخل نہیں ہے، مگر فانی کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

غالب اور فانی

غالب کا رنگِ کلام کئی رنگوں کا مجموعہ ہے، مرزا بیدل کی ترکیبیں، میر کا درد و غم، نظیری کا تغزل، عرفی کی جدت آفرینی کے امتزاج سے غالب کا رنگ طیار ہوا ہے، فانی کی طبیعت بھی غالب کی طرح نکتہ رس اور حکیمانہ واقع ہوئی ہے۔ جس چیز سے ان میں ابتہاجی یا انقباضی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے کی وہ سعی کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:-

غالب:- لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے / یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فانی:- بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی / یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب:- عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا / درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فانی:- قطرہ قطرہ رہتا ہے، دریا سے جدا رہ سکنے تک / جو تابِ جدائی لا نہ سکے، وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

فانی نے اپنی قادر الکلامی سے غالب کے رنگ کو اور زیادہ چوکھا بنا دیا۔ ملاحظہ فرمائیے

آزردہ تھا کہ ضبطِ فغاں میں اثر نہیں / شرمندہ ہوں کہ ضبط مرا رائیگاں نہ تھا

اللہ رے بے نیازیِ آدابِ التفات / دیکھا تجھے تو پاسِ نظر درمیاں نہ تھا

آنکھیں نہیں ہے، تہمتِ نظارۂ جمال / منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

سنگ وہ دیکھ کے سر یاد آیا / کوئی دیوانہ مگر یاد آیا

فانی کو غالب سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ بیان کی شگفتگی ہے۔ یوں تو زندگی کی حقیقت اجاگر کرنے میں دونوں نے تجربات ہی کو سامنے رکھا ہے مگر فانی نے اس کے ساتھ الفاظ و تراکیب کی شگفتگی اور دلآویزی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، غالب کا شعر مخاطب کا محتاج ہے۔ بخلاف اس کے فانی کے

یہاں خود فنا ہی ہے اور اسی سے ان کی آواز غیب کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے فانی نے ہر موقع پر دلیل کو سامنے رکھا ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

غالب :- ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

فانی :- ہو جزو نگاہ غلط، جلوہ خود فریب عالم دلیل گمرہی چشم و گوش تھا

غالب :- ہے غیب غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فانی :- تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گل کرشمۂ حیات ہے، خیال وہ بھی خواب کا

فانی نے اسی خیال کو دوسری جگہ جوش خلوص کے ساتھ ظاہر کیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی:

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

غالب کا شعر ملاحظہ فرمائیے:-

ہاں کھائیو مت فریب ہستی، ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

فانی نے اسی مفہوم کو اس طرح پیش کیا ہے:-

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہئے، راز ہے بے نیاز محرم راز

غالب کے یہاں قطعیت ہے اور فانی کے یہاں محویت۔ غالب کے یہاں نفی محض ہے اور فانی کے یہاں اثباتیت۔ دونوں نے وحدت الوجود پر طبع آزمائی کی ہے ملاحظہ فرمائیے:-

غالب :- نہ تھا جب کچھ، خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

"کیا ہوتا" کے اندر جو معنویت پائی جاتی ہے اس کا جواب نہیں، مگر فانی نے انسان کے احساس انانیت کا فلسفہ بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے:-

میرا وجود ہے میری نگاہ خود نشناس وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

مومن اور فانی

بلند خیالی مومن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے مگر بعض وقت اشکال پیدا کر کے شعر کی لطافت کو ختم بھی کر دیتے ہیں۔ مومن کو ترکیبوں کی تراش و خراش میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ مومن کے عشق میں رکاکت نہیں ہے۔ جیسے وہ خوددار تھے، ویسا ہی ان کا عشق بھی خودداری کے جذبوں سے معمور تھا، اسی لئے مومن کے کلام میں وہ تمام کیفیات پائی جاتی ہیں جو حسن و عشق کی دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔

فانی کے کلام میں بھی معنی آفرینی اور نزاکت خیال کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں مگر ان کی معنی آفرینی مومن کی معنی آفرینی سے مختلف ہے۔ مومن معنی آفرینی میں اس درجہ غرق ہو جاتے ہیں کہ مفہوم کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے مگر فانی کی معنی آفرینی معمّا نہیں بنتی۔ مومن تراکیب نو کے اختراع کے شوقین ہیں مگر ترکیب کی پیچیدگی عام فہم سے بالا ہو جاتی ہے اور فانی کی دلکش ترکیبیں اس قسم کی نہیں ہیں، مومن کے کلام میں جہاں خیال کی بلندی ہے وہاں عموماً الجھن بھی ہوتی ہے، فانی کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً:-

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ہم تمھارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا،

یہ بھی اک التفات ہے ورنہ دعوت نالہ ہائے پیہم کیا

کمال ضبط غم عشق اورے معاذ اللہ کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا

جلوۂ اختیار سے نسبت جبر ہے مجھے، شعلۂ آرمیدہ ہوں وادیٔ برق ناز میں

مومن ندرت ادا، دلکش تراکیب اور خوبصورت بندشوں کے اختراع کرنے میں جہاں مشہور ہیں، وہیں اپنے مقطع کے اعتبار سے ہر کو و مہ کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ چیز فانی کی شاعری کا بھی نمایاں جوہر ہے ملاحظہ فرمائیے:-

فانی زندگی ہے زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی

خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشت جنوں کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیابان ہونا

چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید — کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے
کس کی کشتی تہِ گرداب فنا جا پہنچی — شورِ لبیک جو فانی لبِ ساحل سے اٹھا
آج روزِ وصال ہے فانی — موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

داغ و امیر اور فانی

داغ کے رنگ سے کون واقف نہیں، شعر آیا اور داغ پہچانے گئے۔ ان کی روانی و سلاست فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے بیان میں شوخی، تیکھا پن، بانکپن، بیباکی ہے، معشوق سے بے محابا باتیں کرنا، جلی کٹی سنانا، طعن و طنز کرنا انکا کام ہے۔ امیر کا بھی یہی رنگ ہے مگر وہ لاگ ڈانٹ، چھین جھپٹ میں امیر پیچھے رہ جاتے ہیں، امیر ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر داغ، جرأت کی طرح آزاد ہے۔ فانی کے یہاں جستہ جستہ داغ و امیر کے رنگ کے اشعار بھی موجود ہیں۔ یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب فانی لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے

ہے کفن گردِ لحد، دیکھو نہ میلا ہو جائے — آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے
ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے — مری قضا کو وہ لائے دولھن بنائے ہوئے
مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ — بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
مرا قتل اُن کے ہاتھوں یہ تو باتیں، — کچھ ان کی ہیں، کچھ اُن کے نامہ بر کی
تم کیوں نئے تھے آئینہ خانے میں بے حجاب — اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی
تربت کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے — رو رو کے صبح کی مری شمعِ مزار نے

فانی پر لکھنؤ کے قیام تک لکھنویت کا اثر رہا لیکن بعد کو یہ رنگ اُڑ گیا۔ الغرض فانی نہ میر ہیں، نہ غالب، نہ مومن ہیں، نہ امیر و داغ مگر پھر بھی سب کچھ ہیں اگر میر کا درد و غم، غالب کا فلسفہ و تصوف، مومن کی بلند خیالی اور نزاکت، ندرت و ترکیب الفاظ۔ امیر و داغ کی شوخی ان سب کو ملا دیا جائے تو فانی کی شاعری کا منصب بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

فانی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے اور اسی لئے ان کی زندگی کے ہر موڑ کے ساتھ ان کے کلام کا رخ بھی بدلتا رہا۔ فانی کے یہاں سپردگی، پندارِ نیاز، احساسِ حسن، عرفانِ حیات کے شدید جذبات موجود ہیں۔ مگر ان سب میں غم کی جھلک بھی شامل ہے۔ سپردگی کا تقاضہ یہ ہے کہ شاعر اپنے کو بھول جائے۔ مگر فانی نے اپنی انفرادیت کو ہمیشہ سامنے رکھا اور اس طرح کہ احترامِ حسن یا انکسارِ شوق کے ساتھ جن خود داری بھی پیدا ہونے پائے یہاں تک کہ یہ جذبۂ عجز و انکسار، غرورِ عجز و انکسار بن گیا۔ غالب نے ایک ہی شعر میں معشوق کے علوئے مرتبت کے ساتھ اپنی خودداری کو بھی قائم رکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مگر فانی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

چُن لیا تیری محبت نے مجھے، — اور دُنیا ہاتھ مل کر رہ گئی
بے ذوقِ نظر، بزمِ تماشا نہ رہے گی — منہ پھیر لیا ہم نے، تو دنیا نہ رہے گی
اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر — وعدۂ دید چاہیئے، دیدۂ انتظار کیا
تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ — اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

جس حسن سے فانی کو عرفانِ حیات حاصل ہوا، جس نے فانی کے احساس و ادراک کو قوت عطا کی، جس نے زندگی کو انوار سے بھر دیا، فانی اس کو کیسے بھول سکتے تھے:۔

نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے — ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ خاموش تھا

فانی حسن و سپردگی کے باوجود ہمیشہ اضطراب و خلش محسوس کرتے ہیں اور فانی کا اضطراب جس غم کا خلاق ہے وہ جبرِ موت کی مایوسی کے

نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جستجوئے غم میں جہاں ان کو عرفانِ حیات حاصل ہوتا ہے وہیں وہ موت سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں ؎

سکونِ قلب میسر ہے، موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمۂ رنجِ اضطراب ہوا

تو کہاں تھی اے اجل، اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

کی قضائے مبرم نے زندگی کی غمخواری
درد کی دوا پہونچی درد بے دوا ہو کر

فانی کے جذبۂ اضطراب کی تخلیق، محبت، خودداری، غم اور موانست کے جذبات کی آمیزش سے ہوئی - ان میں بعض جذبے ابدی ہیں -

قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ نہ کم ہوئی
یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا

سینۂ فانی ہے یا جولانگہِ برقِ فنا
دل ہے یا رب یا بلائے آسمانِ اضطراب

بعد فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قراریاں
لاشہ نہ تھی اگر کوئی بجلی کفن میں تھی

اور فانی بڑھ گئی بیتابیِ دل بعد مرگ
کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

سکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں
رہے مگر کوئی اتنا نہ بے قرار رہے

اگر فانی کے جذبات کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی خوشی کو عینِ غم اور رنج کو حقیقی مسرت محسوس کرتے ہیں، اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ وہ ہر مدعا سے اپنے کو محروم تصور کرنے لگتا ہے اور عدم حصول مدعا، انکا مدعا بن جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیے ؎

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

فانی زندگی کی ہر دو قلمونی کو محبت کی بوقلمونی تصور کرتے ہیں، محبت ان کی رگ رگ وپے میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ دل کی ہر کھٹک، محبت کی کشش محسوس ہوتی ہے، وہ اپنے گریہ و ماتم سے دوست تو دوست دشمن کو بھی رلا دیتے ہیں وہ اپنے غم کا عکس تمام مظاہر میں موجود پاتے ہیں چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

میں دردِ فرقت سے جاں بلب ہوں، تمھیں یقینِ وفا نہیں ہے
مجھے نہیں اعتبار اپنا تمھیں نہیں اعتبار میرا

مری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

نذرِ دردِ دل، غمِ دنیا کیا
اک مٹایا داغ اک پیدا کیا

بجلیاں بھر دیں نگاہِ یار میں
تو نے آہِ آتشیں یہ کیا کیا

زیست تھی بیکار فانی دل کے بعد
جان بھی قربان کی، اچھا کیا

دیدنی ہے رنگ دل میں ڈوب کے کھنچنے کے بعد
تم ابھی کیا دیکھتے ہو تم کے خنجر دیکھنا

سانس کے جو آخری جھٹکوں میں ٹکڑے ہو گئیں
ہائے ان ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا

جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

مرے شوق نے سکھایا، اسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

کی وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گن گن کے لئے خونِ وفا کے بدلے

فانی کے نزدیک محبت کا مقام بہت بلند ہے، یعنی جب انسان اپنے کو غم کی آگ میں اچھی طرح تپالے، ہر سانس غم آلود ہو جائے، ہر شعلۂ نفس سے درد کے شرارے اڑنے لگیں، اسوقت انسان اس قابل ہوتا ہے کہ عشق و محبت کا دعوی کر سکے۔ فانی کی زندگی اس نظریۂ محبت کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

باب المراسلة والمناظرہ

استفادہ، سرقہ و توارد کی بحث

(فضا ابن فیضی اعظمی)

مکرمی و معظمی! ـــــ "نگار" ماہِ اگست ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں جناب اقسر صاحب کے غم و غصہ کا گرجتا ہوا بادل اور چڑھتا ہوا طوفان دیکھا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سے کتنے دل متاثر ہوئے ہوں گے، مگر زبانِ فضا پر یہی مصرعہ جاری تھا: "بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی"۔ اور اس ادائے خاص نے کہ "فضا کا کلام اگر شایع ہوگا تو میں نگار کا مطالعہ بند کر دونگا" آپکے دل کو بھی گرمایا۔ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں"۔

حضرت! میری خاموش فطرت اس کی متقاضی نہ تھی کہ کچھ عرض کرتا، اور نہ آلام و محن ہی اس کی اجازت دیتے تھے، مگر آپ کے بے لاگ تنقیدی جائزے نے مجھے مجبور کر دیا کہ چند کلمے بطریق معذرت پیش کر دوں ـــ حقیقت یہ ہے کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ مجھے دعوائے سخن سنجی، جب کبھی طبیعت کسی چیز سے متاثر ہوتی ہے تو بے اختیار کہہ لیتا ہوں۔ اس سے نہ اظہارِ علم و فن مقصود ہے نہ جلبِ منفعت نہ علوئے مرتبت۔ "نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا"۔

لاریب، جو فرو گزاشتیں واقعی ہوں مجھے اس کے اعتراف میں عذر نہیں، میں اپنے ان بزرگوں کا ہمہ تن سپاس ہوں جو مجھ کو میری کمزوریاں بتا کیں یقیناً وہ میرے محسن ہیں اور ہزاروں شکریہ کے مستحق ـــ مجھے اپنی تمام انسانی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود اس امر کا یقین و اطمینان ہے کہ میں نے ہنگامِ فکر کبھی ایسی چیز کے اپنانے کی ناجائز کوشش نہیں کی جو دوسروں کی علامتیں اور خاص حصہ بن چکی ہوں ـــ بلاشبہ ایک مخصوص طرزِ ادا، ایک خاص تخیل اور شعر کی حیثیتِ مجموعی کسی موجد کی ملکیت ہوتی ہے، مگر الفاظ، محاورے اور امثال کسی کی میراث نہیں، نیز اکثر تشبیہات، استعارات، خیالات و نظریات میں اس درجہ توافق، یکسانیت اور عمومیت ہے کہ کسی کے کلام میں استفادہ، سرقہ اور توارد کا فرق کرنا دشوار ہے، اور استفادہ کو سرقہ، سرقہ کو تتبع یا ادرکو سرقہ اور سرقہ کو توارد کہنا آسان بھی ہے اور بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو سخت مشکل، ایک سرقہ بتاتا ہے تو دوسرا سرقہ تو کیا توارد کا بھی شائبہ نہیں سمجھتا، جیسا کہ آیندہ مثالوں سے معلوم ہوگا ـــ یہ واقعہ ہے کہ تتبع و تقلید بزرگوں کا قدیم طریقہ رہا ہے حالانکہ وہ خود صاحبِ طرز تھے مگر دوسروں کے کلام کو معیاری چیز قرار دیکر ان کے تتبع کا اعتراف کرتے تھے اور صرف اعتراف ہی نہیں بلکہ اپنی شاعری کا سنگِ بنیاد ان کے طرزِ سخن پر رکھا۔

علامہ شبلی خواجہ حافظ کے متعلق لکھتے ہیں: "خواجہ حافظ نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا"۔

خواجہ حافظ خود کہتے ہیں: ـــــــ استادِ غزل سعدی پیش ہمہ کس اما ٭ دارد سخن حافظ طرزِ سخنِ خواجو

امیر خسرو امیر الشعراء ہیں پھر بھی خمخانۂ شیراز سے سرمستی کا کیسا اعلان کرتے ہیں:- خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت ٭ شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

مرزا صائب اتباعِ حافظ کو لکھتے ہیں:- ـــــــ رواست صائب اگر نیست از رہِ دعویٰ ٭ تتبعِ غزلِ خواجہ گرچہ بے ادبی است

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے: ـــــــ "پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ٭ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور"

کسی کا شعر ہے نام یاد نہیں رہا: ـــــــ "رکتا نہیں روکے سے مزاجِ خوش طبیعت ٭ چشمہ وہ دشوار میں ہوتا ہے رواں اور"

یہ شعر مرزا کے شعر کا ایک پرتو ہے جو تتبع و استفادہ کے حدود میں ہے ـــ تتبع و استفادہ کے علاوہ بقول پروفیسر قادری صاحب بعض خیالات، بعض مضامین بعض اسالیبِ بیان، بعض ترکیبیں ایسی عام اور فطری ہوتی ہیں کہ اکثر آدمیوں کے ذہن میں بغیر کسی خاص غور و فکر کے آجاتی ہیں، انکے استعمال پر سرقہ کا الزام دینا ظلم ہے ـــ عرفی کا شعر ہے:- "کافر تراست زاہد از برہمن و لیکن ٭ او را بت است در سر در آستیں ندارد

غالب کہتے ہیں:- زمن حذر نکنی گر لباسِ دیں دارم ٭ نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

مرزا کے اس شعر کو عرفی سے سرقہ کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سرقہ کیا توارد کا بھی شائبہ نہیں، "بت در آستیں داشتن" کا محاورہ سرقہ کی دلیل نہیں

جاتا ہے تو پھر محاورہ عام ہو گیا اور اولیت ختم ہو گئی۔ مضمون دونوں شعر کے الگ الگ ہیں۔

شیخ سعدی کا شعر ہے:- اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم — تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

خواجہ حافظ کا مطلع ہے:- بنال بلبل اگر با منت سر یاری است — کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

کسی کا اُردو شعر ہے:- آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

انصاف سے اگر دیکھا جائے تو شاعر اور بلبل کا عشق اس قدر عام و مشہور ہے کہ یہ مضامین بغیر اخذ و سرقہ کے ذہن میں آ سکتے ہیں۔

غالب کے اس شعر کو محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی کے اس شعر کا سرقہ کہا جاتا ہے:- ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — ایں ہا ہمہ راز است کہ مفہوم عوام است

تو عرفی کو حافظ کے اس شعر کا سارق کہنا چاہئے۔

حافظ:- مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

لیکن در اصل اس مضمون میں اگر مضمون کی نوعیت پر غور کیا جائے تو سرقہ کا الزام بیجا ہے ورنہ فارسی کے شعراء متاخرین کی اکثر شاعری متقدمین و متوسطین کا سرقہ ہو جائے گی اور پھر اُردو شاعری تمام کی تمام مالِ مسروقہ۔ سرقہ کی مثال میں مرزا کا یہ شعر بھی ہے:-

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مرزا بیدل:- بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

ولی دکنی کا شعر ہے:- ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں — مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

نظیری:- نہ چناں گرفتہ جا تو میانِ جانِ شیریں — کہ تواں ترا و جاں را زہم امتیاز کردن

اگر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے اور مترجم سارق نہیں، تو ولی پر سرقہ کا جرم عاید نہیں ہو سکتا اور مرزا کے متعلق بھی شاید۔

سرقہ اور توارد کے علاوہ ایک اور صورت بھی واقع ہوتی ہے، وہ یہ کہ ایک شاعر دوسرے کے جواب اور اس کے مقابلہ میں طبع آزمائی کرے، یہ بڑی نازک بات ہے، اس میں جواب و مقابلہ کا بہتر یا کم سے کم برابر ہونا ضروری ہے ورنہ سعی رائگاں جائے گی۔

مرزا کا مقطع ہے:- میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

میر حسین تسکین:- کوچۂ یار میں میں نے تسکیںؔ — پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

مومن خاں:- دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک میں اسے دیکھا کیا

داغ:- آئینۂ دل نے تماشا کیا — اپنی جگہ میں اُسے دیکھا کیا

عرفی:- حد کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست — ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من است

مرزا کا مشہور شعر ہے:- ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مومن خاں:- تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

طاہر:- یار کے وعدۂ فردا کی قسم سچ کہنا! — کل ترے شام کہاں اے شبِ ہجراں ہو گے

مقدر مرزاپوری:- اپنے گھر سے تجھے تنہا تو نہ جانے دیں گے — صبح کو ہم ترے ساتھ اے شبِ ہجراں ہوں گے

ان شعروں میں جواب اور مقابلہ کی صورت ہے، ان کو سرقہ سے کوئی تعلق نہیں۔

چند شعر اور پیش ہیں جن سے اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا کے فرق کا اندازہ ہو گا حالانکہ مصرعے کے مصرعے اور فقرے کے فقرے یکساں ہیں۔

یزید:- انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق — ادر کاساً و ناولہا الا یا ایہا الساقی!

مطبوعات موصولہ

پشتو لوک گیت مجموعہ ہے ان گیتوں کا جو پشتو بولنے والے پٹھانوں میں گائے جاتے ہیں۔ اس میں سات قسم کے گیتوں کو جمع کیا گیا ہے جو مختلف موقعوں پر مردوں اور عورتوں کی طرف سے گائے جاتے ہیں۔

ایک قوم کا صحیح مزاج سمجھنے کے لئے اس قسم کے گیتوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور ہمیں عوام کے انھیں سادہ جذبات سے ان کے رجحانات و میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ پٹھان قوم بڑی سخت دل اور ناعاقبت اندیش سمجھی جاتی ہے، لیکن ان گیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت ایسی نہیں ہے اور ان کے دل بھی حسن و محبت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے خالی نہیں۔ جناب فارغ بخاری نے ان گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی اردو میں درج کر دیا ہے جو بہت سلیس ہے۔

کتابت و طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: نیا مکتبہ قصہ خوانی پشاور

نالۂ پابندنے مجموعہ ہے جناب اختر انصاری اکبرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ ابتدا میں جناب علی اختر حیدرآبادی اور جناب شاعر لکھنوی کے دیباچے نظر آتے ہیں جس میں انھوں نے کافی وضاحت کے ساتھ اختر صاحب کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مجموعہ میں بڑا حصہ غزلوں کا ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زمین بالکل نئی ہے۔ اختر صاحب کو نئی زمینوں میں غزل لکھنے کا بڑا شوق ہے اور وہ اس میں اکثر جگہ بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اختر صاحب چونکہ اپنے میلانات کے لحاظ سے جدید دور کے شاعر ہیں اسلئے ان کے جذبات میں بھی کافی اپج پائی جاتی ہے۔ جذبات کے اظہار میں انھوں نے زیادہ فضول تصنع سے کام نہیں لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھیں معقولیت کے حدود کے اندر لکھیں۔

اخیر میں چند گیت بھی ہیں اور وہ زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں حلقۂ ارباب فکر رتن تلاؤ کراچی سے مل سکتی ہے۔

لسان العصر اس مجموعہ میں تمام ان قطعات و منظومات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو حضرت اکبر الہ آبادی کی وفات پر لوگوں نے لکھی تھیں اور جن کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے۔ یہ کتاب بزم اکبر کراچی کی طرف سے شایع ہوئی ہے اور اختر انصاری اکبرآبادی نے اسے مرتب کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ کی اشاعت بے محل ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت کا صحیح وقت وہ تھا جب اکبر کے تمام کلام اور اس کے سوانح شایع ہو جاتے۔

قیمت تین روپیہ ہے اور کتابت طباعت نہایت پسندیدہ۔ ملنے کا پتہ بزم اکبر کراچی۔

جنوبی ہند میں دو ہفتے یہ مختصر سا سفرنامہ ہے جناب جگن ناتھ آزاد کا جو انھوں نے جنوبی ہند کی سیاحت کے دوران میں مرتب کیا تھا جناب آزاد کو گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی طرف سے شرکت مشاعرہ کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اس سلسلہ میں حیدرآباد بھی گئے اور مدراس کے دوسرے مقامات کی بھی سیر کی۔

آزاد کے جذبات خلوص و صداقت ایسے نہ تھے کہ ان کی قدر نہ کی جاتی۔ وہ جہاں پہنچے لوگوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کی شاعری سے پورا لطف اٹھایا — جناب آزاد نے اسی داستان پذیرائی کو ایسے موثر و دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کو شروع کر کے ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ: دہلی کتاب گھر دہلی۔

ولی گجراتی نتیجہ ہے جناب سید ظہیر الدین مدنی ایم۔ اے پی ایچ ڈی کی ریسرچ کا جو انھوں نے ولی گجراتی کے سوانح اور شاعری کے متعلق کئی سال تک جاری رکھی۔ ابتدا میں انھوں نے گجرات کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہے اور پھر یہاں کے ادبی مشاغل کا

کا ذکر کرتے ہوئے، اُردو ادب کے نشوونما پر روشنی ڈالی ہے۔

ولی کو اس وقت تک دکنی شاعر سمجھا جاتا تھا، لیکن مدنی صاحب مختلف ذرایع سے اس کا گجراتی ثابت کیا ہے۔ ولی کے علمی استعداد اور ان کی شاعری پر بھی انھوں نے کافی بسیط گفتگو کی ہے۔ الغرض یہ کتاب معیاری ریسرچ کی چیز ہے اور ہمیں مدنی صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب کی تاریخ میں بڑا مفید اضافہ کیا ہے۔ قیمت ۱۲ اور انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی سے مل سکتی ہے۔

نوائے بیدل

مجموعہ ہے جناب عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ بیدل صاحب پٹنہ کالج میں اُردو فارسی کے پروفیسر تھے اور ان مخصوص استادوں میں سے تھے جو علمی خدمت خالص علمی حیثیت سے انجام دیتے ہیں اور اسی سلسلہ میں ان کو شاعری کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ایک ستھرے ذوق کا پڑھا لکھا شخص ہر کام سلیقہ سے کرتا ہے اس لئے بیدل صاحب کی شاعری بھی ان کے سلیقہ و ذوق کی آئینہ دار ہے۔

جناب بیدل متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں جو اس سے قبل شایع ہو چکی ہیں، لیکن ان کے مجموعۂ نظم کی اشاعت کی طرف غالباً اب بالکل پہلی بار توجہ کی گئی ہے اور یقیناً بیدل و زبان دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی اگر ایسا نہ کیا جاتا۔

بیدل کی شاعری دراصل شاد اسکول کی شاعری ہے اور میں اس کو ایک علحدہ اسکول اس لئے قرار دیتا ہوں کہ شاد عظیم آبادی کی شاعری یقیناً لکھنوی اور دہلوی اسکول سے مختلف تھی۔

عظیم آباد ہمیشہ سے اہلِ فضل و کمال کا مرکز رہا ہے اور اس کے لئے یہ امر باعثِ صد ہزار افتخار ہے کہ مرزا عبدالقادر بیدل ایسا شاعر اس نے پیدا کیا۔ پروفیسر عبدالمنان صاحب نے بھی اپنا تخلص بیدل رکھا ہے اور گو ان دونوں میں اول و آخر کی نسبت نہیں پائی جاتی، تاہم یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے شاد عظیم آبادی کے رنگ کو بڑی کامیابی کے ساتھ نباہا ہے اور یہ آسان بات نہ تھی۔ مثالاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جب بے نیاز یاں تھیں محبت بھی سہل تھی — اب اس کے التفات نے مشکل بنا دیا

قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے لذت کوشش تو ملتی ہو — پٹک لینے دو سر کو بال و پر سے کھیل لینے دو

خبر نہیں مرا تنکوں کا ایک جا کرنا — ہے بجلیوں کے لئے یا کہ آشیاں کے لئے

میں تو الفت میں وفا کر کے پشیماں ہوا — دیکھنا تم نہ جفا کر کے پشیماں ہوتا

خود اپنے ہاتھ سے چمن اپنا مٹا دیا — شرمندہ برق سے ہیں خجل آسماں سے ہم

ان اشعار سے شاعر کی قوتِ بیان، ندرتِ ادا اور بلندیٔ ذوق پوری طرح نمایاں ہے اور ملک کو اقبال بک ڈپو پٹنہ کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس نے اس مجموعہ کو شایع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ قیمت چار روپیہ، کتابت و طباعت پسندیدہ، کاغذ دبیز و سفید۔

رفیق صحت لاہور

یہ ایک طبی رسالہ ہے جسے جناب حکیم اقبال حسن نے لاہور سے جاری کیا ہے۔ اس وقت تک اس کے دو نمبر تپدق اور پایوریا نمبر کے نام سے شایع ہو چکے ہیں اور بہر نوع بہت کامیاب ہیں۔ یہ دونوں مرض اپنی جگہ بڑے نامعقول ہیں جن میں علاج سے زیادہ تدابیر حفظ ما تقدم کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے نہایت وضاحت کے ساتھ ان امراض کے متعلق ان تمام باتوں کو ظاہر کر دیا ہے جن کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اسی کے ساتھ خود اپنے اور اپنے خاندان کے تجربہ کئے ہوئے نسخے درج کر کے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ یہ التزام کہ ہر نمبر کسی نہ کسی مرض کے لئے مخصوص ہو بڑی سود مند کوشش ہے اور ملک کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس رسالہ کا سالانہ چندہ حکیم صاحب نے صرف دو روپیہ اس لئے رکھا ہے کہ عوام زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔ نمونہ اس پتہ سے طلب کیا جائے حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور۔ ہندوستان میں جو صاحب اس کو لینا چاہیں وہ اپنا چندہ دفتر نگار میں بھیج سکتے ہیں۔

۱۹۵۵ء کا بہترین ادب

مکتبۂ اُردو لاہور سے ہر سال ایک مجموعہ پچھلے سال کے بہترین مقالات و منظومات کا شایع ہوتا رہتا ہے چنانچہ امسال بھی حسبِ معمول ۱۹۵۵ء کے بہترین ادب کے نام سے یہ مجموعہ شایع کیا گیا ہے جو ۴۱۱ صفحات کو محیط ہے

اس انتخاب میں آٹھ مقالے، دس افسانے، ایک ڈراما، ۳۸ نظمیں، ۳۰ غزلیں اور پانچ مزاحیہ مضامین ہیں جو سب کے سب پہلے کہیں نہ کہیں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انتخاب کا مسئلہ بڑا مشکل ہے، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ جس حد تک مقالات کا تعلق ہے ان کے معیاری ہونے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ افسانوں اور غزلوں کے بابت بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں، لیکن منظومات میں البتہ بعض ایسی ہیں جن کے معیاری ہونے کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے تاہم وہ اس قدر کم ہیں کہ انھیں "خال رخ زیبا" سمجھ کر گوارا کیا جا سکتا ہے۔

اس مجموعہ میں عہد حاضر کے مشہور ادیبوں و افسانہ نگاروں کے علاوہ ایک دو ایسے ستارے بھی ہیں جو حال ہی میں طلوع ہوئے ہیں لیکن ان کا مستقبل کافی درخشاں نظر آتا ہے۔

یہ مجموعہ مجلد نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کیا گیا ہے اور چھ روپیہ میں مکتبۂ اردو لاہور سے مل سکتا ہے۔

شکست و فتح دوسرا اڈیشن ہے علامہ جمیل مظہری کے طویل افسانہ کا جو اس سے قبل ایک بار شایع ہو چکا تھا۔ جناب جمیل مظہری نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ پورے ملک کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو ادب و زبان کی خدمت کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کے قلم سے کبھی درجۂ دوم کی چیز نہیں نکلتی۔ علامۂ موصوف نے اس وقت تک متعدد موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اپنے فطری استغناء کی وجہ سے انھوں نے ملک کو اس کا کم موقع دیا کہ وہ ان کے کمالات سے پوری طرح مستفید ہو سکتا۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ بنگال میں بسر ہوا اور ایسے ماحول میں جو ان کے فضل و کمال کے لحاظ سے فروتر تھا۔ چند سال ہوئے کہ ان کے وطن (صوبۂ بہار) نے انھیں علمی خدمت کے لئے چن لیا ہے اور وہ اپنے صحیح منصب پر فائز ہیں۔
یہ افسانہ اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے جب موصوف کلکتہ میں تھے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک گہرا سوچنے والے ایک زبان پر قدرت رکھنے والے اور ایک جدت طراز ادیب کے افسانہ میں ہونا چاہئے۔ یہ افسانہ دراصل ایک فلسفیانہ تجزیہ ہے جذبات محبت کا، لیکن ایسے دلکش انداز میں کہ اگر اسے افسانہ نہ کہا جائے تو بھی وہ افسانہ سے زیادہ دلکشی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔

چھوٹا خدا مجموعہ ہے جناب عندلیب شادانی کے دو افسانوں کا جن میں سے ایک کا نام چھوٹا خدا اور دوسرے کا بے روزگار ہے اور ان دونوں پر "سچی کہانی" ہونے کی مہر ثبت ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر واقعہ افسانہ نہیں ہو سکتا، لیکن اگر خوش قسمتی سے کسی ادیب کو کوئی ایسا واقعہ نظر آ جائے جو افسانوی حیثیت رکھتا ہو تو پھر اسکے پلاٹ کے متعلق گفتگو کا کوئی موقع نہیں رہتا اور اس طرح وہ نقد و تبصرہ سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تاہم ایک پہلو زبان کا رہ جاتا ہے، سو عندلیب شادانی ایسے پختہ کار و مشاق ادیب کی زبان کی بابت بحث بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ حسن اتفاق سے یہ دونوں افسانے نتیجہ خیز بھی ہیں، حالانکہ اگر نہ ہوتے تو بھی اس لحاظ سے کہ وہ سچی کہانیاں ہیں، کس کو مجال دم زدن تھی۔

ضخامت ۱۵۵ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ کاغذ اور کتابت و طباعت پاکیزہ، ملنے کا پتہ:- شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ کشمیری بازار لاہور۔

نوش و نیش یہ کتاب بھی پروفیسر عندلیب شادانی کے ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے اور ان میں بھی ہر ایک پر سچی کہانی لکھا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کم ایسے افسانہ نگار ہوں گے جن کو اتنے صحیح مگر دلچسپ واقعات میسر آ جائیں جتنے شادانی صاحب کو میسر آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود ان کو افسانہ نگار بنانا چاہتی تھی اور جسے قدرت خود کچھ بنانا چاہے، اس کو دنیا میں کون بگاڑ سکتا ہے۔ اس مجموعہ کے تمام افسانے بے شک بہت دلچسپ ہیں اور شادانی صاحب نے انھیں جس تاثر کے ساتھ لطف لے لیکر بیان کیا ہے اس نے ان کی دلچسپی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔
ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ قیمت [illegible]۔ ملنے کا پتہ:- شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور۔

دور حاضر اور اردو غزل گوئی اور نشاط رفتہ یہ دونوں کتابیں بھی پروفیسر عندلیب شادانی کی تصنیف ہیں۔ پہلی کتاب میں ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے جو انھوں نے حسرت، فانی، جگر اور اصغر کی شاعری کے معائب و نقائص ظاہر کرنے کے لئے رسالہ ساقی میں شایع کئے تھے اور دوسری کتاب نشاط رفتہ خود شادانی صاحب کے اشعار کا مجموعہ ہے۔ چونکہ یہ دونوں کتابیں زیادہ تفصیلی تبصرہ کی محتاج ہیں اس لئے اس فرض کو ہم آئندہ ادا کریں گے۔ ان چند سطروں کو محض رسید سمجھنا چاہئے۔

نگار کی پرانی مکمل جلدیں

سنہ ۳۱ء	سنہ ۳۲ء	سنہ ۳۵ء	سنہ ۳۶ء
ع۱۵ر	ع۱۵ر	ع۱۵ر	ع۱۵ر
سنہ ۴۳ء	سنہ ۴۹ء	سنہ ۵۰ء	
ع۱۵ر	ع۱۰ر	ع۱۰ر	مینجر نگار

"رفیقِ صحت" لاہور

کا پہلا شمارہ "تپ دق نمبر" تھا۔ اس کی افادیت کے پیش نظر عوام نے اسے توقع سے بڑھ کر پسند کیا۔ اس کے بعد اگست نمبر دانتوں کی بیماری "پائیوریا" پر شایع ہوا۔ ستمبر کا پرچہ خنازیر کے لئے وقف ہے اگر آپ اب تک اس کے خریدار نہیں ہوئے تو فوراً ہو جائیں ورنہ مجربات و نوادرات کا یہ ذخیرہ آپ کسی قیمت پر بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔

بھارت کے رہنے والے اصحاب دو روپیہ دفتر نگار میں جمع کر کے فوراً ہمیں اطلاع دیں۔ پرچہ آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

مینجر رسالہ رفیقِ صحت داتا گنج بخش لاہور

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں شامل ہے پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول - مینجر نگار۔ لکھنؤ

قولِ فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدرآبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرفِ آخر" کو سامنے رکھ کر اس کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے ان کے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز گرد پوش رنگین قیمت دو روپیہ۔ علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جانِ عالم واجد علی کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جامِ شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے۔

قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ - مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

نقد و تبصرہ
اعری کیا تھی
ول

...ری۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم
اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام ماجد ولین نمبر ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی
ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب
اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ
اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر
کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی
بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شامل
کئے گئے ہیں اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے
بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور
ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء
سے لے کر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں
کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب
کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور
جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور
ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈسن کی مشہور عالم کتاب
"ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر،
عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی
زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی
بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔
سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم
حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے ۵۵ سال کے بعد ... کی
... مفید و عجیب ... ہے کہ آپ اس کو ایک بار ... کے بعد ...
... نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی
زندہ رہنا بھی ایک فن ہے
اور اگر ... کہ آپ ... زندہ رہنا ... آپ کے لئے ...
[illegible]
[illegible]

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ ...
کی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ
کے لئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول